جنوری ۱۹۹۷ء

معارف

مجلس دار المصنفین کا ماہوار علمی رسالہ

مرتبہ

ضیاء الدین اصلاحی

دار المصنفین، شبلی اکیڈمی اعظم گڈھ

معارف کا زر تعاون

ہندوستان میں سالانہ اسی روپیے — فی شمارہ سات روپیے

پاکستان میں سالانہ دو سو روپیے

دیگر ممالک میں سالانہ — ہوائی ڈاک — بیس پونڈ — یا — بتیس ڈالر

بحری ڈاک — سات پونڈ — یا — گیارہ ڈالر

پاکستان میں ترسیل زر کا پتہ:۔ حافظ محمد یحیی شیرستان بلڈنگ

بالمقابل ایس ایم کالج۔ اسٹریچن روڈ۔ کراچی

☆ سالانہ چندہ کی رقم منی آرڈر یا بینک ڈرافٹ کے ذریعہ بھیجیں۔ بینک ڈرافٹ درج ذیل نام سے بنوائیں:

DARULMUSANNEFIN SHIBLI ACADEMY
AZAMGARH

☆ رسالہ ہر ماہ کی ۵ تاریخ کو شائع ہوتا ہے، اگر کسی مہینے کے آخر تک رسالہ نہ پہو نچے تو اس کی اطلاع اگلے ماہ کے پہلے ہفتہ کے اندر دفتر میں ضرور پہونچ جانی چاہیے، اس کے بعد رسالہ بھیجنا ممکن نہ ہوگا۔

☆ خط و کتابت کرتے وقت رسالے کے لفافے کے اوپر درج خریداری نمبر کا حوالہ ضرور دیں۔

☆ معارف کی ایجنسی کم از کم پانچ پرچوں کی خریداری پر دی جائے گی۔ کمیشن ۲۵٪ ہوگا۔ رقم پیشگی آنی چاہیے۔

جلد ۱۵۹   ماہ رمضان المبارک ۱۴۱۷ھ مطابق ماہ جنوری ۱۹۹۷ء   عدد ۱

فہرست مضامین

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

شذرات

حبِ مال اور ہوسِ زر ایک بڑا فتنہ ہے جو انسان کے دین و اخلاق ہی کو نہیں، پورے ملک و معاشرہ کو بھی تباہ و برباد کر دیتا ہے۔ لیکن اب یہ بڑی اور عالمگیر بیماری بن چکا ہے اور مال و زر ہی ہر شخص کی تگ و دو کا محور ہے۔ اسی کے پیچھے دیوانہ ہو کر وہ تمام خوبیوں اور نیکیوں سے ہاتھ دھو بیٹھا ہے۔ اقوامِ عالم میں جنگ ہے تو اسی کی، اسی کو عظمت اور بڑائی کا معیار بنا لیا گیا ہے۔ اس کے سامنے خدا ترسی، دین، علم، اخلاق، خدمتِ خلق اور اصلاح و ہدایت کے چراغ بے نور ہو گئے ہیں۔ ہندوستان میں تو اس دیوی کی پوجا ہی ہوتی ہے۔ اس لیے وبائے عام کی طرح پورے ملک میں بدعنوانی اور کرپشن پھیل گیا ہے جو روکے نہیں رک رہا ہے۔ ہر شخص جائز و ناجائز اور صحیح و غلط ہر طریقہ سے حصولِ مال میں منہمک ہے۔ زمین و جائداد کے جھگڑوں میں جو ختم نہیں ہوتے، خاندان کے خاندان تباہ ہو رہے ہیں اور قتل و غارتگری کا بازار ہمیشہ گرم رہتا ہے۔ ہر طرف متمول لوگوں کا بول بالا ہے۔ لیکن دولت سے محروم اشخاص کسی شمار و قطار میں نہیں۔ خواہ وہ کیسے ہی خدا ترس، شریف، ذی علم اور اخلاص و دردمندی کا مجسمہ ہی کیوں نہ ہوں۔

ملک کی سب سے بڑی بدنصیبی یہی ہے کہ جن لوگوں کے ہاتھوں میں اس کی باگ ڈور آئی یا جو لوگ بڑے اور چھوٹے سرکاری عہدوں پر فائز ہوئے وہ آنکھ بند کر کے اپنا گھر بھرتے اور **جَمَعَ مَالًا وَّ عَدَّدَهٗ** کا عملی نمونہ پیش کرتے رہے۔ قوم و ملک کے مسائل میں سر کھپانے کی کس کو فرصت؟ ساری ذہانت و صلاحیت اور تمام قوت و قابلیت دولت سمیٹنے میں صرف ہوتی رہی۔ تاکہ ان کی کئی پشتیں ان فتوحات و غنائم سے متمتع ہوتی رہیں۔ ہوسِ زر کی تسکین کے لیے جو بدعنوانی ممکن تھی وہ بے تکلف کی گئی۔ نہ خدا کا ڈر، نہ خلق میں رسوائی کی پروا۔ بہتی گنگا میں سب ہی نے ڈبکی لگائی۔ نعرے سوشلزم اور سماج واد کے لگتے تھے مگر ملک کی دولت سمٹ کر انہی کے گھروں میں جمع اور چند لوگوں کے ہاتھوں میں مرکوز ہوتی رہی۔ غریب بیچارے

غریب تر اور نانِ جویں کا محتاج ہوگیا۔ متوسط طبقہ گرانی کے بوجھ تلے دبتا چلا گیا لیکن کارپردازانِ حکومت عیش کرتے اور مزے لوٹتے رہے۔ اس سے زیادہ شرمناک بات کیا ہوگی کہ وزیراعظم، کابینی وزراء، ریاستوں کے وزرائے اعلیٰ، پارلیمنٹ اور اسمبلیوں کے ممبران اور اعلیٰ حکام بدعنوانی کے مقدمات میں ملوث اور تُحِبُّونَ الْمَالَ حُبًّا جَمًّا کی عملی تفسیر بنے ہوئے ہیں۔

حال میں بدعنوانی کے انسداد کے قانون میں ترمیم کی جو تجویز زیر بحث آئی ہے ممکن ہے اسکے لیے قانون میں کوئی لچک ہو لیکن اگر وہ منظور ہوگئی اور اس کے دائرے سے پارلیمنٹ اور ریاستی اسمبلیوں کو باہر کردیا گیا تو پارلیمنٹ اور اسمبلیوں کے بدعنوان ممبروں کو کھلی چھوٹ مل جائے گی۔ ملک کے ان بڑے اور باوقار اداروں کی جو تصویر اب سامنے آئی ہے اس نے اس امر کو بہت ضروری بنا دیا ہے کہ بدعنوانی کے انسداد کے قانون کا اطلاق سرکاری افسروں کی طرح پارلیمنٹ اور اسمبلیوں کے ممبروں پر بھی ہونا چاہیے۔ اگر یہ لوگ واقعی پاک دامن اور بدعنوانیوں میں ملوث نہیں ہیں تو اس قانون سے خائف کیوں ہیں۔ گزشتہ دنوں ایک ریاست کی وزیر اعلیٰ کو بدعنوانیوں میں ملوث ہونے کی بنا پر گرفتار کیا گیا تو سب سے زیادہ چیخ پکار ایک سوشلسٹ لیڈر اور سابق وزیراعظم نے مچائی۔ مگر انھیں کبھی بدعنوانیوں اور بدعنوان لوگوں پر غصہ نہیں آیا۔ اس کا تقاضا بھی یہی ہے کہ مجرم کوئی بھی ہو اسے سزا ملنی ہی چاہیے۔

اس وقت ملک کے حالات کو درست کرنے اور اسے بچانے کے لیے ضروری ہے کہ قانون سب کے لیے یکساں ہو۔ اور اس میں کسی طرح کی تفریق روا نہ رکھی جائے۔ مال و دولت کے متوالوں پر کڑی نظر رکھی جائے۔ ان کے اندر خدا کا خوف اور خلق کی ہمدردی کا جذبہ پیدا کیا جائے اور ان سے انسانیت، اخلاق اور قانون کے مسلمہ ضابطوں کی لازماً پابندی کرائی جائے ورنہ اس شجرۂ فساد کے برگ و بار پھیلتے ہی جائیں گے اور ملک و قوم کو تباہی کی لپیٹ میں لینے والی بدعنوانیوں کا خاتمہ نہیں ہوسکتا۔ اس موقع پر بے اختیار زبان پر یہ واقعہ آگیا کہ ایک مرتبہ قریش جیسے معزز خاندان کی

ایک خاتون نے چوری کی تو لوگوں کو بڑی فکر ہوئی اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آپ کے سب سے محبوب اور چہیتے حضرت اسامہؓ کو سفارش کے لیے بھیجا۔ آپؐ نے فرمایا: تم حدود الہٰی کے بارے میں سفارش کر رہے ہو۔ اس سے پہلے اسی لیے قومیں تباہ ہوئیں کہ وہ غریب لوگوں پر حدود جاری کرتی تھیں اور بڑے لوگوں کو چھوڑ دیتی تھیں۔ خدا کی قسم! اگر محمدؐ کی بیٹی فاطمہ بھی چوری کرے تو اس کے ہاتھ کاٹ دیے جائیں گے۔

افسوس ہے کہ گزشتہ مہینے میں ہمارے ضلع اور شہر کے مشہور قومی کارکن، کامیاب وکیل اور اچھے شاعر جناب احمد علی غزنوی کا انتقال ہوگیا۔ انھیں اقبال سہیل اور مرزا احسان احمد سے مشورۂ سخن کا شرف حاصل تھا۔ ان کے گھر پر اکثر نشستیں ہوتی تھیں۔ اور انھوں نے بعض بڑے مشاعرے بھی کرائے۔ ان کا مجموعۂ کلام "صہبائے خودی" بھی زیر کتابت تھا۔ تعلیمی کاموں سے بھی بڑی دلچسپی تھی۔ اپنے وطن محمد پور میں ایک دینی مدرسہ اور انٹر کالج ان کی یادگار ہے۔ شبلی کالج کی مجلس انتظامیہ کے ممبر اور ایک زمانے میں سینیر نائب صدر تھے۔ دارالمصنفین سے بھی تعلق تھا، یہاں برابر آتے تھے۔ مولانا مسعود علی ندوی کی سفارش پر کانگریس نے ۱۹۶۲ء میں انھیں ٹکٹ دیا تو صوبائی اسمبلی کے ممبر ہوئے۔ مگر اب سیاست کے گرتے ہوئے معیار اور خود کانگریس کے رویے سے خوش نہیں رہتے تھے۔ بڑے باغ و بہار شخص تھے، دوسروں کی خدمت اور مصیبت زدہ لوگوں کی مدد کر کے خوش ہوتے تھے۔ قدرت نے انھیں دردمند دل اور بے چین طبیعت بخشی تھی۔ خود کہتے ہیں ؎

اک دل دردآشنا و اک نگاہِ حق نگر
اور کیا اس کے سوا احمدؔ سے دیوانے میں ہے

مقالات

قرآن مجید کی سائنسی اہمیت پر ایک نظر

از مولانا محمد شہاب الدین ندوی۔ بنگلور۔

قرآن مجید کے بارے میں جو غلط فہمیاں پیدا ہوگئی ہیں، ان میں ایک یہ بھی ہے کہ اسے خالص شرعی احکام و مسائل کی کتاب سمجھ کر اس کے دوسرے علوم و مسائل نظر انداز کردیے گئے ہیں۔ اس کے مقابلے میں بعض جدید حلقے اسے سائنسی علوم کی کتاب قرار دے کر اسکے شرعی مسائل کو اہمیت نہیں دیتے، کتاب الٰہی کے ساتھ انصاف اسی وقت ہو سکتا ہے جب افراط و تفریط سے بچ کر حقیقت پسندانہ نقطۂ نظر اختیار کیا جائے۔ اس مضمون میں قرآن مجید کے بنیادی علوم کا تعارف کراتے ہوئے اس کو سائنسی نقطۂ نظر سے سمجھنے کے سلسلے میں بعض اصول و کلیات پیش کیے جائیں گے، جن سے ظاہر ہوگا کہ دینی و دنیوی حیثیت سے یہ کس قدر ضروری اور اہم علم ہے جس سے عام طور پر تغافل برتا جا رہا ہے۔ اس بات کی بھی کوشش کی گئی ہے کہ اس موضوع کا صحیح تعارف علمائے متقدمین کی تحریروں اور ان کی آراء کی روشنی میں کرایا جائے۔ لیکن اصل موضوع سے پہلے قرآن مجید کا موضوع اور اس کے مباحث کی تعیین ضروری معلوم ہوتی ہے۔

قرآن مجید کا موضوع اور اس کے مباحث قرآن مجید کا موضوع زندگی کے میدان میں فکری اعتبار سے انسان کی صحیح رہنمائی ہے اور یہ رہنمائی محض شرعی مسائل تک محدود نہیں بلکہ انسان کے فکر و نظر کی اصلاح بھی اس میں شامل ہے۔ چنانچہ ارشاد باری ہے:

هُدًى لِّلنَّاسِ وَ بَيِّنٰتٍ مِّنَ الْهُدٰى وَالْفُرْقَانِ (بقرہ: ۱۸۵)	(یہ قرآن پوری) نوع انسانی کے لیے ہدایت ہے اور اس میں رہنمائی اور حق و باطل میں تمیز کرنے کے واضح دلائل موجود ہیں۔

اس آیت کریمہ کی رو سے واضح ہوتا ہے کہ قرآن مجید محض اہل اسلام ہی کے لیے نامۂ ہدایت نہیں بلکہ وہ عام انسانوں کے لیے بھی ایک رہبر ہے جو فکری و نظریاتی اعتبار سے ان کے لیے دعوتِ فکر فراہم کرتا ہے۔ چنانچہ اسی معنی میں حسب ذیل آیات بھی مذکور ہیں:

قُلْ يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ قَدْ جَآءَكُمُ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّكُمْ (یونس: ۱۰۸)	کہہ دو کہ اے لوگو تمہارے پاس تمہارے رب کی جانب سے حق پہنچ چکا ہے۔
الٓرٰ كِتٰبٌ اَنْزَلْنٰهُ اِلَيْكَ لِتُخْرِجَ النَّاسَ مِنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ (ابراہیم: ۱)	(اے محمد) یہ وہ کتاب ہے جسے ہم نے تجھ پر اتاری ہے تاکہ تو نوع انسانی کو (ضلالت کی) تاریکیوں سے (ہدایت کی) روشنی کی طرف لے آئے۔

اب سوال یہ ہے کہ فکر و نظر کے وہ کون سے گوشے یا کون سے مسائل ہیں جن میں وہ انسان کی رہنمائی کرتا ہے؟ تو اس کا صحیح جواب یہ ہے کہ ان تمام امور و مسائل میں وہ رہنمائی کرتا ہے جن سے اس نے بحث کی ہے۔ لہٰذا ہم کو قرآنی ہدایت و رہنمائی کا حال معلوم کرنے کے لیے سب سے پہلے یہ دیکھنا ضروری ہے کہ قرآن مجید نے کن مباحث کیا ہیں اور اس نے کن کن علوم و مسائل سے تعرض کیا ہے؟ امام الہند

حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ (م ۱۱۷۶ھ) کی تصریح کے مطابق قرآن مجید کے اصلی علوم پانچ ہیں۔

(۱) علم احکام، یعنی حلال وحرام کا علم (۲) علم مخاصمہ، یعنی غیر قوموں کے ساتھ علمی مباحثہ (۳) علم التذکیر بآلاء اللہ، یعنی اللہ کی نعمتوں اور نشانیوں کے ذریعہ تذکیر (۴) اللہ کے ایام کے ذریعہ تذکیر، یعنی پیغمبروں اور ان کی نافرمان قوموں کے درمیان جو معرکے ہوئے ان کے ذریعہ عبرت و موعظت (۵) اور موت نیز احوالِ آخرت کے ذریعہ تذکیر و تنبیہ۔

قرآن مجید کے تمام مباحث انہی پانچ علوم کے اندر آگئے ہیں۔ علم احکام کی تشریح تفصیل کرنا فقیہ کی ذمہ داری ہے اور علم مباحث کی وضاحت کرنا متکلم کا کام ہے۔

(الفوز الکبیر)

پہلے دونوں علوم عقائد، عبادات اور معاملاتِ زندگی سے تعلق رکھتے ہیں اور بقیہ تین علوم تذکیری ہیں جو انسان کو متنبہ کرنے کی غرض سے ہیں۔ علم مخاصمہ یا مجادلہ سے مراد وہ مباحثات ہیں جو گمراہ فرقوں کے ساتھ کیے گئے اور ان کے باطل عقائد کی تردید منطقی دلائل کے ساتھ کی گئی۔ انہی مباحث کے تحت عقائد و ایمانیات کی تنقیح ہوتی ہے۔ غرض قرآن مجید ان پانچوں علوم میں ہمارے لیے ہدایت نامہ اور مینارۂ نور ہے۔ اور ان میں سے کسی ایک علم کی بھی قدر و منزلت گھٹائی نہیں جاسکتی۔

یہاں موضوع بحث دوسرا اور تیسرا علم ہے۔ یعنی علم مباحثہ اور علم التذکیر بآلاء اللہ۔ جو اللہ تعالیٰ کی نعمتوں، اس کی نشانیوں اور اس کی تخلیقات سے متعلق ہے اور جن ... جدید علوم کے سوتے پھوٹتے ہیں اور ان مباحث کا تعلق اللہ تعالیٰ کی ربوبیت سے ہے۔

گمراہ قوموں کی اصلاح | علم مخاصمہ (مجادلہ و مباحثہ) میں گمراہ قوموں کے فاسد عقائد سے بحث کی جاتی ہے اور عقلی دلائل کی روشنی میں عقیدۂ توحید عقیدۂ رسالت اور عقیدۂ قیامت کا اثبات خصوصی طور پر کیا جاتا ہے۔ تمام انبیائے کرام کی دعوت کا محور یہی تین بنیادی عقائد ہیں جو دین الٰہی کی اساس ہیں۔

دور قدیم میں اسلام کا سابقہ کفار و مشرکین سے تھا مگر دور جدید میں اس کا مقابلہ ملحدین اور مادہ پرستوں سے ہو گیا ہے جو خدا کو سرے سے مانتے ہی نہیں ہیں۔ لہذا قرآن مجید میں ہر دور کی ذہنیت کے مطابق علمی و عقلی دلائل بیان کیے گئے ہیں۔ اس میں جدید علوم و مسائل کا تذکرہ کرنے کی اصل غرض و غایت بھی یہی ہے کہ وہ ہر دور کے عقلی تقاضوں کے مطابق اس کی ہدایت و رہنمائی کر کے گم کردہ راہ انسانوں کو راہ راست پر لائے۔

خدائی تخلیقات معرفت الٰہی کا ذریعہ | "علم التذکیر بآلاء اللہ" کے تحت اللہ تعالیٰ کی نعمتوں، اس کی نشانیوں اور اس کی تخلیقات کی تفصیل کی جاتی ہے۔ جس کے نتیجے میں اللہ تعالیٰ کی صفات کاملہ کی تنقیح ہوتی ہے اور اس کی ربوبیت و الوہیت کی حقیقت کھل کر سامنے آتی ہے۔ چنانچہ امام غزالیؒ (م ۵۰۵ھ) کی تحقیق کے مطابق سب سے اعلیٰ و افضل علم اللہ تعالیٰ کی معرفت ہے اور باقی تمام علوم ضمنی و ثانوی ہیں۔ اللہ تعالیٰ کی ذات و صفات اور اس کی معرفت تمام علوم کی اصل اور ان کا جوہر ہے۔ چنانچہ خدا کی ذات و صفات کی معرفت کے لیے اس کے افعال کا مطالعہ ضروری ہے اور چونکہ یہ پوری کائنات اور اس کے تمام مظاہر افعال الٰہی کا روپ ہیں اس لیے مظاہر کائنات (مادی اشیاء) کے مطالعہ سے اس کی صفات عیاں ہوتی ہیں اور صفات کے مطالعہ

سے اللہ تعالیٰ کی ذات تک رسائی ہوتی ہے۔ اس اعتبار سے ذات باری تعالیٰ کی معرفت اس کی صفات اور اس کے افعال کے مطالعہ پر موقوف ہے۔ (خلاصہ از جواہر القرآن)

امام غزالیؒ نے خدائے تعالیٰ کی ذات و صفات اور اس کے افعال و تخلیقات سے متعلق قرآن مجید میں مذکور آیات کو "جواہر القرآن" کے نام سے موسوم کیا ہے جن کی تعداد ۷۶۳ ہے اور یہ زیادہ تر وہی آیات ہیں جو سائنسی نقطۂ نظر سے مادی اشیاء اور نظام کائنات سے متعلق ہیں جن کے مطالعہ سے خداوند قدوس کی قدرت و عظمت، اس کی ربوبیت و رحمانیت، اس کی مخلوق پروری اور اس کی بے مثال حکمت و منصوبہ بندی کا حال آشکارا ہوتا ہے۔ اس اعتبار سے سائنسی علوم کی روشنی میں مادی اشیاء کا تفصیلی مطالعہ دراصل "افعال الٰہی" کا مطالعہ ہے، جس کے نتیجے میں خدا کی صفات اور پھر اس کی ذاتِ عالی تک رسائی ہوتی ہے۔ امام غزالیؒ کی نظر میں اس کائنات میں خدا اور اس کے افعال کے سوا اور کچھ بھی نہیں ہے۔

(جواہر القرآن، ص ۲۶، دار احیاء العلوم، بیروت، ۱۹۸۵ء)

صفات الٰہی کی جلوہ گری | غرض نظام کائنات کے تفصیلی مطالعہ سے اس عالم مادی میں خدائے تعالیٰ کی توحید اور اس کی صفاتِ کاملہ کا ثبوت ملتا ہے اور قدم قدم پر اس کا جلوہ نظر آتا ہے۔ ہر سو توحید ہی توحید نظر آتی ہے۔ گویا کہ ہم اسے بالکل سامنے کھڑا پا رہے ہیں اور شاہد حقیقی کا مشاہدہ عریاں طور پر کر رہے ہیں۔ اگر مظاہر عالم میں کارفرما حیرت انگیز نظام کا جائزہ لیا جائے تو قدم قدم پر خدائی صنعت گری اور اس کی کرشمہ سازیوں کا نظارہ ہوتا ہے، خواہ ایک ننھے سے ایٹم کا مطالعہ کریں یا نظام شمسی کا، پھول پتیوں اور رنگ برنگ گل بوٹوں کا مشاہدہ کریں یا دیمک، چیونٹی اور شہد کی مکھیوں کی اجتماعیت کا جائزہ لیں، جسم انسانی میں کارفرما تحیر خیز نظام کو دیکھیں یا انواعِ

حیات کے عجیب و غریب اختلافات کا مشاہدہ کریں، ہر جگہ نفاست، رعنائی اور حسن کاریگری کے مکمل نقوش نظر آئیں گے اور معلوم ہوگا کہ ان ظاہری محسوسات کے پردے میں کوئی حقیقت ثابتہ ضرور پنہاں ہے۔ ورنہ بغیر کسی انقطاع کے تسلسل کے ساتھ ان رنگا رنگیوں کا مظاہرہ ممکن نہ ہوتا۔ اسی کو تصوف کی اصطلاح میں "توحید شہودی" کہا جاتا ہے۔ یعنی ان اشیاء میں کار فرما ظاہری نقوش سے صرف نظر کرتے ہوئے ان کے اندر ودیعت شدہ نظام وحدت کا مشاہدہ کیا جائے تب خدا کی صفاتِ کاملہ کا نظارہ عینی و بصری طور پر ہو جائے گا۔ گویا کہ ہم خدا کو اپنے سامنے اور اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں۔

غرض علم العقائد کی رو سے خدائی صفات کی دو قسمیں ہیں: (۱) صفات ذاتی (۲) اور صفات فعلی۔ صفات ذاتی سے مراد حیات، قدرت، علم، کلام، سمع و بصر اور ارادہ ہیں۔ اور صفات فعلی سے مراد پیدا کرنا، رزق دینا، مارنا اور جلانا وغیرہ ہیں (شرح فقہ اکبر ص ۳۳، از امام ابو منصور ماتریدی، مطبوعہ قطر)

اگر ہم موجودہ سائنسی علوم کی روشنی میں ان صفاتِ الٰہی کی تنقیح و تطبیق کریں تو اس سے حیرت انگیز نتائج سامنے آتے ہیں جن سے عالم انسانی کی ہدایت کے لیے ایک نیا باب کھل سکتا ہے۔ لہذا ضرورت ہے کہ قرآن مجید اور سائنس کی روشنی میں باری تعالیٰ کی ان تمام صفات کو نکھار کر پیش کیا جائے۔ اس مقصد کے لیے جدید سائنسی تحقیقات نے زمین پوری طرح تیار کر دی ہے۔

بنیادی عقائد کا اثبات | عقائد و ایمانیات میں قرآن حکیم سب سے زیادہ زور توحید، رسالت اور قیامت کے اثبات پر دیتا ہے اور بطور دلیل و ثبوت پوری کائنات اور اس کے حیرت انگیز نظام کو پیش کرتا ہے کہ کس طرح اس عالم مادی کی ہر چیز ایک متعین

اور لگے بندھے نظام کے تحت رواں دواں ہے۔ اس میں کسی قسم کا انتشار یا بدنظمی نہیں ہے۔ اس سے ایک اعلیٰ درجے کے مدبر و منتظم کی موجودگی کا پتہ چلتا ہے، جو اپنے افعال وصفات میں حد درجہ حیران کن ہے۔ جیسا کہ ارشاد باری ہے:

مَا تَرَىٰ فِي خَلْقِ الرَّحْمَٰنِ مِن تَفَاوُتٍ	تو خدائے رحمان کی صنعت میں کوئی
فَارْجِعِ الْبَصَرَ هَلْ تَرَىٰ مِن فُطُورٍ	خلل نہ دیکھے گا۔ تو دوبارہ نظر دوڑا
ثُمَّ ارْجِعِ الْبَصَرَ كَرَّتَيْنِ يَنقَلِبْ	کر دیکھ، کیا تجھے (کہیں بھی) کوئی شگاف
إِلَيْكَ الْبَصَرُ خَاسِئًا وَهُوَ حَسِيرٌ	نظر آتا ہے؟ تو پھر نگاہ ڈال کر دیکھ!
(ملک: ۳-۴)	تیری نگاہ تھکی ہوئی اور ناکام لوٹ آئے گی۔

نقاشِ فطرت کی یہ صنعت و کاریگری جمادات، نباتات، حیوانات اور سماوات ہر ہر عالم کا احاطہ کیے ہوئے ہے اور سب ہی میں اس کی صنعت و کاریگری کے نقوش اتنے انوکھے اور عجیب و غریب ہیں کہ خود سائنس دانوں کی عقل بھی سرگرداں ہے کہ وہ ان میں ودیعت شدہ خدائی قوانین و ضوابط (قوانین ربوبیت) کا صحیح صحیح حال کس طرح ضبط تحریر میں لائیں۔

قرآن حکیم نے انسان کو نظام کائنات میں غور و خوض کرکے صحیح عقلی و منطقی نتائج اخذ کرنے کی دعوت اسی لیے دی ہے تاکہ سائنسی نقطۂ نظر سے خدا کا وجود، اس کی وحدانیت اور اس کی قدرت و ربوبیت پوری طرح ثابت ہوجائے اور انسان کے لیے بغاوت و سرکشی کی مجال باقی نہ رہے۔ اس اعتبار سے قرآن مجید اور نظام کائنات یا قرآن مجید اور سائنس میں کوئی تعارض یا تصادم نہیں ہے۔ بلکہ قرآن مجید میں

نظام کائنات سے متعلق جو مجمل آیات و اشارات موجود ہیں ان کی تفصیل جدید سائنسی تحقیقات کے ذریعہ ہورہی ہے۔ گویا کہ جدید سائنس اور اس کے اکتشافات قرآنی حقائق پر مہر تصدیق ثبت کررہے ہیں۔ فرق صرف اجمال و تفصیل کا ہے۔ چنانچہ تحقیقات جدیدہ نے قرآن حکیم کا کوئی بھی بیان آج تک غلط ثابت نہیں کیا۔ جب کہ قدیم افکار و خیالات کی دنیا ہی بدل گئی ہے۔ اس اعتبار سے اس کتاب حکمت کا برحق اور من جانب اللہ ہونا پوری طرح آشکارا ہوجاتا ہے۔

قرآن میں بعض علوم کا اجمالی تذکرہ کتاب الٰہی میں ایسے بے شمار رموز و اسرار مذکور ہیں جن کی شرح و تفصیل جدید علوم کی روشنی میں بخوبی ہورہی ہے اور اس سے قرآن حکیم کا ایک نیا اعجاز سامنے آتا ہے اور یہ ایک ایسا وسیع علم ہے جس کی انتہا نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

يَا اَيُّهَا الْاِنْسَانُ مَا غَرَّكَ بِرَبِّكَ الْكَرِيْمِ۔ اَلَّذِىْ خَلَقَكَ فَسَوّٰكَ فَعَدَلَكَ۔ فِىْٓ اَىِّ صُوْرَةٍ مَّا شَآءَ رَكَّبَكَ (انفطار: ۶-۸)	اے انسان تجھے اپنے مہربان رب سے کس چیز نے برگشتہ کردیا؟ وہ رب جس نے تجھے پیدا کیا، تیرے اعضا کو سڈول بنایا اور پھر ان میں اعتدال و توازن رکھ دیا (غرض) اس نے تجھے جس صورت میں چاہا ڈھال دیا۔

مذکورہ بالا آیت کے متعلق امام غزالی تحریر فرماتے ہیں:۔

"ان آیات کریمہ کو کامل طور پر وہی شخص سمجھ سکتا ہے جو "تشریح اعضاء کا

ماہر ہو اور وہ انسان کے اندرونی اور بیرونی اعضاء ان کی تعداد ان کی حکمت اور ان کے منافع سے پوری طرح واقفیت رکھتا ہو" (جواہر القرآن ص ۴۶)

یہ اللہ تعالیٰ کے وہ "افعال" ہیں جو انسانی جسم کے عجائب سے تعلق رکھتے ہیں اور آج جسم انسانی کے مطالعہ کے لیے کئی علوم کی تدوین ہو چکی ہے جن میں علم الحیات (بیالوجی) علم تشریح (اناٹومی) علم افعال الاعضاء (فزیالوجی) اور طب جدید وغیرہ خصوصی اہمیت رکھتے ہیں۔ بہرحال صدیوں پہلے امام صاحب نے جو پیشین گوئی کی تھی وہ آج بہت بڑی حد تک صحیح نظر آتی ہے۔ مگر اتنے سارے علوم کی تدوین کے باوجود "انسان" کو پوری طرح سمجھا نہیں جا سکا ہے۔ بلکہ وہ ربوبیت کا ایک شاہکار ہونے کے باوجود سائنسی نقطۂ نظر سے ہنوز ایک معمہ بنا ہوا ہے۔ اس موضوع پر ڈاکٹر الکسس کیرل کی کتاب (MAN THE KNOWN) بڑی بصیرت افروز ہے۔ ان حقائق کے پیش نظر حسب ذیل آیت کریمہ کس قدر صداقت سے معمور ہے۔

وَمَا أُوتِيتُم مِّنَ الْعِلْمِ إِلَّا قَلِيلًا (بنی اسرائیل : ۸۵) اور تم کو بہت ہی تھوڑا علم دیا گیا ہے۔

اسی طرح اللہ تعالیٰ کے "افعال" میں سے آفتاب و ماہتاب کی گردش اور ان دونوں کے مقررہ منازل کی پہچان بھی ہے جو اس کے مقرر کیے ہوئے ہیں۔ چنانچہ ارشاد باری ہے :

اَلشَّمْسُ وَالْقَمَرُ بِحُسْبَانٍ۔ (رحمان : ۵) سورج اور چاند ایک حساب سے چل رہے ہیں۔

وَقَدَّرَهُ مَنَازِلَ لِتَعْلَمُوا عَدَدَ السِّنِينَ اور اس نے چاند کی منزلیں مقرر کیں

وَالْحِسَابِ۔ (یونس: ۵) تاکہ تم برسوں کا شمار اور حساب معلوم کرسکو۔

يُوْلِجُ الَّيْلَ فِي النَّهَارِ وَيُوْلِجُ النَّهَارَ وہ رات کو دن میں داخل کرتا ہے

فِي الَّيْلِ (فاطر: ۱۳/) اور دن کو رات میں۔

یہ اور اس قسم کی بعض دیگر آیات کو پیش کرتے ہوئے امام غزالی تحریر کرتے ہیں کہ چاند اور سورج کی گردش، ان کی منزلوں کا حال، ان کے کسوف وخسوف کی کیفیت اور شب و روز کے ہیر پھیر کی حقیقت وہی شخص جان سکتا ہے جو زمین اور اجرام سماوی کے احوال وکوائف سے (گہری) واقفیت رکھتا ہو اور یہ اپنی جگہ پہ ایک اہم علم ہے۔

(جواہر القرآن، ص ۴۶)

قرآن مجید میں کہیں کہیں حد درجہ اجمال ہے، جس کی مکمل تشریح وتفسیر کرنا عام انسان کے بس سے باہر ہے۔ چنانچہ حسب ذیل آیات ملاحظہ ہوں جن میں حد درجہ اعجاز وایجاز ہے۔

وَفِي الْأَرْضِ اٰيَاتٌ لِّلْمُوْقِنِيْنَ یقین کرنے والوں کے لیے زمین میں

وَفِيْ أَنْفُسِكُمْ أَفَلَا تُبْصِرُوْنَ (خدا کے وجود اور اس کی خلاقیت

(ذاریات: ۲۰-۲۱) و ربوبیت کی بہت سی) نشانیاں موجود ہیں اور خود تمہاری اپنی ہستیوں میں بھی کیا تم کو نظر نہیں آتا۔

ان دو آیات کی شرح وتفصیل میں کرۂ ارض اور انسانی اجسام میں ودیعت شدہ ان تمام سائنسی حقایق کو دلائل ربوبیت کے طور پر پیش کیا جا سکتا ہے جو ارضیات اور اس کے جغرافیائی امور، نباتیات، حیوانیات اور انسانیات (انسان کے حیاتیاتی اور نفسیاتی احوال وکوائف) سے متعلق ہوں چنانچہ ان آیات کی شرح وتفسیر میں علامہ

ابن قیم (م ۷۵۱ھ) نے صدیوں پہلے اپنی معرکۃ الآرا کتاب "التبیان فی اقسام القرآن" میں جو تفصیلات پیش کی ہیں وہ پڑھنے کے لائق ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ ان آیات کی شرح و تفصیل میں بلا مبالغہ اگر پورے سائنسی لٹریچر کو پیش کیا جائے تو بھی ان کی مکمل تفسیر نہیں ہوسکے گی۔ یہی مطلب ہے حسب ذیل آیت کریمہ کا:

قُلْ لَّوْ كَانَ الْبَحْرُ مِدَادًا لِّكَلِمٰتِ	کہدو کہ اگر میرے رب کی باتیں لکھنے
رَبِّيْ لَنَفِدَ الْبَحْرُ قَبْلَ اَنْ تَنْفَدَ	کے لیے سمندر بھی سیاہی بن جائے
كَلِمٰتُ رَبِّيْ وَلَوْ جِئْنَا بِمِثْلِهٖ	تو میرے رب کی باتیں ختم ہونے سے
مَدَدًا۔ (کہف: ۱۰۹)	پہلے سمندر ہی ختم ہوجائے، اگرچہ
	اس کی مدد کے لیے ہم اس جیسا ایک
	اور سمندر لے آئیں۔

قرآن مجید ایک بحر زخار اس طرح کی بہت سی مثالیں پیش کی جاسکتی ہیں، جن سے واضح ہوتا ہے کہ قرآن مجید میں مختلف علوم و فنون کے بارے میں جو اجمالی اشارات مذکور ہیں ان کو علی وجہ البصیرت سمجھنے کے لیے علوم و فنون کے سمندروں کی غواصی ضروری ہے۔ گویا کہ قرآنی اشارات مختلف علوم و فنون کے عناوین کی حیثیت رکھتے ہیں جن میں علوم و فنون کی روح کھینچ کر رکھ دی گئی ہے۔ یعنی کتاب الٰہی میں نظام کائنات سے متعلق ایسے اسرار و حقایق مذکور ہیں جن تک انسان کی رسائی مسلسل تحقیق اور غور و خوض کے ذریعہ صدیوں بعد ہوسکتی ہے۔ مگر کمال یہ ہے کہ افکار و نظریات کی تبدیلیوں کا ان پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ بلکہ ہر نئے اکتشاف کی بدولت کتاب الٰہی کا چہرہ مزید روشن ہوجاتا ہے۔ چنانچہ جدید سے جدید تر کسی بھی سائنسی تحقیق نے قرآن عظیم کا کوئی بھی بیان آج تک

غلط ثابت نہیں کیا۔ بلکہ کلام الٰہی کے اسرار دن بدن کھلتے چلے جا رہے ہیں۔ کیا یہ اس کتاب کے برحق اور من جانب اللہ ہونے کا ثبوت نہیں ہے؟ اس سے بڑا علمی ثبوت اور کیا ہو سکتا ہے؟

دو قسم کے حقایق | قرآن میں دو قسم کے سائنسی حقایق بیان کیے گئے ہیں، جن کا تعلق مادی مظاہر سے ہے۔ ایک تو وہی مذکورہ بالا قسم کے اجمالی بیانات اور دوسرے اس مادی کائنات اور اس کی مشنری سے متعلق بعض راز کی باتیں یا "اسرار ربوبیت" جو مجاز و کنایہ اور تشبیہ واستعارہ کی صورت میں بیان کیے گئے ہیں، جن کا صحیح مفہوم سائنسی علوم کی ترقی کے بعد واضح ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر نباتات بھی جوڑے جوڑے (نر و مادہ کی شکل میں) ہوتے ہیں، یہ حقیقت قرآن عظیم میں صراحتاً مذکور ہے۔ مگر اس انکشاف کے ظاہر ہونے تک اس کو مجازی معنی میں لیا گیا۔ چنانچہ لفظ "زوج" کے معنی میاں یا بیوی نیز نر یا مادہ کے بھی آتے ہیں اور مجازاً قسم یا صنف کے بھی۔ قرآن مجید میں صراحتاً کہا گیا ہے:

سُبْحَانَ الَّذِیْ خَلَقَ الْاَزْوَاجَ	پاک ہے وہ ذات برتر جس نے تمام
کُلَّھَا مِمَّا تُنْبِتُ الْاَرْضُ وَمِنْ	جوڑے بنائے، زمین سے اگنے والی
اَنْفُسِھِمْ وَمِمَّا لَا یَعْلَمُوْنَ۔	چیزوں میں بھی اور خود انسانی ہستیوں
(یٰسین: ۳۶)	میں بھی، نیز ان چیزوں میں بھی جن کو
	یہ لوگ نہیں جانتے۔

پیڑ پودوں میں نر و مادہ کا پایا جانا ایک جدید ترین حقیقت ہے جس کا انکشاف قرآن مجید نے چودہ سو سال پہلے ہی کر کے اپنے کلام برحق ہونے کا ثبوت پیش کر دیا ہے لیکن اس آیت کریمہ میں ایک ایسا اصول اور کلیہ بھی بیان کیا گیا ہے جو خود سائنس کے لیے

ایک دعوت فکر ہے۔ یعنی اس کائنات مادی میں حیوانات و نباتات کے علاوہ اور بھی بہت سی چیزیں ایسی ہیں جو جوڑوں (ازواج) کی شکل میں ہیں، مگر انسان انہیں نہیں جانتا۔ قرآن مجید کا یہ کلیہ کبھی ٹوٹ نہیں سکے گا۔ خواہ انسان حیوانات و نباتات کے علاوہ بھی کچھ مزید اشیاء میں جوڑوں کی موجودگی کا پتہ لگالے۔ یہ ربانی کلمات صداقت سے معمور اور شک و شبہہ سے بالاتر ہیں۔

قرآن تمام علوم کا جامع | کتاب الٰہی ایک جامع صحیفہ ہے۔ یہ ازل سے ابد تک کے تمام علوم و معارف کا جامع اور رازہائے کائنات کا امین ہے۔ چنانچہ ارشاد باری ہے:

مَا فَرَّطْنَا فِي الْكِتٰبِ مِنْ شَيْءٍ۔ (انعام: ۳۸)	ہم نے اس کتاب میں کوئی کوتاہی نہیں کی۔
وَنَزَّلْنَا عَلَيْكَ الْكِتٰبَ تِبْيَانًا لِّكُلِّ شَيْءٍ۔ (نحل: ۸۹)	ہم نے آپ پر ایسی کتاب اتاردی ہے۔ جو ہر چیز کی خوب وضاحت کرنے والی ہے۔

نیز ایک حدیث کے مطابق خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے: فِيهِ نَبَأُ مَا قَبْلَكُمْ وَخَبَرُ مَا بَعْدَكُمْ، وَحُكْمُ مَا بَيْنَكُمْ: قرآن میں تم سے پہلے کی خبریں بھی ہیں اور تمہارے بعد کی بھی اور اس میں تمہارے آپس کے معاملات کے درمیان فیصلہ کرنے والی چیز بھی موجود ہے۔ (ترمذی)

حضرت ابن مسعودؓ سے مروی ہے کہ "جسے علم کی تلاش ہو وہ قرآن کو لازم پکڑے۔ کیونکہ اس میں اگلے اور پچھلے تمام لوگوں کی خبریں موجود ہیں۔" (سنن سعید بن منصور، بحوالہ الاتقان)

علامہ جلال الدین سیوطیؒ (م ۹۱۱ھ) تحریر کرتے ہیں کہ کتاب اللہ میں ہر چیز کا

تذکرہ موجود ہے۔ چنانچہ مختلف علوم کا کوئی باب یا کوئی مسئلہ ایسا نہیں ہے جو اس میں مذکور نہ ہو۔ اس میں مخلوقات کے عجائب اور زمین و آسمان کے غرائب وغیرہ ہر چیز کا بیان موجود ہے۔ (الاتقان فی علوم القرآن، ۴/۳۳)

امام غزالیؒ نے پانچویں صدی ہی میں ایک ایسا فکر انگیز خیال ظاہر کیا ہے جو ان کی علمی بصیرت اور ژرف نگاہی پر دلالت کرتا ہے۔ فرماتے ہیں:

"امکانی طور پر ایسے بہت سے علوم ہو سکتے ہیں جو ابھی تک وجود میں نہیں آسکے ہیں مگر ان تک انسان کے پہنچنے کا امکان ہے اور ایسے بھی علوم ہیں جن کا انسانی عقل ادراک نہیں کر سکتی۔ مگر قرآن مجید میں ان تمام علوم کا تذکرہ پایا جاتا ہے اور وہ ایک بحر بے کراں ہے، جس کے ساحل کا پتہ ہی نہیں چلتا۔ وہ معرفت الٰہی اور اسکے "افعال" کا ایک سمندر ہے۔ (خلاصہ از جواہر القرآن ص ۴۴ - ۴۵)

ربوبیت کے جلوے قرآن عظیم نوع انسانی کو پوری طرح جھنجھوڑتے ہوئے کہتا ہے کہ زمین اور اجرام سماوی کی تخلیق میں غور کرو، دن رات کے ہیر پھیر کو دیکھو، ہوا اور بارش کے نظام کا جائزہ لو، حیوانات و نباتات کے عجائب و غرائب کا مشاہدہ کرو، آفتاب و ماہتاب کی حرکات کو غور سے دیکھو۔ غرض دنیا کی ہر چیز اور ہر مظہر فطرت کا باریک بینی کے ساتھ مطالعہ کرو تو ان کی مشنری میں تم کو انتہا درجے کی تنظیم، منصوبہ بندی، وحدت، حسن کاری، صنعت گری اور فنی مہارت کی جھلکیاں نظر آئیں گی۔ چنانچہ ایک خلاق، منصوبہ ساز اور ایک عظیم ترین مدبر ہستی کا وجود تسلیم کیے بغیر ان نفیس ترین ضوابط کی توجیہ ممکن نہیں ہو سکتی۔ دراصل یہ سب ربوبیت کے وہ جلوے ہیں جن سے صرف نظر کرنا ممکن نہیں ہے، سوائے غافل انسانوں کے۔

کائنات مادی افعال الٰہی کی آماجگاہ | خلاصۂ بحث یہ ہے کہ پوری کائنات اور اس کے تمام مظاہر افعال الٰہی کا مظہر ہیں، جن کے مطالعہ و مشاہدہ سے صفات الٰہی کا جلوہ نظر آتا ہے اور صفات الٰہی کے جائزہ سے ذات باری تعالیٰ کا نظارہ ہوتا ہے، جو ربوبیت و الوہیت کے بھیس میں جلوہ گر اور اس عالم مادی پر حکمرانی کر رہی ہے اور جس کے حکم کے بغیر اس عالم رنگ و بو کا ایک ذرہ بھی اِدھر سے اُدھر نہیں ہو سکتا۔ یہ پوری کائنات افعال الٰہی کا مجموعہ ہے جو عالم انسانی کو یہ دعوت فکر دے رہی ہے کہ اس کے حیرت انگیز نظام کا مطالعہ کر کے اس کے خالق و مربی کو پہچانا جائے، واقعہ یہ ہے کہ اس کائناتِ مادی کے ایک ذرہ (ایٹم) کا دل بھی اگر چیر کر دیکھا جائے تو اس میں اسباق و بصائر کا ایک لامتناہی سلسلہ نظر آئے گا جو وجود باری اور اس کی بے مثال قدرت و ربوبیت پر دلالت کرنے والا ہوگا۔ چنانچہ ایک عربی شاعر نے کیا خوب کہا ہے ؎

للّٰہ فی کل تحریکۃٍ	و فی کل تسکینۃٍ لہ شاھدٌ
و فی کل شیئٍ لہ آیۃٌ	تدل علی انہ واحدٌ

یعنی ہر (چیز میں موجود) حرکت و سکون اللہ کے وجود پر گواہ ہے اور دنیا کی ہر چیز میں اس کی ایک نشانی ہے جو اس بات پر دلالت کر رہی ہے کہ اللہ واحد ہے۔

شرک کا نیا روپ | کہتے ہیں کہ تاریخ اپنے آپ کو دہراتی ہے۔ یعنی وہی قدیم احوال و کوائف بھیس بدل بدل کر ہمارے سامنے آتے رہتے ہیں، خواہ زمانہ کتنی ہی ترقی کیوں نہ کر لے۔ چیز ایک ہوتی ہے مگر اس کے رنگ و روپ مختلف ہوتے ہیں۔ چنانچہ آج شرک بھی ہمارے سامنے ایک نئے انداز میں جلوہ گر نظر آ رہا ہے، جو مادیت کا چوغہ زیب تن کیے ہوئے ہے چنانچہ قدیم مشرکین اور جدید منکرین (مادہ پرستوں)

کی ایک مشترکہ خصوصیت یہ نظر آتی ہے کہ مشرکین خدائی صفات کو دوسری ہستیوں کی طرف منسوب کرتے ہیں۔ جب کہ انہی خدائی صفات کو موجودہ ملحدین و مادہ پرست "مادہ" (MATTER) کی طرف منسوب کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ مادہ اپنے وجود کی آپ ہی علت ہے اور یہ وہ رحم مادر ہے جس سے ساری چیزیں خود بخود ظہور میں آرہی ہیں۔ وہ بغیر خداؤں کی مداخلت کے اپنے آپ ہی سب کچھ کرلیتا ہے۔ اس طرح انہوں نے خدا کی جگہ مادہ کو بٹھا دیا ہے اور اس لحاظ سے دونوں ایک ہی صف میں کھڑے نظر آتے ہیں۔ اگر کچھ فرق ہے تو صرف اتنا کہ مشرکین خدا کی خدائی میں دوسرے معبودوں کو شریک کرنے کے باوجود ایک رب الارباب یا سب سے بڑے خدا کا وجود تسلیم کرتے ہیں۔ جب کہ مادہ پرستوں کے نزدیک مادہ ہی واحد اور سب سے بڑا "خدا" ہے۔

اس اعتبار سے توحید اور شرک کا معرکہ آج بھی درپیش ہے لہذا اس نئے شرک سے پنجہ آزمائی کے لیے ہمیں خود کو سائنسی ہتھیاروں سے مسلح کرنا پڑے گا۔ ورنہ یہ بھوت اترنے والا نہیں۔ چنانچہ اسی مقصد کے تحت قرآن حکیم نے مظاہر کائنات اور ان کے نظام کا ذکر کرکے نہ صرف اپنا داعیانہ وہادیانہ کردار ادا کیا ہے بلکہ اہل اسلام کے ذمہ یہ فریضہ بھی عائد کیا ہے کہ وہ قرآنی مقاصد کے مطابق جدید سے جدید تر تمام علوم میں کمال حاصل کرکے نوع انسانی کو راہ راست پر لائیں ؎

ستیزہ کار رہا ہے ازل سے تا امروز چراغ مصطفوی سے شرار بولہبی

فقیہ و متکلم کا درجہ | علم احکام کی تنقیح کرنا فقیہ کا کام ہے اور علم مجادلہ (مباحثہ) کی توضیح متکلم کا ذمہ ہے۔ چنانچہ امام غزالی فرماتے ہیں کہ:

" نقیہ اور متکلم کا درجہ قریب قریب یکساں ہے۔ فرق یہ ہے کہ ایک فقیہ کی ضرورت عموماً زیادہ ہوتی ہے۔ جبکہ ایک متکلم کی ضرورت شدید ہوجاتی ہے اور دینی مصلحتوں کے لحاظ سے ان دونوں کی ضرورت یکساں ہے۔ فقیہ کی حاجت کھانے پینے اور شادی بیاہ وغیرہ کے خصوصی احکام کے سلسلے میں اور متکلم کی ضرورت گمراہ اور بدعتی لوگوں کے ضرر سے بچنے اور ان کے ساتھ بحث و مباحثہ کرنے کی غرض سے رہتی ہے تاکہ اہل اسلام کو ان کے شر سے محفوظ رکھا جاسکے"۔ (جواہر القرآن ص ۲۰)

قرآن فطرت و شریعت کا جامع | غرض قرآن حکیم محض شرعی مسائل ہی کی کتاب نہیں بلکہ وہ تکوینی (طبیعی) امور و مسائل میں بھی ہماری مکمل رہنمائی کرتا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ وہ فطرت و شریعت کا ایسا جامع دستور العمل ہے جس کی نظیر پیش کرنے سے پورا انسانی لٹریچر عاجز ہے۔ لہذا ہمیں اس معاملے میں مکمل توازن سے کام لیتے ہوئے ان دونوں کے ساتھ صحیح انصاف کرنا چاہیے ورنہ عالم انسانی کی رہنمائی نہیں ہوسکتی۔ اہل اسلام کو "خیر امت" اسی لیے قرار دیا گیا ہے کہ وہ اقوام عالم کی صحیح قیادت کرکے انہیں راہ راست پر لائیں مگر چونکہ آج اقوام عالم جدید علوم کے نشہ میں سرشار ہیں اس لیے ان علوم میں کمال حاصل کرکے کھرے اور کھوٹے کی نشاندہی کیے بغیر ان کو راہ راست پر لانا ممکن دکھائی نہیں دیتا۔ لہذا اہل اسلام اٹھیں اور قرآن حکیم کی رہنمائی میں ان کا یہ سب سے بڑا فریضہ ادا کرکے اپنے فرض منصبی سے سبکدوش ہوں،

ایک نئے فکری انقلاب کی ضرورت | موجودہ دور میں اہل اسلام کا فریضہ یہ ہے کہ وہ جدید سائنسی علوم کا تحقیقی نقطۂ نظر سے صحیح مطالعہ کرکے ان میں سرایت کردہ الحاد و مادیت کے جراثیم باہر نکالیں اور ان تمام علوم کی خداپرستانہ طور پر تشریح و توجیہ کرکے

خداوند کریم کی ربوبیت ثابت کریں۔ ورنہ کلمہ الٰہی کا بول بالا نہیں ہوسکتا اور یہ عالم اپنی تہ بہ تہ تاریکیوں کے غار سے کبھی باہر نہیں آسکتا۔ واضح رہے اس کائنات میں کارفرما حیرت انگیز نظام کے مشاہدہ سے خود سائنس داں ورطۂ حیرت میں مبتلا ہیں اور بہت سے سائنس داں اس کی مادہ پرستانہ تشریح و توجیہ سے مطمئن نہیں ہیں مگر خداپرستانہ نقطہ نظر سے مطمئن کرنے والی کوئی متبادل چیز ان کے سامنے نہیں آسکی ہے۔ اس لیے وہ بھی حیران و سرگرداں ہیں۔ لہذا یہ فریضہ قرآن حکیم کی روشنی میں صرف اور صرف امت مسلمہ ہی انجام دے سکتی ہے۔ بشرطیکہ وہ اپنے منصب علمی کا صحیح معنی میں احساس کرلے اور پھر اس میدان میں عملی اقدام کے لیے تیار ہوجائے۔ جب تک یہ نہیں ہوگا عالم انسانی کی فکری و نظریاتی حیثیت سے اصلاح نہیں ہوسکے گی۔ عالم انسانی میں ایک فکری انقلاب لانا خود امت مسلمہ کے فکری انقلاب پر موقوف ہے اور اس مقصد کے لیے ایک خصوصی جماعت تیار کرنا مسلمانوں کے ذمہ فرض ہے۔ ورنہ وہ خدا کے نزدیک مجرم ہوں گے۔ اس وقت ضرورت ایک بہت بڑے علمی جہاد کی ہے اور اہل اسلام کو اس علمی جہاد کے لیے خود کو تیار کرنا ہوگا۔ حسب ذیل آیت کریمہ کے مطابق اہل اسلام کا منصب ہی نوع انسانی کی صحیح رہنمائی ہے:

كُنْتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَأْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ (آل عمران: ۱۱۰)

تم بہترین امت ہو جو نوع انسانی کے لیے برپا کی گئی ہے (اور تمہارا منصب یہ ہے کہ) تم معروف (عقلی و شرعی اعتبار سے درست بات) کا حکم کرتے ہو اور منکر (عقلی و شرعی

اعتبار سے غلط بات) سے روکتے ہو۔

قرآن عظیم پوری نوع انسانی کو مخاطب کرتے ہوئے کہتا ہے:

هٰذَا بَلٰغٌ لِّلنَّاسِ وَلِيُنْذَرُوْا بِهٖ وَلِيَعْلَمُوْٓا اَنَّمَا هُوَ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ وَّلِيَذَّكَّرَ اُولُوا الْاَلْبَابِ۔ (ابراہیم: ۵۲)	یہ قرآن تمام لوگوں کے لیے ایک (واضح) پیغام ہے، تاکہ لوگوں کو اس کے ذریعہ ڈرایا جائے اور وہ جان لیں کہ (اس کائنات میں) وہی ایک معبود ہے اور ارباب عقل متنبہ ہوسکیں۔
وَلَقَدْ ضَرَبْنَا لِلنَّاسِ فِيْ هٰذَا الْقُرْاٰنِ مِنْ كُلِّ مَثَلٍ لَّعَلَّهُمْ يَتَذَكَّرُوْنَ۔ (زمر: ۲۷)	اور ہم نے لوگوں کے لیے اس قرآن میں ہر قسم کی مثال بیان کردی ہے تاکہ وہ چونک سکیں۔

شاہان مغلیہ اور سلاطین عثمانی کے عہد میں

حج کے راستوں کی حفاظت کا مسئلہ

از پروفیسر نعیم الرحمٰن فاروقی۔ آکسفورڈ

مترجم جناب محمد اکرم ندوی، آکسفورڈ

(۲)

اورنگ زیب مکہ مکرمہ کے بحری راستہ کو تحفظ فراہم کرنے پر مصر نظر آتا ہے سورت کے گورنر کے نام متعدد شاہی فرامین جاری کیے گئے جن میں اسے ہدایت کی گئی کہ اراضی مقدسہ کے مسافرین اور حجاج کرام کے تحفظ کی پوری کوشش کرے[1] میر آتش (توپ خانہ کے سربراہ) کو ہدایت کی گئی تھی کہ اسلحہ جات کے شعبہ کے فرنگیوں سے دریافت کرے کہ کس طرح قزاقوں کو سزا دی جائے اور سمندری راستوں کو مقامات مقدسہ کے زائرین اور تجار کے لیے کس طرح کھلا رکھا جائے؟ دوستی اور مصالحت سے؟ یا طاقت اور جنگ سے[2]۔ اورنگزیب نے یہ بھی تجویز پیش کی کہ قزاقوں کو سزا دینے کے لیے ایک

---

[1] KALIMAT-I-TAYYIBAT, P. 31, JADU NATH SARKAR, HISTORY OF AURANGZIB (NEW DE-HI, 1972, V. 265, SARKAR, THE AFFAIRS OF THE ENGLISH FACTORY AT SURAT 1694-1700, PIHRC,

(بقیہ حاشیہ ص ۲۵ پر)

طاقتور بحری بیڑہ قائم کیا جائے۔ لیکن منوچی لکھتا ہے کہ تجربہ کار ملاحوں کی کمی نے اورنگزیب کو اس منصوبہ کے ملتوی کرنے پر مجبور کر دیا[۱]۔ ایک مغل بحری بیڑہ کی کمی کو پورا کرنے کے لیے ۱۶۷۰ء میں ایک ماہر بحری کپتان سیدی یاقوت خاں کو شاہی خدمت میں شامل کر لیا گیا، سیدی کو ہدایت کی گئی کہ سمندری راستوں پر حجاج کرام اور تجارتی جہازوں کی حفاظت کریے جس کے لیے تین لاکھ روپے سالانہ معاوضہ طے کیا گیا[۲]۔ سیدی کا بحری بیڑہ اگر چہ

(بقیہ حاشیہ ص ۲۴) V, (1923) 10, S. H. ASKARI, MUGHAL NAVAL WE-

KALIMAT-I-TAYYIBAT, P. 53, ASKARI MUGAL- ۱۴ - AKNESS.

MANUCCI, STORIO DO MOGOR, II. ۱ - NANAL WEAKNESS, P.8

2-5-40 ۲ حبشہ کا باشندہ سیدی یاقوت خاں کوکن کے گورنر فتح خاں کا غلام تھا، خوانی خاں کے بیان کے مطابق جب فتح خاں نے جنجیرہ کا قلعہ شیواجی کے حوالے کرنے کا فیصلہ کیا تو سیدی یاقوت اور دوسرے دو غلاموں سنبل اور خیریت نے اس (فتح خاں) کی مخالفت کی اور اسے مقید کر کے قلعہ پر قبضہ کر لیا اور سنبل کو اپنا قائد منتخب کر کے مغلوں کی بالادستی قبول کر لی۔ سنبل کی وفات کے بعد یاقوت قلعہ کا مالک ہو گیا، اس نے دندا راجپوری کو شیواجی سے حاصل کیا اور سات دوسرے مرہٹا قلعوں پر قبضہ کر لیا، ان کامیابیوں کی وجہ سے اورنگزیب نے یاقوت کے منصب میں اضافہ کر دیا، اسے خان کا لقب عطا کیا اور سرکاری طور پر اسے دندا راجپوری کا مغل فوجدار بنا دیا، اسے مکہ مکرمہ کے بحری راستہ کی نگرانی کی ذمہ داری بھی سونپی گئی، مرآۃ احمدی کے بیان کے مطابق اس خدمت کے صلہ میں اسے ایک لاکھ پچاس ہزار روپے سالانہ ملتے تھے، انگلش فیکٹری ریکارڈز سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ رقم چار لاکھ سالانہ تھی، سیدی یاقوت خاں کے حالات کے لیے ملاحظہ ہو: منتخب اللباب ۲/۳-۲۲۲۸، ۲۵۳، ۲۰۰-۵۱۳، ۵، علی احمد خاں: مرآۃ احمدی (بقیہ حاشیہ ص ۲۶ پر)

بڑی کشتیوں اور بھاری ہتھیاروں سے لیس تھا لیکن یوروپین قزاقوں کے جہازوں سے اس کا کوئی مقابلہ نہیں تھا،[1] نتیجتاً وہ ہندوستانی جہازوں اور حجاج کا دفاع نہ کرسکا۔

۱۶۹۵ء میں سمندری راستوں کی قزاقی پر قابو پانے کے لیے اورنگزیب نے یوروپین تجارتی کمپنیوں کو مجبور کیا کہ پابندی کے ساتھ ہر سال حجاج کرام کی سواریوں کو جنگی جہازوں کی مرافقت فراہم کریں[2] اور چار سال بعد اس نے ان کو ایک مچلکہ پر دستخط کرنے پر مجبور کیا، جس میں انہوں نے عہد کیا کہ قزاقی کا قلع قمع کر دیں گے اور جہازوں کے تاراج ہونے کی حالت میں مالکان کو معاوضہ ادا کریں گے، معاہدہ کے مطابق ڈچ

(بقیہ حاشیہ ص ۲۵) (برودہ، ۱۹۲۷ - ۸) ۱/۲۷۳ - ۴، نیز ملاحظہ ہو: ARNOLD WRIGHT, ANNESLEY OF SURAT AND HIS TIMES (LONDON, 1918), PP. 70, 124-38, K.M. PANIKKAR, INDIA AND THE INDIAN OCEAN: AN ESSAY ON THE INFLUENCE OF SEA POWER ON INDIAN HISTORY (LONDON, 1945) P. 58, COMMISSARIAT, GUJARAT, iii. 395-99, ASHIN DAS GUPTA, TRADE, AND POLITICS IN 18TH CENTURY INDIA, ISLAM AND THE TRADE OF ASIA, ED. D.S. RICHARDS (OXFORD, 1970) P. 192

[1] WRIGHT, ANNESLEY, P. 130

[2] ۱۶۹۵ء میں شاہی حج کے جہاز گنج سوائی پر انگریز قزاقوں کی غارت گری کے جواب میں یہ اقدام کیا گیا، خوافی خاں کے بیان کے مطابق جہاز جدہ سے باون لاکھ روپیوں کی قیمت کے سونے اور چاندی لیکر لوٹ رہا تھا، خزانہ لوٹ لیا گیا، حاجیوں کی توہین کی گئی اور خواتین کی بے حرمتی کی گئی، منتخب اللباب ۲/۴۲۱-۴۴ نیز ملاحظہ ہو: WRIGHT, ANNESLEY, PP. 162-89, SARKAR, HISTORY, v. 261-3, COMMISSARIAT, GLJARAT, iii. 448-9.

حجاج کرام کے ساتھ جدہ جاتے اور بحر احمر میں داخلہ کی حفاظت کرتے، انگریز جنوبی ساحل کے ذمہ دار تھے اور فرانسیسیوں کو خلیج فارس کی نگرانی کرنی تھی[1] لیکن یہ اقدامات بھی تقریباً غیر موثر ثابت ہوئے، سنہ ۱۷۰۱ء اور سنہ ۱۷۰۳ء میں متعدد مغل جہازوں پر حملے ہوئے اور ان کو لوٹ لیا گیا۔

کرایہ کے جہازوں اور اہل یورپ کے تعاون سے مکہ مکرمہ کے سمندری راستہ کو تحفظ فراہم کرنے میں ناکام ہونے کے بعد اورنگزیب نے مسقط کے عرب قزاقوں کی طرف رخ کیا جو بحری طاقت میں مشہور تھے۔ سورت کے گورنر کو احکام دیے گئے کہ جنگی سواریوں کے حصول اور ان کے تعاون سے انگریز اور ڈچ قزاقوں کو سزا دینے کے لیے مسقط والوں سے معاہدہ کرلے، گورنر کو مسقط والوں سے یہ بھی درخواست کرنی تھی کہ ہندوستانی حجاج کو بحفاظت ان کی منزل پر پہونچا دیں[2]، ساتھ ہی اورنگزیب کے پوتے ملتان کے گورنر معزالدین کو حکم دیا گیا کہ وہ اپنے کسی معتمد کے ہاتھ قیمتی تحائف

---

[1] سنہ ۱۶۹۸ء میں انگریز اور ڈچ قزاقوں کی سرگرمیوں کے جواب میں یہ تادیبی کارروائی کی گئی تھی۔

SARKAR, AURANGZIB, V. 267-8, WRIGHT ANNESLEY, PP. 190-207, MAHARASHTRA STATE ARCHIVES, PRESIDENCY RECORDS, SECRETRIAT OUTWARD LETTER BOOK, NO. 6, 1697-9, PP. 229-30, ASHIN DAS GUPTA, GUJARATI MERCHANTS AND THE RED SEA TRADE, THE AGE OF PARTNERSHIP. EUROPEANS IN ASIA BEFORE DOMINIONS. ED BLAIR B. KING AND M.N (HONOLULU, 1979) PP. 124-31

مسقط کے شیخ کے پاس بھیجے اور اسے یوروپ کے قزاقوں کے خلاف جنگ کرنے پر آمادہ کرے جس کے بدلہ میں مغل ایران کے خلاف اس کی مدد کریں گے، سقط کے حاکم کو اس پر آمادہ کرے کہ دربار عالی کی طرف توجہ کرے، اسے اس کا اشارہ دیا جائے کہ ایرانی بادشاہ مسقط کی جانب ایک فوج روانہ کرنا چاہتا ہے اور اسے بہترین انداز سے اس کی یقین دہانی کرائی جائے کہ اس سلسلہ میں اسے ہندوستان سے مدد اور تعاون حاصل ہو سکتا ہے[۱]۔ آخر میں اورنگ زیب کے فرزند شہزادہ محمد اعظم والی گجرات کو بتایا گیا کہ اورنگ زیب کو آراضی مقدسہ کا رخ کرنے والے جہازوں کی حفاظت کے مشترکہ مقصد کی وجہ سے مسقط کے ساتھ اتحاد قائم کرنے کی امید ہے[۲]۔

بظاہر معلوم نہیں ہوتا کہ اورنگ زیب نے حاکم مسقط کے ساتھ باقاعدہ کوئی اتحاد قائم کر لیا، کسی مغل واقعہ نگار نے اس کا تذکرہ نہیں کیا ہے، منتخب اللباب کا مصنف خوافی خاں بھی جس نے بحر ہند میں انگریز قزاقوں کی سرگرمیوں کا تذکرہ کیا ہے اس اتحاد کی طرف کوئی اشارہ نہیں کرتا، غالباً مجوزہ انضمام ایک خیال رہا جو کبھی شرمندۂ تعبیر نہ ہو سکا، بہرحال داخلی مسائل کے مقابلہ کے لیے بیرونی امداد کی خواہش وطلب یوروپ کے بحری تفوق کے سامنے مغلوں کی بے بسی کو ظاہر کرتی ہے، ساتھ ہی اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اورنگ زیب ہندوستان سے حج کے راستہ کے تحفظ کے لیے کس قدر متفکر تھا، اس نے حجاج کرام کو محفوظ رکھنے کی مکمل کوشش کی لیکن اس کی ساری جدوجہد رائگاں گئی۔ بحر ہند کی نگرانی کے لیے جنگی بیڑہ کی کمی سے بے بس ہو کر یوروپ کی قزاقی کے سامنے اس نے گھٹنے ٹیک دیے۔ ہندوستانی مسلمانوں کے لیے ابھی کچھ اور مدت تک مکہ مکرمہ کا

---

[۱] حوالہ سابق، ص، [۲] کلمات طیبات، ص ۹۵، ۱۳۹۔۴۰، مرآۃ احمدی ۱/۳۵۳۔۴ ۵۔

سفران خطرات کے باوجود کرنے کے سوا اور کوئی دوسرا چارہ نہ تھا۔

اورنگزیب کے کمزور جانشین سمندر میں اہل یوروپ پر قابو پانے کی اہلیت نہیں رکھتے تھے، سلطنت مغلیہ کے زوال، گجرات میں مراٹھوں کے حملہ اور سورت کے حصول کے لیے مغل امرا کی داخلی کشیدگی سے حوصلہ پاکر یوروپ کی کمپنیوں نے کھلے طور پر سورت کے سوداگروں پر اپنی بہادری دکھانا شروع کردی اور حج کے راستہ پر پابندی عائد کردی۔ ۱۷۰۳ء کے بعد ڈچ نے حج کے جہازوں کو لے جانا بند کر دیا[1] ۱۷۳۴ء میں برٹش ایسٹ انڈیا کمپنی کے جنگی جہازوں نے سورت کا محاصرہ کرلیا، تمام کشتیوں پر قبضہ کرلیا گیا اور حج کا راستہ بند رکھا گیا یہاں تک کہ طویل گفت و شنید کے بعد برطانوی بیڑہ کے کپتان نے حج کے صرف ایک جہاز کو روانہ ہونے کی اجازت دی[2]

اس کے برخلاف عثمانیوں کو اپنی رعایا کے لیے مکہ مکرمہ کے راستوں کو آزاد رکھنے میں کوئی دشواری نہیں تھی۔ سلطنت عثمانیہ کو مکہ مکرمہ سے جوڑنے والے حج کے تمام راستے عثمانیوں کے زیر اقتدار تھے۔ حج کے قافلے جو عثمانی سلطان کی نگرانی میں منظم کیے جاتے تھے مکہ مکرمہ کا سفر کسی رکاوٹ اور ظلم و تشدد کے خوف کے بغیر کرتے تھے۔ عثمانی سلاطین کی خادم الحرمین الشریفین کی حیثیت جس کی حفاظت وہ پورے جوش سے کرتے تھے اور جس کا فخریہ اعلان کرتے اور عالم اسلام کی خلافت کے ان کے دعوے کے پیش نظر

---

[1] MSA, SURAT FACTORY DIARY, NO. 3, 1701-4, P. 129a

سورت کے زوال اور گجرات میں مغل انتظامیہ کے خاتمہ کے لیے ملاحظہ ہو: مرآۃ احمدی ۱/۳۹۲-۴۰۱،

نیز ملاحظہ: ASHIN DAS GUPTA, TRADE, PP. 181-214.

[2] COMMISSARIAT, GUJARAT, iii. 558-9.

مسلمانوں کے سفر حج کے لیے سہولیات فراہم کرنا ان کا فرض تھا۔ یہ مختلف حیثیتوں سے بہت ہی اہم کام تھا، موجود شہادتیں بتاتی ہیں کہ عثمانی سلاطین نے ان ذمہ داریوں کو کم سے کم سولہویں صدی کی حد تک برضا و رغبت پورا کیا، پرتگالیوں اور ایرانیوں کے ساتھ ان کی کشیدگیاں اس کا کافی ثبوت فراہم کرتی ہیں۔

عثمانی سلاطین ان خطروں سے بخوبی واقف تھے جو مشرق سے حج کے راستہ میں پرتگالیوں کے ہاتھوں پیش آتے تھے، بحر احمر میں پرتگالیوں کی موجودگی کے اثرات اور مقدس شہروں کے خلاف ان کے منصوبوں سے وہ بخوبی واقف تھے۔ پرتگالیوں کے خلاف جنگ میں سلطان بایزید دوم (۱۴۸۱-۱۵۱۲) نے مصر کے مملوک سلطان کے ساتھ تعاون کیا تھا[1] اور ۱۵۱۷ء کے بعد عثمانی سلاطین نے خصوصی طور پر خود کو اراضی مقدس کے دفاع کے لیے وقف کر دیا تھا، پرتگالیوں کو بحر احمر سے دور رکھنا ان کے لیے بڑی اہم بات تھی۔ انڈریو سی۔ ہس لکھتا ہے "اپنی غازیانہ روایت سے سچی وابستگی کی وجہ سے عثمانی خاندان ان حصار بند مسلم ریاستوں اور نہر سوئز کے مشرق میں واقع تجارتی مراکز کے مسلم ہیرو بنے ہوئے تھے جن پر پرتگالی امپیریلزم کا انحصار تھا[2]" قدیم

---

[1] MICHEL M. MAZZOUI, GLOBAL POLICIES OF SULTAN SELIM, 1512-20, ESSAYS ON ISLAMIC CIVILIZATION, ED, DONALD P. LITTLE (LEIDEN, 1976), P. 235, STRIPLING, TURKS AND ARABS, P. 32. [2] ANDREW C. HESS, THE OTTOMAN SEABORNE EMPIRE 1453-1525 AMERICAN HISTORICAL REVIEW, lXXV (1970), 1, 911-

تجارتی راستوں کی پرتگالیوں کی حصار بندی کے نتیجہ میں ہندوستانی تجارت سے آمدنی کے نقصان اور نتیجتاً مصر، مشرقی بحر متوسط کی ریاستوں اور نیز عثمانی سلطنت میں معاشی بحران عثمانیوں کے لیے اضافی محرک تھے کہ پرتگالیوں کو بحر ہند سے باہر نکال دیں[1]۔ ہندوستانی حکمرانوں کے ساتھ سلطان سلیم اول (۱۵۱۲۔۱۵۲۰) کی خط وکتابت شہادت دیتی ہے کہ عثمانی مصر تھے کہ بحر احمر اور بحر ہند میں پرتگالیوں کی بحری برتری کا خاتمہ کر دیں[2]۔ ۱۵۱۹ء میں سلطان نے پچاس جہازوں کا ایک بیڑہ تیار کرنے کا حکم دیا جسے پرتگالی دخل اندازوں کے خلاف متعین کیا جانا تھا[3]، لیکن اپنے منصوبہ کی تکمیل تک وہ زندہ نہ رہا، ۱۵۲۰ء میں اس کا انتقال ہو گیا۔

سلیم کا جانشین سلیمان اول (۱۵۲۰۔۱۵۶۶ء) بھی اسی طرح مسلمانوں کا غیرت مند اور پرجوش محافظ تھا، ۱۵۲۵ء میں بحر احمر کے عثمانی امیر البحر سلمان رئیس نے ایک رپورٹ

---

[1] MAZZOUI, GLOBAL POLICIES, PP. 230-32 [2] TOPKAPI SARAI-MUSEUM ARCHIVES, ISTANBUL, E 8931, LETTER OF THE GOVERNER OF JEDDA TO SULTAN MUZAFFAR II OF GUJARAT (1519) M. YAKUB MUGHAL, THE BEGINNING OF THE OTTOMAN DOMINATION IN THE RED SEA: THE WAY TO INDIA, SIND UNIVERSITY ARTS AND RESEARCH JOURNAL (1970) PP. 37-8, [3] بحر ہند میں عثمانی سیاست کے لیے ملاحظہ ہو: M. Y. MUGHAL, KANUNI DEVRI OSMANLILARIN HINT OKYANUSU POLITIKASI VE OSMANLI-HINT MUSULMANLARI MUNASEBETLERI (ISTANBUL, 1974

پیش کی جس میں بحر احمر اور بحر ہند میں پرتگالیوں اور عثمانیوں کی طاقت کی طرف اشارہ تھا، اس میں سلطان سے درخواست کی گئی تھی کہ ان سمندروں میں عثمانیوں کی کارروائیوں کو استحکام بخشا جائے، سلطان سلیمان اول کو یقین دہانی کرائی گئی تھی کہ ایک عثمانی بحری بیڑہ کے ذریعہ ہندوستان کی ساری بندرگاہوں اور مراکز پر قبضہ رکھنا ممکن ہوگا جو کہ اس وقت کافروں کے قبضہ میں ہیں[1] سلطان کو ہندوستانی حکمرانوں کی جانب سے بھی پرتگالیوں کے خلاف مکرر درخواستیں موصول ہوئیں، غالباً ان درخواستوں کے جواب میں ۱۵۳۸ء میں سلیمان نے ایک طاقتور بیڑہ ہندوستان روانہ کیا، جس کی قیادت مصر کا گورنر خادم سلیمان پاشا کر رہا تھا، جسے ہدایت کی گئی تھی کہ پرتگالیوں کی مقبوضہ ہندوستانی بندرگاہوں پر قبضہ کر لے، سمندروں سے پرتگالی طاقت کی جڑوں کو نکال پھینکے، اور مکہ مکرمہ اور مدینہ منورہ کا راستہ کھول دے[2] یہ مہم ناکام رہی اور ان مقاصد میں سے کوئی مقصد حاصل نہیں ہوا[3]

۱؎ SALIH OZBARAN, A TURKISH REPORT ON THE RED SEA AND THE PORTUGHUESEN THE INDIAN OCEAN (1525) ARABIAN STUDIES IV (1977), 82-3

۲؎ PANIKKAR, INDIA, P.46

۳؎ اس مہم کی تفصیلات کے لیے ملاحظہ ہو: IBRAHIM PECHEVI PECEVI TARIHI ED. MURAT URAZ (ISTANBUL, 1968) I. 219-55. MUSTAFA BIN ABDULLAH HAJI KHALIFEH, TUHFAT AL-KIBAR FI ASF AR AL-BIHAR, TRANS, JAMES MITCHELL (LONDON, 1831) P.66, ISMAIL H. UZUNCARSILI OSMANLI TRAIHI (ANKARA,

(بقیہ حاشیہ ص ۳۳ پر)

لیکن ہندوستان کے معاملات سے سلیمان کی دلچسپی ختم نہیں ہوئی ۱۵۶۴ء
میں ہندوستانی حجاج اور سوداگروں کے جہازوں پر پرتگالیوں کی زیادتیوں کی
شریف مکہ کی طرف سے اطلاع کے بعد سلیمان نے مصر کے گورنر کو حکم دیا کہ دس
کشتیوں کا ایک شاہی بیڑہ پرتگالیوں کے خاتمہ کے لیے عدن روانہ کر دے۔ سلطان
کے بیان کے مطابق اس بیڑہ کا مقصد دشمن کو تباہ کرنا اور ہندوستانی حجاج اور
سوداگروں کو سمندری راستوں پر قزاقی کے کسی اندیشہ کے بغیر سفر کی سہولیات
فراہم کرنا تھا[1] یمن اور جدہ کے گورنروں کے پاس فرامین بھیج دیے گئے کہ رسد اور
سپلائی کا انتظام کریں اور روڈیس کے گورنر کو حکم دیا گیا کہ کمک کے طور پر اپنی ایک
کشتی عدن بھیج دیں[2]

---

[1] 1947-59) ii. 381-3, 538, STRIPLING, TURKS AND ARA
ARABS, PP. 89-93, M. LONGWORTH DAMES, THE PORTU
GUESE AND THE TURKS IN THE INDIAN OCEAN IN THE
SIXTEENTH CENTURY, JOURNAL OF THE ROYAL ASIATIC
SOCIETY (1921), PP. 15-20, ZAINUDDIN TUHFAT AL-MUJAH
IDIN, P. 75, M. ABIR ETHIOPIA AND THE RED SEA (LOND-
MD, vi. 122, FARMAN NO 256, 13 RE-ON, 1980) PP. 118-19)
MD, vi. 122. FARMAN NO[2] ABIULEVVEL 972 (19 OCT. 1564)
257, 13 REBIULEVVEL 972, GOVERNER OF YEMEN, IBID,
(بقیہ حاشیہ ص ۳۴ پر) P. 123 FARMAN NO. 258, GOVERNER OF JEDDA,

ان منصوبوں کے ساتھ ایک خط پرتگالی بادشاہ دوم سباستیاؤ (۱۵۵۷-۱۵۷۸) کے نام بھیجا گیا، جس میں ہندوستان سے عثمانی حدود میں داخل ہونے والے مسلمان حاجیوں اور سوداگروں پر پرتگالیوں کے حملوں کی طرف اس کو متوجہ کیا گیا۔ دوم سباستیاؤ کی صلح کی تازہ درخواست کو یاد دلاتے ہوئے سلطان نے یہ واضح کیا کہ اگر پرتگال کو واقعی سلطنت عثمانیہ کے ساتھ صلح کی خواہش ہے تو ہندوستانی حجاج اور سوداگروں پر حملے فوراً بند ہونے چاہئیں، سلطان نے دھمکی دیتے ہوئے کہا کہ اگر تم اس علاقہ (ہندوستان) میں بدامنی جاری رکھوگے تو پھر تمہارے خلاف مناسب اقدامات کیے جائیں گے[1]

ایسا لگتا ہے کہ دوم سباستیاؤ سلطان کی دھمکیوں سے متاثر نہیں ہوا، پرتگالی مسلمانوں کے جہازوں کو نشانہ بناتے رہے، اس کی تائید عثمانی دستاویزات سے ہوتی ہے، مصر کے گورنر کے نام ۱۷ جنوری ۱۵۶۸ء کے ایک فرمان نے ہندوستانی مسلمانوں پر پرتگالیوں کے حملوں، ہندوستانی بندرگاہوں پر پرتگالیوں کے تسلط

(بقیہ حاشیہ ص ۳۳) IBID, P. 121, FARMAN NO 265, 15 RABIULE-VVEL 973 (1 OCT. 1565), UZUNCARSILI, OSMANLI TARIHI, III. PT. 1, PP. 331-2, N. A. ASRAR KANUNI SULTAN SULEYMAN DEVRINDE OSMANLI DEVLETI NIN DINI-ISLAM ALEMI (ISTANBUL, 1972), PP. 335-6,

[1] MD, VI. 166, 6 REBIULEVVEL 972 (21 OCT. 1564) شاہ پرتگال کے نام روانہ کیے گئے ایک اور نامہ شاہی کے لیے ملاحظہ ہو: MD, V. 71, NO. 161.

مکہ مکرمہ کے بحری راستہ کی حصار بندی اور ہندوستان کے حاجیوں کو پیش آنے والے مسائل کی زندہ تصویر کھینچی ہے۔ اس کا اعلان کرتے ہوئے کہ ہندوستان کے کچھ حصوں کا کافروں کے قبضہ میں چھوڑے رکھنا مناسب نہیں ہے۔ سلطان نے اعلان کیا کہ ہندوستان سے پرتگالیوں کو باہر نکالنے کی تیاری میں ایک شاہی بیڑہ تیار کیا گیا ہے جسے بحر اوسط سے ایک نہر کے راستہ سے سوئز کی خلیج میں تعین کیا جائے گا، گورنر سے کہا گیا تھا کہ وہ سلطان کو فوراً اطلاع دے کہ کیا اس نہر کا منصوبہ قابل عمل ہے یا نہیں[1]۔

یہ منصوبہ جس کا مقصد بحر احمر اور بحر ہند میں بحر متوسط کے شاہی بیڑہ کی کارروائی کو آسان بنانا تھا۔ عثمانیوں کو اس قابل بنا سکتا تھا کہ بحر ہند میں پرتگالیوں کی بنیادوں پر حملہ کریں، لیکن معلوم ہوتا ہے کہ اس کو یا تو ختم کر دیا گیا تھا یا اس پر ضروری کارروائی نہیں کی گئی، کیونکہ بعد کے عثمانی مراجع اس کا کوئی تذکرہ نہیں کرتے ہیں، شاید یہ زیادہ دلچسپی کی بات ہے کہ اس منصوبہ کا مقصد یہ تھا کہ پرتگالیوں کو ہندوستان سے باہر نکالا جائے اور حاجیوں کے لیے راستہ کی آسانی پیدا کی جائے، جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ عثمانیوں کے لیے مکہ مکرمہ کے حج کے راستوں کا کھولنا اور ان کی حفاظت کرنا کس قدر اہم تھا۔

سولھویں صدی کے نصف آخر میں پورے عالم اسلام سے استنبول درخواستیں پہونچیں کہ فرنگیوں کے ظلم سے بچایا جائے اور مشرق سے مقدس شہروں کو جانے والے راستوں کو کھولنے میں مدد کی جائے۔ اچین (سماترا) کا حکمران سلطان علاء الدین ریات شاہ القاہر (۱۵۴۸-۱۵۷۱) ان درخواست دہندگان میں سے ایک تھا، ۱۵۶۶ء میں

---

[1] MD, vii. 258, No. 721۔

اس نے سلیمان اعظم کے پاس ایک درخواست بھیجی۔ اس منفرد دستاویز میں سلطان کو خلیفہ اسلام، جانشین خلفائے راشدین اور پناہ گاہ انسانیت وغیرہ کے القاب سے خطاب کیا گیا ہے، اس کے بعد فرنگی جارحیت پسندوں کے سامنے مکہ مکرمہ اور دوسری عرب بندرگاہوں کو جانے والے مسلمان حاجیوں اور تاجروں کی حالت زار کا تذکرہ کیا گیا ہے سلطان سے بار بار اسلام کے نام پر درخواست کی گئی ہے کہ ان کی فوری امداد کرے، فرنگیوں کے خطرہ سے نجات دلانے کے لیے مردان کارزار اور اسلحہ کے ذخائر روانہ کرے اور غیر مسلموں کے خلاف جہاد کا اعلان کر دے۔ اس درخواست میں سلطان کو اطلاع کی گئی کہ کالی کٹ اور سری لنکا کے مسلمان اس کے نام کا خطبہ پڑھتے ہیں اور ان حکومتوں کے غیر مسلم حکمران سلطان کے جھنڈے تلے فرنگیوں سے لڑنا چاہتے ہیں، درخواست دہندہ اپنے غم کا اظہار کر[illegible]ے لکھتا ہے کہ اگر عزتمآب کی امداد نہیں آتی ہے تو کمینے غیر مسلم بے گناہ مسلمانوں کا قتل عام کرتے رہیں گے۔ یہ درخواست سلطان کی طویل حیات اور اس کی ثروت اور شوکت کے دوام کی دعا پر ختم ہوتی ہے[1]

---

[1] HINDISTAN MUSULMANIN BIR ARIZASI TSMA, E 8009, MIDDLE OF THE MONTH OF JUMADA II 973 (JAN. 1566)

درخواست کے عنوان سے لگتا ہے کہ درخواست دہندگان ہندوستانی مسلمان تھے، لیکن اندرونی شہادت بتاتی ہے کہ یہ درخواست سماترہ کے سلطان نے بھیجی تھی، بہت سی عثمانی دستاویزات سماترہ کے باشندوں کی نسبت ہند کی طرف کرتی ہیں، اس درخواست سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ سماترہ اور سلطنت عثمانیہ کے درمیان ۱۵۶۵ء سے پہلے سے تعلقات تھے، اس اہم دستاویز کو مورخین کے سامنے لانے کا شرف مقالہ نگار کو حاصل ہے، سماترا اور عثمانی سلاطین کے باہمی تعلقات کے لیے ملاحظہ ہو: (بقیہ حاشیہ ص ۳۷)

اس درخواست کے مضمون سے متاثر ہو کر سلیم دوم نے جو ۱۵۶۶ء میں سلیمان کا
نشین ہوا تھا فوری اقدام کیے، اس نے توپوں، بندوقوں اور دوسرے فوجی ساز و سامان
سے لیس پندرہ کشتیوں اور دو بارکوں کو ساتھ بھیجنے کا فیصلہ کیا، متعدد جانیزاریوں، سات
ہر بندوقچیوں اور اسلحہ کے شاہی، فسر اعلیٰ کو اس مہم میں شریک ہونے کا حکم دیا گیا،
متعدد بڑھئیوں، کان کنوں، لوہاروں اور رنگ ریزوں کو بیڑہ کے ساتھ جانے کی ہدایت
کی گئی، اسکندریہ کے بیڑہ کے کپتان خضر کرت اولو کو مہم کی سربراہی کے لیے نامزد کیا گیا
اور اسے کافروں کو تباہ کرنے اور ان کے قلعوں پر قبضہ کرنے میں سلطان اچین کی مدد
کرنے کی ہدایت کی گئی۔[1] صوبائی گورنروں اور شاہی افسروں کو احکام دیے گئے کہ
ضروری ساز و سامان فراہم کر دیں۔[2] سلطان اچین کے نام خط میں سلطان نے کافروں کے

(بقیہ حاشیہ ص ۳۶) ANTHONY REID, SIXTEENTH CENTURY TURKISH INFLUENCE IN WESTERN INDINESIA, JOURNAL OF SOUTHEAST ASIAN HISTORY, X (1969) 405

MD, vii. 90-92, No. 244, 16 REBIULEUVEL 975 (20 SEPT. 1567) IBID, P. 89, No 238, 17 SEP. 1567, IBID, P. 311, No. 88 17 SHABAN 975 (16 FEB. 1568) MD, vii, 88, No. 236, 17.

MD, vii. 87, No. 234, GOVERNER OF EGYPT, ۱۶ SEPT. 1567 IBID, No. 237, GOVERNER OF YEMEN, IBID, 89, No. 234 GOVERNER OF EGYPT, IBID, 90, No. 242, SHERIF OF MECCA, IBID, 90, No. 43 GOVERNER OF EGYPT

(بقیہ حاشیہ ص ۳۸ پر)

خلاف جہاد کے التزام کا اعادہ کیا اور یہ واضح کیا کہ سماترہ کو کفر کے شر و لے سے محفوظ رکھنے، سرزمین مقدس کے راستہ کو تمام رکاوٹوں اور خطروں سے صاف کرنے اور سماترہ کے مسلمانوں کو محفوظ رکھنے کے لیے یہ بیڑہ بھیجا جا رہا ہے۔[۱]

لیکن یہ بیڑہ کبھی منزل کے لیے روانہ نہیں ہوا۔ جنوری ۱۵۶۸ء میں سماترہ کے سفیر کو مطلع کیا گیا کہ یمن میں بغاوت فرو کرنے کے لیے بحری بیڑہ وہاں بھیج دیا گیا ہے، تاہم سلطان نے سفیر کو سماترہ کے ساتھ اپنی غیر منقطع ہونے والی مدد کا یقین دلایا اور اگلے سال بیڑہ روانہ کرنے کا وعدہ کیا۔[۲] گو ایسا نہیں ہوا، لیکن پرتگالی اور جیسوت

(بقیہ حاشیہ ص ۳۷) IBID., 177, NO. 474, GOVERNER OF EGYPT, IBID., 179, NO. 481, LORD ADMIRAL, IBID, 182, NO. 491, LORD ADMIRAL, IBID. 211, NO. 583, GOVERNER OF EGYPT, IBID, 212, NO. 586, CAPTAIN OF SUEZ, IBID, 213, NO. 610 PIYALE PASHA, THE LORD ADMIRAL

۱؎ MD, VII. 90-2, NO. 224, 20 SEPT. 1567. SAFVET BEY, BIR OSMANI FILOSININ SUMATRA SEFERI, TARIH OSMANI ENCUMAN MECMUASI, 10, AH 1329, PP. 604-14, IBID, TOEM 11, AH 1329, PP. 672-83, SAFVET BEY, SHARQ LONDLERI, OSMANI BAHRA-I-AHMAR FILOSININ SUMATRA SEFERI UZERE VASIQALAR, TOEM, 24, AH 1332, PP. 1,

۲؎ MD, VII. P. 255, NO. 708, 15 RAJAB 975 (15 JAN. 1568) 521-40 IBID, 216, NO. 597, 29, JUMADA I 975 (1 DEC. (بقیہ حاشیہ ص ۳۹ پر)

مآخذ سے معلوم ہوتا ہے کہ کچھ عثمانی فوجی امداد سماترہ پہنچی۔ سماترہ کے ایک ماخذ سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ فوجیوں اور کاریگروں سے لدے دو جہاز اور بندوقیں سلطان کے پاس سے سماترہ پہنچیں لیکن یہ امر محل نظر ہے، البتہ مجوزہ مہم سے معلوم ہوتا ہے کہ دنیا میں ہر جگہ حاجیوں کے لیے راستہ کی سہولیات فراہم کرنے کو عثمانی سلاطین سنجیدگی سے اپنی ذمہ داری سمجھتے تھے اور جب بھی ضرورت پڑتی اپنی اس اخلاقی ذمہ داری کو پورا کرنے کی کوشش کرتے تھے۔

اسی طرح کی عثمانی امداد کی درخواستیں وسطی ایشیا سے بھی آئیں، ۱۵۵۶ء میں اصطرخان پر روسیوں کے قبضہ سے ترکستانی مسلمانوں کے لیے اب تک کھلا حج کا راستہ مسدود ہوگیا تھا، اصطرخان کی راہ اختیار کرنے والے مسلم حاجیوں اور تاجروں پر روسی مظالم کی متعدد رپورٹیں اس سے پہلے استنبول پہنچ چکی تھیں، ۱۵۶۸ء میں خوارزم کے حاکم حاجی محمد خان (۱۵۶۰ - ۱۶۰۳) نے ایک خصوصی سفیر استنبول بھیجا، سفیر کے ذریعہ لائے گئے خط نے شاہ ایران کے ہاتھوں خوارزمی حجاج کے ساتھ بدسلوکی کی اطلاع سلطان کو کی اور اصطرخان کے تبادل راستہ کے کھولنے کی سلطان سے

(بقیہ حاشیہ ص ۳۸) 1567), IBID. 23, 614, IBID, 224, NO. 616, IBID A. N. ص 311, No. 887, 17 SHABAN 975 (16 FEB. 1568) KURAT, THE TURKISH EXPEDITION TO ASRRAKHAN AND THE PROBLEM OF THE DON-VOLGA CANAL, THE SLAVONIC AND EAST EUROPEAN REVIEW, XXXIX (1961), 13.

درخواست کی[۱] اصطرخان اور قازان کو فتح کرنے کی درخواستیں سمرقند اور بخارا کے ازبکوں سے بھی موصول ہوئی تھیں[۲]

عثمانیوں کو تحتی ونگا میں روسیوں کے گھس آنے کی اطلاع تھی اور وہ اصطرخان کے خلاف مہم کی کامیابی کے امکان پر پہلے ہی سے غور کر رہے تھے کہ وسطی ایشیا کے مسلمانوں کی گزارشات نے سلطان کو فوری طور پر متحرک ہونے پر آمادہ کیا، سلطان نے ۱۵۶۸ء میں کفا کے گورنر کو ایک فرمان بھیجا جس میں اصطرخان کے راستہ سفر کرنے والے وسطی ایشیا کے حاجیوں اور سوداگروں پر روسی مظالم کے حوالہ سے روسیوں سے حج کے راستہ کو آزاد کرنے کے لیے اصطرخان کی فتح کے اپنے ارادہ کا اظہار کیا اور گورنر کی رائے معلوم کی کہ اس پر حملہ کرنے کا کون سا بہترین وقت ہوگا[۳] تین ہفتوں کے بعد سمرقند، بخارا اور خوارزم کے حاجیوں اور سوداگروں کے راستہ کے لیے اصطرخان کو فتح کرنے کی سلطان کی خواہش کے اظہار کے لیے کریمیا کے خان دولت

LETTER OF SELIM II TO THE KHAN OF KHWAR-[1] -AZM, MD, vii. 985, No. 2, 723, HALIL INALCIK THE OR-IGIN OF THE OTTOMAN-RUSSIAN RIVALRY AND THE DON-VOLGA CANAL, ANNALES DE L UNIVERSI-TE D, ANKARA, i. (1946-7) 68. A. REFIK, BAHR-i-[2] HAZER-KARADENIZ KANAL VE EJDERHAN A. REFIK, BAHR[3] SEFERI, TOEM, 43, AH 1333, P.4.

[۳] فرمان روانہ کرنے کی تاریخ ہے ۱۵ شعبان ۹۷۵ھ/ ۱۴ فروری ۱۵۶۸ء

غیرے خان (۱۵۵۱-۱۵۷۷) کے نام اسی طرح کا ایک فرمان بھیجا گیا جس میں مہم کی ضرورت کے پیش نظر رسد کے جمع کرنے کی ہدایتیں دی گئیں[1]

اصطرخان کی مہم سے مربوط دون اور ولگا کے دریاؤں کے درمیان ایک نہر کی تعمیر کا منصوبہ تھا جس کا مقصد دریائے ولگا میں عثمانی بیڑہ کی کارروائی کو آسان کرنا تھا۔ اس کے علاوہ اصطرخان میں کمک کی غرض سے آنے والی روسی فوجوں کو دریا کے استعمال سے روکنا اور اصطرخان کے محاصرہ کے لیے ضروری اسلحہ جات کو وہاں تک پہونچانا اس منصوبہ کا مزید مقصد تھا[2]۔ مئی ۱۵۶۹ء میں روانہ کی گئی یہ مہم فوری طور پر مشکلات میں پھنس گئی، غیر کافی ٹکنیکل معلومات کی وجہ سے نہر کا منصوبہ جلد ہی ناقابل عمل محسوس ہونے لگا اور اسے چھوڑنا پڑا۔ محاصرہ کرنے والی توپوں کی کمک کے بغیر عثمانی فوجیں اصطرخان کے دفاعی مورچوں پر مشکل سے اثر انداز ہونے کی توقع کر سکتی تھیں، اچانک حملہ کے ذریعہ قلعہ پر قبضہ کرنے کی متعدد ناکام کوششوں کے بعد انہیں پیچھے ہٹنے پر مجبور ہونا پڑا[3] اور اصطرخان کو عثمانی آزاک سے ملنے والے

---

[1] IBID., PP. 4-5. THE FARMAN WAS ISSUED ON 5 RAMADAN 975 (4 MARCH 1568) IBID. PP. 5-6. 4 MUHARRAM 976 (29 JUNE 1568)

[2] KURAT, TURKISH EXPEDITION, P. 18.

[3] KURAT, TURKISH EXPEDITION, PP. 18-21, INALCIK, DONG-VOLGA CANAL, PP. 78-86, ALLEN TURKISH POWER, PP. 26-28.

حج کے راستہ کی آزادی کی امیدوں پر اس طرح اوس پڑگئی۔

بہر حال اس ناکام مہم سے ایک مثبت نتیجہ برآمد ہوا، ۱۵۷۰ء میں روس کے حکمران ایوان چہارم (۱۵۳۳-۱۵۸۴) نے ایک سفیر کے واسطے سے ایک خط استنبول بھیجا جس میں سلطان کو اصطرخان اور قازان کے مسلمانوں سے اپنی ہمدردی کا یقین دلایا اور سلطنت عثمانیہ کے ساتھ صلح کرنے کی اپنی خواہش کا اظہار کیا، سلطان نے جواب دیا کہ وہ روس کے ساتھ دوبارہ صلح کے تعلقات قائم کرنا چاہتا ہے بشرطیکہ ایوان اصطرخان کا راستہ کھول دے اور وسطی ایشیا سے مکہ مکرمہ جانے والے حاجیوں اور مسلمان سوداگروں کے تحفظ کی ضمانت دے[1] ایوان نے یہ شرط منظور کی اور روس کے ساتھ صلح ہوگئی،

ایوان کے جانشین زار فیوڈر (۱۵۸۴-۱۵۹۸) نے ۱۵۸۵ء اور ۱۵۹۵ء میں اصطرخان اور قازان کے مسلمانوں کی مذہبی آزادی کے تحفظ کے اپنے والد کے عہد کا اعادہ کیا[2]، مختصر یہ کہ اگرچہ عثمانیوں کو دو قدیم مسلمان صوبوں پر روسی تسلط کو تسلیم کرنا پڑا، تاہم انھوں نے روسیوں کو (خواہ وقتی طور سے ہی) مقامی مسلمانوں کے مذہب کے احترام پر آمادہ کرلیا۔

اصطرخان کی مہم حج کے راستہ پر کسی عیسائی طاقت کے تسلط کو ختم کرنے کی عثمانیوں کی آخری کوشش ثابت ہوئی۔ سترہویں اور اٹھارہویں صدی میں عثمانی سلاطین برابر قاہرہ اور دمشق سے بڑی شان کے ساتھ حج کے قافلوں کا انتظام کرتے رہے، حاجیوں اور حج کے راستوں کے تحفظ پر بڑی رقمیں خرچ کرتے رہے اور مقدس شہروں کی دیکھ بھال کے لیے کافی رقمیں اور غلہ جات حجاز روانہ کرتے رہے۔

استنبول میں باشو کالت آرکائیوز میں حج اور حج کے مختلف مسائل سے متعلق سیکڑوں

---

[1] منشآت السلاطین ۲/۱۰-۴۶۰ [2] INALCIK, DON-VOLGA CANAL, PP. 94-7.

دستاویزوں کی موجودگی حج سے عثمانی حکومت کی گہری دلچسپی کی شہادت دیتی ہے[1] لیکن یورپ کے اندر سلطنت عثمانیہ کی طویل جنگیں اور زوال کی وہ علامتیں جن کی اس وقت ابتدا ہو چکی تھی عثمانیوں کو حملہ آورانہ کارروائیوں کا موقع نہیں دے رہی تھیں۔ ہمیں کوئی شہادت نہیں ہے کہ سولہویں صدی کے بعد عثمانی سلاطین نے اپنے زیر اثر علاقوں کے باہر حاجیوں یا حج کے راستوں کے تحفظ کے لیے کسی قسم کی کوئی کوشش کی، کم ازکم عثمانی دستاویزات اس کا کوئی تذکرہ نہیں کرتے، اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ انیسویں صدی میں وسائل حمل ونقل میں انقلابی تبدیلیوں کے ذریعہ جب طویل مسافتوں کی دشواریوں کا خاتمہ ہوا تو اس کے بعد ہی دنیا کے مختلف علاقوں کے مسلمان بغیر کسی رکاوٹ کے مکہ مکرمہ کا سفر کرنے کے اہل ہو سکے۔

---

[1] مثال کے طور پر ملاحظہ ہو: MD, iii. 309, No. 905, iBiD, P. 525, No. 1,553: iBiD, P. 370, No. 1, 094, MD, iv. 26, No. 241, iBiD, P. 172, NoS. 1, 787, 1,788, iBiD, P. 204, No. 2, 139, MD, V. 205, No. 508, iBiD, P. 208, No. 520, iBiD, P. 358, No. 944, iBiD, P. 150, No. 549, iBiD, P. 395, No. 1, 046, MD, Vii. 240, No. 667, iBiD, No. 671, iBiD, P. 523, No. 1, 501, iBiD, P. 633, No. 1, 506, iBiD, P. 744, No. 2, 037, iBiD, P. 748, No. 2, 048, iBiD, P. 525, NoS. 1, 505, 1, 506, MD, iX. 1, No. 3, iBiD, P. 10, No. 26, MD, Xii. 70, No. 34, iBiD, P. 351, No. 710, iBiD, P. 426, No. 827, iBiD, P. 445, No. 862, iBiD, P. 448, No. 868, iBiD, P. 467, No. 896, iBiD, P. 478, No. 918, MD, XV. 100, No. 871-

قرون وسطیٰ کے مسلمان حکمرانوں کی ذمہ داری تھی کہ حج کے راستوں کی حفاظت کریں، حج کے سالانہ قافلوں کا انتظام کریں اور اپنی رعایا کو حج کی سہولیات فراہم کریں، ہندوستان کے مغل شہنشاہ اور ترکی کے عثمانی سلاطین اس ذمہ داری سے مستثنیٰ نہیں تھے، البتہ اس سے عہدہ برآ ہونے کی مغلوں کی کوششوں کو بہت معمولی کامیابی حاصل ہوئی، حج کے بری و بحری دونوں راستے باہر کی طاقتوں کے زیر تسلط تھے اور سترہویں صدی میں بحر ہند میں طاقتور قزاقوں کے ایک نئے گروہ کے غلبہ سے مسئلہ اور زیادہ سنگین ہوگیا تھا۔ ہندوستانی حاجیوں کو یا تو مذہبی مظالم کے سامنے جھکنا پڑتا یا پھر وہ جان و مال کی تباہی کے ممکنہ خطرہ کو قبول کرکے سفر اختیار کرتے۔ سمندر میں مغلوں کی بے بسی اس صورت حال کی بڑی حد تک ذمہ دار تھی۔ اس کی وجہ سے وہ یورپ والوں کے مطالبات ماننے پر مجبور تھے۔ اورنگزیب تنہا مغل شہنشاہ تھا جس نے حاجیوں کے لیے سمندر کے راستہ کو محفوظ کرنے کی سنجیدہ کوشش کی، اگرچہ کوئی کوشش کامیاب نہیں ہوئی، یورپ کی ملاحی، بحری فوجی ٹکنالوجی اور اسلحہ جات اس قدر ترقی یافتہ تھے کہ ان کا مقابلہ مشکل تھا۔

صفوی ایران کو وسطی ایشیا کی ابھرتی ہوئی طاقت ازبکوں کے مدمقابل دیکھنے کی سیاسی خواہش بھی ہندوستانی حجاج کی بے چارگی کی ذمہ دار ہے۔ مکہ کے خشکی کے راستہ پر صفویوں کے تسلط کو مغلوں نے چیلنج نہیں کیا، اس بات کی کوئی کوشش بھی نہیں کی گئی کہ صفوی علاقہ سے ہوکر مکہ مکرمہ جانے والے ہندوستانی مسلمانوں کے لیے رعایت حاصل کرنے کے لیے صفویوں کو آمادہ کیا جائے، یقیناً یہ تعجب خیز ہے کہ اکبر، جہانگیر اور شاہجہاں کے عہد میں مغلوں اور صفویوں کے درمیان کثرت سے

سفارتوں اور قاصدوں کی آمدورفت کے باوجود ایران کے حج کے راستہ کی رکاوٹیں کبھی زیر گفتگو نہیں آئیں، مغلوں کے لیے شمال مغربی سرحد کو مشکلات سے آزاد رکھنے کی ضرورت اس سے کہیں زیادہ اہم تھی کہ حاجیوں کی ضروریات کے مسئلہ پر ایرانیوں کے ساتھ جنگ کا خطرہ مول لیا جائے۔

ہندوستانی حکمرانوں کے مقابلہ میں حج کے راستوں کی حفاظت عثمانی سلاطین کے لیے زیادہ آسان تھی۔ سولھویں صدی میں جب وہ اپنی طاقت کے اوج پر تھے تو انھوں نے ذمہ داری پورا کرنے کی مکمل کوشش کی۔ ہندوستانی سمندر اور خلیج ایران سے پرتگالیوں کو باہر نکالنے کی تدبیریں کی گئیں، فوجی امداد سماترہ بھیجی گئی، وسطی ایشیا کے حج کے راستہ کو روسیوں سے آزاد کرنے کے لیے اصطرخان پر حملہ کیا گیا، لیکن پرتگالی اور روسی اس قدر طاقتور تھے کہ ان کو پسپا کرنا آسان نہیں تھا۔ علاوہ ازیں اپنی طاقت کے مرکز سے بہت دور ایک طاقتور دشمن سے جنگ کرنے کے مسائل نے عثمانی منصوبہ بندیوں کو پست اور ناکام کر دیا۔ سترہویں صدی میں عثمانی طاقت کا زوال شروع ہو گیا اور سلطنت کے اندرونی اور بیرونی مسائل بڑھتے گئے۔ نتیجتاً عثمانی سلاطین حجاج کے لیے مکہ کے راستوں کی حفاظت نہ کر سکے۔ یہ تاریخ کا المیہ ہے کہ ہندوستانی حاجیوں کے لیے محفوظ گزرگاہ کی سہولیات کی فراہمی انگریزوں کے غلبہ کی مرہون منت تھی۔

مولانا آزاد بلگرامی کی فارسی خدمات

از ڈاکٹر سید حسن عباس

(۲)

مناقب میں ان کی صرف ایک تصنیف ہے۔

۱۔ سند السعادات فی حسن خاتمۃ السادات: یہ مختصر سا رسالہ سادات کے فضائل و مناقب کے بیان میں ہے جس میں سادات کی فضیلت آیات قرآنی واحادیث وغیرہ سے بیان کی گئی ہے۔ اس کا سال تالیف معلوم نہیں ہو سکا۔ البتہ آزاد نے اس کی تالیف میں جن سولہ ماخذ سے استفادہ کیا ہے ان کا ذکر جگہ جگہ آیا ہے۔ یہ کتاب ۱۳۰۸ھ میں بمبئی سے ۳۲ صفحات میں شایع ہو چکی ہے۔

آزاد کی ادبی تصنیفات حسب ذیل ہیں:۔

۱۔ دیوان فارسی: آزاد بلگرامی کا دیوان غزلیات، قصائد، مثنویات، رباعیات اور قطعات تاریخ پر مشتمل ہے جو بلا مبالغہ تقریباً دس ہزار اشعار پر مشتمل ہے۔ ان کا کلام ان کی قادر الکلامی، مہارت اور گوناگوں افکار و خیالات کے خوبصورت اظہار کا مظہر ہے۔ مکمل دیوان ابھی شایع نہیں ہوا ہے، صرف دو انتخابات حیدرآباد سے ۱۳۰۱ھ/۱۸۸۳ء میں شایع ہوئے تھے۔ دیوان آزاد کے متعدد قلمی نسخے مختلف کتب خانوں میں پائے جاتے ہیں۔ آزاد کے دیوان کا ایک نسخہ کتبخانہ گنج بخش اسلام آباد میں اور دوسرا

کتابخانۂ مجلس شورائے اسلامی تہران میں بھی موجود ہے۔ ان دونوں نسخوں کے عکس راقم السطور کے پاس محفوظ ہیں۔ ان کے علاوہ کتابخانۂ رضا رام پور میں دو، ندوۃ العلما لکھنؤ میں ایک، دانش گاہ عثمانیہ حیدرآباد میں ایک، نیشنل میوزیم کراچی میں ایک، خدابخش لائبریری میں ایک، انڈیا آفس لندن میں ایک، کتابخانۂ حمیدیہ بھوپال میں ایک، برٹش میوزیم میں ایک، ایشیاٹک سوسائٹی کلکتہ میں تین، سالار جنگ میوزیم میں دو، لکھنؤ یونیورسٹی لائبریری میں ایک، کتابخانۂ آصفیہ میں ایک اور ایران کے معروف محقق استاد گلچین معانی (مشہد) کے ذخیرۂ کتب میں ایک نسخہ موجود ہے اشپرنگر نے اپنی فہرست میں بھی آزاد کے ایک دیوان کا ذکر کیا ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ کم سے کم جتنے نسخے مل سکیں ان کی مدد سے آزاد کا مکمل دیوان مرتب کرکے شایع کردیا جائے۔

۲۔ بیاض : آزاد کی قلمی بیاضیں خدابخش لائبریری، ندوۃ العلماء اور سالار جنگ میں موجود ہیں۔ سالار جنگ کی بیاض سے پروفیسر نثار احمد فاروقی صاحب نے ان کے دو اردو اشعار نقل کرکے روضۃ الاولیا کے مقدمہ میں شایع کردیا ہے یہ بیاض بھی کافی اہم ہے لیکن اسے دیکھنے کا موقع نہیں مل سکا۔ خدابخش لائبریری میں آزاد کی بیاض کا نمبر ۳۴۱۲ ہے۔ اس کے صفحۂ اول پر ان کی تحریر ہے جس سے پتہ چلتا ہے کہ یہ بیاض بلگرام سے سفر حج کے آغاز کے وقت ایک ہفتہ میں مکمل کی تھی اور چلتے وقت میر محمد یوسف بلگرامی کو دے گئے تھے۔ اس یادداشت کے ساتھ ان کی بیضوی مہر بھی ثبت ہے۔ اس بیاض کے لیے انھوں نے ایک قطعۂ تاریخ بھی کہا اور "بیاض رنگین" سے اس کی تاریخ نکالی جو ۱۱۵۰ھ ہوتی ہے۔

اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ تاریخ آغاز بیاض کی ہوگی ورنہ ان کا سفر حج تو ۱۱۵۰ھ میں شروع ہوتا ہے اور تاریخ بیاض بھی اسی سال کے آس پاس کی ہونا تھی۔ یہ بیاض ۱۶۲ اوراق پر مشتمل ہے اور اس میں مختلف شعرا کے مختلف موضوعات کے تحت اشعار اور متفرق یادداشتیں ہیں۔ اکثر مشتملات بیاض آزاد کے خط میں ہیں۔

آزاد بلگرامی کی تیسری بیاض کتابخانہ ندوۃ العلما لکھنؤ میں موجود ہے جس کا عکس مجھے ڈاکٹر احسن الظفر استاد زبان و ادبیات فارسی لکھنؤ یونیورسٹی کے تعاون سے حاصل ہوا تھا۔ نہ صرف یہ بیاض بلکہ ڈاکٹر احسن الظفر نے مختلف مخطوطات اور مطبوعہ کتابوں سے آزاد بلگرامی کے متعلق بہت سی یادداشتوں کے زیراکس بھی مجھے مہیا کیے تھے۔ ان کے اس علمی تعاون سے جس قدر شکریہ ادا کیا جائے کم ہوگا۔

بہرحال مذکورہ بیاض "آزاد بلگرامی کی بیاض بخط آزاد سے نواب صدیق حسن خاں بھوپالی نے سید جلیل احمد سہسوانی سے نقل کرایا تھا۔ جلیل احمد نے ذیقعدہ ۱۲۹۷ھ میں نقل نویسی کا کام شروع کیا تھا اور ذی الحجہ ۱۲۹۷ھ میں مکمل کر لیا تھا۔ یہ بیاض بھی ہند و ایران کے فارسی گو شعرا کے کلام پر مشتمل ہے جس کا آغاز فیضی سے اور اختتام جلال اسیر پر ہوتا ہے۔ نواب صدیق حسن خاں کے بیٹے نورالحسن نے بھی جن کا تذکرہ نگارستان سخن معروف ہے "بیاض دستخط خاص میر آزاد"[1] سے استفادہ کیا اور یہ بیاض ان کا ماخذ رہی ہے۔ ندوۃ العلماء میں موجود آزاد کی بیاض میں ۷۷ شعرا کے کلام کا انتخاب موجود ہے۔ آزاد جیسے تذکرہ نویس کے لیے یہ بیاض کافی اہمیت کی حامل تھیں۔

---

[1] نورالحسن: نگارستان سخن، ۱۶۱۔

۳۔ شرح قطعۂ نعمت خان عالی شیرازی: بارھویں صدی ہجری میں ہجوگوئی کافی رائج تھی اردو اور فارسی دونوں زبانوں میں اس کے وافر نمونے ملتے ہیں۔ تذکروں میں بھی ہجویہ اشعار کافی تعداد میں نظر آتے ہیں۔ مثلاً خان آرزو نے اپنے تذکرہ مجمع النفایس میں شفیعا اثر، سعید اشرف، بنائی، جلال نائینی، شرمی، غضنفر، غیاث نقشبند، مہری، قاضی نور اللہ شوستری، زمانۂ نقاش اور یحیی کاشی کے تراجم میں ان کے ہجویہ اشعار بھی نقل کیے ہیں۔ اسی طرح کشن چند اخلاص نے اپنے تذکرہ ہمیشہ بہار میں شیدا، عالمی اور عاشق کے میر الٰہی، غزالی اور غبار کے سلسلے میں ہجویہ اشعار درج کیے ہیں۔ یہ بات قابل غور ہے کہ بسا اوقات ہجویہ اشعار بھی بڑے معنی خیز اور بلندی خیال کے حامل ہوتے ہیں، قطعہ نعمت خاں عالی شیرازی بھی ایسے ہی معنی خیز اور پیچیدہ و سربستہ خیالات و افکار کا حامل ہے۔ اس قطعہ کے بارے میں شفیق اورنگ آبادی نے تذکرۂ گل رعنا میں نعمت خاں کے ترجمہ میں لکھا ہے کہ:

" قطعہ ہجو کامگار خان پسر دوم عمدۃ الملک جعفر خان وزیر اعظم خلد مکان وارد، زبان زد عالم است، عالمانہ نظم کردہ...."

عالی نے کامگار خاں کی شادی پر یہ قطعہ کہا تھا۔ اس کی شادی ۱۰۷۷ھ میں فتح حیدرآباد کے بعد سید مظفر وزیر سلطان ابوالحسن والی حیدرآباد کی بیٹی سے ہوئی تھی۔ عالی کا قطعہ ۲۵ اشعار پر مشتمل ہے جو کامگار خان کی عروسی کی ہجو میں ہے۔ اس نے اس قطعے میں بے شمار علمی، ادبی، نجومی اصطلاحیں استعمال کر کے کامگار خان کی جنسی کمزوریوں اور اپنی عالمانہ حیثیت کو ظاہر کیا ہے۔ مولانا آزاد نے اس قطعے کی شرح لکھی اور لفظی و معنوی موشگافیوں کے ذریعے قطعۂ مذکور کے اسرار سربستہ کو

واضح کیا ہے۔ شرح لکھتے وقت انھوں نے پانچ کتابوں کو بطور ماخذ استعمال کیا ہے۔ یہ شرح سنہ ۱۲۶۰ھ میں طبع ہو چکی ہے۔ آزاد نے تذکرۂ خزانۂ عامرہ میں بھی عالی کے ترجمہ میں اسے نقل کیا ہے۔ کتابخانۂ مرکزی دانشگاہ تہران میں میری نظر سے اس قطعے کی ایک اور شرح گزری ہے جس کے مصنف کا نام معلوم نہیں ہو سکا لیکن شارح نے آزاد کی شرح کو پیش نظر رکھ کر ایک اور شرح کی ہے۔ مذکورہ نسخہ ۲۵ ذی الحجہ ۱۲۷۹ھ کا مکتوبہ ہے اور کاتب میر غلام حسین رضوی ہیں۔

۴۔ غزلان الہند: آزاد بلگرامی کی ایک اہم تالیف غزلان الہند ہے۔ یہ ان کی عربی تصنیف سبحۃ المرجان فی آثار ہندوستان کی آخری دو فصلوں کا ترجمہ ہے جسے خود آزاد نے اپنے دو شاگردوں لچھمی نرائن شفیق اورنگ آبادی اور میر عبدالقادر مہربان اورنگ آبادی کی فرمایش پر سنہ ۱۱۷۸ھ میں کیا اور مقدمہ و خاتمے کا اضافہ کیا۔ "غزلان الہند" تاریخی نام ہے جس سے ۱۱۷۸ھ برآمد ہوتا ہے اور رسالے کا موضوع علم بدیع اور صنایع شعری ہے۔ مقدمہ میں علم بدیع کی مختصر تاریخ بیان کی ہے۔ اس کتاب پر راقم السطور کا ایک مقالہ خدابخش لائبریری جرنل شمارہ ۷۶۔۷۷ میں شایع ہوا تھا۔ راقم نے چار مختلف نسخوں کی مدد سے متن کی تصحیح کا کام بھی مکمل کر لیا ہے۔ انشاء اللہ بہت جلد اس کی اشاعت عمل میں آئے گی۔

۵۔ مثنوی طلسم اعظم: آزاد نے یہ مثنوی سنہ ۱۱۵۰ھ میں بلگرام سے حج کے لیے جاتے وقت لکھی تھی۔ اس کا تاریخی نام بھی یہی ہے۔ اس مثنوی میں انھوں نے حج کا سفرنامہ بیان کیا ہے اس کے ۴۴ اشعار انھوں نے مآثر الکرام میں نقل کیے ہیں۔ ابھی تک اس کے مکمل نسخے کے بارے میں کوئی اطلاع نہیں ملی ہے۔

۶۔ مثنوی در صفت مدینہ : یہ ۱۷۶ ابیات پر مشتمل ایک مختصر سی مثنوی ہے۔ اس میں انھوں نے مدینہ منورہ کے اوصاف بیان کیے ہیں۔ اس کا ایک مخطوطہ مولانا آزاد لائبریری علی گڑھ کے ذخیرۂ احسن مارہروی میں موجود ہے۔ دیوان کے نسخوں میں یہ مثنوی نہیں ملتی۔

۷۔ مثنوی سراپائے معشوق : یہ مثنوی جیسا کہ اس کے نام سے ہی ظاہر ہے معشوق کے سراپا کی تعریف کے بیان میں ہے یہ ایک مقدمہ اور چند وصف پر مشتمل ہے۔ اس کا سال تالیف معلوم نہیں ہو سکا اور نہ ہی آزاد کے تذکرہ نویسوں نے اس بارے میں کوئی اشارہ کیا ہے۔ واضح رہے کہ آزاد نے عربی میں ۱۱۸۷ھ/۱۷۷۳ء میں مرآت الجمال کے نام سے سراپائے معشوق نظم کیا تھا۔ ممکن ہے کہ اس کے بعد انھیں اسے فارسی میں بھی نظم کرنے کا خیال آیا ہو یا عربی میں فارسی کے بعد نظم کیا ہو۔ عربی میں یہ نظم ایک سو پانچ اشعار پر مشتمل ہے جبکہ فارسی نظم میں اشعار کی تعداد ۱۲۱۵ ہے۔

خضر بانو صاحبہ نے مرآۃ الجمال کو پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں ایک قصیدہ بتایا ہے[1] جو صحیح نہیں ہے۔ اسٹوری نے مرآۃ الجمال اور سراپائے معشوق کو ایک ہی چیز سمجھا ہے۔

آزاد نے اس مثنوی میں اپنی شاعرانہ قادر الکلامی کا مظاہرہ کیا ہے۔ یہ مثنوی بھی شایع نہیں ہوئی ہے اور اس کے متعدد نسخے کتاب خانوں میں ملتے ہیں۔ قدیم ترین نسخہ جو ۱۱۶۵ھ کا مکتوبہ ہے کتابخانۂ مرعشی نجفی قم (ایران) میں موجود ہے لیکن بہت زیادہ کرم خوردہ

---

[1] مجلہ عالمگیر لاہور، سالنامہ ۱۹۳۵ء ص ۱۷۲

ہے۔ ایک نسخہ مولانا آزاد لائبریری علی گڑھ کے ذخیرہ سبحان اللہ میں بھی ہے جس کے بارے میں قیاس ہے کہ بخط آزاد ہے۔

۸۔ مثنوی معراج الکمال تکملۂ امواج الخیال : میر عبد الجلیل بلگرامی (م ۱۱۳۸ھ) نے جو آزاد کے نانا اور استاد تھے، اپنے وطن بلگرام کی تعریف و توصیف میں ایک مثنوی امواج الخیال ۱۱۰۳ھ میں کہی تھی آزاد نے اس مثنوی کا تکملہ، معراج الکمال کے نام سے کہا۔ یہ مثنوی انہوں نے ۱۱۵۱ھ میں سفر حج کے دوران مدینہ منورہ میں مکمل کی۔

۹۔ قصیدہ در تعزیت میر عبد الجلیل و میر سید محمد شاعر بلگرامی : آزاد نے یہ قصیدہ مذکورہ دونوں اشخاص کی وفات پر کہا تھا۔ اس قصیدے میں ایک سو ایک اشعار اور چار مطلع ہیں۔ قصیدے کے ہر مصرعے اور مطلع کے عنوانات سے تاریخ وفات میر عبد الجلیل نکالی گئی ہے۔ چوتھا مطلع میر سید محمد شاعر بلگرامی (م ۱۱۸۵ھ) ابن میر عبد الجلیل بلگرامی کی مدح میں ہے جو آزاد کے ماموں تھے۔ اس کا ایک نسخہ مولانا آزاد لائبریری علی گڑھ کے ذخیرۂ احسن مارہروی میں موجود ہے۔

۱۰۔ مثنوی درجواب مثنوی میر عبد الجلیل بلگرامی : میر عبد الجلیل نے فرخ سیر بادشاہ کی شادی پر ایک مثنوی کہی تھی جو مثنوی درطوی فرخ سیر بادشاہ کے نام سے مشہور ہے، ہو سکتا ہے آزاد بلگرامی نے بھی اسی سلسلے کی کوئی مثنوی کہی ہو۔ یہ مثنوی راقم السطور کے مطالعے میں نہیں آسکی ہے۔

۱۱۔ مثنوی در تاریخ شہدائے جنگ نواب سر بلند خان با راجہ ابھے سنگھ زمیندار مارواڑ : اس مثنوی کے ۱۵۷ اشعار میر سید محمد شاعر بلگرامی نے اپنی تصنیف تبصرۃ الناظرین (قلمی ص ۱۶۵-۱۶۷) پر

درج کیے ہیں۔

۱۲۔ سفر نامہ : آزاد نے اپنے سفر حج کی تفصیلات لکھی ہیں۔ اس کا واحد نسخہ کتب خانہ سالار جنگ حیدرآباد میں موجود تذکرۂ ید بیضا شمارہ ۵۴۲ کے ساتھ ہے (ورق ۱۷۰۔ ۱۷۷)

۱۳۔ چند نظمیں و رسالے : مقبول احمد صمدنی نے تفصیلات کے بغیر آزاد کے چند دیگر رسالوں اور نظموں کی طرف اشارہ کیا ہے[۱]

آزاد نے درج ذیل کتابوں کی ترتیب و تدوین بھی کی ہے :

۱۔ مآثر الامرا : یہ صمصام الدولہ شاہنواز خاں (م ۱۱۷۱ھ) کی مشہور تاریخ و تذکرہ ہے جس میں عہد اکبر سے لے کر مصنف کے زمانے تک کے سلاطین و امرا اور رجال کا تذکرہ ہے، اسے مصنف نے ۱۱۵۵ سے ۱۱۶۰ھ کے درمیانی برسوں میں بڑی محنت سے تالیف کیا تھا، ابھی کتاب مکمل بھی نہیں ہوئی تھی کہ وہ قتل کر دیے گئے اور ان کے اسباب و اموال لوٹ لیے گئے۔ اس کتاب کا مسودہ بھی اس غارت گری کا شکار ہو کر منتشر ہو گیا۔ آزاد بلگرامی نے جو مصنف کے قریبی دوست تھے، بڑی مشکل سے کتاب کے پراگندہ اوراق حاصل کر کے انکی شیرازہ بندی کی اور کتاب پر مقدمہ لکھنے کے علاوہ نامکمل تراجم کو مکمل کیا اور چند تراجم کا اضافہ کیا۔ یہ کتاب جو بیش قیمت اطلاعات و معلومات کا مجموعہ ہے۔ آزاد بلگرامی کی کوششوں سے اہل ادب کے ہاتھوں میں پہنچ سکی ہے۔ اس لیے یہ ان کا احسان عظیم ہے۔

---

[۱] حیات جلیل ۲/ ۱۶۲۔

مآثر الامرا ایشیاٹک سوسائٹی بنگال کلکتہ سے مولوی عبدالرحیم اور مولوی میرزا اشرف علی کی تصحیح کے ساتھ ۱۸۸۸ء، ۱۸۹۰ء اور ۱۸۹۵ء میں تین جلدوں میں شایع ہو چکی ہے۔ اردو اور انگریزی زبانوں میں اس کے تراجم بھی شایع ہو چکے ہیں۔ اردو میں مرحوم ایوب قادری نے اس کا ترجمہ کیا تھا جو مرکزی اردو بورڈ لاہور سے شایع ہو چکا ہے۔ جلد اول کا ایک اور اردو ترجمہ کسی نے کیا تھا جس کا مخطوطہ قومی عجائب گھر کراچی میں موجود ہے[۱]۔

انگریزی ترجمہ H. BEVERIDGE نے کیا تھا جو ۱۹۱۱ء میں کلکتہ سے شایع ہوا تھا۔ یہی ترجمہ B. PRASHAD کی نظرثانی کے بعد ۱۹۴۱ء میں کلکتہ سے ہی تین جلدوں میں شایع ہوا۔

۲۔ انیس المحققین: یہ کتاب تصوف کے موضوع پر ہے جس میں ہندوستان اور بلگرام کے کچھ صوفیہ و مشائخ کے احوال بھی ملتے ہیں لیکن اس کا خاص موضوع میر سید لطف اللہ معروف بہ شاہ لدھا بلگرامی اور ان سے متعلق کچھ دوسرے افراد کے مکتوبات اور شاہ لدھا کے ملفوظات ہیں۔ میر سید نوازش علی بلگرامی جو شاہ لدھا کے مرید تھے انھوں نے شاہ صاحب کے ملفوظات جمع کرنا شروع کیے تھے اور اس مجموعہ کا نام انیس المحققین رکھا اور آزاد بلگرامی کو نظرثانی کے لیے دیا۔ آزاد نے اس کی تصحیح و ترتیب کی اور میر سید محمد، میر سید احمد اور کچھ دوسروں کا حال اس میں اضافہ کیا اور کتاب کو چار فصلوں میں مرتب کیا۔

فصل اول: در ذکر حضرت قطب الاولیا میر سید محمد۔ یہ فصل ذیل کے دو مقصد پر مشتمل ہے۔

مقصد اول: در احوال و اقوال میر سید محمد۔

مقصد دوم: در ذکر فرزندان و مریدان میر سید محمد۔

فصل دوم: در ذکر حضرت سلطان الاولیا میر سید احمد۔ اس میں بھی دو مقصد ہے۔

---

[۱] فہرست مخطوطات اردو قومی عجائب گھر کراچی۔ از ڈاکٹر ظفر اقبال: ص ۱۹۹۔

مقصد اول : در مجملی از احوال و اقوال میر سید احمد۔

مقصد دوم : در ذکر اولاد و مریدان او

فصل سوم : در ذکر سید الاولیا میر سید لطف اللہ معروف بہ شاہ لدھا بلگرامی، اس فصل میں بھی دو مقصد ہے۔

مقصد اول : در ذکر احوال و بعضی کمالات شاہ لدھا۔

مقصد دوم : در ذکر فرزندان و مریدان وی

فصل چہارم : در چندی از رقعات شاہ لدھا بہ مریدان و پیروان خود۔

اس فصل میں شاہ لدھا کے انسٹھ رقعات مختلف لوگوں کے نام درج کیے گئے ہیں۔

آزاد بلگرامی نے میر عظمت اللہ بے خبر بلگرامی کے ترجمہ میں ان کا رسالہ گرامی نامہ نقل کیا ہے۔ جو اس کتاب کے علاوہ کہیں اور نہیں ملتا۔ راقم السطور نے اس رسالے کو مع مختصر مقدمہ مجلہ قند پارسی، شمارہ ۸ نئی دہلی میں شایع کر دیا ہے۔ ڈاکٹر فضل الرحمن ندوی مرحوم نے اپنے مضمون "علی گڑھ کے دو بلگرامی مخطوطات" مطبوعہ خدا بخش جرنل شمارہ ۶۹-۷۰، ص ۱۰۲-۱۱۴ علی گڑھ میں موجود انیس المحققین کے مخطوطے کا تعارف کراتے ہوئے بے خبر بلگرامی کے رسالے گرامی نامہ سے ایک اقتباس نقل کیا ہے اور اسے شاہ لدھا کے ایک مکتوب سے تعبیر کیا ہے درآنحالیکہ آزاد نے صراحت کے ساتھ لکھا ہے:

"... از افادۂ ایشان (میر عظمت اللہ) رسالہ ماقل و دل و رسالہ غبار خاطر و گرامی نامہ در تصوف، در این جا گرامی نامہ نقل کردہ می آید"۔ انیس المحققین: ص ۲۰۷، ۸۲ (قلمی)

انیس المحققین کے قلمی نسخے کتابخانہ آصفیہ حیدر آباد، الہ آباد آرکائیوز، سنٹرل یونیورسٹی لائبریری حیدر آباد اور مولانا آزاد لائبریری علی گڑھ ذخیرۂ حبیب گنج میں موجود ہیں

وگ کی وضاحت

از ڈاکٹر محمد نعمان خاں۔ دہلی۔

جناب نور احمد شاہتاز کا مقالہ "وگ کی شرعی حیثیت" (معارف ستمبر ۱۹۹۶ء۔ ص ۱۸۷۔ ۱۹۶) نظر سے گزرا، دراصل اس پر تو کسی فقیہ ہی کو کچھ لکھنے کا حق ہے، تاہم ذیل میں چند معروضات پیش کی جاتی ہیں۔

۱۔ مقالہ نگار نے قوم بنی اسرائیل کو مصری قوم تصور کر لیا ہے جو درست نہیں، کہاں بھٹکتی پھرتی صحرا نورد قوم بنی اسرائیل اور کہاں متمدن و ترقی یافتہ مصری قوم، پھر من وسلوی کو چھوڑ کر زمین سے اگنے والی چیزوں کی طلب "ھل من مزید" پر دلالت نہیں کرتی۔

۲۔ لفظ بارد کا بھی بظاہر صحیح (تائے مدورہ کے ساتھ) باروکہ یا "بروکہ" ہے الف کے ساتھ نہیں۔ اصل لفظ فرانسیسی میں PERRUQUE ہے اسی سے انگریزی میں PERUKE اور جرمن میں PERUECKE ہے اور انگریزی میں PERIWIG کا مختصر WIG ہو گیا ہے۔

۳۔ لفظ "ملتہ" و "جمہ" کے معنی میں عربی لغات میں جو کچھ تحریر ہے اور وصل کی جو تفصیل حدیث میں آتی ہے وہ وگ یا باروکہ پر صادق نہیں آتی بلکہ اس وگ کا مناسب ترجمہ "شعر مستعار" ہے۔

۴۔ وصل (بالوں کو بالوں میں جوڑ کر لمبا کرنا) اور وگ میں بڑا فرق ہے کیونکہ وصل (بالوں میں بالوں کا ملانا) اس لیے ہوتا ہے کہ انسان کے قدرتی بال طویل یا بہت طویل معلوم ہوں اور وگ بالوں کی (انسانی بالوں نما) ٹوپی کا نام ہے جو از قسم زینت ہے اس کی مثال ایسی ہی ہے جیسے موشے دایان کی وجہ سے فیشن کے طور پر بعض یہودیوں نے ایک آنکھ پر پٹی باندھنا شروع کر دیا تھا۔

وگ کا استعمال گنج کو چھپانے کے لیے بھی ہو سکتا ہے لیکن زیادہ تر اس کا استعمال زینت و فیشن کے لیے ہے، نیز فیشن ہی کی ایک صورت یہ ہے کہ مختلف رنگوں کے بال دکھانے کے لیے مختلف رنگوں کے بالوں کی وگ استعمال کی جاتی ہے، اس سے تغییر فی خلق اللہ لازم نہیں آتی کیونکہ یہ انسانی جسم سے خارج ہے اور کسی طور پر بھی انسان کے جسم کا جز نہیں بن سکتی، بخلاف وصل کے۔ اس میں بالوں کو اس طرح جوڑا جاتا ہے کہ دیکھنے والا اسے قدرت کا ہی کرشمہ تصور کرتا ہے البتہ وگ میں "زور" یعنی جھوٹ کا شائبہ ضرور ہو سکتا ہے کیونکہ جو لوگ اپنا گنج چھپانے کے لیے اسے استعمال کرتے ہیں یا وہ عورتیں جن کے بال چھوٹے ہیں یا وہ گنجی ہیں وہ اس عیب کو چھپانے کے لیے وگ استعمال کرتی ہیں، لیکن اس دھوکہ دہی کا اطلاق بھی صحیح معنی میں اسی وقت ہوگا جب کسی معاملے میں عیب کو مقابل کے صاحب معاملہ سے چھپایا جائے، سر راہ چلتے لوگوں کو اس سے کیا غرض کہ کسی کے بال حقیقت میں کالے ہیں یا سفید، یا گنج ہے یا نہیں، رہا عورتوں کا مسئلہ تو ان کے لیے تو عام مرد کے سامنے اپنی زینت کے اظہار کا کوئی جواز ہی نہیں۔

۵۔ مذکورہ وصل کے سلسلے میں مقالہ نگار نے علمائے مذاہب یا فقہائے امت کے اقوال کو نظر انداز کر دیا ہے تاکہ بقول ان کے قرآن و سنت سے دلیل طلب کرنے

والوں کا منھ بند کیا جاسکے لیکن اس موضوع کی وضاحت کے لیے بہتر یہی تھا کہ ان اقوال کو بھی ذکر کیا جاتا، عجیب بات یہ ہے کہ مقالہ نگار نے فقہ کی جس واحد فقہی کتاب کا حوالہ دیا ہے اس میں جہاں اس مسئلہ کو تفصیل سے بیان کیا گیا ہے اسے نظرانداز کرکے ایسی جگہ سے عبارت نقل کی ہے جہاں اس مسئلہ کا مختصراً اور ضمناً ذکر آگیا ہے جبکہ حوالہ مجلد اول ہی کا دیا ہے، جہاں تفصیل سے اس مسئلے کا ذکر آیا ہے، لیکن معارف (۱۹۱) میں پہلی عربی عبارت "الفقہ وادلتہ" کی مجلد خامس (ص ۵۶۸) سے منقول ہے نہ کہ مجلد اول سے جیسا کہ حوالہ دیا گیا ہے، راقم کو منقول عبارت کو تلاش کرنے میں خاصی دشواری کا سامنا کرنا پڑا، کیونکہ مقالہ میں مجلد خامس کا ذکر سرے سے ہے ہی نہیں۔

مقالہ نگار نے مذکورہ عبارت میں "وصل الشعر بشعر الآدمی" کا ترجمہ وگ کیا ہے جو درست نہیں، سہولت کے لیے یہاں مناسب ہوگا کہ اصل عبارت نقل کر دی جائے۔ ڈاکٹر وہبہ زحیلی نے اپنی کتاب "الفقہ الاسلامی وادلتہ" (ج ۱، ص ۳۱۲-۳۱۴، بیروت، ۲، ۱۹۸۵ء) میں وصل اور متعلقات کی تفصیل بیان کی ہے، لیکن متن میں "لعن اللہ الواصلۃ والمستوصلۃ" والی حدیث بیان نہیں کی ہے، بلکہ وہ ضمناً مفہوم ہے، ان کی عبارت ملاحظہ ہو:

واللعنۃ علی الشیٔ تدل علی	کسی چیز پر لعنت اس کے حرام
تحریمہ، لان فاعل المباح لا	ہونے کی دلیل ہے، کیونکہ مباح کام
تجوز لعنتہ، وعلی ھذا فلا یجوز	کرنے والے پر لعنت جائز نہیں،
وصل شعر المرأۃ بشعر آخر	اس لیے اس حدیث کی بنا پر عورت

لهذا الحديث، واما وصله
بغير الشعر: فان كان بقدر
ماتشد به راسها فلا باس به،
لان الحاجة داعية اليه، ولا
يمكن التحرز منه، كذلك لا
يحرم في الاصح مايزيد عن
الحاجة ان كان فيه مصلحة
من تحسين المرأة لزوجها
من غير مضرة، وقال مالك:
الوصل ممنوع بكل شئ سواء
وصلته بشعر او صوف او
خرق لحديث جابر: "ان النبي
صلى الله عليه وسلم زجر ان
تصل المرأة برأسها شيئا"
(بالاشارة الى نيل الاوطار ج ا
ص ۱۹۱)۔

کے بال کو دوسرے بالوں کے ساتھ
جوڑا نہیں جا سکتا، بالوں کو بالوں کے
علاوہ کسی دوسری چیز سے جوڑنے
سے متعلق تفصیل یہ ہے کہ اگر وہ چیز
اس مقدار میں ہے کہ اس سے سر
گوندھ لیا جائے تو اس میں کوئی حرج
نہیں کیونکہ یہ ضرورت میں داخل ہے،
اور اس سے بچا نہیں جا سکتا، اگر
وہ ضرورت سے زیادہ ہے تب بھی
اصح یہی ہے کہ اس کا جوڑنا بھی حرام
نہیں، بشرطیکہ اس سے شوہر کے لیے
اس کی بیوی کی زینت مقصود ہو
اور اس میں کسی قسم کا ضرر بھی نہ ہو
امام مالکؒ کا قول یہ ہے کہ بالوں
کے ساتھ کسی بھی چیز کا جوڑنا ممنوع
ہے، خواہ وہ چیز بال ہو یا اون یا
دھجیاں۔ چونکہ حضرت جابرؓ کی حدیث
میں ہے کہ "نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم
نے اس بات سے منع فرمایا کہ عورت

کسی چیز کو اپنے سر سے جوڑے۔ (باندھے)" (بحوالہ نیل الاوطار ج ۱، ص ۱۹۱)

وقد فصل الشافعية والحنابلة امر وصل الشعر فقالوا: ان وصلت المرأة شعرها بشعر آدمي، فهو حرام بلا خلاف سواءً أكان شعر رجل ام امرأة، وسواءً أكان شعر قريب محرم ام زوج ام غيرهما لعموم الادلة ولانه يحرم الانتفاع بشعر الآدمي و سائر اجزائه لكرامته بل يدفن شعره وظفره و سائر اجزائه۔

شوافع اور حنابلہ نے اس مسئلہ میں یہ تفصیل بیان کی ہے کہ اگر عورت اپنے بال کسی انسانی بال سے جوڑے تو وہ بغیر کسی اختلاف کے حرام ہے، خواہ وہ بال کسی مرد کے ہوں یا عورت کے، کسی رشتہ دار محرم کے ہوں یا شوہر کے یا ان دونوں کے علاوہ کسی اور کے، کیونکہ دلائل عام ہیں، اور اس لیے بھی کہ انسان کو حاصل شرف کی وجہ سے اس کے بال یا اس کے حصوں یا اجزاء سے کسی قسم کا فائدہ اٹھانا حرام ہے، بلکہ اس کے ناخن، بال اور تمام (جدا ہونے والے) اجزاء کو دفن کیا جائے گا۔

وان وصلته بشعر غير آدمي: فان كان شعراً نجساً، وهو عندهم شعر الميتة وشعر

دوسری صورت یہ ہے کہ غیر انسانی بالوں سے عورت کے بالوں کو جوڑا جائے، اگر یہ غیر انسانی بال نجس ہیں

مالا یوکل لحمہ اذا انفصل فی حیاتہ، فھو حرام ایضا للحدیث ولانہ حمل نجاسۃ فی صلاتھا وغیرھا عمداً، وھاتان الحالتان یستوی فیھما المرأۃ المزوجۃ وغیرھا من النساء والرجال۔

اور وہ ان حضرات کے نزدیک مردار کے بال اور ان جانوروں کے بال ہیں جن کا گوشت کھانا جائز نہیں۔ جبکہ وہ ان کی زندگی میں کسی طرح علیحدہ ہو گئے ہوں۔ تو یہ صورت بھی (مذکورہ) حدیث کی وجہ سے حرام ہے اور اس لیے بھی کہ وہ نماز وغیرہ میں قصداً نجاست کی حامل ہونے کی مرتکب ہوئی، ان دونوں حالتوں میں شادی شدہ وغیر شادی شدہ عورت و مرد یکساں ہیں۔

واما الشعر الطاھر من غیر الآدمی: فان لم یکن لھا زوج فھو حرام ایضا، وان کان لھا زوج یجوز لھا فی الاصح باذن الزوج والا فھو حرام (ج ۱، ص ۳۱۳ و ۳۱۴)

رہی تیسری صورت یعنی غیر انسانی پاک بال کی تو یہ صورت بھی اس عورت کے لیے حرام ہے جس کا شوہر نہیں، اگر اس کا شوہر موجود ہے تو اس صورت میں اصح قول کے مطابق شوہر اجازت دے تو جائز ورنہ حرام۔

مزید واضح انداز میں یہ مسئلہ فقہ السنۃ از السید سابق رحمہ اللہ (ج ۳ ص ۴۸ و ۴۹) میں "النھی

عن ان تصل المرأۃ شعرھا بشعر غیرھا" کے عنوان کے تحت دیکھا جاسکتا ہے۔

حقیقت میں جس موضوع پر مقالہ نگار نے بحث کی ہے وہ وصل (بالوں کو بالوں سے جوڑنے) کی شرعی حیثیت ہے نہ کہ وگ کی، اگر وصل کی حرمت اور وگ کی حرمت کی علت ایک ہے تو اس کی وضاحت کی جانی چاہیے تھی نہ یہ کہ دونوں کو ایک ہی قرار دیدیا جائے۔ یہاں یہ اور عرض کرتا چلوں کہ موسوعۃ فقہ ابراہیم النخعی (متوفی ۹۵ یا ۹۶ھ) ج ۲ ص ۳۳۰ میں اس بات کی وضاحت ہے کہ" لا باس ان تضع المرأۃ علی رأسھا الشعر بغیر وصل" یعنی عورت کے لیے اس میں کوئی حرج نہیں کہ وہ بغیر جوڑا ہوا بال اپنے سر پہ رکھ لے۔

یہ ہے صحیح وگ کی صورت، وگ اگر کسی حرام مادہ سے بنی ہو تو وگ کے حرام ہونے میں کوئی شبہ نہیں، حلال مادہ سے بنی صورت میں صرف اسی وقت حرام ہوگی جبکہ وصل اور وگ میں کوئی علتِ تحریم مشترک ہو، مطلق وصل کی بنیاد پہ حرام نہ ہوگی کیونکہ دونوں ایک چیز نہیں ہیں۔ یہ بات بھی پیش نظر رہے کہ احادیث مذکورہ میں تحریم عورتوں کے لیے ہے اور شرعی حکم میں عورت مرد کی تابع ہے مرد اس کا تابع نہیں۔ امید ہے کہ یہ وضاحت اس مسئلے کو سمجھنے میں معاون ہوگی۔

مصادر

۱۔ الفقہ الاسلامی وادلتہ/الدکتور وھبۃ الزحیلی/ج ۱۔ ۸/دارالفکر۔ دمشق (ط ۲) ۱۹۸۵ء۔ ۲۔ فقہ السنۃ/الشیخ السید سابق/ج ۱۔ ۳ (الطبعۃ الشرعیۃ) ۷/ بیروت ۱۹۸۵ء۔ ۳۔ موسوعۃ فقہ ابراھیم النخعی/الدکتور محمد رواس قلعہ جی/ج ۱۔ ۲/جامعۃ الملک عبد العزیز/مکۃ المکرمۃ (ط ۱) ۱۹۷۹ء۔

معارف کی ڈاک

مکتوب علی گڑھ

علی گڑھ

۹۶-۱۲-۲۸ء

مکرمی و محترمی ! السلام علیکم

دسمبر ۱۹۹۶ء کے معارف میں پروفیسر ضیاء الحسن فاروقی مرحوم سے متعلق عبداللطیف اعظمی صاحب کے مضمون میں بعض تسامحات جگہ پا گئے ہیں۔

۱۔ ضیاء صاحب نے ۱۹۴۸ء میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے ایم۔اے نہیں، بی اے کیا تھا۔ ایم۔اے انہوں نے ۱۹۵۰ء میں الہ آباد یونیورسٹی سے کیا اور ڈپلومیسی اور بین الاقوامی سیاسیات وہیں ان کے مضامین تھے۔

۲۔ جب جامعہ ملیہ اسلامیہ میں عبدالغفار خاں چیئر اور ذاکر حسین چیئر قائم ہوئیں تو ضیاء صاحب کا تقرر ذاکر حسین چیئر پر ہوا اور وہ دو سال اس پر فائز رہے۔ عبدالغفار خاں چیئر پر محترمہ قرۃ العین حیدر کا تقرر ہوا تھا۔

۳۔ ضیاء صاحب نے انگریزی میں مولانا ابوالکلام آزاد کی جو سوانح لکھی ہے اور اس وقت زیر اشاعت ہے وہ مکمل نہیں ہے بلکہ پہلی جلد ہے جو مولانا کی ۱۹۴۰ء تک کی زندگی کا احاطہ کرتی ہے۔ دوسری جلد لکھنے سے قبل افسوس ہے کہ ضیاء صاحب کی وفات ہوگئی۔

نیازمند : ریاض الرحمٰن خاں شروانی

وفیات

ڈاکٹر شجاعت علی سندیلویؒ

دسمبر کے آخری عشرے میں اردو کے ایک بڑے عاشق و مجاہد، اچھے استاذ اور صاحب قلم ڈاکٹر شجاعت علی سندیلوی چل بسے۔ وہ ۱۹۱۶ء میں اودھ کے مشہور قصبہ سندیلہ کے ایک علمی خانوادے میں پیدا ہوئے، ان کے والد مولوی عنایت علی صدیقی بھی ذی علم شخص تھے۔

شجاعت صاحب کا اصل مشغلہ درس و تدریس تھا۔ ممتاز ڈگری کالج اور لکھنؤ یونیورسٹی میں اردو کی تدریسی خدمات انجام دے کر سبکدوش ہوئے تو اپنے گھر پر اور اردو اکادمی میں طلبہ کو اردو پڑھاتے رہے۔

انہوں نے "حالی بحیثیت شاعر" کے عنوان سے تحقیقی مقالہ لکھ کر پی۔ ایچ۔ ڈی کی ڈگری لی، ان کا یہ مقالہ کتابی صورت میں چھپ کر مقبول ہو چکا ہے جو حالی پر مستند اور معیاری کام ہے، اس کے علاوہ بھی متعدد ادبی تنقیدی اور تحقیقی کتابیں یادگار چھوڑیں۔ اردو اور ہندی کی بعض نصابی کتابیں بھی ترتیب دیں۔ وہ اردو کی مختلف تنظیموں سے وابستہ تھے۔ انجمن ترقی اردو اور اتر پردیش انجمن اساتذۂ اردو کے سرگرم ممبر تھے، ادارۂ فروغ اردو سے ان کا گہرا تعلق تھا۔ اس کے ماہانہ رسالہ فروغ اردو کے خاص نمبروں کی ترتیب و تدوین میں ان کا بھی حصہ تھا۔

مرحوم اودھ کی روایتی شرافت، وضع داری، تواضع اور اخلاق کا نمونہ اور بڑی پاکیزہ اور دلکش شخصیت کے حامل تھے، راقم کو ان سے دو ایک بار ہی ملنے کا اتفاق ہوا مگر انکے

خلوص، انکسار، شرافت اور شائستگی کا نقش اب تک دل میں بیٹھا ہوا ہے۔

اردو کے اس بحرانی دور میں اس کے ایسے مخلص اور سراپا عمل خدمت گزار کا اٹھ جانا بڑا حادثہ ہے، اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت فرمائے اور ان کے پس ماندگان خصوصاً چھوٹے بھائی شفاعت علی صدیقی صاحب کو صبر و شکیب عطا فرمائے۔ یہ سطریں تحریر کی جاچکی تھیں کہ شفاعت صاحب پر بھی شدید قلبی دورہ کی خبر ملی، اللہ تعالیٰ انہیں صحتیاب کرے۔ آمین

ڈاکٹر وحید اختر

افسوس ہے مشہور شاعر و نقاد ڈاکٹر وحید اختر بھی وفات پاگئے، ان کی پیدائش اور ابتدائی تعلیم اورنگ آباد میں ہوئی۔ جامعہ عثمانیہ حیدرآباد سے فلسفہ میں ایم۔ اے اور پی۔ ایچ۔ ڈی کی پھر علی گڑھ مسلم یونیورسٹی آئے اور پروفیسر، صدر شعبۂ فلسفہ اور ڈین ہوئے۔

خواجہ میر درد پر بہت کم کام ہوا ہے، ان کی کتاب "خواجہ میر درد۔ تصوف اور شاعری" سے اس کمی کی تلافی ہوگئی جس کی علمی و ادبی حلقوں میں بڑی پذیرائی ہوئی۔ فلسفہ ادبی تنقید اور غالب وغیرہ پر انہوں نے جو کچھ لکھا ہے وہ قدر و قیمت کا حامل اور ان کے اچھے ادبی و تنقیدی ذوق کا ثبوت ہے۔ ڈاکٹر وحید اختر کے متعدد شعری مجموعے بھی شایع ہوئے ہیں، انہیں نظم و غزل دونوں پر قدرت تھی۔ ان کی شاعری مسائل عصر کی ترجمانی ہے۔

اللہ تعالیٰ ان کی بشری لغزشوں سے درگزر فرمائے اور ان کے ساتھ رحم و مغفرت کا معاملہ فرمائے۔

"ض"

باب التقریظ والانتقاد

سید سلیمان ندوی۔ حیات اور ادبی کارنامے

پر ایک نظر

از جناب سبط محمد نقوی صاحب۔ اڈیٹر ہماری توحید لکھنؤ۔

یہ سید محمد ہاشم صاحب کا مقالہ تحقیق[1] ہے۔ جس کے لیے بقول محقق شعبۂ اردو مسلم یونیورسٹی نے ان کا انتخاب کیا تھا اور شعبہ کے لائق و فائق استاد ڈاکٹر نادر علی خاں صاحب کی نگرانی میں ۱۹۸۲ء میں یہ مقالہ مرتب و مکمل ہوا اور اسی سال یونیورسٹی نے اس پر پی، ایچ، ڈی کی ڈگری تفویض کی۔

تقریباً بارہ سال یہ مقالہ منتظر اشاعت پڑا رہا پھر فخرالدین علی احمد میموریل کمیٹی اترپردیش سرکار نے گرانقدر مالی امداد منظور فرما کے طباعت و اشاعت کی دشواریاں دور کیں اور ۱۹۹۵ء میں ڈمائی تقطیع پر فوٹو آفسٹ پر چھپ کے شایع ہوا۔

پروفیسر ڈاکٹر ظہیر احمد صدیقی سابق صدر شعبۂ اردو، دہلی یونیورسٹی نے جو اس مقالے کے ایک ممتحن بھی تھے۔ پیش لفظ لکھ کر کتاب کا بھاؤ بڑھا دیا ہے۔ پروفیسر صدیقی فرماتے ہیں:۔

"انھوں نے بہت گہرائی سے اس موضوع پر مطالعہ کیا ۔۔۔ اور کوشش کی ہے کہ روایات سے ہٹ کر تاریخ و تحقیق کی میزان پر اس کا تجزیہ کیا جائے .... حقیقت

---

[1] فاضل محقق اپنی تحقیق کے سلسلے میں دارالمصنفین بھی تشریف لائے مگر انھوں نے اپنا مقالۂ تحقیق کسی وجہ سے یہاں نہیں بھیجا۔

یہ ہے کہ مصنف کے انکسار کے باوجود یہ کام بہت وقیع ، لائق مطالعہ و توجہ اور قابل قدر

ہے اور اردو کے ادبی سرمائے میں گرانقدر اضافہ ہے ۔۔۔ " (ص۸)

اس بات میں کوئی شک نہیں کہ یہ کتاب اس نقطۂ نظر سے صد درجہ لائق مطالعہ و توجہ ہے کہ ہماری دانش گاہوں میں تحقیق کا معیار کیا ہو گیا ہے ۔ سپروائزر صاحبان ، ممتحن حضرات اکاڈمیوں اور کمیٹیوں کے مبصر صاحبان کتنی لگن اور ذمہ داری سے تحقیق کا وارڈ ڈی پر خاطر فرماتے ہیں اور اردو کے ادبی و تحقیقی سرمائے میں جو اضافہ فرماتے ہیں وہ کس قدر ذرد مایہ اور گمراہ کن ہوتا ہے ۔ اس کتاب میں فاضل محقق نے ابتدا بہ سکون کا کمال دکھایا ہے ، یعنی "پس منظر" کے عنوان سے لکھے گئے پہلے باب سے ہی نہایت گمراہ کن اطلاعات کی فراہمی شروع کر دی ہے ۔ بسم اللہ بہتوں کی غلط ہوتی ہے ، لیکن یہاں کا عالم ہی دوسرا ہے ۔

ہندوستان کی اسلامیات سے معمولی حس و مس رکھنے والے حضرات بھی جانتے ہیں کہ شاہ ولی اللہ صاحب دہلوی اور آپ کا دبستان دینیات یعنی فقہ و حدیث اور تفسیر کا ایک قدیم مرکز رہا ہے ۔ یہ علوم اصطلاحی طور پر منقولات کہے جاتے ہیں ۔ کم و بیش اسی خانوادہ بزرگ کا معاصر اودھ میں انصاریان سہالی کا ایک خانوادہ رہا ہے جو سربراہ خانوادہ ملا قطب الدین کے خون ناحق کے بعد لکھنؤ آکے پناہ گزین ہوا اور "خانوادہ فرنگی محل" کے نام سے علمی تاریخ میں ممتاز ہوا اور ملا صاحب کی شناخت ملا قطب الدین شہید سے تاریخ نے معین کی ۔ ع

گل بر اندازہ ہے خون شہدا کی لالی

۱؎ تذکیر و تانیث میں مقالہ نگار کے اپنے خاص مرجحات ہیں ۔

یہ جملہ معترضہ غالباً یہاں بے محل نہ ٹھہرایا جائے کہ خود دلی میں بھی خانوادۂ خیرآباد معقولات میں ممتاز مقام رکھتا تھا اور خانوادہ ولی اللہی کا متوازی مرکز درس تھا اور خانوادہ فرنگی محل سے مستفیض تھا۔ شاہ عبدالعزیز دہلوی اور مولانا فضل امام معاصر تھے۔ خانوادۂ خیرآباد کے بارے میں معتبر روایتیں ملتی ہیں کہ یہ منقولات میں خانوادہ ولی اللہی سے بھی شرف یاب تلمذ ہوا۔ لیکن خانوادۂ فرنگی محل کی نسبت ایسی کوئی روایت دیکھنے یا سننے میں نہیں آئی کہ وہ ولی اللہی دبستان سے مستفیض ہوا ہو۔ یہ اس قلیل الاطلاع راقم کی بے علمی ہو سکتی ہے اور اس مذاکرے میں تحقیقی صورت حال ابھر آنے کے تمام امکانات موجود ہیں۔ محقق گرامی البتہ استاذ الہند ملا نظام الدین فرنگی محلی کی نسبت افادہ فرماتے ہیں:

> "شاہ ولی اللہؒ، شاہ رفیع الدینؒ، شاہ عبدالعزیزؒ، سید احمد شہید اور شاہ اسمٰعیل شہیدؒ نے قرآن کریم کے فارسی اور اردو ترجمہ، صحاح ستہ کی تعلیم، تبلیغ دین اور بعض علوم اسلامی کو اردو زبان میں منتقل کر کے اس سرمائے میں بیش بہا اضافہ کیا۔ ان حضرات کی جدوجہد کے مراکز دہلی اور لکھنؤ تک ہی محدود نہیں رہے بلکہ اس شمع کی قندیلیں ملک کے ہر صوبے اور ہر علاقے پر ضوفشانی کرتی رہیں۔ ان حضرات کے تلامذہ میں سے ملا نظام الدین فرنگی محلی کو اتنی مقبولیت حاصل ہوئی کہ عربی مدارس میں جو نصاب "درس نظامی" پڑھایا جاتا ہے وہ انہیں کے نام سے منسوب ہے ..." (ص۱۱)

فاضل محقق نے یہ تصریح نہیں فرمائی کہ ملا صاحب نے ان بزرگواروں سے کہاں استفادہ فرمایا! کیا زانوے ادب تہہ کرنے کے لیے شد رحال کیا یا ان نامبردہ اساتذہ نے لکھنؤ قدم رنجہ فرمایا۔ یہ روایت تلمذ کہاں سے لی گئی، اس کا بھی اشارہ نہیں کیا گیا ہے!

خیر! اس سوال کو چھوڑیں، اس مبینہ شاگرد اور مذکورہ اساتذہ کی عمروں کا تفاوت ملاحظہ فرمائیں۔

۱۔ شاہ ولی اللہؒ کی ولادت ۱۱۱۴ھ میں ہوئی۔ استاذ الہند ملا نظام الدین کا سنہ ولادت ۱۰۸۹ھ ہے۔ یہ استاذ معظم شاگرد سے محض (چھبیس سال) صغیر السن تھے۔

۲۔ شاہ رفیع الدینؒ :۔ استاذ الہند کے یہ استاذ' شاگرد کی وفات کے بس دو برس بعد اس عالم کون و فساد میں وارد ہوئے۔ ملا صاحب کی وفات ۱۱۶۱ھ میں ہوئی۔ اور شاہ صاحب کی ولادت ۱۱۶۳ھ کا واقعہ ہے۔

۳۔ شاہ عبدالعزیزؒ: ملا صاحب کے یہ استاد ۱۱۵۹ھ میں متولد ہوئے اور ہاشم صاحب کے تراشے شاگرد ۱۱۶۱ھ میں چل بسے۔ یعنی ۶۹ سالہ علامۂ وقت نے دو برس کے بچے سے استفادۂ کمالات کیا۔

۴۔ سید احمد شہیدؒ کا سنہ تولد ۱۲۰۱ھ یعنی ملا نظام الدین کی وفات کے ۴۰ (چالیس) سال بعد۔

۵۔ شاہ محمد اسمٰعیل شہیدؒ ۱۱۹۳ھ میں پیدا ہوئے۔ ملا صاحب اس کے ۳۴ (چونتیس) سال قبل جاں بحق تسلیم ہوچکے تھے۔

جہانتک سید احمد شہید کا سوال ہے۔ آپ کے سوانح جناب مولانا ابوالحسن علی ندوی نے دو جلدوں میں لکھے ہیں۔ حق یہ ہے کہ تحقیق و سعادت مندی کا حق ادا کیا ہے۔ سید صاحب کے روحانی تصرفات اور کشف و کرامات کا مفصل تذکرہ فرمایا ہے۔ لیکن تحصیلی حالت سطحی بتائی ہے۔ سید صاحب ابجدی تعلیم میں ملا نظام الدین تو خیر' شاید کسی متنفس کے بھی استاد نہ ہوں! ہاں ارشاد و اصلاح کے فیضان سے

ایک دنیا مستفید ہوئی۔ آپ مرشد کی حیثیت سے نہیں" امام زمانہ" کی حیثیت سے اپنے متبعین و متقلدین میں پہچانے گئے" اور" امیر المومنین" کی لفظ سے یاد کیے گئے۔ لیکن جیسا کہ عرض کیا گیا آپ استاد الہند سے بہت متاخر تھے۔ اس لیے آپ کی طرف ملا صاحب کی نسبت تلمذ سراسر لاعلمی و غیر ذمہ دارانہ نگارش پر مبنی ہے اور کمال بے تحقیقی کا شاہکار ہے۔

صاف معلوم ہوتا ہے کہ اس مقالہ تحقیق سے مربوط متعلم و معلم حضرات دبستان ولی اللٰہی اور خانوادۂ فرنگی محل سے عارفانہ تو کیا واقف کارانہ تعلق بھی نہیں رکھتے یا اب ریسرچ کا کام اتنا لایعنی ہو گیا ہے کہ درست و نادرست کی پرکھ کی ضرورت باقی نہیں رہ گئی ہے۔ ورنہ یہ سمجھنا کوئی بڑی دشوار بات نہیں ہے کہ یہ دونوں دبستان اگر مدمقابل نہ بھی رہے ہوں تو متوازی و منفرد ضرور تھے۔ فرنگی محل کی علمی روداد پیش کرتے ہوئے اسی خانوادے کے اس وقت فرد فرید پروفیسر ڈاکٹر ولی الحق انصاری نے ماہنامہ نیا دور لکھنؤ کے اودھ نمبر حصہ اول میں تحریر فرمایا ہے کہ:

" ملا نظام الدین کے عہد میں پہلی مرتبہ اسلامی مدارس کے لیے متفقہ درس ترتیب دینے کا خیال پیدا ہوا، چنانچہ دہلی میں شاہ ولی اللہ صاحب نے اپنے درس میں منقولات پر زیادہ زور دیا جبکہ نظام الدین نے اپنے ترتیب دادہ درس نظامی میں منقولات و معقولات دونوں کو یکساں زور دیا تھا۔ ملا نظام الدین کے ترتیب دادہ اس درس نے پورے ملک میں شرف قبولیت حاصل کیا اور آج تک زیادہ تر مدارس میں اسی کے مطابق تعلیم دی جا رہی ہے۔" (ص۱۴)

لہ مقالہ نگار کے تذکیر و تانیث کے اپنے ترجیحات ہیں۔

یہ اقتباس تو اس لیے پیش کیا گیا کہ ہاشم صاحب کے ثمرۂ تحقیق سے شادکام ہونے والے طلبا و مبتدئین یہ بیان بھی پیش نظر رکھیں لیکن جو بات ان کے پیش نظر رہنا چاہیے تھی وہ یہ ہے کہ شاہ عبدالعزیز نے استاذ الہند کے فرزند رشید عبدالعلی کو "بحرالعلوم" کے خطاب سے کن حالات میں مخاطب کیا۔ یہ بہت مشہور واقعہ ہے اور فرنگی محل کے وقایع نگاروں نے اسے عام طور سے بیان کیا ہے۔ یہ روداد بھی آپ پروفیسر ولی الحق انصاری کی ہی لفظوں میں ملاحظہ فرمائیں:

"نواب ارکاٹ نے انہیں "ملک العلماء" کا خطاب عطا فرمایا۔ "بحرالعلوم" کا خطاب انہیں مشہور زمانہ بزرگ شاہ عبدالعزیز سے عطا ہوا تھا اور اس کا قصہ یہ ہے کہ ملاحسن کے قیام دہلی کے دوران شاہ عبدالعزیز کے ایک شاگرد ان سے بحث میں الجھ گئے لیکن ملاحسن کے جوابوں سے وہ اتنا متاثر ہوئے کہ شاہ عبدالعزیز صاحب کے پاس واپس ہوکر انہوں نے ملاحسن کے علم و فضل کی تعریف کی۔ جس کے جواب میں شاہ صاحب نے فرمایا کہ یہ معقولی حدیث و قرآن سے بے خبر ہوتے ہیں۔ کسی نے اس گفتگو کی اطلاع ملا عبدالعلی کو دی۔ جنھوں نے علم فقہ میں "ارکان اربعہ" لکھ کر شاہ صاحب کو روانہ کر دی، جسے پڑھ کر شاہ صاحب اتنا متاثر ہوئے کہ انہوں نے اپنے خط میں ملا عبدالعلی کو "بحرالعلوم" کے خطاب سے یاد فرمایا اور اس وقت سے یہ خطاب نام سے زیادہ مشہور ہوگیا۔" (اودھ نمبر ص ۱۲)

ستمبر ۹۳ء کے معارف کے مضمون:..... مدرسہ اعظم کے مضمون نگار جناب کاوش بدری اس میں اضافہ فرماتے ہیں کہ:

"اگرچہ "ملک العلماء" کا خطاب ایک تخت نشین والی (نواب عمدۃ الامراء مدارسی) کا

عظام گڑھ ہے اور "بحر العلوم" کا خطاب ایک "بوریہ نشین" ولی کا ارشاد ہے۔ لیکن جو مقبولیت ولی کے ارشاد کو ہوئی وہ والی کے خطاب کو نہ ہوئی" (ص ۲۳۳)

لیکن جب موضوع سے مانوسیت ہی نہ ہو تو پھر آپ ان چیزوں کی توقع کر بھی کیسے سکتے ہیں۔ اب ہم آگے بڑھیں۔

شبلی کی تاریخ ولادت

مولانا سید سلیمان سے متعلق مقالہ تحقیق میں ان کے معمار کی تاریخ ولادت کچھ ایسی اجنبی بات نہیں مگر قدرتی بات بھی نہیں۔ لیکن اس میں اگر کوئی بھید ہے تو شاید آگے کھلے۔ یہاں تو بس آپ یہ ملاحظہ فرمائیں کہ ملک کے جہاد آزادی کی تاریخ سے ہمارے محقق کو کس درجہ بیگانگی ہے۔ انہوں نے مولانا کی تاریخ ولادت ۱۰ مئی بتائی ہے۔ (ص ۲۹۳) یہ تاریخ محقق خبیر کو کہاں سے ملی! یہ ماجرا ملاحظہ فرمایئے۔ حیات شبلی میں سید صاحب نے اپنے استاذ علامہ کی تاریخ ولادت کا ذکر اس طرح کیا ہے۔

"مولانا شبلی مرحوم کی ولادت ذیقعدہ ۱۲۷۳ھ مطابق مئی ۱۸۵۷ء میں عین اس ہنگامہ خیز زمانہ میں ہوتی جو عام طور سے غدر کے نام سے مشہور ہے اور یہ بھی عجیب اتفاق کہ عین اس دن ولادت ہوئی جس دن ضلع اعظم گڑھ کے باغیوں کی ایک جماعت نے ڈسٹرکٹ جیل کے پھاٹک کو توڑ ڈالا..."

چونکہ اس معرکے کا آغاز میرٹھ میں ۱۰ مئی ۱۸۵۷ء کو ہوا تھا اس لیے فاضل محقق نے یہ طے کر لیا کہ یہ لڑائی سارے کے سارے صوبے میں ایک ہی دن پھیل گئی اور اعظم گڑھ میں اسی دن اتنی منظم و طاقت ور ہو گئی کہ انقلابیوں نے سرکاری پہرہ چوکی دھتا بتا کے جیل کا پھاٹک توڑ دیا اور بہت سے قیدیوں کو نکال لے گئے۔ ادھر تو

نہ فرمائی کہ اگر اسی دن کا واقعہ ہوتا تو سید صاحب خود ہی یہ تاریخ ذکر فرما دیتے۔ اس نشاندہی کی کیوں ضرورت پڑتی کہ عین اس دن... جس دن جیل کا پھاٹک توڑ ڈالا گیا تھا۔ لیکن ایسا لگتا ہے کہ محقق مکرم بڑے سلیقے سے ناکامیوں سے کام لینے کے عادی ہیں، اس لیے غور و خوض کی ضرورت نہیں سمجھتے۔ ورنہ دوران تحقیق یہ بھی تعطل کی دس سالہ مدت میں تو صحیح تاریخ معلوم ہی کر سکتے تھے۔ جس طرح شبلی نیشنل پوسٹ گریجویٹ کالج کے مرحوم استاد ڈاکٹر محمد طاہر نے مدتوں پہلے تاریخ معین کی اور اسے ماہنامہ نیا دور لکھنؤ کے شمارہ بابت ماہ جون ۱۹۸۳ء میں چھپوایا اور پھر حال میں ڈاکٹر کاظم علی خاں استاد شعبۂ پوسٹ گریجویٹ کالج لکھنؤ نے تاریخ طے کی اور اسے انجمن ترقی اردو (ہند) کے شبلی سمینار کے لیے لکھے گئے مقالے میں پیش کیا۔ اگر جنگ آزادی کی تاریخ کا جواب بہ کثرت و سہولت مہیا ہے تفحص ہاشم صاحب کرتے تو ڈاکٹر محمد طاہر مرحوم اور ڈاکٹر کاظم علی خاں سلمہ اللہ کی طرح گوہر مراد ان کے ہاتھ بھی لگتا۔ کیونکہ ان دونوں مراسلوں میں جتنے ماخذ مذکور ہوئے ہیں ان میں کم سے کم تین بہت قدیم ہیں۔ لیکن تلاش و تفحص کیسا انھوں نے تو پیش یا افتادہ قرائن کو پامال کیا۔ خیریت یہ ہوئی کہ ہاشم صاحب نے قمری تاریخ و سنہ نقل نہیں کیا۔ جس کے ذکر میں سید صاحب سے فروگزاشت ہوگئی ہے۔ معلوم نہیں وہ کون سے حالات تھے تقویم صد سالہ کا مطالعہ سید جلیل کرنے سے قاصر رہے اور ذیقعدہ کا مہینہ لکھ دیا جب کہ فی الواقع رمضان و شوال کے مہینے مئی ۱۸۵۷ء سے مصادف تھے۔ ۳ جون ۱۸۵۷ء کو جس دن اعظم گڈھ میں جیل پر انقلابیوں کا کامیاب دھاوا ہوا اور اسی دن شبلی کی ولادت ہوئی۔ شوال ۱۲۷۳ھ کی نویں یا دسویں تاریخ تھی۔ ڈاکٹر کاظم علی خاں نولکشوری یک صد و دو سالہ کے

حوالے سے نہم شوال سمجھتے ہیں۔

سادات حسینی | ڈاکٹر سید محمد ہاشم نے مرحوم مولوی سید صباح الدین عبدالرحمن دیسنوی اور غلام محمد صاحب کے تذکرۂ سلیمان کے حوالے سے بتایا ہے کہ "آپ کا ننہال زیدی اور ددھیال حسینی تھا" لیکن سید صاحب کی قلمی بیاض سے مولوی نجم الہدیٰ نے جو مادری و پدری سلسلۂ نسب بیان کیا ہے اور جسے زیر نظر کتاب کے ص۳۱ پر نقل کیا گیا ہے اس کی رو سے تو ددھیال کا سلسلہ حضرت امام علی رضاؑ پر منتہی ہوتا ہے اس لیے معمولاً انہیں "رضوی" کہا جاتا ہے۔ ہر چند یہ حسینی، فاطمی، علوی بھی ہیں لیکن معمول یہی ہے کہ شجرے میں جو امامؑ پہلے آجائیں انہیں سے نسب کی نسبت دے دی جاتی ہے۔ ننہال بے شک "زیدی" ہے اور اسے عابدی اور حسینی بھی کہا جاتا ہے۔

رئیس وفد خلافت | کسی تبصرے کے بغیر یہ عرض کرنا ہے کہ عام طور سے معلوم ہے کہ اس وفد کے راس و رئیس مولانا محمد علی مرحوم تھے۔ سید صاحب مرحوم ایک معزز رکن تھے۔ لیکن فاضل محقق نے اس کا ذکر کئی طرح سے کیا ہے۔ ص۱۲ پر رقم طراز ہیں، "وفد خلافت کے راس و رئیس" ص۱۱ پر تحریر فرماتے ہیں کہ "اس وفد کے اراکین میں مولانا محمد علی جوہر (رئیس وفد) اور پھر ص۱۳ تک پہونچتے پہونچتے سید صاحب کو خلافت کا "رئیس وفد" بنا دیتے ہیں۔ حالانکہ کتابیات میں "برید فرنگ" کا نام موجود ہے اور اس میں وہ تمام خط جمع کر دیے گئے ہیں جو سید صاحب نے اس سفر کے دوران ہندوستان بھیجے تھے۔

آزادی کامل کا مطالبہ | محقق کے رجحان طبیعت کو کیا کہا جائے۔ وہ سید سلیمان مرحوم کے لیے وہ سبھی اوصاف متحقق کر دینا چاہتے تھے جن کے خود مرحوم متمنی نہ تھے اسی سلسلے میں ہاشم صاحب سید صاحب کو

آزادی کامل کا نقیب بنا کے پیش کرنا نہیں بھولے۔ دنیا جانتی ہے کہ اس میدان کے اولین مسلم جانباز حسرت موہانی تھے۔ سید صاحب نے آزادی کامل کا جو مطالبہ پیش کیا، اس کی حقیقت بس اتنی ہے کہ سید صاحب حاصل سفر کے طور پر مرحوم مولانا عبدالباری کو تحریر فرماتے ہیں:

"۔۔۔ تو ہم کہہ سکتے ہیں کہ اگر ہم کعبہ اور مرقد اخضر آزاد کرانا چاہتے ہیں تو ہم کو ہندوستان کو آزاد کرانا چاہیے، اب ہندوستان کی آئینی آزادی میں سعی و کوشش صرف دنیاوی مسئلہ نہیں بلکہ دینی فرض اور مذہبی حق ہے۔ اب علمائے کرام کو نہ صرف درس و افتاء کی خدمات انجام دینا چاہیے بلکہ ان کو صحیح راستہ سے مسلمانوں کو وہ سمجھانا چاہیے جس سے ان کا ملک، ان کا ملک ہو، اب کانگریس اور مسلم لیگ صرف چند وکلا اور پیشہ ور اہل سیاست کی جولانگاہ نہ ہوگی بلکہ تمام مسلمان اپنے پورے (کذا) مذہبی اور دینی غیرت و حمیت کے ساتھ اس مقدس کام کے لیے آمادہ ہو جائیں گے اور اس وقت تک آرام نہ لیں گے جب تک وہ خود اپنے ملک میں آزاد نہ ہو جائیں گے ۔۔۔" (ص ۱۲۱-۱۱۹)

کتاب میں برید فرنگ ص ۱۲۱ کا حوالہ دیا گیا ہے۔ وہ درست نہیں ہے۔ ۲۶ اگست ۱۹۲۰ء کا یہ مکتوب مبارک ص ۱۱۸ پر شروع ہوتا ہے اور اقتباس کا جو حصہ ہم نے پیش کیا ہے وہ برید فرنگ کے ص ۱۱۹ پر ہے۔ یہ واقعہ ہے کہ برید فرنگ کی فہرست میں شمار ۲۳ پر اسے "ہندوستان کی آزادی کا نعرہ" سے موسوم کیا گیا ہے۔ اس کا مطلب بس یہ ہے کہ اس مجموعے میں اس خط کی حیثیت آزادی کے نعرے کی ہے۔ اس کا مطلب یہ نکال لینا کہ سید صاحب نے کسی پلیٹ فارم سے آزادی کا نعرہ لگایا یا کوئی مطالبہ برسر عام پیش کیا، سراسر من مانی ہے۔ سید صاحب کو اپنی حیثیت کا پورا ادراک تھا وہ اپنے پیچھے چھپے فضائل

کی ضرورت نہیں سمجھتے تھے اس لیے انہوں نے کمال حق پوشی کے ساتھ حسرت کی خدمتوں کا اعتراف کیا۔ڈاکٹر خلیق انجم اپنی تصنیف "حسرت موہانی" میں ص ۱۹۱ پر "نگار" کے حسرت نمبر سے سید صاحب کے مضمون کا اقتباس نقل کرتے ہیں:۔

"... آخر دسمبر ۱۹۲۱ء اصل (۱۹۲۰) میں گاندھی جی نے ہندوستان کے سوراج ملنے کی آخری تاریخ مقرر کی تھی۔احمد آباد میں کانگریس کا یہ تاریخی جلسہ تھا،محمد علی،شوکت علی، ابوالکلام نظربند تھے۔باقی حضرات شریک تھے۔ڈاکٹر انصاری اور سید محمود کے ساتھ اجلاس میں میں بھی تھا،اجلاس کے پنڈال سے باہر مسلمانوں کی قیامگاہ کے سامنے ایک شامیانے میں مغرب کے بعد خاص مسلمانوں کا جلسہ تھا،حکیم صاحب وغیرہ موجود تھے،گاندھی جی خاص طور سے مسلمانوں سے کچھ کہنے کے لیے آئے تھے،اتنے میں دیکھا کہ کانگریس کی سبجکٹ کمیٹی سے گھبرائے ہوئے بھاگتے ہوئے دو والنیٹر آئے اور گاندھی جی سے نہایت اضطراب کے ساتھ کہا "جلدی چلیے سبجکٹ کمیٹی میں حسرت موہانی صاحب نے ہندوستان کے استقلال (انڈی پنڈنس) کی تجویز پیش کر دی ہے اور کسی طرح واپس نہیں لے رہے ہیں ..." (ص ۱۹۸)

آگے کی داستان اور لذیذ ہے لیکن یہ ناچیز تحریر پیش نظر مقالہ تحقیق کی بے اعتدالیوں اور تحقیقی خامیوں کی نیت سے سپرد قلم ہو رہی ہے۔اس میں حسرت موہانی کے فضائل نہیں بیان کرنا ہیں۔البتہ اتنا اور عرض خدمت کر دوں کہ خلیق انجم نے یہ بھی بتایا ہے کہ ۱۹۱۵ء کے مسلم لیگ کے اجلاس بمبئی میں اصلاحات کی اسکیم سے متعلق جناح مرحوم نے حسرت کی تجویز میں اصلاحات کو "لوکل سلف گورنمنٹ کی اسکیم وار کے نفاذ" سے بدلوانے کی ترمیم پیش کی تھی اور جناح صاحب کی اہمیں پر اپنی ترمیم پر زور نہیں دیا تھا۔(ص ۱۹۰)

اس گزارش سے محقق مکرم سمجھ لیں گے کہ اس کاروزار میں سید صاحب حسرت کے پیشوا نہ تھے۔ اور جناب سید صاحب کیا شاید کوئی بھی مسلمان نہ تھا۔

(باقی)

مطبوعات جدیدہ

عالم اسلام کی اخلاقی صورت حال

از جناب اسرار عالم متوسط تقطیع، بہترین کاغذ و کتابت و طباعت مجلد مع گرد پوش، صفحات ۵۵۴، قیمت ۱۲۰/ روپے، پتہ: قاضی پبلشرز اینڈ ڈسٹری بیوٹرز، بی ۳۵ ۔ بیسمنٹ، حضرت نظام الدین ویسٹ، نئی دہلی ۔ ۱۳۔

اس ضخیم کتاب کی وجہ تالیف یہ بتائی گئی ہے کہ موجودہ عہد میں دوسرے اقوام وممالک کے مقابلے میں عالم اسلام کی اخلاقی حالت نہایت بدتر اور افسوسناک ہے، جس میں اصل دخل یہودی سازش اور فتنہ انگیزی کا ہے جس کا دائرہ عمل اتنا موثر اور وسیع ہو گیا ہے کہ مسلمانوں کی موجودہ نسل اپنی قابل فخر اخلاقی تاریخ سے بالکل نابلد ہو گئی ہے، عموماً اخلاق اور اخلاقی صورت حال کے الفاظ سے ذہن معروف و متعارف معنی کی جانب ہی متوجہ ہوتا ہے، لیکن اس کتاب میں اخلاق کو تہذیب و ثقافت و تمدن اور ان کے متعدد پہلوؤں کے مرادف قرار دیا گیا ہے، خیال تھا کہ اس لحاظ سے اس میں عالم اسلام کی تہذیبی و ثقافتی و تمدنی زوال کے اسباب کا جائزہ ہوگا، لیکن یہ کتاب عالم اسلام بلکہ عالم انسانیت کے خلاف یہودیوں کی مسلسل سازشوں اور ریشہ دوانیوں کی تاریخ ہے، تقریباً سو صفحات یہودی اور عیسائی آویزش کے لیے وقف کیے گئے ہیں جس میں یہ بتایا گیا ہے کہ جنگوں اور سازشوں کے ذریعہ جب یہود عالم اسلام کو تباہ و تاراج نہ کر سکے تو انھوں نے یورپ کی عیسائیت کے چہرہ اور روح کو مسخ اور مسخر کر کے عالم اسلام پر جو جدید حملے کیے

ان میں سیکولرائزیشن کا تجزیہ سب سے موثر ثابت ہوا، قریب تین سو صفحات اسی سیکولرائزیشن کے فلسفہ کی وضاحت و تشریح کی نذر کیے گئے ہیں، ان مباحث سے مصنف کے مطالعہ کی وسعت کا اندازہ ہوتا ہے لیکن مضامین کے انبار کو جس انداز سے اس خرمن میں یکجا کیا گیا ہے اس سے خوشہ چینی آسان نہیں ہے اور اس میں بڑا دخل کتاب کے اسلوب و طرز نگارش کا بھی ہے، گنجلک اور گراں بار عبارتوں، نامانوس الفاظ و تراکیب نے بھی سلاست و روانی کم کی ہے، مباحث کو سمیٹ کر نہ لکھنے کی وجہ سے جابجا تکرار ہو گئی ہے، افکار کی کثرت و گوناگونی نے اکثر مباحث کو پابند حدود نہیں رہنے دیا۔ مثلاً یہودی سیکولرائزیشن میں ہی ہندویا بھارتی سیکولرائزیشن کی بحث شروع ہو گئی اور جب اختتام کو پہونچی تو پھر سیکولرائزیشن کی تعریف اور اس نظریہ کی توجیہ کی ضرورت محسوس ہوئی۔ ایک جگہ مسلمانوں کی تاریخ عروج و زوال کے متعلق اسلامی تاریخ نگاری کی اب تک کی تمام کوششوں کو جس طرح مغربی اور یہودی فکر قرار دیا گیا ہے وہ فکر کی ژولیدگی اور پراگندہ خیالی کا عجب نمونہ ہے، فاضل مصنف نے اپنے نتائج فکر کو ایسا لگتا ہے کہ ذریعہ پیش کر کے ان کے حتمی اور قطعی ہونے کا بھی انداز اختیار کیا ہے۔ ایک حدیث شریف میں امت مسلمہ کو یہود و نصاریٰ کے تتبع سے خبردار کیا گیا، اس کے ضمن میں مصنف کو یہودی کو خواہ وہ زمرۂ قرآنی کے مطابق مسلمانوں کے کیسے ہی شدید دشمن کیوں نہ ہوں موضوع بنانا اور نصاریٰ سے یکسر صرف نظر کرنا قرین انصاف نہیں تھا، عربی عبارتوں خصوصاً قرآنی آیتوں کے بعض ترجموں میں بے احتیاطی کی گئی ہے۔ انگریزی تعبیرات بھی گنجلک اور مبہم ہیں مثلاً "دو بالکل مختلف معاشرتی عمل ہوتے ہیں، تجویزانہ اور برگزیدہ، ماقبل ماڈرن سوسائٹیاں وغیرہ" بعض عربی اور فارسی عبارتوں اور اشعار کا ترجمہ یا

خلاصہ ضروری تھا لیکن ان خامیوں سے کتاب کی قدر و قیمت پر حرف نہیں آتا، مصنف کا جذبہ قابل قدر ہے، یہ عالم اسلام سے یہودیوں کی نفرت و عناد کے موضوع پر ایک مفید اور پُر از معلومات کتاب ہے جو مصنف کی محنت و مطالعہ کا نتیجہ ہے۔

امثال القرآن از جناب مولوی محمد ثناء اللہ عمری ایم، اے،

متوسط تقطیع، عمدہ کاغذ اور کتابت و طباعت، صفحات ۲۲۴، قیمت درج نہیں،

پتہ: ادارۂ تحقیقات اسلامی، جامعہ دار السلام عمر آباد، این اے ڈسٹرکٹ، تامل ناڈو، ۶۳۵۸۰۸۔

قرآن مجید کے اسلوب و پیرایۂ بیان کی بے شمار خوبیوں اور امتیازات میں ایک دلکش انداز اس کا طرز خطاب بھی ہے، اس نے اپنے حقائق و معارف کی وضاحت و تشریح کے لیے ضرب الامثال اور تمثیل کا موثر اور دل نشین پیرایہ بھی اختیار کیا ہے، اس کے ذریعہ دقیق معارف و حکم بھی مخاطب کے لیے آسان اور قابل فہم ہو جاتے ہیں، ان قرآنی ضرب الامثال کو زیر نظر کتاب میں مختلف عنوانوں کے تحت یکجا کر دیا گیا ہے مثلاً اہل شرک، اعمال شرک، اہل نفاق، رسالت کی ضرورت، شمع رسالت، انفاق فی سبیل اللہ، سود خور، چغل خور، نقض عہد، کلمہ طیبہ، کلمہ خبیثہ، نور و ظلمت، ہدایت و ضلالت، حق و باطل وغیرہ، ہر آیت کی تمہید کے بعد اسکا ترجمہ و تشریح ہے جس میں مختلف مفسرین کے اقوال و آراء سے بھی استفادہ کیا گیا ہے، شروع میں فلسفہ امثال پر ایک عمدہ بحث کی گئی ہے، فاضل مصنف بڑے زود نویس ہیں، ان کے طرز نگارش پر اسلوب ماجدی کا خاص اثر ہے، قرآنی خدمت میں بھی شاید یہی جلوہ نمایاں ہے جس پر پہلے بھی ان کی کتابیں شایع ہو چکی ہیں، زیر نظر کتاب کو اپنے موضوع پر اردو میں غالباً پہلی مرتب و مبسوط کاوش ہونے

کیا ہم مسلمان ہیں از جناب شمس نوید عثمانی مرحوم، متوسط تقطیع، عمدہ کاغذ اور کتابت و طباعت، مجلد مع گرد پوش، صفحات ۵۸۵، قیمت ۱۲۰ روپے، پتہ: مرکزی مکتبہ اسلامی پبلشرز، دہلی نمبر ۶۔

تجلی مرحوم (دیوبند) کا یہ خاص اور مقبول عنوان تھا جسے جناب شمس نوید مرحوم پابندی سے لکھا کرتے تھے، یہ سلسلہ اس زمانے میں اتنا پسند کیا جاتا تھا کہ دوسرے رسالے بھی اسے نقل کرتے تھے، اس میں حضور اکرمؐ اور حضرات صحابہ کرامؓ کی سیرت و سوانح کے پاکیزہ واقعات کو وہ ایسے دل نشیں اور موثر انداز میں پیش کرتے کہ قلب و ذہن پر ایک خاص کیف و اثر طاری ہو جاتا، تجلی و صاحب تجلی کے بعد شمس نوید صاحب بھی مرحوم ہو گئے۔ اب مرکزی مکتبہ اسلامی نے عام فائدے کے لیے اس سلسلۂ مضامین کو نہایت اہتمام سے یکجا کر کے شایع کر دیا، پیش لفظ مدیر تجلی مولانا عامر عثمانی مرحوم کے قلم سے ہے۔

عکس در عکس از جناب محمد یعقوب اسلم، متوسط تقطیع، کاغذ اور کتابت و طباعت عمدہ، مجلد مع گرد پوش، صفحات ۱۰۴، قیمت ۶۰ روپے، پتہ: ٹمل ناڈو پبلی کیشنز ۲۶۔ امیر النساء بیگم اسٹریٹ، ماؤنٹ روڈ، مدراس ۲۔

تامل ناڈو کے جناب علیم صبا نویدی جنوبی ہند بلکہ اب پوری اردو دنیا میں ایک کامیاب شاعر و نثر نگار کی حیثیت سے معروف و مشہور ہیں، افسانہ نگاری اور وادی تحقیق کی بھی انہوں نے سیر کی ہے، لیکن ان کے نقاد ان کی حمد و نعت گوئی کے زیادہ مداح و قائل ہیں، اور اس میں انکی خاندانی نسبت و ماحول کی برکات و حسنات کا بھی دخل ہے اور اس کا اثر خود ان کی شخصیت میں نمایاں ہے، اس کتاب میں ان کے سوانح بھی بڑے دلکش انداز میں پیش کیے گئے ہیں۔ اسی ضمن میں ان کے مضامین اور کتابوں کا مفصل ذکر بھی آگیا ہے۔

ع۔ ص۔

معارف

جلد ۱۵۹ ماہ شوال المکرم ۱۴۱۷ھ مطابق ماہ فروری ۱۹۹۷ء عدد ۲

فہرست مضامین

شذرات

چند ماہ پہلے اعظم گڈھ میں مولانا سید سلیمان ندویؒ پر ایک سمینار ہوا تھا جس کی مختصر مگر جامع روداد معارف میں شایع ہو چکی ہے، سمینار کے انعقاد کا اعلان ہوتے ہی بعض حلقوں سے یہ آواز بلند ہونے لگی کہ اسے دارالمصنفین یا ندوۃ العلما کو کرنا چاہیے تھا جن کی آبیاری مدت العمر حضرت سید صاحبؒ کرتے رہے، سمینار کے انعقاد کے وقت بھی یہی باتیں کانوں میں پڑتی رہیں تو خاکسار کو بھی کچھ لب کشائی کرنی پڑی، اب بھی رہ رہ کے یہی صدا بلند ہوتی رہتی ہے اور اس کے متعلق خطوط و مراسلات بھی چھپتے رہتے ہیں، یہاں اسی تعلق سے کچھ باتیں عرض کی جاتی ہیں۔

اہل نظر جانتے ہیں کہ علامہ شبلیؒ اور مولانا سید سلیمان ندویؒ ہی نہیں، دارالمصنفین کے نظام اور اس کے شعبۂ علمی سے ایسی ہمہ جہت اور قد آور شخصیتیں وابستہ رہی ہیں جن کے خدمات اور کارنامے فراموش نہیں کیے جاسکتے۔ ان کے حالات اور کمالات کا چرچا ایک بار نہیں برابر ہوتا رہنا چاہیے۔ ان سب میں علامہ شبلیؒ کی حیثیت نیر اعظم کی ہے، جن کی علمی ضوفشانی سے پوری دنیا منور ہے، اس لیے ان کا حق سب پر مقدم ہے۔ یہ بھی واضح رہنا چاہیے کہ علامہ شبلیؒ اور مولانا سید سلیمان ندویؒ کی شخصیتیں بڑی جامع، ہمہ گیر اور بین الاقوامی تھیں، ایسی جلیل القدر اور مایۂ ناز ہستیوں پر کسی ایک جماعت یا ادارہ ہی کا حق نہیں ہوتا بلکہ یہ تمام لوگوں اور پوری قوم، پورے ملک اور پوری دنیا کی ملکیت ہوتی ہیں اس لیے ان کی یاد منانے اور ان کو خراج عقیدت پیش کرنے کا حق بھی سب کو ہوتا ہے۔ اسی بنا پر ہندوستان اور پاکستان کے مختلف حلقوں کی طرف سے ان پر سمینار بھی ہوتے رہتے ہیں اور مختلف مصنفین کی کتابیں بھی چھپتی رہتی ہیں۔

مولانا سید سلیمان ندویؒ کے زمانے میں سمینار اور کانفرنسوں کا رواج نہیں تھا، انہوں نے اپنے استاد و مربی علامہ شبلیؒ کے حالات اور کارناموں کو نمایاں کرنے کے لیے ان کی یادگاروں کو جن میں دارالمصنفین سب سے مہتم بالشان ہے مستحکم کرنے اور ترقی دینے کے لیے سعی بلیغ کی۔ ان کی متفرق تحریروں،

مقالات، خطبات، مکتوبات اور منظومات وغیرہ کو نہ جانے کہاں کہاں سے یکجا کرکے کئی کئی جلدوں میں شایع کیا اور وقتاً فوقتاً ان پر مضامین بھی لکھے اور سب سے آخر میں تقریباً ایک ہزار صفحے پر مشتمل ان کی ضخیم لائف لکھی جو اردو کے سوانحی ذخیرہ میں اپنی مثال آپ ہے، خود مولانا سید سلیمان ندویؒ کی وفات کے بعد ندوۃ العلما میں مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کی دعوت پر ایک بڑی کانفرنس ہوئی جس میں سید صاحبؒ پر مفید مضامین بھی پڑھے گئے اور بصیرت افروز تقریریں بھی ہوئیں۔ دارالمصنفین نے رسم عام کی پیروی نہ کرنے کے باوجود معارف کا سلیمان نمبر شایع کیا اور حیات شبلی ہی کی طرح مولانا شاہ معین الدین احمد ندوی نے حیات سلیمان کے نام سے ان کی ضخیم سوانح عمری لکھی اور انکے متفرق مضامین، شذرات اور دوسری نوع کی تحریریں جمع کرکے شایع کیں۔ ان کے اور علامہ شبلیؒ کے تعلق سے معارف میں برابر مضامین چھپتے رہتے ہیں۔

دراصل عظیم افراد و اشخاص کو خراج عقیدت پیش کرنے کا زیادہ مفید، بہتر اور مناسب طریقہ یہی ہے کہ ان کی یادگاروں کو استحکام و دوام عطا کرنے کی پوری کوشش کی جائے اور انہوں نے جو کچھ لکھا اور کہا ہے اس کا ایک ایک حرف اور ہر ہر لفظ قوم کے سامنے برابر پیش کیا جاتا رہنا چاہیے، اس سے پہلے ان صفحات میں اس کا ذکر بار بار آچکا ہے کہ اس وقت دارالمصنفین اور خود علامہ شبلیؒ اور مولانا سید سلیمان ندویؒ کی اکثر تصانیف ختم ہوگئی ہیں اور جو ہیں وہ گھسی پسی پلیٹوں پر ہونے کی وجہ سے پڑھی نہیں جارہی ہیں، اس لیے سب کے صاف، صحیح اور محقق اڈیشن شایع کرنے کی ضرورت ہے، لیکن اس کے لیے مزید کارکنوں کا اضافہ اور خاصا سرمایہ درکار ہے، اسی لیے یہ اپیل بھی کی جاتی رہی ہے کہ اگر دارالمصنفین خصوصاً علامہ شبلیؒ اور مولانا سید سلیمان ندویؒ کی ایک ایک کتاب کی اشاعت کی ذمہ داری چاہے فرادیٰ فرادیٰ یا کئی کئی اشخاص مل کر بھی قبول کرلیں تو اس میں تیزی آسکتی ہے، مگر ابھی تک یہ اپیل کارگر نہیں ہوسکی ہے۔ جو لوگ دارالمصنفین کو مزید

فعال اور مستحکم بنانے کی تجویزیں پیش کرتے ہیں انہیں اسی حیثیت سے خاص طور پر اس کی طرف تعاون کا ہاتھ بڑھانا چاہیے۔ قوم خواہ اپنا فرض ادا کرے یا نہ کرے ہم وابستگان دامن شبلی وسلیمان اپنا فرض خود ادا کرتے رہیں گے، ہماری غیرت گوارا نہیں کرتی کہ اس مقدس کام کے لیے بار بار اپنا سوال دہراتے رہیں۔

گزشتہ مہینے سے معارف میں قدرے تلخ لب ولہجہ میں سید صاحبؒ سے متعلق ایک کتاب پر جو عالمانہ تبصرہ شایع ہو رہا ہے۔ اس کے مصنف اپنی تحقیق کے سلسلے میں دارالمصنفین بھی تشریف لائے تھے اور جناب سید صباح الدین عبدالرحمٰن مرحوم نے انہیں ہر طرح کی سہولت بھی بہم پہنچائی تھی" مگر علی گڑھ کے سید سلیمان ندویؒ سمینار میں انہوں نے علامہ شبلیؒ کی مذمت وتنقیص پر مشتمل اپنا مقالہ پڑھا تو مرحوم کو بڑا تکدر ہوا اور انہوں نے احتجاجاً سمینار میں نہ شرکت کرنے کا فیصلہ کر لیا مگر سید حامد صاحب وائس چانسلر کی یقین دہانی پر انہیں اپنا فیصلہ تبدیل کرنا پڑا، اب یہ تحقیقی مقالہ کتابی صورت میں شایع ہوا تو مصنف نے معلوم نہیں کیوں اسے دارالمصنفین بھیجنا پسند نہیں کیا اسی لیے ہم کو جناب سبط محمد نقوی صاحب سے نہایت مخلصانہ تعلق کے باوجود ان کا تبصرہ شایع کرنے میں تامل تھا کہ جو کتاب ہمیں ملی ہی نہیں، اس کے لیے معارف کے صفحات کیوں وقف کیے جائیں مگر اس تبصرہ کے پڑھنے سے اندازہ ہوگا کہ اس کی اشاعت ضروری تھی اور یہ فرض کفایہ ادا کر کے نقوی صاحب نے ہم سب کو ممنون کرم فرمایا۔ یونیورسٹیوں میں ریسرچ اور تحقیق کے پست معیار کا جو گلہ آج کل کے فاضل مدیر جناب محبوب الرحمٰن فاروقی کر رہے ہیں اس میں وہ بالکل حق بجانب ہیں یہ تحقیق انیق اس کا بین ثبوت ہے۔

طویل عرصہ کے بعد الغزالی کا صاف اور دیدہ زیب نیا اڈیشن چھپ گیا ہے، کاغذ سامان طبع کی گرانی کے باعث دارالمصنفین کی کتابوں کی قیمت میں جنوری ۱۹۹۰ء سے اضافہ کر دیا گیا نئی فہرست کتب بھی شایع ہوگئی ہے اور اب پچھلی فہرستیں مسترد ہوگئی ہیں۔

مقالات

توراۃ وانجیل کی دو بشارتیں

جن کے مصداق محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم ہیں

از
ڈاکٹر مولانا حبیب ریحان ندوی ازہری

اسلام نسخہ شفاء یہ حقیقت ہے کہ کیمونزم، سرمایہ داری، عزلت نشینی، رہبانیت، موجودہ مسیحیت اور مغرب کا فلسفہ عصر حاضر کی بیماری کے علاج میں ناکام ہو چکے ہیں۔ ہماری رائے میں اس جانکاہ مرض کا علاج صرف یہ ہے کہ ہم فطرت بشری کے سب سے بڑے نبض شناس جناب محمد رسول اللہ علیہ وسلم کا دامن تھام لیں اور ان کے نسخہ شفا (قرآن وسنت کا قانون اسلامی) کو اپنالیں کیونکہ تاریخ انسانیت شاہد ہے کہ جب جب اس نے اس دوا کو استعمال کیا، بیماریوں سے اسے کامل ومکمل شفا حاصل ہوگئی!

اسلام انسان کو تمدن، تہذیب، ترقی اور شہریت سب کی دعوت دیتا ہے لیکن اسلامی تہذیب وتمدن کی اصل اولین یہ ہے کہ خدا کا دین اور اس کی شریعت دنیا میں نافذ ہوگی اور اس کے زیر سایہ ایسی ترقی ہوگی کہ چشم فلک حیران ہو جائیگی ورجاننے والے اس بات کو اچھی طرح جانتے ہیں کہ یورپ کی جدید صنعتی ترقی میں سال تک اسلامی علوم وتہذیب اور ترجموں کا ہاتھ ہے گو ان دونوں تہذیبوں میں

خاص فرق ہے۔ اسلامی تہذیب امن وسلامتی کا پرچم اور تمدن وثقافت کا مرکز بنی ہوئی تھی کیونکہ اس کا رشتہ اللہ سے جڑا ہوا تھا اور روحانیت کے شعلے اس میں موجود تھے اکبر کی زبان میں ؎

تعلیم مذہبی کا خلاصہ یہی تو ہے سب مل گیا اسے جسے اللہ مل گیا

لیکن جدید مغربی ترقی جنگ اور ظلم کی دعویدار بنی ہوئی ہے اخلاقی طور پر دیوالیہ ہو چکی ہے کیونکہ اس کا رشتہ خالق کائنات سے ٹوٹ چکا ہے، اس لیے اس زہر کا علاج لبنان کے صحرا میں نہیں، مکہ کے صحرا میں ہے وادی سینا اور شعیر کی چٹانوں میں نہیں بلکہ کوہ فاران کے پاس ہے۔

حضرت موسیٰ کی پیشین گوئی | بائبل کی زبان میں حضرت موسیٰؑ کی توراۃ کے آخری باب میں اپنی وفات سے قبل بنی اسرائیل کو جو برکت دی اس میں اس طرح کہا:

"خداوند سینا سے آیا اور شعیر سے ان پر آشکارا ہوا اور کوہ فاران سے جلوہ گر ہوا اور لاکھوں قدسیوں میں سے آیا۔ اس کے داہنے ہاتھ پر ان کے لیے ایک آتشی شریعت تھی" (استثناء ۳۳:۲)

حضرت موسیٰ علیہ السلام کی یہ پیشین گوئی بالکل واضح ہے، لاکھوں کے لفظ پر بحث کی ضرورت بھی نہیں تاہم علمی امانت کے طور پر اتنا بتا دینا ضروری ہے کہ اس لفظ کی اصل کے بارے میں اختلاف ہے کہ یہ اصل میں کیا تھے، کوثر نیازی صاحب لکھتے ہیں کہ:

"کتاب مقدس میں پہلے دس ہزار کے الفاظ تھے مگر جب اہل اسلام نے اس تعداد کو حضور کے صحابہ پر منطبق کر کے آپ کی صداقت کا ثبوت بہم پہنچانا شروع کیا تو اس کتاب مقدس میں یہ الفاظ بدل دیے گئے اب دس ہزار کی جگہ لاکھوں کے الفاظ ہیں[1]"

---

[1] آئینہ تثلیث مولفہ مولانا کوثر نیازی صفحہ ۱۲۲۔

یہ بات بالکل صحیح اور مدلل ہے اور اس دعوے کی دلیل آگے چل کر اس طرح دی گئی ہے کہ:

"سیکوفیلڈ ریفرنس بائبل ۱۹۱۷ء کے انگریزی ترجمہ میں دس ہزار قدسیوں کے الفاظ موجود ہیں[1]"

ربوہ کی تحقیق | لیکن حال کے اردو ترجموں میں لاکھوں کا لفظ ہے، اس کی وجہ عربی ترجمہ میں ربوات کا لفظ ہے جس پر زیر و زبر نہیں ہے، اس لفظ کی تحلیل کے لیے لغت کی مدد ضروری ہے، عربی لغت میں ربوہ دس لاکھ کو کہتے ہیں اور ربوہ بڑی جماعت مانند دس ہزار کو[2]

اس لیے اس جگہ دونوں کا احتمال ہو سکتا ہے حضرت سلیمان کے نشید الانشاد میں ربوہ کا لفظ موجود ہے جس سے مراد دس ہزار ہیں جو اردو ترجمہ میں بھی موجود ہیں۔

"میرا محبوب سرخ و سفید ہے وہ دس ہزار میں ممتاز ہے۔" (غزل الغزلات ۵:۱)

اس تفصیل سے نفس پیشین گوئی پر مطلق کوئی اثر نہیں پڑتا۔ نہ تحریف کتاب پر کوئی حیرت ہوتی لیکن ہاں۔

یُحَرِّفُوْنَ الْکَلِمَ عَنْ مَّوَاضِعِہٖ (النساء: ۴۶) الفاظ کو اس کے محل سے پھیر دیتے ہیں یعنی بدل دیتے ہیں۔

ضرور مل جاتا ہے۔ کیونکہ ہزار یا لاکھ کا لفظ محض کثرت تعداد کے اظہار کے لیے بولا جا سکتا ہے۔ نیز یہ کہ فتح مکہ کے دن اگر دس ہزار اسلام کے سپاہی موجود تھے تو جس دن

---

[1] آئینہ تثلیث مولفہ مولانا کوثر نیازی: ص ۱۴۱ [2] مصباح اللغات: مولانا عبد الحفیظ بلیاوی مادہ: ربی۔

شریعتِ الٰہیہ مکمل ہوئی یعنی حجۃ الوداع اس دن اس سے بہت زیادہ مسلمان وہاں برسرِ موجود تھے۔

الغرض حضرت موسیٰؑ کی موت سے قبل دی گئی پیشین گوئی حرف بحرف ثابت ہوئی حضرت عیسیٰؑ کے بعد جناب رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم فاران سے آئے اور جہاد ساتھ لائے نیز ایسی کامل ایسی و مکمل شریعت بھی لائے جو قیامت تک انسانوں کو راہ راست دکھائے گی۔ پیشین گوئی میں ایک خاص بات یہ ہے کہ حضرت موسیٰؑ نے حضورؐ کے بعد کسی آنے والے کی بشارت نہ دی جس کا واضح مطلب یہ ہے کہ آپ کی شریعت تا قیامت چلتی رہے گی۔

ایلیاؑ یا مسیحؑ مراد نہیں ہو سکتے پیشین گوئی سے حضرت ایلیا (الیاس علیہ السلام) بزعم یہود اس لیے مراد نہیں ہو سکتے کہ وہ یہودی عقیدہ کے مطابق قیامت سے قبل آئیں گے، فاران سے شام میں ہے، گو کتاب مقدس کے شارح فاران سے شام کا علاقہ مراد لیتے ہیں اسکی تفصیل انشاء اللہ کسی دوسرے موقع پر کی جائے گی، نیز حضرت موسیٰ نے اس آخری پیشین گوئی سے پہلے بھی جس آنے والے کی بشارت دی ہے وہ ہم یہاں بر سبیل تذکرہ نقل کرتے ہیں، تفصیلی بحث "بشارات محمدؐ کتب مقدسہ میں" جیسی کتاب میں کی جائے گی۔

> "خداوند تیرا خدا تیرے لیے تیرے ہی درمیان سے یعنی تیرے ہی بھائیوں میں سے میری مانند ایک نبی برپا کرے گا تم اس کی سننا، یہ تیری اس درخواست کے مطابق ہوگا جو تو نے خداوند اپنے خدا سے مجمع کے دن حورب میں کی تھی"۔ . . . میں ان کے لیے ان ہی کے بھائیوں میں سے تیری مانند ایک نبی برپا کروں گا اور اپنا کلام اسکے منھ میں ڈالوں گا اور جو کچھ میں اسے حکم دوں گا وہی وہ ان سے کہے گا (استثناء ۱۸: ۱۵-۱۹)

حضرت الیاسؑ موسیٰؑ کی نسل سے نہیں ہیں بلکہ ان سے بہت پہلے پیدا ہوئے تھے۔ جو موسیٰؑ کی مانند صاحب کتاب و شریعت نبی بھی نہیں تھے۔

حضرت عیسیٰؑ بن باپ پیدا ہوئے بلکہ مسیحی توان کو ابن اللہ مانتے ہیں وہ موسیٰؑ کے بھائیوں میں کیسے ہو سکتے ہیں، نیز حضرت عیسیٰؑ صاحب شریعت نہیں تھے، صاحب بشارات تھے اور خود حضرت موسیٰؑ کی شریعت کے متبع تھے، جہاد کا حکم بھی نہیں دیا تھا۔

صرف محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہی بشارت کا مصداق ہیں کہ آپ اسحاق کے بھائی اسمٰعیل کی اولاد میں سے ہیں حضرت موسیٰؑ ہی کی طرح صاحب شریعت و جہاد ہیں، تاریخ بنی اسرائیل شاہد ہے کہ موسیٰؑ کی مانند کوئی نبی نہیں آیا تو پھر قیامت سے پہلے جو بھی آئے گا، اب شریعت محمدیہ کے تابع ہوگا، مستقل بالذات نہیں ہوگا۔

حضرت مسیحؑ کی بشارت کامل حق لے کر جلوہ گر ہونے کی بشارت حضرت مسیحؑ نے بھی دی ہے اور حضرت موسیٰؑ کی طرح آخری زمانہ میں دی ہے :

"اس کے بعد میں تم سے زیادہ باتیں نہ کرونگا۔ کیونکہ دنیا کا سردار آتا ہے (یوحنا ۱۴: ۳۰)

آگے چل کر یوحنا ہی کی انجیل میں اس طرح تفصیل ہے :

"انھوں نے مجھ سے مفت عداوت رکھی۔ لیکن جب وہ مددگار آئے گا، جس کو میں تمھارے پاس باپ کی طرف سے بھیجوں گا یعنی روح جو باپ سے صادر ہوتا ہے تو وہ میری گواہی دے گا (یوحنا ۲۶ : ۲۷)

یوحنا ہی کے مزید جملے ملاحظہ ہوں :

"لیکن میں تم سے سچ کہتا ہوں کہ میرا جانا تمھارے لیے فائدہ مند ہے کیونکہ اگر میں نہ جاؤں تو وہ مددگار تمھارے پاس نہ آئے گا لیکن اگر جاؤں گا تو اسے تمھارے پاس

بھیج دوں گا اور وہ آکر دنیا کو گناہ و راست بازی اور عدالت کے بارے میں قصوروار ٹھہرائے گا۔ گناہ کے بارے میں اس لیے کہ وہ مجھ پر ایمان نہیں لاتے راست بازی کے بارے میں اس لیے کہ میں باپ کے پاس جاتا ہوں اور تم مجھے پھر نہ دیکھو گے۔ عدالت کے بارے میں اس لیے کہ دنیا کا سردار مجرم ٹھہرایا گیا ہے۔ مجھے تم سے اور بھی بہت سی باتیں کہنی ہیں مگر اب تم ان کی برداشت نہیں کر سکتے۔

لیکن جب وہ روح حق آئے گا تو تم کو تمام سچائی کی راہ دکھائے گا۔ اس لیے کہ وہ اپنی طرف سے کچھ نہ کہے گا لیکن جو سنے گا وہ کہے گا اور تمہیں آیندہ کی خبریں دے گا اور میرا جلال ظاہر کرے گا۔ (یوحنا ۱۶: ۷-۱۵)

ہمارا مقصد اس مضمون میں بشارتیں جمع کرنا نہیں ورنہ بائبل کے عہد عتیق و عہد جدید سے بے شمار ایسی بشارتیں جمع کی جا سکتی ہیں جن میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو سرور سردار بنا کر ارسال کیے جانے کی وضاحتیں موجود ہیں لیکن سیاق کلام میں صرف انجیل یوحنا کی یہ بشارت آگئی جس کی قدرے تفصیل ضروری ہے۔

انبیاء پر گواہ دنیا و آخرت میں دوسری بات یہ ہے کہ یہود نے جو تہمت آپ پر لگائی تھی اس سے آپ کو بری کرنا نیز مسیحیوں نے جو افسانے گڑھ رکھے تھے انکا پردہ کون چاک کرے گا؟ یہ وہی روح حق جب آئے گا تو کرے گا اور میرے خلاف کہی گئی باتوں کو رد کرے گا اور میرے حق میں گواہی دے گا، یہ صحیح ہے کہ اور اس سے مراد بھی رسول نورؐ ہی ہیں واضح آیت ملاحظہ ہو:

فَكَيْفَ إِذَا جِئْنَا مِن كُلِّ أُمَّةٍ	سو چاہو اس وقت یہ لوگ کیا کریں گے
بِشَهِيدٍ وَجِئْنَا بِكَ عَلَىٰ هَٰؤُلَاءِ	جب ہم ہر امت میں سے ایک گواہ لائیں گے

شَہِیْدًا ۔ (النساء : ۱۴۱) اور ان لوگوں پر تمہیں گواہ کی حیثیت سے کھڑا کریں گے۔

یہ بات معلوم و معروف ہے کہ قیامت سے پہلے اس زمانہ میں بھی جناب رسول انور صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عیسیٰؑ کے پیغمبر ہونے کی گواہی دی!

دنیا کو قصور وار ٹھہرائے گا گناہ کے بارے میں کہ وہ حضرت عیسیٰؑ پر ایمان نہیں لاتے، یہود حضرت مریم پر کیسے بہتان باندھتے ہیں (النساء : ۱۵۶)

نعوذ باللہ حضرت مسیحؑ کو نبی ماننا تو الگ رہا ان کے کامل انسان تک کے قائل نہیں بلکہ "بدروحوں کا سردار" (متی : ۱۲ : ۲۴) اور "دھوکہ باز" (متی : ۲۷ : ۶۳) اور "کفر بکنے والا" (متی : ۲۶ : ۶۵) وغیرہ جیسی ناشائستہ تہمتیں آپ پر لگاتے تھے اور کفر و فساد اور انکار میں اس طرح افراط کرتے تھے لیکن ان کے برخلاف مسیحی تھے جو عظمت و تکریم میں اس طرح افراط کرتے تھے کہ نعوذ باللہ بندہ کو آقا، خادم کو سردار، مخلوق کو خالق اور انسان کو ابن اللہ اور پھر اللہ کی حاکمیت میں شریک اور ملکوت الٰہی کا پورا حقدار جس کو کفارہ کی صورت میں خطاؤں کو بخشنے اور ہر اس چیز پر قدرت کاملہ ہو جو خدائے وحدہٗ کے تصرف میں ہے، یہ عقیدہ صرف عقلی طور پر ہی ہذیان نہیں بلکہ ہر دینی اور فطری تقاضے کے خلاف ہے۔ قرآن پاک نے اس سلسلہ میں حضرت مسیحؑ کی پوزیشن صاف کی اور کئی کلی اصول بتائے۔

<u>حاکمیت خدا کی ہے</u> | پہلا اصول تو یہ ہے کہ حاکمیت صرف خدا کی ہے۔

اَلَا لَہُ الْخَلْقُ وَالْاَمْرُ ط (اعراف : ۵۴) خبردار ہو جاؤ اسی کی مخلوق ہے یعنی وہی ان کو پیدا کرتا ہے اور اس لیے

اسی کی حکومت و اقتدار ہے۔

قُلْ مَنْ بِيَدِهٖ مَلَكُوْتُ كُلِّ شَيْءٍ وَّهُوَ يُجِيْرُ وَلَا يُجَارُ عَلَيْهِ (المومنون: ۸۸)	کہو بتاؤ اگر تم جانتے ہو کہ ہر چیز پر اقتدار کس کے قبضہ میں ہے اور کون ہے وہ جو پناہ دیتا ہے اور اس کے مقابلہ میں کوئی پناہ نہیں دے سکتا۔

اور ہر مسلمان کے لیے ایک مسلم و مقرر قاعدۂ بندگی ہے۔

وَلَهٗ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ كُلٌّ لَّهٗ قٰنِتُوْنَ۔ (الروم: ۲۶)	اس کے بندے ہیں سب جو آسمانوں میں ہیں یا زمین میں، سب اس کے تابع فرمان ہیں۔

کفارہ نہیں، ہر شخص اپنا ذمہ دار — ۲:- دوسرا اصول یہ ہے کہ اپنے اعمال کا ذمہ دار خود انسان ہے اور دوسرا کوئی اس کا کفارہ ادا کر ہی نہیں سکتا۔

اَلَّا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰى وَاَنْ لَّيْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَا سَعٰى (النجم: ۳۸-۳۹)	کوئی بوجھ اٹھانے والا کسی دوسرے کا بوجھ نہیں اٹھائے گا اور انسان کو اس کی سعی یعنی کوشش و عمل ہی کا بدلہ ملے گا۔

مقرب بندے — ۳:- تیسرا اصول یہ کہ خدا یکتا ہے کوئی اس کی آل اولاد نہیں، کوئی شریک و ہمسر نہیں، سب اس کے تابعِ فرمان بندے ہیں، فرشتے مقرب و مکرم بندے ہیں، اسی طرح انبیاء و صالحین بھی لیکن ان میں سے کوئی بھی خدائی کی صفات و اختیار کا حامل نہیں، سب خوفِ خدا سے لرزاں و ترساں رہتے ہیں:

وَقَالُوا اتَّخَذَ الرَّحْمٰنُ وَلَدًا — اور کہتے ہیں رحمان اولاد رکھتا ہے،
سُبْحٰنَهٗ ؕ بَلْ عِبَادٌ مُّكْرَمُوْنَ — سبحان اللہ بلکہ (فرشتے تو) بندے ہیں
لَا يَسْبِقُوْنَهٗ بِالْقَوْلِ وَهُمْ — مکرم و معزز اس کے حضور بڑھ کر
بِاَمْرِهٖ يَعْمَلُوْنَ يَعْلَمُ مَا — نہیں بولتے اور اس کے حکم پر عمل پیرا
بَيْنَ اَيْدِيْهِمْ وَمَا خَلْفَهُمْ — رہتے ہیں جو کچھ ان کے سامنے ہے یا
وَلَا يَشْفَعُوْنَ اِلَّا لِمَنِ ارْتَضٰى — ان سے اوجھل ہے وہ سب جانتا ہے
وَهُمْ مِّنْ خَشْيَتِهٖ مُشْفِقُوْنَ — وہ کسی کی سفارش نہیں کرتے بجز
وَمَنْ يَّقُلْ مِنْهُمْ اِنِّيْٓ اِلٰهٌ — اس کے جس کی سفارش پہ وہ راضی
مِّنْ دُوْنِهٖ فَذٰلِكَ نَجْزِيْهِ — ہو یعنی اجازت دے اور وہ اس کے
جَهَنَّمَ ؕ كَذٰلِكَ نَجْزِي — خوف سے ڈرتے رہتے ہیں اور جو
الظّٰلِمِيْنَ ۔ — کوئی بھی ان میں سے کہدے کہ اللہ
(الانبیاء ۲۶-۲۸) — کے سوا میں بھی ایک خدا ہوں تو
اسے ہم جہنم کی سزا دیں ہم ظالموں
کو بھی بدلہ دیتے ہیں۔

قرآن پاک کے ذریعہ جناب رسول انور صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ تین اہم اصول بیان کر کے حضرت مسیحؑ کی پوزیشن بالکل صاف کر دی۔ نہ ان کی الوہیت باقی رہی نہ فداکاری کی ضرورت اور نہ بنوت وا قانیم ثلاثہ کا چکر۔ ان تینوں متفرق اصولوں کو حضرت مسیحؑ کے مسلہ میں اس طرح ایک آیت میں یکجا کیا گیا ہے جو بڑی جامع ہے۔

يٰۤاَهْلَ الْكِتٰبِ لَا تَغْلُوْا فِيْ — اے اہل کتاب (مراد مسیحی ہیں) اپنے

دِيْنِكُمْ وَلَا تَقُوْلُوْا عَلَى اللّٰهِ
اِلَّا الْحَقَّ ؕ اِنَّمَا الْمَسِيْحُ عِيْسَى
ابْنُ مَرْيَمَ رَسُوْلُ اللّٰهِ وَ
كَلِمَتُهٗ ۚ اَلْقٰهَاۤ اِلٰى مَرْيَمَ وَ
رُوْحٌ مِّنْهُ ۫ فَاٰمِنُوْا بِاللّٰهِ
وَرُسُلِهٖ ۫ وَلَا تَقُوْلُوْا ثَلٰثَةٌ ؕ
اِنْتَهُوْا خَيْرًا لَّكُمْ ؕ اِنَّمَا اللّٰهُ
اِلٰهٌ وَّاحِدٌ ؕ سُبْحٰنَهٗۤ اَنْ
يَّكُوْنَ لَهٗ وَلَدٌ ۘ لَهٗ مَا فِى
السَّمٰوٰتِ وَمَا فِى الْاَرْضِ ؕ
وَكَفٰى بِاللّٰهِ وَكِيْلًا ۧ لَنْ يَّسْتَنْكِفَ
الْمَسِيْحُ اَنْ يَّكُوْنَ عَبْدًا لِّلّٰهِ
وَلَا الْمَلٰۤئِكَةُ الْمُقَرَّبُوْنَ ؕ
وَمَنْ يَّسْتَنْكِفْ عَنْ عِبَادَتِهٖ
وَيَسْتَكْبِرْ فَسَيَحْشُرُهُمْ
اِلَيْهِ جَمِيْعًا
(النساء: ۱۷۱-۱۷۲)

دین میں غلو نہ کرو یعنی حد سے تجاوز
نہ کرو اور اللہ کی طرف حق کے سوا
کوئی بات منسوب نہ کرو، بیشک مسیح
ابن مریم اس کے سوا کچھ نہ تھا کہ اللہ
کا ایک رسول تھا اور ایک کلمہ یعنی حکم
و فرمان تھا جو اللہ نے مریم کی طرف
بھیجا اور ایک روح تھی اللہ کی طرف
سے پس تم اللہ اور اس کے رسولوں پہ
ایمان لاؤ اور نہ کہو کہ تین ہیں، باز
آجاؤ یہی تمہارے لیے بہتر ہے اللہ
تو بس ایک ہی ہے، وہ پاک ہے اس
سے کہ کوئی اس کا بیٹا ہو آسمانوں اور
زمین کی ساری چیزیں اس کی ملک
ہیں اور ان کی کفالت و خبر گیری
کے لیے بس وہی کافی ہے، مسیح نے
کبھی اس بات کو عار نہ سمجھا کہ وہ اللہ
کا بندہ ہے اور نہ مقرب ترین فرشتے
(بندگی کو) اپنے لیے عار سمجھتے اگر
کوئی اللہ کی بندگی کو اپنے لیے عار سمجھتا ہے اور

تکبر کرتا ہے تو ایک وقت آئے گا
جب وہ سب کو گھیر کر اپنے سامنے
حاضر کرے گا۔

قرآن نے اس طرح مسیحؑ کے لاہوتی و ناسوتی حالات پر جو جھگڑے تھے، ان کا دروازہ بند کیا اور رسول اور کامل بندہ ثابت کیا دوسری طرف آپ پر سے اس غبار دور کیا کہ آپ ذلت و مسکنت کے ساتھ سولی پر چڑھے بلکہ یہ بتایا کہ آپ زندہ آسمان پر اٹھا لیے گئے:

وَقَوْلِهِمْ إِنَّا قَتَلْنَا الْمَسِيحَ	اور ان کے اس قول (کی وجہ سے
عِيسَى ابْنَ مَرْيَمَ رَسُولَ اللَّهِ	بھی ان پر لعنت و ملامت ہے کہ)
وَمَا قَتَلُوهُ وَمَا صَلَبُوهُ وَلَٰكِنْ	ہم نے مسیح عیسیٰؑ ابن مریم کو قتل کر دیا
شُبِّهَ لَهُمْ وَإِنَّ الَّذِينَ	ہے، حالانکہ فی الواقع انہوں نے
اخْتَلَفُوا فِيهِ لَفِي شَكٍّ مِنْهُ	نہ اس کو قتل کیا نہ صلیب پر چڑھایا
مَا لَهُمْ بِهِ مِنْ عِلْمٍ إِلَّا اتِّبَاعَ	بلکہ معاملہ ان پر مشتبہ کر دیا گیا اور
الظَّنِّ وَمَا قَتَلُوهُ يَقِينًا	جن لوگوں نے ان کے بارے میں
بَلْ رَفَعَهُ اللَّهُ إِلَيْهِ	اختلاف کیا ہے وہ بھی دراصل شک
وَكَانَ اللَّهُ عَزِيزًا حَكِيمًا	میں مبتلا ہیں انہیں اس معاملہ کا
(النساء: ۱۵۷-۱۵۸)	کوئی علم نہیں محض گمان کی پیروی ہے
	انہوں نے اس کو یقیناً قتل نہیں کیا
	بلکہ اللہ نے اسے اپنی طرف اٹھا لیا

اللہ زبردست طاقت رکھنے والا

اور حکیم ہے۔

مسیح کی الوہیت کا دعویٰ یہود و نصاریٰ کا افترا ہے اور عیسیٰؑ پر یہود نے جو ظلم کیا اور آپ کو مجرم ٹھہرایا کہ آپ نے الوہیت کا دعویٰ کیا یہ سراسر بے بنیاد اور غلط ہے قرآن پاک نے صاف صاف موقف اختیار کیا اور دعویٰ کیا کہ دعوائے الوہیت کا یہ جرم جو یہود نے نفرت میں اور نصاریٰ نے محبت میں حضرت عیسیٰؑ پر لگایا ہے آپ اس سے بالکل بری ہیں۔ قرآن نے کس قدر دلکش و دیبانہ تصویر کھینچی ہے ملاحظہ ہو:

وَاِذْ قَالَ اللّٰهُ يٰعِيْسَى ابْنَ	جب اللہ فرمائے گا کہ اے عیسیٰ بن
مَرْيَمَ ءَاَنْتَ قُلْتَ لِلنَّاسِ	مریم کیا تونے لوگوں سے کہا تھا کہ خدا
اتَّخِذُوْنِيْ وَاُمِّيَ اِلٰهَيْنِ	کے سوا مجھے اور میری ماں کو خدا بنالو
مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ قَالَ سُبْحٰنَكَ	ـــــــ تو وہ خود جواب میں
مَا يَكُوْنُ لِيْٓ اَنْ اَقُوْلَ مَا لَيْسَ	عرض کرے گا سبحان اللہ میرا یہ کام نہ
لِيْ بِحَقٍّ اِنْ كُنْتُ قُلْتُهٗ فَقَدْ	تھا کہ وہ بات کہتا جس کے کہنے کا مجھے
عَلِمْتَهٗ تَعْلَمُ مَا فِيْ نَفْسِيْ	حق نہ تھا، اگر میں نے ایسی بات کہی
وَلَآ اَعْلَمُ مَا فِيْ نَفْسِكَ اِنَّكَ	ہوتی تو آپ کو ضرور علم ہوگا آپ
اَنْتَ عَلَّامُ الْغُيُوْبِ مَا قُلْتُ	جانتے ہیں جو کچھ میرے دل میں ہے
لَهُمْ اِلَّا مَآ اَمَرْتَنِيْ بِهٖٓ اَنِ	اور میں نہیں جانتا جو کچھ آپ کے
اعْبُدُوا اللّٰهَ رَبِّيْ وَرَبَّكُمْ	دل میں ہے آپ تو ساری پوشیدہ
(المائدہ ۱۱۶ - ۱۱۷)	حقیقتوں کے عالم ہیں، میں نے ان سے

اس کے سوا کچھ نہیں کہا جس کا آپ نے
مجھے حکم دیا تھا، یہ کہ اللہ کی بندگی کرو
جو میرا بھی رب ہے اور تمہارا بھی رب۔

نیز رسول انور صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ خدا نے حضرت عیسیٰؑ کا حال اس طرح ظاہر کیا کہ ان کو برگزیدہ انبیاء کی صورت میں کھڑا کیا۔ خدا کی قربت اور دنیا و آخرت کی وجاہت کا اعلان اس طرح کیا۔

اِسْمُهُ الْمَسِيحُ عِيسَى ابْنُ مَرْيَمَ	اس کا نام مسیح عیسیٰ ابن مریم ہوگا دنیا
وَجِيهًا فِي الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ	اور آخرت میں معزز ہوگا، مقرب بندوں
وَمِنَ الْمُقَرَّبِينَ وَيُكَلِّمُ النَّاسَ	میں شمار کیا جائے گا اور وہ صالح
فِي الْمَهْدِ وَكَهْلًا وَمِنَ	بندوں میں سے ہوگا۔
الصَّالِحِينَ (آل عمران: ۴۵-۴۶)	

اور ان وضاحتوں کے بعد سرور کائناتؐ نے حضرت عیسیٰؑ پر سے الزامات دور کیے اور دنیا کو قصوروار ٹھہرایا۔

حق کی تفصیل قرآن کی روشنی میں | ۴: روح حق کے آنے سے مراد حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات گرامی صفات ہے قرآن پاک میں اس کی بے شمار تصریحات موجود ہیں جنکا تفصیلی ذکر یہاں فائدہ سے خالی نہ ہوگا:

إِنَّا أَرْسَلْنَاكَ بِالْحَقِّ بَشِيرًا وَّ	ہم نے تم کو حق (بات) کے ساتھ
نَذِيرًا وَّلَا تُسْأَلُ عَنْ أَصْحَابِ	خوشخبری دینے والا اور ڈرانے والا
الْجَحِيمِ (بقرہ: ۱۱۹)	بنا کر بھیجا اور اہل دوزخ کے تم
	جواب دہ اور ذمہ دار نہیں ہو۔

تِلْكَ اٰيٰتُ اللّٰهِ نَتْلُوْهَا عَلَيْكَ بِالْحَقِّ وَاِنَّكَ لَمِنَ الْمُرْسَلِيْنَ (بقرہ : ۲۵۲)

یہ اللہ کی آیات ہیں جنھیں ہم تمہیں حق کے ساتھ یعنی سچ اور ٹھیک ٹھیک سنا رہے ہیں اور تم یقیناً رسولوں میں سے ہو۔

تم پر نازل کردہ کتاب، کتب سابقہ کی تصدیق کرتی ہے:

نَزَّلَ عَلَيْكَ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ (آل عمران : ۳)

اس نے تم پر یہ کتاب نازل کی جو حق لے کر آئی ہے اور ان کتابوں کی تصدیق کر رہی ہے جو پہلے سے آئی ہوئی تھیں۔

اس کتاب حق کی غایت یہ ہے کہ اس کے قانون پر حکومت کی جائے اور اسی کی روشنی میں عدالت کے فیصلے کیے جائیں:

اِنَّآ اَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ لِتَحْكُمَ بَيْنَ النَّاسِ بِمَآ اَرٰىكَ اللّٰهُ (نساء : ۱۰۵)

ہم نے یہ کتاب حق کے ساتھ تمہاری طرف نازل کی ہے تاکہ جو راہ راست اللہ نے تمہیں دکھائی ہے اس کے مطابق لوگوں کے درمیان فیصلہ کرو۔

نبی برحق پر روح القدس کے ذریعہ قرآن ہدایت وبشارت وشجاعت پیدا کرنے کے لیے ارسال کیا گیا ہے:

قُلْ نَزَّلَهٗ رُوْحُ الْقُدُسِ مِنْ رَّبِّكَ بِالْحَقِّ لِيُثَبِّتَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَهُدًى وَّبُشْرٰى لِلْمُسْلِمِيْنَ (نحل : ۱۰۲)

ان سے کہو، (قرآن کو) تو روح القدس نے تمہارے رب کی طرف سے حق کے ساتھ بتدریج نازل کیا ہے تاکہ ایمان والوں کے ایمان کو پختہ کرے اور ہدایت

وبشارت ہے فرماں برداروں کیلئے۔

وَبِالْحَقِّ اَنْزَلْنٰهُ وَبِالْحَقِّ نَزَلَ وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا مُبَشِّرًا وَّ نَذِيْرًا (الاسراء: ۱۰۵)	حق کے ساتھ ہم نے (قرآن کو) نازل کیا اور حق ہی کے ساتھ یہ نازل ہوا ہے اور تمہیں ہم نے بشارت دینے والا اور ڈرانے والا بنا کر بھیجا ہے۔

آپ کی آمد کو حقانیت، صداقت اور حق کی دلیل بتایا گیا ہے:

وَقُلْ جَآءَ الْحَقُّ وَزَهَقَ الْبَاطِلُ اِنَّ الْبَاطِلَ كَانَ زَهُوْقًا (اسراء: ۸۱)	اور اعلان کر دو کہ حق آگیا اور باطل کی روح نکل گئی یعنی مٹ گیا، باطل ٹوٹنے ہی والا ہے۔

حق کے آنے اور اس میں کسی قسم کا شک نہ کرنے اور مومن اہل کتاب سے اس کے بارے میں پوچھنے کا تذکرہ اس طرح ہے:

فَاِنْ كُنْتَ فِيْ شَكٍّ مِّمَّآ اَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ فَسْئَلِ الَّذِيْنَ يَقْرَءُوْنَ الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلِكَ لَقَدْ جَآءَكَ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّكَ فَلَا تَكُوْنَنَّ مِنَ الْمُمْتَرِيْنَ (یونس: ۹۴)	اگر تجھے اس (ہدایت) کی طرف سے کچھ بھی شک ہو جو ہم نے تجھ پر نازل کی ہے تو ان لوگوں سے پوچھ لے جو پہلے سے کتاب پڑھ رہے ہیں فی الواقع تیرے پاس حق ہی آیا ہے لہذا تو شک کرنے والوں میں سے نہ ہو۔

ساری انسانیت کے لیے رسول برحق پر آئینہ حق نازل ہونے اور ہدایت کی دعوت اس طرح دی گئی ہے یہاں حق سے مراد رسول برحق اور کتاب برحق دونوں ہی ہو سکتے ہیں۔

قُلْ يَاَيُّهَا النَّاسُ قَدْ جَآءَكُمُ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّكُمْ فَمَنِ اهْتَدٰى فَاِنَّمَا يَهْتَدِيْ لِنَفْسِهٖ وَمَنْ ضَلَّ فَاِنَّمَا يَضِلُّ عَلَيْهَا وَمَآ اَنَا عَلَيْكُمْ بِوَكِيْلٍ (یونس: ۱۰۸)

کہہ دو کہ لوگو تمہارے پاس تمہارے رب کی طرف سے حق آچکا ہے اب جو سیدھی راہ اختیار کرے اس کی راست روی اس کے لیے مفید ہے اور جو گمراہ رہے اس کی گمراہی اسی کے لیے تباہ کن ہے اور میں تمہارے اوپر کوئی حوالدار نہیں ہوں۔

سورۂ زمر (۴۱) میں بھی یہ بات کہی گئی ہے اَنَا عَلَيْكُمْ کی جگہ اَنْتَ عَلَيْهِمْ ہے آیات الٰہی کو عین حق اس طرح کہا گیا ہے:

الٓمّٓرٰ تِلْكَ اٰيٰتُ الْكِتٰبِ وَالَّذِيْٓ اُنْزِلَ اِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ الْحَقُّ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يُؤْمِنُوْنَ (الرعد: ۱)

المر۔ یہ کتاب الٰہی کی آیات ہیں اور جو تمہارے رب کی طرف سے تم پر نازل کیا گیا ہے وہ عین حق ہے مگر اکثر لوگ مان نہیں رہے۔

رسولؐ کو خاکم بدہن گستاخ، مجنون کہنے والوں کا جواب اس طرح دیا گیا ہے:

اَمْ يَقُوْلُوْنَ بِهٖ جِنَّةٌ بَلْ جَآءَهُمْ بِالْحَقِّ وَاَكْثَرُهُمْ لِلْحَقِّ كٰرِهُوْنَ (المومنون: ۷۰)

کیا کہتے ہیں کہ وہ مجنون ہے؟ نہیں، بلکہ وہ حق لایا ہے اور حق ہی ان کی اکثریت کو ناگوار ہے۔

نبی حق کو صریح حق پر ہونے، خدا پر بھروسہ کرنے اور کتاب رحمت و ہدایت کی خبر اس طرح دی گئی:

وَاِنَّهٗ لَهُدًى وَّرَحْمَةٌ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ	اور یہ (قرآن) ہدایت و رحمت ہے
اِنَّ رَبَّكَ يَقْضِيْ بَيْنَهُمْ بِحُكْمِهٖ	مومنوں کے لیے یقیناً تیرا رب ان
وَهُوَ الْعَزِيْزُ الْعَلِيْمُ فَتَوَكَّلْ عَلَى	لوگوں کے درمیان اپنے حکم سے فیصلہ
اللّٰهِ اِنَّكَ عَلَى الْحَقِّ الْمُبِيْنِ۔	کر دے گا وہ غالب اور سب جاننے
(النمل : ۷۷ - ۷۹)	والا ہے پس اللہ پر بھروسہ رکھو یقیناً
	تم صریح حق پر ہو۔

محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر کتاب گھڑنے کا الزام لگانے والوں کا پردہ اس طرح فاش کیا گیا۔

الٓمّٓ تَنْزِيْلُ الْكِتٰبِ لَا رَيْبَ	الم یہ کتاب بلاشبہ رب العلمین کی
فِيْهِ مِنْ رَّبِّ الْعٰلَمِيْنَ اَمْ يَقُوْلُوْنَ	طرف سے نازل کی گئی ہے کیا یہ لوگ
افْتَرٰىهُ بَلْ هُوَ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّكَ	کہتے ہیں کہ اس شخص نے اسے خود گھڑ لیا
لِتُنْذِرَ قَوْمًا مَّآ اَتٰهُمْ مِّنْ	ہے؟ نہیں، بلکہ یہ حق ہے تیرے رب
نَّذِيْرٍ مِّنْ قَبْلِكَ لَعَلَّهُمْ	کی طرف سے تاکہ تو متنبہ کرے ایک
يَهْتَدُوْنَ۔	ایسی قوم کو جس کے پاس تجھ سے پہلے
(السجدہ : ۱ - ۳)	کوئی ڈرانے والا نہیں آیا شاید کہ
	وہ ہدایت پا جائیں۔

رسول برحق ارسال کرنے کا تذکرہ سورۂ فاطر میں اس طرح ہے:

اِنَّآ اَرْسَلْنٰكَ بِالْحَقِّ بَشِيْرًا وَّ	ہم نے تم کو حق کے ساتھ بھیجا ہے۔
نَذِيْرًا وَاِنْ مِّنْ اُمَّةٍ اِلَّا خَلَا	بشارت دینے والا اور ڈرانے والا

فِیْھَا نَذِیْرٌ (فاطر: ۲۴)	اور کوئی امت ایسی نہیں گزری جس میں ڈرانے والا نہ آیا ہو۔
وَالَّذِیْٓ اَوْحَیْنَآ اِلَیْکَ مِنَ الْکِتٰبِ ھُوَ الْحَقُّ مُصَدِّقًا لِّمَا بَیْنَ یَدَیْہِ اِنَّ اللّٰہَ بِعِبَادِہٖ لَخَبِیْرٌ بَصِیْرٌ۔ (فاطر: ۳۱)	جو کتاب ہم نے تمہاری طرف وحی کی ہے وہی حق ہے تصدیق کرتی ہے ان کتابوں کی جو اس سے پہلے آئی تھیں، بیشک اللہ اپنے بندوں کے حال سے باخبر اور ہر چیز پر نگاہ رکھنے والا ہے۔

حق پر آنے اور رسولوں کی تصدیق کرنے کا تذکرہ یوں ہے:

وَیَقُوْلُوْنَ اَئِنَّا لَتَارِکُوْٓا اٰلِھَتِنَا لِشَاعِرٍ مَّجْنُوْنٍ بَلْ جَآءَ بِالْحَقِّ وَ صَدَّقَ الْمُرْسَلِیْنَ۔ (الصافات: ۳۶)	وہ کہتے ہیں، کیا ایک شاعر مجنون کی خاطر ہم اپنے معبودوں کو چھوڑ دیں، حالانکہ وہ حق لے کر آیا اور رسولوں کی تصدیق کی۔

خدا کی طرف سے کتاب حق کے نزول کے بعد مخلصانہ بندگی کیے جانے کا حکم دیا گیا ہے۔

تَنْزِیْلُ الْکِتٰبِ مِنَ اللّٰہِ الْعَزِیْزِ الْحَکِیْمِ اِنَّآ اَنْزَلْنَآ اِلَیْکَ الْکِتٰبَ بِالْحَقِّ فَاعْبُدِ اللّٰہَ مُخْلِصًا لَّہُ الدِّیْنَ اَلَا لِلّٰہِ الدِّیْنُ	اس کتاب کا نزول زبردست اور دانا کی طرف سے ہے، یہ کتاب ہم نے تمہاری طرف برحق نازل کی ہے لہذا تم اللہ ہی کی بندگی کرو اسی کے لیے

الْخَالِصُ (زمر: ۱-۳) خالص کرتے ہوئے خبردار! دین خالص اللہ کا حق ہے۔

سورۂ شوریٰ (۱۶) میں بتایا گیا ہے کہ اللہ ہی نے کتاب حق کے ساتھ نازل کی اور میزان یعنی ترازو بھی نازل کیا جس سے مراد اللہ کی شریعت ہے جو ترازو کی طرح تول کر صحیح اور غلط، حق اور باطل، ظلم اور عدل، راستی اور ناراستی اور ایمان و کفر کا فرق واضح کر دیتا ہے۔

سورۂ جاثیہ (۶) میں بھی آیات الٰہی کو حق بتایا گیا ہے اور کفار کے موقف پر تعجب کا اظہار کیا گیا ہے کہ آخر یہ اللہ اور اس کی آیات کے بعد اور کون سی بات ہے جس پر ایمان لا سکتے ہیں۔

اس کتاب حق ترجمان کو سن کر جنوں نے اپنی قوم سے کہا تھا۔

اِنَّا سَمِعْنَا كِتٰبًا اُنْزِلَ مِنْۢ بَعْدِ	ہم نے ایک کتاب سنی ہے جو موسیٰ
مُوْسٰى مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ	کے بعد نازل کی گئی ہے تصدیق کرتی
يَهْدِيْٓ اِلَى الْحَقِّ وَاِلٰى طَرِيْقٍ	ہے، اپنے سے پہلے آئی ہوئی کتابوں
مُّسْتَقِيْمٍ۔ (الاحقاف: ۳۰)	کی رہنمائی کرتی ہے حق اور راہِ راست کی طرف۔

حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی کتاب حق پر ایمان و عمل کی دعوت یوں دی گئی ہے:

وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ	اور جو لوگ ایمان لائے، نیک عمل
وَاٰمَنُوْا بِمَا نُزِّلَ عَلٰى مُحَمَّدٍ وَّهُوَ	کیے اور اس چیز کو مان لیا جو محمد پر

الْحَقُّ مِنْ رَّبِّهِمْ كَفَّرَ عَنْهُمْ سَيِّاٰتِهِمْ وَاَصْلَحَ بَالَهُمْ۔ (محمد: ۲)

نازل ہوئی ہے جو ان کے رب کی طرف سے سراسر حق ہے اللہ نے انکی برائیاں دور کر دیں اور ان کا حال درست کر دیا۔

رسول پاکؐ کو دینِ حق و ہدایت اس لیے دیا گیا ہے کہ دنیا میں اسے پھیلا دیں۔

هُوَ الَّذِيْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰى وَدِيْنِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ ۭ وَكَفٰى بِاللّٰهِ شَهِيْدًا (الفتح: ۲۸)

وہ اللہ ہی ہے جس نے اپنے رسول کو ہدایت اور دین حق کے ساتھ بھیجا ہے تاکہ اس کو تمام ادیان پر غالب کر دے اور حقیقت پر اللہ کی گواہی کافی ہے۔

یہی آیت سورۂ الصف (۹) میں بیان کی گئی ہے اور کفی باللہ شہیدا کی جگہ فرمایا گیا ہے "ولو کرہ المشرکون" یعنی دین کو غالب کرنا ہی فرض ہے، خواہ مشرکین کو یہ کتنا ہی ناگوار گزرے سورۂ توبہ (۳۳) میں بھی یہ آیت سورۂ صف ہی کے الفاظ میں وارد ہوئی ہے۔

جو حق کا علم اور حق کا عَلَم (پرچم) ہو، قدیم کتب حق کی تصدیق کرنے والا ہو جس کی کتاب حق، حق و صداقت کے لیے فرقان ہو، جس کی نبوت حقانیت کی دعویدار ہو، جس کا لایا ہوا دین حق کا ترجمان ہو، جو اہل کتاب سے یہ کہتا ہو کہ دین میں غلو نہ کرو اور خدا کی طرف حق کے سوا کچھ نہ منسوب کرو، جسے حق کو تمام انسانوں تک پہنچانے کی دعوت کا ذمہ دار بنایا گیا ہو، جس حق کے آجانے سے باطل کی حجت بے دلیل ہو جائے۔ اگر وہ روح حق نہیں ہے تو پھر کون حضرت عیسیٰؑ کی پیشین گوئی کا روحِ حق ہوگا، اس سب کی روشنی میں ایک بار پھر بشارت عیسوی کا یہ حصہ پڑھ لیں:۔

"مجھے تم سے اور بہت سی باتیں کہنی ہیں مگر اب تم ان کو برداشت نہیں کر سکتے لیکن جب وہ روح حق آئے گا تو تم کو تمام سچائی کی راہ دکھائے گا"

سچائی اور ہدایت کی راہ | تم کو تمام سچائی کی راہ دکھائے گا، قرآن پاک کا ارشاد ہے :

وَالَّذِیْ جَآءَ بِالْحَقِّ وَصَدَّقَ بِهٖٓ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُتَّقُوْنَ ۔ (الزمر : ۳۳)	اور وہ شخص جو سچائی لے کر آیا اور جنھوں نے اس کو سچ مانا وہی عذاب سے بچنے والے ہیں ۔

دوسری جگہ اہل کتاب سے مخاطب ہو کر کہا :

وَیَكْفُرُوْنَ بِمَا وَرَآءَهٗ وَهُوَ الْحَقُّ مُصَدِّقًا لِّمَا مَعَهُمْ ۔ (بقرہ : ۹۱)	اس دائرے سے باہر (یعنی انبیائے بنی اسرائیل کے سوا) جو کچھ آیا اسے ماننے سے وہ انکار کرتے ہیں حالانکہ وہ حق ہے اور اس کی تصدیق و تائید کر رہا ہے جو ان کے پاس پہلے سے موجود تھا ۔

بائبل کے عربی ترجمہ میں سچائی کی راہ کے بدلے "جمیع الحق" کا لفظ ہے جس کا ترجمہ ہے پورے حق سے آگاہ کرے گا' حق اور سچائی ہم معنی لفظ ہیں، حق کے سلسلہ کی آیتیں اوپر گزر چکی ہیں، پورے حق یا سچائی سے مراد کامل و مکمل لائحہ عمل اور قانون ہے جس کے متعلق قرآن کا ارشاد ہے :

وَنَزَّلْنَا عَلَیْكَ الْكِتٰبَ تِبْیَانًا لِّكُلِّ شَیْءٍ وَّهُدًی وَّرَحْمَةً	ہم نے یہ کتاب تم پر نازل کر دی ہے جو ہر چیز کی صاف صاف وضاحت

وَّبُشْرٰى لِلْمُسْلِمِيْنَ۔ (نحل: ۸۹) کرنے والی ہے اور ہدایت و رحمت
وبشارت ہے ان لوگوں کے لیے
جنھوں نے ایمان قبول کر لیا ہے۔

ہر بیماری کا علاج ہر مشکل کا حل

ہر چیز کی وضاحت، ہر متن کی تشریح، ہر مشکل کا حل، ہر اعتراض کا جواب، ہر تاریکی کے لیے روشنی، ہر زخم کے لیے مرہم، ہر بیماری کے لیے دوا، ہر ناسور کے لیے علاج، ہر بھٹکے ہوئے کے لیے نشانِ منزل اور ہر انسان کا آخری مطمح نظر، آخری تمنا اور آخری سہارا یہی دین ہے۔ جس میں جامعیت و کاملیت و ابدیت کی شان جلوہ گر ہے اور جس کو قیامت تک انسانیت کا دین اس طرح بنا دیا گیا ہے:

اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ وَرَضِيْتُ لَكُمُ الْاِسْلَامَ دِيْنًا۔ (المائدہ: ۳)

آج میں نے تمہارے دین کو تمہارے لیے مکمل کر دیا ہے اور اپنی نعمت تم پر تمام کر دی ہے اور تمہارے لیے اسلام کو تمہارے دین کی حیثیت سے قبول کر لیا ہے۔

اور جس کے متعلق حضرت مسیحؑ کا ارشاد ہے:

"میں باپ سے درخواست کروں گا تو وہ تمہیں دوسرا مددگار بخشے گا کہ ابد تک وہ تمہارے ساتھ رہے۔" (یوحنا: ۱۴-۱۶)

اور یہی کمالِ دین کی پہچان اور ختم نبوت کی دلیل ہے کہ ابد تک اس کی شریعت باقی اور نافذ رہے گی ارشاد الٰہی ہے۔

مَا كَانَ مُحَمَّدٌ اَبَآ اَحَدٍ مِّنْ محمد تمہارے مردوں میں سے کسی

رِّجَالِكُمْ وَلٰكِن رَّسُولَ اللهِ وَخَاتَمَ النَّبِيِّينَ (الاحزاب: ۴۰)

کے باپ نہیں ہیں مگر وہ اللہ کے رسول اور خاتم النبیین ہیں۔

اس لیے ابد تک اسی مددگار اور سردار و سرور کائنات کی پیروی میں انسانیت کی فلاح ہے اور اس کے لائے ہوئے مکمل دین اسلام ہی میں انسانیت کے لیے دنیا و آخرت کی کامرانی و سعادت ہے اور اب قیامت تک جو دین یا ازم یا فلسفہ اس آخری دین کی ہدایت کو قبول نہ کرے گا دو جہاں میں نقصان اٹھائے گا۔

وَمَن يَبْتَغِ غَيْرَ الْإِسْلَامِ دِينًا فَلَن يُقْبَلَ مِنْهُ وَهُوَ فِي الْآخِرَةِ مِنَ الْخَاسِرِينَ (آل عمران: ۸۵)

اس اسلام (فرمانبرداری کی راہ) کے سوا جو شخص کوئی اور طریقہ اختیار کرنا چاہے اس کا وہ طریقہ ہرگز مقبول نہ ہوگا اور آخرت میں وہ ناکام و نامراد رہے گا۔

روح القدس مراد نہیں ہو سکتے یہودی تو حضرت مسیحؑ کو نبی ہی نہیں مانتے اس لیے اس پیشین گوئی کو یا حضرت عیسیٰؑ کی کسی بھی پیشین گوئی کو وہ کذب و افترا یا بدروحوں کی جعل سازی وغیرہ سے تعبیر کرتے ہیں۔

مسیحی حضرات اس قسم کی تمام پیشین گوئی کا مطلب یہ بتاتے ہیں کہ ان سے مراد روح القدس یعنی فرشتہ الٰہی جبرئیل ہیں لیکن یہ تاویل اس لیے درست نہیں کہ روح القدس تو حضرت مسیحؑ کے آنے سے بھی پہلے سے موجود تھا بلکہ حضرت مریمؑ کے پاس اللہ کے حکم سے حضرت عیسیٰؑ کی روح کو لے کر آیا تھا اور بائبل کے تمام حوالوں سے اور ادیان عالم کی تاریخ سے یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچ چکی ہے کہ روح القدس انسانوں کے وجود سے پہلے سے

فرشتگان الٰہی کے ساتھ تھا، پیشین گوئی میں وضاحت ہے کہ اگر میں نہ جاؤں گا تو وہ مددگار تمہارے پاس نہیں آئے گا، حالانکہ روح القدس ہر ہر موقع پر مسیح کے ساتھ تھا، دوم یہ کہ روح القدس نے دنیا میں آکر انسانوں سے مل کر ان کو نہ سچائی کی راہ دکھائی اور نہ مسیح علیہ السلام پر تہمتوں کی صفائی پیش کی۔ یہ ضرور ہے کہ جو کتاب حق خدا نے نبی برحق پر اتاری وہ روح القدس کے ذریعے اتاری لیکن اس حق کی تعلیم، تبلیغ نبی ہی نے دی، توحید کے ذریعے خدا کا جلال ظاہر کیا وغیرہ۔

حضرت عیسیٰؑ بھی مراد نہیں ہو سکتے، یہ بات بالکل واضح ہے، زندگی میں وہ حضرت موسیٰؑ کی شریعت کے ماتحت تھے اور دوبارہ جب آئیں گے تو شریعت محمدیؐ کے تابع ہوں گے، نیز حضرت عیسیٰؑ کے بعد اب تک کوئی ان صفات کا نبی بھی نہیں آیا جو بشارات موسیٰؑ و عیسیٰؑ کا مصداق کہلائے۔

اس لیے عقل و بصیرت، تاریخ ادیان اور سلامت روی کا تقاضہ یہی ہے کہ اس سورج سے زیادہ روشن حقیقت کو انسانیت مان لے کہ وہ آنے والا نبیوں کا سردار، خاتم النبیین خدا کا برگزیدہ بندہ، گواہ، مبشر، نذیر، داعی الی اللہ، خیر اور نیکی کی تمام قدروں کو نشر کرنے والا، سراج منیر محمدؐ امی فداہ ابی وامی ہی ہے جس کے ذریعہ دین مکمل ہوا، نعمت تمام ہوئی اور قیامت تک خدا کی رضامندی کا ضامن اسلام بن گیا۔

زبان حق کا ترجمان وہ اپنی طرف سے کچھ نہ کہے گا بلکہ وہ جو کچھ سنے گا وہی کہے گا اس نبی آخر الزماں کی پہچان حضرت موسیٰؑ نے توراۃ میں بھی اسی وصف کے ساتھ بتائی ہے اور قرآن نے بھی حضورؐ کا یہی وصف بتایا ہے۔

مَا ضَلَّ صَاحِبُكُمْ وَمَا غَوٰى　　　　تمہارا رفیق نہ بھٹکا ہے نہ بہکا ہے

وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْيٌ يُّوْحٰى (النجم : ۳-۴)

وہ اپنی خواہش نفس سے نہیں بولتا، تو ایک وحی ہے جو اس پر نازل کی جاتی ہے۔

قرآن پاک کی بے شمار آیتیں واضح طور پر یہ بتاتی ہیں کہ وہ احکام الٰہی و مواعظ جو حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم کے نطق مبارک سے ساری عمر جاری رہے وہ یا تو قرآن پاک کے کلمات حق تھے جو وحی متلو کی شکل میں نازل ہوئے یا وہ وحی غیر متلو تھی جو حکمت و بصیرت کی حامل تھی اور سنت پاک کے ذریعہ ظاہر ہوئی اور اس طرح آپ کی زبان مبارک لسان حق کی ترجمان تھی اور آپ کی تعلیمات سب کی سب حق تعالیٰ شانہ کی بیان کی ہوئی تعلیمات ہیں۔ چند آیتیں نمونہ کے طور پر ملاحظہ ہوں :

وَاتْلُ مَآ اُوْحِيَ اِلَيْكَ مِنْ كِتَابِ رَبِّكَ لَا مُبَدِّلَ لِكَلِمَاتِهٖ ۔ (الکہف : ۲۷)

تمہارے رب کی طرف سے جو وحی آئی ہے اسے جوں کا توں سنا دو کوئی اس کے فرمودات کو بدل دینے کا مجاز نہیں۔

وَكَذٰلِكَ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ قُرْاٰنًا عَرَبِيًّا لِّتُنْذِرَ اُمَّ الْقُرٰى وَمَنْ حَوْلَهَا (شوریٰ : ۷)

اس طرح ہم نے تم پر یہ قرآن عربی وحی کیا ہے تاکہ تم تمام بستیوں کے مرکز (شہر مکہ) اور اس کے گرد و پیش رہنے والوں کو خبردار کر دو۔

وَكَذٰلِكَ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ رُوْحًا مِّنْ اَمْرِنَا ۔ (شوریٰ : ۵۲)

اور اسی طرح اے نبی اپنے حکم سے ایک روح تمہاری طرف وحی کی ہے (یعنی وحی کے طریقوں سے تم کو سرفراز کیا ہے)

ذٰلِكَ مِنْ اَنْۢبَآءِ الْغَيْبِ نُوْحِيْهِ اِلَيْكَ (آل عمران : ۴۴)

یہ غیب کی باتیں ہیں جو ہم تم کو وحی کے ذریعے بتا رہے ہیں۔

ان جیسی بے شمار آیتوں کی روشنی میں یہ بات واضح ہوتی ہے کہ وہ مبشرِ اعظم جو حضرت عیسیٰؑ کے بعد آئے گا اور جو کچھ خدا کے حکم سے سُنے گا وہی بیان کرے گا اور اپنی خواہشِ نفس سے کچھ نہ کہے گا۔ وہ رسول برحق محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے سوا کوئی اور نہیں۔ آپ کو خدا کی شریعت اور حکم کا ایک لفظ اور نقطہ بدلنے کا نہ اختیار رہے اور نہ آپ نے ایسا کیا، کفار قریش نے جب یہ کہا کہ کوئی مصالحت ہو جائے تمہاری بعض باتیں ہم مان لیں اور بعض باتیں ہماری تم مان لو قرآن میں معمولی سی تبدیلی گوارا کر لو اور قرآن کی ان واضح تعلیماتِ توحید میں کچھ تبدیلی کر دو تو اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول کی طرف سے جو تفصیلی جواب عنایت فرمایا۔ اس حقیقت کو پوری طرح آشکارا کرتا ہے کہ نبی برحق کا منصب صرف یہ ہے کہ وہ کلامِ وحی کا سچا پیرو کار اور حقیقی متبع ہو اپنی طرف سے وہ کچھ کہنے، بڑھانے گھٹانے، چھپانے یا بدل دینے کا اختیار نہیں رکھتا۔

وَاِذَا تُتْلٰی عَلَیْهِمْ اٰیَاتُنَا	جب انہیں ہماری صاف صاف باتیں
بَیِّنَاتٍ قَالَ الَّذِیْنَ لَا یَرْجُوْنَ	سنائی جاتی ہیں تو وہ لوگ جو ہم سے
لِقَآءَنَا ائْتِ بِقُرْاٰنٍ غَیْرِ هٰذَآ	ملنے کی توقع نہیں رکھتے، کہتے ہیں کہ اسکے
اَوْ بَدِّلْهُ قُلْ مَا یَكُوْنُ لِیْٓ اَنْ	بجائے کوئی اور قرآن لاؤ یا اس میں
اُبَدِّلَهٗ مِنْ تِلْقَآئِ نَفْسِیْ	سے کچھ ترمیم و تبدیلی کر دو، ان سے
اِنْ اَتَّبِعُ اِلَّا مَا یُوْحٰٓى اِلَیَّ اِنِّیْٓ	کہو میرا یہ کام نہیں ہے کہ اپنی طرف
اَخَافُ اِنْ عَصَیْتُ رَبِّیْ عَذَابَ	سے اس میں کوئی تغیر و تبدل کر لوں۔
یَوْمٍ عَظِیْمٍ قُلْ لَّوْ شَآءَ اللّٰهُ مَا	میں تو بس اس وحی کا پیرو ہوں جو
تَلَوْتُهٗ عَلَیْكُمْ وَلَآ اَدْرٰىكُمْ	میرے پاس بھیجی جاتی ہے، اگر میں اپنے

بِہٖ فَقَدْ لَبِثْتُ فِیْکُمْ عُمُرًا
مِّنْ قَبْلِہٖ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ
فَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرٰی
عَلَی اللّٰہِ کَذِبًا اَوْ کَذَّبَ
بِاٰیٰتِہٖ اِنَّہٗ لَا یُفْلِحُ الْمُجْرِمُوْنَ
(یونس : ۱۵-۱۷)

رب کی نافرمانی کروں تو مجھے ایک بڑے
ہولناک دن کے عذاب کا ڈر ہے کہو
اگر اللہ کی مشیت یہ ہوتی تو میں یہ قرآن
کبھی نہیں سناتا اور تمہیں اس کی خبر
تک نہ دیتا، آخر اس سے پہلے میں ایک
عمر تمہارے درمیان گذار چکا ہوں کیا
تم عقل سے کام نہیں لیتے، پھر اس سے
بڑھ کر ظالم کون ہوگا جو ایک جھوٹی
بات گھڑ کر اللہ کی طرف منسوب کرے
یا اللہ کی واقعی آیات کو جھوٹا قرار
دے یقیناً مجرم کبھی فلاح نہیں پاتے،

واضح ہوگیا کہ بشارت موسوی" اور اپنا کلام اس کے منھ میں ڈالوں گا اور جو کچھ میں اسے حکم دوں گا وہی ان سے کہے گا" اور بشارت انجیلی" وہ اپنی طرف سے کچھ نہ کہے گا بلکہ جو کچھ سنے گا وہ کہے گا"، کا حقیقی مصداق خاتم النبیین والمرسلین، احمد مصطفےٰ محمد مجتبیٰ صلی اللہ علیہ وسلم ہی ہیں۔ (باقی)

دارالمصنفین کی بعض قرآنی مطبوعات

مقالات سلیمان : جلد سوم ۔ قیمت ۶۰ روپے

تعلیم القرآن : محمد اویس نگرامی ندوی مرحوم : قیمت ۲۵ روپے

جمع و تدوین قرآن : سید صدیق حسن صاحب مرحوم : قیمت ۲۷ روپے

"منیجر"

اقامتِ حج کے متعلق ازالۃ الخفا کے غلط تاریخی بیان کی تصحیح

از ڈاکٹر سید رضوان علی ندوی۔ کراچی

ان دنوں راقم الحروف کو مولانا مودودی مرحوم کی کتاب "تجدید و احیائے دین" پڑھنے کا اتفاق ہوا، اس میں ایک فصل حضرت شاہ ولی اللہ صاحبؒ کے کارناموں پر بھی ہے، جس میں انکی بجا طور پر تعریف کرتے ہوئے ان کا مندرجۂ ذیل قول نقل کیا گیا ہے:

"حضرت عثمانؓ کے بعد کسی فرمان روا نے حج قائم نہیں کیا، بلکہ اپنے نائب ہی مقرر کرکے بھیجتے رہے، حالانکہ اقامت حج خلافت کے لوازم میں سے ہے، جس طرح تخت پر بیٹھنا، تاج پہننا اور شاہان گزشتہ کی شہ نشین میں بیٹھنا قیصر و کسریٰ کے لیے علامتِ بادشاہی تھا اسی طرح حج خود اپنی امارت میں قائم کرنا اسلام میں علامتِ خلافت ہے۔"

(تجدید و احیائے دین، ایڈیشن ۲۶، لاہور ۱۹۹۳، صفحہ ۹۳)

مولانا مودودی مرحوم نے شاہ ولی اللہ صاحبؒ کی یہ عبارت اس ضمن میں پیش کی ہے کہ انہوں نے خلافت و بادشاہت کے فرق کو خوب سمجھا تھا۔

راقم الحروف کو جس کا تاریخ اسلام خاص موضوع ہے اور برسوں وہ اسے عرب دنیا میں پڑھا چکا ہے، یہ بیان تاریخی حقائق کے خلاف نظر آیا اور خیال ہوا کہ شاید مولانا مودو

مرحوم سے ترجمہ میں کوئی سہو ہوگیا ہے یا ترجمہ وطباعت میں کوئی نادانستہ غلطی ہوئی ہے، اس لیے میں نے شاہ صاحبؒ کی اصل کتاب ازالۃ الخفاء دیکھنے کا ارادہ کیا، مگر مشکل یہ پیش آئی کہ مولانا نے اصل فارسی کتاب کا جو حوالہ دیا ہے وہ سوا سو سال پہلے ۱۲۸۶ھ میں بریلی میں چھپی تھی جو اب نایاب ہے، یہ کتاب پھر کبھی چھپی نہیں۔ اس لیے مجھے اس کتاب کے اردو ترجمہ پر اکتفا کرنا پڑا۔ یہ ترجمہ برصغیر کے ایک مشہور لکھنوی عالم مولانا عبدالشکور صاحب اور ان کے شریک کار مولانا انشاء اللہ کے قلم سے ہے۔ اس کا جو ایڈیشن میرے پیش نظر ہے وہ محمد سعید اینڈ سنز کراچی نے طبع کیا ہے مگر تاریخ طباعت مذکور نہیں۔

دوسری مشکل یہ آپڑی کہ مولانا مودودی مرحوم نے غلطی سے مذکورہ بالا عبارت کے لیے ازالۃ الخفاء جلد اول فصل ششم کا حوالہ دیا ہے، یہ اور ان کی دوسری پیش کردہ عبارتیں فصل ششم کے بجائے فصل پنجم میں ہیں۔ بہرحال کافی ورق گردانی کے بعد مجھے مولانا مودودی کا پیش کردہ حوالہ تلاش کرنے میں کامیابی ہوئی، جسے حضرت شاہ صاحبؒ نے ان فتنوں کے سلسلے میں جن کی پیشین گوئی حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمائی تھی ذکر کیا ہے۔ ملاحظہ ہو:

"اور واقعات تاریخ سے یہ امر بھی بخوبی معلوم ہوچکا ہے کہ حضرت عثمانؓ کے بعد کوئی خلیفہ بذات خود حج قائم نہ کرسکا، بلکہ خلفاء حج قائم کرنے کے لیے اپنا نائب مقرر کرتے تھے، بنفس خود اقامت حج سے معذور تھے اور حضرت مرتضیٰؓ اسی وجہ سے بذات خود حج قائم نہ کرسکے ۔۔۔۔ اور حضرت معاویہؓ بن ابی سفیانؓ نے اپنی خلافت کے زمانے میں ابان بن عثمانؓ کو امیر حج مقرر کردیا تھا، حالانکہ خلفائے سابقین بذات خود حج کو قائم کرتے تھے مگر کسی عذر سے نہ جاسکے تو دوسری بات تھی اور حج کا قائم کرنا خلافت کا ضمیمہ بلکہ خلافت کی خصوصیات سے تھا، جس طرح تخت پر بیٹھنا اور سر پر تاج رکھنا پاگلے بادشاہوں

کا محل میں رہنا، شاہان فارس قدیم میں بادشاہی کی علامات سے تھا" (ازالۃ الخفاء ج ۱ ص ۳۲)

اس سے ظاہر ہے کہ مولانا مودودی سے ترجمہ میں کوئی سہو یا غلطی نہیں ہوئی ہے، البتہ انہوں نے ترجمہ میں کچھ تقدیم و تاخیر کر دی ہے، نیز حضرت علی مرتضیٰؓ اور حضرت معاویہؓ سے متعلق جملے حذف کر دیے ہیں، لیکن یہ بنیادی بات اس میں موجود ہے کہ حضرت عثمانؓ کے بعد کسی خلیفہ نے حج قائم نہیں کیا یا بالفاظ دیگر حج کی قیادت نہیں کی۔

میرے نزدیک یہ بات درست نہیں ہے۔ میں عصر حاضر کے تمام علماء و محققین کی طرح ان دونوں بزرگوں کا پایہ شناس اور ان کی عظمت اور بلند مرتبے کا معترف و مداح ہوں مگر عربی کی مشہور مثل ہے کہ "لکل جواد کبوۃ" (ہر اصیل گھوڑا بھی کبھی ٹھوکر کھا سکتا ہے)

یہاں یہی حضرت شاہ صاحب سے بھی ہوا ہے اور افسوس کہ مولانا مودودی مرحوم نے بھی ان کے بیان کو بے چون و چرا نقل کر دیا اور اس کی تحقیق کو ضروری نہیں سمجھا، جب کہ اصل حقیقت اس کے برعکس ہے۔

تاریخ سے ثابت ہے کہ حضرت عثمانؓ کے بعد پانچ اموی خلفا اور تین عباسی خلفاء نے حج قائم کیا یعنی مشاعر مقدسہ: مکہ و عرفات و منیٰ میں حج کی قیادت کی، اس کا ذکر قدیم مستند کتب تاریخ طبری، تاریخ یعقوبی، تاریخ مسعودی اور امام ذہبی کی تاریخ الاسلام وغیرہ میں ہے، ان متداول تاریخوں کے علاوہ ایک قدیم تر اور مستند ترین کتاب "تاریخ خلیفہ بن خیاط" میں پورے التزام کے ساتھ ان تمام خلفاء یا ان کے مقرر کردہ اُن امراء کا ذکر ہے جنھوں نے اقامت حج کا فریضہ انجام دیا، طبری نے بھی اپنی تاریخ میں اس کا التزام کیا ہے، لیکن خلیفہ بن خیاط (وفات ۲۴۰ھ) طبری سے ۷۰ سال مقدم اور امام بخاری کے استاد

ہیں، جن کی مروی احادیث صحیح بخاری میں بھی موجود ہیں۔ ان کی کتاب پہلی بار ڈاکٹر اکرم ضیاء العمری کی تحقیق سے ۱۹۶۷ء میں بغداد میں چھپی تھی، اس کے بعد اس کا دوسرا ایڈیشن ۱۹۷۷ء میں بیروت سے چھپا، یہ کتاب تاریخ طبری اور تاریخ ابن الاثیر وغیرہ کی طرح سنین پر مرتب کی گئی ہے جن کے ضمن میں تاریخی واقعات مذکور ہیں جس کو انگریزی میں AN-NALS کہتے ہیں، یہ مختصر کتاب ایک جلد میں ہے، لیکن اس کے مصنف نے امرائے حج کے ذکر کا اس قدر اہتمام کیا ہے کہ بعض سنین کے ذکر میں صرف امرائے حج کا نام ایک جملے میں دیا گیا ہے جیسے ۲۱۶ھ اور ۲۳۲ھ (اسی سال پر یہ کتاب ختم ہوگئی ہے)۔

ہم اس کتاب سے ذیل میں ان اموی و عباسی خلفاء کا نام پیش کرتے ہیں جنھوں نے مختلف سنین میں اقامت حج کا فریضہ انجام دیا، تاریخ طبری میں بھی ان سب کا ذکر ہے:

۱۔ حضرت معاویہؓ بن ابی سفیان۔ ۴۴ھ، ۵۰ھ، ۵۱ھ (۵۰ھ میں ان کے حج کے بارے میں اختلاف ہے، یعقوبی نے تصریح کی ہے کہ انھوں نے صرف دو حج کیے)

۲۔ عبدالملک بن مروان الاموی۔ ۷۵ھ

۳۔ ولید بن عبدالملک " ۔۹۱ھ

۴۔ سلیمان بن عبدالملک " ۔۹۷ھ

۵۔ ہشام بن عبدالملک " ۔۱۰۶ھ

۶۔ ابوجعفر المنصور العباسی۔ ۱۵۲ھ، ۱۵۸ھ (اسی سال یوم الترویۃ سے ایک روز پہلے اس کا انتقال ہوا، حدود حرم میں مکۃ المکرمۃ سے باہر اور تنعیم کے قریب دفن ہوا)

۷۔ المہدی بن المنصور " ۔ ۱۶۰ھ

۸۔ ہارون الرشید بن المہدی ۱۷۰ھ، ۱۷۳ھ، ۱۷۴ھ، ۱۷۵ھ، ۱۷۷ھ، ۱۷۹ھ، ۱۸۱ھ، ۱۸۶ھ، ۱۸۸ھ (۹ حج)

اس طرح پانچ اموی خلفاء اور تین عباسی خلفاء نے حج کی قیادت کی بلکہ بعض نے ایک سے زیادہ مرتبہ اور ہارون الرشید نے نو مرتبہ اقامت حج کی اور جس سال وہ حج کو نہیں گئے، انھوں نے اپنے خاندان کے کسی امیر (شہزادے) کو اس مہم پر مامور کیا، اس کی تفصیل تاریخ طبری، تاریخ الاسلام ذہبی وغیرہ میں بھی ہے، ایک اور قدیم مورخ الیعقوبی (وفات ۲۹۲ھ بروایت صحیح) نے اپنی تاریخ کی دوسری جلد میں ان مذکورہ بالا خلفاء کی خلافت کے ذکر میں بھی ان کے حج کی قیادت کا ذکر کیا ہے، اس مورخ نے سنین کی ترتیب کے برعکس موضوع یعنی خلفاء کے ناموں پر کتاب لکھی ہے، وہ بڑے پایہ کا مورخ، جغرافیہ نویس اور سیاح تھا اور عباسی دربار سے بحیثیت کاتب (سکریٹری) وابستہ بھی رہا تھا۔ اس نے ہارون الرشید کے ۹ مرتبہ حج کا ذکر بہ تفصیل سنین بالا جلد دوم ص ۴۳۰ (بیروت دار صادر ایڈیشن) میں کیا ہے۔ ملحوظ رہے کہ یعقوبی طبری کا بڑا معاصر ہے، اس کی وفات طبری سے اٹھارہ سال پہلے ہوئی۔

ان تاریخی حقایق کی موجودگی میں حضرت شاہ ولی اللہ صاحبؒ کا یہ بیان کسی طرح تسلیم نہیں کیا جا سکتا ہے کہ "حضرت عثمانؓ کے بعد کوئی خلیفہ بذات خود حج قائم نہیں کر سکا"۔

تعجب اس بات پر بھی ہے کہ مولانا مودودی نے شاہ صاحب کے اس بیان کو صحیح تسلیم کر لیا ہے، یہ ہو سکتا ہے کہ ان دونوں جلیل القدر مصنفین کے پیش نظر تاریخ خلیفہ

بن خیاط اور تاریخ الیعقوبی نہ رہی ہوں مگر تاریخ طبری ایک متداول کتاب ہے، یہی حال ابن الاثیر کی الکامل فی التاریخ کا بھی ہے ان دونوں پر بھی ان عظیم مصنفین کی نظر نہ پڑنا حیرت انگیز ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ہارون الرشید وہ آخری خلیفہ تھا جس نے حج کی قیادت آخری بار ۱۸۸ھ میں کی اس کے بعد کسی عباسی خلیفہ نے حج قائم نہیں کیا[1]

راقم الحروف کی اس تحریر کا اصلی مقصد اسی مسئلہ کی وضاحت و تنقیح کرنا تھا، لیکن حضرت شاہ ولی اللہ صاحبؒ کی ازالۃ الخفاء سے جو اقتباس پیش کیا گیا تھا اس میں مزید کچھ باتیں بھی تصحیح طلب ہیں، من جملہ ان کے ایک بات یہ ہے کہ "حضرت معاویہؓ نے اپنی خلافت کے زمانہ میں ابان بن عثمانؓ بن عفان کو امیر حج مقرر کر دیا تھا"

یہ بات بھی تاریخی حیثیت سے درست نہیں کہ کبھی حضرت معاویہؓ نے اپنی خلافت کے زمانے میں ابان بن عثمانؓ بن عفان کو امیر حج مقرر کیا ہو، اولاً تو خلیفہ بن خیاط کے مطابق حضرت معاویہؓ نے خود تین بار تفصیل مذکورۂ بالا حج کی قیادت کی یعنی ۴۴ھ، ۵۰ھ، ۵۱ھ یا یعقوبی (۲/۲۳۹) کے مطابق دو سال یعنی ۴۴ھ و ۵۰ھ ثانیاً یہ کہ مؤرخین خاص طور پر خلیفہ بن خیاط، یعقوبی اور طبری نے التزام کے ساتھ سال بہ سال امرائے حج کے ناموں کا ذکر کیا ہے ان ناموں میں کہیں ابان بن عثمان کا ذکر نہیں ہے، ان کے عہد میں جن امراء نے مختلف برسوں میں حج کی قیادت کی وہ عتبہ بن ابی سفیان، مروان، عنبسہ بن ابی سفیان، ولید بن عتبہ بن ابی سفیان ہیں۔ ابان بن عثمانؓ نے عبد الملک بن مروان اموی کے دور خلافت میں ۷۶ھ سے ۸۰ھ تک چار سال حج کی قیادت اس وقت کی تھی جب وہ مدینہ منورہ کے امیر (حاکم) تھے۔

---

[1] یعقوبی نے اپنی تاریخ (۲/۴۳۰ طبع بیروت) میں اس کی تصریح کی ہے۔

حضرت شاہ ولی اللہ صاحب نے حج کی قیادت سے حضرت علی مرتضیٰؓ کی معذوری کی وجہ تو بیان کی ہے کہ .... ان کو اپنے دور خلافت میں اپنے مخالفین سے برابر برسر پیکار رہنا پڑا لیکن یہ بھی امر واقعہ ہے کہ خلفائے ثلاثہ حضرت ابوبکرؓ، حضرت عمرؓ اور حضرت عثمانؓ نے بھی اپنی اپنی خلافت کے پہلے سال میں حج کی قیادت نہیں کی، حالانکہ ان کو کسی فتنہ کا سامنا کرنا نہیں پڑا تھا، پھر حضرت معاویہؓ نے صرف دو یا تین سال حج کی قیادت کی اور حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ نے اپنے دو سالہ دور خلافت میں ایک بار بھی حج کی قیادت نہیں کی حالانکہ ان کو بہت سے علماء نے پانچویں خلیفۂ راشد کہا ہے، اس بنا پر میری ناقص رائے میں یہ کہنا کہ "خلیفہ کا خود اقامت حج کرنا ایسا تھا جیسا کسی بادشاہ کا تخت پر بیٹھنا یا سر پر تاج پہننا یا یہ کہ اقامت حج خلافت کی ایک علامت تھی"، درست نہیں۔ ہاں خلیفۂ وقت کا اقامت حج کے لیے اپنا نائب مقرر کرنا ضروری تھا جس کو سبھی خلفاء کرتے رہے اور ہارون الرشید کے عہد تک بہت سے خلفاء براہِ راست بھی یہ فریضہ انجام دیتے رہے۔ بلکہ خود اس نے ایرانی طرز کی ملوکیت اختیار کرنے کے باوجود نو بار حج کی قیادت کی۔

سب سے بڑھ کر یہ کہ خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فتح مکہ کے بعد سنہ ۹ھ کے حج کی اقامت کے لیے حضرت ابوبکرؓ کو اپنا نائب بنا کر بھیجا، حالانکہ اقامت حج کو فقہاء نے امامۃ الصلوٰۃ کی طرح نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور بعد کے خلفاء کی خصوصیات و فرائض میں سے بتایا ہے اور خلفاء مسجد نبوی میں جب تک مدینۂ منورہ مرکز خلافت رہا یہ فریضہ ادا کرتے رہے، اس کے بعد بھی حضرت علیؓ نے کوفہ میں اور ابتدائی اموی خلفاء نے دمشق کی جامع میں اور ابتدائی عباسی خلفاء نے ہاشمیہ اور بغداد میں جمعہ و عیدین کی

نماز میں امامت کی، لیکن پھر نمازوں اور جمعہ و عیدین کے لیے خطباء و ائمہ مقرر کیے جانے لگے اور خلیفہ کا کام صرف سیاست و حکمرانی رہ گیا۔

مشہور دستوری فقیہ ماوردی (وفات ۴۵۰ھ) نے اپنی کتاب "الاحکام السلطانیہ" میں جہاں خلیفہ کے ان اختیارات کا ذکر کیا ہے کہ وہ جمعہ و عیدین وغیرہ اور جہاد کے لیے اپنا نائب مقرر کر سکتا ہے، وہاں اپنی کتاب کے آٹھویں باب میں "ولایت حج" کا بھی ذکر کیا ہے کہ اقامت حج کے لیے خلیفہ اپنا نائب مقرر کر سکتا ہے اور پھر اس نائب کے فرائض بھی لکھے ہیں۔ انہی میں سے یہ بھی ہے کہ وہ حجاج کی سہولت و نگرانی کے علاوہ عرفات و منی میں خطبہ و نماز کی امامت کرے۔

آخر میں یہ عرض کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ تحقیق و تلاش حق ہمارے اسلاف کا خاص طرۂ امتیاز رہا ہے، لیکن بدقسمتی سے مسلمانوں کے علمی تنزل کے زمانے میں تلاش و تحقیق کا ذوق بالکل ختم ہو گیا ہے خصوصاً اس برصغیر میں لوگ اپنی محبوب شخصیتوں کے خلاف کوئی بات سننے کے روادار نہیں ہوتے اور وہ انہیں معصوم عن الخطا سمجھتے ہیں حالانکہ یہ خود اہل السنت والجماعت کے اس عقیدہ کے خلاف ہے کہ انبیاء علیہم السلام کے علاوہ کوئی معصوم نہیں، اس ہمہ گیر رجحان کی بنا پر ممکن ہے ان دونوں بزرگوں کے غالی معتقدین کو ہماری یہ کدوکاوش پسند نہ آئے مگر ہم کو ان حضرات کے غیظ و غضب سے زیادہ حق عزیز ہے۔

اس بات کی وضاحت ضروری ہے کہ کسی کی بزرگی و فضیلت علمی کے لیے یہ ضروری نہیں ہے کہ اس کو تمام ہی علوم میں نبوغ حاصل ہو، حضرت شاہ ولی اللہ صاحب کا میدان تحقیق و تصنیف تفسیر، حدیث، فقہ اور تصوف ہے، تاریخ ان کا موضوع نہیں تھا، سوائے عہد خلافت کے، اسی طرح مودودی صاحب کو بھی زیادہ اشتغال تفسیر، حدیث

فقہ اور سیاست سے تھا، ابتدا میں انہوں نے تاریخ سلاجقہ اور تاریخ دکن وغیرہ ضرور لکھی لیکن اموی و عباسی عہد کی تاریخ پر ان کی نظر گہری نہیں تھی ورنہ وہ شاہ ولی اللہ صاحب کے اس بیان کو قبول نہیں کرتے۔

مآخذ

۱۔ ازالۃ الخفاء عن خلافۃ الخلفاء از شاہ ولی اللہ (فارسی) ترجمہ مولانا عبدالشکور و مولانا انتشار اللہ۔ اشاعت محمد سعید اینڈ سنز، کراچی۔

۲۔ تاریخ خلیفہ بن خیاط، از خلیفہ بن خیاط، تحقیق ڈاکٹر اکرم ضیاء العمری، طبع ثانی، بیروت ۱۹۷۷ء۔

۳۔ تاریخ الیعقوبی، از ابن واضح الیعقوبی (دو جلدیں)، بیروت (تاریخ ندارد)

۴۔ تاریخ طبری، از محمد بن جریر الطبری (۱۰ جلدیں) تحقیق ابوالفضل ابراہیم، دارالمعارف، قاہرہ۔

۵۔ مروج الذہب، از المسعودی (۴ جلدیں)، قاہرہ ۱۹۶۴ء

۶۔ الکامل فی التاریخ، از ابن الاثیر (۹ جلدیں) بیروت ۱۹۶۷ء

۷۔ تاریخ الاسلام، از امام ذہبی (۸ جلدیں) تحقیق عبدالسلام تدمری، بیروت ۱۹۸۹ء۔

۸۔ الاحکام السلطانیہ، از ماوردی، قاہرہ ۱۹۷۳ء۔

۹۔ الاحکام السلطانیہ، از ابویعلی حنبلی، بیروت ۱۹۸۳ء۔

۱۰۔ تجدید و احیائے دین، از مولانا سید ابوالاعلی مودودی، اسلامک پبلی کیشنز لاہور ۱۹۹۳ء۔

فارسی کا ایک اہم کشمیری شاعر

مرزا داراب بیگ جویا

از

ڈاکٹر خورشید نعمانی رودولوی بمبئی۔

مرزا داراب بیگ جویا کشمیر کے ایک اہم شاعر تھے جو غنی اور بینش کے معاصر تھے لیکن تاریخوں اور تذکروں میں ان کا ذکر برائے نام ہی ملتا ہے، اس طرح انہیں وہ امتیازی جگہ نہ مل سکی جس کے وہ مستحق تھے۔

جویا کے آبا و اجداد تبریز (ایران) سے آکر کشمیر میں آباد ہوئے، یہیں جویا کی ولادت ہوئی، ان کے والد کا نام ملا سامری تھا، ان کے والد کے نام سے پہلے "ملا" کا لقب ظاہر کرتا ہے کہ وہ ایک قابل شخص تھے، جویا کے دو بھائی مرزا کامران بیگ گویا اور مرزا فتح علی بیگ تسکین بھی اچھے شاعر تھے گویا ع ایں خانہ ہمہ آفتاب است

مرزا جویا بھی اس وقت کے عام شرفا کی طرح درس و تدریس اور کاروبار دنیا میں منہمک ہو گئے، خوش حالی اور فارغ البالی کا دور دورہ تھا، انہوں نے علامہ عصر شیخ محسن فانی کے سامنے زانوئے ادب تہہ کیا، جویا نے ابتدا سے ہی اچھے شعرا مثلاً ابو طالب کلیم، ملا رضا تجلی، سعید اشرف، سالک یزدی اور سالک قزوینی کی محفلیں دیکھیں اور ان سے استفادہ کیا، شاعری میں انہوں نے کلیم کی شاگردی اختیار کی اگرچہ وہ صائب اور

فطرت موسوی کے شیدائی تھے، صائب کے دیوان "واجب الحفظ" پر جویا نے ایک مقدمہ بھی لکھا جس میں وہ صائب کو اپنا استاد[1] مانتے ہیں، مولف "تاریخ کبیر" لکھتے ہیں:

"داراب جویا مرزا سامری کے فرزند اور میر سعید اشرف، رضا علی تجلی کے ہم درس اور ہم صحبت شاعر ہو گذرے ہیں، وہ اہل تشیع کے اعتقادات سے منسلک تھے، انہوں نے ۱۱۱۸ھ میں وفات پائی، ان کا اصل وطن تبریز تھا، ابو طالب کلیم اور مرزا صائب کے ساتھ کشمیر وارد ہوئے[2]"،

مگر یہ بیان صحیح نہیں ہے جویا دراصل کشمیر میں پیدا ہوئے، انکے جد اعلیٰ تبریز سے ترک وطن کرکے آئے تھے، جویا کی تاریخ ولادت معلوم نہیں مگر یہ بات قرین قیاس ہے کہ ۱۰۳۰ھ کے لگ بھگ وہ پیدا ہوئے اور عالمگیر کے زمانے میں ۱۱۱۸ھ میں وفات ہوئی۔

کلام کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ جویا اور گویا (دونوں بھائیوں کو) سید علی رضا اور میر سعید اشرف کے ساتھ گہری دلچسپی تھی اور ان دونوں کی صحبت میں مشاعرے بھی ہوا کرتے تھے جن میں علمی و ادبی مباحث بھی جاری رہا کرتے تھے، سید علی حسن مولف "صبح گلشن" نے ایک لطیفہ بیان کیا ہے وہ لکھتے ہیں کہ ایک روز جویا اور گویا دونوں بھائی محمد علی ماہر (ان کے معاصر شاعر) کی صحبت میں بیٹھے تھے۔ باتوں باتوں میں جویا نے کہا کہ ہم دونوں بھائیوں نے ابو طالب کلیم کے نام اور تخلص کو برابر تقسیم کرکے اپنا اپنا تخلص اختیار کر لیا ہے، محمد علی ماہر نے کہا کہ ایسا نظر آتا ہے کہ ان کے مطالب اور معنی کو بھی اپنایا ہے[1]۔

کشمیر کے حکام جویا کی بڑی قدر و منزلت کرتے تھے، ابراہیم خاں، حفظ اللہ خاں اور فاضل خاں جو یکے بعد دیگرے کشمیر کے گورنر ہوئے، جویا کا احترام کرتے تھے، اس نے اپنے قصیدوں اور قطعات میں اپنے ان سرپرستوں کی ستائش کی ہے، ابراہیم خاں نے ایک

آئینہ خانہ بنوایا تھا، جویا نے اس کی تقریب پر ایک نظم لکھی جس کا ایک شعر یوں ہے:

نواب در او نشستہ چون مردم چشم خدام بہ دورش زدہ صف چو مژگاں

فاضل خاں گورنر کشمیر سے جویا کے خاص تعلقات تھے، انہیں کی ایما پر اس نے دو مختصر مثنویاں "حسن معنی" اور "ڈل جھیل" لکھیں، "حسن معنی" میں کشمیر کا ذکر تفصیل سے ہے، کشمیر کے باغات، شالیمار باغ، باغ نسیم، باغ بہار آرا، باغ سیف آباد، باغ الٰہی اور نور باغ کے علاوہ کوہ پیر پنچال اور ڈل جھیل کی حسین منظر کشی ہے۔ کشمیر کے لوگوں کے حسن کا بیان ہے اور آخر میں خود کشمیر جنت نظیر سے شاعر کے والہانہ عشق کی داستان ہے ؎

مگو ای ساقی از دشواری آہ بہ کشمیر آمدیم الحمد للہ

دریں گلشن کہ باد آباد جا دید لطافت را مجسم می تواں دید

لب نہر برگ گل را در گلستاں گرفتہ شبنم از شوخی بہ دنداں

فاضل خاں جب کشمیر آئے تو جویا نے اس شعر سے ان کا استقبال کیا:

مگر نواب کشور گیر آمد کہ جانی در ین کشمیر آمد

جویا کے اشعار سے یہ بات عیاں ہے کہ وہ نہایت ظریف طبع اور خوش مزاج واقع ہوئے تھے، بات بات پر ان کی زبان سے پھول جھڑتے تھے، جس محفل میں بیٹھتے اپنے لطیفوں، حکایتوں اور چٹکلوں سے محفل کو زعفران زار بنا دیتے، وہ نیک خو، خوش رو اور ہر دلعزیز تھے، ان کی گفتگو شیریں اور بحث عالمانہ ہوتی تھی، وہ اپنے معاصر غنی کے برعکس امراء و حکام کی تعریف میں قصیدے لکھتے تھے، وہ خلوت پسند نہیں تھے بلکہ ہمیشہ اپنے رفقاء کے ساتھ زندگی کی دوڑ میں شریک نظر آتے تھے۔

وہ تعصب اور حسد، حرص و آز، پندار و غرور سے نفرت کا اظہار کرتے ہیں، انکے

اشعار ان کی صفائی قلب کے آئینہ دار ہیں ع

درسینہ چوں گذر کینہ فتد — آں کینہ بہ حبس دیرینہ فتد

عیب دگر اینکہ زلبس پیر دلی — عکس تو محال است در آئینہ فتد

خوشی ہرگز نہ بیند ہر کہ بد خواہست اُنفش — بخود پیوستہ ہم چوں مار ظلم اندیش می پیچد

بقدر خواہشت دنیا اسیر خویش سازد — تو گر جویا، بدنیا بیش پیچی بیش می پیچد

جویا بہت وسیع النظر تھے، انہوں نے اپنے معاصر شعراء کی جی کھول کر تعریف کی ہے، ابوطالب کلیم اور مرزا صائب کی تعریف میں بھی کافی اشعار کہے ہیں، اپنے استاد مرزا صائب کی خدمت میں خلوص و عقیدت کے ساتھ ذیل کے اشعار پیش کیے ہیں جن سے ان کے عقیدتمندانہ جذبات صاف جھلکتے ہیں ؎

بے تکلف ز شکر ریزی صائب جویا — طوطی نطق تو طرز سخن آموختہ است

رباعی

صائب ز سخن بہرہ تامی کہ تراست — باشد شائستہ تو نامی کہ تراست

نتواں اداکرد بزبان تحسین — حق نمک کہ حسن کلامی کہ تراست

اس کے علاوہ اس نے معاصر شعراء کے کلام کی بھی دل کھول کر داد دی ہے ع

ایں جواب آں غزل جویا کہ بینش گفتہ است

نامہ ام را پارہ چوں بال کبوتر می کند

ایں جواب آں غزل جویا کہ میگوید وحید

ہیچو زلفش کند روزم سیاہ از شش جہت

ایں بطرز آں غزل جویا کہ تمکین گفتہ ست

این بطرز آں غزل جویا کہ شائق گفتہ است
جای دنداں سخت چوں گر دید دندان می شود

جویا کے دوستوں اور سرپرستوں کا حلقہ کافی وسیع تھا جن سے متعلق ان کے کلیات میں اشعار اور اشارے ملتے ہیں، مرزا ابوالخیر کی تعریف میں انھوں نے ایک انتہائی مرصع انشائیہ لکھا، انکے یہاں بچے کی ولادت پر یہ تاریخ کہی جس سے ۱۱۰۸ھ / ۹۶-۱۶۹۵ء برآمد ہوتا ہے ؎

سراپا زباں غنچہ شاں شد نخست   بس آنگہ "گل باغ امید" گفت

اس کے علاوہ سید عبداللہ، محمد عظیم تہرانی اور شیخ نجفی کے نام ان کے خطوط کلیات میں درج ہیں، کشمیر کے ایک صوفی درویش شاہ رضا کی شان میں یہ اشعار بھی ملتے ہیں:

بادشاہی است شہ رضا امروز   کہ نہ در فکر تخت و دیہیم است
درکنار دل آن مکان شریف   بی تکلف بہشت و تسنیم است

جویا کے اشعار اور خطوط سے ان کی بعض دلچسپ عادتوں کا پتہ چلتا ہے، ان کے دو خطوط سے معلوم ہوا کہ وہ حقہ اور قہوہ کے عادی تھے، حقہ کی شان میں ان کی یہ رباعی دلچسپی سے خالی نہیں ؎

پس فیض کہ از چلیم اندوختہ ام   بردی نظر خواہش از آں دوختہ ام
دودش کہ ز سینہ ہر نفس برگردد   دارد پیغامی از دل سوختہ ام

لیکن جویا شراب کو یکسر ناپسند کرتے تھے وہ شراب کو "گودہ حرام" کہتے ہیں ؎

حیف است اگر ز دخت رز جوئی کام   کین فاحشہ باشد از دولت اعلام
تاکی سرخود بہ پائی خود خواہی سودا   تا چند کشی منت این گودہ حرام

جویا نے اپنی عمر کا بیشتر حصہ کشمیر میں گذارا، ان کی شاعری کشمیر کے ذکر سے مملو ہے،

مگر ان کے دل میں اپنے آبائی وطن ایران کی زیارت کا شوق ہمیشہ جاگزیں رہا لیکن ان کی یہ تمنا پوری نہ ہوسکی، جویا بہر حال کشمیر سے نکل کر لاہور پہنچے، لاہور سے جویا کا ایک خاص تعلق تھا، ایک تو وہاں کے دلبروں کی بے جھجھک آمیزش جویا کو اپنا گرویدہ کیے ہوئے تھی ؎

لاہور کہ دلبرش سی عیار است   از شوخی طبع ہا کہ وجہ یار است
گر گنجیش دست رد خلق بود   عیبش نکنی طلائی دست فشار است

دوسرے لاہور ان کی محبوبہ کا مسکن تھا جس کی دید اور وصال ان کی دلی آرزو تھی

در راہ شوق جاناں عزم سفر مبارک   بر فوج غم دلم را فتح و ظفر مبارک
بستم میان ہمت جویا بہ سیر لاہور   امید وصل یاری نازک کمر مبارک

ایک اور غزل میں جویا اپنی (حبشی) محبوبہ سے کہتے ہیں کہ چند روز تیری حسین مسکان سے لطف اندوز ہونے کے بعد اب میں کشمیر واپس جا رہا ہوں ؎

دل می برد دم غنچہ خنداں تو حبشی   جان می دہدم خندۂ پنہاں تو حبشی
فرداست کہ خواہد سوی کشمیر رواں   جویا دو سہ روزی شدہ مہمان حبشی

شاہی دربار سے بظاہر جویا کا کوئی بلاواسطہ تعلق نہیں تھا نہ اورنگزیب سے انکی ملاقات کا کوئی ذکر ملتا ہے لیکن اورنگزیب کی شان میں مندرجہ ذیل رباعی سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ شاہی کرم کے امیدوار ضرور تھے ؎

شاہنشاہا کف تو بحرین عطاست   تقوی تو زیب سلطنت نام خداست
زینت بخش صلاح باشد کرمتا   در دست تو سبحہ چون گہر دریاست

جویا بڑے پرگو شاعر تھے، انہوں نے ہر صنف سخن میں طبع آزمائی کی اور حق یہ ہے

ان کے کلام کی استادانہ شان ہر جگہ نمایاں ہے، خواہ وہ غزل ہو، قصیدہ ہو، رباعی ہو، مرثیہ یا مثنوی، ان کا ضخیم کلیات تقریباً سات ہزار اشعار پر مشتمل ہے جس میں ہر صنف سخن میں طبع آزمائی کی ہے، گویا کے قصیدے جو تعداد میں ۳۲ ہیں، حمد و نعت و ائمہ معصومین کی منقبت میں ملتے ہیں۔ جن میں دو کا ذکر کیا جا چکا ہے، قطعات و رباعیات کی مجموعی تعداد ۱۲۷ ہے جس میں رباعیاں ۱۰۳، قطعات زیادہ تر موضوعاتی اور تاریخ وفات سے متعلق ہیں۔

مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ان کی نعت و قصیدے کے چند اشعار اپنے دعویٰ کے ثبوت میں پیش کیے جائیں، نعت کی مثال ملاحظہ ہو:

افتخار دودہ آدم حبیب ذوالجلال سرور دنیا و عقبیٰ شافع روز جزا
آنکہ جبرئیل امینش می کشیدے غاشیہ آنکہ بر فرمانبرش شاہنشہی چوں مرتضیٰ
رتبۂ قربش تماشا کن کہ مقدار دو قوس بلکہ ہم نزدیک تر بد با جناب کبریا
از عناصر در تن آدم برای خلق او گشتہ اند اضداد باہم چاریار باصفا

ذیل کا قصیدہ جویا نے حضرت علیؓ کی تعریف میں لکھا ہے، اس میں قصیدے کے تمام لوازم موجود ہیں اور یہ ان کے استاد فن ہونے کی دلیل ہے، ان کا قصیدہ خاقانی کے طرز میں لکھا گیا ہے، ان کی شیریں بیانی اور قادر الکلامی کا اندازہ اس قصیدے سے بخوبی ہو سکتا ہے، صفائی بندش، سلاست اور استواری کلام اس کی خصوصیات ہیں، خوش آہنگ الفاظ سے موسیقی کی کیفیت پیدا کر دی ہے۔

نوبہار دردم داغت گل سودائی من صد جو مجنوں بند پا گم کردہ صحرائے من
چاک شد دامان صبر از خراش نالہ ام من کجا و درد ہجر او کجا لے وائی من
خشک شد خوں در رگ گل بے بہار جلوہ ات نوبہار من گل من سرو من رعنائی من

ای بہار رنگ و بو چوں گل سراپا گوش شو | تا در گوشت شود ایں مطلع سرائی من
بسکہ شد لبریز مہر مصطفیٰ اعضائی من | ہم چو گلبن غرق گل گردید سراپائی من
ای فدائی مرقد پاک تو سراپائی من | یا علی مولائی من مولائی من مولائی من
مظہر کل، فاتح خیبر، امیر المومنین | بندگی قنبرش فخر من و آبائی من

جویا کی شاعری کا حسن در اصل ان کی غزلوں میں نکھرتا ہے جس میں اس دور کی تمام خصوصیات نظر آتی ہیں، ان میں کہیں کہیں غنی کا رنگ جھلکتا ہے اور کہیں صائب اور کلیم کا انداز ملتا ہے۔ ڈاکٹر نور الحسن انصاری ان کی غزلوں کے بارے میں لکھتے ہیں:[۳۶]

" جویا کی بہترین شاعری ان کی غزلوں میں ہے، گویا اگرچہ کلیم کے شاگرد تھے، مگر غزلگوئی میں وہ صائب کے نقش قدم پر چلتے تھے... مگر جویا کا اپنا ایک انفرادی انداز ہے جو صائب اور جویا کے دوسرے پسندیدہ شاعر فطرت موسوی سے الگ ہے؛ جویا کے یہاں ایک جاندار تغزل ہے جس کا ایک بنیادی عنصر حسن کا انتہائی نازک اور جمالیاتی احساس ہے، جویا کا تصور حسن بڑا بھرپور، جسمانی اور جذباتی ہے، کشمیری حسینوں کے برف جیسے شفاف و شاداب جسم میں شاعر کی نظر کے لیے جو فتنہ سامانی ہے اس کا منظر دیکھیے:

پائی تا سر مژہ است اندامت | بہ نگہ می تواں چشید ترا "

جویا کی محبوبہ کا جسم پھول سے زیادہ نازک اور اس کی خوشبو سے زیادہ لطیف اور پھولوں کی ڈالی کی طرح تر و تازہ ہے اور اس کا نازک ملبوس نکہت گل کی طرح ہوا بدست ہے ؎

ہمچو شاخ نازک گل از نسیم نو بہار | جوشش مستی می کند در ہر طرف مائلِ ترا

ترسم کی خم اشد تن نازک بدنم را | از نکہت گل جامہ بدہ سیم تنم را
آں کسوت نازک کہ بر اندام تو یار است | چوں نکہت گل دست در آغوش بہار است

جویا کے یہاں وصال محبوب کی جو مکمل اور موثر کیفیت ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ جویا کا معشوق کوئی فرضی یا روایتی نہیں بلکہ ایک حسین و نفیس قسم کا انسان ہے جس کی ہم آغوشی شاعر کو کیا کچھ لطف نہ دیتی ہوگی ؎

شب کہ عریاں بہ برآں شوخ قدح نوشم بود | یک بغل نور چو فانوس در آغوشم بود
ز سرو یار کہ در بر کشیدہ ام امشب | بغل بغل گل آغوش چیدہ ام امشب
سخن چو شیرہ جاں سالہا چکد ز لبم | بایں کہ لعل لبت را مکیدہ ام امشب

جسم و جان کی اس شاعری کے علاوہ جویا کے یہاں حقائق و معرفت کے رازہائے سربستہ کی گرہ کشائی بھی ہے اور فکری عناصر کی نشاندہی بھی ملتی ہے ؎

دارد حیات عالمی و جان بدید نیست | دنیا ز آدمی پر و انسان پدید نیست
گشتہ آبستن ہزار سحر | شب تار مرا تماشا کن

جویا کی اس جاندار شاعری کے بعد ان کی غزلوں کے مزید نمونے ملاحظہ کیجئے:

خود را چو ز خود جدا بیابی | شاید کہ نشان ما، بیابی
می ریختی و سبو شکستی | ای محتسب ای خدا، بیابی
در کشور فقر باش جمشید | تا جام جہاں نما، بیابی
کی کام تو بے طلب بر آید | یعنی کہ بجوئی تا بیابی
جویا یک بار عسلی گو | ہر چیز کہ مدعا بیابی
آسودہ دلی کہ بے قرار است | آں دیدہ خنک کہ شعلہ بار است

بہ ساحت نہ فلک کند سیر — ہرکس سر خویشتن سوار است
زیاد کہ بزور عشقم انداخت — در دریائے کہ بے کنار است
گر غنچہ دل شگفتہ باشد — ہر سوکی کہ بنگری بہار است
صبر دل بے قرار عاشق — پیمانہ و دست رعشہ دار است
پیراہن جسم نازک او — جویا ز نگہت بہار است

جویا نثر نگاری میں بھی درک رکھتے تھے ان کی نثر بڑی پرتکلف و مرصع ہوتی تھی۔ دیباچہ نگاری انکا خاص شغف تھا۔ کلیات میں چار کتابوں پر دیباچے موجود ہیں جن میں دو مرقع پر ہیں ایک کسی سفینہ پر اور چوتھا صائب کے دیوان" واجب الحفظ" پر اس کے علاوہ خود جویا کے دیوان کا دیباچہ، قلمدان کی تعریف نوروز کا بیان اور دوستوں کے نام خطوط ہیں۔

یوں تو جویا کا ذکر کشمیر میں فارسی ادب کی تاریخ و تذکروں میں جستہ جستہ ضرور ملتا ہے۔ لیکن ۱۹۵۹ء میں ڈاکٹر محمد باقر نے لاہور میں کلیات جویا کی ترتیب سے جویا شناسی اور جویا فہمی کے ایک نئے دور کا آغاز کیا ہے

پروفیسر عبدالقادر سروری "کشمیر میں فارسی ادب کی تاریخ" میں جویا کے متعلق رقمطراز ہیں[۵]۔

"غنی کے معاصرین میں مرزا داراب جویا مرزا کامران گویا، دونوں بھائی بھی شاعر تھے، غنی کے بعد جویا فن شعر میں سر آمد مانے جاتے تھے، مرزا صائب کے طرز کا ان پر بہت اثر تھا۔ اور اسی کا تتبع بھی کرتے تھے، ایک دیوان انہوں نے یادگار چھوڑا ہے، جویا کے دو شعر ذیل میں منقول ہیں ؎

می تواں یافتن از نالہ قمری کہ مدام — آتشی ہست نہاں در تہ خاکستر او

منقبت سنج بود خاطر مدحت گر او دل جویا نخورد زین غزل آرائی آب

مقطع سے ظاہر ہے کہ گویا کو منقبت سے بھی بہت دلچسپی تھی"۔

ڈاکٹر مسعودی جویا کے بارے میں یہ رائے رکھتے ہیں[۶]

"غنی کے معاصرین میں مرزا داراب جویا اور مرزا کامران گویا دونوں بھی شاعر تھے،

غنی کے بعد فن شعر میں مرزا جویا کی خاص اہمیت ہے"۔

جویا کا خیال تھا کہ شاعری حیات جاوداں کا سامان بہم پہنچاتی ہے اور خود انکی شاعری طوطی خوش نوا کے نغمے کی طرح ساری دنیا کی شاعری پر چھائی ہوئی ہے۔

حوالہ جات

۱۔ کلیات جویا، مرتبہ ڈاکٹر محمد باقر۔ لاہور، ۱۹۵۹ء، ص ۱۰۔ ۲۔ تاریخ کبیر: از محی الدین مسکین ۱۳۲۱ھ / ۱۹۰۳ء ۳۔ صبح گلشن، مولفہ سید علی حسن ۴۔ فارسی ادب بعہد اورنگزیب: از ڈاکٹر نورالحسن انصاری، دہلی ۱۹۶۹ء ص ۱۱۷ ۵۔ کشمیر میں فارسی ادب کی تاریخ: از پروفیسر عبدالقادر سروری، سری نگر، ۱۹۶۸ء، ص ۱۴۲ ۶۔ کشمیر کے فارسی ادب کی تاریخ (۱۸۱۹-۱۵۸۲ء) از پروفیسر ایم ایم مسعودی، سرینگر، ۱۹۹۳ء، ص ۲۸۔

کشمیر سلاطین کے عہد میں

مغل فرمانرواؤں سے پہلے جن مسلمان حکمرانوں کی حکومت کشمیر میں رہی ہے یہ کتاب اس کی بہت ہی مستند اور مفصل سیاسی و تمدنی تاریخ ہے، دراصل یہ جامعہ ملیہ اسلامیہ کے سابق پروفیسر محب الحسن صاحب کی کتاب (کشمیر انڈر سلطانز) کا اردو ترجمہ ہے۔

مترجم: علی حماد عباسی

قیمت ۵۶ روپے

امام ذہبی کی جلیل القدر تصنیف

سیر اعلام النبلاء

از
جناب شیخ نذیر حسین صاحب۔ لاہور

امام شمس الدین محمد بن احمد بن عثمان الذہبی کا شمار اسلام کے نامور اور کثیر التصانیف مصنفین میں ہوتا ہے۔ ان کے زمانۂ حیات (ساتویں آٹھویں صدی ہجری) میں ملک شام پر مصر کے بحری ممالیک کی حکومت تھی۔ ان کا بڑا کارنامہ مغول (تاتاریوں) کی پیش قدمی کو روکنا ہے، اس وقت دمشق دنیائے اسلام کا علمی اور دینی مرکز تھا، دمشق، حلب اور حمص میں دارالقرآن اور دارالحدیث قائم تھے، لیکن اس علمی رونق کے ساتھ ہی اشاعرہ اور حنابلہ میں فکری اور عقائدی آویزش برپا تھی، تصوف کی گرم بازاری تھی۔ ملک میں جعلی پیروں اور جھوٹے مشائخ کا زور تھا، عوام کی اکثریت جاہل تھی اور وہ ان کے کرامات پر بڑا اعتقاد اور یقین رکھتے تھے، متبرک مقامات پر نذریں اور نیازیں پیش کی جاتی تھیں، غرضیکہ ملک پر اوہام اور بدعات کی ظلمت چھائی ہوئی تھی۔ یہ تھے ملکی حالات جبکہ امام ذہبی کی پیدائش ہوئی۔

وہ ربیع الآخر ۶۷۳ھ / اکتوبر ۱۲۷۴ء میں دمشق میں پیدا ہوئے، ان کے والد شہاب الدین احمد بڑے دیندار اور علم حدیث کے شائق تھے۔ وہ پیشہ کے اعتبار سے

زرکوب (چاندی سونے کے ورق بنانے والے) تھے، اس لیے وہ ذہبی اور ان کے بیٹے ابن الذہبی کہلائے (الصفدی: الوافی)۔ امام ذہبی نے علوم دینیہ کی تحصیل علمائے وقت سے کی۔ شروع میں انہیں علم القرأت سے بڑی دلچسپی تھی۔ شعر و شاعری سے بھی لگاؤ رہا ہے۔ جب وہ اٹھارہ برس کے ہوئے تو علم حدیث ان کی توجہ کا مرکز بن گیا اور وہ ساری عمر اسی کے ہو رہے۔ چونکہ تاریخ اور سوانح کو علم حدیث ہی کی شاخ سمجھتے تھے۔ اس لیے وہ تاریخ نویسی اور سوانح نگاری میں بھی بڑا نام پیدا کر گئے۔ مورخین نے انہیں الرجل الرحال لکھا ہے۔ تعلیم سے فارغ ہو کر امام ذہبی نے مصر اور فلسطین کا سفر کیا اور ۶۹۸ھ میں وہ حج و زیارت سے مشرف ہوئے اور وہاں کے علماء سے مختلف کتابوں کا سماع کرتے رہے۔ ان کتابوں میں کتب مغازی، کتب السیرۃ، تاریخ عام اور کتب التراجم وغیرہ شامل تھیں۔

تعلیم سے فراغت کے بعد وہ مختلف مساجد میں امام اور خطیب اور بعض مدارس میں حدیث کی تدریس کی خدمت انجام دیتے رہے۔ اس اثناء میں ان کی دوستی تین فضلاء سے ہو گئی جو جلد ہی محبت اور باہمی احترام میں بدل گئی۔ ان میں سے ہر عالم اپنے دائرے میں "جبل العلم" تھا اور یہ فضلاء ابو الحجاج یوسف المزی، ابن تیمیہ اور علم الدین البرزالی تھے۔ کچھ عرصے کے بعد انہوں نے تمام دنیاوی مشاغل سے منھ موڑ کر اپنے کو تصنیف و تالیف کے لیے وقف کر دیا۔

آخری عمر میں ان کی آنکھیں خراب ہو گئی تھیں۔ بالآخر نہایت مصروف زندگی گزار کر انہوں نے ۷۴۸ھ/ ۱۳۴۸ء میں انتقال کیا۔ امام ذہبی خوش خلق اور خوش مزاج تھے۔ ان میں محدثین کا جمود اور عام علماء کی یبوست نہ تھی۔ ان کے دن لکھنے پڑھنے اور راتیں یاد الٰہی

میں گزرتی تھیں۔ وہ بعض صوفیہ سے بھی ارادت رکھتے تھے اور ان کی خدمت میں وقتاً فوقتاً حاضر ہوتے رہتے تھے۔

امام ذہبی کے متنوع صفات کا ان کے معاصرین اور متاخر سوانح نگاروں نے پورا پورا اعتراف کیا ہے۔ ان اہل علم نے انہیں محدث العصر، خاتم الحفاظ، مورخ اسلام اور شیخ الجرح والتعدیل لکھا ہے۔

انہوں نے مستقل کتابوں کی تحریر کے علاوہ تقریباً پچاس کتابوں کا اختصار کیا ہے۔ ان مختصرات میں اسد الغابہ فی معرفۃ الصحابہ (ابن الاثیر) مستدرک علی الصحیحین (حاکم نیشاپوری) سنن الکبریٰ (البیہقی) تاریخ بغداد (خطیب بغدادی) تاریخ دمشق (ابن عساکر) تاریخ نیشاپور (حاکم نیشاپوری) کتاب الانساب (السمعانی) خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ ان کتابوں کے اختصار کے علاوہ انہوں نے ان کے اغلاط کی تصحیح کی ہے، مزید معلومات کا اضافہ کیا ہے اور متعلقہ مزید مصادر و مآخذ کی نشاندہی کی ہے۔

امام ذہبی کا شمار عربی کے کثیر التعداد مصنفین میں ہے۔ کثرت تصانیف کے اعتبار سے ان کا مرتبہ ابن الجوزی اور السیوطی کے بعد ہے۔ الذہبی کی چھوٹی بڑی کتابوں کی تعداد دو سو سے اوپر ہے ان میں سے بعض پمفلٹ ہیں، ان کی تفصیل بروکلمان نے تاریخ ادبیات عربی میں دی ہے، ان کی مشہور ترین کتابیں حسب ذیل ہیں:

۱۔ تذکرۃ الحفاظ (مطبوعہ حیدرآباد دکن ۱۹۵۵-۱۹۵۸ء)

۲۔ دول الاسلام (مطبوعہ حیدرآباد دکن ۱۳۳۷ھ)

۳۔ ذیل دول الاسلام (مطبوعہ حیدرآباد دکن، ۱۳۳۷ھ)

۴۔ میزان الاعتدال (مطبوعہ قاہرہ ۱۹۶۳ء)

ان کی بیسیوں کتابیں قسطنطنیہ اور قاہرہ کے کتاب خانوں میں پڑی منتظر طباعت ہیں۔ ان میں اہم ترین تاریخ الاسلام ہے۔

سیر اعلام النبلا: مذکورہ بالا کتاب چند سال ہوئے بڑی آب و تاب سے بیروت سے پچیس جلدوں میں شایع ہوئی ہے۔ یہ پہلی صدی ہجری سے لے کر ساتویں صدی ہجری کے اکابر رجال اور مشاہیر کا تذکرہ ہے جو اندلس سے لے کر اقصائے ترکستان تک محیط ہے۔ آخری دو جلدیں (۲۴ ویں اور پچیسویں) انڈکس کے لیے وقف ہیں۔ پہلی دو جلدیں اگرچہ سیرت النبیؐ اور تاریخ خلفائے راشدین کے لیے مخصوص ہیں، لیکن ان کے لیے فاضل مصنف نے اپنی تاریخ الاسلام کا حوالہ دیا ہے، اس لیے مطبوعہ کتاب کا آغاز حضرت ابو عبیدہ بن الجراحؓ کے تذکرہ سے ہوتا ہے اور تیسری اور آخری جلد کا اختتام سلطان الملک المنصور نور الدین علی الترکمانی الصالحی المتوفی (۱۸۵ھ) کے حالات پر ہوتا ہے۔

فاضل مصنف کا دائرہ کار کسی خاص علم یا فن تک محدود نہیں بلکہ کتاب میں خلفا و ملوک، امرا، سلاطین، وزرا، امراء، قضاۃ، قرا، محدثین، فقہا، ادبا، نحویوں، شاعروں، متکلموں، فلسفیوں اور صوفیوں سب ہی مشاہیر کے حالات ملتے ہیں، فاضل مصنف چونکہ خود محدث ہیں اس لیے وہ محدثین کے حالات کھلے دل سے خوب لکھتے ہیں، لیکن وہ بعض شافعی اور حنفی فقہا سے پورا پورا انصاف نہیں کرسکے، حالات کے بیان میں بھی توازن نہیں رکھ سکے اگر وہ بعض معروف مشاہیر کے حالات لکھتے ہوئے صفحے کے صفحے سیاہ کردیتے ہیں تو بعض کم نصیبوں کے حصے میں چند سطریں آتی ہیں۔ وہ مذکورہ شخصیت کی اہمیت اور قدر و قیمت کا اندازہ اس کے علمی، ادبی اور سیاسی کارناموں کی بنا پر لگاتے ہیں۔

وہ زیر عنوان نامور کے حالات لکھتے ہوئے اس کا لقب، کنیت، تاریخ پیدایش،

تعلیم و تربیت کی تفصیل بیان کرتے ہیں، علماء کے ضمن میں ان کے اساتذہ، تلامذہ، تصانیف کی نشاندہی کرتے ہیں، پھر آخر میں اہل علم کی آرا ان کے بارے میں نقل کرتے ہیں، شعرا کے بیان میں وہ ان کے کلام کے منتخب اشعار اور انشا پردازوں کی نثر کے نمونے پیش کرتے ہیں۔

کتاب میں مذکورہ ناموران کی خوبیوں کے علاوہ ان کی خامیاں بھی کسی تردد کے بغیر بیان کر دیے ہیں، ... مثلاً وہ حنابلہ کے بڑے مداح ہیں، لیکن ان کے ہاتھوں امام طبری کو جو ایذائیں پہنچیں ان کا برملا ذکر کیا ہے۔ شیخ شہاب الدین مقتول سہروردی کی ذہانت و فطانت کو سراہا ہے مگر یہ بھی لکھا ہے کہ یہی حد سے بڑھی ہوئی ذہانت و فطانت ان کی تباہی کا باعث ہوئی۔ وہ امام ابن تیمیہ کے حد درجہ معتقد بلکہ ان سے فیض یافتہ ہیں لیکن ان کے بارے میں صاف لکھ دیا ہے کہ وہ خود پرست اور خود رائے تھے اور بعض فقہی آرا میں جمہور علمائے امت سے الگ نظر آتے ہیں (بحوالہ تذکرۃ الحفاظ، ۴ : ۱۴۹۷)

امام ذہبی کا اسلوب بیان صاف، شائستہ اور سنجیدہ ہے، وہ حتی الامکان عبارت آرائی سے پرہیز کرتے ہیں اور الفاظ کا بقدر معانی استعمال کرتے ہیں۔

سیر اعلام النبلا کا قلمی نسخہ ۱۳-۱۴ جلدوں میں استانبول کے کتبخانہ احمد ثالث میں موجود ہے، چند برس ہوئے کہ لبنان اور شام کے متعدد فضلا نے مل کر کتاب کو پچیس[۲۵] جلدوں میں حسن طباعت کے جملہ لوازم کے ساتھ بیروت سے شایع کر دیا ہے۔ ان فضلا نے تحقیق و تنقید کا حق ادا کر دیا ہے، کتاب میں وارد اعلام، اسما اور اماکن پر حواشی لکھے ہیں اور جن ماخذ اور مصادر سے مزید معلومات مل سکتی ہیں، انکا حوالہ دیا ہے۔ سر کتاب پر نظر ثانی محدث عصر استاد شعیب الارنؤوط کی ہے، احادیث کی تخریج کی ہے اور صحیح اور سقیم اور موضوع و ضعیف کی نشاندہی کی ہے۔ غرضیکہ یہ کتاب پہلی سات صدی ہجری کے ناموران اسلام کی معرفت کیلئے معلومات کا خزانہ ہے۔ چند برس پیشتر کتاب کا نواں، دسواں ایڈیشن شایع ہوا ہے۔

اخبار علمیہ

اسلامی علوم و فنون کا قابل فخر سرمایہ و ورثہ، مخطوطات کی شکل میں مختلف ممالک میں موجود و منتشر ہے، جس کو مرتب و مدون کرنے کی کوششیں تیز تر ہوتی جاتی ہیں، خصوصاً عالم عرب اور یورپ میں اس شعبہ پر خاص توجہ دی جارہی ہے، برصغیر میں بھی یہ دولت عام ہے، مختلف اداروں نے حتی الوسع ان مخطوطات کی ترتیب و تدوین پر توجہ کی ہے، تاہم علم و دانش کے بیشمار موتی اب بھی بکھرے ہوئے ہیں اور لڑیوں میں پروئے جانے کے منتظر ہیں، اس سلسلہ میں پاکستان کے ایک فاضل و محقق ڈاکٹر احمد خاں نے مرکز حمایت المخطوطات العربیہ کو قائم کر کے ایک اہم قدم اٹھایا ہے، ڈاکٹر خان متعدد کتابوں کے مصنف ہیں، امام صغانی کی متعدد تصانیف انہوں نے مرتب کر کے شایع کیں، وہ دمشق کی مشہور مجمع اللغۃ العربیہ کے رکن ہیں، اب انہوں نے مذکورہ ادارہ قائم کر کے پاکستان میں موجود عربی مخطوطات کے تحفظ پر توجہ کی ہے، ۱۹۸۳ء میں ایک جائزہ کے مطابق معلوم ہوا کہ پاکستان میں قریباً اسی ہزار مخطوطات ہیں، ان میں سے بعض عربی، فارسی اور اردو مخطوطات کی فہارس تیار بھی ہوگئی ہیں، لیکن ان میں معلومات زیادہ نہیں ہیں، عربی مخطوطات میں ۸۰ فیصد سے تو علما تک واقف نہیں ہیں، اس صورتحال کے پیش نظر شدت سے محسوس کیا گیا کہ غفلت اور بے توجہی سے یہ موتی کہیں وقت کی گرد میں چھپ کر گم نہ ہوجائیں، ڈاکٹر احمد خاں کے ادارہ کا اولین مقصد یہی ہے کہ ملک کے تمام عربی مخطوطات کا مکمل جائزہ لیا جائے اور پھر ان کی فہرست سازی

تعلیق و تصحیح، قلم بندی اور نشر و اشاعت کا سامان کیا جائے، ان کا یہ بھی عزم ہے کہ اخبار التراث العربیہ کے ذریعہ ان مخطوطات کا عام تعارف کرایا جائے، یہ مقاصد دشوار گزار، دقت طلب اور بڑی محنت و عمل کے متقاضی ہیں جو اسی وقت ممکن العمل ہو سکتے ہیں جب تمام لوگوں خصوصاً علماء و محققین کا تعاون و اشتراک میسر ہو، مالی وسائل کی فراہمی بھی ضروری ہے، توقع ہے کہ یہ عظیم الشان منصوبہ ادارہ کے مخلص بانی کی ہمت و ولولہ سے کامیابی سے ہمکنار ہوگا، ہندوستان کے عربی قدر دانوں کا تعاون بھی اس کے لیے مفید ثابت ہو سکتا ہے ہم خود اس سے علی گڑھ کے فاضل اجل اور اپنے خاص کرم فرما جناب پروفیسر مختار الدین احمد کے ذریعہ متعارف ہوئے، اس کے لیے ہم ان کے مشکور ہیں، ادارہ کا پتہ یہ ہے:

مرکز حمایت المخطوطات العربیہ ۲۲۳۔ شہزاد ٹاون، اسلام آباد، پاکستان۔

حال ہی میں نئی دہلی کے ایک اشاعتی ادارہ گیان پبلشنگ ہاؤس کا ماہانہ خبرنامہ پبلشرز پروفائل، موصول ہوا جس سے معلوم ہوا کہ اس ادارہ نے انگریزی زبان میں تاریخ و علم الانسان پر متعدد عمدہ کتابیں شایع کی ہیں، ان دو خاص موضوعات کے علاوہ تہذیب و ثقافت، ادب، مذہب، فلسفہ، تعلیمات، معاشیات، زرعیات، بین الاقوامی مطالعات، کتب خانہ، انتظامی امور، موسیقی، تھیٹر، پولیس، جرائم، سیاسیات، نفسیات، سماجیات، دیہی ترقیات، نسائیات، سیاحت اور کھیل وغیرہ موضوعات کے متعلق جدید ترین معلومات پر مشتمل کتابوں کی ایک طویل فہرست بھی ہے، مصنفین و مولفین میں بعض مسلمان اہل قلم مثلاً احمد شاہ، افضال احمد، انصار ہروانی، قمر حسن، محمد خالد معروف، ایم اے قریشی، ایم اے کلام اور ایم محمود بھی شامل ہیں، افضال احمد کی کتاب ہندوستان کے مغربی ساحل پر ہندوستان، پرتگال کی تجارت کے متعلق سنہ ۱۶۰۱ء سے ۱۶۶۲ء تک کے عرصہ پر ہے، لیکن اس ادارہ کی سب سے اہم اور

سفید کتاب دی انسائیکلو پیڈک ڈسٹرکٹ گزیٹیرس آف انڈیا ہے، ساڑھے چھ ہزار صفحات کی دس جلدوں کی اس ضخیم انسائیکلوپیڈیا میں ہندوستان کی ۲۵ ریاستوں کے ۵۲۶ ضلعوں کے متعلق ماضی و حال کے مکمل معلومات جمع کیے گئے ہیں۔ تاریخ، رقبہ، جغرافیہ، قبائل، مقامات و عمارات کی تفصیل کے ساتھ زبان، اخبارات و رسائل، اداروں اور کتب خانوں کا بھی اس میں جامع ذکر ہے، گذشتہ سال شایع ہونے والی اس نادر موسوعہ میں ۵۰۰ سیاہ سفید تصویروں کے علاوہ ۲۰۰ رنگین تصویریں، ۳۰۰ نقشے اور ۱۵۰۰ اعداد و شمار کی فہرستیں بھی دی گئی ہیں، مکمل سٹ کی قیمت بیس ہزار روپے ہے، لائق محققین کے ذریعہ جمع کردہ اس قیمتی ذخیرہ کو آل انڈیا ریڈیو کے نیوز سروس ڈویژن کے سابق ڈائریکٹر ایس سی بھٹ نے مرتب کیا ہے۔

علم طبقات الانسان، موجودہ دور کا ایک پرکشش اور پسندیدہ موضوع ہے، ہندوستان کے طول و عرض میں ایسے بہت سے قبائل ہیں جن کی معاشرتی روایات بڑی دلچسپ ہیں، حال ہی میں ریاست میگھالیہ کے کھاسی (KHASI) قبیلہ کا ذکر ٹائمز آف انڈیا میں آیا تو معلوم ہوا کہ اب اس قبیلہ میں دور جدید کی تہذیب کس درجہ سرایت کر چکی ہے گارو اس قبائل کے علاوہ دنیا میں صرف یہی کھاسی قبیلہ ہے جو اپنی طرز معاشرت میں منفرد ہے، یہاں یہ روایت قدیم زمانہ سے چلی آتی ہے کہ ماں باپ کی سب سے چھوٹی بیٹی اپنے والدین کی جائداد و وراثت کی حقدار ہوتی ہے، شادی کے بعد بھی وہ والدین کے پاس رہتی ہے، اور اسے خاندان کے سربراہ کی حیثیت حاصل ہو جاتی ہے، اس کے بچے باپ کے بجائے اپنی ماں کے خاندان سے نسبت کے مستحق ہو جاتے ہیں، اس رواج کی بنا پر لڑکیوں کی اہمیت اولاد ذکور کے مقابلہ میں بہت زیادہ ہے، والدین صاف اور برملا بیٹیوں کو ترجیح دیتے ہیں اسی لیے

ان کی پرورش اور تعلیم پر بھی زیادہ توجہ دی جاتی ہے، اس ترجیح کا مشاہدہ وہاں کی شاہراہوں پر کیا جا سکتا ہے، جہاں لڑکیاں زیادہ صحت مند اور عمدہ پوشاک میں نظر آتی ہیں، جب کہ نوجوان پراگندہ بال دکھائی دیتے ہیں، اعلیٰ تعلیم کی بدولت یہ لڑکیاں زیادہ اچھی ملازمتیں بھی حاصل کرتی ہیں، جس کے نتیجہ میں مردوں میں اب عدم تحفظ اور احساس کمتری کی کیفیت عام ہے، بات یہیں تک محدود نہیں، قبیلہ کے کم حیثیت نوجوانوں کے مقابلہ میں اب یہ لڑکیاں بیرونی افراد سے ازدواجی تعلقات میں زیادہ دلچسپی رکھتی ہیں، بیرونی افراد کے لیے اس قبائلی علاقہ میں یہ سخت قانون ہے کہ وہ یہاں زمین نہیں خرید سکتے اور تجارت کے لیے پروانۂ اجازت بھی حاصل نہیں کر سکتے، لیکن قبیلہ کی لڑکی سے شادی کرنے کے بعد ان کی یہ رکاوٹیں از خود دور ہو جاتی ہیں اور وہ خاندان کی جائداد و میراث کے بالواسطہ مالک بھی ہو جاتے ہیں، اس صورت حال کے پیش نظر کھاسی قبائل کے طالب علموں کی یونین نے حکومت سے مطالبہ کیا ہے کہ ان کے پرسنل لا میں ترمیم کر کے اس قسم کی شادیوں کو ممنوع قرار دیا جائے اور بیرونی افراد کے اس علاقہ میں داخلہ پر بھی پابندی لگا دی جائے یا پھر کھاسی لڑکیوں کو حق وراثت سے محروم کر کے ان کی اولاد کی کھاسی نسبت ختم کر دی جائے، لیکن وہاں کی عورتوں نے ان مطالبات کو فضول و عبث کہتے ہوئے جواب دیا کہ اپنی شادی کے معاملہ میں وہ آزاد و خود مختار ہیں اور یہ سارا شور و غوغا محض مردوں کے غلبہ و تفوق کی جبلت کا مظہر ہے، عورتوں کے اس تیور کے سامنے حکومت بھی پرسنل لا میں مداخلت کی ہمت نہیں کر رہی ہے۔

قبائل کے ذکر کے ضمن میں یہ خبر بھی ملاحظہ ہو، گذشتہ دنوں پرنس آف ویلز شہزادہ چارلس ازبکستان کے دورے پر آئے تو انہوں نے قرآن مجید کے ایک قدیم اور خون آلود نسخہ (غالباً مصحف عثمانی) کی دید و زیارت میں بڑی دلچسپی کا اظہار کیا، اس کے علاوہ

انھوں نے ایک شادی کے لباس عروسی کو بھی بہت پسند کیا، اسلام اور اسلامی روایات سے شہزادہ کے اس شغف کا راز یہ بتایا گیا کہ قبیلہ قریش سے ان کا پشتینی رشتہ ہے، جو آنحضورؐ کے ایک جد عبد شمس تک پرنس کی ایک دادی ملکہ میری کے ذریعہ پہنچتا ہے، دلچسپ بات یہ ہے کہ ایک صحافی کی دریافت میں یہ ملکہ چنگیز خاں کی نسل سے ہے۔

بنی نوع انسان کی اصل و ابتدا کتنی قدیم ہے؟ اس سوال کا جواب قطعیت کے ساتھ شاید کبھی نہ مل سکے، قیاسات و خیال ہمیشہ جدا جدا رہیں گے لیکن ۱۹۹۶ء میں افریقہ میں ایک جبڑے کی دریافت نے قطعی طور پر یہ ضرور ثابت کیا کہ انسان کی اصل و ابتدا کو مزید چار لاکھ سال قدیم بنا دیا، شمالی حبش کے مرتفع حصہ مضر میں ایک وسیع و عریض خطہ میں خام پتھروں کے بکھرے ہوئے علاقہ سے یہ جبڑا برآمد ہوا ہے اور اس کے متعلق کہا جاتا ہے کہ یہ ۲۳ ر۲ ملین سال قدیم ہے اس عمر کے تعین سے یہ بات خود بخود صاف ہو جاتی ہے کہ انسانی نسل کا سب سے قدیم ترین نمونہ ہے، اس جبڑے کی عمر کی یہ تعیین کس حد تک درست ہے؟ یہ سوال زیادہ اہم نہیں، اہمیت اس بات کی ہے کہ موجودہ انسانی طبقات کی اصل اب اس قدیم عہد کے اور قریب تر ہو گئی ہے جب بنیادی ماحولیاتی عہدہ ر۲ ملین سال پہلے شروع ہوا تھا اور جس کی وجہ سے انسان کے قد و قامت اور اس کے طبعی احوال پر اپنا اثر دکھانا شروع کیا تھا، سائنسدانوں کے خیال میں یہی وہ عہد تھا جب یورپ اور شمالی امریکہ میں برفانی یورش ہوئی تھی اور اس سے افریقہ کی آب و ہوا اور موسم بھی بایں طور متاثر ہوا تھا کہ وہ زیادہ خشک اور زیادہ سرد پڑ گیا تھا، ان قدرتی اور طبیعاتی اور ماحولیاتی تبدیلیوں کی وجہ سے بنی نوع انسان میں زبردست تبدیلیاں آئیں اور جو بالآخر عہد جدید کے انسان کی موجودہ ساخت و ہیئت پر منتج ہوئیں، عجیب بات یہ ہے کہ اس سے انسان کے جسم کا سب سے قدیم نمونہ بھی حبش میں دریافت ہوا

ع۔ص۔

آثار علمیہ و تاریخیہ

مکاتیب علامہ سید سلیمان ندوی

بنام

صوبیدار حافظ جلیل صاحب بھوپالی

(سلسلہ کے لیے ملاحظہ ہو معارف دسمبر ۱۹۹۶ء)

بھوپال
۶ دسمبر ۱۹۴۹ء

عزیز مکرم ! شفاکم اللہ تعالیٰ

السلام علیکم و رحمۃ اللہ۔ آپ کا پہلا خط بھی ملا اور آج بھی کارڈ۔ اس محبت کا شکریہ!

آپ کی ترقی کے حالات سن کر بہت خوشی ہوئی۔ اللہ تعالیٰ آپ کو جلد تندرست بنا دیں۔

بحمد اللہ تعالیٰ مع الخیر ہوں اور آپ کے لیے دعا گو۔

میں نے شاید آپ کو لکھا تھا کہ خان بہادر ڈاکٹر مولا بخش آپ کے اندور والے معالج اب یہیں چیف میڈیکل آفیسر ہو کر آگئے ہیں۔

بحمد اللہ قرآن پاک کا دوسرا دور ہو رہا ہے آج کل چوتھا پارہ ہے کچھ نئے لوگ اور بھی آگئے ہیں،

آپ کے بچے کے بارہ میں مولوی شرافت صاحب نے بیان کیا کہ ان کی پچھلی تعلیم اس قدر کمزور ہے کہ وہ موجودہ زیر درس کتابیں سمجھ نہیں سکتے۔

تبدیل آب و ہوا کے لیے کراچی کی تجویز ڈاکٹر نے کی ہے مناسب ہے۔ خدا کرے کہ اس کا جلد موقع ملے، مولوی شرافت صاحب کو آپ کا خط دکھا دیا، وہ وطن سے واپس آچکے تھے۔

آج کل آپ کے بھائی صاحب سیاست کے بحران میں مبتلا ہیں، اللہ تعالیٰ فضل فرمائیں۔

والسلام۔ سید سلیمان ندوی

کراچی ۵۔ جمن اسٹریٹ ۵ ستمبر ۱۹۵۱ء

ڈار منزل۔

مکرم شفاکم اللہ تعالیٰ

السلام علیکم و رحمۃ اللہ۔ عنایت نامہ ملا، احوال سے آگاہی ہوکر خوشی ہوئی، میرا پتہ تو آپ حافظ عمران خاں صاحب سے پوچھ سکتے تھے۔ آپ کے بھائی صاحب سے لاہور میں کئی ملاقاتیں ہوئیں۔ صاحبزادہ بھی آئے، آپ کی خیریت بھی معلوم ہوئی۔

آپ کا خواب خدا کرے میرے لیے فالِ نیک ہو، منام میں جوانی اور تندرستی باطنی جوانی اور تندرستی کی بشارت ہے، بحمد اللہ تعالیٰ اچھا ہوں، جس حال میں ہوں اور جس جگہ بھی ہوں مسلمانوں کی دعاگوئی میں مصروف ہوں۔

آپ کی جمع کردہ کتابوں کی بربادی سے افسوس ہوا۔ بہرحال آپ پھر محنت کریں گے تو دوسرا سرمایہ اور جمع کرلیں گے۔ دار المصنفین سے جی چاہے تو بزم صوفیہ منگوالیں، لکھنؤ سے جامع المجددین مولانا عبد الباری صاحب ندوی کی انہیں سے بارڈنگ روڈ لکھنؤ کے پتہ سے خط لکھ کر منگوالیں، مولانا تھانوی کے مواعظ اور ملفوظات ضرور پڑھیں، مولانا عبد الباری صاحب ہی سے اگر آپ خط و کتابت کریں تو مفید مشورے دیں گے۔ خوشی ہوئی کہ سوڈیڑھ سو گز آپ صرف ایک لکڑی کے سہارے چل لیتے ہیں، اللھم زد فزد، میں یہاں مسلمانوں کو وعظ و نصیحت اور علوم دینی کی ترویج و اشاعت میں مصروف ہوں اور جو خدمت اسی قبیل کی مجھ سے بن آئے۔

احباب کی خدمت میں سلام کہیے، آپ کے لیے دل سے دعا کرتا ہوں، آپ کے ایئرمیل کا کاغذ بیرنگ ہوکر ملا۔ تین آنے کا ٹکٹ چاہیے۔

سلیمان ندوی

معارف کی ڈاک

مکتوب دہلی

ذاکر نگر ۔ نئی دہلی

۲ رمضان المبارک ۱۴۱۷ھ

مطابق ۱۲ جنوری ۱۹۹۷ء

محبی مولانا ضیاء الدین اصلاحی صاحب ۔ سلام ورحمت

پروفیسر ضیاء الحسن فاروقی مرحوم پر میرے مضمون کے بارے میں پروفیسر ریاض الرحمٰن خاں صاحب شروانی کا جو والا نامہ جنوری ۹۷ء کے معارف میں شایع ہوا ہے اس سلسلے میں خاکسار راقم الحروف کی گزارش حسب ذیل ہے :۔

میں نے اپنے مضمون میں یہ لکھ دیا تھا کہ "مرحوم ضیاء الحسن فاروقی صاحب کے بارے میں ان کی پرسنل فائل سے چند اقتباسات پیش کرتا ہوں، جن کی خوبی یہ ہے کہ یہ خود ان کے قلم کے مرہون منت ہیں۔"

اب اگر اس میں کوئی خامی یا غلطی ہے تو اصولاً اس کی ذمہ داری مرحوم پر ہے، نہ کہ مجھ پر۔ ان غلطیوں میں ایک میرا ناکردہ گناہ یہ ہے کہ بقول پروفیسر شروانی صاحب "مرحوم ضیاء صاحب جامعہ میں ذاکر حسین چیئر پر فائز رہے تھے، آپ کے مضمون میں یہ نہیں ہے۔" یہ بات صحیح ہے لیکن اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ بات محقق نہیں ہے، اس اعتراض کو پڑھنے کے بعد جامعہ کے چند سبکدوش سینیر اساتذہ سے میں نے معلوم کیا تو میں نے محسوس کیا کہ

اس کے بارے میں کسی کا ذہن صاف نہیں ہے۔ بالآخر مجھ سے کہا گیا کہ میں رجسٹرار آفس سے رجوع کروں۔ ابھی حال میں ایک نئے رجسٹرار تشریف لائے ہیں۔ ان سے میں نے عرض کیا کہ براہ کرم تکلیف کرکے اس مسئلے پر ضروری معلومات مہیا فرما کر ممنون فرمائیں۔ ظاہر ہے اس میں وقت لگے گا۔ اس عرصے میں اگر محترم پروفیسر شروانی صاحب مطلع فرمائیں کہ ذاکر حسین پر تبصرے کے بارے میں ان کا ماخذ کیا ہے تو عنایت ہوگی۔

میرے مضمون میں صفحہ ۱۲۶۴ کے تیسرے نمبر پر ایک سہو کتابت ہے۔ یہاں درج ہے کہ ۱۹۴۸ء میں ایم اے کیا۔ دراصل یہاں بی اے ہونا چاہیے۔

محترم شروانی صاحب نے ایک اور اہم بات کا انکشاف کیا ہے۔ وہ یہ کہ "مولانا آزاد کی انگریزی سوانح حیات مکمل نہیں ہے۔ بلکہ ۱۹۴۷ء تک ہے"۔ افسوس کہ اس سلسلے میں میں کچھ عرض نہیں کر سکتا۔ ان کے لائق صاحبزادے سے صحیح صورت حال معلوم کرنے کی کوشش کروں گا۔ انشاء اللہ!

عبداللطیف اعظمی

مکتوب اکبر پور

اکبر پور (اودھ)

۲۰-۱-۹۷ء

محب معظم جناب مولانا اصلاحی صاحب! سلام علیکم ورحمتہ وبرکاتہ

میں اعظم گڈھ کے تعزیتی سفر سے پچھلی شام ساڑھے سات بجے یہاں پہونچا۔ معارف جنوری پر ایک نظر ڈال لی۔ اپنا مضمون تو ٹھیک سے دیکھ لیا۔ شکر گذار ہوں کہ آپ نے یہ تیکھا تعقب شایع فرمایا۔ کتابت خوش نما اور طباعت صاف ہے۔ اغلاط عدداً تو

نہ ہونے کے برابر ہیں لیکن جو ہیں وہ بڑی معنویت کی حامل ہیں۔

ص۳۴ پر شیعہ پوسٹ گریجویٹ کالج میں شیدہ شعبہ ہو گیا ہے۔

دوسری غلطی بھی بڑی فاحش قسم کی ہے۔ ص۶۲ پر "حق نیوشی" کو حق پوشی کر دیا گیا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ اس میں میری بدخطی اور غلط نویسی کا بھی دخل ہو۔

دوسری گزارش آپ کے تحشیے سے متعلق ہے۔ آپ نے وادی اور لفظ پر حاشیہ تحریر فرمایا ہے "مقالہ نگار کے تذکیر و تانیث کے اپنے خاص مرجحات / ترجیحات ہیں"۔ مجھے اس بات پر زور دینا ہے کہ یہ میرے نجی مختارات نہیں ہیں۔ دبستانی تقلید کے تابع ہیں۔ ہر چند لکھنؤ اب خاموش بلکہ گنگ ہو چکا ہے، پھر بھی ہمارے وہ اصحاب جو ابھی کالجوں یا یونیورسٹیوں میں داخل نہیں ہوئے ہیں اور وہاں کی بولی بولنے کے پابند نہیں ہیں وہ لفظ کو برسر منبر مونث بولتے ہیں اور ہدف اعتراض بنتے ہیں۔

مولوی حافظ عمیر الصدیق صاحب سے سلام و اکرام کے بعد یہ یاد دہانی کرنا ہے کہ اس پاکستانی مدرک کی عکسی نقل مجھے لکھنؤ کے پتے سے ارسال فرمانا فراموش نہ فرمائیں جس میں جناب سید صاحب مرحوم کی تاریخ ولادت کی بحث ہے۔

حضرت باری آپ حضرات کو ماہ مبارک صیام کے برکات اور عید سعید فطر کے لذات سے متنعم و شاداب فرمائے۔ آمین فقط　　بندۂ اخلاص

سبط محمد نقوی (چیف ایڈیٹر ہماری توحید۔ لکھنؤ)

باب التقریظ والانتقاد

سید سلیمان ندوی۔حیات اور ادبی کارنامے

از جناب سبط محمد نقوی صاحب۔لکھنؤ

(۲)

جیسا کہ آگے چل کر آپ اور واضح طریقے سے ملاحظہ فرمائیں گے، راقم عاجز کی رائے ناقص میں محقق کریم سید صاحب کے عرفانِ ذات و کمالات سے قاصر رہے ہیں، اس لیے انہیں اس طرح پیش کر رہے ہیں کہ جیسے پیرا و ڑ نہیں سکتے۔ یہ مرید رشید زور لگا کر اڑا رہے ہیں۔ یہ سید صاحب کی منقبت نہیں، منقصت ہے۔ وہ جامع و کامل شخصیت کے مالک تھے۔

اب آخر میں اہم سوال جس کا ہمیں تفصیلی جائزہ لینا ہے، وہ مولانا شبلی اور سر سید کے اختلافات ہیں لیکن اس بحث میں داخلے سے پہلے دو ایک معمولی فروگذاشتوں کی طرف متوجہ کر دوں۔

کتاب کے ص۸۱ پر لکھا ہے کہ مولوی مسعود علی ندوی کے ذریعہ محمود آباد میں ایک جگہ کوشش کرنے کے لیے لکھا تھا۔ اس اندراج کے لیے مکاتیب شبلی ج ۲ کا حوالہ دیا ہے۔ افسوس ہے کہ مجموعہ ہائے مکاتیب میرے سامنے نہیں ہیں لیکن جیسا کہ سید صاحبؒ نے حیات شبلی میں لکھا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مرحوم راجہ (بعد میں مہاراجہ) محمد علی محمد خاں تعلقہ دار محمود آباد نے لکھنؤ میں مولانا کو نجف کے پاس زمین دلانے کی جو پیش کش کی تھی اس حوالے سے فرمارہے ہیں۔ جس کے فہم سے محقق عاجز رہے ہیں۔ (دیکھیں حیات شبلی ص۲۹۶)

(حاشیہ ص۱۳۵ پر)

ص ۱۹۱ کے حاشیے میں مولوی مسعود علی صاحب اور سید صاحب کی ناچاقی کے ذیل میں فرماتے ہیں کہ سید صاحب کے جانے کے بعد دارالمصنفین میں وہ لوگ نہیں رہ گئے جو سید صاحب کے زمانے میں تھے۔ حیرت ہوتی ہے کہ تحقیق کے دوران ہاشم صاحب شبلی منزل سے اعانت لیتے رہے۔ اتنا ممنون و متاثر ہوئے کہ کتاب کے انتساب میں ندوہ کے ساتھ اسے شریک کیا۔ پھر بھی یہ معلوم کرنے سے قاصر رہے کہ شاہ معین الدین احمد اور مولوی صباح الدین عبدالرحمٰن کو سید صاحب کی رفاقت[۱] میں کتنے کتنے دن کام کا موقع ملا۔

شبلی اور سرسید کے اختلافات اب ہم کو شبلی اور سرسید کے اختلافات کا جائزہ لینا ہے۔ اس مبحث میں داخل ہو کے یہ احساس شدت اختیار کرتا ہے کہ ہاشم صاحب کی دلچسپی سید صاحب کی شان بڑھانے میں اتنی نہ تھی جتنی مولانا شبلی کی حیثیت گھٹانے میں تھی۔

سید صاحب لاکھ دانا کے ساختہ پرداختہ سہی لیکن ان کے سوانح حیات میں استاد کے اتنے تفصیلی جائزے کی قدرتی گنجایش نہ تھی لیکن بہانۂ بسیار کے طور پر حیات شبلی کے جائزے کے پیرائے میں آورد کی راہ سے یہ گنجایش نکال لی گئی، کتاب کی طول طویل عبارتیں نقل کرنا طول مل کا باعث ہوگا لہٰذا ملخص مطلب پیش کر کے گفتگو کی جائے گی۔

(حاشیہ ص ۱۴۷) مبصر کا خیال صحیح ہے، مولانا شبلی مولوی مسعود علی ندوی کو لکھتے ہیں "ایک کام کرنے کا تو یہ ہے کہ دارالمصنفین کا بندوبست کر دو، راجہ صاحب محمود آباد نے مجھ سے کہا تھا کہ میں نے نجف کے پاس زمین لی ہے، چاہو تو وہیں تم کو بھی دلا دوں۔" مکاتیب شبلی بنام مولوی مسعود علی ندوی خط نمبر ۱۵ حصہ دوم (ض) [۱] اس وقت مذکورہ بالا دونوں حضرات کے علاوہ مولانا عبدالسلام ندوی مصنف شعر الہند، مولانا ابوالجلال ندوی مرحوم، مولوی سید ریاست علی ندوی مرحوم وغیرہ اور خود مولوی مسعود علی ندوی صاحب موجود تھے۔ (ض)

انگریزوں کی حمایت سرسید قوم کے لیے ضروری سمجھتے تھے۔ شبلی انگریزوں کی اسلام مخالف سرگرمیوں کے نکتہ چیں تھے۔ یہ بات درست ہے۔ یقیناً یہ فکری اختلاف تھا اور اپنے اپنے موقف میں دونوں بجا تھے لیکن عملی زندگی میں تو اس کا کوئی ناگوار اثر مشاہدے میں نہیں آیا۔ انگریز دشمنی کے باوجود برطانوی حکام نے مولانا کو شمس العلماء کے خطاب سے نوازا اور مولانا نے اسے خاموشی کے ساتھ نہیں خوشی کے اظہار کے ساتھ قبول فرمایا، یہ تاریخی سانحہ ہے کہ ان دونوں مفکروں نے کوئی متفقہ راستہ نہیں نکالا ورنہ شاید ملت اسلامیہ کی فلاح کی بہتر سبیل ہو سکتی۔ قیاس کا قرینہ یہ ہے کہ اگر مولانا نے افہام و تفہیم کی سعی کی ہوگی تو وہ اس لیے نامشکور رہوئی ہوگی کہ سرسید انگریز اساتذہ اور اپنے صاحبزادے سید محمود کے اثر میں تھے اور ان لوگوں کی رائے کے خلاف کسی اقدام سے معذور تھے۔

۲۔ الفاروق کی تصنیف پر مولانا اور سرسید میں اختلاف ہوا اور اسے سرسید نے ذاتی مسئلہ بنا لیا۔ اس بات میں کوئی شک نہیں کہ سرسید اس کتاب کی تصنیف کے خلاف تھے۔ یہ بھی حقیقت ہے کہ انہوں نے مولانا کو اس سے باز رکھنے کی کوشش کی اور آخر وقت تک جی سے راضی نہ تھے لیکن ایسا نہیں ہے کہ وہ محض سُنّی۔ شیعہ اختلاف ابھرنے کے اندیشے سے الفاروق کی تصنیف سے باز رکھنے کی کوشش کر رہے تھے۔ اس میں سرسید کے معتقدات بھی حائل تھے۔ وہ طباع بزرگ تھے اور انہوں نے کافی نرالے خیالات قائم کر لیے تھے۔ ان میں ایک یہ بھی تھا کہ خلفائے راشدین اور حضرت علی سمیت ائمہ اہل بیت کو وہ جامع الجهتین نہیں سمجھتے تھے۔ ایک کو جہانبانی کا اہل اور دوسرے کو روحانی رہبری کے لائق سمجھتے تھے۔ یہ ان کے اپنے مفروضے تھے جس سے کوئی فریق متفق نہیں ہو سکتا تھا، لیکن وہ اپنے اسی ایک خیال میں متفرد نہ تھے، جنات کے وجود، حضرت عیسیٰ

کی ولادت، دعا کا مسئلہ بہت ساری باتیں ایسی تھیں جن پر وہ اپنی اکیلی رائے رکھتے تھے۔

لیکن یہ خیال درست نہیں ہے کہ سرسید الفاروق کے سوال کو اپنا ذاتی یعنی انا کا مسئلہ بنائے تھے، ہاشم صاحب اگر حیات شبلی توجہ اور یکسوئی سے ملاحظہ کرتے تو انہیں یہ معلوم ہو جاتا کہ جب منشی سراج الدین صاحب نے الفاروق سے پہلے سیرۃ الفاروق لکھ کے چھپوادی تو سرسید نے اپنی ناراضامندی کا برملا اظہار فرمایا۔ مولانا خود راوی ہیں کہ سید صاحب الفاروق کے اوراق دیکھنے کے مشاق ہوتے تو میں مسکرا کے کہتا کہ غزل مشاعرے سے پہلے نہیں سنائی جاتی۔ علی گڑھ سے مولانا کی علیحدگی میں الفاروق کا ہاتھ ہونے کا خیال درست نہیں ہے۔ اگر درست ہو بھی تو قدرِ قلیل ہے۔

۳۔ پہلے سرسید اپنی سوانح عمری شبلی سے لکھوانا چاہتے تھے، ان کے راضی نہ ہونے پر حالی کو منتخب کیا۔ یہ درست ہے اور یقیناً مولانا شبلی کے انکار نے سرسید کو کبیدہ کیا ہوگا۔

لیکن سرسید اور مولانا شبلی کے مابین اتنا ہی معاملہ نہ تھا اور باتیں بھی تھیں مثلاً:

(۱) مولانا کی کانگریس کی حمایت۔ چاہے وہ کسی انداز اور کسی درجے کی رہی ہو۔

(۲) ترکوں کی فتح پر مولانا اور عام مسلمانوں کی مسرت اور سرسید کی کلفت۔

(۳) عربی کی تعلیم اور اس میں اصلاحات جو سرسید کے لیے بڑی آزردگی کا مسئلہ تھا

(۴) سرسید کی تفسیر کے عربی ترجمہ سے مولانا حمید الدین فراہی کی معذرت، اس بنیاد پر کہ یہ کام لاتعاونوا علی الاثم والعدوان کے ذیل میں آتا ہے۔ سرسید کا اس سے یہ گمان کرنا کہ یہ صاف جواب مولانا کے اشارے پر فراہی صاحب نے دیا ہے۔ ضرور بُعد کا باعث ہوا ہوگا۔

(۵) دعا و استجابت کے سوال پر سید صاحب کے مضمون کا اعظم گڑھ سے جواب لکھا جانا۔ ہر چند لکھنے والے ہندو بزرگ تھے اور علی گڑھ کے متوطن۔ اسے بھی سر سید کا خیال کرنا کہ یہ مولانا کے اشارے سے ہے۔

یہ منفی اسباب ہیں جو علی گڑھ سے مولانا کی بد دلی اور انجام کار علٰحدگی کے باعث ہوئے۔ ان کا مثبت رُخ یہ ہے کہ مولانا علی گڑھ یا حیدر آباد کہیں بھی شخص من الاشخاص ہو کے نہیں رہ سکتے تھے۔ اپنے زمانے کے وہ کسی مفکر یا مصلح سے کم رتبہ نہ تھے۔ ان کے سامنے سب سے پہلا سوال اپنی راوت واڑہ، نومسلم راجپوت برادری کی تعلیمی و سماجی حالات کی اصلاح کا تھا۔ وہ وقتاً فوقتاً موازنہ قومی کے جلسے کیے کرتے تھے، نیشنل اسکول جواب ماشاء اللہ پوسٹ گریجویٹ ڈگری کالج ہے یا بعد میں مدرسۃ الاصلاح سرائمیر سب اصل میں موازنہ قومی کے نتائج کے پیداوار ہیں۔ پھر ندوۃ العلماء یا دیگر ملی مسائل میں وہ موثر کردار ادا کرنا چاہتے تھے۔ تصنیف و تالیف میں خود مشغول رہنے کے ساتھ وہ تصنیفی ادارے قائم کرنے کی تمنا رکھتے تھے، یہ سب علی گڑھ اور حیدر آباد کی پابند حاضری میں کہاں ممکن تھا۔

مُوے پر ایک تازیانہ یہ ہوا کہ مولانا کو علی گڑھ سے متعلق رہنے کے لیے سر سید اور مسٹر بک اس بات پر راضی تھے کہ مولانا صرف چھ مہینے علی گڑھ میں رہیں اور چھ مہینے آزاد رہ کے اپنا کام کریں۔ اس میں سید محمود آڑے آگئے۔ پھر بھی آب و دانہ کہیے یا امر مبہم ان بوقت کہیے سر سید کی زندگی تک گاڑی لشٹم پشٹم چلتی رہی۔

ان مسائل کے ساتھ مولانا کی تندرستی کا مسئلہ بھی تھا۔ یہاں ہم یہ اشارہ بھی کرنا چاہیں گے کہ اگر سر سید کو مولانا سے کد ہوتی اور وہ ان سے پنڈ چھڑانا چاہتے تو شش ماہہ

قیام پہ کیوں راضی ہوتے۔

ابھی لکھنے کی بڑی گنجائش ہے۔ لیکن کہاں تک! محقق تبحر کے موضوع سے ربط کا یہ عالم ہے کہ رقمطراز ہیں کہ "یہاں تک کہ اس عہد کے عظیم عربی اسکالر مولانا حمید الدین فراہی بھی ان کو (یعنی شبلی کو) نہ مانتے" مٹ۲۹۶۔ کیسے مانا جائے کہ ان بیچارے نے حیات شبلی سلیقے سے پڑھی ہے یا شبلی کی نسبت معقول معلومات رکھتے ہیں۔ سید سلیمان تو بعد کی چیز ہیں اقرب تو فراہی صاحب ہی ہیں۔ ماموں کے بیٹے، شاگرد، مستفیض اور مطیع و مستعد رفیق کار ان کی نشاندہی اس طرح ہو رہی ہے کہ جیسے غیر اور اجنبی ہوں۔ اصل بات یہ ہے کہ محقق خود اس دیار علم میں اجنبی ہیں۔

فاضل محقق نے یہ تاثر دیا ہے کہ وہ سید سلیمان کے عقیدتمند ہیں اور اسی وجہ سے تحقیق کا پاپڑ بیل رہے ہیں، لیکن دراصل جہاں سید صاحب ان کو اپنے ہم نوا نہیں لگے، وہاں انکو جنبہ دار قرار دینے میں تکلف سے کام نہیں لیا ہے۔ وحید قریشی، محمد امین زبیری، محمد اکرام اور پروفیسر خورشید الاسلام ایسے منتقدین شبلی کی رائیں لکھی ہیں۔ دبی زبان سید صاحب ایسے جید عالم کو جواب سے قاصر بھی ظاہر کیا ہے۔ معتقدین شبلی کا کہیں ذکر نہیں۔ عبداللطیف اعظمی تک کا نہیں۔

حد یہ ہے کہ سرسید ایسے آمریت پسند کے مقابلے میں مولانا کو محرور المزاج، زود اشتعال، راجپوتانہ طینت کا آدمی یا ایسا ہی کچھ بتایا ہے۔ شبلی ایسی ہی ناپسندیدہ شخصیت ہوتے تو ان کی حمایت میں ندوہ میں ایسی تاریخی اسٹرائیک ہوتی نہ حکیم اجمل خاں سے لے کر مولانا محمد علی تک کے ایسے رہنما ان کے حامی ہوتے۔ سرسید سے احباب کی مفارقت کا جو سلسلہ مولوی سمیع اللہ خاں سے چلا وہ آخر میں اس درجے تک پہونچا کہ ان کے

فرشتہ مزاج مناقب نگار مولانا حالی تک کو متزلزل کر گیا۔ مگر یہ سرسید سے بڑھ کے سید محمود کی دین تھی۔

ہم اس توقع پر یہ گفتگو تمام کر رہے ہیں کہ اس کتاب کا مطالعہ کرنے والے طلاب کرام ہمارے معروضات پیش نظر رکھیں گے اور ان معروضات کی روشنی میں مصنف محقق اگلی اشاعت کے لیے کتاب پر نظر ثانی کریں گے۔ ضرورت ہوئی تو جو کچھ اجمالاً عرض کیا گیا ہے اس کی تفصیل بھی پیش کی جا سکتی ہے۔ ہم اس کے بھی متدعی ہیں کہ اگر کہیں نگاہ سے چوک ہوئی ہو تو ہمیں خبردار کر دیا جائے۔

یہاں پہنچ کر مجھے دفع دخل مقدر کی اجازت دیں۔ مجھے اندیشہ ہے کہ کسی دل میں یہ خطرہ پیدا ہو کہ میری غرض اس خامہ فرسائی سے سید علامہ کی کسر شان ہے۔ ایسا نہیں ہے۔ میں سید صاحب کے افاضات سے مستفیض ہوا ہوں۔ انہیں علامۂ روزگار مثال بے مثالی سمجھتا ہوں۔ یہ بیشک ہے کہ میں انہیں علامہ شبلی نعمانی سے اعلم یا اہم نہیں سمجھتا۔ چونکہ فاضل محقق نے اسی تصور کو نصب العین کر کے اپنی تحقیق کا تانا بانا بنا ہے[1]۔ اس لیے اس مطالعے کی ضرورت لازم آئی اور سید صاحب کے تعلق سے ایک نازیبا لفظ لکھ دینے پر ایک عزیز دوست سے مہینوں تو تو میں میں کی آواز میں بحث کرتا رہا۔ جو معارف کے موجودہ مدیر کی مداخلت پر بند ہوا۔

مقصد یہ ہے کہ اردو میں ریسرچ کا جو معیار ہو گیا ہے جس کا ماہنامہ آج کل دلی میں ادھر بہت مذکور رہا اس کا ایک نمونہ پیش کر دیا جائے۔ ریسرچ اسکالر کو تو سند کی فکر رہتی ہے کہ وہ ہاتھ لگے اور استحقاق ملازمت کو مستحکم کرے لیکن سپروائزر صاحبان، ممتحن صاحبان اور اکادمیوں کے ماہرین فن جو امداد کی منظوری کے لیے مسودوں کی جانچ پرکھ کرتے ہیں وہ اتنے ناقص مسودات کو کیا سمجھ کے ڈگری اور امداد کے لیے منظور کرتے ہیں۔

---

[1] علامہ سید سلیمان ندوی پر علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں ہونے والے سمینار میں محقق موصوف کے اسی طرز عمل سے آزردہ ہو کر مرحوم سید صباح الدین عبدالرحمن صاحب سمینار ہال سے باہر ہو گئے تھے اور اس وقت کے وائس چانسلر سید حامد کی معذرت و معافی کے بعد ہی پھر واپس گئے۔ (معارف)

اس سلسلے کا آغاز ہی ہم نے دبستان ولی اللّٰہی سے استاذ الہند ملا نظام الدین کے تلمذ کے سوال سے کیا تھا۔ لیکن وہ مختتم گفتگو تھی۔ آپ نے ملاحظہ فرمایا ہوگا کہ زمانۂ ولادت کے اعتبار سے صرف شاہ ولی اللّٰہ صاحب کی ہی ذات عالی صفات ایسی تھی جس سے بہ ہزار تکلف سہی تلمذ کا امکان ہو سکتا تھا! اس کی کیفیت یہ ہے کہ ان کے دبستان کے مورخ معتقد مولانا حکیم محمود احمد برکاتی نے شاہ صاحبؒ کے دبستان "شاہ ولی اللّٰہ اور ان کا خاندان" کے نام سے ایک کتاب لکھی ہے۔ جسے مکتبہ جامعہ نے شایع کیا ہے۔ اس میں حکیم برکاتی صاحب نے شاہ صاحب کی توقیت بھی درج کی ہے۔ اس کی رو سے شاہ صاحبؒ کے "فراغت درس واجازت تدریس" کا زمانہ ۱۱۲۹ھ/ ۱۷۱۷ء بتایا ہے۔ (ص۱۱) اس کا صریحی مطلب یہ ہوا کہ اگر ملا نظام الدین (ولادت ۱۰۸۹ھ/ شاہ صاحب کے اولین تلمیذ بھی ہوتے تو ۱۵ سالہ استاد کے حضور میں چالیس سال کی عمر میں زانوئے ادب تہ کرتے۔ بھلا یہ عقل میں سمانے والی بات ہے! اسے چھوڑ دیں تو اور دوسری بین شہادت بھی موجود ہے۔ وہ یہ کہ برکاتی صاحب نے دعوائے حصر کے ساتھ شاہ ولی اللّٰہ صاحب کے تلامذہ اور مریدین کی فہرست دے دی ہے (ص۲۵) ان میں ملا صاحب کا اسم گرامی شامل نہیں ہے۔ یہ کیسے ممکن ہو سکتا ہے کہ استاذ الہند ایسا نابغۂ روزگار استاذ سے کبیر السن حلقۂ تلامذہ میں داخل ہوتا اور اس کا نام فخر و مباہات سے رقم نہ کیا جاتا۔ شاگردوں کی اس قلت تعداد پر محمود احمد صاحب روشنی ڈالتے ہیں :۔

> "... اس کی وجہ شاہ عبدالعزیز کے بیان کے مطابق یہ تھی کہ شاہ صاحب نے صرف جوانی میں تدریس کی طرف توجہ کی تھی اور اس کے بعد جب اپنے شاگردوں کی ایک ایسی جماعت تیار کر لی جو مختلف فنون کے ماہر تھے تو مدرسہ ان کے سپرد کر کے خود فکر و تحقیق اور تصنیف و تالیف کے لیے وقف ہو کر رہ گئے تھے۔..." (ص۳۰)

اس گفتگو سے آپ پر یہ واضح ہو گیا کہ استاذ الہند ملا نظام الدین کا ذکر دبستان ولی اللّٰہی کے شاگردوں میں کیا جانا بالکل بے اصل ہے۔ معلوم نہیں کہ فاضل محقق کس رو میں بہہ گئے۔ (باقی)

مطبوعات جدیدہ

نوادر امدادیہ مرتبہ جناب پروفیسر نثار احمد فاروقی، متوسط تقطیع، بہترین کاغذ و کتابت و طباعت، مجلد، صفحات ۲۸۷، قیمت درج نہیں، پتہ: حضرت سید محمد گیسو دراز تحقیقاتی اکیڈمی، روضہ منورہ بزرگ، گلبرگہ شریف، کرناٹک۔

مولانا اشرف علی تھانوی اپنے مرشد و شیخ طریقت حاجی امداد اللہ مہاجر مکی کے احوال و ملفوظات کے متعدد مجموعے اپنی زندگی میں شایع کر چکے تھے، اب یہ خدمت سلوک و تصوف کی کتابوں سے خاص اشتغال رکھنے والے مشہور عالم و محقق جناب نثار احمد فاروقی انجام دے رہے ہیں، امداد المشتاق اور مرقومات امدادیہ کے بعد یہ کتاب بھی ان کی ترتیب و محنت کے نتیجہ میں شایع ہوئی ہے، یہ حضرت حاجی صاحب کے ان خطوط کا مجموعہ ہے جو ان کے مرید و دست گرفتہ مولانا عبدالسمیع بیدل رام پوری صاحب انوار ساطعہ در بیان مولود و فاتحہ کے نام تھے، حاجی صاحب نے اپنے اکثر خطوط میں اپنے دیوبندی خلفاء کے مسلک کے برخلاف مولانا بیدل کے مسلک کی حمایت کی ہے جو فاتحہ، چہلم اور قیام میلاد وغیرہ کے قائل تھے، ہر خط کا اصل عکس بھی دیا گیا ہے، کتاب کا مدلل و مفصل مقدمہ ایک اضافی خوبی ہے جو انوار ساطعہ کے مسائل کے جواز و عدم جواز کی بحث کو اور دلچسپ بناتی ہے، اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ فاضل مرتب کی نظر ان مسائل پر بھی بہت کچھ ہے، البتہ انہوں نے جس طرح بعض تاریخی روایتوں سے استدلال کیا ہے وہ محل نظر ہے، مثلاً قبر پر نذر ماننے اور حاجات طلب کرنے کے اہل روم کے عمل کو صدر اسلام کا رائج معمول قرار دینا، یا حضرت عمرؓ اور دوسرے کبار صحابہؓ کی موجودگی میں

حضرت زینبؓ بنت جحش کی قبر پر چادر چڑھایا جانا وغیرہ باقی مکتوب نگار و مکتوب الیہم کے حالات و کوائف فاروقی صاحب کے ذوق و معیار تحقیق کے عین مطابق ہیں، پیش لفظ خانقاہ خواجہ گیسو درازؒ کے سجادہ نشین کے قلم سے ہے، اس نادر کتاب کی خوبصورت طباعت و اشاعت میں ان کی توجہ و عنایت بھی شامل ہے۔

غالب کے چند نقاد از جناب ڈاکٹر سلیمان اطہر جاوید، متوسط تقطیع، عمدہ کاغذ اور کتابت و طباعت، مجلد مع گردپوش، صفحات ۲۴۲، قیمت ۶۰ روپے، پتہ: غالب انسٹی ٹیوٹ ایوان غالب مارگ، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲۔

سلسلۂ غالبیات کی یہ ایک اور کڑی ہے جس میں غالب کے سترہ طرفدار و نکتہ چیں نقادوں کی تنقید و تحقیق کا جائزہ لیا گیا ہے مولانا حالی سے خورشید الاسلام تک، اس فہرست میں مہر و بجنوری بھی ہیں اور عبداللطیف و یگانہ چنگیزی بھی ہیں، فاضل مصنف اردو کے معروف نقاد اور اہل قلم ہیں، اس لیے مدح و قدح کا یہ محاکمہ ان کے قلم کے ذریعہ کھرا اور دلچسپ ہے انھوں نے محنت و سلیقہ سے اور غیر جانبداری سے ہر ناقد کی تحریر کا جائزہ اور خلاصہ پیش کر دیا ہے، ان کا طرز نگارش بھی رواں اور سادہ ہے البتہ زبان و بیان پر کہیں کہیں علاقائی اثر آگیا ہے، مثلاً "اگر عبدالصمد کوئی حقیقی شخصیت ہوتی تو حالی ان سے ملاقات کیے ہوتے یا نہیں"؟ "انھوں نے قتیل وغیرہ کو خاطر میں نہیں لایا"۔ "انھوں نے غالب کے تعلق سے اس کو کام میں لایا"۔ اپنی کی جگہ ہماری تہذیب و تمدن...؛ مباحث میں 'ایک حد تک'، 'کسی حد تک'، 'بڑی حد تک' جیسے جملوں کا استعمال کثرت سے ہے، حالانکہ حد مجہول و موہوم ہے، لفظ 'نیز' کی تکرار بھی گراں گزرتی ہے 'بغایت سادگی کے ساتھ' ایک جملہ میں موجود ہے، ان تسامحات سے کتاب کی قدر و قیمت کم نہیں ہوتی، یہ غالب شناسی میں

مفید اضافہ ہے۔

تحقیقی گوشے از جناب ڈاکٹر رئیس انور، متوسط تقطیع، کاغذ اور کتابت و طباعت مناسب، مجلد صفحات ۱۲۰، قیمت ۶۰ روپے، پتہ: دانش کدہ، شاہ ٹولی، داناپور کینٹ، پٹنہ ۸۰۱۵۰۳۔

گیارہ مضامین اور چھوٹی تقطیع کے ایک سو بیس صفحات پر مشتمل یہ مجموعہ بقامت کہتر بقیمت بہتر کا صحیح مصداق ہے، نصف سے زیادہ مضامین کا تعلق بنگال میں اردو زبان کے مختلف گوشوں سے ہے، ان کی گذشتہ لئی تالیفات کا موضوع بھی یہی رہا ہے، اس طرح اب وہ بنگال میں اردو کے ماہر ہو گئے ہیں، اس کتاب کے مضامین ان کی تحقیق وجستجو اور مطالعہ کی وسعت کے غماز ہیں خصوصاً کلکتہ میں علمی ادارون مطبعوں اور کتابوں کے متعلق انکے دونوں مضمون بہت عمدہ اور پُر از معلومات ہیں، انھوں نے ایسٹ انڈیا کمپنی کی تعلیمی کارگزاریوں کے پس منظر میں انگریزوں کی منصوبہ بندی اور پیش بیں حکمت عملی کی نشاندہی کرکے اپنے مطالعہ کی گہرائی کا ثبوت دیا ہے، مدرسہ عالیہ کے متعلق لکھا گیا ہے کہ وہ ہندوستان میں مشرقی علوم و السنہ کا پہلا ماڈل ادارہ قرار دیا جا سکتا ہے، کلکتہ کو اردو نثر کا پہلا باضابطہ مرکز بلکہ علوم و السنہ شرقیہ کا پہلا طباعتی مرکز ہونے کا فخر بھی حاصل ہے، نیز بنگال کے ہندو شعراء کی اردو غزل گوئی کو اس لحاظ سے اہمیت دی گئی ہے کہ یہ اردو غزل کی روایت کی تقلید و ترویج کی عمدہ مثالیں ہیں، الفاظ اور ان کی ماہیت کے متعلق بحث و گفتگو سے لائق مصنف کے لسانیاتی ذوق و شعور کا اندازہ ہوتا ہے۔

نشے کی لت موت کا سایہ از جناب اکرام اللہ، متوسط تقطیع، عمدہ کاغذ اور کتابت و طباعت، مجلد مع گرد پوش، صفحات ۲۴۸، قیمت ۱۰۰ روپے، پتہ:

اودھ بک سینٹر، ۱۳۰/۹۶، گنیش گنج، لکھنؤ ۲۲۶۰۱۸۔

انسان کی تباہی و گمراہی میں شیطان کا ایک موثر ہتھیار شراب اور نشہ آور اشیاء ہیں، ر حاضر میں یہ برائی دوسری تمام برائیوں کی طرح بے بند و بے مہار ہوگئی ہے، تہذیب ید نے شراب و منشیات میں خود کو غرق کر لیا ہے اور اب عالم یہ ہے کہ یہ تہذیب د اپنے ہاتھوں ایک پوری نسل انسانی کی ہلاکت کی ذمہ دار ہوگئی ہے۔ شراب اور ں سے بھی بڑھ کر کوکین، ہیروئن، مری جوانا اور دوسری کئی قاتل ڈرگس کی پیداوار اور المی پیمانہ پر ان کی ناجائز فروخت، حکومتوں کے لیے ایک اہم مسئلہ بن گیا ہے، زیر نظر ناب کو اس لحاظ سے اولیت حاصل ہے کہ اردو میں اس قدر تفصیل اور جدید ترین علومات کے ساتھ اس مسئلہ پر اظہار خیال کیا گیا ہے، تین ابواب میں بالترتیب مے نوشی، شیلی ادویات اور سگریٹ نوشی کی تاریخ، زمانۂ حال میں ان کی پیداوار، فروخت و فروغ کے خطے اور پھر ان کی ہلاکت آفرینیوں کے سدباب کے متعلق مربوط گفتگو کی گئی ہے، البتہ اردو متبادل کی موجودگی میں بعض انگریزی الفاظ مثلاً اسنف، مونوپالی، کرانک اور پروہیبیشن کا غیر ضروری استعمال کھٹکتا ہے، تاجکستان کو تجاکستان، قرغیزیا کو کرگز لکھا گیا ہے، وسط ایشیا کی ریاستوں میں کفاکستان کی ریاست کا علم نہیں، ہریانہ کا ضلع حصار ہے ہسار نہیں، لائق مولف اس سے پہلے فریب تمدن اور دلوں کی خیر جیسی مفید اور بامقصد کتابیں لکھ کر داد و تحسین حاصل کر چکے ہیں، یہ کتاب بھی ان کے نام و کام کے لیے باعث خیر و برکت ثابت ہوگی۔

ادباب اردو تحریر و تصویر کے آئینہ میں از محترمہ اسماء رفعت حسین، متوسط تقطیع، عمدہ کاغذ اور کتابت و طباعت، مجلد مع گرد پوش، صفحات ۲۱۲،

قیمت ۸۵ روپے، پتہ : اردو محل پبلشرز، ۱۹ باغ منو، نیا گاؤں، لکھنؤ، یوپی۔

اردو کے ممتاز و معروف اہل قلم کی تصویروں اور ان کی تحریروں کے نمونوں کا یہ انوکھا مجموعہ دراصل حوصلہ مند مولفہ کی محنت وجاں کاہی اور حسن انتخاب کا خوبصورت مرقع ہے، اس کتاب کے پہلے حصہ کی خاطر خواہ پذیرائی ہوئی تھی جس میں قریب اسی اہل قلم شامل تھے، زیر نظر دوسرا حصہ ایک سو چالیس ارباب علم و فضل کی تصویر و تحریر اور ان کے مختصر سوانح سے مزین ہے، اس سہ رنگ آئینہ خانہ میں سوانح و علمی خدمات کو جس سلیقہ، اختصار اور جامعیت سے پیش کیا گیا ہے وہ صد درجہ قابل تعریف ہے، بجا طور پر اس کاوش کو حوالہ جاتی کتاب کی حیثیت حاصل ہوگئی ہے، توقع ہے کہ حصہ اول کی طرح یہ دوسرا حصہ بھی اپنی افادیت و جامعیت کی وجہ سے مقبول عام ہوگا۔

مولانا مودودی کے خطوط از جناب سید امین الحسن رضوی، چھوٹی تقطیع، عمدہ کاغذ اور کتابت وطباعت، صفحات ۱۰۲، قیمت ۱۰ روپے، پتہ: مرکزی مکتبہ اسلامی ۳۰۵۳، بازار چتلی قبر، دہلی ۶ ...۱۱۔

مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی داعی و مفکر اسلام کی حیثیت سے مشہور ہیں، انکا ایک بڑا وصف انکا شگفتہ، دلکش، ٹھوس اور سلیس انداز نگارش بھی ہے، ان کے مکاتیب بھی اس خوبی سے خالی نہیں، زیر نظر مکاتیب ان کے ایک محب صادق کے نام ہیں جنھوں نے ان کو محفوظ رکھا اور اب شایع کر دیا ہے، یہ نجی خط وکتابت ہے، لیکن افادہ عام سے خالی نہیں، بعض علمی و فقہی نکات اور دعوت اسلام کے متعلق مولانا مرحوم کے جذبات کے علاوہ ماش کی دال، دہلی کے فیض الحسن کے کاجر کی ترنی اور کرکٹ کنندہ ی کا ذکر بھی ملتا ہے، مکتوب الیہ نے ہر خط پر توضیحی تحریر بھی دی ہے نیز مولانا سے اپنے ربط و تعلق کی داستان بھی تفصیل سے

سنائی ہے، اس کا مقدمہ مولانا ناصر عمری کے قلم سے ہے جو پڑھنے کے لائق ہے۔

اعلام الفتیہ باحکام اللحیہ معروف بہ داڑھی کی شرعی حیثیت

از جناب مولانا حفظ الرحمن اعظمی، کاغذ اور کتابت وطباعت عمدہ، صفحات ۷۲، قیمت ۱۰ روپے

پتہ: اسلامک بک ہاؤس ابراہیم پور، پوسٹ آفس دیوکلی ترن، اعظم گڑھ، یوپی۔

داڑھی رکھنے کے امر واجب کی تعمیل میں علماء اس مسئلہ پر مختلف الرائے ہیں کہ مطلق ارسال مطلوب و مستحب ہے یا اصلاح لحیہ کی بھی گنجایش ہے، اس مختصر رسالہ میں روایات وآثار صحابہؓ اور اقوال ائمہ اربعہؒ کی روشنی میں بدلائل ثابت کیا گیا ہے کہ جمہور علماء کے نزدیک مطلق ارسال لحیہ واجب نہیں، اس سے پہلے لائق مولف نے مسنون دعاؤں کا ایک مفید مجموعہ شایع کیا تھا، وہ ایک متدین، باصلاحیت اور سنجیدہ مزاج عالم ہیں لیکن اندازہ ہوتا ہے کہ مذکورہ بحث ایک خاص مسلک کی تردید میں ہے اور گو عام انداز متوازن و معتدل ہے تاہم کہیں کہیں شدت میں بعض نامناسب اور غیر ضروری جملے بھی جز و بحث بن گئے ہیں، ان سے احتراز ممکن و مناسب تھا۔

دی موسک آف کورڈوبا مترجم جناب سلیم اے گیلانی، نفیس ترین کاغذ اور دیدہ زیب طباعت، صفحات ۴۶، قیمت درج نہیں، پتہ: اقبال اکیڈمی، ایوان اقبال لاہور، پاکستان۔

علامہ اقبال کی شاہکار نظم مسجد قرطبہ محتاج تعارف نہیں، اپنے موضوع کی طرح یہ نظم بھی جلال وجمال حسن ورعنائی اور کیف واثر کا عجیب امتزاج ہے، زیر نظر انگریزی ترجمہ میں کوشش کی گئی ہے کہ معنی کے ساتھ اصل روح بھی منتقل ہو جائے۔

ع۔ص۔

معارف

جلد ۱۵۹ ماہ ذیقعدہ ۱۴۱۷ھ مطابق ماہ مارچ ۱۹۹۷ء عدد ۳

فہرست مضامین

شذرات

مولانا سید سلیمان ندویؒ نے مغرب کے بعض مفکرین اور ماہرین تعلیم کے حوالے سے تحریر فرمایا ہے کہ ان کے نزدیک نظام تعلیم کا مقصد صرف یہ ہے کہ انسان کو اپنی زندگی گزارنے میں زیادہ سے زیادہ مدد مل سکے یا نوع انسانی کے لیے اجتماعی حیثیت سے زیادہ سے زیادہ فوائد حاصل ہوسکیں یا اس کی آخری غایت محض اس قدر ہے کہ انسان کو مادی قوانین کا صحیح ترین علم ہوسکے، مغربی نظام تعلیم میں بداخلاقی بالواسطہ صرف اس حیثیت سے مذموم ہے کہ بالآخر اسکے نتائج اسکے مرتکب کے لیے تکلیف دہ ثابت ہونگے۔ اس لحاظ سے معیوب نہیں ہے کہ وہ بجائے خود کوئی قابل مواخذہ معصیت ہے۔ سید صاحبؒ نے کرۂ ارض کے دوسرے حصوں میں ایک ایسے نظام تعلیم کا ذکر کیا ہے جس میں علم حصول کی غایت تمامتر خداشناسی، تزکیۂ نفس و توفیق حسن عمل ہے اور اس کا آخری مقصد نجات اخروی ہے نہ کہ بیش قرار مشاہروں کا حصول۔ سعدیؒ تحصیل علم کے لیے جاں گداز کوششوں کی ترغیب اس لیے دیتے ہیں کہ بغیر اس کے خداشناسی و فلاح اخروی ممکن نہیں ہے۔

پئے علم چوں شمع باید گداخت — کہ بے علم نتواں خدا را شناخت

بہ دامن علم گیر استوار — کہ علمت رساند بدار القرار

جس نظام تعلیم کی غایت خداشناسی ہو اس میں طلب علم کا مقصد رضائے الٰہی، حیات اخروی، رفع جہالت نفس اور خدمت خلق ہوتا ہے اس لیے وہ لامحالہ پاکیزہ نفسی، حسن سیرت و کردار، طہارت قلب و نظر اور صفائی فکر و عمل کا مظہر ہوگا۔ یہاں جو جس قدر علم میں فائق ہوگا اس میں اسی قدر احتیاط اور ذمہ داری ہوگی، تعلیم یافتہ شخص اپنے کو جواب دہ اور بداخلاقی اور ہر قسم کی مجرمانہ حرکت کو قابل مواخذہ سمجھے گا۔ لوگوں کی خدمت و خیر خواہی اور قوم و وطن کی فلاح و بہبود کے سوا اس کا کوئی مطمح نظر نہ ہوگا۔ اس کا کوئی رویہ شر و فساد اور ہنگامہ و تشدد کا باعث نہ ہوگا، نہ جرائم اور بدعنوانیوں کا کوئی تصور اس کے ذہن میں پیدا ہوگا اور نہ اپنے ملک و قوم سے بے وفائی اور غداری کا کوئی خیال ہی اس کے دل میں آئے گا، وہ مجبوروں، کمزوروں، غریبوں، پریشان حال اور مصیبت زدہ لوگوں کے استحصال سے باز رہے گا، اس کے ہاتھ اپنے ہی ملک و قوم کے انسانوں کے خون ناحق سے رنگین نہ ہونگے، ایسے نظام تعلیم کی بدولت جو معاشرہ وجود میں آئے گا وہ جرائم،

فواحش، بدعنوانیوں اور گھوٹالوں سے پاک اور رحم و محبت، پاکیزگی اور تقدس کا نمونہ ہوگا، طلبہ و اساتذہ میں عزت واحترام اور رحم و شفقت کا رشتہ ہوگا، طلبہ معمولی معمولی بات پر ہنگامہ و تشدد پر آمادہ نہ ہونگے اور اساتذہ اپنے مطالبات سے انتشار و خلفشار نہ برپا کریں گے۔

مگر یہ پاکیزہ نظام تعلیم اب خواب و خیال ہو رہا ہے اور یورپ و امریکہ کی سیاسی بالادستی کی وجہ سے وہ نظام تعلیم دنیا پر مسلط ہو رہا ہے جو خدا ناشناسی کی بنا پر مفاسد و معائب کا سرچشمہ ہے! اس کا اندازہ محض اسی سے ہو سکتا ہے کہ یورپ میں تعلیم عام ہونے کے باوجود اخلاقی خرابیوں اور جرائم کی تعداد میں برابر اضافہ ہو رہا ہے۔ اس کے مقابلے میں ہندوستان علمی و تعلیمی حیثیت سے پس ماندہ ہے، یہاں ہر زبان پر علم و تعلیم کی کمی کا شکوہ جاری ہے مگر جاہل ہندوستان و تعلیم یافتہ مغرب میں جرائم کے درمیان تناسب کم ہے، خود ہندوستان کی جو ریاستیں تعلیم و تہذیب میں آگے ہیں ان میں جرائم زیادہ تعداد میں واقع ہوتے ہیں اور جو ریاستیں تعلیم و تہذیب میں پست اور کم تر ہیں وہاں جرائم نسبتاً کم ہوتے ہیں، لیکن یہ صورت حال تیزی سے تبدیل ہو رہی ہے اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آزادی کے بعد ہندوستان میں لوگوں کو جرائم اور بدعنوانیوں کے لیے ہر طرح کی چھوٹ مل گئی ہے، جرائم کی تمام قسموں کی نشوونما ہو رہی ہے، جو جتنا ہی مہذب، تعلیم یافتہ اور بلند عہدہ و منصب پر فائز ہے وہ اتنا ہی بے لگام، غیر ذمہ دار اور بدعنوان ہے، حوالوں اور گھوٹالوں کی تفتیش نے کتنے ہی صاف، خوش نما اور بے داغ چہروں کو بدنما، داغدار اور کریہہ المنظر بنا دیا ہے۔

ہمارا روئے سخن تعلیم یافتہ لوگوں کی طرف ہے جن کو افراد اور جماعتوں کو بنانے بگاڑنے اور قوم و ملک کی تعمیر و تخریب میں خاص دخل ہوتا ہے، اچھے اور بہتر تعلیمی نظام ہی سے وہ افراد اور جماعتیں تیار ہوتی ہیں جو قوم و ملک کی خرابیوں کی اصلاح کرتے ہیں اور انہیں ترقی سے ہمکنار کرتے ہیں، لیکن اس وقت یہی طبقہ اخلاقی و قومی تنزل اور آئین و قانون شکنی کا سبب بن گیا ہے اور ہماری تعلیم گاہیں خرابیوں، بدعنوانیوں اور مجرمانہ حرکتوں کا مرکز ہو گئی ہیں۔ نہ طلبہ کو پڑھنے سے دلچسپی، نہ اساتذہ کو پڑھانے سے سروکار، طلبہ کو اپنے استاذوں کو زدوکوب کرنے میں تامل نہیں، شورش، ہنگامہ اور بات بات پر احتجاج ان کا معمول ہے، ان کی اسٹرائک و ہڑتال سے تعلیمی ہی نہیں شہری زندگی بھی

مفلوج اور معطل ہوجاتی ہے اور جب وہ تشدد اور توڑ پھوڑ پر آتے ہیں تو اپنی مادر علمی کے قیمتی اثاثوں اور قوم و ملک کی املاک کو جلا کر خاکستر کر دیتے ہیں، ان سب کے باوجود ان کو آسانی سے ڈگریاں مل جاتی ہیں اور یہی قلیل البضاعت، بے استعداد اور مجرمانہ کردار کے لوگ ملک کے سیاہ و سفید کے مالک ہوجاتے ہیں جس کے بھیانک اور تباہ کن نتائج آئے دن سامنے آتے رہتے ہیں، خداشناسی اور فلاح اخروی کو تعلیم کا نصب العین بنائے بغیر قومی و ملی زندگی کا ہر خاکہ نامکمل اور ہر نقش بے رنگ رہے گا۔

افسوس ہے کہ گزشتہ ماہ مشہور فاضل شیخ عبدالفتاح ابوغدہ ریاض میں انتقال فرماگئے، ان کی تدفین مدینہ منورہ کے معروف قبرستان جنت البقیع میں ہوئی، شیخ کا وطن شام کا مشہور شہر حلب تھا، ابتدائی تعلیم شام میں اور اعلیٰ تعلیم جامعہ ازہر مصر میں پائی۔ ایک عرصہ تک شام ہی میں درس و تدریس کی خدمت انجام دیتے رہے، ۱۹۶۴ء میں محمد بن سعود یونیورسٹی ریاض میں پروفیسر مقرر ہوئے تصنیف و تالیف سے مدۃ العمر سروکار رہا، حدیث و رجال پر ان کی بڑی وسیع اور گہری نظر تھی، فقہ، تاریخ و ادب سے بھی دلچسپی تھی مولانا عبدالحی فرنگی محلی سے خاص شغف تھا، ان کی متعدد کتابیں ایڈٹ کیں۔ مولانا حبیب الرحمن الاعظمی کے علمی تبحر اور وسعت نظر کے بڑے معترف تھے، ممتاز عالم مولانا سید ابوالحسن علی ندوی سے ان کے مخلصانہ روابط تھے جن کی دعوت پر وہ کئی بار دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ تشریف لائے اور اس کے اور ہندوستان کے دوسرے کتب خانوں سے استفادہ کیا، ان کے تلامذہ کا حلقہ وسیع تھا جن میں ہندوستانی فضلا بھی شامل ہیں، شیخ ابوغدہ کی وفات بڑا علمی سانحہ ہے اللہ تعالیٰ دین و علم کے اس خادم کی مغفرت فرمائے۔

اردو میں اچھے رسالوں کا فقدان ہے اور ایسے رسالے تو نایاب ہی ہیں جن کا مقصد محض اردو کی خدمت و ترقی ہے اردو بک ریویو اسی کمی کو پورا کرنے کیلئے ایک سال سے نکل رہا ہے۔ اس میں اردو مطبوعات پر تبصرے کے علاوہ اسکے موجودہ حالات و مسائل بھی زیر بحث آتے ہیں اور اردو دنیا کی ہر قسم کی خبریں بھی ہوتی ہیں! ایسے مفید، بامقصد اور معلوماتی رسالہ کی توسیع اشاعت اور اسکی بقا و تحفظ اردو والوں کا فرض ہے اس کا زر سالانہ ۱۰۰ روپیہ ہے اور پتہ یہ ہے: ۳/۳۹ ۱۷ (بیسمنٹ) نیو کوہ نور ہوٹل، پٹوڈی ہاوس، دریا گنج، نئی دہلی۔ ۱۱۰۰۰۲۔

توراۃ وانجیل کی دو بشارتیں

جن کے مصداق محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم ہیں

از
ڈاکٹر مولانا حبیب ریحان ندوی ازہری۔

(۲)

حضور پاک کی پیشین گوئیاں حضرت مسیح عیسیٰ علیہ السلام کی پیشین گوئی کا یہ جملہ "وہ آیندہ کے متعلق خبریں دے گا" مبنی برحقیقت جملہ ہے، حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے بے شمار آنے والے واقعات کی اطلاع قرآن پاک کے ذریعہ دی اور بہت سی باتیں اس حکمت و وحی کے ذریعے بتائیں جو اللہ تعالیٰ نے آپ کو "وحی غیر متلو" کی شکل میں دی تھی اور جسے سنت یا حدیث کے لفظ سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

یہ پیشین گوئیاں قرآن کے علاوہ، حدیث پاک کی کتابوں، سیر و سیرت کے دفتروں اور اعلام نبوت یا دلائل نبوت جیسی تصنیفات میں تفصیل کے ساتھ بیان کی گئی ہیں، اس میں شبہ نہیں یہ بعض موضوع اور ضعیف و بے اصل باتیں بھی ان میں موجود ہیں، لیکن صحیح چیزوں کو تلاش کرنے کا کام محدثین اور علمائے امت نے کیا ہے اور اس رو سے صحیح و مستند پیشین گوئیاں بھی بہت زیادہ ہیں اور ان کی تشریح و توضیح اتنی طویل ہے کہ پوری ایک ضخیم کتاب بھی ان کے لیے ناکافی ہے۔ راقم یہاں صرف پانچ پیشین گوئیوں کی کچھ تفصیل بیان کرے گا اور دوسری متعدد پیشین گوئیوں کی طرف صرف اشارہ کرے گا۔

جلدی نہ کرو، نشانیاں آنے والی ہیں

وَاِذَا رَاٰكَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اِنْ	یہ منکرین حق جب تمہیں دیکھتے ہیں تو تمہا
يَّتَّخِذُوْنَكَ اِلَّا هُزُوًا ۭ اَهٰذَا	مذاق بنا لیتے ہیں، کہتے ہیں کیا یہی وہ شخص ہے
الَّذِيْ يَذْكُرُ اٰلِهَتَكُمْ ۚ وَهُمْ	جو تمہارے خداؤں کا ذکر کیا کرتا ہے،
بِذِكْرِ الرَّحْمٰنِ هُمْ كٰفِرُوْنَ خُلِقَ	انسانوں کا حال یہ ہے کہ رحمٰن کے ذکر
الْاِنْسَانُ مِنْ عَجَلٍ ۭ سَاُورِيْكُمْ	سے منکر ہیں، انسان جلد باز مخلوق ہے
اٰيٰتِيْ فَلَا تَسْتَعْجِلُوْنِ ۔	ابھی میں تم کو اپنی نشانیاں دکھائے
(الانبیاء : ۳۶ : ۳۷)	دیتا ہوں، جلدی نہ مچاؤ۔

اس کے بعد والی آیتوں سے پتہ چلتا ہے کہ یہ نشانیاں قیامت کے دن ظاہر ہوں گی اور جہنم کی آگ سے وہ بچ نہ سکیں گے اور حق یہ ہے کہ یہ وعدۂ حق اور پیشین گوئی پوری ہو کر رہے گی۔ یا دوسری تفسیر یہ بھی ہے کہ جب رسول پاکؐ دین کے نشر ہونے اور اپنے اصحاب کے غالب ہونے کا ذکر کرتے تھے تو مشرکین و مخالفین اسے جھٹلاتے تھے اور یہ کہتے تھے یہ ہرگز نہیں ہو سکتا تو خدا نے اس کے جواب میں فرمایا کہ غلبۂ دین اور نصرت رسولؐ کی نشانی تم عنقریب اس دنیا میں دیکھ لوگے سورۂ انبیاء ہی کی آیت نمبر ۴۱ اس کی طرف اشارہ کرتی ہے کہ انبیاء و رسل کے ساتھ استہزا کرنے والوں پر مصیبت آجاتی ہے یہ ذہن میں رہے کہ یہ آیات مکیہ ہیں۔

وَلَقَدِ اسْتُهْزِئَ بِرُسُلٍ مِّنْ قَبْلِكَ	تم سے پہلے بھی رسولوں کا مذاق اڑانے
فَحَاقَ بِالَّذِيْنَ سَخِرُوْا مِنْهُمْ	والے اسی چیز کے پھیرے میں آگئے
مَّا كَانُوْا بِهٖ يَسْتَهْزِءُوْنَ (انبیاء : ۴۱)	جس کا وہ مذاق اڑاتے تھے۔

اور اس طرح ان استہزا کرنے والوں کو دنیا میں بھی دردناک انجام سے دوچار ہونا پڑا۔

اپنی نشانیاں آفاق وانفس میں دکھا دیں گے | سورۂ حم السجدہ میں جو مکی سورت ہے اس میں خدا نے اپنے نبیؐ کو حکم دیا کہ ان مشرکین سے کہدو:

قُلْ اَرَءَيْتُمْ اِنْ كَانَ مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ
ثُمَّ كَفَرْتُمْ بِهٖ مَنْ اَضَلُّ مِمَّنْ
هُوَ فِيْ شِقَاقٍۭ بَعِيْدٍ سَنُرِيْهِمْ
اٰيٰتِنَا فِي الْاٰفَاقِ وَفِيْٓ اَنْفُسِهِمْ
حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَهُمْ اَنَّهُ الْحَقُّ۔

(حٰم سجدہ: ۵۲-۵۳)

کہو ان سے کیا تم نے کبھی غور کیا کہ اگر
یہ (قرآن) خدا ہی کی طرف سے ہے اور
تم اس کا انکار کرتے رہے تو اس شخص
سے بڑھ کر بھٹکا ہوا انسان اور کون ہوگا
جو اس کی مخالفت میں دور تک نکل گیا
ہو، عنقریب ان کو ہم اپنی نشانیاں دنیا
میں دکھائیں گے اور ان کے اپنے نفس میں
بھی یہاں تک کہ ان پر یہ بات کھل جائے گی
کہ واقعی یہ حق ہے۔

اس کے ایک واضح معنی تو یہ ہیں کہ قرآن پاک اللہ کی طرف سے نازل ہوا ہے اور ہم تم کو آفاق وکائنات اور تمہارے نفوس میں ایسی نشانیاں دکھا دیں گے کہ تم کو اس کی حقانیت کا یقین ہو جائے گا چنانچہ اس طرح ہر علمی سائنسی اور طبی حقیقت ایک نشانی بن کر سامنے آتی رہتی ہے، لیکن غور کرنے سے یہ معنی بھی ظاہر ہوتا ہے جس کی وضاحت تفسیر میں موجود بھی ہے۔ کہ جب حقانیتِ قرآن اور اسلام کی دعوت آپ نے مکہ میں دی تو اس وقت آپ بڑی شدت اور تنگی کے عالم میں اور دشمنوں کے نرغے میں تھے لیکن ایسے وقت میں بھی آپؐ نے غیب کی یہ بات نہیں بتائی کہ اسلام آفاق پر چھا جائے گا اور تمہارے دل بھی اس کے قائل ہو جائیں گے اور تم ایمان لے آؤ گے، اس سے بڑھ کر نصرت الٰہی پر یقین اور وعدۂ خداوندی پر اعتماد اور

کیا ہو سکتا ہے اور چند گنے چنے کفار کو چھوڑ کر تمام اہل مکہ و اہل جزیرۂ عرب آپ کی حیاتِ مبارکہ ہی میں اسلام کے حلقہ بگوش ہو گئے اور خلفائے اسلام کے زمانہ میں اسلام روئے زمین پر پھیل گیا اور قیامت تک آنے والی نسلیں آیات قرآنی و آیاتِ انفس و آفاق سے برابر اسلام میں داخل ہوتی چلی جائیں گی۔

استہزار کرنے والوں کا انجام | ارشاد خداوندی ہے:

فَاصْدَعْ بِمَا تُؤْمَرُ وَأَعْرِضْ عَنِ الْمُشْرِكِينَ ٥ إِنَّا كَفَيْنَاكَ الْمُسْتَهْزِئِينَ الَّذِينَ يَجْعَلُونَ مَعَ اللَّهِ إِلَٰهًا آخَرَ فَسَوْفَ يَعْلَمُونَ (الحجر: ۹۴-۹۵)	اے نبی جس بات کا تمہیں حکم دیا جارہا ہے اسے کھل کر کہہ دو اور مشرکین سے بے پرواہ ہو جاؤ، تمہاری طرف سے مذاق اڑانے والوں کی خبر لینے کو ہم کافی ہیں جو اللہ کے سوا کسی اور کو بھی خدا بناتے ہیں، عنقریب انہیں معلوم ہو جائے گا۔

جہری دعوت کی ابتداء کے ایام میں اہل مکہ کی طرف سے خاص طور پر ولید بن المغیرہ المخزومی، عاص بن وائل السہمی، الاسود بن عبد المطلب الاسدی، اسود بن عبد یغوث الزہری، حارث بن طلاطلہ وغیرہ نے محفلوں بازاروں اور ہر ہر جگہ آپ کا مذاق اڑایا، لوگوں کو آپ کی باتیں سننے سے منع کیا، اہل مکہ کا وہاں اقتدار تھا، ان کی حکومت تھی، وہ طاقتور تھے اور حضور پاکؐ کی حالت نازک تھی، دشمنوں کے نرغے میں آپ گھرے ہوئے تھے کوئی یار و مددگار نہیں تھا، اس نازک وقت میں حکم ہوتا ہے کہ جس وحی اور اسلامی تعلیم اور توحید کا حکم دیا گیا ہے اسے واضح طور پر بلا جھجک ہانک پکار کر پہنچا دو اور مشرکوں کے اعراض و

استہزار کی مطلق پرواہ نہ کرو، ہم تمہاری طرف سے استہزار اور ٹھٹھا کرنے والوں کو ہلاک کرنے کے لیے کافی ہیں، تاریخ جانتی ہے کہ ولید پیر میں زخم لگنے سے ہلاک ہوا، اسود بن عبد المطلب اس بددعا کا شکار ہوا "اے اللہ اس کو اندھا کر دے اور اولاد کی موت کا غم دکھا" وہ اندھا ہو گیا، اس کے لڑکے زمعہ، عقیل اور حرث اس کے سامنے فوت ہوئے، عاص بن وائل کے پیر کی طرف آپؐ نے اشارہ فرمایا وہ گدھے پر بیٹھ کر طائف جا رہا تھا، گدھے پر سے گرا، پیر میں ایک کانٹا چبھا اور اس طرح مرا، حارث بن طلاطلہ کے پیٹ کی طرف آپؐ نے اشارہ فرمایا وہ نمکین مچھلی کھا کر سویا رات میں پیاس لگی پانی پیا اور اس کا پیٹ پھٹ گیا اور مر گیا۔ ثابت ہوا کہ آپ کے ساتھ استہزار کرنے والوں کو اللہ تعالیٰ نے ہلاک کیا، اس سے بڑھ کر اور پیشین گوئی اور کیا ہو سکتی ہے۔

ابو جہل قریش کا سردار تھا اور استہزار و جہالت میں اپنا جواب نہیں رکھتا تھا، اس کو دوسرے اور کفار کے ساتھ عذاب جہنم کی بشارت اس طرح دی گئی:

"پکڑو اسے اور لے جاؤ رگیدتے ہوئے جہنم کے بیچوں بیچ اور انڈیل دو اس کے سر پر کھولتے ہوئے پانی کا عذاب، چکھ اس کا مزا، تو بزعم خود بڑا زبردست اور عزت والا آدمی تھا" (دخان: ۴۷-۴۹)

اخنس بن شریق الثقفی اور بعض نے کہا کہ جمیل بن عامر الجمحی کے متعلق یہ کہا گیا کہ "تباہی ہے ہر اس شخص کے لیے جو منھ در منھ لوگوں پر طعن اور پیٹھ پیچھے برائیاں کرنے کا خوگر ہے، جس نے مال جمع کیا اور اسے گن گن کر رکھا، وہ سمجھتا ہے کہ اس کا مال ہمیشہ رہے گا، ہرگز نہیں، اسے چکنا چور کر دینے والی آگ میں پھینک دیا جائے گا"

گو یہ وعید ہر کافر کے لیے ہے لیکن مخصوص امراء پر اس کا انطباق ہوا۔ مکہ میں یہ

(حاشیہ ص ۱۷۰ پر)

پیشین گوئیاں کی گئیں اور ان کا انجام یہ ہوا کہ بہت دن بعد کفر پر موت ہوئی۔

نضر بن الحارث رستم و اسفندیار کے قصے سنا کر لوگوں کو قرآن اور حضور پاکؐ کی مجلس سے دور کرتا تھا، حضور پاکؐ نے قرآنی زبان میں اسے عذاب الیم کی خبر سنائی (لقمان: ۶) غزوۂ بدر میں وہ زخمی ہوا، اسیر ہو کر آیا، کفر پر مرا اور ہزیمت و شکست اور جراحت کے عذاب سے دوچار ہونے کے بعد دردناک عذاب کا حقدار بنا۔

ولید بن المغیرہ اسلام کا دشمن تھا، قرآن کی حقانیت اس پر آشکارا ہو چکی تھی لیکن اپنی سرداری قائم رکھنے کی غرض سے اس نے قریش کو یہ مشورہ دیا کہ جزیرۂ عرب سے آنے والے لوگ موسم حج میں جب آئیں گے تو دعوت اسلام سے متاثر ہوں گے اس لیے کسی ایسی بات پر اتفاق کر لیا جائے جو صاحب رسالت کے متعلق ان سے کہی جائے، لوگوں نے کہا ہم کہیں گے محمدؐ (خاکم بدہن گستاخ) پاگل ہیں، شاعر ہیں، کاہن ہیں وغیرہ۔ ولید نے کہا یہ غلط ہے اور لوگ یہ بات نہیں مانیں گے، پھر سوچ سمجھ کر اور غور و فکر کر کے یہ کہا کہ یہ جادو ہے، سورۂ مدثر میں اللہ تعالیٰ نے اس کے متعلق فرمایا "میں نے اکیلا پیدا کیا، بہت سامال اس کو دیا، حاضر رہنے والے بیٹے دیئے، اس کے لیے ریاست کی راہ ہموار کی"۔ پھر آگے چل کر فرمایا، پھر سوچ سمجھ کر آخر کار بولا کہ "کچھ نہیں ہے مگر ایک جادو پہلے سے چلا آرہا ہے، یہ تو ایک انسانی کلام ہے، میں اسے عنقریب دوزخ میں پھینک دوں گا"۔ آخر کار وہ کفر کی حالت میں مرا۔

غلبۂ روم کی پیشین گوئی | عربوں کی سرحدوں پر فارس اور رومی حکومتیں تھیں جو اس وقت دنیا کی دو بڑی طاقتیں تھیں اور اقتدار و تسلط کے لیے آپس میں نبرد آزما رہتی تھیں، فارسی قوم آتش پرست مجوسی تھی۔ بت پرستی بھی عام تھی اور روم والے مسیحی تھے گو انہوں نے

بھی دین میں تحریفات روا رکھی تھیں، ایک جنگ میں فارس کو روم پر جزیرہ میں فتح حاصل ہوئی، مشرکین قریش اس پر بہت مسرور ہوئے کیونکہ فارس اسلام کے سخت دشمن تھے اور مشرک بھی تھے، مسلمانوں کو فارس کی یہ کامیابی اچھی نہیں لگی، اللہ تعالیٰ نے قرآن میں یہ پیشین گوئی کی۔

الٓمّٓ، غُلِبَتِ الرُّوْمُ فِیْٓ اَدْنَی الْاَرْضِ وَهُمْ مِّنْ بَعْدِ غَلَبِهِمْ سَیَغْلِبُوْنَ فِیْ بِضْعِ سِنِیْنَ۔ لِلّٰهِ الْاَمْرُ مِنْ قَبْلُ وَمِنْ بَعْدُ وَیَوْمَئِذٍ یَّفْرَحُ الْمُؤْمِنُوْنَ بِنَصْرِ اللّٰهِ یَنْصُرُ مَنْ یَّشَآءُ وَهُوَ الْعَزِیْزُ الرَّحِیْمُ وَعْدَ اللّٰهِ لَا یُخْلِفُ اللّٰهُ وَعْدَهٗ وَلٰکِنَّ اَکْثَرَ النَّاسِ لَا یَعْلَمُوْنَ۔ یَعْلَمُوْنَ ظَاهِرًا مِّنَ الْحَیٰوةِ الدُّنْیَا وَهُمْ عَنِ الْاٰخِرَةِ هُمْ غٰفِلُوْنَ۔

(روم: ۱-۷)

الٓمّٓ، رومی قریب کی سرزمین میں مغلوب ہوگئے ہیں اور اپنی اس مغلوبیت کے بعد چند سال کے اندر وہ غالب ہوجائیں گے۔ اللہ ہی کا اختیار پہلے بھی تھا اور بعد کو بھی ہے اور وہ دن وہ ہوگا کہ اللہ کی بخشی ہوئی فتح پر مسلمان خوشیاں منائیں گے اللہ نصرت عطا کرتا ہے جسے چاہتا ہے۔ اور وہ زبردست اور رحیم ہے۔ یہ اللہ کا وعدہ ہے، اللہ کبھی وعدہ کی خلاف ورزی نہیں کرتا مگر اکثر لوگ جانتے نہیں ہیں، لوگ دنیاوی زندگی کا بس ظاہری پہلو جانتے ہیں اور آخرت سے غافل ہیں۔

یہ پیشین گوئی حرف بحرف ثابت ہوئی، سب کو یہ قصہ معلوم ہے کہ صدیقوں کے سردار افضل البشر بعد الانبیاء بالتحقیق ابوبکر صدیقؓ نے تصدیقِ قولِ الٰہی و رسول پاکؐ، ابی ناخلف سے اس بات پر شرط باندھی کیونکہ ابی بن خلف نے خدا کی قسم کھا کر کہا تھا کبھی

یہ نہیں ہو سکتا کہ روم فارس پر غالب آجائیں، یہ شرط نو اونٹوں کی تھی اور تین سال کی تھی، جب حضور رسالتمآبؐ کو اطلاع ہوئی تو آپؐ نے فرمایا بضع کے معنی تین سال سے زیادہ کے ہیں، الغرض حضرت ابوبکرؓ نے مدت بڑھوائی اور شرط میں مزید اونٹ بھی بڑھوائے، ایک روایت میں ہے کہ حضور پاکؐ نے حضرت ابوبکرؓ سے سات سال کی مدت بتائی اور یہ پیشین گوئی پوری ہوئی، تاریخ اس پر دلالت کرتی ہے۔

غزوۂ بدر میں فتح | مسلمانوں کو رومیوں کی فتح سے خوشی کا ہونا کوئی اہم بات نہیں تھی، اس لیے ان آیات میں جو دوسری پیشین گوئی تھی جب وہ پوری ہوئی تو مسلمان فرحاں و شاداں تھے، جس دن غلبۂ روم ہوا اسی دن مسلمانوں کو غزوۂ بدر میں مشرکین پر فتح حاصل ہوئی، غزوۂ بدر تمام آیندہ فتوحات کا پیش خیمہ اور دعوت اسلام کے ظاہر و غالب ہونے کا عظیم وسیلہ بنا، اس لیے خوشی و مسرت کا جشن اس دن کیسے نہ ہوتا؟

سورۂ روم مکی ہے اس میں کیے ہوئے وعدہ ہائے نصرت و فتح تمام اور سورتوں میں کیے ہوئے وعدوں کی طرح پورے ہو کر رہیں گے، سورہ کے آخر میں حضور پاکؐ سے خطاب ہے کہ کفار کی ایذا رسانیوں اور استہزار پر صبر کرو۔

فَاصْبِرْ إِنَّ وَعْدَ اللّٰهِ حَقٌّ وَّلَا يَسْتَخِفَّنَّكَ الَّذِيْنَ لَا يُوْقِنُوْنَ۔	صبر کرو، اللہ کا وعدہ یقیناً سچ ہے اور ہرگز ہلکا نہ پادیں تم کو وہ لوگ جو یقین نہیں کرتے۔
(روم : ۶۰)	

مرتدین کے خاتمہ کے لیے محبوب خدا گروہ کی آمد | فتح مکہ اور فتح طائف کے بعد اسلام جزیرۂ عرب میں سیل رواں کی طرح پھیل گیا، قبائل کے وفود آرہے تھے اور کوئی اسلام اور رسول اسلامؐ سے مخالفت کی ہمت نہیں کر سکتا تھا، اس وقت خدا نے اپنے رسولؐ کے ذریعہ اطلاع

دی کہ مرتدین کا ظہور ہوگا اور اس کی ابتدا حضورؐ کے زمانہ ہی میں ہوئی اور مسیلمہ نے آپؐ کو اپنی نبوت کا خط لکھا جس میں آپ کے نبی ہونے کا اقرار بھی کیا، خط کے جواب میں آپ نے اس کو "کذاب" لکھا، کیونکہ حضورؐ کے بعد کسی نبوت کے آنے کا امکان بھی کذب و افترا اور ارتداد کا موجب ہے۔ ارتداد کی شدت اس وقت ہوئی جب حضرت ابوبکرؓ کی خلافت کے بعد مسیلمہ کذاب، سجاح الاسود العنسی نیز معطلین شریعت کے گروہوں نے علم بغاوت بلند کیا اور اسلام کی تعلیمات سے روگردانی کا برملا اظہار ہوا، حضرت ابوبکرؓ جیسے بظاہر نرم مزاج اور صلح جو انسان نے اس موقع پر بلا جھجک ان سب سے جہاد کیا اور فتنۂ ارتداد کا قلع قمع کیا، اس تمہید کے بعد قرآنی بشارت ملاحظہ ہو:

يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَنْ يَّرْتَدَّ	اے ایمان والو! جو کوئی تم میں سے
مِنْكُمْ عَنْ دِيْنِهٖ فَسَوْفَ يَاْتِي	مرتد ہو گیا (اپنے دین سے پھر گیا) تو
اللّٰهُ بِقَوْمٍ يُّحِبُّهُمْ وَيُحِبُّوْنَهٗٓ	اللہ تعالیٰ ایسی قوم کو لائے گا جو اس کے
اَذِلَّةٍ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ اَعِزَّةٍ	محبوب ہوں گے اور انہیں اللہ محبوب
عَلَى الْكٰفِرِيْنَ يُجَاهِدُوْنَ	ہوگا، مومنوں پر نرم اور کفار پر سخت
فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَلَا يَخَافُوْنَ	ہوں گے (یعنی دین کے معاملہ میں کوئی
لَوْمَةَ لَآئِمٍ ذٰلِكَ فَضْلُ اللّٰهِ	سودا نہ کریں گے، نہ خوف کھائیں گے)
يُؤْتِيْهِ مَنْ يَّشَآءُ وَاللّٰهُ	راہ خدا میں جہاد کریں گے، ملامت
وَاسِعٌ عَلِيْمٌ اِنَّمَا وَلِيُّكُمُ اللّٰهُ	کرنے والے کی ملامت سے نہ ڈریں گے
وَرَسُوْلُهٗ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوا	یہ اللہ کا فضل ہے جسے چاہتا ہے دیتا
الَّذِيْنَ يُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ	ہے اور اللہ وسیع (ذرائع) کا مالک

وَيُؤْتُونَ الزَّكٰوةَ وَهُمْ رَاكِعُونَ وَمَنْ يَتَوَلَّ اللّٰهَ وَرَسُولَهُ وَالَّذِينَ اٰمَنُوا فَاِنَّ حِزْبَ اللّٰهِ هُمُ الْغٰلِبُونَ

(المائدہ: ۵۴-۵۶)

اور محیط، علم والا ہے تمہارا رفیق و ولی تو صرف اللہ اور اس کا رسول اور وہ اہل ایمان ہیں جو نماز قائم کرتے ہیں زکوٰۃ ادا کرتے ہیں اور اللہ کے روبرو جھکنے والے ہیں، اور جو اللہ اور اس کے رسول اور اہل ایمان کو اپنا رفیق بنالے اسے معلوم ہو کہ اللہ کی جماعت ہی غالب ہونے والی ہے۔

ان آیتوں میں مسلمانوں کے لیے متعدد امور قابل غور ہیں، خاص طور پر ان میں حضرت ابوبکرؓ اور اسلامی امت کی مدح و توقیر ہے جنھوں نے حضرت ابوبکرؓ کا ساتھ دیا اور مرتدین پر غلبہ حاصل کیا اور اس کے مقابل جو گروہ حضرت ابوبکرؓ کو اپنی ملامت اور دیرینہ بغض کا ہدف بناتا ہے، اس کو اگر رجوع الی الحق کی طلب ہو تو اس کے لیے بھی یہ آیات واضح اور روشن دلائل و حجت فراہم کرتی ہیں لیکن اس موضوع کی تفصیل سے ہم یہاں گریز کرتے ہوئے چند نکات کی طرف صرف اشارہ کرتے ہیں۔ آیات میں

۱:۔ دین سے مرتد ہونے والے کی اطلاع ہے اور یہ واقعہ ظاہر ہوا۔

۲:۔ اس مرتد گروہ کو مغلوب کرنے اور کیفر کردار تک پہنچانے کے لیے ایک قوم اور گروہ اٹھایا جائے گا، اس کی صفات یہ ہوں گی۔ سب سے اہم صفت یہ کہ "اللہ ان سے محبت کرتا ہوگا وہ اللہ سے محبت کرتے ہوں گے"۔

۳۔ مومنوں کے لیے نرم ہوں گے، کفار کے لیے سخت ہوں گے۔

۴:۔ اللہ کی راہ میں جہاد کریں گے۔

۵:۔ کسی ملامت کرنے والے کی ملامت سے نہ ڈریں گے اور نہ اس کی پرواہ کریں گے۔

۶:۔ یہ محض اللہ کے فضل سے ہوگا۔

۷:۔ ان کی ولایت اللہ، اس کے رسول اور مومنین سے ہوگی یعنی کفار و منافقین و مرتدین سے نہ ہوگی۔

۸:۔ وہ نماز کو قائم کریں گے، زکوٰۃ کو ادا کریں گے۔

۹:۔ اور وہی گروہ غالب و فتح مند ہوگا۔

حضور پاکؐ کے وصال کے بعد مومن گروہ حضرت ابوبکر صدیقؓ کی پیروی میں ابھرا اور مرتد گروہ سے اس نے جہاد و قتال کیا، نص قرآنی کی رو سے یہ جہاد فی سبیل اللہ تھا، ملک گیری کی لڑائی نہیں تھی، خاص طور سے حضرت ابوبکرؓ کی نرمی مومنین پر ایک مسلم الثبوت بات تھی، لیکن مرتدین سے جہاد کے سلسلے میں آپ سخت تھے اور کسی ایسے مشورہ کو آپ نے قبول نہیں کیا جس سے ان کے خلاف جہاد نہ کرنے کا جواز ملتا ہو، اس طرح آپ نے کسی ملامت کرنے والے کی ملامت کو قبول نہیں کیا، نماز قائم کی اور مانعین زکوٰۃ کو زکوٰۃ ادا کرنے پر مجبور کیا اور حقیقتِ حال و تاریخ کی شہادت سے یہی گروہ غالب اور فتح مند ہوا، مرتدین کی سرکوبی ہوئی، عام لوگوں نے توبہ کی اور مکمل اسلام میں داخل ہوئے، ان کوششوں کے ذریعے انہوں نے اللہ سے محبت کے وعدہ کو پورا کر دکھایا اور سب سے بڑی سرفرازی اور کامیابی تو یہ کہ وہ اللہ کی محبت و رضا کے مستحق ٹھہرے۔

حضرت ابوبکرؓ اور آپ کے معاون خلفائے ثلاثہ و مہاجرین و انصار اگر آیت کا مصداق نہیں ہیں تو پھر آخر اس کا مصداق کون ہے؟ نص قرآنی کی رو سے ایسے گروہ کا

ظاہر ہونا ضروری تھا جو مرتدین کے خلاف جنگ کرتا۔

اور اگر خدانخواستہ حضرت ابوبکرؓ وعمرؓ اور مہاجرین وانصار ہی مرتد ہو گئے تھے تو نص قرآنی کی رو سے کونسا وہ گروہ پردۂ ہستی پر نمودار ہوا جس نے ان کے خلاف جہاد کیا، ان کو شکست دی اور خود غالب و فتح مند ہوا؟

پس جب ایسا کوئی گروہ نہ دنیا کے پردے پر اور نہ تاریخ میں نمودار ہوا تو اب اس کے سوا عقلی وعلمی و شرعی و تاریخی طور سے کوئی چارہ نہیں رہ جاتا کہ اس عظیم پیشین گوئی کا مصداق صدیقوں کے سردار اور صدیقوں کا وہ پاک باطن گروہ ہی تھا جو صدیق اکبرؓ کے ساتھ تھا۔

یہ آیت حقانیتِ قرآن و رسالت کی بہت بڑی دلیل اور صدیقیتِ صدیقؓ کی واضح حجت ہے اور ان کی اللہ سے محبت اور اللہ کی ان سے محبت و رضا کی واضح نشانی ہے۔

پیشین گوئیوں کے مختصر اشارے | اب ہم بعض ان واقعات کی طرف صرف اشارہ کرتے ہیں جو آپ نے آیندہ کے متعلق فرمائے اور وہ واقع ہوئے۔

آپ نے تمام لوگوں کو خدا کی طرف سے یہ چیلنج دیا کہ "تمہارا جو جی چاہے کرو، تم میرا کچھ نہیں بگاڑ سکتے۔" (ہود : ۵۵)

آپ نے فرمایا کہ یہ دین چاردانگ عالم میں غالب ہو کر رہے گا۔" وہ اللہ ہی ہے جس نے اپنے رسول کو ہدایت اور دین حق کے ساتھ ارسال فرمایا تاکہ اس دین کو پوری جنس دین پر غالب کردے۔" (فتح : ۲۸)

ڈنکے کی چوٹ پر آپ نے تمام باطل ادیان و نظریات اور قریش کے من گھڑت معتقدات کو باطل اور فریب سے تعبیر کیا اور اسلام کے متعلق فرمایا "حق آگیا اور باطل کی روح نکل گئی، باطل کی روح نکلنی ہی چاہیے۔" (الاسراء : ۸۱)

اور ایسا ہی ہوا، اسلام غلبہ اور حجت و دلیل سے آپؐ کی زندگی میں جزیرہ عرب میں اور خلفائے راشدین و خلفائے اسلام کے عہد میں اس وقت کی تمام دنیا پر غالب ہوا۔

واضح اعلان کیا گیا کہ "دشمنوں کے دلوں میں رعب اور خوف ڈال دیا جائے گا"۔ (انفال: ۱۲) اور بار بار اس کا ظہور ہوا "کفر و شرک کے لشکر شکست کھائیں گے اور پیٹھ پھیر کر بھاگ جائیں گے"۔ (القمر: ۴۵)

اور کفار کی مرضی کے خلاف "اللہ تعالیٰ اپنا نور (اسلام کی روشنی) پوری طرح ظاہر کر دیگا۔ (توبہ: ۳۲)

زبور داؤد کی پیشین گوئی پوری ہوگی "میرے صالح بندے زمین کے وارث ہوں گے"۔ (الانبیاء: ۱۰۵) اور جب تک مسلمان زمین کے لیے، انسانیت کے لیے اور خدا کے احکام پر کامل زندگی گزارنے اور بندگی کی شرطوں کو پورا کرنے کے لائق رہے اور صلاح و خیر کے وارث رہے زمین ان کے ورثہ میں رہی۔

کفار و مشرکین کے مکر و فریب سے گھبرانے کی ضرورت نہیں "تمہارا نگہبان اللہ ہے اس نے تمہاری حقیقی تائید اپنی مدد سے کی ہے اور مومنوں کو تمہارا مددگار بنایا گیا ہے"۔ (الانفال: ۶۲)

اور یہ حقیقت واقع ہو کر رہی سخت جاں دشمنوں کے نرغے میں آپ رہے اور انکی کوئی سازش اور مکر و فریب آپ کو نقصان نہ پہنچا سکا اور خدا نے آپ کی مکمل نگرانی اور مدد کی اور سبب کے طور پر بعض اوقات فرشتوں کو ارسال کیا کبھی ہوا اور قدرتی وسائل سے مدد کی اور عام طور سے مہاجرین و انصار کے برگزیدہ گروہ کو آپ کی معاونت کے لیے مقرر کیا جنھوں نے اپنی جان اور اپنی دولت دینِ الٰہی کی نصرت و اشاعت اور

رسول اسلامؐ کی مدافعت میں خرچ کی۔

آپ نے قبیلہ مضر پر قحط نازل ہونے کی بددعا کی اور انہیں اس کی خبر دی، اس کا اثر یہ ہوا کہ لوگ بھوک سے نڈھال ہو گئے، آنکھوں میں اندھیرا چھا گیا، مفسرین نے صحیح قول یہی لکھا ہے کہ آیت قرآنی میں وارد دخان یعنی دھوئیں سے مراد یہی ہے۔ مشرکوں کی دعا اور فرمان الٰہی "کہتے ہیں پروردگار ہم پر سے یہ عذاب ٹال دے ہم ایمان لے آتے ہیں، ان کی غفلت کہاں دور ہوتی ہے، ان کا حال تو یہ ہے کہ ان کے پاس رسول امین آ گیا۔ پھر بھی اس کی طرف ملتفت نہیں ہوئے اور کہا کہ یہ سکھایا پڑھایا باؤلا ہے"۔ (دخان: ۱۲-۱۳) سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ واقعہ ہو چکا ہے، بعض مفسرین کہتے ہیں کہ قیامت کے قریب یہ ہوگا، بہر دو صورت یہ ہو چکا ہے یا ہوگا، یا یہ بھی ممکن ہے کہ ہو چکا ہو اور دوبارہ بھی ہو۔

"يَوْمَ نَبْطِشُ الْبَطْشَةَ الْكُبْرٰى" (دخان: ۱۶) جس دن ہم بڑی ضرب لگائیں گے (پکڑ کریں گے) وہ دن ہوگا جب ہم تم سے انتقام لیں گے، اس سے قیامت کا دن بھی مراد ہے اور مفسرین کے خیال میں یہ بدر کے دن کے عذاب کی پیشین گوئی ہے۔ جس دن ستر قریش کے اکابر قتل ہوئے، کفر کا چراغ مدھم ہوا اور اسلام کے نشر و اشاعت اور اظہار دین کا دروازہ کھلا۔

آیت قرآنی "إِنَّ الَّذِي فَرَضَ عَلَيْكَ الْقُرْآنَ لَرَادُّكَ إِلٰى مَعَادٍ" (قصص: ۸۵) کی تفسیر یہ ہے کہ وہ خدا جس نے تم پر قرآن نازل کیا ہے تمہیں معاد یعنی بہترین انجام تک پہنچائے گا یعنی تم پر اس قرآن کو پھیلانے کی ذمہ داری ہے، ایک تفسیر یہ بھی ہے کہ تمہیں دوبارہ اپنے معاد یعنی جس جگہ سے آئے ہو یعنی مکہ واپس لے جائیگا۔

فتح مکہ اس بشارت کی تعبیر ہے۔

عثمان بن ابی طلحہ سے آپ نے مکہ میں کہا تھا "وہ دن یاد کرو جب کعبہ کی کنجی میرے ہاتھ میں ہوگی" اور ایسا ہی ہوا، آپ نے کمال شفقت و رحمت و عدل کے پیش نظر مفتاح کعبہ عثمان ابن ابی طلحہ ہی کو واپس کردی۔ مظلوموں کو جب قتال کی اجازت دی گئی تو فتح و ظفر کی بشارت بھی ساتھ دی گئی (حج : ۳۹-۴۰) اور یہ فتح نصیب ہوئی۔

غزوۂ احزاب کی پریشانیاں ایسی تھیں کہ قرآن نے اس کی بلیغانہ تصویر کشی کی دل حلق تک آگئے تھے، خوف و ہراس کا عجیب عالم تھا، دشمنوں نے ہر طرف سے گھیر رکھا تھا، مدینہ شریف میں دہنا دوبھر ہو رہا تھا، اس یاس آمیز ماحول میں آپ نے دنیا کے بہت سے علاقوں کے فتح ہونے کی بشارت دی جو پوری ہوئی۔

اس کے علاوہ متعدد مواقع پر آپ نے فارس و شام، مصر و ہندوستان اور ... کے فتح کرنے کی پیشین گوئیاں فرمائیں جو حرف بہ حرف پوری ہوئیں۔

اس تمام تفصیل کے بعد کوئی منصف کیا اس بات میں ادنیٰ شک کر سکتا ہے بشارت انجیل میں جس نبی برحق کا یہ تذکرہ کیا گیا ہے کہ "وہ تم کو آیندہ کے متعلق خبر ... وہ حضور پُرنور، رحمۃ للعالمین، خاتم النبیین والمرسلین محمد مصطفیٰ، احمد مجتبیٰ صلی اللہ ... وسلم کے سوا کوئی دوسرا ہو سکتا ہے۔

(حاشیہ ص ۱۹۹) معارف : ۱؎ دلائل النبوۃ لابی نعیم میں ہے کہ آپ نے اُن ... سر کی طرف اشارہ کیا تو وہ پیپ سے بھر گیا اور اس میں حارث ہلاک ہوا اور ... مرنے والے کا نام حارث بن قیس سہمی بتایا ہے۔

(دیکھئے ص ۲۲۴-۲۲۵)

موجودہ یہودی عیسائی تعلقات

پس منظر اور اسباب

از جناب سید علیم اشرف جائسی۔ لیبیا

یہودی۔ عیسائی تعلقات تضاد کا ایک حیرت انگیز مرقع ہیں، یہ تعلقات اپنے دو ہزار سالہ تاریخ میں مختلف ادوار سے گزرے ہیں، ان کی ابتدا حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) اور ان کے پیروؤں پر یہودیوں کے ظلم و ستم سے ہوئی اور یہ سلسلہ تین صدیوں پر محیط ہے۔ عیسائی فکر کے تمام گوشے ان مظالم سے متاثر ہوئے، اور آج بھی عیسائیت کا مطالعہ کرنے والوں کے لیے عیسائی افکار و عقائد پر ان مظالم کے اثرات ایک مستقل موضوع کی حیثیت رکھتے ہیں مگر جب چوتھی صدی کے آغاز ۳۱۲ء میں شہنشاہ روم قسطنطین نے عیسائیت قبول کر لیا تو ایک نئے دور کی شروعات ہوئی۔ بڑے پیمانے پر یہودی عیسائیوں کے انتقام کا شکار ہوئے اور رحم و محبت کے دعویداروں نے یہودیوں کے خلاف وحشت و بربریت کا کوئی بھی دقیقہ فروگذاشت نہ رکھا۔ اور یہ سلسلہ دوسری جنگ عظیم تک دراز رہا۔ اس درمیان ان تعلقات میں مختلف نشیب و فراز بھی آتے رہے اور مصلحتوں کی بنیاد پر ان میں نرمی اور تلخی بھی آتی رہی لیکن صلیبی جنگوں (اواخر بارہویں صدی) تک ان پر دشمنی اور عداوت کا ہی رنگ غالب رہا ... مگر صلیبی جنگوں کے بعد فکری اور عملی دونوں حیثیت سے ان میں جوہری تبدیلیاں آئیں اور یہ کارنامہ یہودیوں کی عالمی تنظیم "صہیونی تحریک" نے انجام دیا۔

زیر نظر مضمون انہیں تبدیل شدہ تعلقات اور ان کے اسباب و علل کا ایک جائزہ ہے۔

(۱)

۱۔ یہودی کے لیے عیسائی سے جھوٹ بولنا یا اسے پھنسانے کے لیے جھوٹی گواہی دینا جائز ہے اور عیسائی کے خلاف جھوٹ بولنے سے رب کا نام ناپاک نہیں ہوتا اور نہ ہی اس کی توہین ہوتی ہے" (BABA KAMA 113A. 1136)

۲۔" یہودی کو ہمیشہ عیسائی کے ساتھ جنابت کی کوشش کرتے رہنا چاہیے"۔ (ZOHRI I 160A

۳۔" عیسائیوں کے ساتھ جو نیکی کرے گا وہ اپنے قبر سے کبھی نہ اٹھ سکے گا"۔ (ZOHRI I .1256)

۔"۔۔۔ اب آیئے میں آپ حضرات سے بیان کروں کہ ہم نے کیتھولک چرچ کی بنیاد ڈھانے کے لیے کیا کیا، بعض پادریوں کو ورغلا کر انہیں اپنا ہمنوا بنالیا تاکہ وہ ہماری تحریک (صیہونی) کے لیے کام کریں انہیں یہ واضح تعلیمات دی گئیں کہ وہ ہوشیاری اور تیزی کے ساتھ کلیسا کو اندر سے تباہ و برباد کرنے کی کوشش کریں، انہیں اس کے خلاف اسکینڈلز تیار کرنے کا حکم دیا گیا اور اس طرح ہم نے شہنشاہ یہود کی بعض نصیحتوں پر عمل کرنے کی کوشش کی کہ "۔۔۔ اپنے بعض اولاد کو پادری بناؤ تاکہ وہ کلیساؤں میں تخریب کاری کر سکیں ۔۔۔ لیکن افسوس یہ ہے کہ تمام یہودیوں نے اس نصیحت کو پورا کرنے میں اخلاص سے کام نہیں لیا۔۔۔"

" ہم روئے زمین پر پیش آنے والے تمام انقلابات کے محرک ہیں حتیٰ کہ وہ انقلابات بھی جن کے ہم خود ہی شکار ہوئے۔۔۔ ہم نے عیسائیوں میں دینی اصلاحی تحریکات کو پیدا کیا

کالون (CALVIN) اصلاً یہودی اور ہماری اولاد میں سے تھا... خود مارٹن لوتھر (MARTIN LUTHER) بھی غیر شعوری طور پر اپنے یہودی دوستوں کے زیر اثر تھا..."

"صہیونی خواہشات کی تکمیل کے لیے ہم پروٹسٹنٹ حضرات کے شکرگذار ہیں، اگرچہ ان میں سے اکثر اپنے عقیدے کے ساتھ مخلص تھے مگر انہیں ہمارے لیے اپنی غیر شعوری خدمات کا احساس نہیں تھا.... یہانتک کہ ہم اپنی خواہشات کے مطابق یوروپ کی بیشتر حکومتوں کا تختہ پلٹنے میں کامیاب ہوئے، روس ہمارے متعین کردہ راستوں پر چل رہا ہے، فرانس کی فری منسن حکومت ہمارے چنگل میں ہے، برطانیہ ہماری سرمایہ کاری کے طفیل ہمارے قدموں میں ہے، پروٹسٹنٹ برطانیہ کیتھولک کلیساؤں کو تباہ کرنے کے لیے ہمارے لیے کدال جیسا ہے.....

ہم اپنے پروگرام کی تقویت کے لیے دوسری قوموں کے اخلاق کو تباہ کرنے کی کوشش کرتے ہیں، عوام میں انقلابات کی آگ لگاتے ہیں، لوگوں کے دلوں میں قوم وملت کے لیے حقارت کے جذبات ابھارتے ہیں، خاندانی وحدت سے نفرت پیدا کرتے ہیں اور مذہب کے بارے میں یہ تصور ذہنوں میں ابھارتے ہیں کہ یہ ایک لایعنی شیئے اور تضییع اوقات کا سبب ہے اور دین ایک ایسا مسئلہ ہے جسے زمانے نے بہت پیچھے چھوڑ دیا ہے اور دہ نئے عصر کی ضرورتوں کا ساتھ نہیں دے سکتا ہے.....

ہمیں ہمیشہ یاد رکھنا چاہیئے کہ ہمارا بادشاہ یہود جس کا ہمیں انتظار ہے، وہ دنیا کی موجودہ صورت حال سے کبھی بھی راضی نہ ہوگا جب تک کہ پاپائے روم کو اس کی کرسی سے اتارا نہ جائے اور دنیا کے تمام حکمرانوں کو معزول نہ کردیا جائے...." (پیرس میں منعقد عالمی صہیونی کانفرنس کے تقاریر سے مقتبس معمولی حذف وتغییر کے ساتھ۔

"کیتھولک گزٹ" فروری ۱۹۳۶ء)

۱۔" (یہودیوں کی کتاب) تلمود کفر و الحاد اور کمینگی پر مشتمل ہے۔" (اعلان پاپا گریگوری ۱۲۴۲ء)

۲۔" یہودی دنیا کی تمام قوموں کے لیے عموماً اور عیسائی قوم کے لیے خصوصاً ایک بڑا خطرہ ہیں۔" (رسالہ" سیویلٹا کیتھولیکا"، وٹیکن)

۳۔" وہی طاقت جس نے ۱۹۰۰ سو برس قبل مسیح کو صلیب دیا تھا، آج کلیسا کو صلیب پر چڑھانے کے لیے کوشاں ہے۔۔۔" (پادری جیرالڈ، ب، ونیرو ڈ" عیسائیت کے خلاف یہودی سازش" ص ۷)

۴۔" یہودیوں کی کتابوں کی صفحات گردانی نے مجھے تھکا دیا مگر ان میں ایک بھی ایسی عبارت نہ مل سکی جو مسیح کے لیے انسانی احترام پر مبنی ہو ۔۔۔ جبکہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے قرآن میں ایسی بے شمار عبارتیں موجود ہیں جو ذات مسیح کے لیے حد درجہ احترام کی حامل ہیں۔۔۔"

"اسپینی یہودی موشے ڈ لیون اپنی کتاب (شائع شدہ ۱۸۸۰) میں یسوع مسیح کے بارے میں لکھتا ہے کہ وہ" مردار کتا ہیں" اور" نجاست کے ڈھیر میں دفن ہیں" (نعوذ باللہ) تلمود کے غیر عبرانی نسخوں سے وہ القاب و اوصاف حذف کر دیئے گئے جن کے ذریعے یہودی مسیح کو یاد کرتے ہیں، جیسے : مجنون، جادوگر، کتا، ولد الزنا، بت پرست اور ولد الشہوت وغیرہ، ایسے ہی القاب انہوں نے مسیح کی والدہ مریم عذرا کے لیے بھی بنا رکھے ہیں۔۔۔" (ہیوسٹن اسٹوارٹ چیمبرلین : انیسویں صدی کی بنیادیں ۱: ۳۴۰)

(۲)

۱۴۵۳ء۔ ترکی مسلمانوں کے ہاتھوں قسطنطنیہ کا سقوط۔

۱۴۹۲ء۔ امریکہ کی دریافت، سقوط غرناطہ، اندلس کے یہودیوں کی یوروپ کی

طرف ہجرت۔

۱۵۲۳ء۔ یورپ میں اصلاحی تحریک کا آغاز، مارٹن لوتھر کی مشہور کتاب "عیسیٰ یہودی پیدا ہوئے" کی اشاعت ....

۱۵۴۴ء۔ "یہودی اور ان کی دروغ گوئیوں کے متعلق" مارٹن لوتھر کی دوسری کتاب کی اشاعت۔

۱۵۶۵ء۔ بلجیم اور ہالینڈ میں کیتھولکزم کے خلاف پروٹسٹنٹ انقلاب۔

۱۵۸۱ء۔ یہودیوں کی مذمت میں پاپا گریگوری سوئم کا فرمان۔

۱۶۰۹ء۔ ہالینڈ میں کیتھولک فوجوں کو شکست کا سامنا اور وہاں کالوینین پروٹسٹنٹزم (CALYINIAN PROTESTANTISM) کے اصولوں پر جمہوریت کا قیام۔

۱۶۴۹ء۔ گوانا اور کارٹرائٹ نام کے دو بڑے پادریوں نے حکومت انگلینڈ سے مطالبہ کیا کہ انگلینڈ اور ہالینڈ کے عوام کو یہ شرف ملنا چاہیے کہ وہ یہودیوں کو سرزمین فلسطین میں آباد کرائیں، جسے خدا نے یہودیوں کو ابدی میراث کے طور پر عطا کیا ہے اور جو ان کے آباء و اجداد: ابراہیم و اسحاق و یعقوب کی سرزمین ہے۔

۱۶۵۵ء۔ اولیور کرومویل نے اس مطالبے کا استقبال کیا اور کنگ ایڈورڈ کے یہودی مخالف قوانین کو کالعدم قرار دے دیا۔

۱۶۲۲ء۔ بادشاہ انگلینڈ کے قانونی مشیر نے فلسطین میں یہودی ریاست کے قیام کے لیے ایک نئی صلیبی جنگ کی دعوت دی۔

۱۷۰۰ء۔ فیلپ جنٹل نے خلیفۂ عثمانی سے مذاکرات کے ذریعے یہودیوں کے لیے ردم

کے بدلے میں بیت المقدس کے مطالبے کا نظریہ پیش کیا۔

۱۷۹۹۔ نیپولین نے بیت المقدس میں یہودی ریاست کے قیام کے لیے دنیا بھر کے یہودیوں سے اپنی حمایت کا مطالبہ کیا۔

۱۸۱۸۔ امریکی صدر جان آدمز نے فلسطین میں یہودی حکومت کے قیام کی حمایت کی

۱۸۳۸۔ بیت المقدس میں پہلے برطانوی کونسل کا افتتاح اور ایک پادری کا نائب کونسلر کی حیثیت سے تعین۔

۱۸۳۹۔ لورڈ کوپر کے ایک بیان کی اشاعت جس میں اس نے یہودیوں کو عیسائیت کی امید کا مرکز اور مسیح منتظر کی واپسی کا باعث قرار دیا اور یہ دعویٰ کیا کہ یہودیوں کی فلسطین واپسی مشیت الٰہی ہے جس کی تکمیل پر انسان قادر ہے۔

۱۸۴۰۔ برطانوی وزیر خارجہ نے ترکی میں اپنے سفیر کو ہدایت جاری کی کہ وہ ترکی کے سلطان کو اس بات پر راضی کرے کہ وہ یہودیوں کو مشرقی یوروپ سے فلسطین ہجرت کرنے کی اجازت دے دیں۔

۱۸۴۰۔ یہودیوں کو فلسطین میں آباد کرنے کے لیے ایک کانفرنس کا انعقاد جس میں "بغیر قوم کی زمین (فلسطین) برائے بغیر زمین کی قوم (یہود)" کا نعرہ دیا گیا۔

۱۸۴۴۔ برطانوی پارلیمنٹ نے فلسطین میں یہودیوں کی آبادکاری کے لیے ایک کمیٹی تشکیل دی۔

۱۸۶۵۔ ملکہ وکٹوریہ اور کانٹربری چرچ کے سربراہ کی مشترکہ قیادت میں یہودیوں کی مجوزہ ریاست کے لیے ایک فنڈ کا قیام۔

۱۸۷۸۔ پادری ولیم بلیک اسٹون کی کتاب "آمد عیسیٰ" کی اشاعت کتاب کا ترجمہ

دنیا کی چالیس۴۰ زبانوں میں کیا گیا اور یہ پوری صدی میں سب سے زیادہ فروخت ہونے والی کتاب تھی۔

۱۸۸۰- برطانوی وزیر خارجہ لورنس اولیونٹ نے بحیرۂ روم اور دریائے اردن کے درمیان ایک یہودی ہوم لینڈ کے قیام کی تجویز پیش کی۔

۱۸۸۱- زار روس الیگزنڈر دوئم کے قتل کے بعد یہودیوں پر مظالم کا سلسلہ اور نتیجے میں روس سے بڑے پیمانے پر یہودیوں کی ہجرت۔

۱۸۸۲- یہودیوں کو ہجرت کی آسانی فراہم کرنے کے لیے سلطان عبدالحمید کو راضی کرنے کی کوشش۔ "یہودی مسئلہ" کے حل کے لیے عیسائی مذہبی رہنماؤں کی کانفرنس۔

۱۸۸۸- "بے قوم وطن برائے بے وطن قوم" کے نعرے کے ساتھ بلیک اسٹون فلسطین کا دورہ

۱۸۹۱- پادری بلیک اسٹون نے امریکی صدر بنیامین کو ایک یادداشت پیش کی۔ جس میں فلسطین میں ایک یہودی ریاست کے قیام کے ذریعے یہودیوں کے آلام و مصائب پر مرہم رکھنے کا مطالبہ کیا اور اس میں معاہدۂ برلین کا حوالہ دیا گیا جس کے بموجب فلسطین یہودیوں کے لیے طے کیا گیا تھا۔

۱۸۹۶- کتاب "یہودی ریاست" کی اشاعت۔

۱۸۹۷- سوئزر لینڈ میں پہلی عالمی صیہونی کانفرنس کا انعقاد۔

۱۹۰۳- صحرائے سینا میں یہودی آبادکاری کی تجویز سے صیہونی تحریک کا انکار۔

۱۹۰۴- برطانوی وزیر اعظم لائڈ جارج اور وزیر خارجہ آرتھر جیمس بلفور سے صیہونی تنظیم کی ملاقات۔

۱۹۱۶۔ سلطنت عثمانیہ کی آپس میں تقسیم کے لیے معاہدۂ "سائیکس۔ پیکو"

۱۹۱۷۔ وزیر خارجہ بلفور کا یہودیوں سے فلسطین میں ان کے لیے ایک قومی حکومت کے قیام کا مشہور وعدہ۔

۱۹۲۲۔ رابطہ اقوام (LEAGUE OF NATIONS) نے فلسطین پر برطانوی بالادستی کو قبول کیا۔ امریکی کانگریس کی طرف سے فلسطین پر یہودیوں کے حق کا اقرار اور امریکی حکومت کی جانب سے "وعدۂ بلفور" کی تائید۔ فلسطین میں یہودی ریاست کی تجویز کے خلاف ویٹکن کی طرف سے رابطۂ اقوام کے نام میمورنڈم۔

۱۹۳۰۔ فلسطین میں یہودی ریاست کے قیام کی تجویز کو عملی جامہ پہنانے کے لیے ایک تنظیم "امریکن یونین برائے فلسطین" کا قیام۔

۱۹۳۶۔ "امریکن کرسچین کانگریس" کی جانب سے دنیا کی تمام مہذب قوموں سے، یوروپ خاص کر جرمنی سے فرار ہونے والے یہودیوں کو ان کے "فطری ٹھکانے" فلسطین پہنچانے میں امداد و تعاون کا مطالبہ۔

۱۹۴۳۔ برموڈا کانفرنس کا انعقاد جس میں امریکی صدر روزولٹ کی جانب سے یہودیوں کے لیے فلسطین کے تمام راستے کھولنے پر زور۔ ویٹکن کی طرف سے امریکی حکومت کو ایک یادداشت جس میں یہودی ریاست کے قیام کی مخالفت کی گئی۔

۱۹۴۴۔ محدود پیمانے پر یہودیوں کی فلسطین کی ہجرت کی برطانوی تجویز پر امریکہ کی ناپسندیدگی اور اسے غیر محدود رکھنے کا مطالبہ۔ صیہونی مطالبات کے آگے مصری جھکاؤ کے خطرات سے آگاہ کرنے کے لیے ویٹکن کے ایک وفد کی امریکہ روانگی۔

۱۹۴۵۔ صیہونیت کی مکمل حمایت کے اعلان کے ساتھ ہیری ٹرومین کی امریکی انتخاب

میں شرکت۔

۱۹۴۷۔ ٹرومین نے فلسطین میں یہودی اکثریت کے حصول کی کوشش کا مطالبہ کیا۔
مسئلہ فلسطین اقوام متحدہ کے سپرد۔ اقوام متحدہ کی طرف سے تقسیم فلسطین کی قرارداد ۳۳ ممبروں نے حمایت کی، ۱۳ ممبروں نے مخالفت کی جبکہ ۱۵ نے ووٹنگ میں حصہ نہیں لیا۔

۱۹۴۸۔ اسرائیل کے نام سے فلسطین میں یہودی ریاست کا قیام اور ریاستہائے متحدہ اور سوویت یونین کا فوری اعتراف۔ اسرائیل کو ۱۵ کروڑ ڈالر کی امریکی امداد۔

۱۹۴۹۔ اسرائیل کو ۱۵ کروڑ ڈالر کا ایک اور امریکی قرضہ۔ ایلات کے پاس خلیج عقبہ کے بعض علاقوں پر اسرائیل کا جارحانہ قبضہ۔

۱۹۵۰۔ مشرق وسطیٰ سے متعلق امریکہ، برطانیہ اور فرانس کی مشترکہ پالیسی کا اعلان۔

۱۹۵۴۔ عرب ملکوں کو اسلحے کی فروخت کے لیے امریکہ کی سخت شرائط۔

۱۹۵۶۔ نہر سویز کے قومیائے جانے پر برطانیہ، فرانس اور اسرائیل کا مصر پر حملہ۔

۱۹۶۷۔ مصر، شام اور اردن پر اسرائیلی حملہ، صحرائے سینا، غزہ کی پٹی، مغربی کنارہ، گولان کی پہاڑیاں اور قبلہ اول پر یہودی قبضہ

۱۹۶۹۔ امریکی جہازوں سے فلسطینی پناہ گزینوں کے کیمپ پر اسرائیلی بمباری۔ مسجد اقصیٰ کو جلانے کی کوشش۔

۱۹۷۳۔ جنگ رمضان، مصر کی اسرائیل پر واضح برتری۔

۱۹۷۵۔ اقوام متحدہ میں صہیونیت کے نسل پرست ہونے کی قرارداد۔

۱۹۷۶۔ جمی کارٹر کا بیان کہ "جدید اسرائیلی حکومت بائیبل کی پیشین گوئی کی تکمیل ہے"۔

۱۹۷۷۔ جنگ رمضان میں مصری طاقت اور عرب اتحاد کے زبردست مظاہرے کے پیش نظر

مصر کو عربوں سے الگ تھلگ کر دینے کی مغربی سازشیں۔ سادات کا دورہ اسرائیل۔

۱۹۷۸ء۔ معاہدہ کیمپ ڈیوڈ۔ جنوبی لبنان میں اسرائیلی دراندازی۔

۱۹۷۹ء۔ مصر و اسرائیل کے درمیان معاہدہ امن۔ جمی کارٹر کا اسرائیلی کینیٹ (قومی اسمبلی) میں بیان کہ "امریکہ و اسرائیل توریت کی میراث کے باہم حصہ دار ہیں"۔

۱۹۸۰ء۔ مشرقی بیت مقدس کا اسرائیل میں انضمام۔ اسرائیلی حکومت کا بیان کہ بیت المقدس اسرائیل کی ابدی راجدھانی ہے۔

۱۹۸۱ء۔ مغربی امداد سے عراقی ایٹمی ریکٹرز پر اسرائیلی جہازوں کی بمباری۔

۱۹۸۲ء۔ پورے لبنان میں اسرائیلی فوجوں کا داخلہ۔ صبرا اور شاتیلا کے فلسطینی کیمپوں پر اسرائیل کی انسانیت سوز بمباری۔

۱۹۸۳ء۔ یہودیوں کے بارے میں مارٹن لوتھر کے سخت بیانات سے لوتھرین فرقے کے عیسائیوں کی عالمی یونین کا اعلان برأت۔

۱۹۸۴ء۔ ریگن کا اپنے اس یقین کا اعتراف کہ "نجات دہندہ مسیح کی دوبارہ آمد اور دنیا کے آخری معرکے میں اسرائیل کا بنیادی کردار ہوگا"۔

۱۹۸۵ء۔ اتھیوپیا کے یہودیوں (فلاشاز) اسرائیل کی منتقلی۔ عیسائی صہیونی مشترکہ کانفرنس کا سوئزرلینڈ میں انعقاد، دنیا کے ۲۷ ملکوں سے ۶۰۰ مسیحی مندوبین کی شرکت۔

۱۹۸۷ء۔ فلسطین میں "انتفاضہ تحریک" کا آغاز۔

۱۹۸۸ء۔ مغربی دباؤ اور عربوں کے انتشار کے نتیجے میں تنظیم آزادی فلسطین کی طرف سے پہلی بار اسرائیل کے حق وجود کا اعتراف۔ گوربا چوف کا انتخاب اور ماسکو میں یہودی ثقافتی مرکز کا افتتاح

۱۹۸۹ - امریکی اعتراف کہ اسرائیل بڑے پیمانے پر ایٹمی ہتھیار رکھتا ہے۔

۱۹۹۰ - ہزاروں ہزار روسی یہودیوں کی اسرائیل ہجرت (محمد السماک کی کتاب "انجیلی بنیاد پرستی" سے ماخوذ و ملخص)

اس قدر گہرے مذہبی اختلافات اور باہم ایک دوسرے کے خلاف اتنے نفرت انگیز جذبات رکھنے کے باوجود اور اس ناقابل تردید تاریخی شہادت کی موجودگی میں کہ یہودیوں نے ہمیشہ عیسائیوں کے خلاف سازشیں کیں اور ان کی صفوں میں تفرقہ کے بیج بوئے، ان میں باہم خونریزیاں کرائیں، ان کے ملکوں میں انقلابات برپا کیے اور ان کے اقتصاد و معاش کو کھوکھلا کرنے کی کوششیں کیں، مگر ان سب کے باوجود آخر وہ کیا اسباب ہیں جنھوں نے ہر دور میں عیسائی عوام و خواص کی صفوں میں سے ایک بڑی تعداد کو صہیونی اور یہودی مقاصد کے لیے اتنی شدومد کے ساتھ کام کرنے پر مجبور کیا اور یک طرفہ طور پر انہیں یہودیوں کا آلۂ کار بنائے رکھا۔

شاید مذاہب کی تاریخ میں اپنی نوعیت کا یہ انوکھا واقعہ ہے کہ عیسائیت نے اپنے عقیدے کے مطابق مسیح کو صلیب دینے والوں اور انہیں معاذ اللہ ولد الزنا ماننے والوں کا آلۂ کار بننا پسند کیا۔

یہودی ہوم لینڈ کی تجویز سے لے کر وعدۂ بلفور تک، وعدۂ بلفور سے قیام اسرائیل تک اور اسرائیل کے قیام سے لے کر خلیج کی جنگ تک یہودیوں کے لیے عیسائیوں کی اتنی طویل اور پرجوش خدمات کا راز کیا ہے۔

دراصل یہودی۔ عیسائی تعلقات میں اس حیرت انگیز تبدیلی بلکہ عیسائیوں کی جانب سے اس یک طرفہ تبدیلی کے اسباب دو قسم کے ہیں۔

پہلے قسم کے اسباب میں وہ اساطیری روایتیں ہیں جنھیں صیہونیت نے کمال ہوشیاری سے عیسائی کتابوں میں داخل کر دیا اور انہیں عیسائی عقیدے کا جزر بنا دیا، یہ روایتیں تین محوروں کے گرد گھومتی ہیں۔

۱۔ یہودی قوم اللہ کی پسندیدہ اور محبوب قوم ہے۔

۲۔ ایک خدائی میثاق کا تصور جس کے مطابق بنوصہیون (یہودی) اور سرزمین فلسطین ایک دوسرے کے لیے لازم و ملزوم ہیں۔

۳۔ یہ عقیدہ کہ مسیح منتظر کی واپسی فلسطین میں یہودی ریاست کے قیام کے بعد ہی ہوگی۔

دوسرے قسم کے اسباب نفسیاتی، تاریخی، سیاسی اور معاشی نوعیت کے ہیں۔ ان میں سے بعض اہم اسباب مندرجہ ذیل ہیں:

۱۔ صلیبی جنگوں میں (گیارہویں/بارہویں صدی عیسوی) مسلسل اور پے در پے نو بار شکست دنیائے عیسائیت کے لیے ایک نفسیاتی عقدہ بن گئی تھی، عالم اسلام کے سینے میں اسرائیل کا خنجر گھونپ کر عیسائی یوروپ نے اپنے اسی نفسیاتی عقدے سے نجات حاصل کرنے کی کوشش کی ہے، دراصل یہودی ریاست اپنی تجویز سے لے کر قیام تک کے تمام مراحل میں یوروپ کے لیے شعوری یا غیر شعوری طور پر دسویں صلیبی جنگ کے مانند تھی۔

۲۔ صنعتی انقلاب کے ساتھ پورا یوروپ یہودیوں کے سودی نظام میں جکڑا ہوا تھا، انکے لیے ایک ہوم لینڈ کے قیام کے ذریعہ یوروپ ان سے نجات حاصل کرنا چاہتا تھا جو اس کے جدید معاشی نظام کے استحکام اور بقا کے لیے بے حد ضروری تھا۔

۳۔ قومیتوں کی بنیاد پر تقسیم یوروپ کے جدید سیاسی نقشے میں یہودیوں کیلئے کوئی جگہ نہیں رہ گئی تھی۔

۴۔ یہودی ریاست کے قیام کے ذریعے عالم اسلام پر مغرب اپنا تسلط برقرار رکھنا چاہتا تھا۔

اقبال کے اردو کلام میں قرآن سے ماخوذ چند اصطلاحات

از

جناب انعام الحق علمی۔ نائجیریا۔

اقبال نے نہ جانے کس کیفیت میں کہا تھا ؎

ترے ضمیر پہ جب تک نہ ہو نزول کتاب گرہ کشا ہے نہ رازی نہ صاحب کشاف

حقیقت بھی یہی ہے کہ اقبال کی فکر کی گرہ رازی اور زمخشری نے نہیں کھولی۔ بلکہ اسرار کتاب ان کے دل پر خود وا ہوتے گئے جو بتدریج ان کے اشعار میں ڈھلتے چلے گئے۔ ہماری مراد اقبال کی اس فکر سے ہے جو بالآخر ان کی شناخت بنی، ان کے تمام فکری ارتقا سے بحث نہیں ہے، اس لیے کہ زندگی کی طرح فکر کے سفر میں بھی ایسے مقامات آتے ہیں جہاں مسافر نظریات کی بھول بھلیوں میں گم ہو جاتا ہے اور ہر نئے موڑ کو منزل سمجھ لیتا ہے۔ جب گمانوں کا لشکر تشکیک وحیرت کی وادی سے گزرتا ہوا الیقین کی منزل تک پہنچ جاتا ہے تو یہی لیقین اس کا سرمایہ اور شناخت بن جاتا ہے۔ اقبال کی فکر کا جو سفر

موتی سمجھ کے شان کریمی نے چن لیے قطرے جو تھے مرے عرقِ انفعال کے

سے شروع ہوا تھا۔ تقریباً چار دہائیوں کے بعد

دیں ہاتھ سے دے کر اگر آزاد ہو ملت ہے ایسی تجارت میں مسلماں کا خسارہ

یا

ہر نفس ڈرتا ہوں اس امت کی بیداری سے میں ؛ ہے حقیقت جس کے دیں کی احتساب کائنات

پر ختم ہوتا ہے۔گویا قُلْ يٰعِبَادِيَ الَّذِيْنَ اَسْرَفُوْا عَلٰى اَنْفُسِهِمْ لَا تَقْنَطُوْا مِنْ رَّحْمَةِ اللّٰهِ

(الزمر: ۵۳) سے يٰاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تُلْهِكُمْ اَمْوَالُكُمْ وَلَا اَوْلَادُكُمْ عَنْ ذِكْرِ اللّٰهِ

(المنافقون : ۹) تک پہنچنے میں چالیس سال کی مسافت طے کی۔

اقبال کی فکر پر اول و آخر اثر قرآن ہی کا تھا۔قرآن عربی کا اور پھر قرآن در زبان پہلوی (مثنوی مولانا روم) کا۔اور یہ کوئی نئی بات نہیں ہے،خود اقبال ہی نے اس کا اعتراف کیا ہے۔ روؔمی کے لیے خود تسلیم کرتے ہیں کہ از وآموختہ اسرار جاں من۔قرآن کی تلاوت اور فہم سے جو ذوق وشوق اقبال کو تھا وہ ان کے تذکروں میں محفوظ ہے اور ان کے فکر وذہن پر قرآن کے اثر کا اندازہ ان سے ہوسکتا ہے۔ان کے اس ذوق وشوق کو جلا ان کے والد بزرگوار کی ان نصیحتوں نے بخشی جو انھوں نے اقبال کو زمانۂ طالب علمی میں کی تھیں۔اول تو یہ کہ قرآن ایسے پڑھا کرو گویا تم ہی مخاطب ہو اور دوئم یہ کہ اس پیغام کو عالم انسانیت تک پہنچانا ہے اقبال نے ان نصیحتوں کو پورا کرنے کا وعدہ کیا۔یہ واقعہ تفصیل سے اقبال نے اپنے افغانستان کے سفر کے دوران علامہ سید سلیمان ندوی کو بتایا تھا۔

جس طرح کسی شخص کی گفتگو اس کے گھر یا گھرانے، دوست واحباب اور قریبی معاشرہ کو ظاہر کرتی ہے،اسی طرح کسی مصنف کی تحریر اس کی طرز فکر کا آئینہ دار ہوتی ہے۔دینی ماحول اور مذہبی ذہن کے پروردہ اشخاص کی زبانوں پر قرآنی آیات اور احادیث کے اقتباسات ان کی گفتگو میں نمایاں ہوتے ہیں۔ایک گندے معاشرے سے آئے ہوئے شخص کی زبان و گفتگو اس کے برعکس ہوگی۔یہ ایک سہل مگر ٹھوس حقیقت ہے،عربی کی مثال کُلُّ اِنَاءٍ يَتَرَشَّحُ بِمَا فِيْهِ، اس کو اور واضح کردیتی ہے،گویا مصنف کا اسلوب یا شاعر کا انداز بیان اس کی

طرز فکر ہی نہیں بلکہ طرز معاشرت کو بھی ظاہر کرتا ہے۔

اس کسوٹی پر اگر ہم اقبال کے اردو کلام کو پرکھیں تو دو حقائق سامنے آتے ہیں۔ اول تو یہ کہ قرآن کی کثرت تلاوت کے باعث ان کے یہاں متعدد اشعار ایسے ملتے ہیں جہاں قرآنی آیات یا ان کے ٹکڑے اس طرح بے ساختہ استعمال ہوئے ہیں گویا وہ خود شعر ہی کا حصہ ہیں۔ یہ نہیں معلوم ہوتا کہ وہ کسی دوسری زبان سے لیے گئے ہیں۔ مثال کے طور پر مندرجہ ذیل اشعار میں خط کشیدہ الفاظ ملحوظ نظر رہیں۔

(۱) مثل کلیم ہو اگر معرکہ آزما کوئی اب بھی درخت طور سے آتی ہے بانگ لَا تَخَفْ

سورۂ طٰہٰ میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: قَالَ خُذْهَا وَلَا تَخَفْ، سَنُعِيدُهَا سِيرَتَهَا الْأُولَىٰ (۲) آ سناؤں تجھکو رمز آیۂ اِنَّ الْمُلُوْكَ سلطنت اقوام غالب کی ہے اک جادوگری

سورۃ النمل میں ارشاد ہے: قَالَتْ إِنَّ الْمُلُوكَ إِذَا دَخَلُوا قَرْيَةً أَفْسَدُوهَا وَجَعَلُوا أَعِزَّةَ أَهْلِهَا أَذِلَّةً۔

(۳) یہ لسان العصر کا پیغام ہے اِنَّ وَعْدَ اللّٰهِ حَقٌّ یاد رکھ

سورۂ یونس کی آیت ہے: أَلَا إِنَّ وَعْدَ اللَّهِ حَقٌّ وَلَٰكِنَّ أَكْثَرَهُمْ لَا يَعْلَمُونَ۔

(۴) یہ سب ہیں ایک ہی سالک کے جستجو کے مقام وہ جس کی شان میں آیا ہے عَلَّمَ الْاَسْمَاءَ

سورہ البقرہ کی آیت ہے: وَعَلَّمَ آدَمَ الْأَسْمَاءَ كُلَّهَا۔۔۔۔

(۵) حکم حق ہے لَيْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَا سَعٰى کھائے کیوں مزدور کی محنت کا پھل سرمایہ دار

سورہ النجم میں ارشاد ربانی ہے: وَأَنْ لَيْسَ لِلْإِنْسَانِ إِلَّا مَا سَعَىٰ۔۔۔

(۶) آہ اے مرد مسلماں تجھے کیا یاد نہیں حرف لَا تَدْعُ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا آخَرَ

سورہ القصص کی آخری آیت کا ٹکڑا ہے: وَلَا تَدْعُ مَعَ اللَّهِ إِلَٰهًا آخَرَ ۘ لَا إِلَٰهَ

اِلّاھُو.....

اس ضمن میں وہ تلمیحات بھی آجاتی ہیں جو قصص قرآنی سے متعلق ہیں۔ اقبال سے پہلے ہر چند کہ کلیم وطور لن ترانی اور خلیل اللہ کی تلمیحات استعمال ہوتی ہیں، لیکن جو تاثیر ان کو اقبال کے کلام میں آنے سے ملی وہ اس سے پہلے نایاب ہے۔ کلیم وطور کے موضوع پر غالبؔ

کیا فرض ہے کہ سب کو ملے ایک سا جواب　　　آؤ نہ ہم بھی سیر کریں کوہِ طور کی

سے آگے نہ بڑھ سکے۔ وہ یہ نہ کہہ سکے ؎

رشی کے فاقوں سے ٹوٹا نہ برہمن کا طلسم　　　عصا نہ ہو تو کلیمی ہے کارِ بے بنیاد

اور اگرچہ ذوق کو

گیا شیطان مارا ایک سجدے کے نہ کرنے میں　　　اگر لاکھوں برس سجدے میں سر مارا تو کیا مارا

نے شہرت دوام بخش دی لیکن یہ نکتہ ان کے ذہن رسا میں بھی نہ آسکا ؎

آہ اے جبریل تو واقف نہیں اس راز سے　　　کر گیا سرمست مجھکو ٹوٹ کر میرا سبو

میں کھٹکتا ہوں دلِ یزداں میں کانٹے کی طرح　　　تو فقط اللہ ہو، اللہ ہو، اللہ ہو

لیکن یہی قرآنی تلمیحات جب اقبال کے کلام میں آتی ہیں تو ان کا اثر اس لیے بڑھ جاتا ہے کہ اقبال نے ان کو روایتی انداز میں نہیں بلکہ الگ ہی پس منظر میں استعمال کیا ہے۔ مثلاً

صنم کدہ ہے جہاں اور مردِ حق ہے خلیل　　　یہ نکتہ وہ ہے جو پوشیدہ لاالٰہ میں ہے

تھا ارنی گو کلیم میں ارنی گو نہیں　　　اس کو تقاضہ روا مجھ پہ تقاضہ حرام

غریب و سادہ و رنگین ہے داستان حرم　　　نہایت اس کی حسین ابتدا ہے اسمٰعیل

کلامِ اقبال کی یہ خصوصیت کثرت تلاوت کی دین ہے۔

دوسری بات جو ان کے کلام میں نمایاں ہوئی وہ کثرت مطالعہ کی وجہ سے ہے (یہاں

کثرتِ تلاوت اور کثرت مطالعہ کا فرق واضح رہے) یہ وہ مقام ہے جہاں ان کا ذاتی فلسفہ اور فکر قرآنی ارشادات سے ہم آہنگ ہونے لگتا ہے۔ قرآن کے معنی کو بنیاد بنا کر فکر اس کے ہی الفاظ کی نشو ونما کرتی ہے اور اس امتزاج کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ لفظ ان کی شاعری میں ایک اصطلاح کی صورت اختیار کر لیتا ہے اور جب بھی استعمال ہوتا ہے اصطلاح ہی کی شکل میں استعمال ہوتا ہے، محض اپنے لغوی معنوں میں نہیں ۔ مومن، یقین، ابراہیم، خلیل، موسیٰ، کلیم، ابلیس، بولہب وغیرہ وہ قرآنی الفاظ ہیں جو اقبال کے یہاں ایک اصطلاح کی شکل اختیار کر لیتے ہیں مثال کے طور پر ان کے یہاں ابولہب سے مراد ابولہب بن عبدالمطلب اور ابراہیم سے مراد محض ایک پیغمبر نہیں بلکہ یہ ایک تاریخ، ایک رجحان اور ایک جذبہ کی علامت ہیں ۔ یہ چند الفاظ اقبال کے یہاں کیسے اصطلاحات بنے ذیل میں اس کا تجزیہ کیا جاتا ہے :-

(۱) **مومن** : قرآن میں صرف ضمیر واحد میں یہ لفظ پندرہ جگہ آیا ہے اور جمع کی ضمیر اور مشتقات میں اس کی تعداد کم وبیش ایک ہزار ایک سو بیس ہے۔ مومن کے بنیادی معنی اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لانے والے کے ہیں، یہ الگ بات ہے کہ علم التوحید یا ایمانیات میں مومن کے لیے کچھ اور شرائط بھی ہیں۔ یہاں اس سے بحث نہیں ہے کہ اقبال کا مرد مومن اور دوسرے فلسفیوں کے مرد کامل یا فلسفی بادشاہ میں کیا فرق ہے۔ یہاں صرف یہ دکھانا مقصود ہے کہ یہ قرآنی لفظ اقبال کی شاعری میں اصطلاح کیسے بنا۔

قرآن کریم میں مختلف جگہ مومن کی صفات کا ذکر ہوا ہے لیکن خاص طور سے سورہ توبہ سورۂ مومنون اور سورۂ احزاب میں تفصیل سے مومنوں کی صفات کو نمایاں کیا گیا ہے۔ ان میں مومنین کی دس دس صفات بیان کی گئی ہیں۔ اگر تکرار اور مترادفات کو الگ کر دیا جائے تو کم سے کم یہ انیس صفات ضرور سامنے آتی ہیں، توبہ کرنے والے، عبادت کرنے والے،

حمد[3] کرنے والے، روزہ[4] رکھنے والے، رکوع[5] وسجود کرنے والے، نیک[6] باتوں کی تعلیم دینے والے، بری[7] باتوں سے بچنے والے، اللہ کی حدود[8] کا خیال رکھنے والے خشوع[9] وخضوع والے، لغو[10] گفتگو سے بچنے والے، پاک[11] رہنے والے، شرمگاہ کی[12] حفاظت کرنے والے، اسلام[13] لانے والے، ایمان[14] لانے والے، سچ[15] بولنے والے، صبر[16] کرنے والے، خیرات[17] کرنے والے، اللہ[18] کو بکثرت یاد کرنے والے اور فردوس[19] کے وارثین شامل ہیں۔ اقبال کے یہاں بھی مومن اپنی صفات کا حامل ہے۔

یوں تو لفظ 'مومن' پہلی بار اقبال کی نظم 'سید کی لوح تربت' میں ملتا ہے:

بندۂ مومن کا دل بیم و ریا سے پاک ہے   قوت فرمانروا کے سامنے بے باک ہے

یہاں اقبال نے سرسید کو خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے مشہور حدیث نبوی 'افضل الجہاد کلمۃ الحق عند سلطان جائر' کا ترجمہ کر دیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ شعوری طور سے یہ لفظ پہلی بار 'طلوع اسلام' میں آیا ہے جو بانگ درا کی آخری نظم ہے۔

کوئی اندازہ کر سکتا ہے اس کے زور بازو کا   نگاہ مرد مومن سے بدل جاتی ہیں تقدیریں

یہ مومن کے تصور کی ابتداء ہے اور اس کا نقطۂ عروج ارمغان حجاز کی نظم 'مسعود مرحوم' میں ملتا ہے:

مقام بندۂ مومن کا ہے ورائے سپہر   زمیں سے تا بہ ثریا تمام لات ومنات

مومن کی وہ صفات جو قرآن میں بیان کی گئی ہیں، جا بجا اقبال کے اشعار میں ظاہر ہوتی ہیں۔ مثال کے طور پر

تقدیر کے پابند نباتات و جمادات   مومن فقط احکام الٰہی کا ہے پابند   (اطاعت و فرمانبرداری)

آئین جوانمردی حق گوئی و بے باکی   اللہ کے شیروں کو آتی نہیں روباہی   (راست بازی)

اے طائر لاہوتی اس رزق سے موت اچھی   جس رزق سے آتی ہو پرواز میں کوتاہی   (اللہ کی حدود کا خیال رکھنا)

یہ بندگی خدائی وہ بندگی گدائی | یا بندۂ خدا بن یا بندۂ زمانہ (عبادت کرنا)

وہی جواں ہے قبیلے کی آنکھ کا تارا | شباب جس کا ہو بے داغ ضرب ہو کاری (شرمگاہ کی حفاظت کرنا)

متاعِ بے بہا ہے درد و سوزِ آرزو مندی | مقام بندگی دے کر نہ لوں شانِ خداوندی (خشوع و خضوع)

ہوتا ہے کوہ و دشت میں پیدا کبھی کبھی | وہ مرد جس کا فقر خزف کو کرے نگیں (صبر) وغیرہ وغیرہ

ام المومنین حضرت عائشہؓ نے ایک سوال کے جواب میں فرمایا تھا کہ حضورؐ کا اخلاق قرآن تھا۔ یہی بات اقبال کے یہاں ہم کو اس رنگ میں ملتی ہے:

یہ راز کسی کو نہیں معلوم کہ مومن | قاری نظر آتا ہے حقیقت میں ہے قرآن

غرض یہ کہ اقبال کے اشعار میں جب کبھی لفظ مومن استعمال ہوا ہے تو اس سے وہ صاحب یقین و ایمان انسان مراد ہے جو زندگی کے ہر کارزار میں اللہ کی کتاب کو اپنا رہنما جانتا ہو اور جو گفتار و کردار میں اللہ کی برہان ہو:

رہے گا تو ہی جہاں میں یگانہ و یکتا | اتر گیا جو ترے دل میں لاشریک لہٗ

(۲) **ابراهیم**: ابوالانبیاء حضرت ابراہیم علیہ السلام کی ذاتِ گرامی کلامِ اقبال کی دوسری اہم اصطلاح ہے۔ حضرت ابراہیم میں مومن کی کچھ خصوصیات اتنی نمایاں تھیں کہ انکا تقاضا یہی تھا کہ یہ نام خود ایک الگ اصطلاح بن جائے۔ قرآن کریم میں لفظ ابراہیم انہتر[۶۹] بار آیا ہے۔ اسی کا مترادف خلیل اگرچہ قرآن میں تین بار آیا ہے (نساء: ۱۲۵، اسراء: ۷۳، فرقان: ۲۸) لیکن صرف سورۂ نساء کی آیت میں وہ حضرت ابراہیم کے بارے میں ہے دوسرے موقعوں پر اپنے لفظی معنوں میں استعمال ہوا ہے۔

ابراہیم اللہ کے برگزیدہ اور بہت عزیز پیغمبر تھے۔ ان کا ذکر قرآن میں بڑے والہانہ انداز میں ہوا ہے۔ مثال کے طور پر سورۃ النحل کی یہ تین آیات ملاحظہ ہوں:

اِنَّ اِبْرٰهِيْمَ كَانَ اُمَّةً قَانِتًا لِّلّٰهِ	بے شک ابراہیم خلوص دل سے اللہ کی
حَنِيْفًا، وَلَمْ يَكُ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ ۝	فرمانبرداری کرنے والے تھے اور وہ مشرکوں
	میں سے نہ تھے۔
شَاكِرًا لِّاَنْعُمِهٖ، اِجْتَبٰهُ وَهَدٰهُ	خدا کی نعمتوں کا شکر ادا کرتے تھے۔
اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ۝	اس نے ان کو برگزیدہ کر لیا تھا اور انکو
	سیدھی راہ بتادی تھی۔
وَاٰتَيْنٰهُ فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً، وَاِنَّهٗ	اور ہم نے ان کو دنیا میں بھی خیر وخوبی
فِي الْاٰخِرَةِ لَمِنَ الصّٰلِحِيْنَ ۝	عطا کی اور یقیناً آخرت میں بھی وہ صالحین
	میں سے ہوں گے۔

سورۃ الانبیاء میں ہے:

قُلْنَا يٰنَارُ كُوْنِيْ بَرْدًا وَّسَلٰمًا	ہم نے کہا کہ اے آگ تو ابراہیم کے لیے
عَلٰٓى اِبْرٰهِيْمَ ۝	ٹھنڈی ہو جا اور سلامتی بن۔

سورۂ نساء میں ارشاد ہوتا ہے:

وَاتَّخَذَ اللّٰهُ اِبْرٰهِيْمَ خَلِيْلًا ۝	اور ابراہیم کو اللہ نے اپنا خلیل مقرر کیا۔

لیکن ان سب سے الگ اور بالاتر بات یہ ہے کہ وہ اللہ کے امتحان میں پورے اترے تھے:

وَاِذِ ابْتَلٰٓى اِبْرٰهِيْمَ رَبُّهٗ بِكَلِمٰتٍ	وہ وقت یاد کرو جب کہ ابراہیم کا اسکے
فَاَتَمَّهُنَّ، قَالَ اِنِّيْ جَاعِلُكَ لِلنَّاسِ	رب نے چند کلمات سے امتحان لیا اور
اِمَامًا...	ابراہیم نے ان کو پورا کر دیا تو خدا نے
	کہا میں تم کو تمام لوگوں کا امام مقرر کروں گا۔

تفسیر ابن کثیر میں ابن عباسؓ کی یہ روایت ہے کہ پورا اسلام تیس حصوں میں بٹا ہوا ہے اور ابراہیم کا امتحان انھی تیس چیزوں میں لیا گیا تھا اور وہ اس پر پورے اترے لہذا ان کو اللہ تعالیٰ کی جانب سے تین بڑے اعزاز عطا ہوئے۔

اول تو یہ فرمایا گیا کہ وَ اِبْرَاهِیْمَ الَّذِیْ وَفّٰی یعنی وہ ابراہیم جس نے وفا کی۔ وفا کا مطلب محبت نباہنا ہوتا ہے[1] گویا راہ عشق کا کوئی پیچ و خم اور نشیب و فراز ابراہیم کے قدم میں لغزش یا لرزش نہ پیدا کر سکا۔ خواہ وہ اپنے وجود کو آتش نمرود کے سپرد کرنا ہو، ہجرت کی صعوبتیں ہوں، وادی غیر ذی زرع میں بیوی اور بچے کو بلکتا ہوا چھوڑنا ہو یا جگر کے ٹکڑے پر چھری پھیرنی ہو، غرض ابراہیمؑ جہاں اترے کامیاب اترے۔ محبت کے امتحان میں پورا اتر جانا زندگی کا حاصل ہے اور اس کامیابی کی سند خود باری تعالیٰ نے ابراہیمؑ کو مندرجہ بالا آیت میں عطا فرمائی۔ اس کامیابی کا انعام سورۂ بقرہ کی ۱۲۴ ویں آیت کی صورت میں عطا ہوتا ہے اور لوگوں کی امامت کا تاج سر پہ رکھا جاتا ہے اور پھر اس اعزاز و اکرام کی تکمیل سورۂ نساء کی ۱۲۵ ویں آیت میں ہوتی ہے۔ جہاں اللہ تعالیٰ انھیں اپنا خلیل بناتا ہے

اقبال کے آئینہ کلام میں بھی ابراہیم کا یہی قرآنی عکس ہے۔ وہ عشق، استقامت، اطاعت، بت شکنی اور تعمیر کی علامت ہیں۔ جگرؔ کا ایک شعر جو زبان زد خاص و عام ہے۔

یہ عشق نہیں آساں بس اتنا سمجھ لیجے ‌ ‌ اک آگ کا دریا ہے اور ڈوب کے جانا ہے

شاید جگرؔ کے یہاں ہجر و فراق کے درد و کرب کو آگ کا دریا کہہ دیا گیا ہے۔ لیکن ابراہیم

---

[1] **معارف**: اس آیت اور بعض دوسری آیتوں کا مفہوم محل نظر ہے، یہاں توفیہ کا صیغہ آیا ہے نہ کہ وفا کا، پھر بعد کی آیات، اَنْ لَّا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰی الخ کو بھی پیش نظر رکھنا چاہیے تھا۔

اس کیفیت سے جسمانی طور سے گذرے تھے۔ ان کا عشق آتش نمرود میں بے خطر اس لیے کود پڑا تھا کہ وہ اللہ مستی اور خود گزینی کی اس آخری منزل تک پہنچ چکے تھے جس کو یقین کہتے ہیں:

یقیں مثل خلیل آتش نشینی　　یقیں اللہ مستی، خود گزینی

و بت شکنی کی علامت ہیں کہ انھوں نے کار نبوت کی ابتدا ہی صنم خانہ کو ڈھا کر کی تھی:

صنم کدہ ہے جہاں اور مرد حق ہے خلیل　　یہ نکتہ وہ ہے جو پوشیدہ لاالہ میں ہے

بت شکنی کا دوسرا پہلو اللہ کے گھر کی تعمیر ہے۔ انھوں نے جس کام کی ابتدا بتوں کو توڑ کر کی تھی اس کی تکمیل بیت اللہ کی تعمیر میں کی۔ ابراہیم اللہ کے معمار تھے۔ سجدۂ شوق کی ادائگی کے لیے جن در و دیوار کو انھوں نے اٹھایا تھا وہ ابد تک کے لیے عالم انسانیت کی جبین نیاز کی سجدہ گاہ اور بے تاب و بے قرار دلوں کی آرزوؤں کا مرکز بن گیا۔ اقبال ابراہیم کا ذکر ایک معمار کی حیثیت سے اس لیے کرتے ہیں کہ وہ مسلمانوں سے جو انہی ابراہیم کے پیرو ہیں، انہی صفات کے طالب ہیں:

حنا بند عروس لالہ ہے خون جگر تیرا　　تری نسبت براہیمی ہے معمار جہاں تو ہے

(۳) **موسیٰ**: اللہ تعالیٰ کے ایک اور جلیل القدر نبی حضرت موسیٰؑ تھے۔ قرآن میں ان کا ذکر یا نام ایک سو چھتیس (۱۳۶) بار آیا ہے۔ یہ بھی ایک اعزاز ہے۔ موسیٰ ابراہیم ہی کے خانوادہ سے تھے۔ اگرچہ دونوں کے درمیان صدیوں کا فاصلہ تھا۔ قرآن کے مطالعہ سے ذہن میں جو اس پیغمبر کی تصویر بنتی ہے وہ اپنے برگزیدہ جد امجد سے قدرے مختلف ہے۔ ایک قبطی کا قتل (سورۃ القصص) الواح کا پھینک دینا (سورۂ اعراف) بھائی کی داڑھی سے پکڑ لینا (سورۂ طٰہٰ) ایک جلالی شخص کی تصویر کشی کرتا ہے۔ ان کی اس لاٹھی کو اللہ نے اپنی نشانی قرار دیا جس سے وہ اپنی بھیڑوں کو ہانکتے تھے اور درخت سے پتیاں گراتے تھے۔

ں لاٹھی کو وہ فرعون کے دربار میں اللہ تعالیٰ کی نشانی کے طور پر پیش کرتے ہیں اور یہی
ںا جادوگروں کو شکست دیتا ہے اور سمندر میں راستہ پیدا کرتا ہے لیکن عصائے موسیٰ
وب کلیم جادوگر کی وہ چھڑی نہیں جس سے عام لوگوں کی نظروں کو دھوکا دیا جاتا ہے
رافعی پیدا کیے جاتے ہیں بلکہ ہر باطل اور کفر کے مقابلہ میں حق کی وہ قوت ہے جس سے
انپوں کا سر کچلا جاتا ہے۔ موسیٰ کا عصا اقبال کے یہاں اسلام کی مسلح قوت کی نمائندگی
رتا ہے :

تازہ پھر دانش حاضر نے کیا سحر قدیم گذر اس عہد میں ممکن نہیں بے چوب کلیم

یہ سحر قدیم دہی دور جاہلیت کے افکار و نظریات ہیں جو اس بظاہر ترقی یافتہ دور
ں پھر سے سر اٹھا رہے ہیں۔ وہ باطل قوتیں جنھیں اسلام کی روشنی سے ضد اور جن کی
اندہی و وضاحت مولانا مودودی نے اپنی کتاب تجدید و احیائے دین میں کی ہے فی زمانہ
ن کے مقابلے کے لیے چوب کلیم ہی کی ضرورت ہے ع لاکھ حکیم سر بجیب ایک کلیم سر بکف

عصائے موسیٰ ایک موثر EFFECTIVE اور جاری و ساری OPERATIONAL
لح قوت کی علامت ہے۔ اس کے بغیر رہنمائی ممکن نہیں۔

ں کے فاقوں سے ٹوٹا نہ برہمن کا طلسم عصا نہ ہو تو کلیمی ہے کار بے بنیاد

ریاست کی موجودگی اور دولت کی فراوانی کے باوجود کوئی بھی مسلم معاشرہ اس وقت
ت محفوظ نہیں ہے، جب تک اس کی قیادت کے پاس باطل کی قوت کو دبانے کے
ضرب کلیمی نہیں۔ اقبال کے کلام میں موسیٰ یا کلیم جب بھی استعمال ہوا ہے جرأت مندی،
ادری اور بے باکی کے پس منظر میں استعمال ہوا ہے۔

ں کی بڑھتی ہوئی بے باکی و بے تابی سے تازہ ہر عہد میں ہے قصہ فرعون و کلیم

مثل کلیم ہو اگر معرکہ آزما کوئی اب بھی درخت طور سے آتی ہے بانگ لاتخف

نظر آئی نہ مجھے قافلہ سالاروں میں وہ شبانی کہ ہے تمہید کلیم اللہی

(۴) ابلیس: ابلیس عامۃ الناس کے لیے اس کائنات کا سب سے ملعون فرد ہے جو ایک وقت معلوم تک اپنی نافرمانی کے باعث بارگاہ خداوندی کا معتوب اور ہر برائی اور شر کا ذمہ دار ہے لیکن فلسفہ اور تصوف نے ابلیس کو ایک اور شکل بھی دی ہے۔ کچھ صوفیہ کے نزدیک ابلیس کا سجدہ سے انکار نافرمانی یا استکبار کی وجہ سے نہیں بلکہ توحید پر اس کے پختہ ایمان کے باعث ہے، اس کے لیے یہ ناممکن تھا کہ وہ کسی مخلوق یا غیر اللہ کو سجدہ کرتا اور اسی لیے کسی صوفی نے کہا ہے کہ جو توحید شیطان سے نہیں سیکھتا وہ کافر ہے۔ لیکن منصور حلاج کے یہاں ابلیس موحد ہی نہیں بلکہ دنیا کے دو عظیم ترین موحدین میں سے ایک ہے۔ دوسرے موحد خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔ وہ اللہ تعالیٰ سے کہتا ہے کہ میری نافرمانی تو تیری ذات کی قدوسیت کا اعلان ہے۔ 'طواسین' کے اسی باب میں تھوڑا آگے چل کر منصور حلاج کوہ سینا کے ڈھلوانوں پر ابلیس اور حضرت موسیٰ کی ایک ملاقات کا ذکر کرتے ہیں جہاں دونوں کے سوال و جواب کے درمیان ابلیس اپنا یہی نقطہ نظر دہراتا ہے۔

اقبال کا ابلیس بھی عام مسلمانوں کے ابلیس سے مختلف ہے (مستشرقین نے اقبال کے فلسفۂ ابلیس پر کتابیں بھی تصنیف کر دی ہیں) یہ بحث فلسفہ اقبال سے تعلق رکھتی ہے کہ وہ کہاں تک صوفی احمد غزالی، منصور حلاج اور سنائی سے متاثر ہوئے۔ ہمارا مقصود صرف یہ بتانا ہے کہ اقبال کا ابلیس موحد ہو یا نہ ہو لیکن خودی کا علم بردار ضرور ہے۔ انکی نظم 'ابلیس و جبرئیل' ابلیس کے پورے کردار کی آئینہ دار ہے۔ اس کی یہ خودی شاید اللہ تعالیٰ کے یہاں بھی اتنی غیر پسندیدہ نہیں۔ اس لیے جب وہ بارگاہ خداوندی میں عرض

کرتا ہے کہ :

ہاں مگر تیری مشیت میں نہ تھا میرا سجود

تو فہمایشی انداز میں ارشاد ہوتا ہے کہ :

ظالم اپنے شعلہ سوزاں کو خود کہتا ہے دود

آدم کی تخلیق، سجدہ کا حکم اور ابلیس کا انکار۔ اس ساری کہانی کا نچوڑ ابلیس جبریل کو اس طرح سمجھاتا ہے :

آہ اے جبریل تو واقف نہیں اس راز سے کر گیا سرمست مجھکو ٹوٹ کر میرا سبو

میں کھٹکتا ہوں دل یزداں میں کانٹے کی طرح تو فقط اللہ ہو، اللہ ہو، اللہ ہو

عشق کی سنگلاخ وادی میں اقبال کے رہنما ابراہیم ہیں۔ زندگی کے خارزار میں انکا معیار موسیٰ ہیں، لیکن خودی و خودداری کی چوٹی پر ان کو ابلیس نظر آتا ہے۔

مذکورہ بالا چار الفاظ کے علاوہ کچھ اور قرآنی الفاظ بھی ہیں جنھیں اقبال نے اصطلاحاً استعمال کیا ہے جیسے کہ یقین، عجم یا عجمی اور بولہب وغیرہ وغیرہ۔ اقبال کے کلام کا یہ پہلو قرآن کے مطالعہ کی کثرت کا آئینہ دار ہے۔

ضمیمۂ انٹرنس کورس فارسی مرتبہ علامہ شبلیؒ

از ڈاکٹر ظفر الاسلام اصلاحی۔ علی گڑھ

معارف نومبر ۱۹۹۶ء میں ڈاکٹر سید لطیف حسین ادیب صاحب کا مضمون "انٹرنس کورس فارسی مرتبہ علامہ شبلیؒ" نظر سے گزرا۔ موصوف نے یہ مفید معلومات فراہم کرکے دکھایا ہے کہ درسی کتب کی ترتیب و تیاری میں بھی علامہ شبلی کی خدمات اظہر من الشمس ہیں۔ چند ماہ قبل ایک مضمون "مولانا شبلی اور علی گڑھ کی تیاری کے سلسلے میں جو سہ ماہی فکر و نظر کے علامہ شبلی نمبر (جون ۱۹۹۶ء) میں چھپ گیا ہے۔ مولانا آزاد لائبریری (مسلم یونیورسٹی علی گڑھ) میں الہ آباد یونیورسٹی کے لیے مولانا شبلی کی تیار کردہ بعض فارسی درسیات نظر سے گزری تھیں۔ انہی کے حوالہ سے یہاں کچھ باتیں مذکورہ بالا مضمون کے ضمیمہ کے طور پر عرض کرنا چاہتا ہوں۔

ڈاکٹر سید لطیف حسین صاحب کے بیان کے مطابق مضمون لکھتے وقت ان کے پیش نظر انٹرنس کورس فارسی طبع پنجم تھا۔ اس پر سنہ طباعت درج نہیں ہے، لیکن انہوں نے ۱۸۹۶ء کو طبع اول کا سنہ قرار دے کر طبع پنجم کو ۱۹۰۰ء بتایا ہے۔ حسن اتفاق سے مولانا آزاد لائبریری میں بھی علامہ شبلی کے مرتب کردہ انٹرنس کورس فارسی کا ایک مطبوعہ نسخہ دستیاب ہے جس کے ٹائیٹل کور پر یہ عبارت مرقوم ہے:۔

٭ انٹرنس کورس فارسی

مجوزہ سنڈیکٹ برائے امتحان ۱۹۰۰ء

مرتبہ جناب مولانا محمد شبلی صاحب نعمانی

المخاطب بہ شمس العلماء

پروفیسر مدرستہ العلوم علی گڑھ و فیلو آف یونیورسٹی الہ آباد

در مطبع العلوم علی گڑھ طبع شد

اس نسخہ میں بھی سنہ طباعت اور طبع نمبر کی صراحت نہیں ہے لیکن یہ ۱۹۰۰ء کے کورس کے لیے مجوزہ تھا، اس لیے کہا جا سکتا ہے کہ یہ ۱۹۰۰ء سے پہلے (اغلباً ۱۸۹۹ء میں) چھپا ہوگا اور مولانا شبلیؒ کے نام کے ساتھ "پروفیسر مدرستہ العلوم علی گڑھ" کے توصیفی لقب سے بھی یہی واضح ہوتا ہے کہ یہ علی گڑھ میں ان کے تدریسی خدمات کے دوران ہی شایع ہوا ہوگا۔ پیش نظر مضمون میں محولہ انٹرنس کورس فارسی مطبع فیض عام علی گڑھ سے چھپا تھا جب کہ مولانا آزاد لائبریری کے نسخہ پر مطبع العلوم علی گڑھ درج ہے۔ البتہ ٹائیٹل کی پشت پر جو اشتہار چھپا ہے اس کی عبارت دونوں نسخوں میں بالکل یکساں ہے لیکن ان دونوں نسخوں کے مشمولات میں ایک بڑا فرق یہ پایا جاتا ہے کہ ڈاکٹر صاحب کا محولہ نسخہ ۴۲ صفحات پر مشتمل ہے جس میں حصہ نثر و نظم دونوں شامل ہیں اور آخر میں "انتخاب از قواعد فارسی" کے عنوان سے انیس۱۹ صفحات کی ایک اور تحریر منسلک ہے، جب کہ مولانا آزاد لائبریری کا نسخہ صرف حصۂ نثر پر مشتمل ہے اور اس کے صفحات کی تعداد صرف ۹۶ ہے۔ مزید براں دونوں نسخوں کے حصۂ نثر کے مشمولات میں بھی کسی قدر فرق نظر آتا ہے، ڈاکٹر لطیف حسین ادیب صاحب نے مذکورہ کورس کے محتویات کی تفصیل بیان کرتے ہوئے باب دوم (انتخاب از سفرنامہ خسرو) کے تحت جو ذیلی سرخیاں درج کی ہیں ان میں "صفت شہر مصر" اور "صفت شہر مکہ" کے مابین علی گڑھ کے نسخہ میں دو ذیلی سرخیاں (صفت احوال سلطان، سیر سلطان) کا اضافہ ہے اور آخری سرخی

"صفت زمین عرب و یمن" کے بجائے علی گڑھ کے نسخہ میں "صفت زمین عرب و عجم" درج ہے۔ بہر حال دونوں نسخوں کے مشمولات پر بحیثیت مجموعی نظر ڈالنے سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ بعد میں اس کورس کے معیار کو مزید بلند کیا گیا ہے، علی گڑھ کے نسخہ کی قدامت اس سے بھی واضح ہوتی ہے کہ یہ سنہ ۱۹۰۱ء میں اسلامیہ اسکول اٹاوہ کے طالب علم محمد محسن کے زیر درس رہا ہے جیسا کہ اس کے اندر پہلے صفحہ پر ان کے نام وغیرہ کے اندراج سے ظاہر ہوتا ہے اور پیش نظر مضمون میں محولہ نسخہ سنہ ۱۹۱۱ء میں بریلی کے طالب علم سید عابد مہدی کے زیر مطالعہ تھا جیسا کہ فاضل مضمون نگار نے نشاندہی کی ہے۔

ڈاکٹر سید لطیف حسین صاحب نے حیات شبلی کے حوالہ سے یہ بھی فرمایا ہے کہ علامہ شبلیؒ نے الہ آباد یونیورسٹی کے لیے ایف۔اے اور بی۔اے کا فارسی کورس بھی تیار کیا تھا لیکن ان میں سے کسی کورس کی کاپی دستیاب نہ ہو سکی، یہاں اس کا ذکر اہمیت سے خالی نہ ہوگا کہ مولانا آزاد لائبریری میں مولانا شبلی کے مرتبہ انٹرمیڈیٹ کورس فارسی کا بھی ایک مطبوعہ نسخہ محفوظ ہے۔ اس کے ٹائٹل کور پر کتاب، مرتب کا نام اور باقی تفصیلات بایں الفاظ مندرج ہیں:

انٹرمیڈیٹ کورس فارسی

مجوزہ سنڈیکٹ الہ آباد یونیورسٹی

مرتبہ جناب مولانا محمد شبلی صاحب نعمانی

الملقب بہ شمس العلماء

پروفیسر مدرسۃ العلوم علی گڑھ، فیلو آف یونیورسٹی الہ آباد۔

در مطبع العلوم علی گڑھ باہتمام سید اصغر علی طبع شد

سنہ ۱۸۹۰ء

۱۹۰۵ء کے مطبوعہ اس نسخہ پر طبع نمبر کی صراحت نہیں ہے، لیکن قرین قیاس یہی معلوم ہوتا ہے کہ یہ طبع اول ہے۔ یہ انٹرمیڈیٹ کورس ۲۰۲ صفحات پر مشتمل ہے اور آخر میں پانچ صفحات کا صحت نامہ اغلاط بھی منسلک ہے۔ یہ کورس حصہ نثر و نظم پر مشتمل ہے اور پھر ہر حصہ ۶،۶ ابواب میں منقسم ہے۔ ان کے علاوہ آخر میں ۳۵ صفحات پر مشتمل "انتخاب از مخزن الفوائد" بھی شامل ہے جس میں شعر و شاعری کی کیفیت و فضیلت، شعر کے اقسام اور معائب و محاسن سے بحث کی گئی ہے، دلچسپ بات یہ بھی ہے کہ انٹرمیڈیٹ کورس فارسی کا انداز ترتیب بھی وہی ہے جو انٹرنس کورس کا ہے، فرق صرف معیار یا اختصار و تفصیل کا ہے، انٹرمیڈیٹ کورس فارسی کا پیش نظر نسخہ الہ آباد کے خان بہادر ابو محمد کے زیر مطالعہ رہا ہے اور انہی کے ذاتی ذخیرۂ کتب سے مولانا آزاد لائبریری کے لیے بقیمت حاصل کیا گیا تھا جیسا کہ ڈپٹی لائبریرین و اورینٹل ڈویژن کے موجودہ سربراہ ڈاکٹر ضیاء الدین انصاری صاحب نے بتایا۔

مختصر یہ کہ علی گڑھ قیام کے دوران علامہ شبلی کی علمی مصروفیات میں ایم اے او کالج اور الہ آباد یونیورسٹی کے مختلف مضامین کی درسیات کی تیاری بھی شامل تھی حیدرآباد اور ندوۃ العلماء میں بھی انہوں نے اس نوع کی خدمت انجام دی ہے۔ تعلیم و تدریس کے میدان میں علامہ شبلی کی یہ خدمات بھی بڑی وقعت رکھتی ہیں، انکی مرتب کردہ درسیات کا تفصیلی مطالعہ و تجزیہ اہمیت و افادیت سے خالی نہ ہوگا۔ ڈاکٹر سید لطیف حسین صاحب کے مذکورہ مضمون کی روشنی میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ وہ بخوبی اس خدمت کو انجام دے سکتے ہیں۔

ہندوستان میں عربی سیرت نگاری

از جناب توقیر احمد اعظمی ندوی۔ علی گڑھ

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے والہانہ عشق و شیفتگی کے جذبات دنیا کے ہر مسلمان کے دل میں موجزن ہیں اس کی وجہ سے ہر ہر زبان میں اور ہر ہر خطے کے لوگوں نے آپ کے حالات مبارکہ پر منظوم و منثور کتابیں لکھی ہیں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت عرب میں ہوئی تھی اس لیے آپ کی سیرت مبارکہ پر سب سے زیادہ کتابیں عربی زبان ہی میں لکھی گئی ہیں اور اب بھی اس زبان میں سیرت کی کتابوں کی تالیف کا سلسلہ جاری ہے جو انشاء اللہ غیر منقطع رہے گا،

سرزمین ہند بھی عربی زبان کے فیوض سے محروم نہیں رہی اور یہاں کے علماء کا حصہ عربی زبان و ادب اور اسلامی علوم و فنون کی خدمت میں کسی اسلامی ملک سے کم نہیں ہے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات گرامی سے والہانہ تعلق کی بنا پر سیرت نبوی بھی یہاں کے اہل علم کے مطالعہ و تحقیق اور بحث و نظر کا خاص موضوع رہا ہے، ذیل میں عربی میں سیرت کے ہونے والے ہندوستانی سرمایہ کا مختصر جائزہ پیش کیا جاتا ہے۔

موجودہ تحقیقات کے مطابق ہندوستان میں اولین عربی سیرت نگار ابو معشر نجیح بن عبدالرحمٰن (م ۱۷۰ھ) تھے، انہوں نے دوسرے اسلامی دیار و امصار کے علاوہ شہر نبوی مدینہ منورہ اور مرکز خلافت بغداد میں سیرت کا درس دیا تھا اور انہوں نے مغازی پر ایک کتاب بھی تصنیف کی تھی لیکن افسوس کہ وہ بادحوادث کی نذر ہوگئی تاہم اسکے

متفرق اجزا سیرت نبوی کے دوسرے مصادر جیسے ابن کثیر کی "السیرۃ النبویہ" طبقات ابن سعد اور تاریخ طبری وغیرہ میں بکھرے ہوئے ملتے ہیں، بقول فواد سیزگین ان کی کتاب مکمل حیات نبوی پر مشتمل تھی[۱]

لیکن اس کے بعد کئی صدی تک فن سیرت کی جانب زیادہ اعتنا نہیں کیا جا سکا، گو آٹھویں صدی عیسوی کے آغاز میں سندھ پر عربوں کے قبضہ کے بعد اگرچہ مسلمانوں کا غلبہ مختلف علاقوں اور خطوں میں برقرار رہا تاہم سیاسی افراتفری اور حکومت کے عدم استحکام کی وجہ سے علمی و ثقافتی سرگرمیاں برگ و بار نہ لا سکیں۔ دسویں صدی کے اوائل میں غزنوی سلطنت نے سیاسی استحکام کی راہ ضرور ہموار کی مگر یہ بھی مستحکم اور پائدار ثابت نہیں ہوئی۔ اس لیے عملاً تیرہویں صدی تک سرزمین ہند میں اسلامی تہذیب کو برگ و بار لانے کا موقع نہ ملا، جس کے بغیر علمی ترقی ناممکن تھی۔

جب تیرہویں صدی عیسوی میں ہندوستان میں دہلی سلطنت کا قیام ہوا تو اسلامی تہذیب عربی قالب کے بجائے عجمی بالخصوص ایرانی لباس میں جلوہ گر ہوئی اور عہد مغلیہ میں تو فارسی تو زبان و تہذیب بام عروج تک پہنچی، اس کے نتیجہ میں عربی زبان کی حیثیت محض ثانوی زبان کی رہ گئی، اس کی وجہ سے عربی زبان کے ساتھ عربی علوم سے اعتنا میں بھی کمی آئی، اس صورت میں سیرت نگاری کا عدم ارتقا فطری امر تھا[۲] اسی لیے اس دور میں بعض نعتیہ و مدحیہ قصائد کے علاوہ کسی مکمل تصنیف کا سراغ نہیں لگتا۔

گو اس سلسلہ میں پیش رفت سست رہی چنانچہ مکمل تصنیف کے ذکر سے تاریخ کے صفحات خالی ہیں تاہم دسویں صدی میں سیرت کی جن وقیع کتابوں کا ذکر ملتا ہے ان میں عمر بن بحرق حضرمی (م ۹۳۰ھ) کی الحضرۃ الاحمدیہ بسیرۃ الحضرۃ النبویۃ الاحمدیہ[۳]

اور ملا عبد النبی اور شیخ زین الدین علی ملیباری (م ۹۲۸ھ) کی نامعلوم الاسم کتابیں ہیں۔ سیرت کی ان مکمل کتابوں کے علاوہ اس صدی میں چند شمائل و قصائد وغیرہ کا بھی ذکر ملتا ہے[۴]۔

گیارہویں صدی میں عربی سیرت نگاری پر خاصا کام ہوا، جس کی ایک اہم خصوصیت یہ ہے کہ پورے عہد نبوی پر محیط، مختصر و بسیط سیریں لکھی گئیں اور محض شروح و حواشی و تراجم یا قصائد مدح و نعت پر اکتفا نہیں کیا گیا ہے[۵]۔ اس عہد کے ایک سیرت نگار یعقوب بن حسن کشمیری (م ۱۰۰۳ھ) کے حالات زندگی سے اندازہ ہوتا ہے کہ انھوں نے مغازی پر ایک کتاب یا اس کی شرح لکھی تھی، منور بن عبد الحمید نے قصیدہ بردہ کی شرح لکھی تھی لیکن اس صدی کے دو اہم سیرت نگار محمد بن فضل اللہ برہانپوری (م ۱۰۲۹ھ) اور عبد القادر حضرمی (م ۱۰۳۸ھ) ہیں، جنھوں نے سیرت نبوی کے موضوع پر متعدد کتابیں یادگار چھوڑی ہیں، اول الذکر نے کم از کم پانچ کتابیں سیرت کے مختلف پہلوؤں پر مرتب کیں اور موخر الذکر نے الحدائق الحضرۃ فی سیرۃ النبی واصحابہ العشرۃ، المنتخب المصطفی فی اخبار مولد المصطفی اور المنہاج الی معرفۃ المعراج وغیرہ[۶] جیسی کتابیں یادگار چھوڑی ہیں، ان کے علاوہ ہندوستان میں علم حدیث کی اولین و ممتاز ترین شخصیت مولانا عبد الحق محدث دہلوی نے شمائل کے موضوع پر "مطلع الانوار فی الحلیۃ الجلیۃ النبویۃ" لکھی۔

بارہویں صدی میں خلاف توقع بہت زیادہ پیش رفت نظر نہیں آتی ہے، حکیم محمد اکبر دہلوی (م ۱۱۶۰ھ) نے تلخیص الطب النبوی اور شیخ سعد اللہ سلونی (م ۱۱۳۰ھ) نے تحفۃ الرسول کے نام سے سیرت نبوی یا اس کے کسی پہلو پر کتاب لکھی، اس کے علاوہ اس صدی میں کچھ نئے پہلوؤں پر بھی روشنی ڈالی گئی۔ حواشی و شروحات و

قصائد بھی کہے گئے لیکن اس صدی میں سیرت کی واحد مکمل تصنیف مولانا ہاشم سندھی (م ۱۱۷۳ھ) کی بذل القوۃ فی سنی النبوۃ ہے جو خوش قسمتی سے محفوظ رہی اور اب دستیاب ہے، اس کو ہندوستان میں عربی سیرت نگاری کی کامل و اولین تصنیف قرار دیا جا سکتا ہے جو ہم تک پہنچی ہے، اس کے علاوہ ایک کتاب "حدیقۃ الصفا فی اسماء المصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم" کا پتہ چلتا ہے، جس کی شرح فارسی میں وسیلۃ الفقیر بشرح اسماء الرسول البشیر کے نام سے لکھی گئی، اس کتاب میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے قریباً ۱۲۸۱ اسماء بیان کیے گئے ہیں، ان کتابوں کے علاوہ السیف الجلی علی ساب النبی صلی اللہ علیہ وسلم، رسالۃ فی ان ساب النبی صلی اللہ علیہ وسلم، ان اسلم لا یسقط عنه القتل ولو کان کافرا اصلیا، بسط البردۃ لمزی ناظم البردہ، النور المبین فی جمع اسماء البدریین، فتح العلی فی حوادث سنی نبوۃ النبی اور حلاوۃ الفم بذکر جوامع الکلم وغیرہ بھی لکھی گئیں اور تقریباً آٹھ قصائد بھی آپ کی شان میں کہے گئے۔[۳۶]

تیرہویں صدی ہجری میں ہمیں سیرت نبوی کے مختلف گوشوں پر کافی مواد ملتا ہے لیکن یہ حقیقت ہے کہ عربی میں مکمل کتب سیرت کم لکھی گئیں، اس کی ایک وجہ فارسی اور اردو کی روز افزوں مقبولیت اور عربی زبان کا محدود دائرہ بھی ہے۔

اس صدی میں عربی کی کتب سیرت میں قاضی عیاض کی شفاء، خطیب کی مشکوۃ اور قسطلانی کی مواہب کی تلخیص اور صوفیانہ نقطہ نظر کی حامل التنبیہات النبویہ فی سلوک الطریقۃ المصطفویۃ مولف مولانا ولی اللہ سورتی (م ۱۲۴۲ھ) کے علاوہ سید مرتضیٰ بلگرامی (م ۱۲۰۵ھ) صاحب تاج العروس کی العقد المنظم

فی امہات النبی اور مولانا کرامت علی کی السیرۃ العطرۃ محمد خاتم الرسل وغیرہ ہیں، موخر الذکر کتاب بقول ڈاکٹر زبید احمد اس دور کی سب سے قابل ذکر سیرت ہے جو ضعیف روایات سے خالی ہے اگرچہ اس میں نقد و بحث کم ہے[۹]، اس کے متعلق ڈاکٹر منجد کا خیال ہے کہ یہ سیرت حلبیہ کی تلخیص ہے[۱۰]۔ یہ کتاب ۱۸۵۷ء کے انقلاب کے بعد لکھی گئی تھی، اس کا موجودہ ایڈیشن بمبئی سے ۱۹۷۰ء میں شایع ہوا ہے۔

چودھویں صدی کو ہم عربی سیرت نگاری کا دور عروج قرار دے سکتے ہیں، اس صدی میں کئی کتابیں منصۂ شہود پر آئیں، متعدد کتابوں کا عربی میں ترجمہ ہوا، اس دور کی کتب سیرت میں مولانا ابوبکر بن محمد جونپوری (م ۱۳۵۹ھ) کی سیرت الرسول، شیخ احمد بن صبغۃ اللہ مدراسی کی تاریخ احمد قابل ذکر ہیں، عبدالرحیم دہلوی (م ۱۳۲۶ھ) نے سیرت ابن ہشام کے اشعار کو مرتب ہی نہیں کیا بلکہ اس کے نامکمل قصائد کو بھی مکمل کیا[۱۱]، محمد عبدالواحد غازیپوری کی تحفۃ الاتقیا، محمد عبدالمجید کی المرتجی بالقبول، محمد خیر اللہ کی خیر الحقائق، محمد بن سعید کی الفتوحات الاحمدیۃ اور خلاصۃ سیر سید البشر اور غلام احمد کی سیر البشر وغیرہ بھی ہیں[۱۲]، جو سیرت کے مختلف گوشوں سے متعلق ہیں، اس دور میں ہندوستان کے محققین نے سیرت و دلائلِ نبوت کی بعض قدیم کتابوں کو شایع کرنے کا مفید کام بھی انجام دیا۔

ماضی قریب میں ہندوستان کے اہل علم و فضل نے سیرت نگاری پر خاص توجہ کی ہے، اور اس فن کی بعض اہم کتابوں کو تحقیق و تدوین کے ساتھ شایع کیا، ان میں مشہور محقق و فاضل ڈاکٹر محمد حمید اللہ کا نام خاص طور پر قابل ذکر ہے، جنھوں نے سیرت ابن اسحق کو شایع کیا احادیث کے قدیم ترین مجموعہ صحیفہ وہب بن منبہ کے علاوہ بلاذری کی انساب الاشراف

کی پہلی جلد جو سیرت نبوی پر مشتمل ہے، اس کی اشاعت کا فخر بھی ان کو حاصل ہے، ڈاکٹر مصطفیٰ اعظمی کا نام بھی اہمیت کا حامل ہے، انھوں نے مغازی عروۃ بن زبیر کو اپنی تحقیق کے ساتھ شایع کیا، اس کے متعلق کہا جاتا ہے کہ سیرت کی اولین تصنیف ہے، اسی طرح مولانا محمد بن ابراہیم مدرس مدرسہ محمدیہ دہلی نے محب الطبری کی خلاصۃ السیر کو اپنی تعلیقات کے ساتھ پیش کیا۔

لیکن سیرت کے اس سرمایہ میں بڑی بلند پایہ اور بہترین تصنیف مولانا سید ابوالحسن علی ندوی مدظلہ کی "السیرۃ النبویۃ" ہے جس کو برصغیر کی عربی سیرت نگاری کا لعل بے بہا کہا جا سکتا ہے۔ یہ زبان کی سلاست، اسلوب کی دلکشی اور دعوتی انداز بیان کے لحاظ سے بھی نہایت اچھی کتاب ہے جو اپنی گوناگوں خصوصیات کی وجہ سے بہت مقبول ہوئی خصوصاً عرب دنیا میں اس کی بڑی پذیرائی ہوئی، اب تک اس کے تقریباً ۲۳ ایڈیشن شایع ہو چکے ہیں، کتاب کی مقبولیت اور افادیت کے پیش نظر متعدد زبانوں میں اس کا ترجمہ بھی کیا گیا ہے اور یہ ترجمے بھی بہت مقبول ہوئے۔ مغز و مواد کے لحاظ سے بھی یہ وقیع اور اہم ہے، بالخصوص اس کا پہلا باب بہت مفید اور قیمتی ہے، اس میں عہد جاہلیت کے عرب ہی نہیں اس وقت کے عالم انسانیت کے منظر کو بھی پیش کرتا ہے، جامعیت و تفصیل کے لحاظ سے اسکو غالباً سب سے پہلی بار سیرت نبوی کا ایک حصہ بنا کر پیش کیا گیا ہے جس سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کی اہمیت کا اندازہ ہوتا ہے۔ گو قدماء کی کتب میں بھی عہد جاہلیت کی تصویر ملتی ہے لیکن وہ عموماً قریش مکہ اور عرب کے پس منظر تک محدود رہتی ہیں لیکن مولانا ندوی کی اس سیرت میں دنیا کے اور علاقوں اور تہذیبوں کا مطالعہ اس خوبی سے کیا گیا ہے کہ یہ بعثت جس قدر عرب کے لیے ضروری تھی اسی طرح پورے

عالم کے لیے ناگزیر تھی اور اس وقت اس قول حق کُنْتُمْ عَلٰی شَفَا حُفْرَۃٍ مِّنَ النَّارِ کی صداقت تاریخی اعتبار سے پوری طرح آشکار ہو جاتی ہے، بلاشبہ یہ باب اول جامع ترین ہے۔

ایک اور سیرت نگار مولانا صفی الرحمٰن مبارکپوری صاحب کی "الرحیق المختوم" بھی قابل ذکر ہے، ان کی یہ کتاب دراصل ایک عالمی مقابلہ سیرت نگاری کے لیے لکھی گئی تھی جو بیان کی ندرت، اسلوب کی حلاوت اور بحث و تحقیق کے اعلیٰ معیار کے باعث انعام اول کی مستحق ہوئی، اس کتاب کا اردو ترجمہ بھی شایع ہو چکا ہے۔

مولانا یوسف کاندھلوی صاحب کی حیاۃ الصحابہ سیرت کی کتاب نہیں ہے تاہم اس کی پہلی جلد میں سیرت نبوی پر کافی مواد موجود ہے۔

شیخ الحدیث مولانا محمد زکریاؒ کی کتاب "حجۃ الوداع وعمرات النبیؐ" میں سیرتِ نبوی کے ایک اہم پہلو کو بڑی تحقیق و تدقیق کے ساتھ واضح کیا گیا ہے۔

اس صدی میں اردو کی بعض اہم کتب سیرت کے عربی میں تراجم کیے گئے، جن میں علامہ شبلیؒ کی شہرۂ آفاق سیرۃ النبی بھی ہے، اس کے ترجمہ کی ذمہ داری ندوہ کے ایک فاضل مولانا اسمٰعیل مدراسی مرحوم نے لی تھی لیکن افسوس ان کی حیات شعلہ مستعجل ثابت ہوئی اور وہ اس کی تکمیل نہیں کر سکے، جانشین علامہ شبلیؒ مولانا سید سلیمان ندویؒ کے سیرت پر مشہور خطبوں "خطبات مدراس" کو "الرسالۃ المحمدیۃ" کے نام سے مولانا محمد ناظم ندوی نے عربی جامہ پہنایا، ایک اور مشہور مفسر محمد علی لاہوری کی کتاب محمد رسول اللہ کا عربی ترجمہ منیر بعلبکی نے کیا ہے، اس کے علاوہ مولانا قاضی سلیمان منصور پوری کی رحمۃ للعٰلمین کا بھی عربی ترجمہ ہو چکا ہے۔

عربی سیرت نگاری کے اس مختصر جائزہ سے ہندوستانی علماء و فضلاء کی کاوشوں کا
اندازہ ہوتا ہے لیکن یہ حقیقت ہے کہ علامہ شبلی اور سید سلیمان ندوی کی سیرۃ النبی اردو
جیسی عظیم الشان تالیف کے مانند عربی میں کوئی سیرت نہیں لکھی گئی[۱۳]۔

حواشی

[۱] فواد سیزگین : تاریخ التراث العربی، الهيئة المصرية العامة للكتب ۱۹۷۷ء جلد ۱ ص ۲۶۴
[۲] ڈاکٹر یٰسین مظہر : ہندوستان میں عربی سیرت نگاری ، تحقیقات اسلامی اکتوبر تا دسمبر ۱۹۸۴ء،
ص ۲۰۰، ۲۱۱ [۳] عبدالقادر حضرمی : النور السافر [۴] دیکھئے تحقیقات اسلامی، حوالہ سابق [۵]
ایضاً [۶] ایضاً [۷] ایضاً [۸] ایضاً [۹] ڈاکٹر زبید احمد، عربی ادبیات میں پاک و ہند کا حصہ [۱۰] مقدمہ
تحقیق بذل القوۃ [۱۱] ایضاً [۱۲] ایضاً [۱۳] ایضاً۔

فارم ۱۷

ڈیکھو رول نمبر ۸

معارف پریس اعظم گڈھ

نام مقام اشاعت	: دار المصنفین اعظم گڈھ	پتہ	: دار المصنفین اعظم گڈھ
نوعیت اشاعت	: ماہانہ	نام پبلیشر	: " " "
نام پرنٹر	: عتیق احمد	ایڈیٹر	: ضیاء الدین اصلاحی
قومیت	: ہندوستانی	قومیت	: ہندوستانی

نام و پتہ مالک رسالہ دار المصنفین

میں عتیق احمد تصدیق کرتا ہوں کہ جو معلومات اوپر دی گئی ہیں وہ میرے علم و یقین میں
صحیح ہیں۔ عتیق احمد۔

تلخیص و تبصرہ

بنی بویہ اور ان کی حکومت

"یہ پُر از معلومات مضمون مجلۃ التاریخ الاسلامی (نئی دہلی) میں شایع ہوا تھا، مولوی کلیم صفات اصلاحی ناظر کتبخانہ دار المصنفین نے قارئین معارف کے لیے اسکی تلخیص کی ہے" (ض)

بنی بویہ کے نسب کے بارے میں مورخین کا اختلاف ہے، بعض کا خیال ہے کہ یہ ساسانی بادشاہ بہرام بن یزدجرد کی اولاد ہیں اور کچھ لوگوں کا کہنا ہے کہ یہ بنی ضبہ کے وہ عربی قبائل تھے جو پہلے بلاد نجد کے شمالی حصے میں بود و باش رکھتے تھے، بعد میں بعض پڑوسی عربی قبائل سے جنگ وجدل کی وجہ سے ان لوگوں نے شہر دیلم کا رخ کیا اور وہیں آباد ہو گئے، لیکن یہ موخر الذکر روایت درست نہیں معلوم ہوتی، غالباً یہ ان کے عروج واقتدار کے زمانے میں ان کا فضل و منقبت ظاہر کرنے کے لیے وضع کی گئی ہوگی جیسا کہ یاقوت حموی نے بھی تصریح کی ہے، وہ لکھتا ہے:

"بویہی فرمانروا عضد الدولہ نے ۳۶۶ھ میں ابو اسحاق ابراہیم بن ہلال الصابی کو اس جرم میں قید کر دیا کہ وہ اس کے دشمن عز الدولہ بختیار کا میر منشی تھا۔ اس کی گرفتاری کے بعد بغداد کے کچھ امرا عضد الدولہ کے پاس آئے اور انھوں نے ابراہیم بن ہلال الصابی کی علمی جلالت و مرتبت، دیانت اور فرض شناسی کا حوالہ دے کر اس کی رہائی کا مطالبہ کیا، عضد الدولہ اس شرط پر آزاد کرنے کے لیے آمادہ ہوا کہ وہ بنی بویہ کی تاریخ اور ان کے فضائل و مناقب پر ایک کتاب تصنیف کرے چنانچہ اس نے "کتاب التاجی فی اخبار بنی بویہ" تالیف کی اور

جس میں بنو صنبہ سے بنو بویہ کے تعلق و انتساب کو ثابت کیا لیکن اس کتاب کی صداقت و استناد پر شبہ کیا گیا ہے، چنانچہ بعض تذکرہ نگاروں نے لکھا ہے کہ ابو اسحاق صابی کے کسی ساتھی نے قید خانے میں اس سے ملاقات کی تو وہ اسی کتاب کے مسودے کی ترتیب میں مصروف تھا جب ساتھی نے اس کی مشغولیت کے بارے میں دریافت کیا تو اس نے بتایا کہ "کچھ بے سروپا اور جھوٹی باتوں کی ترتیب و تالیف کر رہا ہوں"۔

البیرونی کو بھی بنی بویہ کے حسب و نسب کا صحیح علم نہ ہو سکا، اس کی تصریح کے مطابق ساسانی بادشاہ بہرام گور یا عربی النسل بہرام بن ضحاک بن ابیض بن معاویہ بن دیلم بن باسل بن صنبہ سے ان کا نسبی تعلق ہے۔

درحقیقت ان کے حکومت و اقتدار کے حصول کے بعد ہی نسب وضع کیا گیا ہے، بویہی خاندان کا سب سے پہلا شخص جس کا ذکر تاریخ میں ملتا ہے ابو الشجاع بویہ بن فنا خسرو ہے جس کے تین بیٹے تھے، علی، حسن اور احمد اور انہی تینوں بھائیوں سے بویہی خاندان کا سلسلہ چلا۔ ابو الشجاع ایک دیلمی قبیلہ کا سردار تھا۔ اس کے بارہ میں ایک روایت یہ بھی ہے کہ وہ ابتداً سامانیوں سے متوسل تھا پھر ۳۱۶ھ / ۹۲۸ء میں ایک جماعت کے ساتھ دیلمی قائد مرداویج بن زیار کے لشکر میں شامل ہو گیا جو زیاری حکومت کا بانی تھا۔ ایک روایت یہ ہے جو بوجوہ قابل ترجیح بھی ہے کہ ابو الشجاع بویہ ایک غریب ملاح و ماہی گیر تھا جو بحر قزوین کے ساحل پر مچھلیوں کا شکار کرتا تھا۔

غرض اسی بویہ بن فنا خسرو سے اس خاندان کا انتساب ہوا، بعض مورخین نے یہ بھی لکھا ہے کہ بویہ اور اس کے تینوں بیٹے بڑی عسرت اور تنگدستی کی زندگی بسر کر رہے تھے کہ اتفاقاً ایک دن ان کی ملاقات ایک نجومی سے ہو گئی، اس نے پیشین گوئی کی کہ وہ ایک وسیع و عریض سلطنت اور بڑے مال و دولت کے مالک ہوں گے مگر اس وقت باپ اور بیٹوں

نے اسے مذاق پر محمول کیا۔

بنی بویہ کی شہرت بویہ کے بڑے فرزند علی بن بویہ کے ذریعے ہوئی وہ اور اس کا بھائی حسن بن بویہ زیدیہ حکومت میں فوجی ملازم تھے۔ اس سلطنت کا رقبہ طبرستان اور دیلم تک تھا۔ ۳۱۲ھ میں علی بن بویہ زیدیہ حکومت کے ایک بڑے افسر ماکان بن کالی کے ظلم و جبر سے تنگ آکر سامانی امیر نصر بن احمد سے جا ملا۔

سیاسی اضطراب اور اقتصادی بحران کے عہد میں عموماً فوجیوں کی خدمات مشکوک ہوتی ہیں اور وہ وفاداری اور سچی خیرخواہی کے بجائے اپنے ذاتی فائدوں اور مال و دولت سے سروکار رکھتے ہیں چنانچہ یہی وجہ ہے کہ علی بن بویہ چوتھی صدی ہجری کے اوائل میں ماکان بن کالی کے ہمرکاب نظر آتا ہے جو اس وقت ایک دوسرے دیلمی سردار مرداویج بن زیار کے ساتھ برسرپیکار تھا۔ لیکن جب بنو بویہ نے مرداویج بن زیار کا پلہ بھاری دیکھا تو وہ ماکان کو چھوڑ کر سپہ سالاروں کی ایک جماعت کے ساتھ مرداویج سے مل گیا۔ مرداویج نے ان کا خیر مقدم کیا اور نہایت عزت و تکریم کی اور ان تمام سرداروں کو عراق عجم میں اپنے مفتوحہ پہاڑی علاقوں کے ایک ایک شہر کا حکمراں نامزد کیا۔ اس طرح علی بن بویہ کے حصے میں شہر کرج آیا، مگر مرداویج کو حکم نامہ جاری کرنے کے فوراً بعد یہ احساس ہوا کہ اس نے ان سپہ سالاروں کی تقرری میں عجلت سے کام لیا ہے، کیونکہ کل تک جو اس کے دشمن کی فوج میں شامل تھے ان سے کیا بعید ہے کہ وہ اس کے خلاف بھی بغاوت نہ کریں گے، چنانچہ اس نے اپنے بھائی وشمگیر ابن زیار کو جو رے میں اس کا نائب تھا اور اسی سے ان تمام سرداروں کو اپنے شہروں کا پروانہ لینا تھا فوراً ایک خط لکھا کہ جو سپہ سالار تمہارے پاس پہونچے ہیں ان کی تقرری منسوخ کر دو اور اگر ان میں سے کسی نے اپنے شہر کا انتظام اپنے ہاتھ میں لے لیا ہو تو اس کو

چھوڑ کر باقی دوسروں کو انتظامی عہدوں سے الگ رکھو۔

وشمکیر بن زیار کے پاس بھیجے جانے والے خطوط ضابطہ کے مطابق پہلے اس کے وزیر حسین بن محمد ملقب بالعمید کے ہاتھ لگتے تھے جن کو پڑھنے کے بعد وہ وشمکیر کی خدمت میں پیش کرتا تھا، عمید کے علی بن بویہ سے گہرے مراسم تھے اس لیے جب مرداویج کا یہ خط اس نے پڑھا تو چپکے سے علی بن بویہ کے پاس جاکر اس خط کے مضمون سے اسے باخبر کر دیا اور مشورہ دیا کہ وہ فوراً شہر کرج جاکر اپنے منصب کو سنبھال لے تاکہ وشمکیر اس کی تقرری کو منسوخ نہ کر سکے، علی بن بویہ اس کے مشورے کے مطابق کرج چلا گیا اور اپنا منصب بھی سنبھال لیا، دوسرے روز وزیر عمید نے وشمکیر کی خدمت میں اسکے بھائی مرداویج کا خط پیش کیا چنانچہ اس نے اس کی ہدایت کے مطابق سپہ سالاروں کی تقرریاں منسوخ کر دیں مگر علی بن بویہ کی تقرری بحال رہی اور اسی کے نتیجے میں بالآخر دولت بویہ کا قیام عمل میں آیا۔

مسکویہ کی روایت کے مطابق علی بن بویہ اور عمید کے مابین دوستی کا آغاز اس طرح ہوا تھا کہ ایک روز علی بن بویہ کو پیسوں کی سخت ضرورت تھی اس لیے وہ اپنے ایک خوبصورت خچر کو بازار میں فروخت کے لیے لے گیا، اتفاق سے عمید کو ایک خچر کی ضرورت تھی جس کی خریداری کے لیے اس نے اپنا ایک آدمی بازار بھیجا تھا، علی بن بویہ کو اس کا پتہ چلا تو وہ خود ہی اپنا خچر لے کر عمید کے پاس پہونچا اور بلا قیمت اسے ہدیہ کر دیا، اس ہدیہ کے نتیجے میں عمید نے علی کو کرج کی حکمرانی کے حصول میں مدد دی، یہ علاقہ ہمدان کے جنوب مشرق میں واقع تھا علی بن بویہ حکمراں ہونے کے بعد اپنی حکومت کے دائرے کو وسیع کرنے میں مصروف ہو گیا، وہ خود لشکر کی قیادت کرتا اور اس نے خورمیوں کے زیر نگیں متعدد قلعے فتح کرلیے

اور کافی مال و متاع حاصل کیا، اس کے ذریعے وہ عام لوگوں کو اپنا گرویدہ بنانے لگا۔

کرج میں علی بن بویہ کی مقبولیت اور اعزاز مرداویج ابن زیار کو ناگوار گزرا۔ چنانچہ اس نے علی کو کرج کی حکمرانی سے ہٹانے کے لیے یہ تدبیر اختیار کی کہ وہاں بڑی تعداد میں اپنے ان فوجیوں کو روانہ کیا جن کی بیش قرار تنخواہیں تھیں تاکہ وہ جنگ وجدال کے بغیر ہی علی بن بویہ کے خلاف بغاوت اور انقلاب برپا کردیں کہ علی ان کے اخراجات خاطر خواہ برداشت نہ کرسکے اور نتیجتاً یہ فوج اس کے خلاف بغاوت کر بیٹھے اس وقت اس پر حملہ موزوں رہے گا، لیکن صورت حال وہاں اس کے برعکس ہوئی۔

علی بن بویہ نے ان فوجیوں کا پُر تپاک خیر مقدم کیا اور ان کے ساتھ ایسا برتاؤ کیا کہ وہ اس کے مطیع ہوگئے، جب مرداویج کو یہ پتہ چلا کہ علی نے ان فوجیوں کی ہمدردی حاصل کرلی ہے تو اس کو اپنے طریقۂ کار پر افسوس ہوا اور اس نے خط لکھ کر انہیں واپس آنے کا حکم دیا مگر علی بن بویہ نے ان کو مرداویج کے خلاف برانگیختہ کرکے اس کا منصوبہ ناکام بنا دیا، چنانچہ تمام فوجی اسی کے پاس خوشی اور اطمینان سے رہ گئے۔

رفتہ رفتہ علی بن بویہ اتنا مضبوط ہوگیا کہ وہ مرداویج کے مقابلہ میں صف آرا ہوسکے جس کی جانب سے بنو بویہ کی مخالفت کا اظہار ہوتا رہتا تھا۔ علی نے ان سے لڑنے کے لیے اپنی فوج بھی تیار کرلی تھی لیکن مرداویج فوجوں کی تعداد اور اسلحہ دونوں میں اس سے فائق تھا، اس لیے ان کا مقابلہ اس کے لیے آسان نہیں تھا، اسی دوران وہ اپنی فوجیں لے کر کرج سے نکلا اور جنوبی جانب شہر اصفہان کا رخ کیا۔ اس وقت وہاں عباسی سردار ابوالفتح بن المظفر محمد بن یاقوت ایک لشکر سمیت موجود تھا جس میں تقریباً دس ہزار فوجیں تھیں، اسی کے ساتھ اصفہان کی مالگذاری اور بندوبست کا مہتمم ابوعلی بن رستم بھی وہاں تھا،

علی نے ان دونوں سے یہ خواہش ظاہر کی کہ وہ ان دونوں کے ساتھ مل کر خلیفۂ عباسی کا مطیع ہونا چاہتا ہے مگر ان دونوں نے اس کی درخواست رد کر دی، نتیجتاً دونوں جانب صف آرائی ہوئی اور ۳۲۱ھ میں علی بن بویہ کامراں ہوا، ابن اثیر نے اس فتح کا بنیادی سبب یہ بتایا ہے کہ وہ دیلمی فوجی جو لشکر خلافت میں تھے دوران معرکہ اپنی ہم وطن افواج یعنی علی بن بویہ سے آملے، بہرحال ایک چھوٹے سے لشکر کے ذریعہ جس کی تعداد ایک ہزار بھی نہیں تھی دس ہزار کے لشکر خلافت کو شکست دینا علی بن بویہ کا ایسا بڑا کارنامہ تھا جس نے اسے تمام لوگوں کا مرکز توجہ بنا دیا، اس سے اس کی بڑی شہرت بھی ہوئی اور اس کی حکومت بھی مزید مستحکم ہوئی۔

خلافت عباسیہ کی ناراضگی اور مرداویج کی قربت کی وجہ سے علی بن بویہ کے لیے اصفہان میں قیام کرنا خطرناک تھا اس لیے اسے زیر نگیں بنا کر وہ ارجان کی طرف چلا گیا جو ایران کے شمال مغرب میں شیراز سے ۱۲۰ میل کے فاصلے پر واقع تھا۔

ذی الحجہ ۳۲۱ھ میں وہ جنگ و جدال کے بغیر ہی ارجان پر قابض ہو گیا کیونکہ محمد بن یاقوت میں جو خلافت عباسیہ کی طرف سے وہاں کا والی تھا، اس کی اصفہان کے میدان جنگ میں شکست کھانے کے بعد اب بویہی افواج سے نبرد آزما ہونے کی ہمت نہیں تھی۔

علی ابن بویہ نے ارجان میں کچھ دنوں قیام کیا تاکہ فوج بھی آرام کر لے اور وہ مزید فتوحات حاصل کر سکے۔ مسکویہ کا بیان ہے کہ وہاں سے اس نے تقریباً بیس لاکھ درہم خراج میں وصول کیے اور اس کے علاوہ بھی بڑا مال و دولت حاصل کیا۔ جس سے اس کی طاقت میں غیر معمولی اضافہ ہوا۔ وہاں سے وہ نوبندجان پہنچا اور اس کے حکمراں کو شکست دے کر اس پر قابض ہوا۔ یہ بڑا شہر ارجان اور شیراز کے وسط میں تھا۔

اب علی بن بویہ کا حوصلہ اتنا بڑھا کہ وہ فارس کے پایۂ تخت شیراز پر حملے کے بارے میں سوچنے لگا، مگر اسے معلوم تھا کہ مرداویج بن زیاد ایک طرف اپنے بھائی وشمگیر سے اور دوسری طرف عباسی سپہ سالار یاقوت سے خط و کتابت کر رہا ہے اس لیے اسے اندیشہ ہوا کہ اگر سب مل کر اس کے خلاف حملہ آور ہوئے تو اس کے لیے کامیاب ہونا مشکل ہو سکتا ہے۔

چنانچہ وہ اپنا لشکر لے کر نوبندجان سے ایران کے پرانے مشہور شہر اصطخر پہونچا اور وہاں سے ایرانی شہر بیضا پہونچا جو شیراز سے ۲۴ میل پر تھا۔ اس اثنا میں عباسی سپہ سالار ایک فوج گراں لے کر اس کا تعاقب کرتا رہا۔ بالآخر، ۱ جمادی الآخر بروز منگل ۳۲۲ھ کو عباسی افواج اور علی بن بویہ کا آمنا سامنا ہوا، جنگ میں عباسی افواج کو شکست فاش ہوئی، اس فتح نے علی بن بویہ کے لیے شیراز کے راستے کھول دیئے، چنانچہ اس نے اس شہر کو اپنا پایۂ تخت بنایا۔

علی بن بویہ نے شیراز کے باشندوں کے ساتھ بڑے حسن سلوک کا معاملہ کیا، چنانچہ انہوں نے اس کے تئیں اطاعت و فرمانبرداری کا ثبوت دیا، جو لوگ اس کے ہاتھوں قید ہو گئے تھے ان کے ساتھ بھی اچھا برتاؤ کیا اور ان کو یہ اختیار دیا کہ اگر وہ چاہیں تو یاقوت کے یہاں جا سکتے ہیں اور چاہیں تو اس کے ساتھ ہی رہیں مگر انہوں نے اسی کے پاس رہنے کو ترجیح دی، چنانچہ اس کی افرادی قوت بہت بڑھ گئی اور ۳۲۵ھ میں اس کا دائرہ اقتدار فارس، ری، اصفہان اور بلاد جبل تک وسیع ہو گیا۔

علی بن بویہ کی یہ خواہش تھی کہ وہ اپنے مفتوحہ ممالک پر اپنے اقتدار کے لیے شرعی جواز فراہم کرے چنانچہ خلیفہ عباسی راضی باللہ کو اس مضمون کا خط لکھا کہ وہ خلافت کا مطیع ہے اور اپنے مفتوحہ ممالک کے لیے خلافت سے ضمانت چاہتا ہے اور اس کے بدلے میں وہ خزانۂ خلافت میں ۸۰ لاکھ درہم پیش کرنے کو تیار ہے، راضی باللہ علی بن بویہ کی

اس پیش کش پر راضی ہوگیا اور یحییٰ بن ابراہیم مالکی کے ہاتھوں خلعت، عہدنامہ اور علم خلافت بھیجا اور تاکید کی کہ یہ ساری چیزیں اسی وقت ابن بویہ کے حوالہ کی جائیں، جب وہ مطلوبہ مال اس کے حوالہ کردے اور یہ وعدہ کرے کہ وہ یہ رقم ہر سال ادا کرتا رہے گا مگر علی بن بویہ نے قاصد کے ساتھ دغا کی اور تحائف وصول کرنے کے بعد بھی مقررہ رقم حوالہ نہ کی مزید یہ کہ اس نے لوگوں کے سامنے خلیفہ عباسی کے عہد نامے کو پڑھ کر سنایا تاکہ عوام مطمئن ہوجائیں کہ اس کے اقتدار کو خلیفہ عباسی کی تائید حاصل ہے۔

بنی بویہ کے زیر تسلط جو علاقہ آچکا تھا وہ اسی پر قانع نہ رہے بلکہ عراق پر قبضے کے لیے طالع آزمائی کرنے لگے، اتفاق سے اس وقت بغداد کی حکمرانی کے لیے امیرالامراء اور اس کے حریفوں کے درمیان سخت جنگ چھڑی ہوئی تھی، چنانچہ اس معرکہ آرائی میں بنو بویہ کو اپنی آرزو کو شرمندۂ تکمیل کرنے کا اچھا موقع حاصل ہوا، ۳۲۶ھ میں وہ اہواز اور واسط پر قابض ہوگئے اور ۳۳۴ھ میں احمد بن بویہ کی قیادت میں بویہی لشکر نے عباسی پایۂ تخت بغداد کی جانب کوچ کیا، مورخ صولی کا بیان ہے کہ خلیفہ عباسی متقی باللہ نے بنو بویہ کی بغداد آنے کی دعوت اس وقت دی تھی جب امیرالامراء توزون سے ان کی کشمکش جاری تھی، چنانچہ بغداد میں داخلے کے وقت احمد بن بویہ لوگوں کو خلیفہ کا خط دکھاتا تھا جس کا ایک مقصد تو یہ تھا کہ لوگوں کی تائید اسے حاصل ہو اور دوسرا مقصد یہ بھی تھا کہ اس شہر پر ان کے قبضہ کو تسلیم کیا جائے۔

خلیفہ عباسی مستکفی باللہ نے بویہی لشکر کا خیر مقدم کیا کیونکہ اس وقت امیرالامراء کے منصب کے لیے امراء اور دوسرے قائدین فوج میں جو معرکہ آرائی جاری تھی اس کے نتیجہ میں عراق فلاکت اور بدحالی سے دوچار تھا اور خلیفہ کو یہ احساس تھا کہ بویہی افواج

عراق کو اس پریشانی سے نجات دلانے میں مدد دی گئی، ان حالات میں بنو بویہ نے عراق میں امیر الامراء کا منصب اپنے لیے حاصل کر لیا اور یہ منصب ان میں خاندانی طور پر ایک سو تیرہ سال تک قائم رہا جس کے نتیجہ میں خلافت عباسیہ کی شکل و صورت ہی بدل گئی، اکثر مورخوں کا بیان ہے کہ خلافت عباسیہ کی ہیئت و اہمیت بویہی عہد میں ختم ہو چکی تھی، خلیفۂ عباسی محض ایک دینی شعار کے طور پر باقی تھا، اقتدار میں برائے نام اس کا حصہ رہ گیا تھا۔ اصل حکومت و اقتدار بویہی امرار کے ہاتھوں تھا۔

درحقیقت بنو بویہ ہی خلافت عباسیہ کے اضمحلال و زوال کا سبب نہ بنے تھے۔ بویہیوں سے پہلے ترکوں کے عہد میں خلافت عباسیہ کی ہیبت ختم ہو چلی تھی، ترکی امراء ہی اصلاً خلافت عباسیہ کے ارباب حل و عقد بنے ہوئے تھے چنانچہ خلیفہ متوکل کے بعد بالترتیب چار خلفاء مستنصر، مستعین، معتز اور مہتدی کے دور میں ترکوں کا اقتدار اس قدر بڑھ گیا تھا کہ خلیفۂ عباسی کو ترک سرداروں کے ہاتھوں کا کھلونا کہا جاتا تھا جو ان کی مرضی کے بغیر کوئی کام انجام نہیں دے سکتا تھا، ان حالات کے نتیجہ میں مرکز خلافت سیاسی، اقتصادی اور انتظامی اعتبار سے نہایت کمزور ہو گیا تھا اور ماتحت ریاستوں کی خود مختاری کا سلسلہ دراز ہونے لگا تھا، چنانچہ ۳۲۲ھ میں جب راضی باللہ خلیفۂ عباسی ہوا تو اس کی بادشاہت کا دائرہ محض بغداد اور اس کے چند نواحی علاقوں تک محدود تھا، خلافت عباسیہ کے ضعف کی تصویر ابن الاثیر کی درج ذیل تحریر سے بخوبی سامنے آجاتی ہے۔

" خلافت کے علاوہ انتظام کے سارے امور کا یہ حال تھا کہ بصرہ ابن رائق کے قبضہ میں تھا، خوزستان اور اہواز ابن البریدی کے ہاتھ میں تھے، فارس عماد الدولہ ابن بویہ کے زیر تسلط تھا، کرمان میں علی بن ایاس کی حکومت تھی، رے، اصفہان اور جبل

رکن الدولہ ابن بویہ کے قبضہ میں تھے، وشمگیر جو مرداویج کا بھائی تھا وہ خود اپنے بھائی سے دست بگریباں تھا، دیار بکر مضر اور ربیعہ ابن حمدان کے ہاتھ میں تھے، مصر، شام، ابن تغج کے زیر اقتدار تھے، مغرب اور افریقہ پر ابن عبد یمین کی حکمرانی تھی، اندلس پر عبدالرحمن بن ناصر کا قبضہ تھا، ماوراء النہر کے علاقے بنو سامان کے ہاتھ میں تھے طبرستان پر دیلمیوں کی اور بحرین و یمامہ پر ابو طاہر قرمطی کی حکومت تھی۔

اس طرح خلافت عباسیہ کی حالت بڑی نازک ہوگئی تھی۔ خلیفہ امیر الامراء کے احکام کا پابند ہوتا تھا اور خود اپنی مرضی سے کچھ نہیں کر سکتا تھا، جیسا کہ گذر چکا ہے کہ خلافت عباسیہ کے اضمحلال کا اصل سبب بنو بویہ نہیں تھے بلکہ وہ حالات تھے جن سے خلافت عباسیہ بنو بویہ سے سو سال قبل دوچار ہو چکی تھی اور جس کو جدید مورخین نے "ترکی اقتدار کا عہد" کا نام دیا ہے اور یہ واقعہ ہے کہ ترکوں کے غلبہ و تسلط کے مقابلے میں بویہیوں کا عہد کافی بہتر تھا کیونکہ وہ اقتدار پر پوری طرح قابض تھے اور سارے انتظامی امور انہوں نے خود سنبھال رکھے تھے اور خلیفہ کو ان تمام مشکلات سے بچا رکھا تھا جس سے وہ ترکوں کے عہد میں دوچار تھے، چنانچہ ترکوں کے عہد میں فوجوں کی بغاوت اور ترک سپہ سالاروں کی کشمکش کے نتیجہ میں خلیفہ عباسی معزول کر دیا جاتا تھا اور اس کی شخصیت مجروح کی جاتی تھی مگر جب بویہیوں نے اقتدار پر قبضہ کیا اور امیر الامراء کا منصب ان کے خاندان میں موروثی ہوا اور خلیفہ کی جانب سے بویہی امیر کو اپنے ہی نام سے نظم و انتظام کی اجازت حاصل ہوگئی تو خلیفہ سے ان کی آویزش کی کوئی وجہ باقی نہیں رہی، نیز یہ فائدہ حاصل ہوا کہ ان کو خلیفہ کی جانب سے اجازت ملنے کی وجہ سے احترام اور عزت کی دولت حاصل ہوئی جو ان ترک سپہ سالاروں کو بہر حال حاصل نہ ہو سکی جو خلیفہ عباسی کو ناراض کر کے اقتدار پر قابض ہوتے تھے۔

(ک۔ص)

آثار علمیہ و تاریخیہ

تراجم کا آغاز

از

مولانا عبد اللہ عمادیؒ

آج کل[1] مصر کی ادبی جماعت کے محمد آفندی لطفی جمعہ کا نام سرزمین ہند میں پہنچ چکا ہے اور ان کی کتاب " تاریخ فلاسفۃ الاسلام فی المشرق والمغرب کو شعبہ فلسفہ کی تحریک پر محکمہ دار الترجمہ جامعہ اردو میں منتقل کرنے کا اہتمام کر رہا ہے۔ یہ کتاب ۲۲۰ صفحات پر مشتمل ہے۔ اس کا نقش اول ایک ایسا مقالہ ہے جس کی بنا پر محمد آفندی لطفی کو ۱۹۰۹ء میں حکومت فرانس سے پی ایچ ڈی کی ڈگری عطا ہوئی۔ بعد ازاں ۱۸ مہینوں کی مزید کاشوں سے اس کتاب کا نقش ثانی مرتب ہوا جو ۱۹۲۷ء میں مصر کے مطبع " المعارف" سے شایع ہوا۔ اس کتاب کے مقدمہ (ص، ن، س) میں اس معروف دار الترجمہ کا تذکرہ ہے۔ جو عباسی خلیفہ مامون الرشید ۱۹۹ھ تا ۲۱۸ھ نے قائم کیا تھا۔ اس شیریں حکایت کا ہر پارہ ایک شکر پارے کی طرح تاریخ کو شیرینی کام و دہن کی لذت بخش رہا ہے۔

مذکورہ کتاب میں مولف نے ترجمۂ علم و فن کی اولیت خلیفہ منصور ۱۳۶ھ تا ۱۵۸ھ سے منسوب کی ہے لیکن تاریخ نے رہبران اسلام و وزیران حکمت کے جو نقوش محفوظ کر رکھے ہیں اس کی سر منزل ایک پایہ شناس اہل نظر کو آغاز اسلام (یعنی قرن اول) ہی سے ملتی ہے۔

علم کی ابتدا جناب رسالت مآب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی حکیمانہ تعلیمات و

---

[1] معارف: واضح رہے کہ مولانا کا انتقال تقریباً ۵۰ سال پہلے ہوا تھا۔

آیات بینات سے علم و حکمت کی عالیشان تخم ریزی کی۔ حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے خطبات نے اس عظیم شعبہ کی ترویج و تکمیل کی راہیں کھولیں۔ حضرت علیؓ کی ہدایت پر آپ کے شاگردوں نے علم کی بنیاد ڈالی۔ آپ کی ایک کتاب چرم آہو (ہرن کی کھال) پر لکھی ہوئی تھی۔ زائدہ بن قدامہ نے جو حسن بن عطیہ کے ساتھ جنگ روم ۶۰ یا ۶۱ھ میں شہید ہوئے تھے فن حدیث، تفسیر، تجوید اور اخلاقیات پر کئی کتابیں لکھی تھیں۔ علامہ ابن ندیم نے کتاب الفہرست میں ان کی کتاب السنن، کتاب القرآت، کتاب التفسیر، کتاب الزہد اور کتاب المناقب کا تذکرہ کیا ہے۔

۲۔ فن ترجمہ کا آغاز | حضرت امیر معاویہؓ کے دور (۴۱ تا ۶۰ھ) سے فن ترجمہ کی ابتدا ہوئی۔ دمشق میں علم طب و نجوم کی کتابیں ترجمہ ہوئیں، امیر معاویہؓ ہی کے حکم سے شام کے ایک عیسائی طبیب ابن آثال نے حب کی کتابیں عربی میں ترجمہ کیں، علامہ ابن الندیم نے کتاب الفہرست" میں صفحہ ۳۵۱ تا ۳۶۰ کیمیائی تصانیف و تراجم کی ایک طویل فہرست پیش کی ہے جن میں متعدد کتابیں مثلاً کتاب الحرارت، کتاب الوصیت وغیرہ پہلی صدی ہجری کی ہیں۔

علاوہ ازیں امیر معاویہؓ ہی کے حکم سے عبید بن شریہ جرہمی نے دنیا کی مختلف اقوام کی ایک تاریخ مرتب کی تھی۔ ابن ہشام نے اس کا خلاصہ بھی لکھا ہے جو دائرۃ المعارف عثمانیہ یونیورسٹی (حیدرآباد دکن) سے "کتاب التیجان" کے نام سے شایع ہوئی تھی۔

۳۔ دوسرا دارالترجمہ | خالد بن یزید نے دوسرا دارالترجمہ قائم کیا تھا جس میں زیادہ تر کیمیا و طب کی کتابیں عربی میں منتقل کردہ تھیں، طب کی وہ مشہور کتاب اسی دارالترجمہ کا سرمایہ تھی جس کی نسبت حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کا استخارہ مشہور ہے۔

خالد بن یزید نے چند یونانیوں کو جو مصر میں پناہ گزیں تھے ملک شام میں طلب کیا اور بعض یونانی و قبطی کتابوں کا عربی ترجمہ کرایا اور کئی رسائل بھی لکھے۔

۴۔ بغداد کا اہتمام | عہد بنی عباس میں مسلمانوں کا تیسرا دارالترجمہ قائم ہوا جس کا بانی عباسیوں کا دوسرا خلیفہ ابوجعفر منصور (۱۳۶ھ تا ۱۵۸ھ) تھا۔ اس کے عہد میں علم ہیئت و طب کی کتابیں ترجمہ ہوئیں۔ منصور کے بعد مہدی و ہادی کا زمانہ خالی نظر آتا ہے مگر ان دونوں کی تلافی خلیفہ ہارون الرشید (۱۷۰ھ تا ۱۹۳ھ) کے دارالترجمہ نے کر دی جس نے علم ریاضی میں بطلیموس کی کتاب مجسطی شایع کر کے ایک نیا باب کھول دیا۔ اسی دور میں اقلیدس کے مقالے عربی میں نقل ہوئے اور سنسکرت کی کتاب "سند ہند" بھی نقل ہوئی۔

۵۔ بیت الحکمۃ | مامون ۱۹۹ھ تا ۲۱۸ھ کا دارالترجمہ جس کو بیت الحکمۃ کہتے تھے۔ نہایت باقاعدہ اور ترقی یافتہ شکل میں تھا۔ اس نے مختلف اقوام کے علما و حکما کو ملازم رکھ کر یونانی، سریانی، عبرانی، نبطی، لاطینی، فارسی اور سنسکرت کی کتابیں عربی میں ترجمہ کرائیں مثلاً:

- فلسفہ ادب میں افلاطون کی آٹھ کتابیں۔
- فلسفہ و منطق میں ارسطو کی انیس کتابیں۔
- علم طب میں بقراط کی دس اور جالینوس کی دس کتابیں۔
- ریاضی و ہیئت (ASTRONOMY) میں اقلیدس، ارشمیدس اور بطلیموس کی بیس کتابیں۔
- فارسی زبان سے تاریخ و ادب کی بیس کتابیں ترجمہ ہوئیں۔ عربوں کو فارسی

زبان کا سرمایہ دیگر علوم و فنون مثلاً علم ہیئت، طب، ریاضی، سائنس سے خالی نظر آیا، اسی بنا پر انہیں صرف تاریخ و ادب ہی کے ترجمہ پر قناعت کرنا پڑا۔

- سنسکرت زبان سے علم ریاضی، طب، ہیئت اور ادب کی تیس کتابیں ترجمہ ہوئیں۔
- سریانی اور نبطی زبانوں سے زراعت، باغبانی اور طلسم وغیرہ کی بیس کتابیں اور لاطینی اور عبرانی زبانوں سے مختلف فنون کی بیس کتابیں ترجمہ ہوئیں۔

مترجمین | اس عہد کے بہترین مترجمین کے نام بھی تاریخ نے محفوظ کر رکھے ہیں، مثلاً:

۱۔ خاندان بخت یشوع۔ یہ علم طب میں نبطی و عراقی ماہرین فن تھے۔ عیسائیوں میں "بوخت" بیٹے کو اور "دوخت" بیٹی کو کہتے تھے۔ اسی مناسبت سے بخت یشوع سے مراد حضرت عیسیٰؑ کے بیٹے۔

۲۔ خاندان حنین۔ یہ نصرانی خاندان تھا۔ اسلام کی رواداری اور منزلت شناسی نے اسے شیخ المترجمین کا درجہ دیا تھا۔

۳۔ قسطا بن لوقا۔ یہ بعلبک کا عیسائی تھا جو مختلف زبانیں جانتا تھا۔ علم طب، فلسفہ، ریاضی اور موسیقی سے دلچسپی رکھتا تھا۔ اس نے متعدد کتابیں یونانی سے عربی میں منتقل کیں۔ روغن لفظ اسی کی دریافت ہے جس کی پچکاری سے آگ لگ جاتی تھی۔

۴۔ جیش اعسم ۵۔ خاندان ماسرجویہ۔ یہودی ۶۔ خاندان ثابت کلدانی۔ فرقہ صابی۔

۷۔ یحییٰ بن عدی ۸۔ متی بن یونس ۹۔ اسطفانی ۱۰۔ موسیٰ بن خالد و یوسف بن خالد۔

۱۱۔ ابن المقفع۔ ادب میں یگانۂ زمانہ تھے۔ کلیلہ و دمنہ کو فارسی سے عربی میں منتقل کیا۔ یتیمیہ کی تالیف کی۔

۱۲۔ خاندان نوبخت۔ متکلمین امامیہ کے سربراہ تھے۔ کتاب "فرق الشیعہ" اسی

خاندان کے ایک رکن رکین کی ہے۔ جسے قسطنطنیہ سے جرمن مستشرقین کی مجلس نے شایع کرایا۔

۱۳۔ حسن بن سہل۔ وزیر خلافت۔

۱۴۔ احمد بن یحییٰ بلاذری۔ مشہور مورخ و مولف فتوح البلدان کے مصنف مولانا ابوالخیر مودودی نے اس کا اردو ترجمہ کیا۔

۱۵۔ اسحاق بن یزید ۱۶۔ پنڈت منکہ ۱۷۔ پنڈت ابن دھن۔

۱۸۔ ابن وحشیہ کی کتاب الفلاحہ جس کو نامور ادیب مولوی سید ہاشم صاحب ناظم دائرۃ المعارف (حیدرآباد دکن) نے اردو میں نقل کیا ہے۔

۶۔ دارالعلم | اسلامی فتوحات کے دور میں مصر کو بھی علمی میدان میں بغداد کا مقابلہ کرنا تھا دولت فاطمیہ کے خلیفہ الحاکم بامر اللہ نے مصر میں جامع ازہر قائم کی اور عباسیوں کے بیت الحکمۃ کے بالمقابل قاہرہ میں ایک دارالترجمہ تشکیل دیا جس کا نام "دارالعلم" تھا۔ مقریزی کی "الخطط والآثار" میں اس کا تذکرہ موجود ہے۔

۷۔ دارالترجمہ عجم | عجمیوں نے جب سامانیوں کے لیے علمی ساز و سامان مہم پہنچایا تو وہاں ایک دارالترجمہ قائم ہوا جس میں فارسی کتابیں ترجمہ ہوئیں۔ انگریزوں نے عربوں کی بہترین جغرافیائی کتابوں کا جو سلسلہ شایع کرایا ہے اس میں اصل عربی کتب کے ساتھ ان فارسی ترجموں کے بعض اوراق بھی ثبت ہیں جو سلطنت سامانیہ کے دارالترجمہ سے لیے گئے ہیں۔ طبری کا فارسی ترجمہ بھی اس کی یادگار ہے۔

۸۔ دارالترجمہ دہلی | ہندوستان میں سلطان فیروز شاہ باربک کے دارالترجمہ میں علوم ہیئت (ASTRONOMY)، نجوم (ASTROLOGY) اور طب (MEDICINE) کی کتابیں جو سنسکرت میں تھیں ترجمہ ہوئیں، تاتار خان نے جو وزیر سلطنت ہونے کے علاوہ

ایک فاضل مصنف بھی تھا جو اپنی محنت اور علماء و فضلاء کی قابلیت سے فائدہ اٹھاتے ہوئے متعدد کتابیں
جس میں جو تاما لخانی کے نام سے مشہور ہیں۔ کشف الظنون میں بھی ان کا بیان موجود ہے۔

۹۔ دارالترجمہ کشمیر | اسلامی سلطنت کے کارہائے نمایاں میں سے ایک یہ بھی ہے کہ اس نے کشمیر میں ایک دارالترجمہ قائم کیا تھا، جہاں تاریخ، نجوم و طب کی کتابیں فارسی میں ترجمہ ہوئیں۔

۱۰۔ دارالترجمہ الٰہ آباد | شہنشاہ اکبر نے دہلی میں ایک دارالترجمہ قائم کرایا جو ساری عجمی تعلیم گاہوں سے بڑھا ہوا تھا اور تراجم کے معیار و تعداد میں بھی۔

۱۱۔ دارالترجمہ شمس الامراء | دکن میں نواب ناصر الدولہ آصف جاہ چہارم کے حکومت میں عہد نواب شمس الامراء کا دارالترجمہ قائم ہوا جہاں انگریزی، فرانسیسی کے متعدد مثلاً علم ہوا (ATMOSPHERE) علم مناظر (OPTICS)، علم آب (HYDRAULICS)، علم فلک (ASTRONOMY) علم ریاضی (MATHS)، جر ثقیل وغیرہ کے ترجمے ہوئے۔
مسئلہ شمسیہ کے رسائل تشنگانہ بھی اس ضمن میں آتے ہیں۔

۱۲ محکمۂ علوم و فنون | محبوب علی پاشا (فرمانروائے دکن) کے عہد میں بھی ایک دارالترجمہ قائم ہوا جس کا نام "محکمۂ علوم و فنون" تھا اور شمس العلماء مولانا شبلی نعمانی اس کے ناظم تھے تواریخ ابن خلکان و ابن اثیر اسی محکمہ نے ترجمہ کی تھیں۔ صدر محاسبی (OFFICE OF ACCOUNTS, GENERAL) کی طرف سے جب اس محکمہ کی روزانہ کارگزاری پر قید و بند عائد کر دی گئی تو ناظم دارالترجمہ اسے برداشت نہ کر سکے اور انکا استعفیٰ کے ساتھ ہی یہ محکمہ ٹوٹ گیا۔

۱۳۔ دارالترجمہ دکن (BUREAU OF TRANSLATION) | آصف سابع میر عثمان علی خاں کے دور میں ۱۹۱۷ء کے لگ بھگ ایک وسیع دارالترجمہ کی تشکیل بمقام عثمانیہ یونیورسٹی حیدر آباد عمل میں آئی۔ دارالترجمہ کے ہر شعبہ میں ہی روزانہ اجلاس ہوا کرتے تھے شعبۂ مصطلحات میں فنون حیاتیات، کیمیا، طبیعیات ریاضی، علم ہندسہ، معاشیات، قانون، تاریخ اور تدریسیات کی اصطلاحیں وضع کرنے کے لیے علیحدہ علیحدہ مجالس قائم ہوئیں۔

معارف کی ڈاک

مکتوب اسلام آباد

ادارۂ معارف نوشاہیہ، اسلام آباد

یکم جنوری ۱۹۹۷ء

جناب مدیر معارف سلام مسنون

معارف نومبر ۱۹۹۶ء پیش نظر ہے۔ ڈاکٹر سید لطیف حسین ادیب صاحب کے مضمون "انٹرنس کورس فارسی مرتبہ علامہ شبلی" کے سلسلے میں میری حسب ذیل گزارشات ہیں:

۱۔ فاضل مضمون نگار کا یہ قیاس درست معلوم ہوتا ہے کہ اس کورس کی اولین طباعت ۱۸۹۶ء میں ہوئی (صفحہ ۳۷۰) اس کی تائید برٹش میوزیم کی فہرست مطبوعات فارسی[1] (ص ۶۷) سے بھی ہوتی ہے، اس فہرست میں مذکورہ کورس کے حسب ذیل ایڈیشنوں کا ذکر کیا گیا ہے۔

الف۔ طبع آگرہ، ۱۸۹۶ء، ۲۲۲ صفحات

ب۔ طبع الہ آباد، ۱۹۰۱ء، ۲۲۴ صفحات

ج۔ طبع الہ آباد، ۱۹۰۲ء، ۲۲۴ صفحات

اس فہرست میں جہاں علامہ شبلی کے مذکورہ ایڈیشنوں کا ذکر ہوا ہے وہاں مصنف کے

1-EDWARD EDWARDS, A CATALOGUE OF THE PERSIAN PRINTED BOOKS IN THE BRITISH MUSEUM LONDON, 1922. P. 67

نام کی تصریح کے بغیر ایک اور اندراج بعنوان "انٹرنس کورس فارسی ... برائے امتحان ۱۹۰۵ء مطبوعہ ۱۹۰۵ء، ۵۸ ورق" (کذا) ہوا ہے۔ ضخامت کے فرق سے یہ قیاس کیا جاسکتا ہے کہ یہ غالباً مرتبہ شبلی نہ ہو۔

۲۔ مضمون میں کہیں کہیں کتابت (؟) کے اغلاط بھی در آئے ہیں۔ مثلاً سفرنامہ خسرو (ص ۱۷۳) کی جگہ سفرنامہ ناصر خسرو ہونا چاہیے۔ عبداللطیف السطوجی (ص ۱۷۳) کی جگہ عبداللطیف الطسوجی درست ہے۔ محتشم کاسی (ص ۱۷۳) نہیں بلکہ محتشم کاشی صحیح ہے۔ شذرہ میں (ص ۲۲۳) مغربی پنجاب کے شہر میانوی کو میانوالی پڑھا جائے تو صحیح ہے۔

ڈاکٹر رفیع الدین کاظمی کے مضمون "مطہر کا وطن" کے سلسلے میں مرحوم مولانا امتیاز علی عرشی کے مقالے "ظہور الاسرار نامی اور مطہر کڑہ" مشمولہ مقالات عرشی، مطبوعہ لاہور، ۱۹۷۰ء کو بھی پیش نظر رکھا جائے۔ اس میں عرشی صاحب نے کڑہ کا تعین کیا ہے۔

مخلص : عارف نوشاہی

مکتوب امریکہ

۲۰ر دسمبر ۱۹۹۶ء
رچ منڈ۔ امریکہ

محترم مولانا ضیاء الدین صاحب! السلام علیکم

عین اس وقت جب میں عازم سفر تھا، سلطانہ اعجاز کے ٹیلیفون سے حادثہ عظیم کی خبر ملی ....

حادثہ ایک قیمتی چیز ہے اور اسکے ساتھ تھوڑے دنوں کی حرماں نصیبیاں ہیں، اسکی تھوڑی سی جھلک تدافل یام کے دامن میں نظر آجاتی ہے، اصل صورت حال کیلئے فیصلے کے دن کا انتظار کرنا پڑے گا۔ ویسے سکون قلب اسی میں ہے کہ مالک سے بہتری کی توقع رکھی جائے کیونکہ وہ اپنے بندوں پر بڑا مہربان رحیم ہے۔

میری کتاب "ایمانی پرائمر" پہونچی ہوگی۔ دوسری دو کتابیں "النجوم" اور "خلیوں کی کہانی" ملی ہیں یا نہیں؟ عزیزہ اعجاز سے منگالیجئے گا۔ بچوں کے لئے "اسلامی اعمال" تیار کر رہا ہوں۔ تمنا ہے کہ اتنی مختصر اور آسان ہو کہ بچے زبانی یاد کرلیں اور بعد میں انہیں معلوم ہو کہ "ہم نے جو یاد کرلیا ہے وہ قرآن ہے"۔

دعاؤں کا طالب : ریاض

ادبیات

غزل

از جناب شاہ اقبال ردولوی صاحب

دھوپ بھی چاندنی راتوں کا مزا دیتی ہے
زندگی آپ کی یادوں کو دعا دیتی ہے

یاس جب سارے چراغوں کو بجھا دیتی ہے
بڑھ کے امید نئی شمع جلا دیتی ہے

ایک لمحہ جو ترے غم کو بھلا دیتا ہے
زندگی اس کو بڑی سخت سزا دیتی ہے

گردشیں ساری زمانے کی لرز جاتی ہیں
روح جب ہادیٔ برحق کو صدا دیتی ہے

زخمِ دل، داغِ جگر، وعدۂ فردا یعنی
فصلِ گُل دیکھئے اب کے مجھے کیا دیتی ہے

گردشِ بخت وہ گردش ہے کہ اقبال اکثر
ہوش والوں کو بھی دیوانہ بنا دیتی ہے

غزل

از جناب ابرار اعظمی صاحب

مرے شعور کا تیور مری تلاش میں ہے
مرے یقین کا محور مری تلاش میں ہے

وہ دیکھو صبح کا منظر مری تلاش میں ہے
سنو کہ مہر منور مری تلاش میں ہے

مرے خیالوں کو دے کر حسین پیراہن
سنا ہے اب وہ فسوں گر مری تلاش میں ہے

میں حیرتی نہیں، ہاں آئینہ سا لگتا ہوں
کچھ اس یقیں پہ کہ جوہر مری تلاش میں ہے

مرا وجود ہے مثل صدف تہی دامن
مگر خیال کہ گوہر مری تلاش میں ہے

عجیب شخص ہوں میں بھی، کھڑا ہوں صحرا میں
پکارتا ہوں، سمندر مری تلاش میں ہے

صنم کچھ اور تراشے گا منفرد، دلکش
مری زبان کا آزر مری تلاش میں ہے

وہ دیدنی سا، خلاؤں میں محوِ رقصِ خرام
مری غزل کا ہے پیکر مری تلاش میں ہے

میں تشنہ لب نہیں، تشنہ لبی ہے میرا شعار
ہزار مینا و ساغر مری تلاش میں ہے

ہزار بار نظر جس پہ جاکے لوٹ آئی
وہ کہہ رہا ہے کہ آ، گر مری تلاش میں ہے

یہ ربطِ لفظ و معانی، عطائے خالقِ کن
اسی میں ڈھونڈھ مجھے گر مری تلاش میں ہے

غزل

از جناب وارث ریاضی صاحب

نہ لفظوں میں بیاں ہونا نہ آنکھوں سے عیاں ہونا
کمالِ عشق ہے اسرارِ الفت یوں نہاں ہونا

نمود ایسی کہ ہمدوشِ فرازِ کہکشاں ہونا
نہاں کچھ اس طرح ہونا کہ بے نام و نشاں ہونا

خوشی مخصوص ہے اس جانِ عالم کے لیے لیکن
تجھے اے غم مبارک حاصلِ کون و مکاں ہونا

کریں وہ نالۂ غم سے بہارِ جاوداں پیدا
عبث ہے گوشۂ زنداں میں فکرِ آشیاں ہونا

کہانی قیس کی وردِ زباں دنیا میں ہے لیکن
مرے دردِ محبت کو نہ آیا داستاں ہونا

جہانِ عشق میں غم کے سوا کچھ بھی نہیں ملتا
یہاں بے سود ہے اندیشۂ سود و زیاں ہونا

مرے چہرے سے پڑھ لیں میری بربادی کا افسانہ
کہ مشکل ہے زباں سے داستانِ غم بیاں ہونا

تو اے سیلابِ غم! رہنا سمٹ کر دیدہ و دل میں
عیاں ہونا تو پھر وسعت میں بحرِ بے کراں ہونا

قیامت ہے کہ رہزن قوم کے سردار بن جائیں
مصیبت ہے ہوس رانوں کا میرِ کارواں ہونا

رہِ غم میں پریشاں نکہتِ گل کی طرح میں ہوں
مری قسمت میں تھا گرد و غبارِ کارواں ہونا

عمل کی راہ میں اربابِ ایماں کے لیے یکسر
ہزیمت ہے اسیرِ گیسوئے وہم و گماں ہونا

عمل سے منحرف ہو کر مسلسل آرزوؤں سے
بہت مشکل ہے راہِ زندگی میں کامراں ہونا

کوئی کچھ بھی کہے لیکن دلیلِ حجتِ حق ہے
بتوں کی صف میں ناقوسِ برہمن سے اذاں ہونا

اسی کو دی گئی ہے دولتِ علم و یقیں وارث!
جسے تھا محرمِ اسرارِ بزمِ دو جہاں ہونا

مطبوعات جدیدہ

نگارشات از جناب ڈاکٹر مولانا عبداللہ عباس ندوی، مرتب جناب ڈاکٹر محسن عثمانی، متوسط تقطیع بہترین کاغذ و کتابت وطباعت، مجلد مع گرد پوش، صفحات ۳۰۳، قیمت درج نہیں، پتہ: مجلس علمی، بی، ۱۲، ذاکر باغ، اوکھلا روڈ، نئی دہلی ۲۵۔

یہ علمی، دینی، سیاسی اور صحافتی موضوعات پر قریب پینتالیس مقالات و مضامین کا مجموعہ ہے۔ اکثر تحریریں فاضل مصنف کی ادارت میں نکلنے والے رسالہ ذکر و فکر دہلی میں چھپ چکی ہیں، رسالہ کی اشاعت اب موقوف ہے، لائق مرتب نے انکو اور دوسرے مضامین کو بڑے سلیقہ سے یکجا و مرتب کر کے چند سال پہلے شایع کر دیا تھا، زیر نظر مجموعہ اسی کا دوسرا ایڈیشن ہے، اس میں بعض ان اداریوں کو بھی شامل کر دیا گیا ہے جو مولانا نے ندوہ کے ترجمان تعمیر حیات کے لیے سپرد قلم کیے تھے۔ اسلام اور علم، اسریٰ و معراج، شانِ عبدیت، محدث ابن الاثیر جیسے بلند پایہ مضامین کے علاوہ مولانا آزاد کی ترجمان القرآن اور مولانا دریابادی کی تفسیر ماجدی اور مستشرقین اور سیکولرزم کی تاریخی حیثیت پر بھی بہت وقیع تحریریں ہیں، وقتی اور عصری مسائل پر بھی متعدد مختصر مضامین ہیں، اصابت رائے اور حسن تجزیہ کے علاوہ ان تمام نگارشات کا وصف خاص فاضل صاحب قلم کا دلکش و دلآویز طرز و اسلوب ہے، ایک باب اسلامی ادب کے عنوان سے خاص کیا گیا ہے، حالانکہ ان کی ہر تحریر اسلامی ادب کی صالح، پاکیزہ، بامقصد اور معیاری روایات و خصوصیات کی حامل ہے اور بار بار پڑھنے کے لائق ہے۔ پیش لفظ میں لائق مرتب نے جہاں تعارف کا فریضہ انجام دیا وہیں انھوں نے مصنف کے تعلق سے لکھنؤ کے ایک قضیہ نامرضیہ کا ذکر بھی چھیڑ دیا جو

غلطی غیر ضروری اور بے جا نظر آتی ہے۔

انجمن خدام کعبہ از جناب ڈاکٹر ابو سلمان شاہجہانپوری، متوسط تقطیع، کاغذ اور کتابت و طباعت گوارا، مجلد مع گردپوش، صفحات ۱۱۰، قیمت ۳۰ روپے، پتہ: مکتبہ رشیدیہ، مراد اسٹریٹ، پاکستان چوک، کراچی ۱، پاکستان یا مکتبہ شاہد، علی گڑھ کالونی، کراچی ۴۱، پاکستان۔

اس صدی کے اوائل میں انگریزوں کے تسلط سے رہائی اور ملک کی آزادی کے حصول کی خاطر چھوٹی بڑی متعدد تحریکیں سرگرم عمل ہوئیں، اب ایک صدی گزرنے کے بعد یہ تاریخ کا ایک حصہ بن کر ذہنوں سے فراموش ہوتی جارہی ہیں، انجمن خدام کعبہ بھی اسی سلسلہ جدوجہد کی ایک کڑی ہے جو ۱۹۱۳ء میں لکھنؤ میں مولانا عبدالباری فرنگی محلی اور علی برادران کی رہنمائی و سرپرستی میں قائم ہوئی تھی، اس کے مقاصد میں گو مسلمانان ہند کی تعلیمی و معاشرتی اصلاح و ترقی بھی شامل تھی، مگر اصل غایت حرمین شریفین کی حرمت و عظمت کے تحفظ کی سعی بلیغ تھی جس کے ضمن میں انگریزوں اور یوروپی اقوام کی ہوس ملک گیری سے نبرد آزما ہونے کی تمنا بھی شامل تھی، یہ تحریک گو بن کھلے مرجھا گئی، لیکن اس غنچہ ناشگفتہ کی مختصر داستان اس دور کے ذہن و مزاج کو سمجھنے کے لیے سامان بصیرت رکھتی ہے، اس کتاب میں فاضل مرتب نے انجمن کے آغاز، مقاصد، نظام، خدمات اور حکومت وقت کے شبہات اور سزا و عتاب کے متعلق اصل مآخذ سے مستند معلومات جمع کر دیے ہیں، ایک باب میں قدرے تفصیل سے اس تحریک کی ناکامی کے اسباب کا جائزہ لیا گیا ہے اور یہی سب سے اہم ہے، انجمن کے سلسلہ میں مولانا احمد رضا خاں بریلوی کے نام مولانا فرنگی محلی کا وہ طویل خط بھی اس میں شامل ہے جس کا ایک جملہ یہ ہے کہ "حرم کے ہر ذرہ ذرہ کی بے حرمتی کا عصیان آپ کے

سرپرہے"۔ علامہ شبلی نعمانی کی نظم بھی انجمن کے سلسلہ میں انھوں نے ہمدرد کے صفحات سے ڈھونڈ نکالی ہے جو مولانا کے کشاف کے قلمی نام سے ۱۹۱۱ء میں چھپی تھی، یہ اس لیے بھی اہم ہے کہ کلیات شبلی میں اب تک یہ شامل نہیں، البتہ ایک جگہ علامہ شبلی کا سنہ وفات غلطی سے ۱۹۱۲ء لکھ دیا گیا ہے۔

تحریک اسلامی کے عالمی اثرات از جناب مولانا خلیل احمد الحامدی، متوسط تقطیع، عمدہ کاغذ اور کتابت و طباعت، صفحات ۲۲۴، قیمت ۳۲ روپے، پتہ: مرکزی مکتبہ اسلامی، ۱۳۵۳، چتلی قبر، دہلی ۶۔

مولانا خلیل حامدی مرحوم پاکستان کی جماعت اسلامی کے ممتاز رہنما تھے وہ مولانا مودودی کے تربیت یافتہ اور معتمد خاص تھے، جماعت کے عربی ترجمان اور عربی ممالک میں اس کے سفیر بھی تھے، اس کتاب میں انھوں نے اپنے مطالعہ و مشاہدہ کی روشنی میں مختلف ملکوں میں جماعت اسلامی کے اثر و نفوذ کی نشاندہی کی ہے، جماعت کی علمی، فکری، تحریکی اور اصلاحی سرگرمیوں سے واقفیت کے لیے یہ کتاب معلومات سے لبریز ہے، یہ مضامین در اصل جماعت کے کارکنوں کی ایک تربیت گاہ میں پیش کیے گئے تھے اس لیے قدرتاً ان میں کہیں کہیں خطیبانہ بلند آہنگی اور ترغیبانہ تعلی کے عناصر بھی موجود ہیں، مثلاً جوش کلام میں یہ کہنا کہ جماعت نے مغربی تہذیب کے سحر کو کافور کیا ورنہ علامہ رشید رضا اور علامہ شبلی نعمانی اور دوسرے علمائے کبار بھی اس کے سامنے سپر انداز ہو گئے تھے۔ جدید مسلمان ماہرین معاشیات کی مدح و تحسین کے ساتھ اس جملہ استخفاف کی قطعی ضرورت نہ تھی کہ "یہ باتیں کسی مسجد کے خطیب یا تدریس کے معلم یا دارالافتاء کے مفتی کی نہیں"۔

کشمیر میں عربی شعر و ادب کی تاریخ از جناب ڈاکٹر سید محمد فاروق بخاری

متوسط تقطیع، عمدہ کاغذ اور مناسب کتابت و طباعت، صفحات ۱۷۶، قیمت درج نہیں، پتہ: جموں اینڈ کشمیر اکیڈمی آف کلچر اینڈ لنگویجز، سرینگر کشمیر۔

جنت نظیر کشمیر کی وادیوں میں جب اسلام کی بہار آئی تو کلام ربانی کی زبان عربی مبین کی نعمت بھی ساتھ لائی، علماء و مشائخ اور مبلغین اسلام کی برکت سے علم و فضل کا مدار عربی زبان و علوم کی تحصیل پر ہی رہا، البتہ سیاسی اور جغرافیائی اسباب سے پورے ملک کے مانند کشمیریوں نے بھی فارسی شعر و سخن کے ساتھ خاص اعتنا کیا، اس قابل قدر کتاب میں بڑی محنت و جستجو سے کشمیر میں عربی شعر و ادب کی تاریخ مرتب کی گئی ہے، اس عام خیال کے باوجود کہ تاریخ ادبیات کشمیر میں کسی ایک کے متعلق یہ کہنا مشکل ہے کہ اس نے عربی شاعری کو بطور مستقل فن اپنایا ہو، لائق مصنف نے متعدد کشمیری شعراء کے عربی کلام تک رسائی حاصل کی، اس سے پہلے وہ کشمیر میں اسلام اور عربی علوم کی اشاعت کے موضوع پر کتابیں شایع کر چکے ہیں، یہ کتاب بھی اسی سلسلہ کی ایک کڑی ہے، توقع ہے کہ پیش رو کاوشوں کی طرح اسے بھی قبولیت حاصل ہوگی۔

سفر حجاز از جناب شارق علوی، عمدہ کاغذ اور کتابت و طباعت، ۵۶ صفحات، پتہ: 8-C، وگیان پوری، مہانگر، لکھنؤ، یوپی ۲۲۶۰۰۶۔

'حج بیت اللہ و رسولہ' ایک اور سادہ، مختصر اور پُر اثر روداد سفر ہے، قلب و ذہن کے تاثرات کے علاوہ ہندوستانی حجاج کو پیش آمدہ مسائل و تجربات کا بھی بیان ہے جن سے فائدہ اٹھایا جا سکتا ہے۔

ع۔ ص۔

معارف

جلد ۱۵۹ ماہ ذی الحجہ ۱۴۱۶ھ مطابق ماہ اپریل ۱۹۹۷ء عدد ۴

فہرست مضامین

شذرات

اتر پردیش اردو اکادمی لکھنؤ کے زیر اہتمام ۱۶-۱۷ مارچ ۱۹۹۷ء کو مولانا حکیم سید عبدالحی حسنی مرحوم سابق ناظم ندوۃ العلماء پر ایک بین الاقوامی سیمینار ہوا جس میں جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، دہلی یونیورسٹی، جواہر لال نہرو یونیورسٹی دہلی، بنارس ہندو یونیورسٹی، لکھنؤ یونیورسٹی، اودھ یونیورسٹی سلطانپور، ندوۃ العلماء لکھنؤ، دارالعلوم تاج المساجد بھوپال اور مہاراشٹرا ور کرناٹک کے اصحاب علم و ادب شریک ہوئے، دارالمصنفین شبلی اکیڈمی سے راقم کو اس میں شرکت کی سعادت میسر آئی، سعودی عربیہ کے وزیر اوقاف ڈاکٹر عبداللہ عبدالمحسن الترکی کی نیابت و نمایندگی سید احمد بن عبدالرحمن خلیفہ نے کی جو ہندوستان میں سعودی عربیہ کے سفارتخانے سے وابستہ ہیں۔ افتتاحی جلسہ کی صدارت دنیائے اسلام کے نامور عالم حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی ناظم ندوۃ العلماء اور برصغیر کے مایہ ناز مورخ پروفیسر خلیق احمد نظامی سابق صدر شعبہ تاریخ علیگڑھ مسلم یونیورسٹی نے فرمائی۔ سابق مرکزی وزیر اور کانگریسی رہنما مسٹر راجیش پائلٹ نے مہمان خصوصی کی حیثیت سے تشریف لاکر سیمینار کی رونق بڑھائی اور اردو زبان سے اپنے لگاؤ کا ثبوت دیا۔

---

۱۶ مارچ کو ۱۱ بجے دن میں افتتاحی جلسہ ہوا، اس میں اکادمی کے وائس چیرمین جناب اطہر نبی ایڈوکیٹ نے اتر پردیش اردو اکادمی کی کارگزاری پیش کی آیندہ کے منصوبے بتائے اور سیمینار کے معاونین و شرکاء کا شکریہ ادا کیا، اکادمی کے چیرمین پروفیسر محمد یونس نگرامی ندوی نے خطبۂ استقبالیہ پڑھا جس میں اسلامی علوم و فنون کے مختلف دائروں میں ہندوستان کے علما و مصنفین کے کارہائے نمایاں کا جائزہ لیتے ہوئے مولانا سید عبدالحی صاحب کی علمی عظمت و بلند پائیگی دکھائی۔ مولانا سید عبدالحی صاحب کے فرزند والاتبار مولانا سید ابوالحسن علی ندوی نے بتایا کہ ہندوستان کے علما و فضلاء کے کارنامے دوسرے اسلامی ملکوں سے بڑھکر ہیں، لیکن ان کی تصنیفات اور علمی سرگرمیوں اور مسلمان حکمرانوں کے علمی، تمدنی، تعلیمی اور انتظامی کارناموں سے عرب مصنفین عموماً ناواقف تھے، مولانا سید عبدالحی صاحب نے انکو اپنی بیش بہا تصانیف کے ذریعہ ہندوستانی

کارناموں سے واقف کرایا اور شعرائے اردو کا تذکرہ لکھا اس طرح اپنے ملک اور اس کی زبان و ادب اور اس کے علم و فن کی اہم خدمت انجام دی۔ پروفیسر خلیق احمد نظامی کے خطبۂ صدارت میں مولانا کی علمی، دینی اور خاندانی عظمت و وجاہت اور دوسرے متعدد پہلوؤں کا احاطہ بڑے دلکش انداز میں کیا گیا تھا، مسٹر راجیش پائلٹ نے ملک کے بدتر حالات اور سیاستدانوں کی غلط روی پر دکھ ظاہر کرتے ہوئے اس پر خوشی کا اظہار کیا کہ اب لوگوں کو کرپشن اور بدعنوانیوں کا احساس ہونے لگا ہے، انہوں نے ملک میں نفرت و انتشار پھیلا کر اسے کمزور کرنے والوں کے خلاف کمربستہ ہوجانے کی موثر اپیل کی۔

اسی روز سہ پہر کو مقالات کا پہلا جلسہ مولانا ڈاکٹر عبداللہ عباس ندوی کی صدارت میں ہوا، جس میں پانچ مقالے پڑھے گئے، ایک مقالہ خود جناب صدر کا تھا، ۱۷ مارچ کو مقالات کا دوسرا جلسہ ۹ بجے پروفیسر نثار احمد فاروقی کی صدارت میں ہوا جس میں دس مقالے پڑھے گئے، راقم نے اپنا مضمون اسی جلسہ میں پڑھا۔ سہ پہر کو تیسرے جلسہ کی صدارت پروفیسر محمد راشد ندوی نے کی۔ اس میں پانچ مقالے ہوئے، اس دو روزہ سمینار کی نظامت ڈاکٹر شبیر احمد ندوی ریڈر شعبۂ عربی لکھنؤ نے خوش اسلوبی سے کی۔ مقالات کے جلسوں کے بعد ۵ بجے اختتامی جلسہ ہوا جس سے مولانا سید ابوالحسن علی ندوی اور اترپردیش کے گورنر شری رومیش بھنڈاری نے خطاب کیا، اس موقع پر جناب اطہر نبی وائس چیرمین نے اردو اکادمی کے لیے جو مطالبات پیش کیے، گورنر صاحب نے کم و بیش انہیں منظور فرما کر اپنی اردو دوستی اور اقلیت نوازی کا ثبوت دیا، سمینار کی ساری کارروائی گومتی نگر لکھنؤ میں اکادمی کی شاندار عمارت کے پرشکوہ آڈیٹوریم میں ہوئی، لیکن مولانا سید عبدالحئی صاحب عرصہ تک ندوۃ العلماء کے ناظم رہے اس لیے اس کی جانب سے بھی مندوبین کو آخری روز مغرب بعد شبلی ہال میں ایک استقبالیہ دیا گیا، جس میں مولانا علی میاں مدظلہ، مولانا سید محمد رابع ندوی، پروفیسر خلیق احمد نظامی، پروفیسر نثار احمد فاروقی اور پروفیسر نگرامی کی تقریریں ہوئیں اس تقریب کا اختتام عشائیہ پر ہوا جس میں معززین شہری بھی شریک ہوئے۔

مولانا سید عبدالحئی صاحب ایک متبحر عالم اور بلند پایہ مصنف تھے ان کی اکثر تصنیفات عربی میں ہیں لیکن اردو میں بھی

بھی انکی قلمی فیاضیوں سے محروم نہیں رہی۔ تنہا گل رعنا ہی انکے اردو کا اچھا مصنف اور صاحب مذاق ہونے کا ثبوت ہے، اس لیے انکے علمی کمالات و خدمات کا اعتراف مناسب تھا، اتر پردیش اردو اکادمی خصوصاً اسکے حوصلہ مند اور فعال چیرمین پروفیسر محمد یونس نگرامی کی حق شناسی اور قدر دانی تحسین کی مستحق ہے جن کے جوش و ولولہ اور سرگرمی و جانفشانی سے یہ سمینار کامیاب رہا لیکن یہ بات ضرور محسوس کی گئی کہ لکھنؤ جو علم و ادب کا گہوارہ اور اصحاب ذوق کا مرکز ہے انکی اور یونیورسٹی اور کالجوں کے اساتذہ و طلبہ کی صورتیں مقالات خوانی کی نشستوں میں نظر نہیں آئیں۔ وجہ جو بھی رہی ہو لیکن اردو والوں اور اکادمی کے ذمہ داروں کو بھی اس پر غور کرنا چاہیے۔ سب کے تعاون ہی سے اردو کی خدمت ہو سکتی ہے اور اس کے مسائل حل ہو سکتے ہیں۔ علم و فن اور زبان و ادب پر کسی خاص طبقہ و گروہ کا اجارہ نہیں ہے، افتتاحی و اختتامی جلسوں میں شرکا کی تعداد اتنی زیادہ تھی کہ آڈیٹوریم ناکافی ہو گیا تھا مگر منتظمین نے اس کی طرف کوئی توجہ نہیں کی۔ مقالوں پر بحث و مذاکرہ کا موقع بھی نہیں دیا گیا۔

یہ خبر بڑے رنج و غم کے ساتھ سُنی جائے گی کہ ۱۵ مارچ کو دلی میں پروفیسر عثمان ادہمی کا انتقال ہو گیا، انکا آبائی وطن بستی تھا مگر انہوں نے علی گڑھ میں اپنا مکان تعمیر کرا لیا تھا، وہ مسلم یونیورسٹی میں حیاتیات کے پروفیسر تھے۔ انکی علمی اور تنظیمی صلاحیتوں کا اسوقت زیادہ اندازہ ہوا جب وہ سید حامد صاحب کی وائس چانسلری کے زمانے میں پراکٹر تھے اور غالباً انہی کی تحریک اور جناب حکیم عبدالحمید صاحب کی خواہش پر ادہمی صاحب یونیورسٹی سے سبکدوش ہو کر ہمدرد اسٹڈی سرکل کے ڈائرکٹر ہوئے، ان کی اور سید صاحب کی مشترکہ جد و جہد سے اس کوچنگ سنٹر سے گزشتہ چھ برسوں میں ستر آئی۔ اے۔ ایس منتخب ہوئے جو ایک بڑا کارنامہ ہے، وہ مولانا آزاد میموریل اکادمی کے صدر بھی تھے جو ایک زمانے میں ان کی جد و جہد سے سرگرم رہی، ادہمی صاحب ایک شریف انسان اور قوم و ملت کے خاموش اور مخلص خادم تھے، وہ نام و نمود اور صلہ و ستائش سے ہمیشہ بے پروا رہے۔ ان کی ذاتی زندگی بھی صاف اور پاکیزہ تھی، اللہ تعالیٰ مغفرت فرمائے، متعلقین کو صبر جمیل دے اور ہمدرد اسٹڈی سرکل اور قوم کو ان کا نعم البدل عطا فرمائے۔ آمین!

مقالات

مولانا[1] حکیم سید عبدالحئی کی ادبی نکتہ سنجی و سخن فہمی گل رعنا کی روشنی میں

از

ضیاء الدین اصلاحی

مولانا حکیم سید عبدالحئیؒ صاحب کے ذوق میں بڑا تنوع اور رنگارنگی تھی، انہوں نے مختلف میدانوں میں اپنے کمال کے جوہر دکھائے ہیں، اب تو یہ نہیں کہا جا سکتا مگر مولانا کے زمانے تک علماء کا یہ خاص وصف وامتیاز تھا کہ وہ علم و دین میں پختگی و رسوخ کے ساتھ شعر و ادب کے بھی ماہر ہوتے تھے اور اس کا بڑا عمدہ اور ستھرا ذوق رکھتے تھے اور ان کی قلم رو میں نثر ہی کی طرح نظم بھی داخل ہوتی تھی۔

مولانا سید عبدالحئیؒ صاحب اردو، فارسی اور عربی تینوں زبانوں کے ادب میں بلند پایہ رکھتے تھے، انہوں نے بعض وجوہ سے اپنی علمی، تحقیقی اور تصنیفی سرگرمیوں کے لیے عربی زبان کا انتخاب کیا اور اس میں ان کے اصل تصنیفی موضوعات تاریخ، تاریخ علوم و فنون، مذہب، تذکرہ و سوانح تھے، جن میں ادبی کمال دکھانے کا موقع کم ہوتا ہے، مگر ان کی سلیس و شگفتہ عربی تحریروں سے ادبی رعنائی و لطافت اور طرز ادا کی دلکشی و دلآویزی پوری طرح عیاں ہے۔

---

[1] یہ مضمون مولانا پر ہونے والے اتر پردیش اردو اکادمی لکھنؤ کے سمینار میں، ۸ مارچ ۱۹۹۶ء کو پڑھا گیا تھا، اب بعض اضافوں کے ساتھ اسے معارف میں شایع کیا جا رہا ہے۔ "ض"

یہی حال ان کی اردو تحریروں کا بھی ہے جو مولانا کی ملکی اور مادری زبان تھی مگر وہ اس کی جانب بس کسی خاص تقریب یا تحریک ہی سے متوجہ ہوتے تھے اور ایسی سلیس، صاف، شیریں اور شگفتہ اردو تحریر ان کے قلم سے نکلتی تھی جو متانت وحلاوت کی لطیف آمیزش اور علمی سنجیدگی کے ساتھ زبان کی چاشنی سے معمور اور ادب وانشا کا دلکش نمونہ ہوتی تھی۔

خالص دینی ماحول میں نشو ونما پانے اور ایک متقشف مذہبی عالم ہونے کے باوجود مولانا کو شعر وسخن سے فطری وموروثی ذوق تھا، ابتدا میں وہ فکر سخن بھی فرماتے تھے، اردو، فارسی، اور عربی تینوں زبانوں میں کلام موجود ہے، مگر جوانی گئی تو شاعری کا کوچہ بھی چھوڑ دیا، تاہم ذوق سلیم اور شعر وسخن کا ملکہ خداداد تھا، اپنے پیشہ کی مصروفیت، ندوۃ العلماء کے انتظامی وتعلیمی امور، گوناگوں علمی اشتغال اور تصنیفی انہماک بھی شعر وسخن کی دلچسپی کم نہ کرسکا اور ہمیشہ اچھے شعر سے لطف اندوز ہوتے اور اس کی داد بھی دیتے۔

یہاں شاعری میں مولانا کا درجہ ومرتبہ زیر بحث نہیں، دراصل ان کو شعر گوئی سے زیادہ شعر فہمی کا ملکہ تھا اور وہ سخن گو سے بڑھ کر سخن فہم تھے، سخن فہمی، ذوق سلیم، نقد شعر میں بصیرت، زبان وبیان کی آگہی، ادب وبلاغت کی رمز شناسی، نکتہ رسی اور دقیقہ بینی ان کا طرۂ امتیاز ہے، جس کا ثبوت ان کی اردو تصنیف "گل رعنا" ہے جس کو عام طور پر قدیم طرز کا اردو شعرا کا ایک تذکرہ سمجھا جاتا ہے اور یہ بیجا بھی نہیں، تاہم اس کے چند اور امتیازات وخصوصیات بھی ہیں جن کی طرف شروع ہی میں اشارہ کردینا مناسب ہوگا۔

---

[1] ان کے والد بزرگوار مولانا فخرالدین خیالی ایک قادرالکلام شاعر، مورخ اور صاحب تصانیف کثیرہ تھے، ان کا سب سے اہم کارنامہ مہر جہاں تاب ہے جس کے ایک دفتر میں عربی، فارسی، اردو اور بھاشا شاعروں کے تذکرے علیحدہ علیحدہ درج کیے ہیں۔

مولانا کے بچپن میں ان کے اکثر خاندانی بزرگوں کے پاس بیاض ہوتی تھی اور جو جس مذاق کا ہوتا تھا اس کی بیاض بھی اسی نوعیت کی ہوتی تھی، یہ دیکھ کر ان کو بھی بیاض بنانے کا شوق ہوا، گو ان کا اصل پیشہ طبابت تھا مگر ان پر شعر و ادب، نقد شعر اور سخن فہمی کا ذوق غالب تھا اس لیے وہ اپنی بیاض میں اپنے دور تک کے خاص خاص شعرا کے اچھے اور اپنے پسندیدہ اشعار نقل کرتے رہے۔

بچیس تیس برس کی عمر تک یہ شغل جاری رہا، اس کے بعد علمی و تعلیمی مصروفیتیں اور تصنیفی مشاغل بڑھ جانے کی وجہ سے بیاض پس پشت ہوگئی، البتہ انتقال سے دو تین برس پہلے نقرس، وجع مفاصل اور دوسری بیماریوں کی وجہ سے نقل و حرکت سے معذور اور مطالعہ و تصنیف سے محروم ہو گئے جو ان کی گھٹی میں پڑے ہوئے تھے اور اس کے اس قدر عادی ہو گئے تھے کہ اس کے بغیر رہ نہیں سکتے تھے، اس زمانے میں ان کو ایسی کتابوں کی تلاش ہوئی جن سے دماغ پر زیادہ زور نہ پڑے، اتفاق سے اسی تلاش و جستجو میں یہ بیاض ہاتھ لگی جسے دیکھ کر خیال ہوا کہ اس میں مشہور شاعروں کا کلام اتنا جمع ہو گیا ہے کہ اسے ترتیب دے کر اور اس میں شعرا کے مختصر حالات کا اضافہ کر کے شایع کر دیا جائے تو قارئین کی دلچسپی کا سامان ہوگا۔ اس مقصد سے مختلف تذکرے جمع کیے اور کام شروع کیا تو یہ خاصی کتاب وجود میں آگئی (دیباچہ کتاب ص۳)

مولانا عبدالحئی صاحب نے شعرا کے حالات قلمبند کرنے کے لیے جب تذکروں اور مراجع کی کتابوں کا مطالعہ شروع کیا تو ان میں ان کو جہاں تشنگی اور کمی یا رنگ آمیزی اور غلط بیانی نظر آئی ان کی اصلاح و تصحیح بھی فرمادی، اس سلسلے میں ڈاکٹر سید عبداللہ مرحوم کا یہ بیان قابل توجہ ہے:۔

"جب سے انجمن ترقی اردو کی کوشش سے اردو کے قدیم تذکرے چھپنے لگے ہیں، آب حیات کے بعض بیانات غلط ثابت ہو رہے ہیں، اس کے بعد سے اب تک تنقیدوں کا سلسلہ جاری ہے۔"

ڈاکٹر صاحب نے مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی مرحوم، مولوی عبدالحق بابائے اردو، شیخ چاند مصنف سودا، مولانا عبدالحیٰ مصنف گل رعنا اور پروفیسر حافظ محمود خاں شیرانی کو آب حیات کے نقادوں میں بتاتے ہوئے لکھا ہے:

"مولانا عبدالحیٰ نے بھی کم و بیش تیس چالیس موقعوں پر آزاد سے اختلاف کیا ہے ... جس قدر انسانی علم ترقی کرتا جاتا ہے اور نئی نئی باتیں دریافت ہوتی جاتی ہیں، اسی قدر پرانی کتابوں میں ترمیم و اصلاح کی گنجایش زیادہ ہوتی جاتی ہے اور ایک لحاظ سے یہ بہت اچھی بات ہے، کیونکہ اس سے کتابوں کے داغ دھل جاتے ہیں اور نقائص کم ہو کر خوبیاں نمایاں ہو جاتی ہیں۔" (شعرائے اردو کے تذکرے اور تذکرہ نگاری کا فن ص۲۱ شایع کردہ مکتبہ جدید لاہور ۱۹۵۲ء)

یہ صحیح ہے کہ آب حیات کی غلطیوں کی تصحیح خاص طور پر گل رعنا میں کی گئی ہے لیکن دوسرے تذکرہ نگاروں کے بعض خیالات سے اختلاف و اتفاق کی مثالیں بھی اس میں موجود ہیں، مثلاً میر محمد تقی میر نے نکات الشعرا میں شعرائے دکن کا ذکر میر عبدالولی عزلت کی بیاض سے نقل کیا ہے مگر مصنف گل رعنا کو ان سے اولاً تو یہ شکایت ہے کہ حال تو کچھ لکھا نہیں کسی کے ایک دو شعر، کسی کے کچھ زیادہ لکھے ہیں ثانیاً ان کی نسبت جو رائے قائم کی ہے وہ ان ہی کے الفاظ میں یوں نقل کی ہے:

"یکے از شاعران سمت دکن کہ بے رتبہ اند مگر بعض چنانچہ ولی و سید عبدالولی و

سراج و آزاد کہ معاصر ولی بود سررشتہ مضبوط گوئی بدست ایشاں یافتہ می شود باقی سر کلافہ داشتہ اند" (ص۵۶)

یہ عبارت گنجلک ہے، ڈاکٹر محمود الٰہی نے نکات الشعرا کو از سر نو ایڈٹ کر کے شایع کیا ہے اس میں یہ عبارت اس طرح ہے:

"مخفی نماند کہ شاعران سمت ملک دکن اکثر بے رتبہ اند مگر بعضے چنانچہ ولی محمد کہ صاحب دیوان مشہور و معروف است و سید عبدالولی عزلت و سراج و آزاد کہ ہم عصر ولی بود و عارف علی خاں عاجز کہ سررشتہ مربوط گوئی بدست ایشاں افتادہ است و باقی ہمہ درست حرف زدن نمی دانستند تا بہ شعر گوئی چہ نسبت لہذا بر اشعار اکثر آنہا اکتفا کردہ نوشتہ می آید۔" (ص۹۰)

اب میر صاحب کے اس بیان پر مصنف گل رعنا نے جو رد و کد کی ہے اسے ملاحظہ فرمائیے!

"میر صاحب نے جن شاعروں کا ذکر کیا ہے اور جو کلام ان کا انہیں ملا ہے اس کے لحاظ سے یہ رائے ان کی صحیح ہو تو ہو مگر اصلیت اور واقعہ کے اعتبار سے غلط اور بالکل غلط ہے، میر صاحب نے دکن کے سینکڑوں شعرا میں سے کم و بیش پچیس ہی شاعر کا ذکر کیا ہے، ان سینکڑوں میں بیسیوں ایسے ہیں جو میر عبدالولی عزلت سے بہتر شعر کہتے ہیں۔

کسی کے ایک دو شعر پڑھ کر اسکی نسبت جو رائے قائم کی جائے گی وہ اصلیت سے دور ہوگی، مرزا داؤد کا صرف ایک شعر میر صاحب کو ملا ہے، حالانکہ ان کے دیوان میں پانسو شعر سے کم نہیں، اگر تم اسی ایک شعر کو پڑھ کر سارے دیوان کو خرافات کہہ دو

تو اس سے زیادہ زبردستی کیا ہو سکتی ہے،

جن لوگوں کی خبر میر صاحب کو نہیں ہوئی، ان میں سے میر عاشق علی خاں ایما، میر غلام علی ارشد، مرزا علی نقی خاں ایجاد، میر عبدالحئی خاں صادم، عارف الدین عاجز، میر ادلاد محمد ذکا، لچھمی نرائن شفیق اور بہت سے ایسے شعرا ہیں جن کے ہاں زبان کی صفائی، خیالات کی رنگینی اور پختگی کلام کے تمام لوازم موجود ہیں" (گل رعنا ص۸۶-۹۶، طبع پنجم عکسی اڈیشن)

میر قدرت اللہ قدرت کو میر تقی میر نے عاجز سخن بتایا ہے اور نکات الشعرا میں ان کا صرف ایک شعر نقل کیا ہے، مصنف گل رعنا تحریر فرماتے ہیں:

"ممکن ہے کہ قدرت کا بہترین کلام میر صاحب تک نہ پہنچا ہو یا ان کی کسی بات پر چڑھ گئے ہوں اور ان کو یاران بزم میں شریک کرنا پسند نہ کرتے ہوں، قدرت کے قادر الکلام ہونے میں کچھ شک نہیں، ایسے شخص کو عاجز سخن کہنا میر صاحب کی زبردستی ہے" (ص۲۰۵)

انعام اللہ خاں یقین حضرت مرزا مظہر کے شاگرد رشید تھے، میر صاحب ان سے بہت خفا ہیں، مصنف گل رعنا نکات الشعرا سے ان کا بیان نقل کرکے اس پر یہ تبصرہ کرتے ہیں:

"میر صاحب کی زبردستی دیکھو۔ یقین کا دیوان ان کی سخن گوئی کی زندہ شہادت ہے، ایسے سخن گو کی سخن فہمی کا انکار کرنا میر صاحب کی زبان سے اچھا نہیں لگتا، اس سے بھی زیادہ ستم ظریفی یہ ہے کہ ان کے معاصرین میں سے کچھ لوگ سرے سے یقین کے کلام کو مرزا صاحب کی طرف منسوب کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ یقین کو شعر کہنا ہی نہیں آتا تھا" (ص۱۹۲)

آزاد اور میر صاحب ہی پر موقوف نہیں وہ دوسرے تذکرہ نگاروں کی غلط بیانی کی اصلاح بھی کرتے ہیں، میر حسن نے میر محمد حسین کلیم دہلوی کے بارے میں تحریر کیا ہے کہ در ہندی

نثر کتاب بے نیز ایجاد کردہ" مصنف گل رعنا اس کی تصحیح کرتے ہوئے لکھتے ہیں :

"اس سے شبہ ہوتا ہے کہ ان سے پہلے کسی نے نثر اردو میں کوئی کتاب نہیں لکھی، مگر یہ صحیح نہیں، مقدمہ میں میں نے بیان کیا ہے کہ فضلی نے دہ مجلس ۱۱۴۵ھ میں لکھی تھی" (ص۱۱)

اس کی مزید تفصیل کی گنجایش نہیں، ہمارا مقصد یہ دکھانا ہے کہ گل رعنا میں آب حیات کی طرح دوسرے تذکرہ نگاروں کے غلط آرا و خیالات کی بھی تصحیح کی گئی ہے۔ جو اس بات کا نتیجہ ہے کہ مصنف کی اردو شاعری پر وسیع و عمیق نظر ہے اور وہ اس کا اچھا مذاق رکھنے کے علاوہ نکتہ سنج اور سخن فہم بھی تھے۔

دوسری اہم چیز کتاب کا عالمانہ و محققانہ مقدمہ ہے جس میں اردو زبان و شاعری کی تاریخ اور ان کے عہد بعہد ارتقا کا حال بیان کیا گیا ہے، مصنف نے دراصل اس کتاب کو تین طبقات میں تقسیم کیا ہے اور ہر طبقہ کو تین دور میں منقسم کیا ہے، مقدمہ میں ہر طبقہ و دور کے اہم اور نمایاں شعرا کے امتیازات اور ہر دور کی ممتاز خصوصیات اور زبان و شاعری میں ہونے والی اصلاحات و تعبیرات پر مبسوط تبصرہ کر کے شعر و ادب میں اپنی قابلیت، وسعت نظر، پختگی اور مذاق سخن کی بلندی کا ثبوت بہم پہنچایا ہے۔ اسی لیے ڈاکٹر رام بابو سکسینہ نے مولانا عبدالسلام ندوی کی تصنیف لطیف شعر الہند کے ضمن میں اسکے ساتھ ہی گل رعنا کی بھی یہ خصوصیت بتائی ہے :

"اور مثل مولوی حکیم عبدالحئی صاحب مرحوم کے گل رعنا کے جو قدیم طرز کا تذکرہ ہے، اس میں بعض خاص خاص باتیں ایسی ہیں جو دوسری کتابوں میں نہیں ملتیں" (تاریخ ادب اردو حصہ نثر ص۵۲ تیج کمار بکڈپو، لکھنؤ)

اور خود مصنف شعر الہند مولانا عبدالسلام ندوی رقم طراز ہیں :-

"اس زمانے میں یہ ضرورت محسوس ہورہی تھی کہ اردو کے تمام مشہور اساتذہ کے حالات میں ایک مبسوط اور محققانہ تذکرہ مرتب کیا جائے اور اس میں ان تمام اساتذہ کے کلام پر تبصرہ ہو جنھوں نے اردو شاعری کو ترقی دی ہے' مولانا عبدالحئی صاحب مرحوم سابق ناظم ندوۃ العلماء نے اسی ضرورت کو پیش نظر رکھ کر ایک مبسوط تذکرہ "گل رعنا" کے نام سے مرتب فرمایا تھا جو آج ان کی وفات کے دو سال بعد دارالمصنفین کی طرف سے شایع ہورہا ہے، اس میں سب سے پہلے اردو زبان اور اردو شاعری کی تاریخ درج کی گئی، اس کے بعد شعرائے دکن کا تذکرہ ہے، پھر ہر دور کے شعراء کے حالات ہیں جن کا خاتمہ اساتذہ دور جدید مثلاً مولانا حالی اور سید اکبر حسین وغیرہ پر ہوا ہے" (شذرات معارف جنوری ۱۹۲۵ء)

اس وضاحت کا مقصد بھی یہ ہے کہ گل رعنا محض ایک عام تذکرہ نہیں ہے بلکہ مستند تذکرہ ہے جس میں شاعری اور اردو زبان کی تاریخ اور اس میں عہد بعہد کے تغیرات و اصلاحات اور ہر دور کے اساتذہ سخن کے خصوصیات کلام پر عالمانہ و ماہرانہ تبصرہ ہے' جس سے مصنف کی اردو زبان و شاعری سے غیر معمولی واقفیت واطلاع اور شعر و سخن کے اداشناس ہونے کا پتہ چلتا ہے۔

تیسری مفید اور بیش قیمت چیز گل رعنا کے محققانہ حواشی ہیں جن میں اس کے متن میں وارد اشخاص و رجال کے متعلق گوناگوں اطلاعات و معلومات فراہم کیے گئے ہیں ان میں شاعر و ادیب اور دوسرے طبقوں کے اہل کمال اور سلاطین و امرا کا مستند حال بیان کیا گیا ہے اور یہ بھی ان کے حسن ذوق اور بالغ نظری کا ثبوت ہیں۔

گل رعنا کی چوتھی اور بڑی اہم خصوصیت مصنف کی سخن فہمی، شعری و ادبی بصیرت'

بلاغت شناسی، دیدہ وری، نکتہ رسی اور شعروادب سے لطف لینے اور اس کی داد دینے کی صلاحیت ہے، چنانچہ خود مصنف اپنے دیباچہ کے آخر میں لکھتے ہیں:

"امید ہے کہ بزرگانِ سخن فہم اس کی قدر فرمائیں گے" (ص۹)

بلاشبہ بعض بزرگان سخن فہم نے اس کی قدر افزائی کی، مولوی عبدالحق صاحب فرماتے ہیں:

"عام طور پر لوگ اس سے لاعلم تھے کہ مولانا مرحوم اردو زبان وادب کا ایسا اچھا ذوق رکھتے تھے... ہر شاعر کے کلام سے نمونہ بھی دیا گیا ہے جس سے فاضل مولف کی وسعتِ نظر کا ثبوت ملتا ہے... ہر شاعر کے کلام پر بہت ہی منصفانہ رائے کا اظہار کیا گیا ہے" (رسالہ اردو جولائی ۱۹۲۵ء)

یہی منصفانہ رائے کا اظہار اس کا ثبوت ہے کہ ع ہم سخن فہم ہیں غالب کے طرفدار نہیں

نواب صدر یار جنگ مولانا حبیب الرحمن خاں شروانی مرحوم نے ایک مرتبہ مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کو اپنے پہلو میں بیٹھا کر فرمایا:

"کتاب (گل رعنا) پڑھ کر ہی معلوم ہوا کہ مولانا کو سخن فہمی اور ادب و شاعری کا ایسا ذوق عطا ہوا ہے" (حیات عبدالحئی ص۲۳۳)

مولانا شروانی ان کے ذوق ادب و شعر اور سخن فہمی کے ایسے معترف تھے کہ ان کے پاس اپنی غزلیں بھیجتے تھے، ایک دفعہ ان کو اپنی کوئی فارسی غزل بھیجی مولانا نے شاید تواضعاً نواب صاحب کو لکھا ہوگا کہ میری تحسین، تحسین ناشناس ہوگی، اس کے جواب میں نواب صاحب فرماتے ہیں:

"آپ بھی ناشناس ہیں تو سخن شناس کون ہوگا، صاحب ذوق سلیم جس کے دل میں درد

کی چاشنی ہو ضرور شعر فہم ہوگا، ذوق نہ ہوتا تو قند پارسی کیوں کام بخش ہوتا۔ درد نہ ہوتا تو خاک رہ جاناں کی حسرت دل میں کس طرح ہوتی، ذوق ہم دردی ورا تہ آہنگی کی سلسلہ جنبانی کرتا ہے، نوائے دل پر توجہ فرمائیے کہ کس پردہ سے اٹھ رہی ہے"

(حیات عبدالحئی ص۲۲۵)

مولانا عبدالحئی صاحب کے فخر روزگار فرزند مولانا سید ابوالحسن علی ندوی نے جن کا شعری وادبی ذوق بہت عمدہ اور رچا ہوا ہے، حیات عبدالحئی میں جابجا ان کے ذوق سلیم اور ملکہ سخن فہمی کی توثیق کی ہے، مولانا کے عہد و ماحول کا تذکرہ کرنے کے بعد تحریر فرماتے ہیں:

"اس ماحول اور اس انداز کی تعلیم و تربیت میں شعر و سخن کا ذوق سلیم اور سخن فہمی کا مذاق صحیح نہ پیدا ہونا تعجب ہے، چنانچہ یہ مذاق نہ صرف یہ کہ پیدا ہوا بلکہ اس نے اس حد تک ترقی کی کہ ان کے قلم سے اردو شعرا کا ایک تذکرہ مرتب ہوا جو ان کی زندگی کے بعد "گل رعنا کے نام سے شایع ہوا" حیات عبدالحئی ص۱۳۱)

ایک جگہ مولانا کے مختلف و متضاد اوصاف و کمالات یوں بیان فرماتے ہیں:

"قدیم ماحول، خالص دینی تعلیم اور دولت باطنی کے ساتھ ادب وانشا اور شعر و شاعری کا اعلیٰ مذاق اور نقد سخن کا ملکہ راسخ" (حیات عبدالحئی ص۳)

ایک جگہ مولانا کی اسی خصوصیت کو یوں نمایاں کیا ہے:

"آپ کا کمال اور جوہر سخن فہمی کا ملکہ خداداد ہے، تاریخ نکالنے کی آپ نے مشق نہیں کی تھی مگر نکالتے تھے تو خوب نکالتے تھے" (حیات عبدالحئی ص۲۵۴)

ان خارجی شہادتوں کے بعد وقت آگیا ہے کہ اب ہم خود گل رعنا کی داخلی شہادتوں سے مولانا کی شعر فہمی کے کمال اور ادبی نکتہ رسی کے جوہر کو دکھائیں۔

مقدمہ میں مولانا نے اردو شاعری کے تین طبقے قائم کیے اور ہر طبقہ کو تین تین دور میں تقسیم کیا ہے، اسی طبقہ و دور بندی کے لحاظ سے اصل کتاب میں شعرا کا تذکرہ لکھا اور ان کے کلام کا نمونہ دیا ہے، مقدمہ میں طبقات کی تقسیم سے پہلے وہ اردو شاعری کی حقیقت سناتے اور اس کا مرکز ثقل دکن سے دہلی منتقل ہونے کا ذکر کرتے ہیں، اس میں ایک ہی شاعر کے دو مختلف پیرایہ بیان یا جدا جدا رنگ و انداز کی نشاندہی کرتے ہیں، اس سے ان کے سخن فہمی کے ملکہ خداداد کا اندازہ ہوتا ہے، پہلے ہم اسی بحث کو لیتے ہیں۔

اردو کا مرکز ثقل جس زمانے میں دکن سے دہلی منتقل ہوا، اسی زمانے کے ایک بڑے شاعر قزلباش خاں امید تھے، اہل ہند کے ساتھ ان کی گرم جوشیاں مشہور ہیں، ان کا قیام پہلے اورنگ آباد میں رہا، پھر یہ دہلی آئے، مولانا پہلے ان کا یہ شعر نقل کرتے ہیں:

بامن کی بیتی آج مری آنکھ موں پہ ہے غصہ کیا دکالی دیا در وگر لی[1] (گل رعنا صفحہ ۷۹)

پھر آگے انہی کے یہ دو شعر بھی نقل کیے ہیں:

در و دیوار سے اب صحبت ہے یار بن گھر میں عجب صحبت ہے

تری آنکھوں کو ڈرتا ہوں الحفیظ الحفیظ کہتا ہوں (ایضاً ص ۳۰)

ایک ہی شاعر کے یہاں دو طرح کا رنگ کیوں پیدا ہوا مولانا کی نکتہ شناس طبیعت اور اردو شاعری کے رنگ و آہنگ سے آشنا ذہن نے اس کی یہ وجہ بتائی ہے:

"ان تینوں کو ملا کر دیکھو معلوم ہوتا ہے کہ پہلا شعر کسی اور کا ہے یا پچھلے دو شعر امید کے نہیں ہیں، مگر یہ تینوں شعر ان ہی کے ہیں۔ پہلا شعر اس وقت کا ہے جب ان کو نیا نیا شوق پیدا ہوا تھا اور یہ دکن میں تھے، ہندوستان میں رہتے رہتے زبان لاتی

---

[1] آخری لفظ پڑھا نہیں گیا۔

صاف ہوگئی تھی کہ یہ دو شعر نہایت صاف اور سادہ کہہ سکے، میر تقی میر کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ دونوں شعر دلی کی کمائی ہے۔" (ص ۳۰ و ۳۱)

ہر شاعر کا رنگ سخن جدا اور طرز ادا مختلف ہوتا ہے، بعض شعرا کے طرز کلام کا فرق دقیق ہوتا ہے، اس کی وجہ سے اکثر لوگوں کو دھوکا ہو جاتا ہے مگر بعض بعض کے کلام کا فرق بہت نمایاں ہوتا ہے، شیخ محمد ابراہیم ذوق بہادر شاہ ظفر کے استاد تھے، دونوں کے کلام میں وہی فرق ہے جو استاد اور شاگرد کے کلام میں ہوتا ہے، اس کے باوجود شمس العلما مولانا محمد حسین آزاد کا شاگرد کے دواوین کو سراپا استاد کا طبع زاد بتانا سخت عجیب ہے، مصنفِ گل رعنا نے اس کی تردید میں جو کچھ لکھا ہے وہ ان کی سخن شناسی اور صحت مذاق ہی کا نہیں حقیقت شناسی اور انصاف پسندی کا بھی ثبوت ہے، ملاحظہ ہو:

"لطف یہ ہے کہ چاروں دیوان اس بدنصیب بادشاہ کے چھپ چکے ہیں اور حضرت ذوق کا بھی تھوڑا بہت جو کچھ کلام مل سکا ہے وہ ایک دیوان کی شکل میں شایع ہو چکا ہے، ان دونوں کو پڑھو اور ہر ایک کے انداز سخن پر غور کرو پھر اپنی فطرت سلیم سے فتوی لو، دونوں کی حیثیتیں جداگانہ نظر آئیں گی، ذوق پھر بھی ذوق ہیں، ظفر کے استاد۔ ان کے کلام کی رنگینی، ترکیب کی چستی، مضمون کی بندش، جوش و خروش، انکی باتیں ان کے ساتھ ہیں۔ ظفر کے ہاں جو سامان نظر آئے گا وہ اس سے ملتا جلتا ہوگا اور ہونا بھی چاہیے، کیونکہ استاد کا رنگ شاگرد میں آنا ضرور ہے مگر پھر بھی وہ دوسری طرح کا ہوگا، محاوروں کی فراوانی یہاں زیادہ ملے گی مگر جوش و خروش کی جگہ دل وجگر کے ٹکڑے حروف و الفاظ بن کر آنسوؤں کی سیاہی اور آہ جگر دوز کے قلم سے لکھے ہوئے تم کو ملیں گے، اب انھیں ظفر کا سمجھو یا ذوق کا۔" (گل رعنا ص ۲۹۰)

مولانا نے بعض شاعروں کے اشعار کے عیب و ہنر اور ان کی خوبی و خامی اور حسن و قبح دکھائے ہیں، اس سے ان کے مذاق سخن کی بلندی اور شعر فہمی کے کمال کا پتہ چلتا ہے۔

کبھی صرف ایک دو فقرہ لکھ کر اپنی تحسین ظاہر کر دی ہے جس کے بعد شعر نقل کیا ہے، اسے پڑھنے سے واقعی ان کے کمال سخن سے آشنا ہونے کا اچھی طرح اندازہ ہوتا ہے مثلاً مرزا مرتضیٰ قلی فراق فارسی کے کہنہ مشق شاعر تھے۔ ان کے بارے میں لکھتے ہیں "اردو میں فرماتے ہیں اور خوب فرماتے ہیں" پھر یہ شعر پیش کرتے ہیں۔

تماشا اس چمن کا کس کے دل کو شاد کرتا ہے کہ یاں اک لب تبسم غنچہ کو برباد کرتا ہے

اسیروں کی قسم تجھ کو صبا سچ کہہ کہ گلشن میں کوئی ان ہم نواؤں سے ہمیں یاد کرتا ہے

مومن و غالب کے طرز ادا کی ایک خاص خوبی یہ بتائی ہے کہ اکثر موقعوں پر مضمون کے بعض اجزا کو چھوڑ جاتے ہیں جس سے ایک خاص لطف پیدا ہو جاتا ہے، یہ وہ موقعے ہوتے ہیں جہاں سننے والوں کا ذہن خود بخود اس جز کی طرف منتقل ہو سکتا ہے، مگر مولانا عبدالحئی صاحب اس سے آگاہ فرماتے ہیں کہ یہ شاعری کا ایک نازک پہلو ہے جس میں کبھی بے اعتدالی پیدا ہو جاتی ہے[1] جس کی وجہ سے شعر سخت پیچیدہ ہو جاتا ہے، مولانا نے

---

[1] مولانا عبدالحئی صاحب نے حکیم مومن خاں کے تذکرہ میں ان کی اس خصوصیت کے بارہ میں لکھا ہے "ان کے طرز ادا میں ایک بات اور بھی ہے جس کو مولانا شبلی نے شعر العجم میں خصوصیات غالب میں بیان کیا ہے کچھ شک نہیں کہ مرزا غالب بھی ان کے ساتھ شریک ہیں مگر مومن کے یہاں یہ بات بہت نمایاں ہے کہ اکثر موقعوں پر مضمون کے بعض اجزا چھوڑ جاتے ہیں جس سے ایک خاص لطف پیدا ہو جاتا ہے، یہ وہ موقعے ہوتے ہیں جہاں سننے والے کا ذہن خود بخود اس جز کی طرف منتقل ہو سکتا ہے، یہ شاعری کا ایک نازک پہلو ہے جس میں کبھی بے اعتدالی بھی پیدا ہو جاتی ہے (بقیہ حاشیہ ص ۲۵۸ پر)

مومن خاں کے بعض اشعار کو اکثر اسی پیچیدگی پر مبنی قرار دیا ہے اور مثال میں ان کا یہ شعر نقل کیا ہے:

ڈرتا ہوں آسمان سے بجلی نہ گر پڑے صیاد کی نگاہ سوئے آشیاں نہیں

مولانا کی تشریح ملاحظہ کیجیے:

"کہنا یہ ہے کہ اہل دنیا کا ایک نہ ایک بلا میں مبتلا رہنا ضرور ہے، اس لیے جب کبھی میں ایک بلا سے محفوظ ہوتا ہوں تو دوسری بلا کا منتظر رہتا ہوں مگر جب تک یہ جملہ کہ اہل دنیا کا ایک نہ ایک بلا میں مبتلا رہنا ضرور ہے، بڑھایا نہ جائے عام ذہن معنی مقصود کی طرف منتقل نہیں ہوتا، مگر شاعر نے اس کے ذکر نہ کرنے میں لطافت رکھی ہے کہ اس نے گویا قصداً ذکر نہیں کیا، اس لیے کہ یہ بات ایسی بدیہی ہے کہ اسکے جتانے کی کچھ ضرورت نہیں" (گل رعنا ص ۲۶۴)

مصنف گل رعنا نے طبقہ متاخرین کے دور اول کے شعرا امام بخش ناسخ اور خواجہ حیدر علی آتش اور ان کے متبعین کی یہ خصوصیت بتائی ہے کہ انھوں نے استعاروں اور تشبیہوں سے کلام میں زور پیدا کرنے کی کوشش کی مگر اس میں وہ حد اعتدال سے گزر گئے۔ صفت در صفت اور استعارہ در استعارہ کر کے کلام کو اتنے ایچ پیچ میں ڈال دیا ہے کہ اس گورکھ دھندے کو کھولتے کھولتے مطلب غائب ہو جاتا ہے اور اکثر کوہ کندن و کاہ برآوردن کی مثل اس پر ٹھیک اترتی ہے، خواجہ آتش کے یہاں صاف تشبیہیں، استعارے اور حسن تعلیل کی مثالیں کثرت سے مل سکتی ہیں مثلاً:

(بقیہ حاشیہ ص ۲۵۷) جس کی وجہ سے شعر سخت پیچیدہ ہو جاتا ہے اور اس کے سمجھنے میں کاوش فکر کی ضرورت پڑتی ہے" (ص ۳۰۶)

صبحِ بہار ہے مجھے ساقی پلا شراب سب جانتے ہیں عید کا روزہ حرام ہے

نیلوفر آنکھ ہے مرے دریائے حسن کی شبرنگ مردمک نہیں بھنورا کنول میں ہے

غنچے شگفتہ ہوتے ہیں آئی ہے فصل گل کپڑوں کو پھاڑنے کی بہار آجکل میں ہے

مے گلرنگ سے جھلکی جو سرخی پان کی اس میں گلوئے یار پر عالم ہوا شیشہ کی گردن کا

صیاد حسن کھیلتا ہے جب شکار عشق بلبل کو پھانستا ہے رگ گل کے دام سے

اے مرغ دل ہے فاصلہ اس زلف و خال میں دانہ ترے نصیب کا باہر ہے دام سے

فصل بہار آئی مبارک ہوا ے جنوں خار اور آبلہ سے ملاقات راہ کی

سفر ہے شرط مسافر نواز بہتیرے ہزارہا شجر سایہ دار راہ میں ہے

مگر ان کے حریف شیخ امام بخش ناسخ اپنی دقت پسندی کی وجہ سے بال کی کھال نکالنے کے عادی ہیں، سیدھی بات بہت کم کہتے ہیں، کہتے بھی ہیں تو بے مزہ کہتے ہیں آیئے مولانا کی سخن فہمی کا تماشا دیکھنے کے لیے ناسخ کے کچھ اشعار پر ان کا نقد و تبصرہ دیکھیں، شیخ ناسخ کا شعر ہے:

ابھی ہر چند وہ بت نوجواں ہے سفید اس کا مگر موئے میاں ہے

مصنفِ گل رعنا فرماتے ہیں:

" حسب معمول کمر کو بال سے تشبیہ دی، پھر بال کے اوصاف اس کے لیے ثابت کر کے بدن کے لحاظ سے کمر کو سفید قرار دیا ہے پھر کمر کا بال سے استعارہ کر کے اسکی سفیدی پر اظہار تعجب کر دیا، ان نکتہ آفرینیوں کے بعد مطلب یہ نکلا کہ بال بڑھاپے میں سفید ہوا کرتے ہیں، مگر تعجب ہے کہ معشوق کا بال جوانی میں سفید ہو گیا" (ص۲۵)

مولانا ارشاد فرماتے ہیں کہ اس بدمزہ مضمون کو بیسیوں جگہ متعدد طریقے سے ادا کیا ہے، ایک جگہ یوں فرماتے ہیں:

آرائش جمال خدا داد عیب ہے موئے کمر کو ذوق نہیں ہے خضاب کا

چند اور مثالوں سے مولانا کی شعر فہمی اور نکتہ وری کا کمال دیکھو، فرماتے ہیں:

ایک جگہ چاند کہ سات سیاروں میں سے ایک وہ بھی ہے۔ خانہ نشیں بنا کر اس کو ثابت فرض کیا، پھر گھر سے نکال کر اس کے سیارہ ہونے پر اظہار تعجب کرتے ہیں۔

وہ مہ خانہ نشیں گلیوں میں آوارہ ہوا اے منجم دیکھنا ثابت بھی سیارہ ہوا

مصنف گل رعنا لکھتے ہیں:

"معشوق کی آنکھ کو بہ لحاظ وحشت چشم غزال سے تشبیہ دی جاتی ہے، انھوں نے ستم ظریفی یہ کی کہ پہلے تو آنکھ کا استعارہ غزال چشم سے کیا، چونکہ وہ جانور ہے اس لیے اس کے واسطے چارے کی بھی فکر کرنی پڑی۔"

چشم بد دور آج آتے ہیں نظر رخسار صاف سبزۂ خط کیا غزال چشم کا چارہ ہوا

اسی مضمون کو خواجہ آتش نے بھی باندھا ہے مگر طرز ادا نے ان کے شعر کو کس قدر مزے دار کر دیا۔

خط پر جو آئینہ میں پڑے ہے نگاہ یار آہوئے چشم مست ہیں سبزہ چرے ہوئے

رنگ اڑنے کو طیر اور رنگ حنا کو طائر سے تشبیہ دینا ایک معمولی بات ہے، شیخ صاحب نے اس سے یہ بات نکالی ہے کہ طائر بھی تو جانور ہے، ذبح ہوتے وقت تڑپنا، لوٹنا اس کا خاص وصف ہے، یہ وصف انہوں نے طائر رنگ کے لیے بھی ثابت کر چھوڑا۔

اس ادا سے باڑھ دیکھی آپ نے تلوار کی طائر رنگ حنا بھی طائر بسمل ہوا

مولانا عبدالحیٰ صاحب ان کے دیوان کو اس قسم کی نکتہ آفرینیوں سے بھرا ہوا بتاتے ہیں تاہم ع گر انصاف شیوۂ ایست کہ بالائے طاعت است

اس لیے مولانا کے خیال میں جہاں کہیں دقت آفرینی سے کام نہیں لیتے تشبیہ و تمثیل میں اچھے اچھے شعر بھی نکالتے ہیں مثلاً

آزاد ہیں قیود سے افتادگان خاک | اڑتا پھرا شجر سے جو برگ خزاں گرا
خاکساروں سے ملا کرتے ہیں جھک کر سربلند | آسماں پیش زمیں سہر تواضع خم ہوا
طرفہ گل اس باغ میں ہیں اور شبنم ہے عجب | ہنس کے بیٹھا جو تری محفل میں وہ رو کر اٹھا
کیا روز بد میں ساتھ رہے کوئی ہم نشیں | پتے بھی بھاگتے ہیں خزاں میں شجر سے دور
مشک میں خوشبو ہے پیچ و تاب مثل مو نہیں | پیچ ہیں سنبل میں مثل مو مگر خوشبو نہیں
عشق میں بدمست ہوں میں پر کوئی واقف نہیں | نشہ ہے جام مے الفت میں لیکن بو نہیں
مسی آلودہ لب پہ رنگ پان ہے | تماشا ہے تہہ آتش دھواں ہے

(الیضاً ملتِ ۷۷)

برمحل اشعار | مولانا اپنی تحریروں میں جہاں کوئی شعر نقل کرتے ہیں وہ نگینے کی طرح جڑا ہوا معلوم ہوتا ہے اور سیاق و سباق اور اپنے موقع کے لحاظ سے نہایت موزوں، مناسب اور برمحل ہوتا ہے، جس سے پتہ چلتا ہے کہ وہ شعر و ادب کے بڑے نکتہ شناس اور اچھے سخن فہم تھے۔ چند مثالوں سے اس کی تصدیق ہو جائے گی۔

گل رعنا دراصل شعراء کے کلام کا انتخاب ہے اس لیے اس میں اس کا موقع کم تھا۔ تاہم جہاں کہیں کسی موقع سے کوئی شعر آگیا ہے تو اسے پڑھ کر طبیعت وجد میں آجاتی ہے۔ مولانا کو شکایت ہے اور بجا شکایت ہے کہ متاخرین کے دور میں آکر شاعری کا معیار پست اور زبوں ہو گیا ہے، غزل نری لفاظی بن گئی ہے اور خیالات میں تازگی معقود ہو گئی ہے، اس لیے ان کے کلام میں کسی قسم کا ولولہ اور جوش بہت کم پایا جاتا ہے، مولانا فرماتے ہیں کہ "اگر یہ لوگ اپنے کلام کو اپنے خیالات و جذبات کا آرگن بناتے تو اس کا بہت

عمدہ اثر پڑتا اور ان کو اپنے اساتذہ کی پیروی کرنے پر قناعت نہ کرنی پڑتی اور اسیر لکھنوی کا یہ شعر ان کے حسب حال نہ ہوتا۔

شاعرانِ حال کیا مضمونِ نو پائیں اسیرؔ   ڈھونڈتے ہیں پر تخلص بھی نیا ملتا نہیں
(ص۴۲)

بہادر شاہ ظفر کے دادا شاہ عالم کے وقت میں ہندوستان کی سلطنت جا چکی تھی، وہ ایک وظیفہ خوار کی حیثیت سے برائے نام بادشاہ رہ گئے تھے اور ان کی حکومت دہلی میں قلعہ معلی کی چار دیواری کے اندر سمٹ کر رہ گئی تھی۔ مولانا فرماتے ہیں "لیکن اقلیم سخن کی فرماں روائی دادا سے ترکہ میں ملی تھی اور اردوئے معلی ان کے زیر نگیں تھا، افسوس ہے اس کو بھی مولوی محمد حسین آزاد نے ظفر سے چھین کر استاد ذوق کو بخش دیا"۔ اس موقع پر یہ شعر پیش کیا ہے جو کس قدر موزوں اور حسب حال ہے:۔

اگر آں ترک شیرازی بدست آرد دل ما را   بخال ہندوش بخشم سمرقند و بخارا را
(ص۱۱۹)

آگے پھر لکھتے ہیں "اس بد نصیب بادشاہ کی ساری زندگی روتی جھینکتی گذری، دلوں کے ارمان دل ہی میں رہے، سلطنت کا خواب جو دیکھا تھا، اس کی تعبیر یوں ظاہر ہوئی کہ غدر ۱۸۵۷ء کے بعد قلعۂ معلی سے بھی نکال کر رنگون پھینک دیے گئے"۔ اس موقع پر یہ شعر انکے نوک قلم پر آگیا ؎

نکلنا خلد سے آدم کا سنتے آئے ہیں لیکن   بہت بے آبرو ہو کر ترے کوچہ سے ہم نکلے

یہی نہیں آگے کی سنیئے "جوان جوان بیٹے اور پوتے ان کی آنکھوں کے سامنے کھڑے کر کے گولی مار دیے گئے، طوق و سلاسل اور خدا جانے کیا کیا جو کچھ بھی اس منحوس شاعری کی بدولت ان کو ہوس ہوتی ہوگی وہ سب نکل گئی اور جتنے دنوں کی زندگی تھی رنگون کے بلاخانے میں بے بسی و بے کسی کے ساتھ پوری کر کے ۱۲۷۹ھ میں پیوند خاک ہو گئے، اب کوئی یہ بھی

نہیں جانتا کہ ان کو گور کفن ملا بھی یا نہیں"۔ اس موقع پر مصنف گل رعنا کو تسلیم کا یہ شعر یاد آتا ہے ؎

نہ شامیانہ، نہ شمع تربت، نہ موج سبزہ، نہ چادر گل
بلا نصیبوں میں پھنس کے کیا کیا خراب مٹی ہے بے کسی کی

مرزا مظہر جان جاناں کے قتل کا واقعہ تحریر کرنے کے بعد ان کے لوح مزار پر خود انہی کا جو شعر کندہ ہے اسے برمحل نقل کرکے اس کی تصریح کرتے ہیں کہ لوح مزار پر اس کا کندہ ہونا حسب حال ہے اور صحیح پیشین گوئی ہے۔

بلوح تربت من یافتند از غیب تحریرے
کہ ایں مقتول را جز بے گناہی نیست تقصیرے (ص ۱۳۲)

اور اس سیاق میں کہ سودا ہجو گوئی کے مرد میدان تھے' ان کے ہم عصروں میں سے میر تقی میر، میر ضاحک، فدوی، ندرت اور بقا نے بھی اس کوچہ کی خاک اڑائی ہے، اس موقع پر یہ مصرعہ ؏ مگر وہ بات کہاں مولوی مدن کی سی۔ کتنا برمحل اور مناسب ہے۔

یاد ایام یا تاریخ گجرات محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کے لیے مولانا حبیب الرحمن خاں شروانی کی فرمایش پر لکھا گیا طویل مقالہ ہے، اس میں گجرات کے اسلامی عہد کی علمی، تمدنی اور مذہبی تصویر کھینچی گئی ہے اور گجرات کے فرمانرواؤں کی حکمرانی کا مرقع پیش کیا گیا ہے، اس میں اشعار نقل کرنے کا موقع نہیں تھا، لیکن گجرات کے اسلامی دور کی یاد نے مولانا کے زخم کہن تازہ کر دیے اور اس کی ابتدا و انتہا شعروں ہی سے ہوئی ہے اور بہت خوب ہوئی ہے۔ پہلے ابتدا کا شعر ملاحظہ ہو جو بہت حسب حال ہے۔

مشاطہ را بگو کہ براسباب حسن یار
چیزے فزوں کند کہ تماشا بما رسید

اور آخر کے دو شعر سننے سے پہلے اس کا پس منظر ملاحظہ ہو، گجرات کی عظمت و شوکت کی داستان سنانے کے بعد مولانا اس کے موجودہ باشندوں سے سوال کرتے ہیں:۔

"مگر اے اہل گجرات! خدارا انصاف کیجئے! کیا اب بھی آپ کے ملک سے ایسے جوہر قابل نکلتے ہیں جو علامہ وجیہ الدین اور شیخ محمد طاہر محدث نہ سہی، سید جلال رضوی اور قاضی عبدالوہاب کی یادگار سمجھے جانے کے مستحق ہوں، آپ کہیں گے کہ اب اس کا زمانہ نہیں نہیں ہے تو جانے دو، میں پوچھتا ہوں کہ آپ میں کوئی ہے جو دادا بھائی نوروجی اور مسٹر گاندھی کا جواب ہو، کہو نہیں"۔

اور پھر یہ اشعار پڑھیے اور مولانا کی سخن فہمی و نکتہ سنجی کا اندازہ کیجیے:

چمن کے تخت پر جس دم شہ گل کا تجمل تھا ہزاروں بلبلیں تھیں باغ میں اک شور تھا غل تھا
کھلی جب آنکھ نرگس کی نہ تھا جز خار کچھ باقی بتاتا باغباں رو رو یہاں غنچہ وہاں گل تھا

مولانا ندوۃ العلماء کے عرصہ دراز تک ناظم رہے، اس کے سالانہ جلسوں میں ان کو گذشتہ سال کی روداد پیش کرنی پڑتی تھی، روداد عام طور پر خشک و بے مزہ ہوتی ہے لیکن مولانا سید ابوالحسن علی ندوی لکھتے ہیں:

"بہت سے ایسے حصے بھی ہوتے تھے جو اہل علم اور ادب کے ذائقہ شناسوں کے لیے نہ صرف دلچسپ بلکہ معلومات افزا ہوتے تھے، خصوصاً جب جلسہ کسی ایسے مقام پر ہوتا جس سے مسلمانوں کی گزشتہ تاریخ و تہذیب کا دور وابستہ ہوتا تو ان کے داغ کہن تازہ ہو جاتے اور ان کا تاریخی و علمی ذوق ان کی عنان قلم کو بے اختیار عہد ماضی کی طرف موڑ دیتا"۔ (حیات عبدالحئی ص ۱۹۵-۱۹۹)

ایسا ہی ایک اجلاس بلگام میں ہوا تو شاہان بیجاپور کی ہنر پروری اور علم دوستی کا ذکر کرنے لگے جس نے اس سرزمین کے ایک ایک ذرہ کو رشک آفتاب بنا دیا تھا، خصوصاً خسرو اسد خاں کے کارنامے ان کی زبان قلم پر آگئے جس کی سیر چشمی و فیاضی، تدبر و دانشمندی سے

بلگام بڑے بڑے متمدن شہروں کا ہمسر ہوگیا تھا، اسی سیاق میں مولانا کو یہ شعر بھی یاد آتا ہے کہ :

یاد تھیں ہم کو بھی رنگا رنگ بزم آرائیاں لیکن اب نقش و نگار طاق نسیاں ہوگئیں

انتخاب اشعار | گل رعنا میں مشہور شعراء کا منتخب کلام پیش کرنا ہی مصنف کا اصل مقصد ہے اور یہ انتخاب بڑی خوش ذوقی سے کیا گیا ہے، طوالت کے خوف سے مثالیں پیش کرنے کی گنجایش نہیں۔ ناظرین کتاب کی ورق گردانی کرکے مصنف کے حسن ذوق، نکتہ شناسی اور شعر فہمی کا اندازہ کر سکتے ہیں، گل رعنا کے حواشی بھی بہت مفید اور پُراز معلومات ہیں، ان میں بھی متن میں وارد اشخاص کے اشعار کا انتخاب کہیں کہیں دیا گیا ہے، اسی سے بعض مثالیں پیش کرنے پر اکتفا کرتا ہوں :

شمس ولی اللہ کے ہم عصر ایک بزرگ سید محمد جمال الدین قادری تھے، خاکیؔ تخلص تھا، مصنف گل رعنا نے ان کے کلام کو اول سے آخر تک عارفانہ رنگ میں ڈوبا ہوا پایا ہے، ان کا مکمل دیوان مولانا حبیب الرحمن خاں شروانی کے کتب خانہ میں موجود تھا، ان کی مہربانی سے خاکیؔ کے دیوان کے کچھ منتخب اشعار مصنف کو ملے جن کو ملاحظہ طلب کہہ کر نذر قارئین کیا ہے، اس سے دونوں بزرگوں کی شعری بصیرت اور سخن فہمی آشکارا ہے۔

جائز نہیں تھی ہجر کے شب کی شکایتیں مجکوں خصوص آج تو نقد وصال تھا

اپنے معشوق سنگ ہو رہنا ایک دل ایک رنگ ہو رہنا

خوش بھی حال ہے فقیری کا نفس و دل بیچ جنگ ہو رہنا

جن نے مے کو پیا کے نوش کیا اس کے حق میں ہوا ہے شربت تلخ
(صلا حاشیہ)

اور اب نواب آصف الدولہ کے کلام کا یہ نمونہ ملاحظہ ہو :

آصف نہ چھپے عشق بتاں دل سے ہمارے — سو بار اگر پھر بھی بنا دیں اسے گھڑ کر
شوخی چشم کی شہرت کو تری سُن سُن کر — شرم سے باغ میں نرگس نے چھپائیں آنکھیں
جس جگہ آنسو گرے ہے آبلہ پڑ جائے ہے — آپ آتش ہوئے کیوں کر ہم کیا جانیے
پوچھتے کیا ہو شب ہجر کی حالت یا رو — میں ہوں اور رات ہے اور بستر تنہائی ہے
تیرے کوچہ میں نقش پا کی طرح — ایسے بیٹھے کہ پھر نہ وہاں سے گئے (ص۵۸)

نواب مصطفےٰ خاں شیفتہ کے تذکرہ میں مفتی صدر الدین خاں آزردہ پر قدرے طویل حاشیہ ہے، یہ بقول مصنف گل رعنا سرمایہ نازش ہندوستان، فضل و کمال اور فنون ادبیہ کی بے نظیر قابلیت میں اپنا آپ جواب تھے، سرزمین ہند میں جامعیت کے دو ہی چار شخص ہوئے ہوں گے۔ سید آثار الصنادید میں جہاں کہیں ان کا تذکرہ کرتے ہیں پورے ایک صفحہ میں ان کے القاب و آداب لکھتے ہیں اور پھر کہتے ہیں:

ہزار بار بہ شویم دہن بہ مشک و گلاب — ہنوز نام تو گفتن کمال بے ادبی است

اس جامع کمالات ہستی کے یہ اشعار ملاحظہ ہوں ؂

میں اور ذوق بادہ کشی لے گئیں مجھے — یہ کم نگاہیاں تری بزم شراب میں
اے دل تمام نفع ہے سودائے عشق میں — اک جان کا زیاں ہے، سو ایسا زیاں نہیں
اچھا ہوا نکل گئی آہ حزیں کے ساتھ — اک قہر تھی، بلا تھی، قیامت تھی جاں نہیں
کامل اس فرقۂ زہاد سے اٹھا نہ کوئی — کچھ ہوئے تو یہی رندان قدح خوار ہوئے
کمبخت وہ غضب زلف سیہ فام، یہ کافر — کیا خاک جئے کوئی شب ایسی، سحر ایسی
(ص۲۳۳)

اسد الدولہ نواب محمد تقی خاں بہادر ترقی تخلص میر سوز کے شاگرد، شعر اچھا کہتے تھے، مولانا نے لکھا ہے کہ ان کا خاندان شرافت اور وضعداری میں ہمیشہ نیک نام رہا ہے، لکھنؤ کی

زمین بدل گئی، آسمان بدل گیا مگر ان لوگوں کی وضعداری نہیں بدلی، ترقی کے یہ دو شعر گل رعنا کے حاشیے میں آگئے ہیں:

ساکنانِ کعبہ نے کی بت پرستی اختیار وہ صنم نامِ خدا کیا ان دنوں جوبن پہ ہے

در و دیوار سے آتا ہے نظر جلوہ دوست آئینہ خانہ مرا گوشہ تنہائی ہے (ص۳۶۲)

مرزا غالب کے تذکرے کے حاشیے میں ایک جگہ مصنف گل رعنا نے نواب یوسف علی خاں ناظم والی رام پور کی جو صاحبِ دیوان تھے ایک پوری غزل نقل کی ہے، میں مطلع کا شعر درج کرتا ہوں:

میں نے کہا کہ دعوی الفت مگر غلط کہنے لگے کہ ہاں غلط اور کس قدر غلط (ص۳۱۳)

مرزا مظہر جان جاناں کے تذکرہ میں میر عبدالحئی تاباں کا کسی موقع سے ذکر آیا ہے جن کو مرزا صاحب سے عقیدت اور مرزا صاحب کو ان سے محبت تھی مصنف گل رعنا نے ان پر طویل حاشیہ لکھا ہے جس میں ان کے یہ اشعار درج ہیں:

کس کس طرح کی دل میں گزرتی ہیں حسرتیں ہے وصل سے زیادہ مزا انتظار کا

ہنستا ہے گل چمن میں تو نالاں ہے عندلیب دو دل خوشی نہ دیکھے کبھی اس جہاں کے بیچ

انجان ہو تو اس سے کوئی درد دل کہے جو جانتا ہو میں اسے آگاہ کیا کروں

اے باغباں اب تو جاتے ہیں ہم قفس میں چھوٹے تو پھر ملیں گے گر ہاں وے پر ہیں گے

جاتی ہے عمر ہر دم ہم کو خبر نہیں ہے کیا جانیے کہ کب تک ہم بے خبر رہیں گے (ص۱۳۰-۱۳۹)

سودا اور میر سوز کے ایک شاگرد نواب مہربان خاں رند دیوانِ فرخ آباد تھے، مرزا محمد رفیع سودا کے تذکرے میں ان کا کسی مناسبت سے نام آیا ہے، حاشیے میں ان پر جو نوٹ ہے اس میں یہ تین اشعار بھی درج ہیں:

خلقت تمام گردش افلاک سے بنی		ماٹی ہزار رنگ کی اس چاک سے بنی

مجھ ساتھ تیری دوستی جب ہوگئی آخر		دنیا کی مرے دل سے طلب ہوگئی آخر

حاصل تو ہوا وصل ہمیں رات پر افسوس		اک پل میں شب عیش و طرب ہوگئی آخر
(صفحہ ۱۴۱)

سید محمد شاکر ناجی کے تذکرہ میں عمدۃ الملک امیر خاں محمد شاہی کا ذکر اس طرح آیا ہے کہ ناجی ان کے نعمت خانہ کے داروغہ تھے، امیر خاں کی طبیعت نہایت بذلہ سنج و لطیفہ گو واقع ہوئی تھی، فارسی اور اردو دونوں زبانوں میں شعر کہتے تھے اور انجام تخلص تھا، مصنف گل رعنا نے یہ اشعار نقل کیے ہیں:

دور سے آئے تھے ساقی سن کے میخانے کو ہم		پر ترستے ہی چلے اب ایک پیمانے کو ہم

کیوں نہیں لیتا ہماری تو خبر اے بے خبر		کیا ترے عاشق ہوئے تھے درد و غم کھانے کو ہم

ٹک تو فرصت دے کہ رخصت ہو چلیں صیاد ہم		مدتوں اس باغ کے سایہ میں تھے آباد ہم

ساتھ اپنے سر کے تھا انجام پاس تمکنت		شکر ہے تڑپے نہ زیر خنجر جلاد ہم

نعش میری دیکھ کے مقتل میں یوں کہنے لگے		کچھ تو یہ صورت نظر آتی ہے پہچانی ہوئی

چاک کو تقدیر کے ممکن نہیں ہرگز رفو		سوزن تدبیر بھی گو سو برس سیتی رہے

نواب محمد یار خاں امیر نواب رام پور علی محمد خاں کے بیٹے اور نواب فیض اللہ خاں کے بھائی تھے، شیخ قیام الدین قائم سے مشق سخن کی، اس مناسبت سے قائم کے تذکرے میں انکا نام آگیا ہے، جس کے حاشیے میں مصنف گل رعنا نے یہ تین شعر نقل کیا ہے ؎

بیٹھے بٹھائے کوچۂ قاتل میں لے گیا		یارب برا ہو اس دل خانہ خراب کا

ساقی گزک کی کچھ نہیں حاجت شراب دے		ہم دل جلوں میں آپ مزا ہے کباب کا

گر وقت ذبح نالہ کیا میں نے کیا ہوا		پہلے کسی کا ہاتھ، کسی کی زباں چلے

(۱۸۲ ص

شاہ نصیر کے استاد شاہ محمدی مائل کے یہ تین شعر بھی حاشیے میں درج ہیں:

حال کہنے کی نہ دی گریہ نے فرصت رات کو — آج پھر کہیو اسے مائل وہ کیا افسانہ تھا

کیا کہوں میں تجھ سے دل زار کی ہوس — مشہور ہے جہاں میں بیمار کی ہوس

کہتا نہ تھا کہ باز آ ہر دم کی اس ہنسی سے — آخر گیا نہ ظالم اک بے گناہ جی سے (ص۲۷۷)

شاہ نصیر ہی کے تذکرے کے ایک حاشیہ میں راجہ چندو لال دیوان کے یہ شعر نقل ہیں جو فارسی اور اردو دونوں زبانوں میں طبع آزمائی کرتے تھے اور شاداں تخلص تھا:

نور تھا یا شعلہ تھا یا برق یا خورشید تھا — کچھ تو اے موسیٰ کہو کیا تھا وہ جلوہ طور کا

شاداں وہاں بھی کیا ہے حسینوں کی انجمن — جاتے ہیں لوگ کیوں عدم آباد کی طرف

خدا نے دی ہے کیا تاثیر وقت صبح صادق کو — اثر رکھتی ہے اکثر جو دعائے صبح صادق ہو (ص۲۷۹)

میر نظام الدین ممنون کے حال میں انکے والد میر قمرالدین منت کے حاشیے کے اردو اشعار ملاحظہ ہوں:

علاج دل کو آئے تھے مسیحا سخت دعوے سے — یہاں کیا ہوگیا وہ معجزہ حضرت سلامت کا

اس آنے کا کچھ ہے لطف پیارے — ہر دم جو کہو کہ جائیں گے ہم

قدم رکھ گیا کون سینے پہ اپنے — گل داغ میں آج مہندی کی بو ہے (ص۲۸۳)

اکبر الہ آبادی نے مولوی وحید الدین وحید رئیس کڑہ سے مشق سخن کی، ان کے دو شعر ملاحظہ ہوں:

ہم نے جب وادی غربت میں قدم رکھا تھا — دور تک یاد وطن آئی تھی سمجھانے کو

ہم نے اپنے آشیانے کے لیے — جو چبھے دل میں وہی تنکے لیے (ص۲۸۸)

میر محبوب علی خاں آصف جاہ ششم کے دو شعر بھی ملاحظہ ہوں:

اے یاس تو نے داغ تمنا مٹا دیے — گلزار تھا یہ دل اسے ویرانہ کر دیا

ذکر کسی سے محبت یہ ہم نہ کہتے تھے — دل فریفتہ سنتا ہے تو بھلا کس کی (ص۲۹۲)

سیرت نبویؐ پر ایک ہندو کی مراٹھی تصنیف

از جناب انیس احمد چشتی صاحب، پونا

یہ ایک عجیب بات ہے کہ مہاراشٹر کے مسلمانوں کی مادری زبان اردو ہے۔ اس کی وجہ کچھ بھی ہو لیکن قرین قیاس یہی ہے کہ جب سلاطین دہلی نے اور بطور خاص محمد بن تغلق نے دولت آباد (موجودہ اورنگ آباد) کو اپنا پایۂ تخت بنایا اور اس کے ہمراہ امیر خسرو جیسی جلیل القدر شخصیتیں اور پر گو شعرا اس علاقے میں تشریف لائے تو اس کا لازمی نتیجہ یہ نکلا کہ شمال و جنوب میں تہذیبی مواخات کے ساتھ ساتھ لسانی اور سماجی لین دین بھی واقع ہوا۔ ۱۷۰۷ء میں جب احمد نگر میں اورنگ زیب نے اپنی آخری سانس لی اور اورنگ آباد میں سپرد خاک ہوا تو ولی دکنی ان ہی لمحات میں دہلی کی جامع مسجد کی سیڑھیوں پر بیٹھ کر اپنا اردو کلام سنا رہے تھے اور دہلی کے دربار اور اونچی حویلیوں میں جہاں فارسی کا راج اور عربی کا رواج تھا وہاں آہستہ آہستہ جنوبی ہند کی زبان ولی دکنی کی مٹھاس کو لیے دلوں میں گھر کر رہی تھی اور اردو کے پہلے صاحب دیوان شاعر کی شہرت کی صدائے بازگشت جب دکن میں سنائی دینے لگے تو یہاں کی عوام نے بے محابا اس زبان کو گلے لگایا اور قلی قطب شاہ دکنی کی شاعری میں انہیں یگانگت کی بو باس آنے لگی جس میں انہوں نے خسرو کی فارسی اصطلاحات اور خواص کے لہجے کی براہ راست آمیزش کی اور نتیجتاً وہ اردو زبان وجود میں آئی جو اس وقت بھی مہاراشٹر میں بولی اور سمجھی جاتی تھی اور آج بھی بمبئی میں وہی اردو صنعتی

پیمانے پر استعمال کی جا رہی ہے۔ اردو چونکہ ہند آریائی زبان ہے اس لیے یقیناً اس کا دور سنسکرت، پراکرت اور اپ بھرنش کے بعد کا ہے جس میں شورسینی پشاچ اور مہاراشٹری کی شکلیں قائم اختیار کر چکی تھیں۔ یعنی یہ مرحلہ دسویں اور گیارہویں صدی عیسوی کے درمیان کا ہے۔ آج مہاراشٹر میں وضع قطع کے علاوہ مسلمانوں کی سب سے بڑی پہچان ان کی اردو زبان کا مادر زادپن بھی ہے۔ یہاں تک کہ مہاراشٹر کے دیہاتوں اور دور افتادہ علاقوں میں اکثر ہندو اردو کے لیے "مسلمانی" کا لفظ بولتے ہیں۔ یہ بھی اتفاق ہے کہ مہاراشٹر کے مسلمانوں نے اپنی دینی اور علمی ضروریات کے لیے مراٹھی کا استعمال حرام نہیں تو مکروہ ضرور سمجھا اور شاعری سے لے کر قرآن فہمی تک اور فقہ سے لے کر تاریخ و سیر کے مندرجات تک سب کے سب علوم اردو میں استعمال کرتے رہے اور اپنی ان ضرورتوں کو پورا کرنے کے لیے انہوں نے دہلی، لکھنؤ، لاہور اور حیدرآباد وغیرہ کے علماء، مفکرین، ادباء اور دانشوروں سے استفادہ کیا اور آج بھی یہ سلسلہ برابر جاری ہے۔ اردو اور مراٹھی کے مابین اس ذہنی، لسانی اور ثقافتی بُعد کے باوجود مہاراشٹر کے مسلمانوں اور یہاں کے مسلم حکمرانوں نے مراٹھی زبان کو مالامال ضرور کیا اور اسے نئے الفاظ مہیا کیے لیکن وہ مراٹھی زبان کو مسلمان نہیں کر سکے۔ ایک اندازے کے مطابق مراٹھی زبان میں تقریباً ۲۵ تا ۲۸ فیصد الفاظ فارسی اور عربی کے مستعمل ہیں۔ مثلاً تعاقب، کارکردگی، لفافہ، وکیل، انار، قمیص، صاحب، غلام، غلام گیری، راہداری، پروانہ، منسوخ، دستور، محفل، لائق، نالائق، خوشی، درجہ، ربیع، خریف، بہار، برشگال[1]، کم قوت، حکمت، حکیم، واقف کار، قاعدہ، مرادور، مطلع، منصف، شاعر (शाहीर)، میت، مقدمہ، کفن، دفن، دروغ، خرافات ([illegible])

---

[1] [illegible] کی فارسی مراٹھی میں من و عن مستعمل ہے۔

(रवीराम), ناظر، قانون، روزنامہ، پرسش، عدالت، لازم، تعلیم، کسرت، راستہ، راست بازی، خانہ فیل خانہ وغیرہ۔ مگر اس کے باوجود اس میں ابتک کوئی معتبر اسلامی لٹریچر وجود میں نہیں آسکا ہے۔ تاہم قرآن مجید کے تین ترجمے ہو چکے ہیں، پچھلے پندرہ برسوں میں جو اسلامی دعوتی مراٹھی لٹریچر وجود میں آیا ہے، ان میں سے اکثر چھوٹی بڑی کتابیں اور رسائل یا تو مولانا ابوالاعلیٰ مودودی کی ہیں یا پھر مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کی ہیں، یہ مزید حیرت کی بات ہے کہ سیرت نبویؐ پر مراٹھی زبان میں صرف تین کتابیں ہیں اور ان میں سے دو غیر مسلم مصنفین کی فکر کا نتیجہ ہیں۔ تیسری کتاب ابو سلیم محمد عبدالحیٔ کی حیات طیبہؐ کا ترجمہ (पावन जीवन) کے عنوان سے ۱۹۸۶ء میں شایع ہوا تھا۔ غیر مسلم مصنفین کی دو کتابوں میں سے " سانے گروجی " کی لکھی کتاب کا نام ہے " اسلامی سنسکرتی " یعنی اسلامی تہذیب۔ اس نام ہی سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ کتاب نہ سیرت پر لکھی گئی ہے اور نہ ہی اس کا واحد مقصد بھی یہ ہے۔

جن غیر مسلموں نے اسلام پر لکھا ان میں اچاریہ ونوبا بھاوے، یدوناتھ تھتے، سانے گروجی، ایم وہی پردھان، دی جی گدرے اور شری پاد جوشی خصوصیت سے قابلِ ذکر ہیں۔ ان کے علاوہ جن لوگوں نے اسلام پر لکھا ان میں سے اکثر حمید دلوائی، تسلیمہ نسرین، ارون شوری اور سلمان رشدی کے کام کی چیزیں ہیں۔ ان میں دل کے پھپھولے پھوڑے گئے ہیں۔ مہاراشٹر کے اکثر بڑے شہروں کے کتب خانوں کی لمبی چوڑی فہرستیں اور کیٹلاگ کھنگالنے کے بعد سیرت پر کسی مراٹھی داں غیر مسلم کی جو قابل قدر کتاب ہاتھ لگی ہے اس کا نام ہے (मुहम्मद पैगंबर) اس کے مصنف کا نام ایم وہی پردھان ہے۔ کتاب کی ضخامت بشمول IMPRINT اوراق کے $\frac{23 \times 36}{16}$ کے ۳۴۰ صفحات ہے۔

کتاب کے اولین صفحات IMPRINT PAGES پر طابع ناشر اور مصنف کے تعلق سے اس طرح تحریر ہے: "راؤ صاحب راؤ بہادر دامودر ساولارام ین دے نے اپنے اندو پرکاش چھاپہ خانے نمبر ۳۸۰ گرگاؤں روڈ، بمبئی میں چھاپا اور راؤ صاحب ایم وی پردھان نے پریل، سپاری باغ روڈ بمبئی سے شایع کیا۔ اگلے صفحے پر مصنف نے اپنی اس تصنیف کو خالص ہندو عقیدے کے مطابق "حضرت محمد پیغمبرؐ کے چرنوں میں نہایت عقیدت کے ساتھ پیش کیا ہے۔

اس انتساب کے بعد مصنف کی جانب سے اس تحریر پر یکم جنوری ۱۹۲۹ء کی تاریخ پڑی ہے۔ ایم وی پردھان جنجیرہ کے نواب کے ہاں دیوان کی حیثیت سے ملازم تھے[1]

اس کتاب کے مطالعے کے بعد بلا مبالغہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ سیرتؐ پر مراٹھی زبان میں یہ ایک مکمل کتاب ہے۔ مصنف کوتاہ بینی، تعصب ذہنی، بہتان تراشی اور افترا پردازی کے امراض سے پاک اور بڑی حد تک اسلامی افکار و انقلابات کا معترف اور نسلاً برہمن ہونے کے باوجود سیرت نبویؐ کے تابناک پہلوؤں کا نقیب نظر آتا ہے۔

بعض جگہوں پر اس کے قلم نے دھوکا بھی کھایا ہے، مثلاً حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے حضرت خدیجہؓ کے ساتھ نکاح کو وہ نعوذ باللہ [illegible] لکھ بیٹھا ہے جبکہ اس پیراگراف میں اس کے قلم سے اس عمل کی تردید بھی ہوتی ہے۔ اسی طرح بعض اسلامی اصطلاحات و الفاظ اور خاص ناموں کے تلفظ میں وہ غلطی کا بھی مرتکب ہوا ہے، مثلاً زیدؓ کو وہ ([illegible]) طائف کو ([illegible])، حارث کو ([illegible])، حدیث کو ([illegible]) لکھ بیٹھا ہے جو کہ ظاہر ہے اس کے انگریزی ماخذ کا نتیجہ ہے۔ کیونکہ انگریزی میں "ث" کے تلفظ کے لیے

---

[1] دستاویزات ضلع رائے گڑھ (کوکن)، کلکٹر کچہری۔

TH کا استعمال عام ہے۔ اسی طرح ایم ڈی پردھان نے بعثت سے پہلے کے تمام تذکرے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے واحد غائب کا صیغہ استعمال کیا ہے جیسے تو اور وہ۔ مراٹھی میں اس عمل کے لیے (वा आहे) کا لفظ بولتے ہیں۔

اس کے برعکس سیرتؐ کے ان پہلوؤں کی جو ہمیشہ ناقدین کا ہدف بنے رہے ہیں مصنف نے نہایت بے باکانہ طور پر مدافعت کا فریضہ انجام دیا ہے۔ جیسے تعدد ازدواج، ہجرت، اسلام کا تلوار کے زور پر پھیلنا، اسلام میں عورت کا مقام، واقعۂ افک اور بت شکنی وغیرہ کا نہایت عمدگی سے تجزیہ کیا گیا ہے اور ان حقائق کی پوری وکالت کی گئی ہے۔

سن ۸۱-۱۹۸۰-۸۲ء میں ریاست مہاراشٹر کی آٹھویں جماعت کی تاریخ کی درسی کتاب میں ہجرت کے لیے مراٹھی زبان میں (पलायन) یعنی فرار اور انگریزی میں ESCAPE کا لفظ استعمال کیا گیا تھا۔ یہی لفظ پورے مہاراشٹر میں مسلمانوں کے خون خرابے کا باعث بنا تھا اور صرف مالیگاؤں شہر میں ۷ نوجوان مسلمانوں کی لاشیں خون میں لت پت ہوگئی تھیں۔ ایم ڈی پردھان نے ہجرت کے لیے مراٹھی میں نہایت محتاط طریقے پر (वतनत्याग) وطن کو خیرباد کہنے کا لفظ استعمال کیا ہے۔

اس کتاب میں کل ۱۷ ابواب ہیں۔ پہلا باب عرب کے جغرافیہ، تہذیب، تمدن، عربی اخلاقیات اور مہمان نوازی سے شروع ہوکر آخری باب اسوۂ حسنہ پر ختم ہوتا ہے جس کے اخیر میں مغرب کے نامور مستشرقین و مورخین مثلاً آرنلڈ، بوس ورتھ اسمتھ، اسٹینلی لین پول، لیونارڈ، جے کے کورے، ڈاکٹر گستاؤ ڈیل اور ٹامس کارلائل وغیرہ کی اسلام اور حضور پاکؐ سے متعلق آراء اور انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا کے مقالے کے مندرجات نقل کیے ہیں۔ یہ حوالے خود مصنف کی وسیع النظری اور عمیق مطالعے کا پتہ دیتے ہیں۔

مصنف کی تحریر میں ایک طرح کا جوش اور اُبال ہے۔ پتہ چلتا ہے کہ وہ ایک منصوبہ بند طریقے سے کعبے کی پاسبانی کے لیے صنم خانے سے اٹھا ہے۔ اسلام کی مدافعت میں وہ نہ صرف یہ کہ کمربستہ ہے بلکہ ایک قابل وکیل کی طرح مخالفین پر نقد و جرح کے وار بھی کرتا ہے۔ مثلاً بت شکنی کے جواب میں وہ سیرت کے حوالوں سے یہ ثابت کرتا ہے کہ کس طرح سرور کائناتؐ کا انصاف عیسائی یہودی اور زرتشی مذاہب کے ماننے والوں کے لیے یکساں تھا اور کس طرح انہیں اسلامی مملکت میں مراعات حاصل تھیں جو بعد میں بھی جاری رہیں۔

اسلام پر سب سے بڑا الزام یہ ہے کہ وہ "قوتِ بازو اور تلوار کی جھنکار کے زور پر پھیلا اور اس کی بنیاد کسی مضبوط فلسفے یا اصول پر قائم نہیں ہے"۔ مصنف نے اس الزام کے دفاع میں ایک پورا باب سپردِ قلم کیا ہے۔ ہندوؤں کو مخاطب کر کے وہ لکھتا ہے کہ:

> "ہم یہ الزام محض لاعلمی اور اسلام سے متعلق عدم واقفیت کی بنا پر دہراتے رہتے ہیں۔ اس کے لیے ہمیں اسلام کا اور حضورؐ کے مشن نیز آپ کے صبر و رضا اور عام معافی کے اعلان نامے کا گہرائی سے مطالعہ کرنا چاہیے۔"

ہم صرف محمد پیغمبر: اسلام کا علمبردار سے زیادہ آپؐ کے بارے میں کچھ نہیں جانتے۔ آپؐ کی سیرت سے متعلق ہمیں ذرہ برابر بھی علم نہیں ہے۔ ہماری درسی کتابیں اس کے متعلق خاموش ہیں۔ تاریخ کی درسی کتاب میں ایک آدھ صفحے میں مذہب اسلام اور پیغمبر صاحب کی ادھوری سیرت تحریر کر کے اس صفحے کو پورا کر دیا جاتا ہے۔ اتنے مختصر وسائل کے ساتھ کسی مذہب کے جملہ اصول و نظریات اور اس کے اسرار جاننا بے حد مشکل ہے۔ اس نے جگہ جگہ مثالیں دی ہیں کہ ایک دوسرے سے نبرد آزما قبائل کو آپؐ نے کس طرح شیر و شکر کر دیا جبکہ معاملہ یہ تھا کہ مکہ اور طائف کے دو افراد کی کسی راستے پر مڈ بھیڑ ہو جاتی تو ان کا ایک دوسرے سے

لہولہان ہوئے بغیر جدا ہونا مشکل تھا۔

اپنی تصنیف کے بارہویں باب میں اس نے "عرب کا نسوانی سماج اور اس کی اصلاح" کے عنوان سے ایک مستقل مضمون لکھا ہے۔ وہ لکھتا ہے کہ "اکثر غیر مسلموں کا یہ تصور ہے کہ مذہب اسلام میں عورت کو کوئی مقام و درجہ حاصل نہیں" یہ ان کی بہت بڑی غلط فہمی ہے۔ اسکے برعکس حضرت پیغمبرؐ سے پہلے عورتوں کی حالت ناقابل بیان تھی جسے آپؐ نے سدھار کر ساری دنیا کو یہ بتا دیا کہ عورت کا مقام بہت بلند ہے۔ اس پہلو کو اچھی طرح سمجھ لینے کے لیے اسلام سے پہلے اور اسلام کے بعد عورت کی پوزیشن کا تقابلی مطالعہ ضروری ہے۔

تاریخ کے مطالعے سے پتہ چلتا ہے کہ زمانۂ قدیم کے ترقی یافتہ ملکوں میں بھی عورتوں کو مردوں سے کم درجہ کی مخلوق سمجھا جاتا رہا ہے۔ مشہور مورخ گبن کے مطابق قدیم زمانے میں سماجی قوانین ایسے وحشیانہ اور ظالمانہ تھے کہ ان کے تحت عورتوں کو مدت العمر اپنے شوہر یا آقا کی مکمل غلامی کا مقدس فریضہ انجام دینا پڑتا تھا۔ رومی قانون کے مطابق شوہر اپنی بیوی کا مختار کل ہوا کرتا تھا۔ شادی سے پہلے وہ اپنے باپ کی مکمل ملکیت ہوا کرتی تھی۔ شادی کے بعد وہ اور اس کی دولت شوہر کے قبضے میں چلی جاتی تھی، جہاں اس کا استعمال ایک بے جان شئے کی طرح کیا جاتا تھا۔ شادی شدہ عورتوں کو بھی ایک زرخرید غلام کی طرح استعمال کیا جاتا تھا۔ ایک دور میں تو یہ رومی قانون اس قدر ظالمانہ شکل اختیار کر چکا تھا کہ کسی شوہر کو اپنی بیوی کی معمولی سی غلطی پر بھی اسے ہلاک کر دینے کا حق حاصل تھا۔ سارے یورپ نے جس طرح اصلاح کے رہبرانہ اصول روم اور یونان سے اخذ کیے ہیں اسی طرح سماجی قوانین بھی انہوں نے اسی سرزمین پر مرتب کیے ہیں۔ تاہم تاریخ سے یہ ثابت ہے کہ اس دور میں عورت کا مقام تقریباً سارے یورپ میں ایک جیسا ہی تھا۔

پامپے (یا پمپیائی) شہر کی حالیہ کھدائی میں دریافت بڑی عمارتوں اور رئیسوں کی کوٹھیوں میں لگے فواروں اور پتلوں کو دیکھ کر شرم و حیا کے مارے تہذیب کی نظریں جھک جاتی ہیں۔ بڑے بڑے دیوان خانوں کی دیواروں پر شرمناک اور فحش تصاویر نظر آتی ہیں۔ اس سے یہ اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ رومی ریاستوں میں خواتین کو گوشے اور پردے میں رکھ کر انہیں مردوں کے لیے محفوظ کردہ جگہوں پر جانے کی سخت ممانعت رہی ہوگی یا تو پھر مرد ان کی آزادی اور عصمت کی مطلق پرواہ نہ کرتے ہوں گے۔ ایم گستاؤلی بان کے مطابق قدیم رومی شہر میں بیوی پر شوہر کو مکمل ظالمانہ حقوق حاصل تھے۔ عورتوں کو کوئی سماجی حق حاصل نہیں تھا۔ شوہر کے علاوہ دوسرا کوئی اس کے برتاؤ سے متعلق رائے زنی نہیں کر سکتا تھا اور ضرورت پڑنے پر اسے قتل کرنے کے بھی جملہ حقوق شوہر کو حاصل تھے۔ روم میں ایک سے زائد بیویاں رکھنے کا عام رواج تھا۔ اس بات سے سب واقف ہیں کہ مارک انتونی کی دو بیویاں تھیں۔ باپ اگر پاگل ہو تب بھی لڑکی کا بیاہ اسکی اجازت کے بغیر ہو نہیں سکتا تھا۔ باپ کو اپنی اولاد کے ساتھ ساتھ اپنی بیوی کو بھی فروخت کرنے کا حق حاصل تھا۔ اگر ترقی یافتہ روم کا یہ حال تھا تو یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں کہ غیر ترقی یافتہ ممالک میں عورت کا کیا حال رہا ہوگا۔

یونان میں بھی طبقۂ نسواں کا یہی حال تھا۔ اسپارٹا میں ضدی اور کمزور بچوں کی ماؤں کو مار ڈالا جاتا تھا۔ اس کا لازمی نتیجہ یہ نکلا کہ ریاست میں عورتوں کی تعداد بہت کم ہو گئی اور ایک سے زیادہ شوہروں کی وبا عام ہو گئی۔ ایتھنز میں عورت ایک جنس بازار کی طرح خریدی جا سکتی تھی۔ اپنی وصیت میں مال و دولت کے علاوہ اپنی بیوی کو کس طرح ٹھکانے لگایا جائے اس کا بھی اعلانیہ بیان ہوتا تھا۔ یہ وہ لوگ تھے جن کی چابکدستی سر چڑھ کر بولتی تھی لیکن دل کے

اتنے ہلکے تھے کہ وہ عورت کو بدشگونی کی علامت تصور کرتے تھے۔ ترقی کے اعلیٰ ترین مناصب طے کرنے والے یونان میں طوائفوں کے علاوہ کسی دوسری عورت کو عزت کا مقام حاصل نہ تھا، اس لیے تعلیم اور اصلاحات کی جملہ سرگرمیاں صرف طوائفوں میں ہی جاری تھیں۔ لوری پائیڈلس کے مطابق عورت صرف بدی کا میکہ ہے کسی نیکی کی ادائیگی کے لیے وہ نہ صرف یہ کہ کمزور بلکہ نااہل بھی ہے۔ چوتھی صدی میں جب یورپ نے عیسائیت کا لبادہ اوڑھ لیا تب یورپ ساری دنیا میں یونانی اور رومی اصلاحات کا نقیب بن گیا۔ جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ جہاں جہاں یہ تازہ اصلاحات ہوئیں انہوں نے ہر جگہ خواتین کے حقوق کی پامالی کی اور عورتوں کو زمین بوس کر دیا۔ اس کے بعد تقریباً ڈیڑھ ہزار سال تک سارے یورپ میں عورتوں کی حالت ناگفتہ بہ ہو گئی

اس طویل جرح کے بعد فاضل مصنف خطۂ عرب میں بعثت سے پہلے کی عورتوں کی وہ تصویر کھینچتا ہے جس سے تقریباً ہر شخص واقف ہے۔ ہم اس کی تفصیل میں نہ جاتے ہوئے محض مصنف کے بیان کردہ اسلامی اصلاحات کا جائزہ پیش کرتے ہیں:

"اسلام نے عورتوں کی اس حالت پر خصوصی توجہ دی اور لوگوں کو بتا دیا کہ ہر ایک کی ترقی کا دارومدار اس کی اپنی پرہیزگاری پر منحصر ہے۔ مذہبی اور اخلاقی فرائض کی ادائیگی کے لیے دونوں کو اپنی نفسیاتی قوت کا یکساں استعمال کرنا ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اسلام کی نظر میں دونوں کے سماجی حقوق برابر برابر ہیں۔"

مصنف زندہ درگور کیے جانے کی رسم کے خلاف بطور حکم ابوداؤد کے حوالے سے ایک حدیث نقل کرتا ہے جس میں کہا گیا ہے کہ "جس کسی کے ہاں لڑکی پیدا ہو وہ اسے دفن نہ کرے، اسے ذلیل نہ کرے اور لڑکے کو بیٹی پر ترجیح نہ دے۔ ایسا انسان یقیناً جنت کا حق دار ہے۔"
آگے چل کر وہ رقمطراز ہے کہ:

"اسلام میں تعلیم کے معاملے میں عورت مرد میں کوئی تفریق نہیں۔ دونوں کا تعلیم یافتہ ہونا ضروری ہے۔ اسی لیے لڑکے اور لڑکی دونوں کو یکساں تعلیم کے مواقع میسر آنے لگے۔ صرف اتنا ہی نہیں خاوند اور بیوی کے درمیان بھی اونچ نیچ کی خلیج حائل نہیں رہی، اور دنیا میں دونوں کو یکساں حقوق ملنے لگے۔ اسلام نے پہلی مرتبہ باپ کی وراثت میں لڑکی کو حصہ دلوایا۔ دینی اور سماجی طور پر بھی عورت اور مرد کو یکساں حقوق حاصل ہیں جس طرح مرد کو اپنی شریک حیات کے انتخاب کا حق حاصل ہے اسی طرح عورت کو بھی اس کا حق حاصل ہے۔ بغیر عورت کی اجازت سے کیا ہوا نکاح کوئی قانونی حیثیت نہیں رکھتا اور ایسی صورت میں وہ شوہر سے علٰحدگی اختیار کر سکتی ہے۔"

ایک غیر مسلم مورخ اور دانشور کی تصنیف سے لیے گئے یہ اقتباسات اس لیے پیش کیے جا رہے ہیں کہ ہندوستان کے موجودہ حالات میں آج کے سازشی ذہن کے پیدا کردہ نام نہاد مسائل کا یہ منہ توڑ جواب ہیں۔ مصنف کے اکثر ماخذ انگریزی ہونے کے باوجود اس نے بامسلمان اللہ اللہ، با برہمن رام رام کا وطیرہ اختیار نہیں کیا ہے۔ وہ اپنے مقصد میں بڑی حد تک کامیاب ہے۔ پوری کتاب پڑھ لینے کے بعد قاری کے ذہن پر اسلام کی عظمت اور پیغمبر اسلام کی چھاپ پڑ جاتی ہے۔ غزوات عام مستشرقین کی طرح اس کے یہاں جارحانہ نہیں بلکہ مدافعانہ ہیں۔ غزوۂ بدر، غزوۂ احد اور غزوۂ خندق کے تذکرے کے دوران مصنف نے اسلوب میں بلند آہنگی پیدا کرنے کی کوشش کی ہے اور یہ صاف محسوس ہوتا ہے کہ یہ جنگیں مسلمانوں پر مسلط کردہ ہیں نہ کہ تسلط حاصل کرنے کے لیے لڑی گئی ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے رحمۃ للعالمین ہونے پر اس نے کوئی آنچ نہیں آنے دی ہے۔ آپ کے عفو و درگزر، سراپا رحمت اور جود و سخا کے واقعات کو دل کھول کر گنوایا گیا ہے۔ صحابۂ کرام اور انصار و مہاجرین کے باہمی تعلقات کو حکایت لذیذ کی طرح دراز تر بیان کیا گیا ہے۔

امیر الہند نواب محمد علی خان والا جاہ

از

جناب عبید اللہ ـــ ایم ۔ اے (مدراس)

ہندوستان کو آزاد ہوئے لگ بھگ پچاس سال ہو رہے ہیں۔ انگریزی عہد کی تمام باجگذار ریاستیں انڈین یونین میں ضم کر دی گئیں، دیسی ریاستوں کے راجاؤں اور نوابوں کو جو مراعات حاصل تھے وہ بھی ختم کر دیے گئے، سابقہ ریاست مدراس اور موجود تملناڈ میں خاندان انوری یا خاندان والا جاہی کے موجودہ نواب محمد عبد العلی خان عظیم جاہ کو حکومت ہند کی طرف سے پرنس آف ارکاٹ کے خطاب کے ساتھ وہی مراعات اور امتیازات بدستور جاری ہیں جو انگریزی عہد میں ان کے اسلاف کو حاصل تھے۔

ایسٹ انڈیا کمپنی اور نواب محمد عبد العلی خاں عظیم الدولہ (۱۸۰۱ء تا ۱۸۱۹ء) کے درمیان ایک معاہدہ ۱۹ ربیع الاول ۱۲۱۶ھ مطابق ۲۱ جولائی ۱۸۰۱ء کو طے ہوا اور نواب صاحب کو گدی نشین کیا گیا۔ بارہ ہزار ہن ماہانہ کی صورت میں رقم مقرر کی (ریاست کی سالانہ آمدنی کچھ بھی ہو) کرناٹک کا سارا ملکی، مالی اور فوجی انتظام ایسٹ انڈیا کمپنی کے تحت ہوگیا۔

موجودہ نواب محمد عبد العلی خان عظیم جاہ کا قصر (امیر محل شہر چینئی (مدراس) مختلف مذہبی، ادبی اور سماجی سرگرمیوں کا مرکز ہے، صدر یا وزیر اعظم جمہوریہ ہند،

مرکزی حکومت کے وزرا، اعلیٰ فوجی افسر، بیرونی ممالک کے سفرا، اور وفود جب کبھی شہر چینئی آتے ہیں تو "امیر محل" میں پرنس آف ارکاٹ سے ضرور ملاقات کرتے ہیں۔

دکن اور میسور کی تاریخ پر بہت کچھ تفصیلی مواد طبع ہو چکا ہے لیکن خاندان والاجاہی کے متعلق بہت کم تاریخی واقعات طبع ہوئے ہیں، جیسا کہ ڈاکٹر محمد غوث سابق منتظم شعبہ مخطوطات (جامعہ عثمانیہ حیدرآباد) نے اپنے ایک مضمون بعنوان "ہندوستان کی ابتدائی فرانسی اور انگریزی کشمکش میں خاندان انوری کا حصہ" میں بجا طور پر تحریر کیا ہے کہ ریاست خاندان والاجاہی (کرناٹک) کی تاریخ پر جہاں تک علم ہے ارباب تاریخ نے اب تک بہت کم توجہ کی ہے، جب تک اس ریاست کی تاریخ نہ مرتب ہو جائے اس وقت تک تاریخ ہند کا ایک اصلی باب تاریکی میں ہوگا۔

خاندان والاجاہی کی ہندوستان میں آمد | خاندان والاجاہی میں امیر الہند نواب محمد علی خاں والاجاہ کو خاص اہمیت حاصل تھی، وہ ۴۶ سال تک کرناٹک کے ناظم بلکہ مطلق العنان رئیس اور حاکم رہے۔ اپنے اوصاف حمیدہ کے ساتھ علمی اور ادبی دلچسپی اور مذہبی رواداری کی وجہ سے یہ دور ممتاز تھا، محمد علی والاجاہ کے والد بزرگوار نواب محمد انور الدین خاں سراج الدولہ شہامت جنگ گوپامئوی فاروقی نے خاندان انوری یا والاجاہی کی بنیاد ڈالی، والاجاہ کا تعلق اس مشہور فاروقی خانوادہ سے تھا جس کے مورث اعلیٰ شیخ سلیمان نے نویں صدی ہجری کے آغاز میں ایک بڑے لشکر کے ساتھ کابل فتح کیا تھا اور اپنی حکومت قائم کی، شیخ سلیمان کے پوتے سلطان شہاب الدین احمد المعروف فرخ شاہ نے کابل پر حکومت کر کے عادل کا لقب پایا، چنگیز خاں کے حملوں کی وجہ سے اس سلطنت کا خاتمہ ہوا، فرخ شاہ کے پوتے نے افراد خاندان کے ساتھ ہندوستان کا رخ کیا، یہ لوگ

ملتان، قنوج اور گوپا مئو میں پھیل گئے۔

محمد علی والاجاہ ۱۱۳۵ھ میں شاہجہاں آباد میں پیدا ہوئے، گویا اصلاً اس خاندان کا وطن ثانی دہلی تھا۔ والد نے بچے کا نام غلام انبیاء رکھا کہ اس سے تاریخ ولادت برآمد ہوتی ہے۔ ان کی والدہ نے عقیدہ امامیہ اثنا عشریہ کے مطابق ان کا نام محمد علی رکھا۔ چار سال کی عمر میں اپنی والدہ کے ساتھ قصبہ گوپا مئو پہنچے، بسم اللہ خوانی کی رسم انجام پائی۔

سلسلۂ نسب | محمد علی والاجاہ کا سلسلۂ نسب والد کی طرف سے خلیفۂ ثانی حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ سے ملتا ہے۔ شجرہ ذیل میں دیا گیا ہے:

نواب محمد علی خاں والاجاہ بن نواب انورالدین خاں بن حاجی محمد انور بن مولوی محمد منور بن شاہ نعم اللہ بن مخدوم عبدالحیٔ بن مخدوم عبدالقادر القنوجی بن قاضی عبداللہ بن قاضی ابراہیم اصغر بن شیخ نعمۃ اللہ بن شیخ علاءالدین اصغر بن شیخ محمد بن شیخ علاءالدین اکبر بن قاضی فخرالدین اصغر بن قاضی شعیب بن شیخ محمد احمد بن شیخ یوسف بن سلطان شہاب الدین احمد المعروف بفرخ شاہ بن شیخ فخرالدین اکبر بن سلطان سلیمان بن شیخ مسعود بن عبداللہ الواعظ الاصغر بن شیخ ابوالفتح الواعظ الاکبر بن شیخ اسحاق بن شیخ ابراہیم اکبر بن شیخ ناصرالدین (حضرت امام حسنؓ کے نواسے) بن حضرت عبداللہ بن حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ۔

تعلیم و تربیت | محمد علی والاجاہ چھ سال کی عمر کو پہونچے تو اپنی والدہ اور ایک رشتہ دار کے ساتھ بنگالہ کے راستہ اپنے والد نواب انورالدین خاں کی خدمت میں پہونچے۔ والاجاہ کو موقع ملا کہ والد بزرگوار کی نگرانی میں تعلیم و تربیت حاصل کریں۔

آصف جاہ اول نے ۱۱۵۶ھ مطابق ۱۷۴۳ء میں نواب انورالدین خاں کو کرناٹک

میں محمد سعید سعادت اللہ خاں ثانی کا نگران اور نائب مقرر کیا تھا، چند ہی ماہ بعد سعادت اللہ خاں ثانی کے قتل کے بعد نواب انورالدین خاں کرناٹک کے ناظم مقرر ہوئے۔ ارکاٹ کو اپنا مستقر بنایا، کرناٹک کے فوجی اور دیوانی نظم و نسق کے لیے جن افراد کو مقرر کیا تھا وہ زیادہ تر گوپامئو کے رہنے والے تھے۔ چند عہدہ داروں کے نام یہ تھے: محمد نجیب خاں (انتظامی مشیر) مسیح الزماں خاں (بخشی گری) غضنفر علی خاں (رسالہ داری) محمد ابرار خاں (پیادہ فوج کی سرداری) سید علی خاں صفوی سید ناصر علی خاں۔ راجا بسنت رائے، رائے منولال وغیرہ، نواب انورالدین خاں نے کرناٹک کے مختلف علاقوں کی نگرانی اپنے لڑکوں کے سپرد کی۔ نطھر نگر (ترچنا پلی) کا علاقہ محمد علی والاجاہ کے سپرد تھا۔

والد کا احترام | محمد علی والاجاہ اپنے والد بزرگوار کا بہت احترام کرتے تھے۔ وہ بھی والاجاہ سے محبت رکھتے تھے، والد نے انہیں حقہ پینے سے منع کر دیا تھا۔ والد کے مرنے کے بعد والاجاہ اس عہد پر قائم رہے۔ اپنے بچوں کو حقہ کشی سے منع کرتے تھے۔

والاجاہ نے ایک مہم سے کامیاب لوٹتے ہوئے نطھر نگر کے قلعہ کے باہر کیمپ میں قیام کیا تاکہ دوسرے روز صبح سویرے والد کی خدمت میں حاضر ہو جائیں۔ باپ سے صبر نہ ہو سکا بیٹے کے دیدار کے شوق میں جوش محبت سے اپنے ہی ہاتھ سے ایک منظوم خط لکھ کر قلعہ کے باہر بیٹے کے پاس بھجوایا۔

گر بخبرم زود در آئی چہ شود مانند نسیم سحر آئی چہ شود
ہر چند کہ بوی گل ز گل آید پیش ای گل تو ز بو پیشتر آئی چہ شود

والاجاہ سے دریافت کیا کہ شہر میں داخل ہونے کا وقت کیا ہے، پھر یہ شعر بھی لکھا

شہر ما فردا پر از شکر شود شکرا رزان ار زان می شود

دوسرے روز والاجاہ قلعہ نظرنگر میں باپ کی خدمت میں حاضر ہوئے، قدموں پر سر رکھ دیا۔ والاجاہ نے دیکھا کہ والد بزرگوار نے پلنگ کے بغیر زمین پر بستر بچھا کر تکیہ لگا لیا ہے اور خیال کیا کہ پلنگ کسی کو مرحمت کیا ہوگا، اپنے خادم خاص کو اپنا پلنگ لانے کے لیے کہا۔ انورالدین خاں کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے اور والاجاہ سے کہا "وہ خدا تعالیٰ سے عہد کیے تھے کہ جب تک تم فتح و کامرانی سے واپس نہ آجاؤ زمین پر ہی سویا کروں گا۔ اب جبکہ تم آگئے آج ہی سے پلنگ استعمال کرونگا"۔

ایک مرتبہ والاجاہ بیمار پڑ گئے، باپ ان کو دیکھنے کے لیے گئے اور پلنگ سے متصل بیٹھ گئے۔ اس وقت جو اطباء حاضر تھے ان میں حکیم علی اکبر، حکیم محمد امین اور حکیم سکندر بھی موجود تھے، اطباء نے کیفیت عرض کی اور نواب انورالدین خاں نے یہ شعر پڑھا:

جان من سہل است جان جانم او ست

دراند اختہ ام در مانم او ست

۱۱۶۲ھ/۱۷۴۸ء میں آمبور کے مقام پر فرانسیوں سے جنگ کرتے ہوئے انورالدین خاں شہید ہوئے، اس وقت ان کی عمر ۷۷ سال تھی۔ لاش چند دن ارکاٹ کی جامع مسجد میں امانت رکھی گئی، اس کے بعد حیدرآباد لے جائی گئی، آصف نگر کے محلہ میں ان کے پیر و مرشد حضرت میران سید شاہ ولی اللہ محمد قادری کے مزار کے پائین میں دفن کیا گیا۔

نظامت | باپ کی شہادت کے بعد نواب محمد علی خاں والاجاہ ۱۱۶۳ھ مطابق ۱۷۵۰ء میں کرناٹک کے ناظم مقرر کیے گئے۔ مغل حکمراں شاہ عالم بادشاہ نے نواب محمد علی کو امیرالہند والاجاہ کا خطاب، خلعت وغیرہ عطا فرمایا ۱۱۷۹ھ/۱۷۶۵ء کے معاہدہ الہ آباد'

کی رو سے والاجاہ آصف جاہی خاندان کے تابع نہ رہے۔

محمد علی والاجاہ کے خصائل اور عادات | محمد علی والاجاہ کو قدرت نے اخلاق حمیدہ اور اوصاف پسندیدہ سے نوازا تھا، زمانہ کی سیاست میں جو بلندی حاصل کی وہ ان اوصاف کا عکس تھی۔ توزک والاجاہی میں والاجاہ کے دن رات کی مصروفیت کا خاکہ یوں بیان کیا گیا ہے۔

"والاجاہ رات میں تین بجے بیدار ہوجاتے، وضو کرکے تہجد کی نماز پڑھتے اس کے بعد تلاوت قرآن مجید میں مصروف ہوجاتے، صبح کی نماز پڑھ کر آفتاب کے طلوع ہونے تک کسی سے بات کیے بغیر وظائف پڑھنے میں مشغول ہوجاتے۔ یہ درود چنے کے دانوں پر پڑھا جاتا تھا، قریب قریب دو سو افراد حاضر رہتے تھے، شاگرد پیشہ ور افراد اور اہل مذہب کی کوئی تمیز نہیں تھی، اس طریقہ درود خوانی کو والاجاہ نے ایک دائمی مشغلہ بنا لیا تھا۔ اس کے بعد ایک مجلس مذاکرہ شروع ہوتی اس مجلس میں علماء فضلائ برادران و فرزندان احباب اور قرابتدار جمع ہوتے اس مجلس کے بعد دربار عام ہوتا، کاغذوں پر دستخط ہوتے، امور ریاست کی اصلاح کے بارے میں مشورے ہوتے، ظہر کی نماز کے بعد دارالانشاء میں معروف رہتے، گھربار کے کاروبار، قرابتداروں کے حالات کا استفسار اور مساکین کے حالات کا جائزہ لیا جاتا، عصر کی نماز سے فارغ ہوکر علمائ اہل تصوف اور مشائخ کے جلسہ میں شریک رہتے، گفتگو ہوتی، معاملات پر غور و خوض ہوتا، اہل مجلس کے ساتھ نماز مغرب اور عشاء ادا کی جاتی، اس کے بعد امور ملکی کا انتظام ہوتا، اسکے بعد خوابگاہ چلے جاتے، والاجاہ پابند نماز تھے، روزانہ پانچ وقت کی نماز

ادا کرنے کے علاوہ نماز جمعہ کے بھی پابند تھے، عیدین کی نمازیں بھی پڑھا کرتے تھے۔ نفل نماز بھی ادا کرتے تھے، خاص خاص موقعوں پر دعائیں پڑھنے کے سلسلہ کو بڑی کوشش سے جاری رکھا تھا، بعض مقدس راتوں میں شب زندہ داری کے بھی عادی تھے، مسجد کو پیدل جایا کرتے، رمضان کے پورے روزے رکھا کرتے نفل روزوں کے عادی تھے، گناہوں سے بچا کرتے تھے، لوگوں کی خطاؤں کو معاف کر دیا کرتے۔ درود پڑھنے پر ہمیشہ مائل رہتے تھے"

والاجاہ کے علمی اور ادبی خدمات والاجاہ کا دور حکومت علم و فضل کی قدردانی کے لحاظ سے خاص اہمیت رکھتا ہے، اس دور میں علم و ادب کی خوب ترقی ہوئی، والاجاہ کے ادبی ذوق، علم و فضل کی قدردانی اور شعراء نوازی کی وجہ سے ہندوستان کے مختلف علاقوں کے بڑے بڑے علماء، مشائخ طریقت، نامور شعرائے کرام اور اطبائے حاذق کے علاوہ ایران و عرب کے اہل علم و قلم بھی ارکاٹ چینئی اور کرناٹک کے دوسرے علاقوں میں جمع ہو گئے تھے، جیسے مولوی امین الدین خاں (المتوفی ۱۱۹۵ھ)، سید محمد دالہ موسوی (خراسان۔ المتوفی ۱۱۸۴ھ) قاضی تلسمانی (افریقہ۔ المتوفی ۱۲۰۱ھ) ....

.... مولوی سید شاہ عبد القادر مہربان فخری (المتوفی ۱۲۰۳ھ) مولانا باقر آگاہ (المتوفی ۱۲۲۰ھ ملا عبد العلی محمد المتوفی ۱۲۲۵ھ) مولوی غلام محی الدین معجز (المتوفی ۱۲۳۶ھ) مولوی محمد غوث شرف الملک المتوفی ۱۲۳۸ھ) وغیرہ۔

والاجاہ کی علم دوستی کا اس سے بھی اندازہ ہوتا ہے کہ اس دور کے مشہور شاعر میر اسمٰعیل خاں ابجدی کو انور نامہ تحریر کرنے پر والاجاہ نے ابجدی کو چاندی میں تلوا کر ہم وزن رقم اور خلعت مرحمت فرمایا تھا، میر اسمٰعیل خاں ابجدی، سید شاہ میر بیجاپور کے

فرزند تھے، سید شاہ میر بیجاپوری جنوبی ہند کے مشہور مورخ ملا محمد قاسم مولف تاریخ فرشتہ کے بہنوئی تھے، اسجدی کا خاندان بیجاپور کی تباہی کے بعد چنیئی کے ایک تعلقہ چنگل پیٹ میں مقیم ہوا۔

مذہبی خدمات | والاجاہ پابند مذہب تھے، اپنے دور حکومت میں کرناٹک کے مشہور شہروں میں مساجد تعمیر کروائیں۔ شہر چنیئی کے مشہور مساجد کے نام یہ ہیں۔ مسجد والاجاہی مسجد معمور، مسجد سعید آباد، عیدگاہ وغیرہ جیسی شاندار مساجد والاجاہ کی زندہ یادگار ہیں۔ کرناٹک کے دوسرے شہروں مثلاً ترچناپلی، ارکاٹ، ناگور وغیرہ میں والاجاہ کی تعمیر کردہ مساجد اب بھی موجود ہیں۔

اپنے وطن گوپامئو (یو۔ پی) میں حسب ذیل چار یادگاریں موجود تھیں۔

مدرسہ والاجاہی، جامع مسجد گوپامئو کی جدید تعمیر، عیدگاہ اور قبہ مزار حضرت مخدوم اعزالدین سرخ، اجمیر کا سماع خانہ بھی والاجاہ نے تعمیر کروایا تھا۔

مکہ معظمہ، مدینہ منورہ، نجف اشرف، کربلائے معلی، مشہد شریف میں آب دار خانے قائم کرکے ان کے مصارف ادا کرتے تھے، شریفوں اور صالحوں کی خدمت میں نذریں بھیجتے اور اس ملک کی صنعتیں بھی بطور تحفہ روانہ کرتے۔ دو بحری جہاز خریدے گئے تھے، ایک کا نام سفینۃ اللہ اور دوسرے کا نام سفینۃ الرسول تھا، حاجیوں کے جدہ لانے اور لے جانے کے لیے استعمال کیے جاتے تھے۔ حرمین شریفین میں سند فراشی (جاروب کشی)، اور چراغوں کو روشن کرنے کی خدمت موروثی طور پر سلطان ترکی سے حاصل کی تھیں۔ ان سب اخراجات کے لیے ایک لاکھ روپیہ سالانہ کی آمدنی محمود بندر کے محاصل سے بطور جاگیر مقرر کی تھی، مکہ معظمہ اور مدینہ منورہ میں اپنے وکیل مقرر

کیے تھے، یہ وکیل نادار لوگوں کی خبر گیری کرتے تھے۔ ان کے لیے طعام کا اہتمام کرتے تھے۔ غریب حاجی جن کے پاس رقم نہیں ہوتی تھی ریاستی وکیل ادا کرتے تھے۔ اہل حرمین کی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لیے بڑی بڑی رقمیں بھیجا کرتے تھے۔ ان سہولتوں کی وجہ سے عرب محمد علی والا جاہ کو 'سلطان الہند' کا لقب دیتے تھے، جمعہ کے خطبوں میں سلطان ترکی کا نام لینے کے بعد 'امیر الہند والا جاہ' کا نام لیا جاتا، مکہ معظمہ اور مدینہ منورہ میں حجاج کے قیام کے لیئے 'رباط' بھی تعمیر کروائی تھی، اب بھی 'ارکاٹ رباط' کے نام سے مکہ معظمہ میں موجود ہے، جہاں ٹمل ناڈو ریاست کے حجاج قیام کرتے ہیں۔ ۱۹۹۴ء کے حج کے موقع پر راقم الحروف کو 'ارکاٹ رباط' میں قیام کا موقع ملا۔ ہر قسم کی سہولتیں اس رباط میں میسر ہیں۔ مدینہ منورہ کی رباط حاصل کرنے کے لیے نواب محمد عبد العلی خاں عظیم جاہ پرنس آف آرکاٹ نے حکومت سعودیہ سے تعلق رکھے ہیں۔

نواب والا جاہ کے دور حکومت میں مختلف صوفیائے کرام اسلام کا اخوت و مساوات والا پُر امن پیام ساتھ لے کر اپنے قول و فعل سے اس کی تشہیر ریاست کرناٹک کے مختلف علاقوں میں کرتے رہے، چند صوفیائے کرام کے نام ذیل میں دیے گئے ہیں۔

حضرت محمد مخدوم عبد الحق ساویؒ عرف دستگیر صاحب گیان بھنڈاری (المتوفی ۱۱۶۵ھ) (ہنود میں گیان بھنڈاری کے نام سے مشہور تھے) حضرت شاہ ابوالحسن قربی (المتوفی ۱۱۸۲ھ) حضرت سید شاہ عبد اللطیف ذوقی (المتوفی ۱۱۹۴ھ) حضرت خواجہ سید رحمت اللہ قادری نائب رسول اللہ (المتوفی ۱۱۹۵ھ) حضرت شاہ تراب چشتی (ترنامل)

محمد علی والا جاہ بھی شاہ ظاہر الدین محمد (المتوفی ۱۲۱۰ھ) کے مرید تھے، عبد الجبار ملکاپوری نے اپنے تذکرہ میں لکھا ہے کہ شاہ ظاہر الدین محمد پالکی میں بیٹھے ہوتے اور

والاجاہ آپ کے نعلین ہاتھ میں لیے پیدل چلتے تھے۔ کتب خانہ سالار جنگ حیدرآباد دکن میں والاجاہ کی ایک مثنوی مخطوطہ کی شکل میں محفوظ ہے جس میں تصوف کے بعض مسائل منظوم کیے گئے ہیں۔ کتب خانہ مدرسہ محمدی باغ دیوان صاحب میں والاجاہ کی تالیف "دعائے معظم" مخطوطہ کی شکل میں موجود ہے۔ یہ مخطوطہ مختلف دعاؤں پر مشتمل ہے، خاص خاص اوراد خاص خاص دنوں اور اوقات میں پڑھنے کے ہدایات بھی شامل ہیں۔

رواداری | والاجاہ کا دور مذہبی رواداری کے لحاظ سے بہت مشہور تھا، ہندو مسلم شیر و شکر تھے۔ راجا حکومت رام ریاست کے دیوان تھے، یہ صاحب ہنر تھے، انکے بہت سے قلمی فارسی خطوط اور دیگر شاہکار آج تک محفوظ ہیں، کاشی پرشاد فدوی کو رائے کا خطاب اور پیش کاری کی خدمت عطا ہوئی۔ مکھن لال منشی تھے اور رائے کا خطاب دیا گیا۔ مختلف مندروں کو جاگیریں دی گئیں۔

عدل و انصاف | والاجاہ نے پوری کوشش کی کہ عدل و انصاف کا خیال رکھا جائے اور اسلامی روایات کو برقرار رکھا جائے، ذیل میں ان کے عدل و انصاف کا ایک واقعہ بیان کیا جاتا ہے۔

محمد علی والاجاہ کے بڑے فرزند عمدۃ الامراء کمسن تھے کہ ایک دن کھیل کود کے موقع پر ان کے ہاتھ سے ایک معمار کے بچہ کی پیشانی پر ضرب لگی، خون بہنے لگا، اس وقت والاجاہ دارالعدالت سے اٹھ کر محل سرا جا رہے تھے، زخمی بچہ کو روتا دیکھ کر واقعات دریافت کیے۔ اپنے بیٹے کے فعل کو خدا ترسی کے خلاف تصور کیا۔ اپنے بیٹے اور معمار کے بیٹے کو دارالعدالت میں لے جانے کا حکم دیا۔ اپنے بیٹے کو مجرموں کے مقام پر کھڑا کیا۔ ارباب عدالت سے درخواست کی کہ تعدی کرنے والے کو سزا دی

جائے اور ولدیت کے رشتہ کو سزا کی اجرائی میں حارج نہ سمجھیں۔ حاکم عدالت وزارت علی خاں عرب تھے، موصوف نواب انورالدین خاں کے زمانہ سے اس خدمت پر مامور تھے، حاکم عدالت نے یہ نکتہ پیش کیا کہ دونوں غیر مکلف ہیں۔ شرعی حدود میں نہیں آتے، محمد علی والا جاہ نے کہا کہ اس مسئلہ کی شرعی نوعیت پر کوئی قیل و قال نہیں ہو سکتی، لیکن انتظام حکومت بھی تو ضروری ہے تاکہ لوگوں کو عبرت حاصل ہو۔ چنانچہ معمار کے بچہ کو حکم دیا گیا کہ عمدۃ الامراء کی پیشانی پر بھی اسی شدت سے ضرب لگائی جائے جس شدت سے اس کی پیشانی پر ضرب لگی تھی۔ معمار کے بچہ نے حکم کی تعمیل کی۔ اس واقعہ سے سب کارکنوں کے ذہن میں والا جاہ کے عدل و انصاف کا سکہ بیٹھ گیا اور رعب طاری ہو گیا۔

فلاحی کام | والا جاہ نے اپنے دور میں رعایا کے لیے دارالشفاء کا قیام، کنوؤں کی کھدائی، پلوں کی تعمیر، باغوں کی درستگی، نہریں جاری کرنا وغیرہ جیسے فلاحی کام انجام دیئے۔

دادودہش | محمد علی والا جاہ فیاض حکمراں تھے، بہت سارے مشائخ و اہل کمال وغیرہ کی مالی مدد کرتے تھے۔ مثلاً بریلی کے شاہ ابو سعید اور ان کے فرزند شاہ ابواللیث ہندوستان کے باشندوں کی اولاد اور امراء وغیرہ بھی والا جاہ کے دادودہش سے مستفید ہوئے۔ مرشد قلی خاں ناظم بنگالہ کے فرزند یحییٰ خاں، ناظم دکن مبارز خاں کے پوتے خواجہ مودود خاں، آصف الدولہ کے پوتے حمیدالدولہ، محمد شاہ بادشاہ کے امیر خاص دلاور خاں وغیرہ گردش زمانہ کی وجہ سے تباہ حال ہو گئے تھے، والا جاہ کی مالی امداد سے ان کی مشکلات دور ہوئیں۔

تواضع اور کسر نفسی | محمد علی والا جاہ اپنی دادودہش کے باوجود تواضع اور کسر نفسی میں مشہور تھے۔ کرناٹک سے گویا مئو تک غریبوں اور قرابتداروں کے لیے ان کا

دسترخوان ہمیشہ بچھا رہتا تھا، محتاجوں اور غریبوں کی مدد کرتے تھے۔ نذر و نیاز کے موقع پر دعوتوں میں لوگوں کا اجتماع ہوتا یا کسی اور موقع پر مجلسوں میں مشائخ اور فقراء وغیرہ جمع ہوتے تھے تو ان کے ساتھ مدارات کی جاتی، مہمان نوازی کا جو اہتمام کرتے اس کی نظیر مشکل سے ملتی تھی، خود مہمانوں میں کھڑے رہتے، مہمانوں کا ہاتھ اپنے ہاتھ سے دھلاتے تھے، اس کے باوجود والاجاہ کی بزرگی کا رعب ملازموں، مصاحبوں اور فرزندوں پر اس قدر چھایا رہتا کہ کوئی بات کرنے کی جرأت نہیں کرتا۔

رحمدلی | نواب محمد علی والاجاہ میں رحمدلی اس درجہ تھی کہ انہوں نے کبھی کسی فرد کو تکلیف نہ دی۔ والاجاہ کی خوابگاہ کی چوکی پر جو لوگ پہرہ دیتے تھے ان میں سے کسی کو سوتا دیکھتے تو اپنا تکیہ اس کے سرہانے رکھا دیتے اور صبح تک اس کو اٹھانے کی ترکیب نہ کرتے۔ ایک مرتبہ ایک سفر کے موقع پر ایک فراش کو اپنے خیمہ میں اپنی مسند کے پاس سوتے ہوئے پایا۔ والاجاہ اس مسند پر بیٹھنے کے بجائے کسی دوسری جگہ بیٹھ گئے اور ملاقات عام کا حکم دے دیا، لوگوں کو بھی منع کر دیا کہ فراش کو بیدار نہ کرے۔

والاجاہ کسی جانور کو مارنے سے بھی پرہیز کرتے، چنانچہ قربانی کے وقت چوپایہ پر اپنا ہاتھ پھیر دیتے تھے اور قربانی دوسرا شخص کر دیتا۔

اگر کسی بچھو اور سانپ پر نظر پڑ جاتی تو اس کے محافظ بن جاتے اور زندہ جنگل میں پہونچا دیتے۔

وفات | والاجاہ کا انتقال ۲۹ ربیع الاول ۱۲۱۰ھ روز سہ شنبہ سات ساعت صبح ہوا، ان کی مدت حکومت ۴۶ سال سات ماہ تیرہ[۱۳] دن تھی۔ بیان کیا جاتا ہے کہ محمد علی والاجاہ کو مشہور صوفی حضرت مخدوم عبدالحق ساوائی القادریؒ کے مقبرہ میں امانتاً

سونپا گیا تھا، لیکن حضرت دستگیر صاحبؒ نے کسی سے عالم رویا میں کہا کہ "فقیروں میں بادشاہ کا کیا کام"، اس لیے والاجاہ کی نعش کو تدفین کے لیے نطہر نگر (ترچنا پلی) لے جایا گیا۔ اس سفر میں جہاں جہاں قیام کیا جاتا تھا والاجاہی خاندان کی جانب سے اس مقام پر مسجد تعمیر کی جاتی تھی، یہ مساجد اب بھی تملناڈ اسٹیٹ میں والاجاہی خاندان کے دور حکومت کی یاد تازہ کرتے ہیں۔ حضرت نطہر علی طبل عالم بادشاہ کی درگاہ کے احاطہ میں نواب محمد علی والاجاہ کو دفن کیا گیا۔ "ستون خیرات شکست" تاریخ وفات ہے۔ اس زمانہ کے مشہور فارسی شاعر مکھن لال خرد نے یہ تاریخ لکھی۔

چو والاجاہ سنش پنج و ہفتاد ازین دار فنا رفتہ بجنت

شدم در فکر سالش بسکہ حیراں خرد گفتا بصد افسوس وحسرت

سن تاریخ دان در وقت رحلت ہزار و دو صد و دہ بذر ہجرت

کتابیات

قصر والاجاہی از محمد حسین تمنائی، توزک والاجاہی از برہان خاں ہانڈی، بیاض از عبدالوہاب مدار الامرائ، دیوان عظیم جاہ، خلاصہ سوانحات ممتاز از میر خورشید حسن، مدراس میں اردو ادب کی نشو ونما از ڈاکٹر محمد افضل الدین اقبال، باقر آگاہ از ڈاکٹر ذاکرہ غوث، خاندانی روزنامچے۔

علامہ سید سلیمان ندویؒ کی خدمات قرآن

از پروفیسر نثار احمد فاروقی۔ دہلی

حضرت علامہ سید سلیمان ندویؒ ہمارے علمائے سلف کا نمونہ تھے۔ ان کے علمی کارناموں کا سرسری جائزہ بھی لیا جائے تو اسلامی ثقافت کے ہر ممتاز شعبے میں ان کی خدمات پوری آدھی صدی پر پھیلی ہوئی ہیں۔ انہوں نے باضابطہ کوئی تفسیر تو نہیں لکھی مگر ان کی تصانیف میں جابجا قرآن کریم سے استشہاد کیا گیا ہے اور انہوں نے قرآنی مطالب کی تشریح میں نہایت احتیاط اور سلامت فکر کا اظہار کیا ہے، آیات قرآنیہ کی تشریح ایسے دل نشیں پیرائے میں کی ہے کہ ریب و شک کی گنجایش نہیں رہتی۔ اسلامی عقائد اور اعمال کو وہ قرآن اور احادیث کی روشنی ہی میں پیش کرتے ہیں مگر اس میں ان کا تاریخی شعور بھی ساتھ دیتا ہے، متکلمانہ انداز بھی۔ تفسیر میں ان کی سلامت روی کا اسلوب یہ ہے کہ وہ لفظ قرآن کو سب سے پہلے قرآن ہی سے پرکھتے ہیں۔ مثلاً ایک ترکیب قرآن میں خاتم النبیین آئی ہے یعنی حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم انبیاءؑ کے خاتم ہیں۔ جس فرقے نے سلسلۂ نبوت کے ختم ہونے سے انکار کیا اور یہ دعویٰ کیا کہ کسی نبی کا مبعوث ہونا اب بھی ممکن ہے وہ خاتم کو اسم آلہ کہتا ہے یعنی ما یختم بہ، یہ مُہر کے مفہوم میں ہے جو تصدیق کے لیے لگائی جاتی ہے۔ علمائے اہل سنت بلکہ جمہور علماء کا کہنا یہ ہے کہ مہر تصدیق کے لیے یہ درست ہے مگر اسی میں عبارت کا تمام ہو جانا بھی شامل ہے، مہر تصدیق کے بعد جو عبارت اضافہ کی جائے گی وہ

غیر مصدوق وغیر مصدق ہوگی۔ تشریح تو یہ بھی درست ہے مگر کافی نہیں، اس میں تفریعات کی گنجائش رہ جاتی ہے۔

علامہ سید سلیمان ندویؒ نے اپنے اصول تفسیر القرآن بکلام الرحمٰن کی روشنی میں یہ دیکھا کہ مادۂ ختم اور اس کے مشتقات قرآن کریم میں کن معانی میں استعمال ہوئے ہیں۔ مثلاً اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

خَتَمَ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ (۲ : ۷) اللہ نے ان کے دلوں پر مہر لگا دی ہے، یعنی نصیحت و ارشاد و ہدایت ان کے قلوب میں راہ نہیں پا سکتے۔ اس سے معلوم ہوا کہ اگر مقصود یہ ہو کہ باہر سے کوئی شئے اندر داخل نہ ہو سکے تو یہاں ختم استعمال ہوگا۔ دوسرے موقع پر قرآن کریم میں ارشاد ہے: وَخِتَامُهٗ مِسْكٌ (۸۳ : ۲۶) یعنی شراب طہور جن ظروف میں ہوگی انہیں مشک سے سربند کیا ہوا ہوگا۔ سربند کرنے کا مقصود یہ ہوتا ہے کہ نہ باہر سے کوئی شئے اندر داخل ہو سکے، نہ اندرون ظرف جو کچھ ہے وہ باہر نکل سکے۔ اس سے واضح ہوا کہ ختم نبوت سے مراد یہ ہے کہ انبیائے سلف کا جو طویل سلسلہ ہے ان میں سے کسی نبی کو خارج نہیں کیا جا سکتا، ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ فلاں نبی کو ہم نہیں مانیں گے یا وہ نبی نہیں تھے۔ اسی طرح اب کسی شخص کے دعوائے نبوت کو بھی تسلیم نہیں کیا جا سکتا۔ اس سے واضح ہو گیا کہ خاتم النبیین کا مفہوم محض تصدیق انبیاء نہیں بلکہ سلسلۂ نبوت کا تمام ہو جانا ہی قرآن کی مراد ہے۔

اس ایک ہی مثال سے اندازہ ہوگا کہ سید صاحب کا اسلوب تفسیر سلامت فکر کا آئینہ بسم اللہ الرحمٰن الرحیم کا ترجمہ کرتے ہوئے عام طور سے مترجمین نے لفظ رحمٰن کو اسم صفت قرار دیا ہے لیکن قرآن کریم میں جن مواقع پر لفظ رحمٰن استعمال ہوا ہے ان میں غور کرنے سے معلوم

ہوگا کہ یہ اسم صفت نہیں اسم ذات ہے یعنی اللہ وہی ہے جسے تم رحمٰن کہتے ہو اور وہ نہایت رحم کرنے والا ہے بلکہ رحیم کا مفہوم از روئے قواعد عربی یہ ہوگا کہ ہمیشہ رحم کرنے والا ہے، اس لیے کہ فاعل جب بروزن فعیل آتا ہے تو اس کے فعل میں مداومت ہوتی ہے۔

علامہ سید سلیمان نے اپنے ابتدائی زمانے سے ہی قرآن کریم کی تشریح و تفسیر کا ذوق پیدا کر لیا تھا۔ قرآنیات سے متعلق ان کے ابتدائی مضامین جیسے قضا و قدر[1] اور قرآن مجید" (جولائی ۱۹۰۶ء) القرآن والفلسفۃ الجدیدۃ (۱۹۰۶ء) مسئلہ ارتقا اور قرآن (دسمبر[2] ۱۹۰۷ء) مکرمات القرآن (۱۹۰۹ء[3]) "قیامت: قرآن کی روشنی میں" (اکتوبر[4] ۱۹۰۹ء) اسماء القرآن (اگست ۱۹۱۱ء) رسالہ الندوۃ (لکھنؤ) میں شایع ہوئے۔ مولانا ابوالکلام آزاد کے الہلال سے وابستگی کے زمانے میں انہوں نے سیاسی اور ثقافتی موضوعات کے علاوہ کم سے کم دو[2] مضامین قرآنیات پر بھی لکھے۔ ایک کا عنوان تھا: قصص بنی اسرائیل یہ ستمبر، اکتوبر، نومبر ۱۹۱۳ء کے الہلال میں تین قسطوں میں شایع ہوا دوسرا مضمون علوم القرآن ۱۹۱۴ء الہلال ہی میں اور تین قسطوں میں چھپا تھا۔

" قصص بنی اسرائیل" کے بارے میں اس وقت صرف یہی کہنا ہے کہ اسرائیلیات علم تفسیر قرآن کا ایک قدیم شعبہ ہے۔ تفاسیر میں اسرائیلی روایات وہب بن منبہ، کعب الاحبار، عبداللہ بن سلام اور القرظی جیسے راویوں کے توسط سے آئی ہیں جن کے

---

[1] معارف: یہ مضمون علامہ شبلیؒ کا ہے اور مقالات شبلی جلد اول (۴۶-۶۵) میں شامل ہے اور بعد والا مضمون القرآن والفلسفۃ الجدیدہ کے نام سے جولائی (۱۹۰۶ء) کے الندوہ میں شایع ہوا ہے یہ دونوں غلطیاں یادگار سلیمان مرتبہ عبدالقوی دسنوی (۱۳۵-۱۳۶) میں بھی ہیں [2] جنوری ۱۹۰۸ء آگے بھی شہور و سنین کی اسی طرح کی غلطیاں ہیں جن کی تصحیح کر دی گئی ہے [3] الندوہ جنوری ۱۹۰۹ء [4] ستمبر ۱۹۰۹ء۔

بارے میں یہ سمجھا جاتا ہے کہ وہ یہودی ماخذ سے واقفیت رکھتے تھے لیکن اس صدی کی تیسری دہائی میں میکنزی نے یہودی ماخذ کی مدد سے قصص بنی اسرائیل کو تین ضخیم جلدوں میں جمع کیا ہے اس میں ان قدیم مصادر کی روایات کی اصل شکلیں معلوم کی جاسکتی ہیں اور ہماری قصص الانبیاء کی کتابوں سے ان کا تقابلی مطالعہ بہت دلچسپ نتائج سامنے لاتا ہے۔

رسالہ معارف کی ادارت کے زمانے میں بھی علامہ ندوی مرحوم نے قرآنیات پر متعدد مضامین لکھے ہیں، کسی نے آذر اور مریم بنت عمران پر تاریخی اعتبار سے اعتراضات کیے۔ سید صاحب نے "قرآن مجید پر تاریخی اعتراضات" کے عنوان سے جولائی[1] ۱۹۱۶ء کے معارف میں لفظ آذر پر بحث کی اور ستمبر ۱۹۱۶ء میں مریم بنت عمران کی تاریخی حیثیت پر محاکمہ کیا۔

" جنت سبا اور قرآن مجید کے ثبوت اعجاز کی کچھ قدیم شہادتیں" جنوری ۱۹۱۷ء کے معارف میں شایع ہوا، ان کے علاوہ: تفسیر القرآن بکلام الرحمٰن" (معارف اکتوبر ۱۹۲۹ء) تفصیل البیان فی مقاصد القرآن (نومبر ۱۹۳۲ء) ترجمان القرآن (اکتوبر ۱۹۳۲ء[2]) صبر کا قرآنی مفہوم (مئی جون ۱۹۳۵ء) شیخ جوہری الطنطاوی کی تفسیر جواہر القرآن کے مقدمہ پر تبصرہ (فروری ۱۹۳۷ء[3]) قرآن پاک کا تاریخی اعجاز (فروری ۱۹۳۹ء) کیا قرآن رسول کا کلام اور انسانی تعلیمات سے ماخوذ ہے؟ (اکتوبر ۱۹۴۰ء) وحی از روئے قرآن اور مدعی کا تضاد بیان (نومبر ۱۹۴۰ء) اور ایک آیت کا زمانۂ نزول (جون[4] ۱۹۴۴ء) یہ سب مضامین معارف کی زینت بنے۔ ان کے علاوہ بھی قرآنیات پر سید مرحوم کے

---

[1] جولائی کے بجائے اگست ۱۹۱۶ء میں [2] معارف: یہ ادارہ اس سے پہلے کے دونوں مضامین تفسیر اور علوم قرآنی کی تصنیفات پر تبصرے ہیں [3] فروری ۱۹۳۷ء کے بجائے فروری ۱۹۳۸ء میں۔ [4] جون کے بجائے مئی ۱۹۴۴ء میں۔

مضامین معارف اور دوسرے رسالوں میں چھپے ہیں[1] جن کا احاطہ سردست مقصود نہیں۔

قرآنی آیات و الفاظ کی حکیمانہ تشریح کے نمونے ان کی تصانیف میں جا بجا موجود ہیں، بلکہ ان کی اساس ہی قرآن و حدیث پر رکھی گئی ہے۔ علامہ ندوی کو جو صفت دوسرے علمائے اسلامیات سے ممتاز کرتی ہے وہ ان کا گہرا تاریخی شعور ہے۔ اس کا ایک اچھا نمونہ تاریخ ارض القرآن ہے جو ان کی ابتدائی تصانیف میں سے ایک ہے اور اس موضوع پر اردو زبان میں پہلی عالمانہ و محققانہ تصنیف تھی۔

مسلمانوں کو ابتدائی دور میں قرآن و حدیث، سیر و مغازی اور فقہ نے اتنا مصروف و منہمک رکھا کہ وہ جزیرہ نمائے عرب کے تاریخی آثار کی طرف توجہ ہی نہ کر سکے پھر علوم کے مرکز بدلتے گئے اور بحث و تحقیق کے نئے موضوعات کا دروازہ یونانی علوم نے کھول دیا حالانکہ دنیا کے سارے مذاہب میں تاریخ کا سب سے گہرا واضح اور موثر شعور مسلمانوں ہی کا ملتا ہے اور تیسری صدی ہجری کے آتے آتے انھوں نے بہترین سائنسی اور منطقی اصول پر مبنی کتب تاریخ و کتب رجال مدون کرنا شروع کر دیا تھا لیکن اس عہد میں اور اس کے بعد بھی کئی صدیوں تک کتب اور روایات ہی کو تاریخ کے مصادر سمجھا گیا۔ آثار کا تحفظ تو ہوا مگر ان کی تاریخی قدر و قیمت کا چنداں احساس نہ تھا دوسرے لفظوں میں یوں کہا جائے کہ آرکائیوز شخصی سطح پر بھی موجود تھے مگر آرکیالوجی کے تاریخی مصادر ہونے پر زیادہ توجہ ابتدائی صدیوں میں نہ تھی۔ اس کا سبب ممکن ہے یہ ہو کہ قبل اسلام کے آثار کو کفر و شرک کی نشانیاں سمجھا جاتا ہو۔

مغربی علماء نے تاریخی مصادر میں ایک نئے شعبے کا اضافہ کیا جسے حفریات یا (EXCA-VATIONS) کہا جاتا ہے اور اس میں تیزی ۱۹۲۰ء کے بعد آئی ہے جب تاریخ ارض القرآن

---

[1] ان کا ایک مجموعہ دار المصنفین نے مقالات سلیمان جلد سوم کے نام سے شایع کیا ہے۔

لکھی جا چکی تھی۔ سر جان مارشل نے ارض فلسطین کو جس میں موجودہ اسرائیل اردن اور شام کے علاقے بھی شامل ہیں خاص طور پر منتخب کیا جسے وہ بائبل کی سرزمین کہتے ہیں۔ یہاں حفریات EXCAVATIONS کے نتیجے میں طرح طرح کی چیزیں برآمد ہوئی ہیں جن میں سے بعض کا مطالعہ آج تک جاری ہے۔ ان آثار سے اب تک تو قرآن کریم کے ہر اشارے کی تفسیر اور ہر بیان کی تصدیق ہی حاصل ہوئی ہے۔

عرض کرنا یہ ہے کہ ان حفریات کے نتائج کی روشنی میں اگر تاریخ ارض القرآن کا نیا ایڈیشن مرتب کیا جائے تو اس کی اہمیت و افادیت کئی گناہ بڑھ جائے گی۔ ابھی پچھلے سال ہی الربع الخالی کے اس حصے میں جو حجاز کے مشرق میں اور عمان سے ملا ہوا ہے ایک نئی دریافت ہوئی ہے جس کے بارے میں بہت وثوق سے یہ کہا جا رہا ہے کہ یہی وہ جگہ ہے جسے قرآن کریم میں ارم ذات العماد کہا گیا ہے۔ اس طرح کی اور بھی متعدد تحقیقات ہیں جنکی روشنی میں اس نہایت مفید کتاب کو UPDATE کیا جانا چاہیے۔

علامہ سید سلیمان ندوی کی حیات اور علمی خدمات پر چند کتابیں بھی لکھی گئی ہیں۔ پی ایچ ڈی کے کم سے کم دو مقالوں کا مجھے علم ہے جو ہندوستان میں لکھے گئے، پاکستان کا حال معلوم نہیں۔ ہندوستان میں علامہ ندوی کے بارے میں چند اچھے اور بڑے سمینار بھی ہوئے۔ علی گڑھ، پٹنہ اور بھوپال کے سمیناروں میں تو راقم الحروف بھی شریک تھا۔ میرا مشاہدہ یہ ہے کہ حضرت علامہ کی شخصیت اور علمی خدمات کے مختلف اور متنوع پہلوؤں پر مضامین و مقالات لکھے اور پڑھے گئے، مگر انکی قرآنی خدمات اور اسلوب تفسیر پر زیادہ توجہ نہیں کی گئی۔ اس موضوع پر ان کے فرزند رشید ڈاکٹر سید سلمان ندوی حفظہ اللہ کا ایک مضمون کہیں پڑھا تھا جس میں بہت مفید اشارے تھے۔ یہ موضوع بہت اہم ہے اور خاصی تفصیل کا تقاضا کرتا ہے، میں نے فی الوقت اس کی ضرورت کا احساس دلانے کے لیے مختصر نویسی سے ہی کام لیا ہے۔

اخبار علمیہ

ہندوستان میں فارسی زبان و تہذیب و ثقافت کی اشاعت و فروغ میں ایرانی سفارت خانہ کا شعبہ ثقافت لائق ستایش ہے، وقتاً فوقتاً وہ مختلف موضوعات پر سمیناروں کے انعقاد کے علاوہ مفید اور بلند پایہ کتابیں شایع کرتا رہتا ہے، اردو اور انگریزی میں متعدد رسائل کی اشاعت بھی پابندی سے ہوتی رہتی ہے، فارسی زبان میں "قند پارسی" کے نام سے شایع ہونے والا علمی و تحقیقی مجلہ خاص طور پر قابل ذکر ہے، طباعت کے تمام محاسن سے آراستہ یہ مجلہ ہندوستان کے فارسی داں طبقہ کی توجہ مبذول کرنے میں کامیاب ہوا ہے، حال ہی میں اس کا ضخیم شمارہ (مارچ ۱۹۹۷ء) حافظ نمبر کی شکل میں موصول ہوا، اس میں خواجہ شعر و معرفت حافظ شیرازی اور ہندوستان میں ان کی پذیرائی و اثر انگیزی کے متعلق عمدہ مقالات و مضامین آگئے ہیں، ان میں اکثر وہ مقالے ہیں جو ۱۹۹۶ء میں بمبئی میں منعقدہ حافظ شیرازی بین الاقوامی سمینار میں پیش کیے گئے تھے، متعدد مضامین میں ہندوستان میں موجود دیوان حافظ کے نسخوں کا جائزہ لیا گیا ہے، علامہ اقبال کے تعلق سے بھی کئی مضامین ہیں، ایک تحریر قاضی نذر الاسلام اور حافظ کے عنوان سے ہے، البتہ تعجب ہے کہ علامہ شبلی کے تعلق سے کوئی تحریر نہیں ہے جنھوں نے لکھا تھا کہ "یہ عموماً مسلم ہے کہ عالم وجود میں آج تک کوئی شخص غزل میں ان کا ہمسر نہ ہو سکا" یہ بھی امر مسلم ہے کہ خواجہ صاحب کے کلام کا تنقیدی جائزہ پہلی بار ہندوستان میں علامہ شبلی کے

قلم ہی کا مرہون منت ہے، ایک گوشہ پروفیسر نذیر احمد کے پانچ مقالات کے لیے خاص ہے، پروفیسر شریف حسین قاسمی کی ادارت میں یہ خاص شمارہ خواجہ صاحب کے قدردانوں کیلئے بہترین تحفہ ہے۔

حافظ کا کلام گو صدیوں سے قدردانوں کے حافظہ میں زندہ وتازہ ہے لیکن اب سوء حفظ کی شکایت عام ہے، حال ہی میں ہندوستانی سائنسدانوں نے قوت حافظہ کو اور تیز کرنے کے لیے 'میموری پلس' نامی دوا ایجاد کی ہے، سنٹرل ڈرگ ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کے ڈائریکٹر ایس کے باسو نے کہا کہ تحقیق سے یہ ثابت ہو چکا ہے کہ اس دوا میں بیکوسائیڈ اے اور بی کے اجزاء سے حافظہ کو تقویت ملتی ہے لیکن اس سلسلہ میں ایک مشکل یہی ہے کہ خود دوا کھانا کیسے یاد رہے، چنانچہ ہانگ کانگ کی ایک دواساز کمپنی ونسنٹ رے لیٹ نے ایک MEDIMATE بنائی ہے، اس میں مختلف گولیوں کے لیے خاصے بڑے خانے موجود ہیں، جن میں رنگ اور خوراک کے لحاظ سے جدا جدا ان گولیوں کو رکھا جا سکتا ہے ان خانوں پر الارم کا نظام ہے جو خود بخود اپنی آواز سے یہ یاد دلاتا ہے کہ کس دوا کا کونسا وقت ہے اور وہ کتنی مقدار میں لی جا سکتی ہے، شاعرانہ انداز میں اس سائنسی عمل کے متعلق یہی کہا جا سکتا ہے کہ ع بھول جانا ہمارا یاد رہے

حافظہ اور ذہن کے متعلق ایک تازہ تحقیق یہ بھی ہے کہ سرعت فکر کا تعلق ارادہ سے اس طرح ہے کہ کچھوے جیسے سست رفتار بطئی الفہم بھی خود کو سریع الفکر بنا سکتے ہیں، اس موضوع پر ہالینڈ میں داد تحقیق دی گئی اور اس سوال پر توجہ مرکوز کی گئی کہ اگر ایک شخص اپنی انگشت شہادت کو تحریک دینا چاہے تو اس خواہش اور اس کی بجا آوری میں کتنا وقت درکار ہے؟ محققین کے مطابق یہ خیال ذہن کے ایک گوشہ سے شروع ہوتا ہے

اور ۶ سینٹی میٹر کے فاصلہ پر ایک دوسرے گوشہ تک انگشت نمائی کے عمل سے پہلے اپنا سفر مکمل کرلیتا ہے، اس کی یہ مدت مسافت ۰.۰۹ ملی سکنڈ کی ہوتی ہے یعنی صفر اعشاریہ دو میل فی گھنٹہ کی رفتار سے بھی بہت کم۔ پروفیسر البرٹ جیڈ نے یہ بھی بتایا کہ بیرونی محرکات کے نتیجہ میں ردعمل کی کیفیت پیدا ہوتی ہے جس کا اثر عمل اضطراری کی شکل میں سامنے آتا ہے اس عمل کے مقابلہ میں فکر کو مہمیز کرنے میں خود ساختہ محرکات زیادہ اثر انداز ہوتے ہیں، اس ذہنی ورزش میں مصروف ایک محقق جانسن کا خیال ہے کہ دماغ کے مرکز میں فکر کا یہ گوشہ جہاں حرکت کا خیال پنپتا ہے، پہلی بار متعین ہوا ہے، ان کے خیال میں یہ انکشاف اب اس علم کی نئی بنیاد فراہم کر سکتا ہے۔

سائنس کی دنیا میں گذشتہ سال کے نصف آخر کی سب سے اہم خبر یہ تھی کہ مریخ پر انسانی زندگی کے ابتدائی آثار و شواہد کی معرفت میں کامیابی حاصل کر لی گئی ہے، یہ تحقیق دراصل انسان کی اس تلاش و جستجو کا ایک حصہ ہے کہ کیا ہم اس کائنات میں تنہا ہیں؟ قدرتاً اس انکشاف سے ساری دنیا پر حیرت و استعجاب کی کیفیت طاری ہوگئی کہ مریخ پر قدیم ترین ایک خلیاتی زندگی کا ثبوت فراہم ہوگیا ہے، تفصیل یہ ہے کہ ۱۹۸۴ء میں برِ اعظم انٹارٹیکا میں شہاب ثاقب کا ایک حصہ دریافت ہوا، ہوسٹن امریکہ کے جانسن خلائی مرکز میں الکٹرونی خوردبینوں سے اس کے طویل تجزیہ کے بعد سائنسداں اس نتیجہ پر پہونچے کہ تیرہ ہزار سال پہلے زمین پر گرنے والا یہ حجر شہابی دراصل لاکھوں سال پہلے مریخ کے ایک آتش فشانی لاوا کے ابل پڑنے کا نتیجہ ہے جو بعد میں بتدریج سرد ہوگیا، یہ حجر شہابی بتدریج کم درجہ حرارت میں متغیر ہوا اور یہ تغیر جسم نامی کی ہیئت اجتماعی کے سرگرم ہونے سے ممکن ہوا اور یہی امکان زندگی کی موجودگی کا بھی پیام ہے، علاوہ بریں اس شہاب ثاقب میں

ایسے باریک ترین عناصر بھی پائے گئے جو مریخ پر اربوں سال پہلے زندگی کے ابتدائی شواہد قرار دیے جاسکتے ہیں لیکن اس تحقیق و انکشاف کو حکمائے چین نے محض ایک افسانہ قرار دیکر اس کی سنجیدگی کو کم کرنے کی کوشش کی ہے ان کا کہنا ہے کہ وائیجر اور گلیلیو جیسے تحقیقاتی تیاروں سے جو کام بن نہ پڑا وہ دور افتادہ ایک پتھر کے ٹکڑے سے کیسے ثابت کیا جاسکتا ہے؟ ان کے اعتراض کا جواب اگرچہ دیا گیا ہے تاہم سیاست کی طرح سائنس میں دانش فرنگ اور حکمت چین کی کشمکش کو نیا میدان ضرور مل گیا۔

مریخ پر زندگی کے آثار کی دریافت نے بہرحال اتنا تو کیا کہ کائنات میں زندگی کے سراغ کو پانے کی خواہش تیز تر ہوگئی، حال ہی میں کیلی فورنیا میں یوروپا اوشن کانفرنس منعقد ہوئی اس میں سرگرداں افلاک کے ایک سائنسداں فرینک ڈریک نے یہ نظریہ پیش کیا کہ مشتری کے ایک چاند یوروپا میں بھی زندگی کے امکانات ہیں ان کے خیال کی بنیاد یہ ہے کہ اس نظام شمسی میں زمین کے علاوہ یوروپا ہی ایسا کرہ ہے جس کی کیمیائی ترکیب و ساخت میں پانی کے وافر اجزا شامل ہیں اور پانی کا دوسرا نام زندگی ہے۔ اس کانفرنس کے بعض شرکا نے دعوی کیا کہ مشتری کے اس چاند میں قریب ۵۰ کیلو میٹر گہرا سمندر ہے، اس کی تائید میں انھوں نے آسمانی تحقیقاتی سیارچوں وائیجر اور گلیلیو کی بھیجی ہوئی چند تصویریں پیش کیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ پانی کی سطح پر برف کی ایک اور منجمد سطح ہے بعض شرکا کا خیال تھا کہ یوروپا چاند میں زمین سے زیادہ پانی ہے، اس پانی کی تہہ میں آتش فشاں بھی ہیں جن سے وہ حرارت بھی ملتی ہے جو زندگی کے لیے ایک ناگزیر شئے ہے اور جو جراثیم کے نمو کا سبب بنتی ہے، اب ان خیالات کے بعد انتظار ہے گلیلیو تحقیقاتی سیارچہ کے اس نئے سفر کا جو خاص اسی چاند کی دید کے لیے ہے۔

ع۔ص۔

معارف کی ڈاک

مکتوب لاہور

دائرۂ معارف اسلامیہ لاہور

مخدومی و مکرمی اصلاحی صاحب

السلام علیکم۔ معارف برابر پہنچ رہا ہے، بہت بہت شکریہ یہ آپ کی توجہ اور قدر افزائی سے معارف (فروری ۱۹۹۷ء) میں امام ذہبی کی جلیل القدر تصنیف سیر النبلاء پر میرا مضمون شایع ہوا ہے لیکن اس میں کتابت کی چند غلطیاں راہ پاگئی ہیں، جن کی تصحیح حسب ذیل ہے:

ص ۱۳۳۔ امام ذہبی کی صحیح تاریخ وفات ۷۴۸ھ/ ۱۳۴۷ء ہے۔

ص ۱۳۵۔ سطر ۹، تیئسویں ۲۳ جلد کے بجائے تیسری جلد چھپ گیا ہے۔

ص ۱۳۶۔ سطر ۱۰-۹، امام ابن تیمیہ پر نقد و تبصرہ کے لیے دیکھئے (سیر النبلاء مقدمہ ص ۱۴۳، بحوالہ بیان زغل العلم ص ۱۷-۱۸)

ص ۱۳۶۔ سطر ۱۷، محدث عصر کا صحیح نام استاد شعیب الدرنوؤط[1] ہے۔ برائے مہربانی ان تصحیحات کو معارف کی کسی قریبی اشاعت میں شایع کردیں۔ اسی سلسلہ کی اور دو کتابیں چھپ رہی ہیں، ملاحظہ کے لیے جلد بھیجوں گا۔

حضرت علی میاں مدظلہ کی خدمت عالی میں اگر اس دور افتادہ کا سلام پہنچا سکیں تو بڑی مہربانی ہوگی۔ میں دو تین خط اور دو کتابیں ان کو بھیج چکا ہوں لیکن ان کی طرف سے کوئی رسید نہیں آئی۔ شاید وہ باہر سفر میں ہوں، رفقائے کرام سلام قبول فرمائیں

امید ہے کہ آپ حضرات سے ہوں گے، توجہ فرمائی کے لیے مکرر شکر گزار ہوں۔ فقط والسلام

نیاز مند: شیخ نذیر حسین

---

[1] معارف: یہ اور دوسری غلطی کتابت کی ہے مگر پہلی اور تیسری غلطی یا کمی خود شیخ صاحب کے مسودہ میں رہ گئی تھی۔

باب التقریظ والانتقاد

سید سلیمان ندوی۔ حیات اور ادبی کارنامے

از جناب سبط محمد نقوی صاحب، لکھنؤ

سلسلہ کے لیے دیکھئے ماہ فروری ۱۹۹۷ء

اب ہم سید صاحب کی ولادت کے زمانے کے تعین کے بارے میں فاضل محقق کے رویے پر روشنی ڈالنے کی اجازت چاہتے ہیں۔

یہ اشارہ تو ہم بار بار کر چکے ہیں کہ فاضل محقق نے کہیں بھی شان تحقیق کو راہ نہیں دی ہے۔ جہاں پیش رو حضرات سے اتفاق تھا وہاں تقلید فرمائی ہے۔ جہاں اتفاق نہ تھا وہاں خطائے اجتہادی کے باکمال سینہ زوری مرتکب ہوئے ہیں۔ اجتہاد واقعی اور معروضی تحقیق کے مطالبے ایک ہی جیسے ہیں، اپنے وقت کے امامیہ مسلک کے عالم اجل اور ادیب اکمل جناب مفتی میر محمد عباس شوستری نے اپنے خویش و جانشین نجم العلماء مولانا سید نجم الحسن صاحب کو موعظت فرمائی تھی:

"... دیکھو جب کسی مطلب پر استدلال مقصود ہو اور کوئی مسئلہ زیر بحث ہو تو کبھی دلیل کو مدعی کے تابع نہ کرنا بلکہ ہمیشہ مدعی کو دلیل کا تابع رکھنا یعنی جو مدعا ہو اس کی دلیلوں میں نظر کرنا اور دلیل جس مقام پر پہونچا دے اس مدعا کو حق سمجھنا۔ یہ نہ کرنا کہ مدعا کو اول نصب العین کر لو اس کے بعد استدلال۔ اس لیے کہ اس صورت میں کبھی حق نہیں مل سکتا۔ جب پہلے سے مدعا مان لیا جاتا ہے تو اگر جبال راسیات بھی اس کے خلاف آجائیں، انسان کچھ نہ کچھ ان کے ہٹا دینے میں زور لگائے گا اور صراط مستقیم سے دور ہوتا جائے گا"۔ تجلیات حصہ (۲) مولفہ مرزا محمد ہادی عزیز، ص ۲۱۸۔

جناب رشید حسن خاں اس وقت اردو تحقیق میں دھوم مچا رہے اور کوس عن الملک الیوم بجا رہے ہیں۔ انہوں نے تحقیق و تدوین کے لوازم پر بڑی مفصل گفتگو فرمائی ہے۔" ادبی تحقیق۔ مسائل و تجزیہ" نام کے مجموعہ مضامین کے علاوہ کثیر التعداد تحریروں میں رشد و ہدایت کا سلسلہ جاری رکھا ہے۔ انہوں نے بھی تقریباً ایسی ہی احتیاطیں لازم ٹھہرائی ہیں۔ حضرت مفتی علامہ اور رشید حسن خاں کے موعظ و ارشاد کی روشنی میں ہاشم صاحب کے زیر نظر کارنامے کی پرکھ کی جائے تو جس صورت حال کا مواجہہ ہوگا وہ بڑی بھیانک ہے۔ یہاں ایک مثال ملاحظہ فرمائیں :

ہاشم صاحب نے سید صاحب کی تاریخ ولادت ۲۳ صفر ۱۳۰۲ھ مطابق ۲۲ نومبر ۱۸۸۴ء جمعہ طے فرمائی ہے (ص۲۴) اور یہ تقلید اعمیٰ کا بڑا روشن نمونہ ہے۔ ۲۲ نومبر ۱۸۸۴ء کو جمعہ تھا ہی نہیں۔ سید علامہ کے قطعہ تاریخ ولادت کی جو سید صاحب کے جد مجد کا نتیجہ فکر ہے جو قرارت فرمائی ہے تو ۲۳ صفر کا بھی اثبات نہیں ہوتا۔ وہ مصرعہ جس میں صفر کی تاریخ بتائی گئی ہے اسے یوں نقل فرمایا گیا ہے

بشہر صفر چوں شدہ بود "سنہ"

یہ "سنہ" نہیں ہے "سہ" ہے۔ یعنی تین (۳) ہے تو پھر سید صاحب کی تاریخ ولادت ۳ صفر ۱۳۰۲ھ مطابق ۲۱ نومبر ۱۸۸۴ء یوم جمعہ ماننا ہوگی۔ جمعہ سے مفر کی کوئی تدبیر نہیں۔ حکیم میر مہدی صاحب مرحوم نے صراحت فرمائی ہے :

بہ روز آدینہ بوقت سعید

تب یہ فرض کرنا لازم ہو جائے گا کہ تقویموں کا یہ اندراج کہ محرم ۱۳۰۲ تیس دن کا ہوا تھا غلط ہے اور فی الواقع صفر کی رویت ہلال ۲۹ محرم کو ہو گئی تھی اور ۳ صفر یوم جمعہ

۱۲ نومبر کو واقع ہوئی تھی۔

ڈاکٹر اختر علی کے مضمون "سید سلیمان ندوی کی تاریخ ولادت" سے ایک اور صورت سامنے آتی ہے۔ یہ مضمون کسی پاکستانی جریدے میں شایع ہوا تھا۔ اس کی نشاندہی محب مکرم مولوی حافظ عمیر الصدیق دریابادی نے فرمائی اور اس کی عکسی نقل ارسال فرماکے ممنون کیا۔ اس مضمون میں ڈاکٹر اختر علی نے سید صاحب کی تاریخ ولادت ۲۳ صفر ۱۳۰۲ھ مطابق ۱۲ دسمبر ۱۸۸۴ء جمعۃ المبارک لکھی ہے۔ ڈاکٹر اختر کے استدلال میں وزن ہے کیونکہ وہ خود سید صاحب کے بیان پر بنا کرتے ہیں۔ یہ بیان مولوی عبدالحکیم دیسنوی کے نام ایک خط میں ہوا ہے۔ یہ خط معارف کے شمارہ بابت ستمبر ۱۹۶۰ء میں شایع ہوا ہے۔ سید صاحب تحریر فرماتے ہیں کہ :۔

"اسلام پور میں دادا مرحوم کا ایک "سفینہ" ملا۔ جس میں تمام اعزہ جوان کے وقت میں تھے ان کی تاریخ ولادت اور وفات لکھی ہے۔ اس میں اتفاقاً میری پیدائش کی تاریخ بھی نکل آئی اور اتنی ہی نہیں بلکہ میری پیدائش کا قطعہ تاریخ بھی ان کا مصنفہ ملا۔ میں نے نقل کر لیا ہے۔ آخری مصرعہ ہے

شدہ مہر تاباں ز برج کمال

اس میں پانچ عدد کا تخرجہ ہے۔ ۔ ۔"

المیہ یہ ہے کہ سید صاحب کے اس بیان کے باوجود ڈاکٹر اختر علی نے قطعہ تاریخ کی قرأت میں ڈاکٹر ہاشم سے بڑھ کے ٹھوکر کھائی۔ سید صاحب کے ارشاد سے مترشح ہوتا ہے کہ نثر میں بھی ۲۳ تاریخ کی صراحت ہے مگر سید صاحب نے ۵ کا تخرجہ کیسے لکھا۔ کیا ۹ کو ۵ پڑھا گیا یا کیا؟ لہذا حافظ عمیر صاحب کو پھر زحمت دی کہ ستمبر ۶۰ کے معارف سے سید صاحبؒ کے

مکتوب گرامی کی نقل اور سفینے کے اندراج کی نقل مہیا فرما دیں۔ اس سفینے کو ڈاکٹر ہاشم نے دارالمصنفین کے کتب خانے میں دیکھا ہے اور بیاض کے نام سے اپنے مقالے میں ذکر فرمایا ہے۔ لیکن مجھے کوئی جواب نہیں ملا۔ ہو سکتا ہے اس لفافے میں رہا ہو جسے مولانا اصلاحی صاحب نے میرے پاس بھیجا تھا اور جو نارسا رہا۔ ڈاک کی رفتار بھی میری قسمت کی نارسائی سے ہم آہنگ ہے۔

اب صورت حال یہ ہے کہ سید صاحب کے مکتوب میں ۲۳ تاریخ صراحتاً ملاحظہ فرما لینے کے بعد بھی مصرعہ میں تاریخ کی قرأت ڈاکٹر اختر علی نے یوں کی :

بشہر صفر چوں شدہ بود "سن"

معنویت کی طرف متوجہ نہ ہونا آج کوئی خاص بات نہیں۔ لیکن ڈاکٹر ہاشم کے "سنہ" سے "۳" کی طرف تبادر فوری ہوتا ہے۔ لیکن ڈاکٹر اختر کا "سن" تو ہم ادنی طلاب کے سر پر سے سن سے گزر جاتا ہے۔ کوئی نابغہ ہی گرفت کر سکے تو کر سکے۔ اگر ڈاکٹر نے ۲۳ تاریخ تسلیم کر لی تھی تو ان کی مجبوری تھی کہ مصرعہ اس طرح پڑھیں :

بشہر صفر چوں شدہ "بست و سہ" (۲۳)

یہ سید صاحب کے بیان کو درست مان لینے کا منطقی نتیجہ ہے۔ افسوس ہے کہ یہ دونوں ڈاکٹر صاحبان مغز سخن تک پہونچنے سے قاصر رہے اور قطعہ تاریخ کی مروجہ پیش کش میں ناکام رہے۔ مروجہ طریقہ یہ ہے ؎

بگفتا کہ بے واو شد مصرعہ ــــ شدہ مہر تابان ز برج کمال
۱۳۰۲ = ۹ - ۱۳۱۱

اگر تخرجہ نہ کیا جائے جیسا کہ ہاشم صاحب نے کیا ہے تو مصرعہ کے اعداد ۱۳۱۱ ہوتے ہیں اور جیسا کہ اختر صاحب جناب سید صاحب کے حوالے سے فرماتے ہیں کہ ۵ کا تخرجہ

ہے تو اعداد ۱۳۰۶ ہوتے ہیں۔

بندۂ خام کار پختہ وثوق سے اب بھی عرض نہیں کر سکتا کہ سفینے کی قرارت درست ہوئی ہے یا نہیں، لیکن صحت کے مفروضے پر ڈاکٹر اختر علی کی مستنبط تاریخ ۲۳ صفر ۱۳۰۲ھ مطابق ۱۲ دسمبر ۱۸۸۴ء کا سید سلیمان ندوی کی تاریخ ولادت کے طور پر تسلیم کر لیا جانا اولیٰ ہے۔

اب تک ہاشم صاحب اشاروں کنایوں سے کام چلا رہے تھے۔ آخر میں کھل کھیلے اور سید صاحب کے ایسے کمالات کی نشاندہی میں لگ گئے جو ان کے زعم میں شبلی کے یہاں نہیں پائے جاتے اور "یہ بات سید صاحب کی زندگی کے ورق ورق میں بکھری ہوئی ملتی ہے"۔ (ص ۳۶)

بندۂ گستاخ اگر ڈاکٹر ہاشم کے موقف پر تجزیاتی نگاہ ڈالے تو وہ سید صاحب مرحوم کے عقیدت مندوں کے لیے دل آزار ہو سکتی ہے اور ادارۂ معارف کے لیے کشمکش کا باعث لہذا

کمیت قلم کی عناں کھینچتے ہیں

لیکن خاتمہ کلام میں اتنا عرض کرنے کی اجازت چاہتے ہیں کہ ڈاکٹر ہاشم کو شبلی اور سید سلیمان کے طول حیات میں جو بارہ سال کا فرق ہے۔ اسے نظر انداز نہیں کرنا چاہیئے تھا۔ ۱۲ سال میں تو شبلی کے ایسا مرد کار زنابغہ روزگار معلوم نہیں کیا کیا کر ڈالتا۔ میں سید صاحب کو الزام نہ دوں گا۔ بے چارے بھوپال تک یہ خیال دل سے لگائے رہے لیکن غالباً خدائے بخشندہ نے دار التکمیل کی تاسیس سید صاحب کو مقسوم ہی نہیں کی تھی۔ علامہ اور جی لیے ہوتے تو شاید اس کی تکمیل ہو جاتی۔

محض مدت حیات کی ہی بات نہیں ہے۔ دونوں کے حالات زندگی، صحت و مرض کے کوائف، خانگی مسائل، انفس و ثمرات سے امتحاں، اہلیہ کی جدائی، عقد ثانی پہ فرزند اکبر کی آزردگی، بن باس، تین تین بھائیوں کی جوان مرگی اور نا وقت وفات، ضعیفی میں اولاد نرینہ کا

انعام مہر سلب نعمت سے امتحان۔ ندوہ کے رفقا کے ہاتھوں ناقدری، حکومت وقت کا عتاب، دربار بھوپال میں سیرۃ النبیؐ کے دفتر کی امداد بند کرانے کی سازشیں۔ غرض متعدد اور گوناگوں ذہنی و دماغی الجھنیں۔ یہ سب نگاہ میں رکھتے تو کج رائی کا شکار نہ ہوتے اور میری طرح بجا طور سے اس نتیجے پر پہنچتے کہ شبلی نعمانی اپنے کسی معاصر مسلمان سے مفضول نہ تھے، نہ آغا خاں' نہ سرسید' نہ جناح، نہ علی برادران اور نہ کسی اور سے۔

ہم نے تفاوت احوال کا خلاصہ نظر ارباب نظر کر دیا جس کی تفصیل حیات شبلی و حیات سلیمان میں ملاحظہ کی جاسکتی ہے، اب ناقد بصیر ہی طے کرے کہ کیا بہ ایں تفاوت موازنے کا کوئی محل ہے، سید صاحب بہ قید حیات ہوتے تو اسے کیا پسند فرماتے ؟

یہ نکتہ بھی توجہ طلب ہے کہ تقابلی مطالعے کا وقت تب آتا ہے جب شخصیت کی معرفت کامل ہو جائے۔ ابھی شبلی کی شخصیت سے ناشناسی کے لبادے ہی کہاں اترے ہیں تو تقابل و توازن کیسا ؟ محقق عزیز فرماتے ہیں :۔

" سید صاحب شبلی کے ان تمام اوصاف و کمالات پر حاوی بھی تھے اور ان کے مبصر بھی"۔

ہاشم صاحب کچھ اور نہ کرتے ان اعتراضات کو تو ملحوظ خاطر رکھتے جو سید صاحب نے اپنے شخصیت ساز کے لیے کیے ہیں تو بھی "پیراں نمی پرند مریداں می پرانند" کا خانقاہی کاروبار تحقیق کے نام سے یونیورسٹی میں شروع نہ فرماتے۔ سید صاحب اپنی ذات پر استاد علامہ کے احسانات کے ذیل میں رقم طراز ہیں :۔

" دوسرا یہ کہ تعلیم سے فراغت کے بعد جو تعلیم کا سب سے نازک دور آتا ہے اس میں اس کی ایسی دست گیری فرمائی کہ حصول علم اور شوق مطالعہ کے سوا کسی اور راہ میں بھٹکنے نہ دیا اور خاندان کے بزرگوں سے کہہ سن کر طبابت کے خاندانی پیشے سے ہٹا کر علم و فن کے

آستانے پر کھڑا کر دیا۔۔" (حیات شبلی ص۱۱ متن کتاب)

ہاشم صاحب کا سید صاحب کو شبلی کے تمام اوصاف و کمالات پر حاوی اور ان سے بڑا مبصر، سیاست داں، صحافی، ماہر تعلیم، محقق اور ماہر لسانیات قرار دینا محض بلا دلیل ہے۔ ہم تو بہ پاس خاطر نازک مزاجاں اس وادی پُر خار سے سلامت گزر گئے۔ اگر کوئی صاحب اس بحث کو بڑھانا چاہیں تو ہم حاضر ہیں۔ ہم کو دونوں شخصیتیں عزیز ہی نہیں عزیز تر ہیں، مگر یہ واضح رہے کہ سید سلیمان شبلی کے ساختہ پرداختہ تھے۔ ان کا یہ شرف نہیں کہ وہ کلی یا جزوی طور پر علامہ شبلی سے برتر تھے، ان کا اصل شرف ہے کہ جو کام مولانا شبلی خود نہ کرنا چاہتے یا کسی وجہ سے نہ کر پاتے تھے۔ اس کام کے لیے ان کی نظر سید سلیمان ہی پر پڑتی تھی۔ اپنے سوانح کے لیے یہی کیا۔ سیرۃ النبی ایسے عظیم و تاریخ ساز کارنامے کے لیے یہی کیا۔ وہ فخر استاد شاگرد تھے، مگر شاگرد ہی تھے، حریف نہیں تھے۔

ہاشم صاحب اپنے پورے مقالہ میں کسی غیر مطبوعہ مواد کا استعمال نہ کر سکے۔ نہ کوئی نادر و تازہ حوالہ دے سکے تو اپنی تحقیق کا حاصل یہی قرار دیا کہ وہ استاد پر شاگرد کی برتری کا دعویٰ کر دیں۔

کتاب المناجی

از مولوی حافظ عمیر الصدیق ندوی

المنتزع من الجزء الاول من الکتاب المعروف بالمناجی (عربی و انگریزی) از جناب ڈاکٹر محمد صابر خاں، متوسط تقطیع، عمدہ کاغذ و طباعت، مجلد مع گرد پوش، صفحات ۳۱۵، قیمت ۳۰۰ روپے، پتہ: پاکستان ہسٹاریکل سوسائٹی، مدینۃ الحکمت، شارع محمد بن قاسم، کراچی پاکستان۔

چوتھی صدی ہجری میں خلافت عباسیہ کے ضعف و انحلال کے نتیجے میں مختلف علاقائی اور قبائلی طاقتیں ابھرنا شروع ہوئیں، دیلم و جیلان کے نومسلم شیعہ قبیلے کا ظہور اور بنو بویہ کی شکل میں اس کا عروج اسی زمانے کا اہم واقعہ ہے جس نے خلافت عباسیہ کی رہی سہی وقعت بھی ختم کردی، عمادالدولہ، معزالدولہ، عزالدولہ جیسی شان و شوکت کے امرا کے بعد عضدالدولہ جیسا جامع اوصاف فرمان روا ان کا جانشین ہوا جو عقل و دانش، تدبیر و سیاست، شجاعت و شہامت، فضل و کمال، علم نوازی اور علما پروری وغیرہ مختلف اوصاف جہانبانی میں یگانہ تھا، نحو میں کتاب الایضاح والتکملہ، قرأت میں حجۃ، طب میں ملکی، اصول تاریخ میں تجارب الامم اور تاریخ میں کتاب التاجی جیسی اہم کتابیں اسی کی توجہ و عنایت کا نتیجہ ہیں، کتاب التاجی کو ابواسحاق ابراہیم بن ہلال الصابی نے عضدالدولہ کی فرمائش پر تالیف کیا تھا اور اس کے لقب تاج الملۃ کی مناسبت سے اسے "الکتاب التاجی فی اخبار و آثار الدولۃ الدیلمیہ" کا نام دیا جو کتاب التاجی کے نام سے مشہور ہے اور جس کے حوالے دیلمیوں کی معاصر اور مابعد کتب تاریخ میں ملتے ہیں، اس سے اس کی اہمیت کا اندازہ ہوتا ہے، لیکن ایک زمانہ تک اس کے مفقود رہنے کی وجہ سے یہ باور کرلیا گیا تھا کہ دوسرے قدیم اسلامی ورثہ کے مانند یہ بھی اب کنز مخفی ہوچکی ہے، ۱۹۵۲ء میں عرب لیگ کے ثقافتی شعبہ کو صنعاء (یمن) کے مکتبہ متوکلیہ میں اس کا ایک ملخص مخطوطہ ہاتھ لگا جو فقہ زیدیہ کے ایک مخطوطہ کے آخر میں شامل تھا، المنتزع من الجزء الاول من الکتاب المعروف بالتاجی نامی اس مخطوطہ کی مائکرو فلم بھی دارالکتب المصریہ قاہرہ میں محفوظ کردی گئی لیکن ابھی تک یہ اہم مخطوطہ کسی صاحب نظر کی نگاہ اعتنا کا منتظر تھا، حسن اتفاق سے اس نایاب اور اہم مخطوطہ کی تحقیق و تصحیح و تعلیق اور انگریزی زبان میں اس کے ترجمہ کا تاج شرف و

سعادت فاضل محقق ڈاکٹر محمد صابر خاں کی قسمت میں آیا جو اپنے بلند پایہ علمی و تحقیقی مضامین وکتب کی وجہ سے محتاجِ تعارف نہیں، اس سے پہلے مسکویہ کے متعلق ان کی ایک کتاب بھی شکاگو سے اسٹڈیز ان مسکویس کنٹمپریری ہسٹری شایع ہوچکی ہے، مخطوطات سے ڈاکٹر خاں کی دلچسپی کا اندازہ اس سے ہوتا ہے کہ انہوں نے کلکتہ کی ایشیاٹک سوسائٹی کے عربی مخطوطات کی ایک فہرست بھی مرتب کرکے شایع کی ہے، علوم عربیہ سے ان کے شغف کا اندازہ ان کی ایک اور کتاب ببلوگرافی آف عربک سورسز فار دی ہسٹری آف سائنٹسٹس اینڈ سائنس سے ہوتا ہے، ان کے اسی علمی و تحقیقی سلسلے کی ایک کڑی اس نادر و نایاب مخطوطہ کی تحقیق و تحشیہ اور انگریزی ترجمہ کے ساتھ اشاعت بھی ہے۔ ۴۶ صفحات پر مشتمل یہ مخطوطہ گو کامل ہے تاہم پہلے صفحہ کے نہ ہونے کی وجہ سے اس کے ملخص وکاتب کا نام اور سنہ کتابت کا یقینی پتہ نہیں چل سکا، تاہم طرز تحریر وکتابت اور ایک صفحہ پر ۶۰۹ھ مرقوم ہونے کی وجہ سے یہ نتیجہ اخذ کیا گیا ہے کہ یہ ساتویں صدی ہجری کا مکتوبہ ہے، دیلم وجیلان کی ابتدائی تاریخ پر کم لکھا گیا ہے، اس کتاب میں اختصار کے باوجود طبرستان کے زیدی ائمہ اور دیالمہ کے عام حالات اور بنو بویہ، امرائے زیدیہ اور بنو سامان کے علاوہ بنو باورستان، بنو سالار، بنو کنکر اور بنو ہسوران کے مقامی امراء کے متعلق جو معلومات درج ہیں ان سے عام کتب تاریخ خالی ہیں۔

اصل عربی متن بہ شمول فہرست اسمار وقبائل واماکن اور مقدمہ مرتب ۷۰ صفحات کو محیط ہے لیکن اس کی اصل قدر وقیمت کا اندازہ اس کے انگریزی حصہ سے ہوتا ہے، جو ۲۵۶ صفحات پر مشتمل ہے، ۴۳ صفحات میں انگریزی ترجمہ اور ۳۰ صفحوں میں کتابیات کے علاوہ ۹۴ صفحات میں حواشی وتعلیقات ہیں، باقی ۸۰ صفحات میں مقدمہ ہے، جو تین

فصلوں پر مشتمل ہے، پہلی فصل میں مخطوطہ کی دستیابی کی سرگزشت اس کی طرز کتابت اور سنہ کتابت کے تعین اور مرتب کے حالات و سنہ تالیف، کتاب کی روایات کی صداقت و استناد پر بحث کی گئی ہے، فاضل مرتب کے خیال میں مکمل کتاب التاجی کی دریافت ہی اس مخطوطہ کے مضامین کی صداقت کو متعین کر سکتی ہے، تاہم اس کی روایات و واقعات کے معتبر و مستند ہونے کے قرائن و دلائل موجود ہیں اس لیے اس کی اہمیت سے انکار نہیں ہو سکتا۔ دوسری فصل میں مخطوطہ کے مندرجات، مصادر و ماخذ خصوصاً طبرستان کے امرائے علویہ کے متعلق معلومات زیر بحث آئے ہیں، فاضل محقق کے مطالعہ، تلاش و جستجو اور ان کی جاں کاہی و دقت نظری کا یہ بہترین نمونہ ہے، اس میں انھوں نے اس عہد کے مورخین کی دو قسمیں کی ہیں، ایک وہ مورخین جن پر حدیث و فقہ اور مذہبی رجحانات غالب ہیں، اس طبقہ کے سرخیل مورخ طبری ہیں، دوسرے وہ جن کو سیکولر کہا جا سکتا ہے ان میں سنان بن ثابت بن قرہ، ثابت بن سنان اور مسکویہ اور خود ابو اسحٰق الصابی وغیرہ ہیں، اس طبقہ کی ایک مشترکہ خصوصیت یہ بتائی ہے کہ وہ حکومت کے انتظامی ادارے دیوان یا براہ راست دربار سے وابستہ رہے ابو اسحٰق اور مسکویہ دونوں عضد الدولہ کے دربار سے متعلق تھے، مسکویہ کی تجارب اور الصابی کی تاجی میں فرق یہ ہے کہ مسکویہ نے اپنی خواہش سے کتاب مرتب کی، جبکہ الصابی نے عضد الدولہ کی فرمائش کی تعمیل کی۔ اس لیے اس نے واقعات کو ہمیشہ بنو بویہ کے نقطہ نظر سے دیکھا، وہ دوسرے عربی مورخین کے برخلاف کسی واقعہ کے متعدد پہلوؤں کو نہیں بیان کرتا۔ کبھی کبھی یہ محسوس ہوتا ہے کہ فاضل محقق اصل کتاب التاجی پر تبصرہ کر رہے ہیں، جس کا احساس غالباً ان کو بھی ہوتا ہے، اس لیے معاً بعد وہ پھر لکھتے ہیں کہ محض اس ملخص مخطوطہ کی بنیاد پر کسی حتمی رائے کا اظہار درست نہیں۔ اس فصل میں

انہوں نے اس عہد کی تاریخوں اور کتاب التاجی کے مضامین کا موازنہ و مقابلہ بھی کیا ہے، اس سلسلہ میں انہوں نے عربی و فارسی کی اکثر اہم تاریخوں، تذکروں حتی کہ کتب ادبیات کے حوالہ سے دیلم و طبرستان وجیلان کی تاریخ کا جائزہ لیا ہے، اس طرح یہ فصل اس علاقہ کی سیاسی تاریخ کا مفصل مطالعہ ہے جو زائد ہونے کے باوجود غیر ضروری اور بے فائدہ نہیں ہے۔ مقدمہ کی تیسری فصل میں اس مخطوطہ کے قابل اعتماد و استناد ہونے اور اس کی قدر و قیمت متعین کرتے ہوئے فاضل محقق نے تسلیم کیا ہے کہ یہ مشکل اور دشوار مرحلہ ہے، کیونکہ صرف چند عربی و فارسی مصادر ہی میں کتاب التاجی کے متعلق مواد موجود ہے اور خود صابی کا یہ بیان کہ اس نے دانستہ التاجی میں غلط بیانیاں کی ہیں، بہرحال فاضل محقق نے مالہ و ماعلیہ کا جائزہ غیر جانبدارانہ اور معتدل انداز میں پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔

اس طویل اور پُر مغز مقدمہ کے علاوہ ۹۲ صفحات پر مشتمل حواشی و تعلیقات بھی ان کی دیدہ ریزی کا نتیجہ ہیں جو ارض دیلم اور بنو بویہ کی تاریخ کا بہترین ماخذ ہے کتابیات میں ۶۰۴ مراجع کا ذکر محقق کی سعی و کاوش اور کتاب کے بیش قیمت ہونے کا ثبوت ہے۔

جناب حکیم محمد سعید نے اس کتاب کو شایع کرکے علوم اسلامیہ میں اسلامی ہند کے قدیم فیضان کی روایت کی پاسداری کی ہے، البتہ سرورق پر پہلی ہی سطر میں المنتزع کے بجائے المنتز اور بن ہلال کی جگہ بن اسکاتب کے سہو کا داغ لگ گیا، گو اس سے کتاب کے حسن ظاہری و معنوی پر اثر نہیں پڑا

ادبیات

غزل

از

جناب رئیس نعمانی صاحب، علی گڑھ

ای خراباتِ دل وجانها درایوانِ شما　　باز تشنه کام می گردند رندانِ شما

طالبانِ حسن را با وصل و با ہجران چه کار　　بس بود بهرِ دل شان، سحرِ پیمانِ شما

گر نمی خواهد رهائی، نیست جای حیرتی　　یوسفی کو هست بی جرمی به زندانِ شما

دیده و دل، جسم و جان، احساس وافکارِ لطیف　　هر چه دارم، هست از انعام واز آنِ شما

کی رسد یارب به ساحل زورقِ اندیشه ام　　زانکه خود درجست از دستم به طوفانِ شما

در شهادت گاهِ الفت بی گناهم کشته اند　　صد سپاس وشکر و منت، ردِّ احسانِ شما

آبِ از جو رفته باز آید بجو، بشنیده اید؟　　چون به عقلِ خویش باز آیند مستانِ شما

چاره سازان بهرِ ما خود چسان فایز شوند؟　　دردِ در دِ ماست، درمان است درمانِ شما

تا به کی شبهائی امیدم نبیند روی صبح؟　　ای که مهر و ماه می گردد به فرمانِ شما

گر بتابد پرتوی از نور در کاشانه ام　　کم نگردد تابشی از روی تابانِ شما

قلبِ زارم هم به امیدِ قضاوت می تپد　　قضیه با فیصل همی گردد به دیوانِ شما

این رئیس بینوا هم بانوا گردد، اگر
راست آید کارِ کی در دو دیوانِ شما

مطبوعات جدیدہ

قرآنی معارف از جناب مولانا محمد نظر علی خاں، متوسط تقطیع، عمدہ کاغذ اور کتابت و طباعت، مجلد مع گرد پوش، صفحات ۳۳۵، قیمت ۱۲۰ روپے، پتہ: جلالی اکیڈمی، ۲۳۶ بی، گلی مدرسہ حسین بخش، جامع مسجد دہلی ۱۱۰۰۰۶۔

قرآن مجید اور اس کے علوم و معارف پر بہت کچھ لکھا گیا ہے، زیر نظر کتاب اسی سلسلہ کی کڑی اور اس میں ایک بہترین اضافہ ہے، اصلاً یہ دو حصوں پر مشتمل ہے، پہلا حصہ قرآن مجید اور اس کے علوم کی تاریخ ہے جس میں قرآن مجید کے اسماء و معانی و فضائل، زمانۂ نزول، کیفیاتِ وحی، جمع و تدوین کے علاوہ کتابت و قراءت سبعہ، مکی و مدنی سورتوں کی تقسیم، ناسخ و منسوخ، عہدِ صحابہ و تابعین میں تفسیر کے مناہج جیسے اہم مباحث کو بڑے اختصار و جامعیت اور مستند معلومات کے ساتھ پیش کیا گیا ہے، دوسرا حصہ تراجم و تفاسیر سے متعلق ہے جس میں عربی، فارسی، اردو، انگریزی اور بنگالی زبان کے قریباً تمام اہم مفسرین و مترجمین کی کاوشوں کا استقصاء کیا گیا ہے، اس باب میں ہندوستان کے قدیم و جدید مفسرین کے متعلق پُر از معلومات بحث میں چند غیر معروف لیکن بعض حیثیتوں سے اہم تفسیروں کا ذکر آگیا ہے، مثلاً صاحبزادہ علی عباس خاں رامپوری کی تفسیر سورۂ یوسف جو فیضی کی سواطع الالہام کی طرح غیر منقوط ہے اور فاضل مصنف کی نظر میں سواطع الالہام کے اکثر اشکالات کے برخلاف یہ سلیس و سادہ ہے، ایک باب میں اثنا عشری مفسرین کا ذکر ہے، جن کے متعلق بتایا گیا ہے کہ انکا زاویۂ نگاہ معتزلہ کا ہے، خصوصاً ان نصوص میں جو علم الکلام کے مسائل سے مربوط ہیں وجہ یہ ہے کہ

اکثر یہ علمائے امامیہ معتزلہ کے شاگرد تھے، ایک اور باب میں بعض صوفیہ مفسرین کی تفسیروں کا تعارف ہے، اس میں ابن عربی کی تفسیر کا ذکر تفصیل سے ہے لیکن خود فاضل مصنف ابن عربی سے اس تفسیر کی نسبت کو صحیح نہیں مانتے۔ ہر تفسیر کے خصائص و امتیازات کے علاوہ صاحب تفسیر کے سوانح و دیگر کمالات علمی بھی پیش کر دیے گئے ہیں، ممکن ہے عصر حاضر کے مفسروں کے متعلق ان کا یہ خیال محل نظر سمجھا جائے کہ ان کے ہاں کوئی جدت نہیں کیونکہ متقدمین نے ان متاخرین کے لیے کوئی گنجایش ہی نہیں چھوڑی تاہم ان تفسیروں کے اوصاف و خصوصیات کی نشاندہی کی گئی ہے، اردو تفسیروں اور ترجموں کا تعارف نسبتاً زیادہ مفصل ہے، فاضل مصنف کے خیال میں ان کے استاد مولانا سید عبدالدائم جلالی کی تفسیر بیان السبحان موجودہ دور کی بہترین تفسیر ہے، جس کو شایان شان شہرت و مقبولیت حاصل نہ ہوسکی، مولانا احمد رضا خاں بریلوی کے ترجمہ قرآن کنزالایمان پر تبصرہ پڑھنے کے لائق ہے، جس میں فاضل بریلوی کے اعتراف کمال اور نسبت "پھٹنولی" کے اشتراک کے باوجود واضح کیا گیا کہ خاں صاحب کے ہاتھ سے دامن احتیاط کئی بار چھوٹا ہے اور انھوں نے بعض ایسے الفاظ اور جملے سپرد قلم کیے جو ترجمہ سے مناسبت نہیں رکھتے، اردو کے بعض منظوم تراجم کا بھی ذکر کیا گیا ہے، بلاشبہ اپنے موضوع پر اردو میں یہ پہلی کتاب ہے جس میں مختلف زبانوں کے تراجم اور تفسیروں کا اس جامعیت سے جائزہ لیا گیا ہے، علوم القرآن سے شغف رکھنے والوں کے لیے یہ موسوعہ اور انسائیکلوپیڈیا کی حیثیت رکھتی ہے مگر ان کا دعویٰ کہ "تراجم و تفاسیر کی تعداد لاکھوں تک پہنچ گئی ہے"۔ بغیر کسی مستند حوالہ کے مبالغہ آمیز سمجھا جائے گا۔

خطبات اقبال از جناب محمد شریف بقا، متوسط تقطیع بہترین کاغذ و طباعت، مجلد مع گرد پوش، صفحات ۱۴۴، قیمت ۷۰ روپے، پتہ: اقبال اکادمی،

پاکستان، ۱۱۹ میکلوڈ روڈ، لاہور، پاکستان۔

اسلامی الٰہیات کی تشکیل جدید کے موضوع پر علامہ اقبال کے بلند پایہ عالمانہ و فلسفیانہ خطبات محتاج تعارف نہیں، فلسفہ زمان و مکان، مادیت وعقلیت، نظریہ ارتقا مسئلہ بقائے روح، جبر و قدر اور حقیقت کائنات جیسے مذہبی، سائنسی اور عقلی مباحث پر مشتمل ان خطبات کو سمجھنا آسان نہیں، فاضل مولف کو یہ احساس ہے کہ یہ خطبات لاجواب اور مشرقی و مغربی علوم پر حاوی ہیں اور ان میں ان تمام مسائل پر اظہار خیال کیا گیا ہے جن کا تعلق مسلمانوں کی انفرادی اور اجتماعی زندگی کے ساتھ بڑا گہرا ہے، اسی احساس کے پیش نظر انہوں نے ان خطبات کے اہم نکات کی تشریح سادہ اور آسان زبان میں اس جذبہ سے کی ہے کہ عام لوگ بھی اس سے فیضیاب ہو سکیں اور یہ غلط فہمی بھی دور ہو کہ یہ خطبات ناقابل فہم اور دقیق ہیں، اس کتاب سے یہ مقصد بخوبی حاصل ہوگیا ہے

ندوۃ العلماء محرک و بانی؟ از جناب ڈاکٹر محمد اسمٰعیل آزاد فتحپوری

و جناب مولوی نجیب اصغر فتحپوری، متوسط تقطیع، کاغذ و کتابت و طباعت مناسب صفحات ۱۵۲، قیمت ۴۰ روپے، پتہ: جبلی بک ڈپو، پریڈ، کانپور، یوپی۔

تحریک ندوۃ العلماء کے بانی و محرک کی تلاش و تعیین میں یہ دلچسپ اور پُر از معلومات کتاب ہے، عموماً ندوہ کے بانی کی حیثیت سے مولانا محمد علی مونگیری کا نام نامی پیش کیا جاتا مگر اس کتاب میں خاصی محنت سے ایسے حوالہ جات تلاش کیے گئے ہیں جن سے بنائے تاسیس کا شرف اولیت مولانا حکیم سید ظہور الاسلام فتحپوری کو حاصل ہوتا ہے، ان کے شاگرد اور صاحب البرامکہ مولانا عبدالرزاق کانپوری کی یاد ایام اس دعویٰ کا اہم ثبوت ہے، مولانا مونگیری کو ناظم اول کی حیثیت سے تسلیم کیا گیا ہے، اس سلسلہ

ندوہ کی ابتدائی تاریخ پر بھی اظہار خیال کیا گیا ہے اور خصوصیت سے یہ بتایا گیا ہے کہ اہالیانِ فتحپور ندوہ کیلیے سرگرم تعاون اور مخلصانہ جدوجہد میں پیش پیش رہتے ہیں بعض کتابوں اور خیالات کے تسامحات پر گرفت بھی کی گئی ہے تاریخ ندوہ سے تعلق رکھنے والوں کے لیے اس کتاب کا مطالعہ دلچسپی سے خالی نہیں۔

نوائے دید از جناب پروفیسر سید حسنین عظیم آبادی، عمدہ کاغذ اور کتابت و طباعت، صفحات ۷۲، قیمت ۳۰ روپے، پتہ: کتاب منزل، سبزی باغ، پٹنہ بہار۔

دہلی و لکھنؤ اور حیدر آباد کی طرح کبھی مرشد آباد بھی مسلم بنگالہ میں علم، ادب، تہذیب و تمدن کا مرکز تھا، نواب مرشد قلی خاں کے عہد میں یہ رشک شیراز ہو گیا تھا، بعد میں سراج الدولہ کے وزیر میر جعفر کا انتساب بھی اس کی تقدیر میں آیا، زیر نظر کتاب اسی شہر مرحوم کا سفر نامہ ہے اور رپورتاژ کی دلکش ادبی شکل میں ہے، فاضل روداد نگار اپنے رفیق سفر سید حسن عسکری کے ہمراہ نظامت لائبریری کے چند مخطوطات سے استفادہ کی غرض سے وہاں گئے، جو کچھ دیکھا دل پر اس کا خاص اثر محسوس کیا، ایک مسجد کی سیڑھیوں تلے مرشد قلی خاں کی قبر دیکھی معلوم ہوا کہ وصیت کی تھی کہ ہر نمازی کے تلووں کی خاک ان کے جسم پر پڑتی رہے، یہ پورا بیان پُراثر انداز سے لکھا گیا ہے، طرز نگارش کا ایک نمونہ ملاحظہ ہو، "گم سم ڈیوڑھیاں، شکستہ برجیاں، سنسان صحن باغ، ویران پائیں باغ دیدۂ بے تاب کو روک لیتے کہ ٹھہرو، غور سے دیکھو یہ مکانات، یہ عمارات اور ان سے آباد یہ محلے اور ان سجے ہوئے گلزار محلوں کا یہ مرشد آباد کبھی رشکِ فردوس تھا۔"

اُردو مراٹھی کے تہذیبی رشتے

از جناب ڈاکٹر سید یحیٰی نشیط، متوسط

تقطیع، کاغذ اور کتابت و طباعت عمدہ، صفحات ۱۲۰، قیمت ۴۰ روپے، پتہ: ڈاکٹر سید یحیٰی نشیط، کاشانہ، کل گاؤں ۴۴۵۲۰۳۔

اس کتاب میں ارض مراٹھا مہاراشٹر کی معاشرتی و ادبی زندگی میں مراٹھی اور مسلم تہذیب و ثقافت کے باہمی ارتباط و اثر پذیری کو موضوع بنایا گیا ہے، یہ خطہ آٹھویں صدی عیسوی ہی میں مسلمانوں کے وجود سے آشنا ہو گیا تھا، یہاں کے راجاؤں کا ذکر مسلمانوں کے قدیم تاریخی عربی مصادر میں موجود ہے، بعد میں حضرات صوفیہ کے ذریعہ عام ہندو اور مسلمان ملک کے دوسرے خطوں کی طرح یہاں بھی باہم قریب اور سماجی زندگی میں شریک ہوئے، مراٹھی زبان پر اس اختلاط کے واضح اثرات موجود ہیں، فاضل مصنف نے ایک مضمون میں ان اثرات کا جائزہ بڑی خوبی سے لیا ہے اور مراٹھی کے قدیم شاعر مرتیونجیہ جن کا اصل نام شاہ مرتضیٰ ہے کی مراٹھی اردو لغت کو اس رشتہ اتحاد کی پہلی مثال قرار دیا ہے، باقی پانچ اور مضامین میں مراٹھی کے مسلم شعراء کی اردو کاوشوں، اردو مراٹھی ثقافتی ہم آہنگی، مراٹھی سنتوں کی اردو دانی وغیرہ پر اظہار خیال کیا گیا ہے، آخری مضمون مراٹھی شاعری کے عروض و بحور پر ہے جن میں کئی بحریں اردو سے مماثل ہیں، فاضل مولف کا یہ خیال درست ہے کہ اردو میں ان موضوعات پر پہلی بار خامہ فرسائی کی گئی ہے، مولف کا مزاج تحقیقی اور اسلوب شگفتہ ہے، ملک کی علاقائی زبانوں اور اردو کے ربط و رشتہ کے تعلق سے توقع ہے کہ یہ کتاب مقبول ہوگی۔

ع۔ ص۔

معارف

جلد ۱۵۹ ماہ محرم الحرام ۱۴۱۸ھ مطابق ماہ مئی ۱۹۹۷ء عدد ۵

فہرست مضامین

شذرات

۲۷ر اپریل کو دارالمصنفین شبلی اکیڈمی کی مجلس انتظامیہ کا جلسہ جناب محمد فاروق نعمانی کی وفات کی وجہ سے ملتوی ہوگیا اور ۲۸ر اپریل کو ۱۰ بجے دن میں شروع ہوا، جس میں مندرجہ ذیل ارکان شریک ہوئے مولانا محمد سعید مجددی (بھوپال) پروفیسر ریاض الرحمن خاں شروانی (علی گڑھ) مولانا محمد رابع ندوی (مہتمم دارالعلوم ندوۃ العلماء) مرزا امتیاز احمد بیگ (اعظم گڑھ) ڈاکٹر سلمان سلطان (اعظم گڑھ) جناب عبدالمنان ہلالی جوائنٹ سکریٹری اور راقم السطور۔ حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی عین روانگی کے وقت ضعف و اضمحلال بڑھ جانے کی وجہ سے تشریف نہ لاسکے، مجلس انتظامیہ کے سربراہ پرنس معظم جاہ بہادر ملک سے باہر تھے جس کی اطلاع بہت پہلے آگئی تھی۔ خواجہ محمد یوسف (کلکتہ) اور مولانا تقی الدین ندوی (ابوظبی) کے بھی معذرت نامے آئے۔

موقر ارکان نے دارالمصنفین کے پچھلے سال کے کاموں کا جائزہ لینے کے بعد اس کے آیندہ کے منصوبوں پر غور و خوض فرمایا، طباعت کے نظام پر اطمینان ظاہر کرنے کے باوجود اسکا معیار مزید بہتر بنانے کی ہدایت کی، دراصل اس زمانے میں صاف ستھری طباعت کے لیے آفسٹ مشین ضروری ہوگئی ہے جو صاحب خیر کی اعانت ہی سے میسر آسکتی ہے، علمی و تحقیقی سرگرمیوں کے دائرے کو وسعت دینے پر بھی زور دیا گیا، جس کے سلسلے میں بار بار عرض کیا جاچکا ہے کہ دارالمصنفین کی موجودہ آمدنی میں لائق اور مناسب افراد کی خدمات حاصل کرنا دشوار ہے۔ تصنیف و تالیف کی تربیت کرنے والے ایسے طلبہ بھی نہیں ملتے جو ایثار و قناعت کے خوگر اور علمی شوق و جذبہ سے سرشار ہوکر کسی خاص موضوع پر باقاعدہ تیاری کریں، یہ بھی ملحوظ رہے کہ اب عربی مدارس اور جدید تعلیم گاہوں کا معیار تعلیم پست ہوگیا ہے اس لیے ان کے فضلا برسوں کی محنت و ریاضت کے بعد ہی دارالمصنفین کے کام کے ہوسکتے ہیں لیکن ایسے صبر آزما اور پتہ مار کام کے لیے تن آسان اور سہولت پسند طلبہ کہاں آمادہ ہوسکتے ہیں۔

دارالمصنفین کی مالی حیثیت کو مستحکم کرنے کے لیے اس کی تمام تصنیفات کے جن میں درجنوں کی طباعت مولانا مسعود علی ندوی مرحوم کے بعد سے نہیں ہوسکی، صحیح اور محقق اڈیشن شایع کرنے کا منصوبہ بنایا گیا ہے، اس سلسلے میں اولیت سیرۃ النبیؐ کی جلدوں اور علامہ شبلیؒ کی تصنیفات کو دی گئی ہے یا پھر ان آوٹ آف اسٹاک کتب کو جن کی اشاعت کی کوئی صاحب خیر ذمہ داری لے لیں۔ خدا کا شکر ہے کہ علامہ شبلی کی سیرت کے دونوں حصوں کی اشاعت کا سامان انکے دو عزیزوں اور معتقدین نے اپنی جیب خاص سے کر دیا۔ اب بقیہ حصوں کی اشاعت کیلئے مولانا سید سلیمان ندویؒ کے عقیدتمندوں کی طرف ہماری نگاہ اٹھ رہی ہے، توقع ہے کہ وہ ان کی اشاعت میں ہمارا تعاون کریں گے۔ ۲۰/ اپریل کو پروفیسر ریاض الرحمٰن شروانی نے علامہ شبلی کی شخصیت کے امتیازی پہلو پر توسیعی خطبہ دیا، اس میں شہر کے اصحاب علم و دانش بڑی تعداد میں شریک ہوئے، یہ پُرمغز مقالہ معارف کے آیندہ شمارے میں شایع ہوگا۔

افسوس ہے کہ ۲۶ و ۲۷/ اپریل کی درمیانی شب میں جناب محمد فاروق نعمانی نے الہ آباد میں داعی اجل کو لبیک کہا، وہ مولانا شبلی کے برادر زادہ اور مولوی محمد اسحٰق صاحب وکیل ہائی کورٹ کے صاحبزادے تھے، جو اعظم گڑھ میں مولانا کے علمی و تعلیمی اور خاندانی جائداد اور زمینداری کے کاموں میں انکے خاص دست و بازو تھے، ان کے انتقال پر مولانا نے ایسا پُر درد مرثیہ لکھا جو اردو کی عزائیہ شاعری میں بے مثال ہے، فاروق صاحب اس وقت کم سن تھے، اس کی طرف مولانا نے اس شعر میں اشارہ کیا ہے ؎

لاڈلے ہیں کہ کسی اور کے بس کے بھی نہیں　　　اس کے بچے ابھی سات آٹھ برس کے بھی نہیں

فاروق صاحب شبلی کالج کے پُرجوش اور سرگرم ممبر تھے، دارالمصنفین سے بھی ان کو گہرا اور جذباتی تعلق تھا، یہاں کی دعوتوں اور مجلسوں میں شریک رہتے، صوم و صلوٰۃ کے پابند تھے، لاگ لپیٹ انکو نہیں آتا تھا۔ اللہ تعالیٰ مغفرت فرمائے اور پس ماندگان کو صبر جمیل عطا کرے۔ آمین۔

اس سال ایام حج میں منیٰ میں آتش زدگی کے المناک واقعہ میں ہزاروں حجاج جاں بحق ہوئے اور اس سے بھی سوا زخمی ہوئے، ستر ہزار خیمے جل گئے، جو لوگ زندہ بچے ان کو کیسی کیسی ذہنی و دماغی اذیت برداشت کرنی پڑی ہوگی یہ لوگ لاکھوں روپے خرچ کرکے اعزہ واقربا کو چھوڑ کر اور زحمت سفر برداشت کرکے حج بیت اللہ کے لیے گئے تھے لیکن اس بھیانک واقعہ کی وجہ سے ارکان و مناسک ادا نہ کرسکے اور حج کی سعادت سے محروم رہے آگ کسی کی غلطی سے لگی ہو لیکن اس کے اس قدر پھیل جانے اور ہیبت ناک شکل اختیار کرلینے میں کیا ذمہ داروں کی غفلت وکوتاہی کا دخل نہیں ہے، یہ اور اس طرح کی تمام باتوں پر غور کرکے ان کا تدارک لابد ہے۔

جناب اندر کمار گجرال کا وزیراعظم ہونا ہندوستان کے لیے فال نیک ہے اس کا عام طور پر پُرجوش خیر مقدم کیا گیا ہے۔ بیرونی ملکوں اور پاکستان میں بھی خوشی ظاہر کی گئی ہے، وہ بڑے شریف، شائستہ اور سلجھے ہوئے آدمی ہیں، جن کو موجودہ سیاستدانوں کے جوڑ توڑ، بے اصولی بدعنوانی جعل سازی اور موقع پرستی کی ہوا نہیں لگی ہے، وہ ایک راست باز، ایماندار اور اصول پسند سیاست داں، اچھے اسکالر اور دانشور ہیں جن کا سیکولرزم پر پختہ عقیدہ ہے، بغیر جوڑ توڑ کے اس منصب پر فائز ہوجانا ان کی مقناطیسی شخصیت کا کرشمہ ہے، اگر وہ جوڑ توڑ کی سیاست اور سازش کا شکار نہ ہوئے تو ان کی تجربہ کاری، دوراندیشی اور سلامت روی سے ملک کا بھلا ہوسکتا ہے۔ وہ اردو نواز، اقلیتوں کے دوست مسلمانوں کے ہمدرد اور ان کے مسائل سے باخبر ہیں، اردو لسانی اقلیت کو خوشی ہے کہ گجرال کمیٹی کے چیرمین کی حیثیت سے انھوں نے اردو کے فروغ و ترقی کے لیے جو سفارشات پیش کی تھیں وہ اب نقش و نگار طاق نسیاں نہ بنی رہیں گی۔

مقالات

مولانا حکیم سید عبدالحئی کی ادبی نکتہ سنجی و سخن فہمی گل رعنا کی روشنی میں

از
ضیاء الدین اصلاحی

(۲)

اصنافِ سخن | مولانا کے اردو کے نکتہ سنج ادیب و مبصر اور سخن فہم ہونے کا ایک ثبوت یہ بھی ہے کہ انہوں نے مقدمہ اور اصل کتاب میں اردو شاعری کے بعض اصناف سخن کی خصوصیات وغیرہ بیان کرکے ان کے متعلق مفید معلومات تحریر کیے ہیں، اس سے اردو شاعری پر ان کی وسعتِ نظر کا اندازہ بھی ہوتا ہے، ہم چند مثالیں پیش کرتے ہیں۔

غزل کے متعلق ان کی رائے ہے کہ اس میں بے تکلف زبان میں نرم نرم باتیں، عاشق معشوق کے خیالات، وصل کا ارمان، فراق کی المناک کیفیت اور جذبات انسانی کی صحیح ترجمانی ہوتی ہے، (ص۵۲) غزل میں سادگی کا خیال نہ رکھنے اور اس کی زبان میں شیرینی اور گھلاوٹ کے بجائے ثقالت کو معیوب سمجھتے ہیں، ایک جگہ لکھتے ہیں:-

"بات یہ ہے کہ اصل وضع کے لحاظ سے غزل کا موضوع عشق و محبت کے سوا اور کوئی چیز نہیں ہے، مگر شروع ہی سے شعراء نے اس کو جذبات انسانی کے ظاہر کرنے کا ایک ذریعہ بنالیا ہے، خواہ ان کا منشا خوشی ہو یا غم یا حسرت یا ندامت یا

دنیا کی بے ثباتی یا موت کا خیال یا اور کسی قسم کا جذبہ یہاں تک کہ اخلاق و مواعظ کو بھی اس میں داخل کر دیا ہے، اسی لحاظ سے جب تک غزل کو جذبات انسانی کے ظاہر کرنے کا آلہ بنائے رکھو گے، غزل غزل رہے گی ورنہ نری لفاظی ہو گی"۔ (ص۸)

اور غزل مسلسل کی تعریف اور فائدہ یہ بتایا ہے کہ:

"جس میں ایک شعر کا مضمون دوسرے شعر سے الگ نہیں ہے بلکہ ساری غزل کا مضمون اول سے آخر تک ایک ہے، ایسی غزلوں کے لکھنے میں بڑا فائدہ یہ ہے کہ اس میں کسی قدر طولانی مضمون بھی بندھ سکتے ہیں مثلاً ہر ایک موسم کی کیفیت، صبح و شام کا سماں، چاندنی رات کا لطف، جنگل یا باغ کی بہار، سفر کی روداد، وطن کی دلبستگی اور اسی قسم کی بہت سی باتیں جو دو ایک شعر میں نہیں سما سکتیں"۔

(ص ۳۶۵ - ۳۶۶)

عاشقانہ شاعری کی مولانا نے دو قسمیں بتائی ہیں، اول وہ جس میں عاشقانہ جذبات کی صحیح کیفیت حق شناس آنکھوں میں خدانمائی کا جلوہ دکھاتی ہے، اس کی حد ایک طرف تصوف یا معرفت یا عشق حقیقی سے ملتی ہے، دوسری طرف پاک محبت اور عشق مجازی سے ڈانڈا مل جاتا ہے"۔ (ص۵۳)

تصوف کے رنگ کو شعر کی جان اور اس کے بغیر کلام کو روکھا پھیکا بتاتے ہیں (ص۵۵) یا قصیدہ میں پُر شوکت الفاظ، بلند مضامین اور چست ترکیبوں کا استعمال ہونا چاہیے۔ (ص۵۶) مولانا تاریخ گوئی میں تعمیہ و تخرجہ کے معیوب سمجھے جانے کا ذکر کرتے ہیں مگر مومن خاں کے بارے میں بتاتے ہیں کہ ان کی طبع رسا نے اس کو محسنات میں داخل کر دیا۔ صنعت گل رعنا، ہجو گوئی کے متعلق تحریر فرماتے ہیں:۔

شاعری کے گلشن کا ایک خار دار بیل ہے مگر جس طرح سے گل کے ساتھ کانٹوں کا ہونا ضروری ہے، اسی طرح شاعرانہ جوش و خروش کی تکمیل میں اس کو بہت کچھ دخل ہے'

اسی وجہ سے عربی اور فارسی کی شاعری بھی اس سے نہیں بچ سکی" (صنہ)

مرثیہ کے متعلق ان کا خیال ہے اور اپنے اس خیال کو وہ صحیح بھی بتاتے ہیں کہ "اردو شاعری کی ابتدا اسی سے ہوئی" وہ کہتے ہیں کہ سچ تو یہ ہے کہ اگر اس حصہ کو اردو شاعری سے نکال لو تو پھر اس میں سوا خد و خال اور گل و بلبل کے کچھ نہیں رہ جاتا اور اردو شاعری کی تاریخ نامکمل رہے گی اگر اس میں اس کا ذکر نہ کیا جائے۔

ریختی کا موجد وہ رنگین اور انشا کو نہیں مانتے، کیونکہ قدما کے ہاں بھی اس کا سراغ ملتا ہے مولانا ہاشمی بیجاپوری طبقہ متقدمین کے دور اول کے مشہور شاعر ہیں، ان کی شاعری میں ریختی ملتی ہے، سید محمد قادری خاکی جو غالباً ولی کے ہم عصر تھے ان کے دیوان میں بھی ایک دو ریختیاں ہیں۔ مگر اس میں شک نہیں کہ ان کے سوا اور کسی کا کلام اس طرح کا نظر سے نہیں گزرا، اس کے زندہ کرنے اور رواج دینے کا طرۂ افتخار مرزا سعادت یار خاں رنگین اور ان کے دوست سید انشاء اللہ خاں کے حصہ کا تھا، جو ان کو حاصل ہوا۔ (ص۵۵)

اسی سلسلے میں یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ مصنف گل رعنا نے زبان کی صحت و صفائی، بیان میں گھلاوٹ اور لچک اور انداز بیان میں سادگی، اثر انگیزی روزمرہ اور محاورہ کی پابندی پر بڑا زور دیا ہے اور جو چیزیں ان میں مانع ہوتی ہیں ان کو چھوڑ دینے یا انہیں سلیقہ سے استعمال کرنے کی تاکید کرتے ہیں، یہاں ان کی ادبی نکتہ سنجی، سخن فہمی اور بلاغت شناسی کی خصوصیت کو واضح کرنے کے لیے اس کا ذکر بھی ضروری معلوم ہوتا ہے۔

تشبیہ و استعارہ کے متعلق لکھتے ہیں کہ:

بعض مضامین ایسے دلچسپ و دلکش ہوتے ہیں کہ ان کو محض صفائی اور سادگی سے بیان کر دینا کافی ہوتا ہے مگر بہت سے خیالات ایسے ہوتے ہیں کہ معمولی زبان انکو نہیں ادا کر سکتی اور معمولی اسلوب ان میں اثر پیدا کرنے سے قاصر ہوتے ہیں ایسے موقعوں پر تشبیہ اور استعارہ یا کنایہ اور تمثیل سے کام لینے کی ضرورت پڑتی ہے، اگر ایسا نہ کیا جائے تو شعر شعر نہیں رہتا، معمولی بات چیت ہو جاتی ہے" (صفحہ ٦)

وہ تشبیہ و استعارہ کو ایک فطری چیز بتاتے ہیں، ایک عامی بھی جوش و خروش میں غیظ و غضب کی حالت میں رنج و غم کی کوئی بات کہتا ہے تو بے ساختہ اس کے منھ سے تشبیہ و استعارہ کے قالب میں ڈھل کر بات نکلتی ہے اور وہ سننے والے کے دل پر وہی اثر پیدا کرتی ہے جو کہنے والے کے دل پر اس وقت طاری ہے۔ اس کی مثال بھی دی ہے کہ اگر تم یہ کہنا چاہو کہ فلاں شخص بہادر ہے اور اسی لفظ سے ادا کرو تو ادائے مطلب کا یہ ایک معمولی طریقہ ہوگا اور اگر اسی بات کو یوں کہو کہ وہ شیر کے مانند ہے تو یہ تشبیہ ہوگی، اور اس میں زور پیدا ہو جائے گا اور یوں کہو کہ وہ شیر ہے تو زور اور بڑھ جائے گا اور اگر اس شخص کا نام نہ لو اور یوں کہو کہ میں نے ایک شیر دیکھا ہے اس سے مراد اسی شخص کو لو تو یہ استعارہ ہے اور اسی مقصد کو حاصل کرنے کا ایک طریقہ اور بھی ہے کہ شیر کا نام ہی نہ لیا جائے بلکہ اس کے جو مخصوص اوصاف ہیں اس شخص کی نسبت استعمال کیے جائیں۔ مثلاً یوں کہا جائے کہ وہ جب میدانِ جنگ میں ڈکارتا ہوا نکلا تو ہل چل پڑ گئی تو یہ بھی استعارہ ہے اور پہلے کی نسبت زیادہ لطیف ہے۔ (صفحہ ۷)

مصنف گل رعنا تشبیہ میں مشبہ اور مشبہ بہ کے درمیان اور استعارہ میں مستعار لہ اور مستعار منہ میں کسی قسم کی مناسبت کا ہونا ضروری قرار دیتے ہیں خواہ ایک صفت میں ہو

یا چند اوصاف میں، حواس ظاہری سے محسوس ہوتی ہو یا عقل سے اس کا ادراک ہوتا ہے، اس کو وہ ایسی چیز بتاتے ہیں جس میں سلیقہ سے کام لینے کی حاجت ہے، شاعر اسی نکتہ کو پیش نظر رکھے گا تو اس سے سلیقہ مندی ظاہر ہوگی اور اگر وہ بے اعتدالی سے کام لے گا تو اس شعر کو سن کر بجائے اس کے کہ اس کے جوش و خروش کا دل پر اثر ہو، تشبیہ و استعارہ کی پیچیدگی اپنی طرف متوجہ کرے گی اور اس طرح سے اس کا مقصود فوت ہو جائے گا۔ (ص۴۲)

ایک جگہ اس پر مزید زور دیتے ہوئے رقم طراز ہیں:

"اس میں شاعر کی سلیقہ مندی کی سخت ضرورت ہے کہ وہ اس کو صفت در صفت یا استعارہ در استعارہ کرکے بعید الفہم نہ کر دے، دوسرے یہ کہ جس چیز کے ساتھ تشبیہ دی جائے یا استعارہ کیا جائے وہ اس خاص صفت میں جس میں تشبیہ یا استعارہ مقصود ہے، کمال رکھتا ہو تاکہ اس کے ذکر کرتے ہی سننے والے کی طبیعت میں جوش اور اثر پیدا ہو، تیسرے یہ کہ ان دونوں میں مناسبت پوری پوری پائی جائے۔" (ص۴۱)

متاخرین کے دور میں یہ خصوصیت پیدا ہو گئی جس پر مصنف نے اظہار تاسف کیا ہے، کہ انھوں نے استعاروں اور تشبیہوں سے کلام میں زور پیدا کرنے کی کوشش کی مگر وہ اس میں اعتدال سے گزر گئے اور ان باتوں کا کم لحاظ رکھا ہے، صفت در صفت اور استعارہ در استعارہ کرکے کلام کو اتنے ایچ پیچ میں ڈال دیا ہے کہ اس گورکھ دھندے کو کھولتے کھولتے مطلب غائب ہو جاتا ہے اور اکثر کوہ کندن و کاہ برآوردن کی مثل اس پر ٹھیک اترتی ہے۔ (ص۴۳)

یہی نہیں اس زمانے میں وہ بتاتے ہیں کہ قابلیت کا معیار صنائع و بدائع اور اس میں مخصوص صنعت مراعات النظیر پر آکر ٹھہر گیا تھا اور بعضوں نے اس رعایت لفظی کا پردہ وہ آنا

باریک کر دیا تھا کہ وہ ہوا کے جھونکے سے ضلع جگت کی حد میں پہنچ گئے، اور شاعری اچھا خاصہ سوانگ بن گئی (ص ۷۹)

مصنف گل رعنا کو تشبیہ و استعارہ کی خوبی سے انکار نہیں وہ اسے بجائے خود نہایت عمدہ چیز مانتے ہیں، جس وقت گفتگو کا معمولی انداز جوش پیدا کرنے سے قاصر رہتا ہے تو اسی کے ذریعہ سے کلام میں زور اور قوت پیدا کرنی پڑتی ہے، علاوہ اس کے یہ چیزیں کلام کو خوبصورت بھی کر دیتی ہیں جیسا کہ زیور سے حسینوں کے جمال میں آب و تاب پیدا ہو جاتی ہے، مگر بقول آزاد یہ رنگ اگر اس حد تک رہے جیسا کہ چہرہ پر غازہ یا آنکھوں میں سرمہ تو خوش نمائی اور بینائی دونوں کو مفید ہے اور اگر حد اعتدال سے گزر جائے تو اسکی شدت سے زبان خیالی باتوں سے فقط توہمات کا سوانگ بن جاتا ہے، اسی لیے وہ کہتے ہیں تشبیہیں اور استعارے قریب المأخذ ہوں یعنی پاس پاس کے ہوں اور آنکھوں کے سامنے ہوں تو کلام میں لطافت و نزاکت پیدا ہو جائے گی اور اگر دور پڑ جائیں اور بہت باریک پڑ جائیں تو دقت پیدا ہو جائے گی، اسی طرح اگر اس خاص صفت یا ان مخصوص اوصاف میں جن میں کسی چیز کو کسی سے تشبیہ دی گئی ہے یا استعارہ کیا گیا ہے، پوری پوری مناسبت نہ ہوگی تو کلام بدرنگ اور بے مزہ ہو جائے گا۔ (ص ۷۲)

اردو شاعری پر ایک اعتراض یہ کیا جاتا ہے کہ وہ اپنی اصل بھاشا کی آغوش سے نکل کر فارسی کی آغوش میں چلی گئی اور فارسی کے الفاظ و خیالات اس پر چھائے ہوئے ہیں، مصنف گل رعنا اس کا اور اس کے سبب کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"چونکہ اردو شاعری کی ابتدا فارسی کی انتہا سے جا ملی ہے، لہٰذا بہت سے خیالات جو خاص ملک فارس سے علاقہ رکھتے ہیں، اس میں خود بخود آ گئے مثلاً بجائے عورتوں کے

لڑکوں کا عشق، ان کے خط کی تعریف، شمشاد، نرگس، سنبل، سوسن، بنفشہ وغیرہ کی تشبیہیں۔ لیلیٰ، شیریں، شمع، گل، سرو وغیرہ کا حسن۔ مجنوں، فرہاد، بلبل، قمری، پروانہ کا عشق، مانی و بہزاد کی مصوری، رستم و اسفندیار کی بہادری، زحل کی نحوست، سہیل یمن کی رنگ افشانی، نوروز کا جشن، جام جم، خم افلاطون، راہ ہفت خواں، کوہ بے ستون، کوہ الوند، جوئے شیر، قصر شیریں، جیحوں سیحوں اور خدا جانے کیا کیا الفاظ، ترکیبیں اور خیالات فارسی سے اردو میں آگئے۔

ان خیالوں اور اشاروں نے اردو شاعری کو سنگلاخ بنا دیا جس کی ماں بھاشا سی شیریں زبان تھی جو ہم کو وہ چیزیں بتاتی ہے جن کی کیفیت ان کے دیکھنے، سننے، سونگھنے، چکھنے یا چھونے سے حاصل ہوتی ہے مثال کے طور پر خیال کرو بارش کا موسم ہندوستان میں بہار کا موسم ہے، بادلوں کا گھر گھر کر آنا، سرد ہواؤں کا چلنا، سرسبز اور شاداب درختوں کا جھومنا، ہلکی پھواروں کا پڑنا، کوئل کا کوکنا، پپیہوں کا پی کہاں پی کہاں کی صدا لگانا یہ اور اسی قسم کی بہت سی دلکش باتیں ہیں جن کو دیکھ کر دل کو سرور اور آنکھوں کو نور حاصل ہوتا ہے اور انہی باتوں کو اگر شعر کے قالب میں ایک خاص انداز سے ڈھالا جائے تو اس کو سن کر دلوں میں جوش اور طبیعتوں میں اتنی امنگ پیدا ہو سکتی ہے جو ہمارے فارس کو خواب میں نصیب نہیں۔

مگر بدقسمتی سے اردو شاعری میں گل و بلبل کا دخل ہوا جو متقدمین کے ہاں کم کم، متوسطین کے ہاں کچھ زیادہ پایا جاتا ہے اور متاخرین کی شاعری کا دارومدار اسی پر ٹھہر گیا، تحسین و آفریں کی ہوس میں کبھی صفت در صفت، کبھی استعارہ در استعارہ سے اسے اتنا تنگ و تاریک کر دیا کہ شاعری گورکھ دھندا بن کر رہ گئی۔" (ص ۱۴۱)

یہ باتیں وہی شخص لکھ سکتا ہے جس کا مذاق سخن بلند اور ادبی ذوق نہایت پختہ ہو، اور وہ شعر و بلاغت کا ادا شناس ہو۔

شعراء کے بارے میں معنی خیز اور جچا تلا تبصرہ | مصنف گل رعنا نے مقدمہ میں بھی اور شعراء کے تذکروں کے ضمن میں بھی ہر ہر شاعر کے بارے میں جو نپا تلا اظہار خیال کیا ہے اس سے ان کی خصوصیات اور امتیازات پوری طرح نمایاں ہو گئے ہیں۔ یہ دراصل مصنف کے ادب و نقد ادب میں کمال اور سخن فہمی و شعر و بلاغت کی نکتہ شناسی کا نمونہ ہے مثلاً میر انیس اور مرزا دبیر کے متعلق انہوں نے بڑا بلیغ اور موثر تبصرہ کیا ہے، فرماتے ہیں:

"ان دونوں نے مرثیہ گوئی کی صنف میں ایسی ترقی کی ہے کہ جس کے آگے قدم بڑھانا نظر بحالات موجودہ دشوار معلوم ہوتا ہے، ان لوگوں نے بھی تشبیہوں اور استعاروں سے کام لیا ہے اور مبالغہ کی تو حد کر دی ہے مگر با وجود اس کے زبان میں وہ لوچ اور وسعت پیدا کی ہے جو انہی کا حصہ ہے، ایک ایک مضمون کو سینکڑوں نہیں ہزاروں رنگ سے ادا کیا ہے اور ہر قسم کے خیال کا ایسا طلسم باندھا ہے کہ دیکھنے سے تعلق رکھتا ہے، صبح کا عالم دیکھو، رات کی رخصت، سیاہی کا چھٹنا، نور کا ظہور، آفتاب کا طلوع مرغزار کی بہار، شام ہے تو شام غریباں، رات کا سناٹا، کبھی تاروں کی چھاؤں، کبھی اندھیری راتوں کی ظلمت، دن کو کڑاکے کی دھوپ، لوؤں کی لپٹ، آفتاب کی آتش فشانی غرضیکہ قوت تخیل سے ایک نیا عالم پیدا کر دیا ہے اور حقیقت یہ ہے کہ اپنی شاعری سے اردو زبان کو گل ہائے رنگا رنگ سے مالا مال کر دیا ہے، جس کی وجہ سے اردو زبان ہمیشہ ان کی منت پذیر رہے گی۔" (ص۳۲)

ایک اور جگہ مرثیہ میں جدتیں پیدا کرنے کے سلسلے میں ان دونوں بزرگوں کے کارنامے

بیان کیے ہیں:

"میر انیس و مرزا دبیر نے اس بنیاد پر ایک بلند و مستحکم عمارت کھڑی کر دی، بیان کرنے کے نئے نئے اسلوب اردو شاعری میں بکثرت پیدا کر دیے، ایک ایک واقعہ کو سو سو طرح سے بیان کر کے قوت متخیلہ کی جولانیوں کے لیے ایک نیا میدان صاف کر دیا، مناظر قدرت کی ایسی تصویریں کھینچیں کہ فارسی شاعری میں بھی اس کا نمونہ بمشکل مل سکے گا، اسی طرح جذبات انسانی کی صحیح ترجمانی کر کے اردو شاعری کو پستی سے بلندی پر پہنچا دیا۔" (ص۲۶۶)

ان دونوں بزرگوں کا تقابل کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"شوکت الفاظ، مضامین کی آمد، اس میں جا بجا غم انگیز اشارے، درد خیز کنایے، المناک و دل گداز انداز جو مرثیہ کی اصلی غرض ہے، ان وصفوں میں وہ میر انیس سے ممتاز ہیں، کچھ شک نہیں کہ میر انیس زبان کی صفائی، بندش کی چستی اور مناظر قدرت کی صحیح تصویر کھینچنے میں اپنا مثل نہیں رکھتے، مرزا صاحب کے کلام کا خاص جوہر تشبیہات و استعارات ہیں، یہ اپنی قوت متخیلہ کے زور سے ایسے عجیب استعارے اور نادر تشبیہیں ڈھونڈھ ڈھونڈھ کر پیدا کرتے ہیں کہ وہاں تک ان کے حریفوں کا طائر وہم بھی پرواز نہیں کر سکتا، بقول علامہ شبلی خیال آفرینی، دقت پسندی، جدت استعارات، اختراع تشبیہات، شاعرانہ استدلال، شدت مبالغہ میں ان کا جواب نہیں۔"

مگر میری رائے میں اس فیصلہ کا یہ مطلب نکالنا خطرناک غلطی ہے کہ مرزا دبیر زبان کی صفائی، بندش کی چستی اور مناظر قدرت کی صحیح تصویر کھینچنے سے عاری ہیں، یا میر صاحب قوت متخیلہ میں بالکل بیٹھے ہیں اور ان کے ہاں عجیب استعارے اور نادر تشبیہیں نہیں ہیں، ایسا خیال کرنا ان دونوں بزرگوں کے دامن کمال پر دھبہ لگانا ہے، مقصد یہ ہے کہ

ہر شاعر کا رنگ طبیعت انداز بیان اور طرز مذاق مخصوص قسم کا ہوا کرتا ہے، ایک چیز ایک کے ہاں افراط سے ملے گی، دوسرے کے ہاں اس سے کم، یہی حال میر و مرزا کا بھی ہے اس سے نہ ان کی تنقیص کی جاسکتی ہے نہ ان کی۔ ع ہر طرز میں جو خوب کہے خوب وہ ہے"

صاحب ذوق سلیم کا قلم ہی یہ گل افشانیاں کر سکتا ہے، اس کے بعد ہی خواجہ آتش کے شاگرد نواب مرزا شوق کے بارے میں فرماتے ہیں انہوں نے زہر عشق بہار عشق وغیرہ چند مثنویاں اس صفائی اور سادگی سے لکھی ہیں جو اخلاقی حیثیت سے کتنی ہی کم رتبہ ہوں مگر زبان اور بیان کے لحاظ سے اردو کی بہترین مثنویوں میں شمار ہونے کے قابل ہیں، میر حسن اور انکی مثنوی پر ان کا یہ حقیقت و انصاف پر مبنی تبصرہ پڑھنے کے لائق ہے۔

"میر حسن کی مثنوی گلزار ارم اور اس سے بھی بہتر ان کی دوسری مثنوی سحر البیان ہے جس نے اتنی قبولیت حاصل کرلی تھی کہ آج تک کسی مثنوی کو نصیب نہیں ہوئی، اس مثنوی میں روزمرہ اور محاورہ کی صفائی، قافیوں کی نشست، ترکیبوں کی چستی اور مصرعوں کی برجستگی کے علاوہ ربط کلام کی خوبی اور ہر بیت کو دوسری بیت سے ایسا گہرا تعلق ہے جیسا زنجیر کی ہر کڑی کو دوسری کڑی سے ہوتا ہے اور مطالب ایسی صفائی سے ادا کیے ہیں کہ اگر ان ہی کو نثر کردیا جائے تو نثر کا بیان نظم سے کچھ زیادہ صاف اور مربوط نہ ہوگا، سب سے بڑی بات یہ ہے کہ جو حالت کسی شخص یا کسی چیز یا مکان کی بیان کی ہے وہ لفظاً و معنیً اس قدر عادت کے موافق ہے، جیسی فی الواقع ہوا کرتی ہے۔ غرض کہ جس واقعہ کی تصویر کھینچی ہے وہ صفائی اور سادگی کے ساتھ اس قدر موثر اور دل گداز ہے جو دیکھنے سے تعلق رکھتی ہے" (ص۵۶)

ایک اور جگہ لکھتے ہیں:

"میر حسن قصیدے کے مرد میدان نہیں تھے، البتہ غزل میں ان کا درجہ بہت بلند ہے اور

اور مثنوی میں تو یکتائے زمانہ تھے، جس سے کسی کو بھی انکار نہیں ہو سکتا، بے نظیر و بدر منیر کے قصہ میں جو سحر بیانی کی ہے اس کا آج تک جواب نہیں ہو سکا۔

اس کی زبان کی صفائی، محاورہ کا لطف، مضمون کی شوخی، طرز ادا کی نزاکت اور سوال و جواب کی نوک جھونک حد توصیف سے باہر ہے، باوجود اس کے کہ سحرالبیان کی تصنیف کو ڈیڑھ سو برس ہونے کو آئے ہیں لیکن اس کی زبان قریب قریب وہی ہے جو آج کل بولی جاتی ہے، یہی ایک اس امر کا کافی ثبوت ہے کہ میر حسن کا مذاق سخن کتنا لطیف و پاکیزہ تھا" (ص ۲۴۰)

اس کے بعد مرزا نسیم دہلوی کے متعلق سنیئے انہوں نے اپنے استاد حکیم مومن خاں کی دقت پسندی کو دور کر کے ان کی نادر ترکیبوں کی میناکاری کو اس قدر صاف اور روشن کر دیا ہے جو قابلِ تحسین ہے۔

شاہ مبارک آبرو پر مختصر مگر جامع تبصرہ ہے، طبیعت رسا اور فکر معنی یاب تھی، اس زمانہ کے دستور کے موافق تشبیہ اور ایہام میں کلام الجھا ہوا ہے، مگر محاوروں کی چاشنی نے اس کو بامزہ کر دیا ہے۔

مرزا مظہر جان جاناں اور ان کے کلام پر اس تبصرہ سے ان کی نکتہ دانی اور شعر فہمی کا اندازہ کیجئے!

" خصوصاً مرزا جان جاناں مظہر رحمۃ اللہ علیہ نے اس خارزار (تناسب لفظی و صنائع بدائع کی دوسری قسمیں خصوصاً ایہام اور ذو معنین) کو ایسا چھانٹا کہ شاعری ساحری بن گئی، پھر اپنے زور طبع اور خداداد قابلیت سے اچھوتے مضمونوں اور فارسی ترکیبوں اور اردو کے دلکش محاوروں کو اس طرح پر ترتیب دیا اور وہ خوبی پیدا کی کہ ایہام اور تجنیس وغیرہ صنائع لفظی جو ہندی دوہروں کی بنیاد تھے اسے سب بھول گئے" (ص ۵)

میر محمد باقر حزیں پر تبصرہ اور نمونہ کا ایک شعر ملاحظہ ہو:

• غزلوں کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ طبیعت معنی یاب و فکر رنگیں رکھتے تھے اور سوز و گداز کی چاشنی اس میں کسی سے کم نہیں ؎

خوب سوجھا ہے مزا عشق میں رسوائی کا		معتقد دل سے ہوں اس دل کی میں دانائی کا (ص۳۲)

شیخ امام بخش ناسخ کے شاگرد خواجہ محمد وزیر وزیرؔ کے رنگ کو وہی بتاتے ہیں جو انکے استاد کا ہے، مضمون کی بلندی، خیال کی نزاکت، بیان کی متانت اور زبان کی صحت غرض پختگی کلام کے تمام لوازم اس میں موجود ہیں، لیکن غزل کی جان یعنی تاثیر کے نہ ہونے سے ان کے کلام کی حیثیت ایک حسین مگر جسد بے روح سے زیادہ نہیں قرار پا سکتی، ان کے تمام دیوان کو اول سے آخر تک پڑھو اس میں دس شعر بھی ایسے نہ ملیں گے جن سے اہل دل کے قلوب کو سرور اور اہل نظر کی آنکھوں کو نور حاصل ہو، مگر اس میں شک نہیں کہ جوان کا رنگ ہے اس میں ناسخ و آتش کے بعد ان کے معاصرین میں سے کوئی ان کا مثل نہیں (ص۳۰۲)

سید ظہیر الدین ظہیر دہلی کے رہنے والے اور شیخ ابراہیم ذوق کے شاگرد تھے مگر کلام میں استاد کے بجائے مومن خاں کا رنگ تھا، ذوق کے کلام کی ممتاز خصوصیت کلام کی پختگی، محاورہ کی صفائی اور زبان کی درستی کے ساتھ تعقید الفاظ کا عیب بھی ہے جو ظہیر کے یہاں نہیں پایا جاتا، مومن خاں کے یہاں شاعری کا مدار خیال کی نزاکت، ترکیب فارسی کی خوبی اور اسلوب بیان کی جدت پر ہے جو ظہیر کی شاعری کا سرمایہ ناز ہے، جہاں کہیں نزاکت خیال اور جدت اسلوب کے ساتھ الفاظ کی رنگینی اور ترکیب کی تازگی کی خوبیاں جمع ہو جاتی ہیں تو مرزا نسیم کی طرح دل پذیری کی شان ان کے کلام میں بھی پیدا ہو جاتی ہے اور جہاں کہیں استاد کا رنگ ہے وہاں مرزا داغ اور ان کے کلام میں فرق کرنا دشوار ہے۔ غرض کہ مجموعی

حیثیت سے ظہیر کی شاعری ولی کی اصلی اور قدیم شاعری کا ایسا نمونہ ہے جس کی مثال ان کے بعد اور کسی کے کلام میں نہیں مل سکتی (ص ۴۲۹)

خواجہ احسن اللہ بیان اور ان کے کلام کے بارے میں فرماتے ہیں:

"اصول شاعری سے باخبر، خوش گو، تیز طبع اور مشاق سخنور تھے، ان کے کلام میں نمکینی اور رنگینی ایسی غضب کی ہے کہ شعر پڑھ کر دل تڑپ جاتا ہے، دور از قیاس استعاروں اور پیچیدہ بندشوں سے کلام پاک وصاف ہے اور سادگی میں بھی اس کا انداز ایسا ہے جس پر ہزاروں بناوٹیں قربان کر دی جائیں۔ (ص ۱۹۶)

میر ضیاء الدین ضیا مرزا رفیع سودا کے ہم عصر تھے، ان کے کلام پر یہ ماقل ودال تبصرہ ملاحظہ ہو:

"اصناف سخن میں سے غزل کو پسند کیا تھا، قصیدہ اور مثنوی کی طرف طبیعت نہیں مائل ہوئی، سنگلاخ زمینوں میں غزل کہنے کا شوق تھا، جس میں شعر کا سرسبز کرنا ہر کسی کا کام نہیں۔" (ص ۲۱)

جعفر علی حسرت کے بارے میں ان کا خیال ہے کہ "ان کے کلام میں ترکیبوں کی موزونیت، الفاظ کی برجستگی اور خیالات کی سادگی ان کے پیش رو شعرا کی طرح بہت نمایاں ہے، یہ صحیح ہے کہ سارا کلام ان کا ایک طرح کا نہیں ہے، تاہم آزاد کی اس رائے سے مجھے اتفاق نہیں کہ ان کے دیوان میں پھیکے شربت کا مزہ آتا ہے۔" (ص ۲۲) شیخ غلام علی راسخ عظیم آبادی کی زبان بہت پاکیزہ، طرز بیان نہایت صاف وسادہ، کلام میں رطب ویابس نہ ہونے کے برابر اور تصوف کا مذاق بہت ابھرا ہوا بتاتے ہیں جس کو بہت سادہ طریقہ سے ادا کرتے ہیں، تشبیہ اور استعاروں کی چاشنی کم ہے، جس سے کسی قدر پھیکا پن ظاہر ہوتا ہے،

تاہم رنگین شعروں کی بھی کمی نہیں ہے، سینکڑوں شعر ایسے انتخاب کیے جا سکتے ہیں جو دل نشین ہونے کے قابل ہیں (ص ۲۳۵)

میر نظام الدین ممنون کے بارے میں یہ نپی تلی رائے لکھ کر اپنے مذاق سخن کی بلندی اور شعر فہمی کا ثبوت دیا ہے " زبان ان کی صاف اور شیریں ہے۔ اس میں جا بجا محاوروں کی چاشنی دیتے ہیں تو کلام اور بھی مزے دار ہو جاتا ہے، پھر ترکیب و بندش کی چستی سے پامال و فرسودہ مضامین بھی اس انداز سے ادا کرتے ہیں کہ اس میں ایک قسم کی لطافت و نزاکت پیدا ہو جاتی ہے" (ص ۲۸۴) میر حسین تسکین پر یہ تبصرہ بھی اردو شاعری پر ان کی وسعت نظر اور شعر و سخن کا نکتہ داں ہونے کا ثبوت ہے۔

" کلام کا رنگ گواہی دیتا ہے کہ مومن خاں کے شاگردوں میں یہ خاص مرتبہ رکھتے تھے استاد کی طرز ادا، معاملہ نگاری اور شوخی کو روزمرہ کی صفائی اور سادگی کے ساتھ اس طرح سے ملا جلا دیا ہے کہ ان کے کلام میں دلآویزی کی شان بڑھ گئی ہے اور مومن خاں کے ساتھ اس قدر ہم رنگی پیدا ہو گئی ہے کہ اگر ان دونوں کے کلام کو مخلوط کر دیا جائے تو ایک کے کلام کو دوسرے کے کلام سے تمیز کرنا دشوار ہو جائے گا" (ص ۳۲۶)

مرزا اصغر علی نسیم کے بارے میں جو کچھ لکھا ہے، بہت خوب لکھا ہے:

" نسیم نے تمام اصناف سخن میں قدرت کامل پائی تھی خصوصاً مثنوی میں ان کو ید بیضا حاصل تھا، ان کے کلام میں خیال کی دلفریبی اور بیان کی رنگینی کے ساتھ زبان کی صفائی اور پاکیزگی اس قدر نمایاں اور واضح ہے کہ اس کے ساتھ کسی دوسرے کا کلام لگا نہیں کھاتا۔

میری نظر میں وہ اپنے معاصرین اہل دلی میں ایک ہی شخص ہیں جس نے اپنی طرز بیان کو

محفوظ رکھتے ہوئے اہل لکھنؤ کی متروکات کو قبول کرنے میں پیش قدمی کی اور زبان کا ایسا اعلیٰ نمونہ پیش کیا کہ شعرائے لکھنؤ نے بھی اس کی داد دی اور یہاں رہ کر اپنے شاگردوں اور عقیدتمندوں کا ایک معقول گروہ پیدا کر لیا" (ص۳۹۳)

میر مظفر علی خاں اسیر کو پُرگو، کہنہ مشق اور تمام اصناف سخن پر قدرت رکھنے والا کہنے کے باوجود اپنے ہم عصروں کی طرح لفظی رعایتوں کا اسیر بتاتے ہیں (ص۳۹۰) متاخرین کے دور میں جب قابلیت کا معیار صنائع و بدائع اور اس میں مخصوص صنعت مراعات النظیر پر آکر ٹھہر گیا تھا تو اس زمانے میں امانت کی شاعری کا دار و مدار اسی ضلع جگت پر تھا، مشکل سے کوئی صاف شعر ان کے ہاں مل سکتا ہے، خصوصاً واسوخت کی شہرت کی بنیاد اسی پر تھی۔ مولانا عبدالحئی صاحب کے بچپن میں اس کی بڑی دھوم تھی، مولانا نے ایک بند اور چند اشعار نمونہ کے طور پر نقل کیے ہیں (ص۱۰۶)

نواب سید محمد خاں رند کے بارے میں اس تاثر کا اظہار فرمایا ہے، بات یہ ہے کہ اہل لکھنؤ کی شاعری کا مدار مضمون کی بلندی، خیال کی نزاکت اور زبان کی صحت پر ہوا کرتا ہے، ان کے ہاں تینوں چیزیں کمزور ہیں، بلند پروازی اور خیال آفرینی میں خواجہ وزیر اور زبان کی صحت میں میر صبا کو یہ نہیں پہنچتے مگر ان کے ہاں سادگی اور صفائی اور تاثیر کا سا ہلکا رنگ نظر آتا ہے جس سے خواجہ وزیر محروم ہیں اور صبا کے یہاں کچھ کچھ پایا جاتا ہے (ص۴۰۸)

بات تقابل کی آگئی تو چند ہم عصر شعراء کے متعلق گل رعنا کے مصنف کی گہرافشانیاں ملاحظہ کر کے شاعری پر ان کی استادانہ و ماہرانہ نظر، ذوق ادب کی بلندی اور سخن فہمی کا تماشا دیکھ لیں!

میر تقی میر، مرزا رفیع سودا، خواجہ میر درد اور میر سوز وغیرہ ہم عصر طبقۂ متوسطین کے دور اول کے سرخیل اور اردو شاعری کے اساطین میں تھے، پہلے ہم انھی حضرات کا تقابلی مطالعہ پیش کرتے اور ہر ایک کے الگ الگ طرز و خصوصیت کو بیان کرتے ہیں:۔

مرزا رفیع سودا قصیدہ کے میدان میں فارسی شعراء سے بھی بعض باتوں میں آگے بڑھ گئے ہیں، ان کے کلام کا زور و شور انوری کے کلام سے نہیں دبتا اور نزاکت مضمون میں عرفی کو بھی شرماتا ہے، وہ ہجو کے بھی مرد میدان ہیں، گرمی کلام کے ساتھ شوخی و ظرافت ان کے حصہ میں آئی ہے، اس کی نظیر دوسری جگہ نہیں مل سکتی، مرثیہ کو مسدس کیا جس سے اس میں وسعت پیدا ہوگئی۔ قصیدوں میں پُرشوکت الفاظ، بلند مضامین اور چست ترکیبیں استعمال کیں، عاشقانہ مثنویاں جس شان کی میر تقی میر نے لکھی ہیں ان کی نظیر اس دور سے پہلے نہیں ملتی۔

غزلوں میں بے تکلف زبان میں نرم نرم باتیں، عاشق و معشوق کے خیالات، وصل کا ارمان، فراق کی المناک کیفیت اور جذبات انسانی کی صحیح ترجمانی جیسی انھوں نے کی اس کی نظیر قدماء کے کلام میں نہیں مل سکتی، میر تقی میر، میر درد، یقین، بیان، حزیں، ہدایت اور بیدار کی غزلیں پڑھو اور اپنے دل پر ہاتھ دھر کر دیکھو۔

جوش و خروش، کلام کی گرمی اور دل آویزی، دلچسپ اور دل پسند بحروں میں... پھر سنگلاخ زمینوں اور مشکل ردیف اور قافیوں میں شعر کی آب و تاب دیکھنا چاہو تو مرزا رفیع سودا اور قائم کا کلام دیکھو اور انصاف کرو... اگر روزمرہ اور محاورے میں بیان کی بے تکلفی اور سادگی دیکھنا ہو تو میر تقی میر، میر درد اور میر سوز کی غزلیں پڑھو جس پر ہزاروں طرح کی بناوٹیں قربان ہوتی نظر آئیں گی... تصوف کو خواجہ میر درد سے پہلے سراج

کے سوا کسی نے چھوا ہی نہیں، اس کی آمیزش سے جو تڑپ ان کے کلام میں پیدا ہوگئی ہے اس کا اترا ہوا خاکہ بھی ان کے پیش رووں میں نظر نہیں آتا (ص۵۲-۴۹)

آزاد کے حوالہ سے سودا کے کلام پر جو رائے زنی کی ہے اس سے بھی ان کی سخن فہمی اور شعری خوش مذاقی عیاں ہے، لکھتے ہیں:-

"ان کا کلام کہتا ہے کہ دل کا کنول ہر وقت کھلا رہتا تھا، اس پر سب رنگوں میں ہم رنگ اور ہر رنگ میں اپنی ترنگ، جب دیکھو طبیعت شورش سے بھری اور جوش وخروش سے لبریز، نظم کی ہر فرع میں طبع آزمائی کی ہے اور کہیں رکے نہیں، چند صفتیں خاص ہیں جن سے کلام ان کا جملہ شعراء سے ممتاز معلوم ہوتا ہے، اول یہ کہ زبان پر حاکمانہ قدرت رکھتے ہیں، کلام کا زور مضمون کی نزاکت سے ایسا دست وگریباں ہے جیسے آگ کے شعلے میں گرمی اور روشنی، بندش کی چستی اور ترکیب کی درستی سے لفظوں کو اس در وبست کے ساتھ پہلو بہ پہلو جڑتے ہیں گویا ولایتی طپنچہ کی چاپیں جڑی ہوئی ہیں اور یہ خاص ان کا حصہ ہے، چنانچہ جب ان کے شعر میں سے کچھ بھول جائیں تو جب تک وہی لفظ وہاں نہ رکھے جائیں، شعر مزا ہی نہیں دیتا، خیالات نازک اور مضامین تازہ باندھتے ہیں مگر اس باریک نقاشی پر ان کی فصاحت آئینہ کا کام دیتی ہے تشبیہ واستعارے ان کے ہاں ہیں مگر اسی قدر کہ جتنا کھانے میں نمک یا گلاب کے پھول پر رنگ، رنگینی کے پردہ میں مطلب اصلی کو گم نہیں ہوتے دیتے" (ص۱۴۱-۱۴۰)

میر صاحب کو غزل کا بادشاہ بتایا ہے، قصیدہ کے مرد میدان نہیں، ان کے قصیدے کم ہیں اور اسی قدر درجہ میں کم ہیں، واسوخت لاجواب ہیں۔ (ص۱۶۹)

خواجہ میر درد کی زبان اور طرز ادا وہی ہے جو میر کی ہے، قصیدہ کی طرف مائل نہیں

ہوئے، اس واسطے کہ جس مرتبہ کے وہ آدمی تھے، اس کو بھٹی سے کیا نسبت، غزلوں کا دیوان بقول میر حسن کے مثل دیوان حافظ کے سراپا انتخاب ہے، تصوف اور اخلاق کی چاشنی کے اعتبار سے ان کا کلام میر و مرزا کے کلام سے زیادہ دلآویز ہے۔ (ص ۱۷۶)

سید محمد میر سوز کے متعلق آزاد کی اس رائے کو بے لاگ بتاتے ہیں کہ ان کی زبان عجب میٹھی زبان ہے اور حقیقت میں غزل کی جان ہے، ان کی انشا پردازی کا حسن تکلف اور صنائع مصنوعی سے بالکل پاک ہے، البتہ غزل میں دو تین شعر کے بعد ایک آدھ پرانا لفظ ضرور کھٹک جاتا ہے (ص ۱۸۲)

طبقۂ متوسطین کے دور سوم کے شعراء میں ذوق اور ظفر کو روزمرہ و محاورہ بندی میں سب سے فائق بتایا ہے (ص ۵۵) مومن اور غالب کے ہاں خیال آفرینی کے ساتھ فارسی کی ترکیبیں زیادہ داخل ہوگئی ہیں اور بول چال کا لطف ذوق و ظفر کی نسبت ان کے ہاں کم ہے، اس دور میں نصیر نے مضمون آفرینی کی بنیا ڈالی اور بعید الفہم استعاروں سے کام لے کر اور مشکل و سنگلاخ زمینوں میں شعر کہہ کر اس کو تنگ و تاریک کر دیا ہے، اگرچہ ان کے ہاں بھی محاورہ جہاں آجاتا ہے شعر میں تڑپ پیدا کر دیتا ہے مگر بیشتر حصہ ان کے کلام کا بے لطف و بے رنگ ہے، ذوق کے کلام میں عموماً زبان کا چٹخارہ اپنے معاصرین سے زیادہ ہے مگر وہ بھی جہاں مضمون آفرینی کرتے ہیں، صفائی سے دور جا پڑتے ہیں، ظفر کا تمام دیوان زبان کی صفائی اور روزمرہ کی خوبی میں یکساں ہے لیکن اس میں تازگی خیالات بہت کم پائی جاتی ہے، ممنون، مومن، غالب اور ان کے متبعین تسکین و شیفتہ کے ہاں تازگی خیالات کے ساتھ فارسی ترکیبوں کا اثر غالب ہے، خصوصاً مومن اور غالب نے جہاں بے اعتدالی سے کام لیا ہے وہاں ان کا کلام رتبہ سے بہت گر گیا ہے، انھوں نے اور ان کے متبعین نے

معمولی معمولی مضمون کو اس طریقہ سے ادا کیا ہے جو سب سے نرالا ہے (ص۵۹)

بعض موقعوں پر شاہ نصیر کے استعارہ یا تمثیل پر پھبتی کا دھوکا ہوتا ہے، البتہ ذوق نے خیال آفرینی کے ساتھ اچھی اچھی تشبیہیں اور استعارے پیدا کیے ہیں اور ان سے بہت زیادہ حکیم مومن خاں اور مرزا غالب نے اس میں کاوش کی ہے اور بعض مقاموں پر جدت سے بھی کام لیا ہے (ص۹۱) شاہ صاحب کے بارے میں ان کا خیال ہے کہ شکوہ الفاظ کے ساتھ نئی نئی تشبیہیں اور استعارے اور زمینیں بھی نئی نئی نکالی ہیں جس میں شعر کا سرسبز کرنا ہر کسی کا کام نہیں (ص۲۰۹) ذوق کے متعلق وہ آزاد کی اس رائے سے متفق ہیں کہ عام جوہر ان کے کلام کا تازگی مضمون، صفائی کلام، چستی ترکیب، خوبی محاورہ اور عام فہمی ہے مگر رنگ مختلف وقتوں میں مختلف رہا (ص۲۵۸) مومن خاں نے جس قدر اسالیب بیان میں نزاکت ولطافت پیدا کر دی ہے وہ ان کی ذہانت اور جولانی طبیعت کا تماشا گاہ ہے، قصیدوں میں غزلوں میں مثنویوں میں ہر جگہ ان کا انداز بیان کیفیت سے خالی نہیں (ص۳۰۸)

مرزا غالب کے اہم خصوصیات و امتیازات حسب ذیل ہیں:۔

۱۔ مرزا نے اپنے تغزل کی بنیاد ایسے اچھوتے اسالیب پر رکھی ہے جن کو اور شعراء کی فکر نے مس تک نہیں کیا، وہ معمولی سے معمولی مضمون کو ایسے نرالے انداز سے ادا کرتے ہیں جو بالکل نیا معلوم ہوتا ہے، یہ ضرور نہیں کہ ہر ایک مضمون ان کا نیا ہی ہو۔

۲۔ عام اور مبتذل تشبیہیں جو عموماً شعراء کے کلام میں پائی جاتی ہیں، ان سے جہاں تک ہو سکتا ہے بچتے ہیں اور نئی نئی تشبیہیں پیدا کرتے ہیں۔

۳۔ متانت اور سنجیدگی کو شوخی اور ظرافت سے ایسا پیوست کرتے ہیں کہ دونوں مل کر شعر میں تڑپ پیدا کر دیتے ہیں، سودا اور انشا شوخی اور ظرافت میں غالب سے بڑھ کر

ہیں مگر جب وہ شوخی پر آتے ہیں تو متانت ان کے ہاں سے رخصت ہو جاتی ہے۔

۴۔ مرزا کے طرز ادا میں ایک خاص چیز ہے جو مومن کے سوا اوروں کے ہاں بہت کم دیکھی جاتی ہے، ان کا کلام ایسا پہلو دار ہوتا ہے کہ بادی النظر میں ان سے کچھ اور معنی مفہوم ہوتے ہیں مگر غور کرنے کے بعد دوسرے معنی نہایت لطیف پیدا ہوتے ہیں جس کی وجہ سے ان کا شعر ہمیشہ ایک نیا لطف دیتا ہے۔

سید انشا کے معاصر شیخ غلام ہمدانی مصحفی کی ہمہ گیر طبیعت نے کسی خاص رنگ پر قناعت نہیں کی، ان کے کلام میں کہیں میر کا درد ہے، کہیں سودا کا انداز، کہیں سوز کی سادگی اور جہاں کہیں ان کی کہنہ مشقی اور استادی اپنے پیش رو اساتذہ کی خوبیوں کو یکجا کر دیتی ہے تو وہ اردو شاعری کے بہترین نمونے قرار دیے جا سکتے ہیں، اس مجموعی حیثیت سے بقول حسرت موہانی میر و مرزا کے بعد کوئی استاد ان کے مقابلہ میں نہیں جنچتا اور یہ اپنے ہم عصروں میں سب سے برتر اور فائق نظر آتے ہیں۔ مصحفی پر انشا کو ترجیح دینے کی آزاد کی کوشش کی تردید کرتے ہیں اور کہتے ہیں انشا کی ذہانت اور طباعی میں کچھ شک نہیں مگر سخن سنجی اور مشاقی کے لحاظ سے انشا کو مصحفی کے مقابلہ میں لانا ہی مصحفی کی سخت توہین کرنا ہے، بذلہ سنجی اور ظرافت کے زور سے شاہ و وزیر کے دربار میں رسوخ حاصل کر لینا یا زبان آوری اور طباعی کی مدد سے مجلسوں کو گرما دینا اور چیز ہے اور اصول فن کو لیے ہوئے اصنافِ سخن میں سے ہر صنف پر قدرت کامل رکھنا اور سخن سنجی کا حق پورا پورا ادا کرنا اور بات ہے، یہی وجہ ہے کہ انشا کی گرم بازاری انھی کے ساتھ ختم ہو گئی اور مصحفی کے کمال کا سکہ اب تک رائج ہے (ص ۲۲۲)

مصنف گل رعنا کو اس کا سخت افسوس ہے کہ مصحفی جیسے باکمال شاعر کی جتنی قدر ہونی

چاہیے تھی لکھنؤ میں نہیں ہوئی وہ ان کی عظمت اور قادر الکلامی کے بڑے معترف ہیں، ان کے کمال فن کے ثبوت میں دو باتیں بطور خاص تحریر فرمائی ہیں:

(۱) جتنے استادان کے شاگردوں اور عقیدتمندوں میں سے نکلے اتنے آج تک کسی شاعر کو نصیب نہیں ہوئے شعرائے لکھنؤ کے جتنے بھی سلسلے ہیں وہ سب حضرت مصحفی کے منت پذیر ہیں، شیخ امام بخش ناسخ کو گو انکار ہو مگر اس میں کچھ شک نہیں کہ وہ بھی بواسطہ یا بلا واسطہ انہی کے مائدۂ سخن کے ریزہ چیں تھے، خواجہ حیدر علی آتش، میر مستحسن خلیق، میر مظفر حسین ضمیر، میر مظفر علی اسیر وغیرہ اس پایے کے لوگ ہیں جن کے دامن تربیت میں پرورش پاکر سینکڑوں استاد بن گئے، سب کو جانے دو میر خلیق کے فرزند میر ببر علی انیس اور میر ضمیر کے شاگرد مرزا سلامت علی دبیر کو لو جنھوں نے ہندوستان میں سخنوری کے ڈنکے بجائے ہیں اور اردو شاعری کو معراج کمال تک پہونچا دیا ہے۔

(۲) ان کی مشاقی و استادی کا ثبوت خود ان کا کلام ہے جو آٹھ دیوانوں میں مشکل سے سما سکا ہے، اگر یہ سچ ہے کہ مصحفی اپنی غزلیں بیچا کرتے تھے تو جتنا موجود ہے اس کا سوایا اور رہا ہوگا پھر اگر ان کے سارے دیوانوں میں سے صرف وہی اشعار چھانٹے جائیں جو ہر طرح سے بلند رتبہ ہیں تو انشا کے مجموعہ ہزل وغزل کے برابر ایک مجموعہ ان کے منتخب اشعار کا تیار ہو سکتا ہے (ص ۳۱۵)

اس کے مقابلے میں ان کے حریف سید انشا کے بارے میں مصنف گل رعنا کا خیال ہے کہ ان کے کلام میں کچھ ناگوار الفاظ اپنے ہم عصروں سے زیادہ ملتے ہیں، وہ ہر جگہ مینگا مشی کرتے ہیں، کہیں آزادوں کے لہجہ میں بولنے لگتے ہیں، کہیں رنڈیوں کی زبان میں گفتگو کرتے ہیں، کبھی پورب میں ہیں، کبھی پچھاں میں اور کسی جگہ ان کا رفیق زندگی یعنی تمسخر ان سے

جدا نہیں ہوتا (ص۵۳) اس کے باوجود مصنف گل رعنا کی حق و انصاف پسند طبیعت انکے جائز کمال کے اعتراف میں بخل سے کام نہیں لیتی، ملاحظہ ہو:

"بلا کے ذہین و ذکی تھے، تھوڑے دنوں میں فارسی، اس کے بعد عربی میں خاصی استعداد پیدا کرلی، طبابت کی طرف متوجہ ہوئے تو وہ ان کی خاندانی چیز تھی، شاعری کی طرف آئے تو آندھی کی طرح آئے، عربی، فارسی اور ریختہ تینوں زبانوں میں طبع آزمائی کی، بہارالدین آملی کی نان و حلوا کے جواب میں شیر و برنج تیار کی جو حقیقت میں بہت مزیدار ہے، نواب سعادت علی خاں کے شکار کا حال ایک مثنوی میں لکھا ہے، وہ بہت اچھی ہے۔ مگر زیادہ توجہ ریختہ کی طرف رہی اور اخیر اخیر میں اسی کو اپنے فضل و کمال کا جولان گاہ قرار دیا" (ص۲۴۹-۲۵۰)

امیر و داغ، جلال اور تسلیم وغیرہ کا تقابلی مطالعہ بھی ملاحظہ ہو۔

سچ یہ ہے کہ امیر و داغ اس دور آخر میں فلک شاعری کے آفتاب و ماہتاب تھے۔ ایک مضمون آفرینی کا دلدادہ تھا تو دوسرا بیان کی شوخی اور معاملہ نگاری پہ فریفتہ۔ امیر کے ہاں نازک خیالی کے ساتھ شکوہ انفاظ کی چاشنی بھی ملی ہوئی تھی اور مزہ یہ ہے کہ اس میں دقت پسندی کو وہ جائز نہیں رکھتے تھے، اہل فن کا اتفاق ہے کہ امیر اس فن کے مسلم الثبوت استاد تھے۔ وہ ایسی طبیعت لے کر آئے تھے جو شعر و انشا کے لیے موزوں تھی، انہوں نے تمام اصناف سخن پر طبع آزمائی کی ہے۔ اس پر کلام کا زور، مضمون کی نزاکت سے ہر جگہ دست و گریباں ہے، بندش کی چستی اور ترکیب کی درستگی، لفظوں کو خوبصورتی سے پہلو بہ پہلو جوڑتے ہیں، خیالات نازک اس طور پر باندھتے ہیں کہ اس باریک نقاشی پہ فصاحت آئینہ کا کام دیتی ہے (ص۳۰۳) داغ نے غزل کی زبان میں نہایت صفائی، وسعت

اور بانکپن پیدا کر دیا ہے، ان کے ہم عصروں میں کوئی بھی زبان کی صفائی، روزمرہ کی خوبی اور محاوروں کی روانی میں ان کا مثل نہیں، روزمرہ کی صفائی اور سادگی کے ساتھ طرز ادا کی شوخی اور بانکپن داغ کا حصہ ہے، غزل میں ان کو سب پر مزیت ہے (ص۸)

نواب مرزا داغ کا یہ حال بھی پڑھیے، حریف، ظریف، خوش طبع، رنگین مزاج زبان میں فصاحت و سادگی، بیان میں شوخی اور بانکپن، کلام کو دیکھو فصاحت اور محاورے کا دریا بہہ رہا ہے، حسن و عشق کے معاملات ہیں اور عاشق و معشوق کے خیالات، گویا اس میں شراب ناب کا سرور پیدا کرتے ہیں جس کو سن کر عوام سر دھنتے ہیں اور خواص مزہ لیتے ہیں۔ (ص۴۲۰ و ۴۲۱)

حکیم ضامن علی جلال کی زبان اور طرز ادا کو لکھنؤ کی روزمرہ اور طریقہ بیان کا بہترین نمونہ کہا جا سکتا ہے، طرز ادا میں ایک قسم کا لوچ جو اہل زبان کے ساتھ مخصوص ہوا کرتا ہے، جلال کے ہاں زیادہ پایا جاتا ہے، غزل میں داغ کے بعد ان کو سب پر مزیت ہے (ص۸) امیر اللہ تسلیم الفاظ کی رنگینی اور مضمون کی دلآویزی میں سب سے بڑھے ہوئے تھے اور مثنوی میں ان کو جو مرتبہ حاصل ہے اس میں ان کے ہم عصروں میں سے کوئی بھی ان کا شریک و سہیم نہیں، قصیدے میں بھی کچھ کم نہیں، تشبیہوں اور استعاروں کی برجستگی میں محسن کا کوئی ہم پلہ نہیں، جس زور و شور کے قصیدے لکھے وہ انھی کا حصہ ہے (ص۱۸) عام جوہر ان کے کلام کا مضامین کی بلند پروازی، الفاظ کا شان و شکوہ، بندش کی چستی، استعاروں کی رنگینی اور قصہ طلب تلمیحات ہیں جس میں ان کے معاصرین میں کوئی ان کا شریک نہیں، بلکہ اردو شاعری میں اس کا جواب نہیں (ص۴۵) راقم نے بے شمار مثالیں جمع کر دی ہیں، اور ابھی مزید اور بھی جمع کی جا سکتی ہیں، ان پر ایک طائرانہ نظر ڈالنے ہی سے اندازہ

ہوجاتا ہے کہ گلِ رعنا کا مصنف شعروادب کا بڑا عمدہ اور اعلیٰ ذوق رکھتا تھا، وہ لکھنؤ اور دہلی اسکول کی خصوصیات اور ان کے طرز و انداز سے باخبر تھا، اردو شاعری میں بالغ نظر تھا اور اس نے اس کا دقت نظر اور باریک بینی سے مطالعہ کیا تھا اور اسے خدا نے شعر فہمی اور کلام کی خوبی، لطافت، نزاکت، جاذبیت و تاثیر اور اچھے برے کی تمیز کا فطری ملکہ بخشا تھا اور وہ اچھے شعروں سے لطف اندوز ہوتا تھا۔

ہر دور کے کلام کی خوبی و خرابی سے واقفیت | یہ پہلے گذر چکا ہے کہ گلِ رعنا میں اردو شعرا کے تین طبقات قائم کیے گئے ہیں، متقدمین، متوسطین اور متاخرین۔ پھر ان تینوں طبقوں کو تین تین دور میں تقسیم کیا ہے، مصنف نے اپنی شعری و ادبی بصیرت و واقفیت اور شاعری کی تاریخ پر وسعت نظر اور شعر و سخن کے فطری اور خداداد ملکہ کے نتیجے میں ہر طبقہ کے ہر دور میں ہونے والی زبان کی اصلاح و ترقی کا عالمانہ و مبصرانہ اور ناقدانہ و محققانہ جائزہ لیا ہے، چند مثالوں سے اس کی وضاحت ہوگی۔

طبقہ متقدمین میں پہلے دور میں ان شاعروں کو بتایا ہے جن کی نشو و نما حیدرآباد اور بیجاپور میں ہوئی، اس دور میں اردو زبان عالم طفولیت میں تھی، دکنی الفاظ کثرت سے اس میں پائے جاتے ہیں، شمال ہند کے رہنے والوں کو ان کے اشعار کا بیشتر حصہ سمجھ میں نہیں آسکتا، اس دور اور دوسرے دور کے طریقہ بیان میں بھی کوئی ندرت نہیں ہے، سیدھے سادے انداز سے پیش پا افتادہ مضامین کو نظم کر دیا ہے ... دوسرے دور کے شعراء کی زبان منجتے منجتے بہت صاف ہوگئی ہے تاہم دکن کا لب و لہجہ اور کہیں کہیں الفاظ و روابط جو اہلِ دکن کے ساتھ مخصوص ہیں، ان لوگوں کے کلام میں پائے جاتے ہیں (ص۲۲)

ان دونوں دور کے شاعروں کا انداز بیان بہت صاف و سادہ ہے جو کچھ آنکھوں کے

سامنے دیکھتے ہیں، اور اس سے دل میں جو خیالات گزرتے ہیں، وہی زبان سے کہہ دیتے ہیں، ایچ پیچ کے خیالات دور دور کی تشبیہیں نازک استعارے نہیں بولتے۔ اسی واسطے اشعار صاف و بے تکلف ہیں (ص۱۴۱) اس طبقہ کے تیسرے دور میں شعرائے دلی شامل ہیں، انکے کلام میں بھی وہ الفاظ و روابط پائے جاتے ہیں۔ خلاصہ بحث کے طور پر فرماتے ہیں کہ بہر حال متقدمین کے خیالات میں ندرت نہیں ہے تو نہ ہو مگر ان کا انداز بیان بہت بے تکلف اور سیدھا سادا ہے اس میں شعرائے دکن و دلی میں باہم امتیاز نہیں (ص۱۴۲)

طبقہ متوسطین کے ہر ہر دور پر زیادہ تفصیل سے اظہار خیال کیا ہے اور اس میں زبان کی اصلاح و صفائی، متروک الفاظ کی فہرست اور ہر ہر دور کی خصوصیات وغیرہ کا ایسا مرقع پیش کیا ہے جس سے اس کی خوبی و بے اعتدالی اور اسلوب بیان کی ندرت وجدت وغیرہ اچھی طرح نمایاں ہوگئی ہے۔

طبقہ متوسطین کے پہلے دور میں مرزا مظہر، مرزا رفیع، میر تقی میر، خواجہ میر درد، میر سوز، قائم، یقین، بیان، حزیں، ہدایت، قدرت، بیدار، ضیا، ممتاز شعرا شامل ہیں، اس دور کے جو کارنامے اور خصوصیات بتائے ہیں ان کا لب لباب یہ ہے :

۱۔ زبان کی صفائی اور صحت میں پوری کوشش، بہت سے الفاظ و روابط جنھیں دلی اور اس کے ہم عصر بے تکلف کام میں لاتے تھے نکال ڈالے تاہم کچھ اجنبی اور نامانوس الفاظ رہ گئے، جیسے کیا کیا بجائے کس کس۔ ان نے بجائے اس نے، بہر نظر بجائے نظر بھر کے، دل اپنے کے بجائے اپنے دل کے، مجھ آنسو بجائے میرے آنسو، جس تس نے بجائے جس کسی نے، ایدھر اودھر بجائے اِدھر اُدھر، کہنے لاگا بجائے کہنے لگا، دیوانہ بیگانہ بجائے دیوانہ و بیگانہ، رقیباں بجائے رقیبوں کے انکھڑیاں، آنکھوں کی جگہ، سجن معشوق کے

معنوں میں، بیچ، اندر کے معنوں میں' دم کھا رہو، سانس نہ لو یعنی چپکے رہو' وغیرہ۔

۲۔ دل پذیر اور دلکش اور پسندیدہ محاورات جو فارسی میں دیکھے انہیں کہیں ترجمہ کرکے اور کہیں بجنسہ لے لیا ہے مثلاً تر دامن، پنبہ دہن، آتش زیر پا، دامن کوہ، گردن مینا دست سبو، سرو آزاد اور اسی طرح سینکڑوں الفاظ اور محاورے ہیں جنھیں اردو میں ایسی بے تکلفی سے کھپایا ہے کہ کہیں سے جوڑ نہیں کھلتا۔

۳۔ جو عاشقانہ مضامین غزلوں میں بہت پہلے سے بندھتے چلے آتے ہیں ان کو بہ تبدیل الفاظ و بہ تغییر اسالیب معمولی بول چال اور روزمرہ میں اس خوبصورتی سے ادا کیا ہے کہ بار بار پڑھیے اور مزے لیجیے، ان کی بندشیں اگلی بندشوں سے زیادہ چست اور لطیف اور ان کے محاورے اگلے محاوروں سے زیادہ دلآویز و دلکش ہیں۔ مذکورۂ بالا شعراء کے کلام سے اس کی مثالیں بھی دی ہیں۔

۴۔ اعتدال کے ساتھ تشبیہ و استعارہ سے کام لیا، صفت در صفت اور استعارہ در استعارہ کرکے کلام میں پیچیدگی نہیں پیدا کی۔ تشبیہ و استعارہ کو محاوروں کی رنگینی سے اس طرح کھپایا کہ شعر سُن کر اس کی گرمی اور جوش و خروش میں انسان ایسا محو ہو جاتا ہے کہ تشبیہ و استعارہ کی طرف فوراً ذہن منتقل نہیں ہوتا، یہی بات ان کی شاعری کی جان ہے۔

۵۔ سب سے پہلے اسی دور کے شعراء نے قصائد دھوم دھام سے لکھے اور ان کو اعلیٰ درجہ فصاحت و بلاغت پر پہنچا دیا، عاشقانہ مثنویاں جس شان کی لکھی ہیں اس کی نظیر اس دور سے پہلے نہیں ملتی، چو مصرعے مرثیہ کو مسدس کیا جس سے اس میں وسعت پیدا ہوگئی، میر نے واسوخت میں طبع آزمائی کی اور اس میں کمال دکھایا، ہجو گوئی کی ایسی نظیر

پہلے نہیں ملتی، مخمس، مربع، مثلث اور مستزاد غرض کہ جتنے اصناف سخن ہیں سب میں طبع آزمائی کی اور اردو شاعری کو ہر طرح مکمل کر دیا۔

۶۔ تناسب لفظی اور صنائع و بدائع کی دوسری قسمیں خصوصاً ایہام اور ذومعنین جو قدما کی شاعری کا مایۂ ناز ہیں ان کے دور کرنے میں بڑی کوشش کی اور اردو شاعری کو معراج کمال پر پہنچا دیا۔

۷۔ اصناف سخن میں ہر چیز کو پورے سلیقہ سے بیان کیا، قصیدوں، غزلوں میں جس طرح کے الفاظ، زبان، ترکیبیں، محاورے، روزمرہ اور مضامین و خیالات ہونے چاہئیں ان کو برتا اور کلام میں جوش و خروش، گرمی، تڑپ سوز و گداز اور دلآویزی پیدا کی اور دلچسپ اور دل پسند بحریں اختیار کیں۔ (ص ۵۲-۴۲)

متوسطین کے دوسرے دور میں شیخ غلام ہمدانی، میر غلام حسن حسن، شیخ قلندر بخش جرأت اور میر انشاء اللہ خاں انشا وغیرہ کے نام ہیں، اس دور کی یہ خصوصیات ہیں:

۱۔ ان لوگوں نے زبان کی صحت اور صفائی میں ایک قدم اور آگے بڑھایا اور بہت سے ناگوار الفاظ و روابط نکال ڈالے اور وہ ایک حد تک صاف و شستہ ہو گئی، تاہم پھر بھی کچھ الفاظ باقی رہ گئے، سید انشا کے کلام میں کچھ ناگوار الفاظ ہم عصروں سے زیادہ ملتے ہیں۔

۲۔ طرز بیان میں کوئی حسن و خوبی نہیں پیدا کی، ان ہی پھولوں سے گلدستے تیار کیے جو ان کے پیش رو جمع کر چکے تھے صرف اتنا کیا کہ شوخی و ظرافت کے ساتھ عاشقانہ شاعری میں حقیقت کے منہ سے نقاب کو ہٹا کر مجاز کو زیادہ نمایاں کیا۔ پاک اور بے لوث عشق کی جگہ ہوس پرستی کے جذبات کی تصویر کھینچی، جرأت، انشا اور رنگین نے ترقی دے کر

اس ناپاک طریقہ کی بنیاد ڈالی جس پر متاخرین نے بلند عمارتیں کھڑی کر دیں اور یہ رنگ اتنا مقبول ہوا کہ سنجیدہ اور پاکیزہ خیال دم بخود ہو کر رہ گئے۔

۳۔ ان کی رنگین طبیعت نے ریختہ سے ریختی کے شاخسانے کھڑے کر دیے، اس کے زندہ کرنے اور رواج دینے کا طرۂ افتخار مرزا سعادت یار خاں رنگین اور ان کے دوست سید انشاء اللہ خاں کے حصہ میں آیا۔

۴۔ اس عہد کا بہترین کارنامہ میر اثر کی مثنوی خواب و خیال اور میر حسن کی مثنوی گلزار ارم اور اس سے بھی بہتر ان کی دوسری مثنوی سحر البیان ہے جس کی خصوصیات پہلے بیان کی جا چکی ہے۔ (صفحہ ۵۶-۵۳)

اسی طبقہ کے تیسرے دور میں نصیر، ممنون، ذوق، ظفر، مومن، غالب، تسکین اور شیفتہ وغیرہ کا تذکرہ کیا ہے اور یہ خصوصیات بیان کی ہیں:

۱۔ سب سے بڑا کارنامہ زبان کی اصلاح اور درستی ہے جو نامانوس الفاظ دور دوم تک باقی رہ گئے تھے ان کو انہوں نے دور کر کے روزمرہ اور محاوروں کے ساتھ فارسی زبان کی نہایت لطیف اور خوش نما ترکیبوں سے اردو میں شیرینی اور گھلاوٹ پیدا کر دی۔

۲۔ ولی سے مصحفی تک عموماً انداز بیان میں صفائی، سادگی، روزمرہ کی پابندی، بیان میں گھلاوٹ اور زبان میں لچک پائی جاتی ہے، اس دور میں مضمون آفرینی کی بنیاد پڑی، زبان کا چٹخارہ، تازگی خیالات اور فارسی ترکیبوں کا اثر غالب ہے۔

۳۔ اچھی اچھی تشبیہیں اور استعارے پیدا کرنے کے باوجود شعر کی لطافت کو ہاتھ سے جانے نہیں دیا۔

۴۔ میر و مرزا سے لے کر مصحفی تک کے شعراء کا ایک محدود دائرہ ہے جس سے وہ بہت کم نکلتے ہیں، ان کی بڑی کوشش یہ ہوتی ہے کہ پہلے کے بندھے ہوئے مضمون کو ایسے بلیغ اسلوب سے ادا کیا جائے کہ اگلی بندشوں سے بڑھ جائے مگر اس دور کے شعراء میں سے مومن و غالب اور ان کے متبعین نے معمولی معمولی مضمونوں کو اس طریقہ سے ادا کیا ہے جو سب سے نرالا ہے' ان کا کلام ایسا پہلودار ہوتا ہے کہ بادی النظر میں اس سے کچھ اور معنی مفہوم ہوتے ہیں مگر غور کرنے کے بعد ایک دوسرے ہی نہایت لطیف معنی پیدا ہوتے ہیں جس کی وجہ سے انکا شعر ہمیشہ ایک نیا لطف دیتا ہے اور اس کے بار بار پڑھنے سے طبیعت نہیں اکتاتی۔ ان کے طرز ادا میں ایک خاص بات اور بھی ہے کہ اکثر موقعوں پر مضمون کے بعض اجزا کو چھوڑ جاتے ہیں، جس سے ایک خاص لطف پیدا ہو جاتا ہے۔ یہ وہ موقعے ہوتے ہیں جہاں سُننے والوں کا ذہن خود بخود اس جز کی طرف منتقل ہو سکتا ہے (صفحہ ۶۲-۵۷)

متاخرین کا پہلا دور ناسخ و آتش اور ان کے متبعین کا ہے، اسکی یہ خصوصیات ہیں:

۱۔ سب سے بڑا کارنامہ زبان میں تراش خراش کر کے بدمزہ اور ناگوار الفاظ نکال دینا ہے' ناسخ و آتش کے یہاں جو الفاظ رہ گئے ہیں وہ عجب نہیں کہ ان کا ابتدائی کلام ہو۔

۲۔ زبان کو صاف کرنے پر بھی غزل میں سادگی کا خیال نہیں رکھا، ایسی صنف لطیف میں عربی الفاظ رفتہ رفتہ کثرت سے داخل ہو گئے زبان میں شیرینی اور گھلاوٹ آنے کے بجائے وہ زیادہ ثقیل ہو گئی۔

۳۔ صنائع و بدائع کو قابلیت کا معیار بنا لینے سے شاعری اچھا خاصا سوانگ بن گئی۔

۴۔ تشبیہ و استعارہ میں حد اعتدال سے تجاوز کرنے سے زبان خیالی باتوں سے فقط توہمات کا سوانگ بن گئی، کلام بدرنگ اور بے مزہ ہو گیا اور شاعری گورکھ دھندا ہو گئی۔

۵۔ شاعری کے فطری اور لطیف جذبہ کو ضلع جگت کے ساتھ فحش اور گندے مضامین سے ناپاک کر دیا، قبول عام حاصل کرنے کو جامہ عریانی اختیار کر کے بے پردہ مضامین، سوقیانہ محاورے اور مبتذل الفاظ سے کلام کو پستی کی انتہائی حد تک پہنچا دیا اور ایسا رنگ اچھالا کہ ہولی کا سوانگ اور گنواروں کی کبیر مات ہو گئی۔

۶۔ البتہ اصلاح زبان کے لیے مساعی جمیلہ کر کے مفید خدمت انجام دی (ص ۶۹-۶۶)

متاخرین کے دوسرے دور یعنی داغ و امیر کا بھی اسی حیثیت سے مکمل جائزہ لیا گیا ہے اور آخر میں یہ مبصرانہ رائے قابل ذکر ہے۔

"خیالات کے اعتبار سے اس دور کے شعرا کا کلام پڑھو تو ان میں کسی طرح کی تازگی نہ پاؤگے، وہی گل و بلبل کی داستان، شمع و پروانہ کا قصہ، لیلیٰ و مجنوں کی کہانی، جفائے یار، رشک اغیار، شوق وصل، رنج و فراق، زلف پریشاں، چشم فتاں، نرگس بیمار، سیب زنخداں، رندی و بادہ خواری اور زاہدوں پر طعن و تعریض کے مضامین کو الٹ پھیر اور ردیف و قافیہ کے ادل بدل سے باندھ کر مختلف شکلیں پیدا کر لی ہیں، چاہو تو اسی کو ان کی شاعری کا کمال سمجھ لو کہ ان کے اساتذہ نے جن مضمونوں کو اپنے خاص انداز سے باندھا ہے انھوں نے اس میں فی الجملہ صفائی اور سادگی پیدا کر کے شکل بدل دی ہے یا یوں سمجھو کہ سانچہ بدل دیا ہے، پہلے جو چیز ایک شکل پر ڈھلی تھی وہ اب دوسری شکل پر ڈھل گئی ہے، جس میں بہ نسبت شعرائے دور اول کے کلام کسی قدر صفائی اور سادگی پائی جاتی ہے۔" (ص ۸۱)

گل رعنا کے مقدمہ میں عہد بعہد اردو شاعری میں ہونے والی ان اصلاحات و تغیرات کو بڑی تفصیل سے مثالیں دیکر سمجھایا ہے جس کو پڑھنے کے بعد اردو شاعری پر ان کی گہری نظر اور شعر و سخن کی ان کی مزاج شناسی اور سخن فہمی و نکتہ سنجی کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے۔

عباسی عہد کا مشہور زہدیہ شاعر۔ ابوالعتاہیہ

از جناب عبدالجبار صاحب علی گڑھ

نام وطن اور نسبت ابو اسحٰق اسمٰعیل بن قاسم بن سوید بن کیسان العنزی کی پیدائش سنہ ۱۳۰ھ میں عین التمر میں ہوئی، جو مورخین عین التمر کو حجاز کا حصہ مانتے ہیں وہ ابوالعتاہیہ کو عربی الاصل بتاتے ہیں اور جو اس کو عراق کا ایک علاقہ قرار دیتے ہیں ان کے نزدیک ابوالعتاہیہ عربی الاصل نہیں ہے۔

عنزی کہے جانے کی وجہ مورخین نے یہ لکھی ہے کہ جب سنہ ۱۲ھ میں حضرت ابوبکرؓ کے دور خلافت میں یہ علاقہ حضرت خالد بن ولیدؓ نے فتح کیا تو ابوالعتاہیہ کے جد امجد کیسان بھی قیدی بن کر آئے جن کو حضرت ابوبکرؓ نے عبادہ بن رفاعہ العنزی کو دیدیا مگر انھوں نے ان کو آزاد کر دیا تھا، اس طرح یہ ولاء کے اعتبار سے عنزی کہلانے لگے [1]

ابوالعتاہیہ کی وجہ تسمیہ صاحب اغانی نے لکھا ہے کہ ایک دفعہ خلیفہ مہدی نے کسی بات پر غصہ ہو کر اس سے کہدیا تھا کہ "انت انسان متحذلق معتّہ" (تو بے حیا مجنوں اور آوارہ گرد انسان ہے) اسی وقت سے لوگ اسے ابوالعتاہیہ کہنے لگے اور یہ لقب اتنا مشہور ہوا کہ اصل نام اور کنیت پر غالب آگیا [2]

نشوونما اس امر پر اتفاق ہے کہ ابوالعتاہیہ عین التمر میں سنہ ۱۳۰ھ میں اموی خلافت کے

۱؎ دائرۃ المعارف الاسلامیہ: ج ۴/ ص ۳۰۴ ۲؎ اغانی۔ ابوالفرج الاصبہانی ج ۴/ ص ۲۔

خاتمہ سے دو سال قبل پیدا ہوا لیکن اس کا خاندان کوفے میں کب منتقل ہوا اس کا کوئی ثبوت نہیں ملتا۔ غالب گمان یہی ہے کہ ۱۳۲ھ میں جب عباسی خلافت قائم ہوئی اور ابوالعباس السفاح نے کوفہ کو دارالخلافہ بنایا تو لوگ وہاں آکر آباد ہونے لگے۔

اس زمانے میں علماء و فضلاء کے علاوہ ہنرمند اور پیشہ ور لوگ بھی کوفہ میں وارد ہوئے، ابوالعتاہیہ کے والد مٹی کے برتن بنانے کی صنعت اور حجامت سے واقف تھے اس لیے وہ بھی کوفہ آکر آباد ہوئے، اس کی وجہ سے ابوالعتاہیہ کی نشو ونما یہیں ہوئی۔ اور جب وہ سن شعور کو پہونچا تو اس کا بھی میلان خاندانی پیشے کی جانب ہو گیا اور وہ گھڑا لوں کے ہاتھ بٹانے اور کوفے کی گلی کوچوں میں مٹی کے برتن بیچنے لگا۔ ممکن ہے اس کے اس پیشہ کی بنا پر لوگوں نے اس کو حقارت کی نگاہوں سے دیکھا ہو اور سماج میں اس کو کمتر سمجھا گیا ہو، اسی لیے آگے چل کر اس نے اپنی شاعری میں حسب و نسب پر تقوی و پرہیزگاری اور زہد کی فضیلت و برتری دکھائی ہے چنانچہ کہتا ہے کہ:

الا انما التقوی ھی العز والکرم و حبک للدنیا ھو الفقر والعدم

ولیس علی عبد تقی نقیصۃ اذا صحح التقوی وان حال او حجم[1]

(تقوی ہی میں اصل عزت و کرامت ہے، دنیا کی حرص و محبت میں فقر و محتاجی کے سوا کچھ نہیں ہے اور ایک متقی و پرہیزگار آدمی کے لیے یہ کوئی عیب کی بات نہیں ہے کہ وہ برتن بناتا یا حجامت کرتا ہے)

اس سے پتہ چلتا ہے کہ خاندانی وجاہت سے محرومی اور پیشے کی حقارت کا شاعر کو اس قدر احساس تھا کہ اس کا رجحان زہدیہ شاعری کی جانب ہو گیا۔

معاشرہ میں پستی کے اسی احساس نے ابوالعتاہیہ کے دل میں شدت اور تلخی پیدا

---

[1] اغانی: ابوالفرج الاصبہانی، ج ۴، ص ۶۔

کردی تھی اور وہ ارباب دولت وثروت اور حکمراں طبقے سے نفرت کرنے لگا تھا جس کا اظہار اس نے اپنی زہدیہ شاعری میں کھل کر کیا ہے۔

افلاس اور غربت نے شاعر کو اس کا موقع نہیں دیا کہ وہ زبان کے نوک پلک سے آشنا ہوتا اور متقدمین کلاسیکل شعراء کے کلام کا درس لیتا اور مطالعہ کرتا۔ اس کی وجہ سے کلام کا انداز سہل اور سادہ ہے جو زمانے کے بدلتے حالات کا تقاضا بھی تھا، اسی لیے ابونواس جیسے اہم شعراء بھی اسی انداز کو اپنا کر مقبول ہوئے۔

ابوالعتاہیہ کو شعروسخن کا خداداد ملکہ تھا، اس کی وجہ سے بہت جلد اس نے بڑے بڑے شعراء کی مجلسوں میں اپنی جگہ بنالی چونکہ ان شعری مجلسوں میں والبہ، ابونواس اور نمیری جیسے لہو ولعب کے دلدادہ اور شراب وکباب کے عادی شاعروں سے اسکی صحبت رہی اس لیے اس کی ابتدائی دور کی شاعری میں بھی یہی رنگ اور جوانی کی رنگینی ومستی کا اثر پایا جاتا ہے مگر اس کے ابتدائی دور کے کلام کا بڑا حصہ مفقود ہوگیا اور کوفہ میں گزری اس کی زندگی کا حال بھی نہیں ملتا۔

بغداد میں آمد شاہی دربار میں ابوالعتاہیہ کی رسائی اور بڑے بڑے شعراء کی ہم نشینی اس بات کا ثبوت ہے کہ کوفہ ہی میں اس کے کلام میں پختگی آچکی تھی اور شاعری کے فن میں وہ کمال حاصل کر چکا تھا۔

بغداد کی تعمیر کے بعد شاعروں، ادیبوں اور ارباب فن نے اسکی طرف رخ کیا اس لیے کہ اب کوفہ میں ان کی پذیرائی کا سامان نہیں رہ گیا تھا۔ یہ دیکھ کر ابوالعتاہیہ بھی اپنے بچپن کے دوست ابراہیم الموصلی مغنی کے ہمراہ بغداد آیا لیکن بدقسمتی سے اس کی رسائی دربار تک نہ ہوسکی اس لیے مجبوراً کوفہ واپس آگیا مگر اسکے دوست ابراہیم کی قسمت نے یاوری کی

اور وہ دربار میں باریاب ہوگیا اور جب اس کا اثر ورسوخ بڑھا تو ایک روز اس نے موقع پاکر خلیفہ سے ابوالعتاہیہ کی سفارش کی اور اس کو دوبارہ کوفہ سے بغداد بلوایا، ابوالعتاہیہ نے خلیفہ کی مدح میں ایک شاندار اور پُرزور قصیدہ لکھا جس کو ابراہیم مغنی نے جب خلیفہ اور اہل دربار کے سامنے گایا تو تحسین و مرحبا کی آوازوں سے دربار گونج اٹھا، چند اشعار ملاحظہ ہوں:

اتتہ الخلافۃ منقادۃ الیہ تجرر اذیالہا

ولم تک تصلح الا لہ ولم یک یصلح الا لہا

ولو رامہا احد غیرہ لزلزلت الارض زلزالہا[1]

(یعنی خلافت خلیفہ کے پاس مطیع اور فرمانبردار بن کر آئی ہے، نہ تو خلافت ہی کسی کے لیے زیب دیتی تھی اور نہ خلیفہ خلافت کے علاوہ کسی اور کام کے لیے موزوں تھا، خلیفہ کے علاوہ اگر کوئی دوسرا آدمی اس کا ارادہ بھی کرتا تو زمین کے اندر زلزلہ آجاتا یعنی زمین اس کو برداشت نہیں کرسکتی تھی)

یہ ایسا انوکھا تخیل تھا کہ تمام لوگ یہ اشعار سن کر حیران اور دم بخود رہ گئے۔ خلیفہ مہدی بھی بہت خوش ہوا اور خوب انعام و اکرام سے نوازا۔

اپنی شاعرانہ صلاحیتوں کی بنا پر ابوالعتاہیہ نے بہت جلد خلیفہ ہی کے دل میں اپنی جگہ نہیں بنائی بلکہ تمام بڑے بڑے وزراء و امرا، عمائد و ارکان سلطنت بھی اسکے فریفتہ اور گرویدہ ہوگئے، خلیفہ کے ماموں یزید بن منصور الحمیری سے اسکا اتنا گہرا تعلق ہوگیا تھا کہ اس نے اپنی نسبت عنزی چھوڑ کر ان سے اپنے کو منسوب کرنے لگا اور زندگی بھر ان کی مدح کرتا رہا۔

گو کوفہ ہی میں ابوالعتاہیہ کی شاعری چمک اٹھی تھی لیکن بغداد جیسے علم و فن کا ماحول

---

[1] ابوالعتاہیہ، احمد ہلالی، ص ۱۰۳۔

وہاں نصیب نہیں ہو سکا تھا۔ اس لیے اس کی شاعری کا اصل دور یہیں سے شروع ہوتا ہے اور دیکھتے ہی دیکھتے ابوالعتاہیہ نے وہ درجہ حاصل کر لیا کہ خلیفہ کا ہم نشین اور ہر وقت کا ساتھی ہو گیا، خوشی ہو یا غم، سفر ہو یا حضر، رات کی قصہ گوئی ہو یا تفریحی محفل ابوالعتاہیہ ہر موقع پر ساتھ رہتا۔ ایک مرتبہ خلیفہ مہدی کی بیٹی کا انتقال ہو گیا جس کا اس پر اتنا اثر ہوا کہ کھانا پینا بھی ترک ہو گیا، جب ابوالعتاہیہ کو اس کی خبر ہوئی تو یہ تعزیتی اشعار لکھ کر پیش کیا:

ما للجدیدین لا یبلی اختلافهما — وکل غض جدید فیهما بال

یا من سلا عن حبیب بعد میته — کم بعد موتک ایضا عنک من سال[1]

(دن رات کے آنے جانے سے گھبرانا نہیں چاہیے ہر دن ایک نئی آزمائش ہوتی ہے اور اے وہ شخص جس نے آج ایک حبیب کے مرنے پر تسلی دی ہے، تیری موت کے بعد کون کس کو تسلی دے گا)

جب خلیفہ نے یہ تعزیتی اشعار سنے تو کہا "بہت اچھا کہا تو نے تو ہمارے دل کی بات کہہ دی"۔ پھر انعام واکرام سے نوازا اور ہر شعر پر ایک ہزار درہم عطا کیے۔

خلیفہ ہادی سے وابستگی | ابوالعتاہیہ کا تعلق خلیفہ مہدی کے زمانے ہی سے ہارون الرشید سے ہو گیا تھا، اس لیے مہدی کے انتقال کے بعد جب ہادی تخت خلافت پر رونق افروز ہوا تو ابوالعتاہیہ کو خطرہ محسوس ہوا، کیونکہ ہادی کو معلوم تھا کہ اس کا رجحان ہارون کی طرف ہے، ابوالعتاہیہ نے اس کے تدارک کے لیے خلیفہ ہادی کی شان میں ایک شاندار مدحیہ قصیدہ لکھا اور اس کی توجہ اپنی طرف مبذول کرانے میں کامیاب ہو گیا۔ قصیدے میں اس نے اپنے خوف وہراس کا تذکرہ بھی کیا تھا۔

---

[1] اغانی لابوالفرج الاصبہانی ج ۴، ص ۳۔

الا شافع عند الخليفة يشفع فيدفع عنا شر ما نتوقع
يروعني موسى على غير عثرة الا انما موسى من العفو اوسع[1]

(کیا خلیفہ سے معافی مانگنے والا بخش دیا جاتا ہے اور کیا خلیفہ ہم سے متوقع مصیبت کو دور کر دیگا، بغیر کسی غلطی کے خلیفہ ہادی مجھے خوفزدہ کیے ہوئے ہے البتہ خلیفہ معاف کرنے میں بہت کشادہ دل ہے)

یہ ایک لمبا قصیدہ ہے جسے سن کر خلیفہ خوش ہوا اور باریابی کا موقع بخشا، جب خلیفہ کے یہاں ایک لڑکا پیدا ہوا تو اس کی خوشی میں خلیفہ کو یہ تہنیتی اشعار لکھ کر پیش کیے:

اكثر موسى غيظ حساده وزين الارض باولاده
وجاءنا من صلبه سيدا اصيد في تقطيع اجداده[2]

(خلیفہ نے اپنے حاسدوں کے غصہ کو اور زیادہ کر دیا اور زمین کو اپنی اولاد سے رونق بخشی، ہمارے پاس خلیفہ کی سلب سے ایک اور سردار آیا ہے جس نے اپنے آباء و اجداد کے قد کو اور سربلند کر دیا ہے۔)

خلیفہ ہارون الرشید کے دربار میں خلیفہ ہادی ایک سال چند ماہ بعد انتقال کر گیا۔ اس کے بعد ایک طویل عرصہ ابوالعتاہیہ نے خلیفہ ہارون الرشید کے ساتھ گزارا، یہی اس کا سنہرا دور کہلاتا ہے جس میں اس کی عظمت دوچند ہوئی اور اسی دور میں وہ دنیا سے کنارہ کشی اختیار کر کے زہد کی طرف مائل ہوا اور اسی میں اس کی شاعری کا وہ خاص رنگ ابھرا جس کو زہدیہ شاعری کہتے ہیں، اس زمانے میں اسے ابتلا سے بھی دوچار ہونا پڑا۔

ابوالعتاہیہ نے زہد کے اثر سے نہ صرف دربار سے کنارہ کشی اختیار کی بلکہ غزلگوئی

[1] اغانی: ج/۴/۵۶ [2] ابوالعتاہیہ۔ احمد بدانق، ص ۱۱۶

بھی ترک کر دی اس کی وجہ سے ہارون الرشید نے اس کو اور اس کے دوست ابراہیم الموصلی مغنی کو قید میں ڈال دیا اور دونوں کے درمیان ایک وسیع دیوار حائل کر دی تاکہ وہ ایک دوسرے سے مل نہ سکیں اور یہ حکم بھی صادر کیا کہ جب تک ابوالعتاہیہ غزل کہنے اور ابراہیم اس کو گانے کا عہد نہ کرے دونوں کو رہا نہ کیا جائے، اس تکلیف و مشقت کا اظہار ابوالعتاہیہ نے یوں کیا ہے:

ایا غمی لغمک یا خلیلی — ویا و یلی علیک او یا عویلی

یعز علی انک لا ترانی — وانی لا اراک ولا رسولی[1]

(اے دوست تیرے غم کی وجہ سے میرا غم اور بھی زیادہ ہو گیا ہے اور تیری مصیبت کی وجہ سے میرا واویلا اور زیادہ ہو گیا اور مزید برآں مشقت کا باعث یہ ہے کہ نہ تو مجھے دیکھ سکتا ہے اور نہ میں تجھے اور نہ میرا کوئی پیغام پہونچ سکتا ہے)

خلیفہ نے ایک مرتبہ ابوالعتاہیہ کے ساتھ قید میں اس کی نگرانی کے لیے ایک آدمی کو مامور کر دیا تھا تاکہ جو اشعار بھی یہ کہے نگراں اس کو لکھ کر خلیفہ کے پاس بھیج دے۔ اسی زمانے میں ابوالعتاہیہ نے جب یہ شعر کہے،

اما، واللہ ان الظلم لؤم — وما زال المسئ ھو الظلوم

الی الدیان یوم الدین نمضی — وعند اللہ تجتمع الخصوم[2]

(اللہ کی قسم ظلم کرنا گھٹیا پن ہے یعنی بادشاہ کے شایان شان نہیں ہے اور خطا کار ہمیشہ ظالم ہی ہوتا ہے روز قیامت اللہ کے سامنے پیشی ہوگی اور اسی کے سامنے ظالم و مظلوم پیش ہوں گے)

اور خلیفہ نے انہیں سنا تو اس پر رقت طاری ہو گئی اور اس کو رہا کر کے ایک ہزار

---

[1] دائرۃ المعارف: ص ۳۴۴ [2] اغانی: ج ۴/ص ۴۴۔

ینار عطا فرمائے۔

خلیفہ سے تعلق و قربت کے باوجود ابوالعتاہیہ کی اپنی ایک منفرد رائے ہوتی تھی اور
ہ معاشرہ کی موجودہ حالت اور روزمرہ کے واقعات کا تذکرہ بھی اشعار کے اندر کر دیتا تھا
س کی وجہ سے اسے متعدد بار قید و بند کی صعوبت جھیلنی پڑی۔

خلیفہ ہارون الرشید طبعاً حساس اور شکی واقع ہوا تھا، اس بنا پر ابوالعتاہیہ اکثر
خوف و رجا اور امید و بیم میں رہتا تھا، لیکن واقعہ یہ ہے کہ خلیفہ شاعر کو اور شاعر خلیفہ کو
بہت زیادہ محبوب تھے، یہی وجہ ہے کہ شاعر خلیفہ کی مدح سرائی میں حد سے تجاوز بھی
کر جاتا تھا۔ خلیفہ سے اس کو جس قدر تعلق تھا اس کی بنا پر اسکے اس سلسلے کے اشعار
شاہکار رہے ہوں گے لیکن افسوس کہ اس دور کا کلام محفوظ نہیں رہا ورنہ ممکن تھا کہ
وہ زہدیہ شاعری کی طرح غزلیہ شاعری کا بھی امام ہوتا اور ابونواس وغیرہ کو پیچھے چھوڑ جاتا۔

ابوالعتاہیہ مہدی سے لے کر مامون تک کے طویل زمانے میں جو تقریباً نصف صدی
پر مشتمل ہے چھایا ہوا نظر آتا ہے، لیکن پورا شعری سرمایہ زمانہ کی دست برد کی نذر ہو گیا
صرف چند چیزیں ہی ملتی ہیں جو خلیفہ کی مدح سرائی میں ہیں۔

خلیفہ مامون سے ابوالعتاہیہ کی وابستگی | خلیفہ ہارون کے انتقال کے بعد امین خلیفہ ہوا
مگر اس کے قتل کے بعد زمام سلطنت مامون کے ہاتھوں میں آگئی۔

امین کے قتل کے وقت اس کی ماں سیدہ زبیدہ اس کے پاس بغداد ہی میں تھی
اسے فکر لاحق ہوئی کہ معلوم نہیں مامون اس کے ساتھ کیا برتاؤ کرے، اس لیے اس نے
ابوالعتاہیہ سے اشعار لکھنے کی فرمائش کی تاکہ وہ مامون کے غیظ و غضب سے محفوظ رہے۔
ابوالعتاہیہ نے اس کی فرمائش پر ایک بہترین قصیدہ لکھا جس کے چند اشعار یہ ہیں:

الا ان صرف الدھر یدنی و یبعد ویمتع بالالاف طورا ویفقد

اقول لریب الدھر ان ذھبت ید فقد بقیت والحمد للہ احمد

اذا بقی المامون لی فالرشید لی ولی جعفر لم یفتقد ومحمد[1]

(بے شک زمانہ کی گردش کبھی قریب ہو جاتی ہے اور کبھی دور اور کبھی گردش ایام ہزاروں میں کھیلنے کا موقع دیتی ہے اور کبھی تنگ دست بنا دیتی ہے، میں گردش زمانہ سے کہوں گا کہ میرا اگر ایک مددگار چل بسا ہے تو الحمد للہ احمد تو باقی ہے اور جب مامون باقی ہے تو وہ میرے لیے رشید کی طرح ہے اور جعفر و محمد بھی ابھی باقی ہیں)

خلیفہ مامون ان اشعار کی وجہ سے زبیدہ سے خوش ہو گیا اور اس کے پاس ہدایا بھیجے اس کے علاوہ انہیں اپنے پاس آنے کی دعوت بھی دی، جب زبیدہ مامون کے پاس گئیں تو یہ کہا:

الحمد للہ لئن فقدت ابنا خلیفۃ فلقد اعتضت ابنا خلیفۃ۔

اگرچہ میں ایسے بیٹے کو جو کہ خلیفہ تھا کھو چکی ہوں لیکن الحمد للہ دوسرا خلیفہ بیٹا میں نے حاصل کر لیا ہے۔

مامون نے کہا:

ما تلد النساء مثل ھذہ فما ذا ابقیت فی ھذا الکلام لبلغاء الرجال

کسی عورت نے تجھ جیسی کو جنم نہیں دیا تو نے ماہرین زبان کے لیے اس میں کوئی گنجائش نہیں چھوڑی۔

مامون نے شعر کہنے والے کا نام دریافت کیا، زبیدہ نے جواب دیا کہ ابوالعتاہیہ

---

[1] کتاب بغداد: ابن طیفور، ص ۱۹۔

مامون نے پوچھا کہ اس کو کتنا انعام دیا؟ زبیدہ نے کہا کہ "بیس ہزار درہم" مامون نے بھی بیس ہزار دینے کا حکم فرمایا[1]

اس واقعہ کے بعد ابوالعتاہیہ کا دربار سے مستقل تعلق ہوگیا اور کبھی کبھی خلیفہ اس سے ان اشعار کو سنتا جو اس نے موت اور دنیا کی بے ثباتی کے بارے میں کہے ہیں، مثلاً:

انساک محیاک المماتا ۔۔۔ فطلبت فی الدنیا الثباتا

اوثقت فی الدنیا وانـ ـــــت تریٰ جماعتہا شتاتا[2]

(تجھ کو تیری زندگی نے موت سے غافل کر دیا پس تو دنیا میں ثبات کا طلب گار بن بیٹھا یا تو دنیا پر بھروسہ کر بیٹھا حالانکہ تو جانتا ہے کہ دنیا کا شیرازہ منتشر ہوتا رہتا ہے۔)

خلیفہ مامون علم دوست اور علم نواز نہ تھا بلکہ علم و ادب کا اچھا ذوق بھی رکھتا تھا خاص طور پر فن شاعری سے اس کو زیادہ دلچسپی تھی، یہی وجہ تھی کہ وہ بڑے بڑے شعراء پر بلا جھجک تنقید کر دیا کرتا تھا، ایک مرتبہ ابوالعتاہیہ نے خلیفہ کی موجودگی میں کچھ اشعار سنائے تو ابوالعتاہیہ بھی تنقید سے نہ بچ سکا، جب ابوالعتاہیہ نے کہا:

ما احسن الدنیا و اقبالہا ۔۔۔ اذا اطاع اللّٰہ من نالہا

من لم یواس الناس من فضلہا ۔۔۔ عرض للادبار اقبالہا[3]

(دنیا اسی وقت اچھی ہے جب اس کو پانے والا اللہ کا فرمانبردار ہو اور جو دنیا پانے کے بعد غریبوں کی ہمدردی اور غمخواری نہ کرے اس سے دنیا پیٹھ پھیر لیتی ہے)

جب خلیفہ مامون نے یہ اشعار سنے تو کہا کہ "پہلا شعر عمدہ ہے لیکن دوسرے

---

[1] ابوالعتاہیہ احمد ابراہیم، ص ۱۵۵ [2] اغانی، ج ۴/۴۲ [3] ابوالعتاہیہ: احمد ابراہیم، ص ۱۵۷۔

شعر میں کوئی خاص بات نہیں ہے کیونکہ دنیا سب ہی سے پیٹھ پھیر لیتی ہے خواہ وہ غریبوں کی مدد کرے یا بخل سے کام لے، البتہ لوگوں کی غمخواری سے اس کو ثواب ملے گا اور بخل سے گناہ"۔ ابوالعتاہیہ نے کہا" صدقت یا امیر المومنین اھل الفضل اولی بالفضل واھل النقص اولی بالنقص"۔ یہ سن کر خلیفہ نے اعتراف حق کے صلہ میں اس کو دس ہزار درہم دینے کا حکم فرمایا، غرض مامون کے عہد میں بھی اس کی پذیرائی اور قدردانی کا سلسلہ جاری رہا مگر اسی دور میں اس کو اچانک موت نے اپنی آغوش میں لے لیا۔ والبقاء للہ وحدہ۔

ابوالعتاہیہ کے اخلاق و عادات ابوالعتاہیہ کے والد عسیر الحال تھے، عسرت ہی کی وجہ سے وہ آبائی وطن چھوڑ کر کوفہ میں متوطن ہوئے، ابوالعتاہیہ سن رشد کو پہنچا تو اس کو اس بات کا احساس رہ رہ کر ستاتا تھا کہ ہم دینی اور دنیوی وجاہت سے محروم ہیں، نسبی حیثیت سے وہ موالی میں تھا اور پیشے کے اعتبار سے بھی عام اور خزاف، یہ احساس اس کو زندگی بھر دامن گیر رہا، ممکن ہے زہد کی طرف اس کے میلان کی ایک وجہ یہ بھی رہی ہو، ایک زمانے میں اس کا زیادہ وقت لہو ولعب میں گزرتا تھا اس کا اور اس کی بعض دوسری عادتوں کی وجہ سے تذکرہ نگاروں کا خیال ہے کہ وہ اچھے اخلاق و سیرت کا حامل نہ تھا۔ علاوہ ازیں اس کے ابتدائی دور کے کلام میں فحش، یاوہ گوئی اور بے راہ روی کا رنگ غالب تھا جس کا سلسلہ ہارون الرشید کے زمانے تک باقی رہا۔ اس کے بعد وہ زہد کی طرف مائل ہوا اور آخر تک اسی رنگ میں اس کا کلام ڈوبا رہا۔

مگر حالات کے ساتھ ساتھ اس کے عادات و اطوار کے اندر بھی خوشگوار تبدیلی پیدا ہوتی رہی، لیکن وہ ہمیشہ شاعرانہ ذوق و طبیعت کا مالک رہا اور شعراء جن اوصاف

سے متصف ہوتے ہیں وہ بھی ان سے متصف رہا۔

ابو العتاہیہ کا عقیدہ خلافت عباسیہ خصوصاً ہارون الرشید اور مامون کے زمانے میں مذہبی اور فکری آزادی کی وجہ سے بغداد مختلف افکار و مذاہب کا مرکز بن گیا تھا جس کا اثر لامحالہ لوگوں کے عقائد و افکار پر بھی پڑا اور نومسلم تو خاص طور پر ان رجحانات سے متاثر ہوئے، ابو العتاہیہ پر بھی ان افکار کا اثر انداز ہونا اس لیے مستبعد نہیں ہے کہ اس کا نہ کسی ممتاز علمی و دینی خانوادہ سے تعلق تھا اور نہ دینی علوم کی تحصیل کی اسے مہلت ملی، تاہم وہ صحیح العقیدہ مسلمان تھا۔ اس کے بیٹے محمد بن ابو العتاہیہ کا بیان ہے کہ جس وقت میرے والد نے عتبہ کے بارے میں یہ اشعار کہے :

کان عتابۃ من حسنہا ‎ دمیۃ قس فتنت قسہا

یارب لو انسیتہا بما ‎ فی جنۃ الفردوس لم انسہا[1]

(گویا کہ عتبہ اپنے حسن جمال میں کسی بت خانہ کی تصویر ہے جس پر پادری فریفتہ ہو گیا ہے اے خدا اگر میں یہاں اس کو بھول بھی جاؤں تو جنت الفردوس میں میں اس کو کیسے بھول سکونگا)

منصور بن عمار نے جب یہ اشعار سُنے تو ابو العتاہیہ کے زندیق ہونے کا فتویٰ صادر کر دیا اور کہا کہ یہ شخص جنت کی توہین کرتا ہے اور اپنے اشعار میں جنت و دوزخ کا تذکرہ نہیں کرتا صرف موت کا تذکرہ کرتا ہے، جب ابو العتاہیہ کو یہ معلوم ہوا تو اس نے منصور کے پاس یہ اشعار لکھ کر بھیجے :

ان یوم الحساب یوم عسیر ‎ لیس للظالمین فیہ نصیر

فاتخذ عدۃ لمطلع القبر ‎ وھول الصراط یا منصور

---

[1] اغانی : ج ۴ / ۵۳۔

(قیامت کا دن بہت سخت ہے، جہاں ظالم لوگوں کا کوئی مددگار نہیں ہوگا، اے منصور قبر جو کہ پہلی منزل ہے اور پلصراط کی ہولناکی سے بچنے کی تیاری کر)

منصور بن عمار کو جب ان اشعار کا علم ہوا تو اپنے قول سے رجوع کر لیا اور کہا کہ:

اشهد کمران ابا العتاهية	میں اس کی گواہی دیتا ہوں کہ ابوالعتاہیہ
قد اعترف بالموت والبعث	نے موت اور ما بعد الموت کا اقرار کر لیا
ومن اعترف بذالک فقد	ہے اور جس نے اس کا اعتراف کر لیا تو وہ
بریٔ مما قذف بہ[1]	اس تہمت سے بری ہوگیا۔

ایک مرتبہ ہارون الرشید نے ابوالعتاہیہ سے کہا کہ لوگ تمہیں زندیق سمجھتے ہیں ابوالعتاہیہ نے کہا، حضور میں کیسے زندیق ہو سکتا ہوں جبکہ میرا قول ہے کہ:

ایا عجبا کیف یعصی الالہ	ام کیف یجحد الجاحد
وفی کل شیٔ لہ ایۃ	تدل علی انہ واحد[2]

(کتنے تعجب کی بات ہے کہ اللہ کی نافرمانی یا اس کا کوئی انکار کرے، جبکہ ہر جگہ ہر شے کے اندر اس کی نشانیاں بھری پڑی ہیں کہ وہ ذات واحد ہے)

اس قسم کے بہت سے اشعار کی وجہ سے وہ زندیقیت سے بری ہو جاتا ہے تاہم اس میں شبہ نہیں کہ اس کے بعض اشعار میں مسلم عقائد کے خلاف باتیں بھی ملتی ہیں مگر ان کو دینی علوم سے اس کی ناواقفیت پر محمول کرنا چاہیے، تذکرہ نگاروں نے اس بارے میں مختلف اقوال نقل کیے ہیں، بعض کے خیال میں وہ فلاسفہ کے مذہب کو مانتا تھا جو بعث و نشور پر یقین نہیں رکھتے اور وجہ یہ بتاتے ہیں کہ اس کے اشعار میں

[1] ابوالعتاہیہ۔ عبداللطیف شراره۔ ص ۴۵۔ [2] ایضاً

موت وفنا کا ذکر نہیں ملتا، بعض نے زندقہ اور الحاد کی نسبت اس کی طرف کی ہے، ابن المعتز نے ابوالعتاہیہ کو ان مانوی عقائد سے متاثر بتایا ہے جو اس وقت بغداد میں رائج تھے۔

بعض کا قول ہے کہ وہ شیعہ تھا، چنانچہ ایک جگہ کہتا ہے کہ "اگر تمہیں کسی شریف اور پاکباز انسان کی تلاش ہے تو جس نے درویشوں کا لباس پہن رکھا ہے اس کی طرف رجوع کرو":

اذا اردت شریف الناس کلھم　　　　فانظر الی ملک فی زی مسکین[1]

اس قسم کے اشعار سے ابوالعتاہیہ کا اشارہ امام موسیٰ کاظم اور دوسرے شیعی ائمہ کی طرف ہوتا تھا، یہ بھی کہا جاتا ہے کہ وہ خلق قرآن کا قائل تھا اور اس کا جھکاؤ معتزلہ کی طرف تھا[2]، غرض مورخین اور تذکرہ نگاروں کے ان متضاد اقوال کی وجہ سے کسی نتیجہ پر پہنچنا مشکل ہے۔

ابوالعتاہیہ کا بخل تراجم و تذکرہ کی کتابوں میں ابوالعتاہیہ کے بہت سے اشعار ایسے ملتے ہیں جن میں بخل کی مذمت اور اس سے بچنے کی تلقین کی گئی ہے، مثلاً:

الحرص لؤم ومثلہ الطمع　　　　ما اجتمع الحرص قط والورع[3]

(حرص و طمع بہت بری چیزیں ہیں، تقویٰ و پرہیزگاری اور طمع و حرص ایک جگہ جمع نہیں ہو سکتیں)

ایک جگہ کہتا ہے:

اذا المرء لم یعتق من المال نفسہ　　　　تملکہ المال الذی ھو مالکہ

الا انما مالی الذی انا منفق　　　　ولیس لی المال الذی انا تارکہ[4]

(جب انسان اپنے نفس کو مال سے آزاد نہیں کرتا تو مال اس کا مالک بن جاتا ہے جب کہ وہ اس کا مالک تھا، بیشک میرا مال وہی ہے جس کو میں خرچ کر دیتا ہوں اور جس کو میں چھوڑ جاتا ہوں وہ میرا مال نہیں ہے)

---

[1] اغانی: ج ۴/ ۱۰ [2] ایضاً [3] ابوالعتاہیہ: سید احمد برانق، ص ۶۷ [4] اغانی ج ۴/ ۱۸۔

ثمامہ نے پوچھا کہ یہ مضمون تونے کہاں سے حاصل کیا ہے، ابوالعتاہیہ نے جواب دیا
حضورؐ کے فرمان "انما لک من مالک ما اکلت فافنیت ولبست فابلیت او اعطیت
مضیت" سے ثمامہ نے کہا کہ کیا تم حضورؐ کے اس فرمان کو حق مانتے ہو، ابوالعتاہیہ نے
کیوں نہیں۔ ثمامہ نے کہا پھر بھی اپنے گھر اتنا مال جمع کرتے ہو کہ نہ اسے خود کھاتے ہو
نہ اس کی زکوٰۃ دیتے ہو۔ ابوالعتاہیہ نے کہا ابو معن تم ٹھیک کہتے ہو، لیکن میں فقرو
فہ اور لوگوں کا محتاج اور دست نگر ہونے سے ڈرتا ہوں۔ ثمامہ نے کہا اس سے بڑھ کر
یری کیا ہوگی کہ تو ہمیشہ محزون ہی رہتا ہے اور خود اپنی ذات پر خرچ کرنے میں بھی
ل سے کام لیتا ہے، میری اس بات کا جواب دینے کے بجائے وہ کہنے لگا کہ عاشورہ کو
شت خریدا تھا اس کے پانچ درہم ابھی تک ادا نہیں ہوسکے، اسے سن کر مجھے بے اختیار
سی آگئی کہ اللہ نے اسلام کے لیے اس کا سینہ نہیں کھولا ہے۔[1]

معد بن عیسیٰ نے ابوالعتاہیہ سے پوچھا کہ کیا تم اپنے مال کی زکوٰۃ نکالتے ہو؟ اس نے
ا جو کچھ میں اپنے اہل وعیال پر خرچ کرتا ہوں وہ میرے مال کی زکوٰۃ ہی تو ہے، معد نے
ا زکوٰۃ کا مال فقراء ومساکین کے لیے ہوتا ہے، ابوالعتاہیہ کا جواب یہ تھا کہ اگر میں اپنے
ل وعیال پر خرچ کرنا بند کردوں تو ان سے بڑھ کر فقیر روئے زمین پر کوئی نہ رہے گا۔[2]

اسی طرح کے دوسرے واقعات بھی کتابوں میں مذکور ہیں جن کی بنا پر بعض لوگوں
ے اس کے زہد کے بارے میں بھی شک وشبہ کیا ہے، لیکن اس کی مختلف تاویلیں
ا گئی ہیں، جیسے افضل زہد وہ ہے جو مالداری کے ساتھ ہو چنانچہ اس کا شعر ہے:

افضل الزھد زھد کان عن جدۃ   وافضل العفو عفو عند مقدرۃ

---

[1] دائرۃ المعارف۔ فواد افرام البستانی ج ۴/ ۴۴۳ [2] اغانی ج ۴/ ۲۱۔

لیکن عجیب بات یہ ہے کہ ادب کی کتابیں بخلا کے قصوں اور نوادرات سے بھری پڑی ہیں، اسی زمانے کے مشہور ادیب وانشا پرداز جاحظ نے کتاب البخلا لکھی لیکن اس نے یا کسی اور ادیب نے بھی ابوالعتاہیہ کو بخلا کی فہرست میں شمار نہیں کیا۔

ابوالعتاہیہ کا معاشقہ عشق و محبت بھی شاعر کی ایک پہچان بن گئی ہے اور بعض شعرا، نے فرضی محبوبوں پر اپنی غزلیہ شاعری کی بنیاد رکھی ہے۔ ابوالعتاہیہ بھی متعدد بار عشق و محبت کے دام میں گرفتار ہوا اور نامراد رہا جس کی بنا پر اسے عورتوں سے نفرت اور دنیا سے بیزاری ہوگئی۔ تذکرہ نگاروں کا خیال ہے کہ عشق و محبت کی ناکامی نے ابوالعتاہیہ کی زندگی میں انقلاب پیدا کر دیا اور اس نے زہد کو اپنا اوڑھنا بچھونا بنالیا، ابوالعلاء معری کہتا ہے:

الله ینقل من شاء رتبة بعد رتبة
ابدی العتاهیة نسکا وتاب عن حب عتبة

(اللہ تعالی جس کو چاہتا ہے ایک مرتبہ سے دوسرے مرتبہ کی طرف منتقل کر دیتا ہے، ابوالعتاہیہ نے زہد کا اظہار کیا اور عتبہ کی محبت سے تائب ہوگیا۔)

ابوالعتاہیہ کی ادبی یادگاریں اور معاصرین کی رائیں ابوالعتاہیہ کے شعری اکتسابات کا سرمایہ نہایت وافر تھا، ابن ندیم نے الفہرست میں اس کے ۲۲ یا ۲۳ شعری مجموعوں کا تذکرہ کیا ہے[1] لیکن یہ سب بادحوادث کی زد سے محفوظ نہیں رہے۔ خطیب بغدادی کا بیان ہے کہ:

وهو احد من سار قوله	ابوالعتاہیہ ان شعرا میں سے تھا
وانتشر شعره وشاع ذكره	جس کا کلام اور تذکرہ ہر خاص و عام

---

[1] الفہرست، ابن ندیم، ص ۲۳۳۔

ویقال ان احداً لم یجتمع له	کہا جاتا تھا اور یہ بات بھی کہی جاتی ہے
دیوانه لعظمه[1]	کہ اس کا کلام اتنا زیادہ تھا کہ کوئی اسے
	جمع نہیں کر سکا۔

ابوالفرج اصبہانی نے بھی کتاب الاغانی میں متعدد اقوال نقل کر کے اس کے شعری سرمایے کی کثرت و اہمیت دکھائی ہے، ایک جگہ لکھتا ہے کہ مشہور ہے۔

اطبع الناس بشار بن برد	شعراء میں سب سے زیادہ ماہر اور جودت
والسید الحمیری وابوالعتاهیة	طبع والے بشار، سید الحمیری اور ابوالعتاہیہ
وما قدر احد علی جمع شعر	ہیں اور ان کے اشعار کی کثرت کی بنا پر
هؤلاء لکثرته[2]	کوئی ان کو جمع نہیں کر سکا۔

حرمازی نے ایک مرتبہ ابوالعتاہیہ کو یہ کہتے ہوئے سنا: "لو شئت ان اجعل کلامی شعر الفعلت[3] کہ اگر میں چاہتا تو اپنا پورا کلام شعر ہی بنا دیتا۔ رجاء بن مسلم نے سلم الخاسر سے کہا، من اشعر الناس؟ (سب سے بڑا شاعر کون ہے؟) اس نے جس کے یہ اشعار ہیں:

کل نفس عند میتتها	حظها من مالها الکفن
ان مال المرء لیس له	منه الا ذکره الحسن[4]

(آدمی کا حصہ اس کے مال میں سے مرتے وقت صرف اتنا ہی ہے جس سے اس کا کفن ہو سکے اور انسان کے مال سے صرف اس کا ذکر خیر ہی باقی رہ جاتا ہے۔)

بشار بن برد نے بھی اس کو اپنے زمانہ کا سب سے بڑا شاعر کہا اور ابونواس سے

تاریخ بغداد، خطیب بغدادی، ج/۶/ ۲۵۰ [2] اغانی ج/۴/ ۱۳ [3] ایضاً [4] ایضاً۔

جب کوئی سوال کرتا کہ تم بڑے شاعر ہو یا ابوالعتاہیہ ؟ تو وہ یہی جواب دیتا :

واللہ ما رایتہ قط الا | یعنی جب بھی میں نے اس بارے میں
ظننت انہ سماوی وانا ارضی | سوچا تو مجھے یہی لگا کہ وہ شعروادب کے
 | آسمان پر ہے اور میں زمین پر ۔

ابوتمام نے ابوالعتاہیہ کے مندرجہ ذیل پانچ شعروں کو بے نظیر اور لاجواب قرار دیا ہے :

الناس فی غفلاتھم ورحی المنیۃ تطحن

لوگ غفلت کی نیند میں سوئے ہوئے ہیں، حالانکہ موت کی چکی ان کو پیستی جارہی ہے ۔

الم تر ان الفقر یرجی لہ الغنی وان الغنی یخشی علیہ الفقر

کیا تو نے کبھی غور کیا کہ جب آدمی فقیر ہوتا ہے تو وہ غنی کا طلب گار ہوتا ہے اور جب مالدار ہوتا ہے تو فقر وفاقہ سے ڈرتا ہے ۔

ولما استقلوا باثقالھم وقد ازمعوا للذی ازمعوا

جب انسان کی ذمہ داریاں کم ہوتی ہیں تو وہ جس کام کا بھی ارادہ کرلیتا ہے اس کو کرگزرتا ہے ۔

قرنت التفاتی باثارھم واتبعتھم مقلۃ تدمع

جب میں نے ان کے آثار قدیمہ کی طرف توجہ کی اور ایک نظر ادھر دیکھا تو میری آنکھوں میں آنسو بھر آئے ۔

ھب الدنیا تصیر الیک عفوا الیس مصیر ذالک الی زوال[1]

---

[1] ابوالعتاہیہ : عبدالطیف شرارہ، ص ۳۵ ۔

۵۔(جتنا ہو سکے صدقہ خیرات کر، یہ دنیا خود بخود تیرے پاس چلی آئے گی اور کیا اس کا انجام زوال نہیں ہے۔)

اس سے پتہ چلتا ہے کہ ابوالعتاہیہ اپنے دور کا ہی نہیں ما بعد کا بھی ایک بہت اچھا اور کامیاب شاعر تھا جس کی عظمت کا لوہا اس کے ہم عصر اور بعد کے شعرا بھی مانتے تھے، اسے جو مقبولیت اور خلفا و وزرا کے درباروں سے جو انعام و اکرام حاصل ہوا وہ اسکے ہم عصروں کو نصیب نہیں ہو سکا۔

ابوالعتاہیہ کی وفات خلیفہ مامون کے عہد میں ۲۱۳ھ میں وہ پیٹ کے مرض میں مبتلا ہوا اور جاں بر نہ ہو سکا، جب اسے وقت آخر کا احساس ہو گیا تو اس نے اپنے دوست مخارق سے یہ اشعار گانے کی فرمائش کی۔

اذا ما انقضت عنی من الدھر مدتی　　فان عزاء الباکیات قلیل

سیعرض عن ذکری وتنسیٰ مودتی　　ویحدث بعدی للخلیل خلیل[1]

جب کہ میں نے ایک زمانہ یہاں پر گزارا ہے پھر بھی رونے والیوں کی تعداد اتنی کم ہے، میرے دوست بھی میرے تذکرے سے اعراض کریں گے اور تو بھی میری محبت کو بھلا دے گی اور ہر دوست کو میرے بعد اور دوست مل جائیں گے۔

صاحب اغانی نے محمد بن ابوالعتاہیہ کے حوالہ سے لکھا ہے کہ سب سے آخری اشعار جو میرے والد نے مرض الموت میں کہے وہ یہ ہیں:

الٰھی لا تعذبنی فانی　　مقر بالذی قد کان منی

ومالی حیلۃ الا رجائی　　وعفوک ان عفوت وحسن ظنی

---

[1] ابوالعتاہیہ: عبداللطیف شرارہ، ص ۳۵۔

یظن الناس بی خیراً وانی لشر الناس ان لم تعف عنی[1]

"خداوندا! مجھے عذاب مت دینا، اس لیے کہ مجھے اپنے تمام گناہوں کا اعتراف واقرار ہے اور میرے لیے بجز امید وحسن ظن اور تیری معافی کے بشرطیکہ تو معاف کر دے کوئی حیلہ وتدبیر نہیں ہے، لوگ میرے بارے میں اچھا خیال کرتے ہیں حالانکہ میں سب سے برا انسان ہوں اگر تو نے معاف نہیں کیا"

سن وفات میں مختلف اقوال ہیں، بعض نے ۲۱۳ھ، بعض نے ۲۱۱ھ اور ایک قول ۲۰۹ھ کا بھی ہے لیکن اس میں اتفاق ہے کہ عہد ماموتی میں انتقال ہوا اور بغداد کے غربی جانب حیال قنطرۃ الزیاتین نامی قبرستان میں دفن کیا گیا۔ (باقی)

---

[1] اغانی: ج ۴/۱۱۳۔

مولانا شبلی کی بعض کتابوں کے نئے ایڈیشن

سیرۃ النبی: حصہ اول، دوم۔ یہ دونوں کتابیں کمپیوٹر سے کمپوز کرکے حال ہی میں شایع ہوئی ہیں۔ ان میں غلطیوں کی تصحیح اور مکمل حوالوں کی تخریج کے علاوہ اشاریے اور ببلوگرافی کا اضافہ بھی شامل ہے۔ قیمت حصہ اول مجلد ۱۹۰ روپے۔ حصہ دوم مجلد ۱۹۰ روپے

الغزالی: یہ کتاب بھی مدت دراز سے ختم تھی، اب کمپیوٹر سے کمپوز ہوکر اسکا صاف ستھرا اور پاکیزہ ایڈیشن نکلا ہے۔ قیمت مجلد ۱۲۰ روپے

الفاروق: چند برس پہلے مولانا کی اس مہتم بالشان کتاب کا عکسی ایڈیشن شایع ہوا ہے۔ قیمت ۹۵ روپے

المامون: ہی کے زمانے کا ابو العتاہیہ مشہور شاعر ہے۔ مامون اور اسکے عہد کے حالات اور ادبی وعلمی مجلسوں کی روداد مولانا کے سحر نگار قلم سے مطالعہ کے لائق ہے۔ قیمت ۵۰ روپے۔

"منیجر"

مکتوبات صدی کے نسخہ عہد مصنف کا عکسی ایڈیشن

از جناب شمیم منعمی صاحب

مکتوبات صدی کسی تعارف کی محتاج نہیں، شاید ہی مکتوبات کے کسی مجموعہ کو وہ شہرت ور مقبولیت ملی ہو، جو کہ مکتوبات صدی کو نصیب ہوئی۔ یہ مکتوبات زبان و بیان، مضامین مطالب اور موضوع و مقصد کے اعتبار سے شاہکار ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہر بڑی اور چھوٹی ائبریری میں بشرطیکہ اس کا تعلق مخطوطات سے ہو، اس کے کئی کئی خطی نسخے مل جاتے یں۔ خود اس مجموعۂ مکتوبات کے مکتوب نگار حضرت مخدوم جہاں شیخ شرف الدین احمد یحییٰ نیری (م ۷۸۲ھ) کے عہد میں اس کے متعدد نسخے تیار ہو چکے تھے۔ چنانچہ مکتوبات صدی کے مشہور و معروف نسخے کے مرتب حضرت زین بدر جو کہ مکتوب نگار کے مرید خاص بھی ہیں، اسی مکتوبات صدی کے مقدمے میں اس زمانے (۷۴۰ھ) کے بارے میں لکھتے ہیں جب کہ مکتوبات قلم مخدوم سے برآمد ہو رہے تھے:

"ایں مجموعہ خدمت گاران و خادمان کہ دراں محل حاضر بودند ازاں مکتوبات انتساخ کردند و بدیں ترتیب مرتب گردانیدند تا باشد کہ روزے وقتے توفیق رفیق شاں گردد و بعمل مقرون گردانند"۔

انہیں میں سے ایک نسخے کا دعویٰ کرتے ہوئے خدابخش لائبریری پٹنہ نے اسکا عکسی ایڈیشن (FACSIMILE EDITION) شایع کیا ہے۔ اس ایڈیشن میں

تعارف کے عنوان سے مشہور مورخ پروفیسر سید حسن عسکری صاحب مرحوم کے اسی نسخے سے متعلق دو مقالے بزبان انگریزی شامل کیے گئے ہیں اور تقدم/پیش لفظ کے عنوان سے علوم مشرقیہ کے مشہور عالم مولانا سید شاہ محمد اسمٰعیل صاحب مدظلہٗ کی ۱۲ صفحات پر مشتمل تحریر ہے، جس سے نسخے کے مطالعہ میں رہنمائی حاصل ہوتی ہے۔ اس کے علاوہ "حرفے چند" کی سرخی سے اس وقت کے لائبریری کے ڈائریکٹر عابد رضا بیدار صاحب کی تین صفحات پر مشتمل نگارش ہے۔

مگر افسوس ہے کہ مکتوبات صدی کا زیر تبصرہ عکسی ایڈیشن غیر ذمہ داری اور بے پروائی سے مرتب ہوا ہے، جس کا اندازہ ہماری درج ذیل معروضات سے ہوگا۔

① بیدار صاحب حرفے چند کے تحت فرماتے ہیں:

"مکتوبات صدی، فوائد رکنی، خوان پر نعمت، ارشاد الطالبین، ارشاد السالکین، معدن المعانی، مخ المعانی، عقائد شرفی، شرح آداب المریدین، راحت القلوب، سہ صدی مکتوبات، مکتوبات جوابی حضرت شیخ یحییٰ منیری کے اصل فارسی متن چھپ چکے ہیں۔" (ص۵)

یہ غیر ذمہ دارانہ اطلاع ہے کیونکہ "فوائد رکنی" اور "شرح آداب المریدین" کا مکمل فارسی متن ہنوز غیر مطبوعہ ہے۔ شرح آداب المریدین کے صرف ایک حصے کا اصل فارسی متن مع حاشیہ ملا غلام یحییٰ بہاری شایع ہوا تھا۔

② "مکتوبات صدی، ارشاد الطالبین، ارشاد السالکین، فوائد رکنی، خوان پر نعمت شرح آداب المریدین، معدن المعانی مونس المریدین، اوراد شرفی، عقیدۂ شرفی، سبیل رشاد (دو جلدوں میں ۱۰۱ مکتوبات کا ترجمہ از مکتوبات دو صدی) اردو ترجمہ

میں آچکی ہیں" (ص ۴)

(الف) شرح آداب المریدین کا اردو ترجمہ آنا تو دور اس کا مکمل اردو ترجمہ آج تک ہوا بھی نہیں ہے چہ جائیکہ شایع ہونا۔ اس کی صرف ایک جلد کا اردو ترجمہ منظر عام پر آیا ہے جو کہ ۱۶ فصول کی شرح پر محیط ہے جبکہ آداب المریدین اور اس کی شرح ۲۴ فصول پر محیط ہے۔

(ب) "اوراد شرفی" حضرت مخدوم جہاں کی جانب اوراد کے تین مجموعے منسوب ہیں۔ (۱) اوراد کلاں (۲) اوراد اوسط (۳) اوراد خورد۔ ان کے علاوہ مکتوبات و ملفوظات میں بھی خال خال اوراد و ظائف مذکور ہیں۔ اوراد شرفی کے نام سے بہت بعد میں کسی بزرگ نے مخدوم کے مذکورہ بالا اوراد و ظائف کی تلخیص و تخریج و ترتیب فرمائی ہے اس لیے مخدوم کے مکتوبات و ملفوظات کے ساتھ اوراد شرفی کا ذکر میرے خیال میں درست نہیں ہے۔

(ج) مکتوبات دو صدی کا مکمل یکجا اردو ترجمہ خانقاہ معظم بہار شریف کے مکتبہ شرف سے شایع ہو چکا ہے، اس سے بے خبری افسوسناک ہے، اس میں ۲۰۸ مکتوبات کا اردو ترجمہ موجود ہے۔

(د) "فواید المریدین" کے اردو ترجمہ کی اشاعت سے اب تک خدا بخش لائبریری کا انفارمیشن سیکشن بے خبر ہے۔

۳ * مندرجہ ذیل تصانیف ابھی شایع نہیں ہوئی ہیں۔

مکتوبات دو صدی، مکتوبات بست و ہشت، اجوبہ و اسئلہ، رسالہ مکیہ اشارات شرفی، رسالہ ذکر مخدوم الملک، رسالہ مرآۃ المحققین، رسالہ وجودیہ، رسالہ وصول الی اللہ، گنج لایفنی، ملفوظ الصفر، ملفوظات شرف الدین یحییٰ منیری،

انیس العشاق، اسباب النجاۃ، رسالہ در ہدایت حال تحفہ غیبی، لطائف معانی، ملفوظات زاد راہ۔" (ص ۵)

(الف) پتہ نہیں اس سے ان کتابوں کے متن کے شایع نہ ہونے کی طرف اشارہ ہے یا ترجمہ کے؟

(ب) اگر متن مراد ہے تو اطلاعاً عرض ہے کہ مکتوبات دو صدی، مکتوبات بست و ہشت اور رسالہ اجوبہ کاکوی کے اصل فارسی متن بہت پہلے شایع ہو چکے ہیں، قیاس غالب ہے کہ انکے مطبوعہ نسخے خدا بخش لائبریری میں بھی موجود ہوں گے۔

(ج) اگر اردو ترجمہ کے شایع نہیں ہونے کی اطلاع دی جارہی ہے تو ذہن صاف ہو جانا چاہئے کہ "مکتوبات دو صدی" اور "مکتوبات بست و ہشت" کا مکمل اردو ترجمہ خانقاہ معظم بہار شریف کے مکتبہ شرف سے کئی سال پہلے چھپ چکا ہے۔

(د) اجوبہ کے نام سے مخدوم کے دو الگ الگ رسالے ملتے ہیں (۱) اجوبہ کلاں (۲) اجوبہ خورد۔ یا (۱) اجوبہ زاہدیہ (۲) اجوبہ کاکویہ۔

(ھ) "اشارات" کے ساتھ "شرفی" کی نسبت کسی نسخے میں نظر سے نہیں گزری۔

(و) اسباب النجاۃ کا پورا نام "اسباب النجاۃ لفرقۃ العصاۃ" ہے۔

(ز) لطائف معانی دراصل معدن المعانی کی ہی تلخیص ہے۔

(ح) ملفوظ السفر، گنج لایفنی، ملفوظات شرف الدین یحییٰ منیری(؟)، تحفہ غیبی ملفوظات کے مجموعے ہیں، انہیں تصانیف کے زمرے میں لکھنا درست نہیں۔

(ط) پیش کردہ فہرست بھی نامکمل ہے۔

(۵) "مخدوم صاحب ۶۶۱ھ میں پیدا ہوئے تھے[۱]

---

[۱] مخدوم صاحب محقق نادر بیگس کے خیال میں صحیح تاریخ سنہ ۶۹۹ھ کے آس پاس ہے۔ ص ۸

فادر جیکسن نے یہ خیال کہاں ظاہر کیا، اس کی وضاحت ضروری تھی، بغیر وضاحت کے اس اطلاع کا نقل کرنا صحت مند اختلاف نہیں ہے۔

⑤ " مکتوبات صدی کئی بار چھپ چکا ہے اصلاً بھی، ترجمتاً بھی لیکن خدا بخش لائبریری اور خاص کر اس صدی کو یہ شرف حاصل ہونا تھا کہ مکتوبات صدی کا سب سے قیمتی نسخہ اس کے مکمل عکسی اڈیشن کی شکل میں آپ تک پہنچانے کا شرف حاصل کرے۔" (ص۶)

(الف) یہ علمی دنیا کی بدقسمتی ہے کہ متن اور ترجمے کی اشاعت کا سلسلہ تو جاری ہے لیکن آج تک مکتوبات صدی کا باضابطہ ایڈٹ نسخہ منظر عام پر نہ آسکا، خدا بخش لائبریری اپنے غیر معمولی وسائل و ذرائع کی بنا پر اس اہم فریضے کو بخوبی ادا کر سکتی ہے، لیکن یہ امر افسوسناک ہے کہ نامکمل متن اور ناقابل قرأت حاشیے کی ہو بہو اشاعت پر خود کو مشرف سمجھا جا رہا ہے۔

(ب) نسخہ موصوفہ و مذکورہ ناقص الطرفین ہے، صرف حاشیے کی بنا پر عام نسخوں سے ممتاز ہے لیکن یہ حاشیے بھی اکثر ناقابل قرأت ہیں الا ماشاء اللہ۔

⑥ " متن کے حواشی کی وجہ سے مکتوبات صدی کا یہ نسخہ خصوصی اہمیت اختیار کر گیا ہے۔ یہ حواشی ایک خیال کے مطابق حضرت مظفر شمس بلخی اور ایک خیال کے مطابق جس کے شواہد قوی تر ہیں، حسین معز بلخی (حسین نوشہ توحید) کے قلم سے ہیں۔" (ص۶)

(الف) حواشی کی خصوصی اہمیت مسلم لیکن اسے پیش کرنے والے کتنی اہمیت دے رہے ہیں یہ ان کے پیش کرنے کے انداز سے نمایاں ہو جاتا ہے فرماتے ہیں :-

" حواشی کی ایک صاف نقل آج کی کتابت میں دی جا رہی ہے، اگر کوئی حاشیہ جدید خط میں نہ ملے تو آپ خود ان نقول کی روشنی میں پڑھنے کی زحمت گوارا فرمالیں کہ نقل کرنے میں بہت سے حواشی چھوٹ بھی گئے ہیں۔" (ص۶)

(ب) حواشی اور ان کی جدید خط میں نقول کا عالم یہ ہے کہ بعض نقلیں ایسی ہیں کہ محولہ ورق پر وہ حاشیہ عکس میں ندارد ہے۔ مثلاً صـ۲۸ پر ایضاً کے اشارے کے ساتھ جدید خط میں آخری حاشیہ" مخدوم جہاں را عرضداشت کردہ شد آدم علیہ السلام ..." سے شروع ہوتا ہے، جس کے بارے میں یہ اطلاع دی گئی ہے کہ متن کے ورق (۴، اب) پر موجود حاشیہ کی نقل ہے۔ جبکہ ق ۴، اب پر یہ حاشیہ ندارد ہے۔ دراصل یہ حاشیہ ق ۴، ا پر ہے لیکن اسے صرف کتابت کی غلطی اس لئے نہیں مانا جاسکتا ہے کہ اس سے قبل جو حاشیے جدید خط میں لکھے گئے ہیں وہ بھی" ق ۴، اب" ہی کے ہیں۔

(ج) اسی منظوم حاشیے کا اختتام جدید خط میں یوں ہوتا ہے۔

" مخدوم نبشتہ شدہ بیت اگر سلام آسان بدے ہر کسے چو شبلی و سلمان بدے
تا نگر دی تو مسلماں از دروں (کے خواہی) شد مسلماں از بروں"

لیکن یہ عبارت اور یہ بیت مذکورہ بالا اصل حاشیے (ق ۴، ا) میں سرے سے نہیں ہے، پتہ نہیں یہ تحریف کیونکر ممکن ہو سکی۔

(د) از یں قبیل صـ۲۹۷ اور صـ۲۹۸ پر جدید خط میں حواشی کی نقول کے تحت عکس متن کے ق ۷، الف کے حوالے سے یک سطری و چہار سطری منجملہ ۲ عدد حاشیے کی نقلیں پیش کی گئی ہیں۔ جبکہ عکس متن کا" ق ۷، الف" نکال کر دیکھئے تو ان میں سے ایک بھی حاشیے کا وجود نہیں ہے اور اس امید پر بھی نہ رہیے کہ یہ حاشیے" ق ۷، ب" پر مل جائیں گے۔

(۸) ایسی مثالیں متعدد ہیں، صرف نمونے کے طور پر چند پیش کر دی گئیں۔

(۹) ایسے حواشی کی تعداد بھی بہت بڑی ہے جو عکس میں موجود ہیں لیکن جدید خط میں پیش کی گئی نقل میں ان کا ذکر ندارد ہے۔

(باقی)

اخبار علمیہ

سائنس کی بعض تحقیقات، مذہب و معاشرت میں وقتاً فوقتاً اضطراب پیدا کرتی رہتی ہیں، اس سال کی جس سائنسی تحقیق نے عالم انسانیت میں شور و غلغلہ بپا کر رکھا ہے وہ عمل کلون ہے، اسکاٹ لینڈ کے ایڈن برگ میں روجن انسٹی ٹیوٹ کے سائنس دانوں نے ڈاکٹر ولیمس کی رہنمائی میں ایک مادہ بھیڑ کے تھن سے ایک خلیہ لیکر اس سے ایک جین (ڈی این اے) کا جوہر نکالا اور ایک دوسری بھیڑ کے رحم میں نشوونما پانے کے لیے داخل کر دیا، بچہ ہوا تو وہ اسی بھیڑ کا ہم شکل و ہم رنگ تھا، اس کامیاب تجربے کے بعد امریکہ کے ایک سائنسداں نے اسی عمل کا تجربہ بندر پر کیا اور وہ بھی کامیاب ثابت ہوا، اس نے یہ بھی کہا کہ یہ صرف ایک خلیہ تک محدود نہیں، بلکہ ایک مادہ کے متعدد خلیوں سے بیک وقت متعدد ہم شکل پیدا ہو سکتے ہیں، وہ بیک وقت آٹھ ہم شکل بندروں کی پیدائش کا منصوبہ بنا چکے ہیں، جانوروں کے بعد اب انسانوں کی باری ہے، تجربہ گاہوں میں ایک رنگ روپ بلکہ یکساں عقل و عادت کے ہم شکل انسانوں کی پیدائش کی خواہش کا اظہار کیا جا رہا ہے، یہی نہیں ماضی قریب میں موت کی آغوش میں پہنچنے والے ممتاز افراد کی نقل مطابق اصل کی تیاری کی تمنا بھی ہے، ظاہر ہے انسانی معاشرہ میں ان بے شمار ہم شکلوں کی موجودگی سے انتشار، عدم تعارف اور بے شمار ایسے مسائل کا امکان ہے، جن سے سماجی اور عائلی زندگی کا شیرازہ منتشر ہو سکتا ہے۔

اگرچہ سائنسداں اس عمل کے بعض مثبت پہلوؤں مثلاً بڑھاپا اور بعض مہلک امراض کا علاج اور بعض ادویات جدیدہ کی ترغیب دے رہے ہیں مگر اہل نظر کی نگاہ اس نفع قلیل کے مقابل اثم کبیر پر ہے، چنانچہ مختلف مذاہب کے افراد و ادارے اس تجربہ کے خلاف ہیں، خود یورپ کے اکثر ملکوں نے انسانی کلون کی تحقیق پر پابندی عائد کر دی ہے، بعض اسلامی ملکوں میں بھی علماء نے اس کی قباحت ظاہر کی ہے، گو وہ کلیسا کی مانند زیادہ خائف نہیں، بعض صوفیہ کے تذکروں میں عالم مثال میں ہمرسو ہم شکلوں کے ظہور کی روایتیں ملتی ہیں، لیکن دلچسپ بات یہ ہے کہ انتشار پسند اور بے سمت مغربی معاشرہ بھی اس تجربہ کے خلاف ہے تاہم مغرب کے ہم جنس اس کے حق میں ہیں، ان کا کہنا ہے کہ SA-MESEX کی تخلیق مکرر کی راہ میں یہ تحقیق معاون ثابت ہوگی، نیویارک کے ایک تاجر رنیڈ ولف وکرنے تو کلون رائٹس یونائٹیڈ فرنٹ نامی ایک محاذ بھی قائم کیا ہے، انکا کہنا ہے کہ "عوام کو تخلیق مکرر (REPRODUCTION) کا حق ہے، ہم اسی حق کا دفاع کریں گے، اگر کسی شخص کو اپنے مماثل اور بعینہ اسی شکل کے انسان کی خواہش ہے تو اس کو پیدا ہونے کا حق ملنا چاہیے"۔

فلکیات میں یہ تازہ انکشاف بھی سائنسی خبروں میں نمایاں رہا جسے "آسمانی فنگر پرنٹ" کا نام دیا گیا ہے۔ عرصہ سے انسان کے ذہن میں آسمانوں سے پرے کال کوٹھریا (بلیک ہول) کا تصور موجود ہے، اب ان کا وجود ایک حقیقت بن چکا ہے گو ان کی کنہ و حقیقت اب بھی مبہم ہے تاہم کیفیت مجہول نہیں ہے، اب ہبل کی مشہور رصدگاہ میں ایک ماہر فلکیات نے اپنے مشاہدہ کی بنیاد پر بتایا کہ یہ بلیک ہول ہر بڑی کہکشاں کے مرکز میں واقع ہیں اور یہ گیس اور کوکبی مادہ نضلہ کو اپنے اندر بڑی تیزی سے جذب کرتے ہیں۔

ہبل کی دوربین سے تین بلیک ہولوں کا مشاہدہ کیا گیا، ان میں ایک سورج سے نصف بلین گنا زیادہ وسیع و عریض ہے، پندرہ کہکشاؤں میں چودہ کال کوٹھریوں کا پتہ لگ چکا ہے آئن سٹائن کے نظریہ اضافیت کے سلسلہ کی اب تک یہ سب سے وقیع مشاہداتی تحقیق قرار دی گئی ہے۔

حیرت کدہ افلاک میں دم دار ستاروں کا ظہور، انسان کی چشم بصیرت کے لیے خاص تجسس کا باعث بنتا رہا ہے، عوام خواہ ان ستاروں سے خائف ہوں لیکن ماہرین فلکیات ان کے ظہور و دید کے مشتاق ہی رہتے ہیں، گزشتہ سال ایک روشن ترین دمدار تارہ' برف کے گولے کے مانند سورج کے مدار میں اس انداز سے طواف و رقص میں مصروف تھا کہ لگتا تھا وہ فنافی الشمس ہو جائے گا، لیکن ایسا ہوا نہیں وہ قریباً ۳۴ ملین کیلومیٹر کے فاصلہ پر رہا، البتہ اس کی تابانی سورج کی حدت سے بڑھتی رہی زمین پر اس کا کھلی آنکھوں سے مشاہدہ کیا گیا، جب یہ زمین سے پندرہ ملین کیلومیٹر کے فاصلہ پر ۲۰۰...۳۴ کیلومیٹر فی گھنٹہ کی رفتار سے گزرا تو ریکارڈ کے مطابق یہ زمین سے قریب ترین گزرنے والا روشن ترین ستارہ قرار دیا گیا، آسمانی دھول اور برف اور خدا جانے کن عناصر کا مرکب تارہ اب اس راہ سے دس بیس ہزار سال بعد دوبارہ گزرے گا۔ عین اس کے ظہور کے وقت امریکا کے دو ماہرین فلکیات ایلن ہیل اور تھومس باپ نے کہکشاں میں ایک اور دمدار ستارہ کا مشاہدہ کیا اور حساب لگا کر بتایا کہ سال ڈیڑھ سال بعد وہ آسمان دنیا پر اس شان سے ظاہر ہوگا کہ ہر صاحب بصارت اس کا بآسانی نظارہ کر سکے گا، اس سال یہ دم دار ستارہ واقعتاً ظاہر ہوا، ہندوستان شمال مشرق کے رخ پر اس کا مشاہدہ کیا گیا، ہیل باپ کے ناموں سے موسوم یہ

دم دار تارہ اب قابل دید فلکی تماشہ دکھا رہا ہے، جیسے جیسے یہ سورج سے دور ہوتا جاتا ہے، منوں اور ٹنوں کی مقدار میں یہ نامیاتی کیمیائی فضلہ اگل رہا ہے جو سائنسدانوں کی نظر میں زندگی کے لیے بڑا کارآمد سامان ہے، یخ بستہ پانی، ہائیڈروکاربن اور دوسرے نامیاتی سالماتی مادوں کی وافر ترین مقدار ہے جو زندگی کی آفرینش کے لیے ضروری ہے۔ یہ تصور تو پہلے بھی تھا کہ ان ستاروں میں برف، کوکبی فضلہ اور کیمیائی عناصر کائنات کی بیرونی سطح پر زمہریری منطقوں میں یخ بستہ رہتے ہیں، سورج کی زد میں آنے کے بعد یہی عناصر گرمی سے پگھل پگھل کر خارج ہونے لگتے ہیں اور اسی کو ستاروں کی دم سمجھا جاتا ہے لیکن دوسرے دمدار ستاروں اور ہیل باپ میں فرق کیا ہے؟ اس کا جواب ہاپکن یونیورسٹی کیلی فورنیا کے ہیرالڈ ویور نے دیا کہ فرق حجم کا ہے، ہیل باپ کا حجم ۱۹ سے ۲۵ میل ڈائی میٹر کا ہے، اس سے پہلے کسی دم دار تارے کا اتنے قریب سے مشاہدہ نہیں کیا گیا جبکہ اس دمدار تارے کی سطح بھی صاف دیکھ لی گئی ہے، اسی لیے اس کی دریافت سب سے اہم ہے۔ ڈاکٹر ویور نے ایک سائنسی جریدہ میں یہ بھی لکھا کہ ساڑھے چار لاکھ بلین سال پہلے نظام شمسی کی تشکیل جس کوکبی بادل کے مادہ سے ہوئی تھی اسی مادہ سے ان دمدار ستاروں کی بھی تکوین ہوئی، سورج سے دوری کی وجہ سے ان کا یہ مادہ اب تک غیر متغیر اور اصل شکل میں موجود ہے، اب اگر ان کے علم میں کامیابی حاصل ہوتی ہے تو یہ جواب بآسانی مل جائے گا کہ اس نظام شمسی کی تشکیل میں کن عناصر کی شمولیت تھی۔

علم سماوات اور تخلیق انسانی کی ہوش ربا داستانوں سے الگ یہ خبر بھی عبرت اثر ہے کہ گزشتہ دنوں ایران میں رضا شاہ پہلوی کے اس عدیم المثال خزانہ کی ایک نمائش

بینک ملی میں ہوئی جس کی بنیاد پر سابق شاہ نے ۱۹۶۷ء میں خود کو شاہ شاہاں کا لقب دیا تھا، اس نمایش میں تخت طاؤس اور تاج کیکاؤس نے ملوکیت رفتہ اور جمہوریت موجودہ کا فرق بھی اہل نظر پر واضح کردیا، بینک ملی کی طلسماتی عمارت میں الماس، یاقوت، زمرد، نیلم، موتی اور جواہرات ہزاروں کی تعداد میں نگاہوں کو خیرہ کر رہے تھے، دنیا کے تمام تراشیدہ ہیروں کا قریباً یہ نصف حصہ تھا، انچ وٹ سے بڑے زمرد دنیا کی کسی تاریکی کو منور کر سکتے تھے، اس میں ۵۰۰ قیراط کا دنیا کا سب سے بڑا یاقوت بھی تھا، دریائے نور نامی گلابی اور بے داغ جوہر جو ۱۷۵ سے ۱۹۵ قیراط وزنی تھا خاص طور پر مرکز نگاہ تھا اور سب سے بڑھ کر جواہرات سے مرصع تخت طاؤس تھا جو نادر شاہ کے ہاتھوں دلی سے ایران گیا تھا، اپنی تابانیوں کے پس منظر میں کتنے سیاہ بختوں کی داستان بھی سنا رہا تھا ایک اور اہم اور قابل دید شے ایسا گلوب بھی تھا جس میں زمین کے تمام سمندروں کو زمردوں اور بر اعظموں کو یاقوت، نیلم جیسے ہیروں سے مرصع کر کے دکھایا گیا تھا، اس میں ۵۱ ہزار سے زیادہ جواہرات جڑے ہوئے تھے، اس الف لیلوی خزانہ کے ایک ماہر محمد علی قہرمانی قاچار نے کہا کہ شاہ کے متروکہ اس خزانے کی اصل قیمت لگانا بڑا دشوار ہے، کیونکہ اس میں ایسے جواہر ہیں جو پہلے کبھی بازار میں آئے ہی نہیں۔

متاع دنیوی خواہ کیسی ہی مزین اور خیرہ کن ہو، بہر حال پر فریب ہے، جسے اسلام کی دولت حاصل ہے وہی حقیقتاً صاحب ثروت ہے، محمد علی کلے اور مائیک ٹائسن دنیا کے وہ نامور مکے باز ہیں جن کو اسلام کی دولت بھی حاصل ہوئی، اب ایک خبر سے معلوم ہوا کہ برطانیہ کے سابق باکسنگ چیمپین کرس یوبینک نے اسلام قبول کرنے کے بعد اپنا نام حمدان رکھا ہے، وہ دو سال سے اسلام کے مطالعہ میں مصروف تھے اور آخر کار اس کی حقانیت پر ایمان لے آئے۔

(ع۔ ص)

معارف کی ڈاک

مکتوب اکولہ

مومن پورہ۔ اکولہ
۲۷ اپریل ۹۷ء

محترم جناب اصلاحی صاحب! السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

امید ہے مزاج بخیر ہوگا۔ اپریل کے شمارہ میں جناب انیس احمد چشتی کا مقالہ بعنوان "سیرت نبوی پر ایک ہندو کی مراٹھی تصنیف" کا مطالعہ بڑے شوق اور دلچسپی سے کیا چشتی صاحب نے مہاراشٹر کے واحد غیر مسلم کی سیرت پر مراٹھی تصنیف کا عمدہ طریقے سے تعارف کرایا ہے، البتہ ان کا یہ بیان ناواقفیت پر مبنی ہے کہ "سیرت نبوی پر مراٹھی زبان میں صرف تین کتابیں ہیں اور ان میں سے دو غیر مسلم مصنفین کی فکر کا نتیجہ ہیں، تیسری کتاب ابوسلیم محمد عبدالحئی کی حیاتِ طیبہ کا ترجمہ पवित्र जीवन کے عنوان سے ۱۹۷۱ء میں شایع ہوا تھا۔" (صفحہ ۲۷۲)

اس ضمن میں عرض ہے کہ مراٹھی زبان میں جناب ابوسلیم محمد عبدالحئی کے علاوہ سیرت نبوی پر مزید دو مسلم مصنفین کی کتب موجود ہیں۔ پہلی کتاب محمد سعید علی ٹولکر کی لکھی ہوئی ہے جس کا نام مہان پیغمبر (महान पैगंबर) ہے، یہ کتاب عطیہ پبلی کیشنز گوڑے گاؤں ضلع رائے گڑھ سے شایع ہوئی تھی۔ کتاب پر تاریخ طباعت مذکور نہیں۔ دوسری کتاب جو ابھی سال گزشتہ ۱۹۹۶ء ہی میں منظر عام پر آئی ہے وہ عبدالحمید صدیقی پاکستان کی انگریزی تصنیف کا مراٹھی ترجمہ ہے جسے اسلامک مراٹھی پبلی کیشنز ٹرسٹ بمبئی نے "محمد پیغمبر یانچے پوتر جیونی" (मुहम्मद पैगम्बर यांचे पवित्र जीवनी) کے نام سے شایع کیا ہے۔

فقط والسلام

عبدالرحیم

تلخیص و تبصرہ

جمہوریہ سورینام میں اسلام اور مسلمان

جنوبی امریکا کی اس ریاست کی دریافت ان اسپینی ملاحوں اور ناخداؤں نے کی جنہوں نے سورینام کے ساحلوں پر پہلی مرتبہ قدم رکھا اور پھر ایک صدی کے بعد اس کی ملکیت کے مدعی ہو گئے، لیکن بدقسمتی سے یورپ کے دو بڑے استعمار پسند ملک ہالینڈ اور برطانیہ بھی اس کے دعویدار بن بیٹھے۔ جن کے درمیان مسلسل معرکہ آرائی ہوتی رہی، بعد میں فرانس بھی ان کی جنگ میں شامل ہو گیا اور بالآخر تینوں ہی نے اس کے حصے بخرے کر کے الگ الگ حصوں پر قبضہ کر لیا۔ اس طرح برٹش گیانا، ڈچ گیانا اور فرانسیسی گیانا میں سورینام کا پورا خطہ تقسیم ہو گیا۔ ۱۹۷۵ء میں جب اسے داخلی خود مختاری حاصل ہوئی تو یہ ملک سورینام کے نام سے مشہور ہوا اور ہالینڈ کی نو آبادیوں کے ساتھ دولت مشترکہ کا ایک رکن بن گیا۔

حدود اربعہ اور رقبہ سورینام کے مغرب میں جمہوریہ گیانا، مشرق میں فرانسیسی گیانا، شمال میں بحر اوقیانوس اور جنوب میں برازیل کا ملک واقع ہے، اس کا کل رقبہ ۱۶۳۲۶۵ مربع کلومیٹر ہے۔ آبادی تقریباً ۳۵۲۰۰۰ ہے۔ دار السلطنت پارا ماریبو ہے۔ جس کی آبادی ڈیڑھ لاکھ کے قریب ہے۔

جغرافیائی حالات سورینام کے قدرتی اور جغرافیائی حالات قدرے مختلف ہیں۔ ساحلی علاقے نشیبی اور ہموار ہیں جن میں متعدد دریا رواں ہیں۔ ان ہی سے متصل ریتیلے ٹیلے ہیں، ان کے علاوہ سرسبز و شاداب زمینیں بھی ہیں، بلند و بالا پہاڑوں کا ایک سلسلہ ہے جو

گھنے جنگلوں سے ڈھکا ہوا ہے۔ ایک حصہ بالائی زمینوں کا بھی ہے جن کی سطح مرتفع ایک ہزار میٹر تک بلند ہے۔

آبادی اور باشندے | سورینام کا موسم معتدل ہے، یہاں بارش زیادہ ہوتی ہے۔ پہلے یہاں ریڈ انڈین آباد تھے۔ یورپین لوگوں کی آمد کا سلسلہ سترہویں صدی عیسوی کے نصف آخر میں شروع ہوا اور اٹھارہویں صدی عیسوی میں ڈچ استعمار کے تسلط کے وقت وہاں یہ یورپی کثرت سے آباد ہو چکے تھے۔ ڈچوں نے سورینام میں زراعت کرنے کے لیے ہزاروں افریقی غلام بلا لیے تھے۔ اس طرح افریقیوں کی ایک بڑی تعداد بھی سورینام کے جنگلوں اور جھاڑیوں میں پناہ گزیں ہو گئی تھی۔ ان افریقیوں نے ڈچوں کے خلاف بغاوت کر دی تھی لیکن ۱۷۸۰ء میں صلح ہو گئی، افریقیوں کے علاوہ چین، انڈونیشیا اور ہندوستان کے مزدوروں کو بھی ڈچوں نے کاشتکاری کے لیے لا بسایا تھا۔ اس طرح سورینام میں تینوں براعظموں ایشیا، افریقہ اور یورپ کی مشترک اور مخلوط آبادی ہے جس کی تفصیل اس طرح ہے:

افریقی ۳ء۳۱٪، ہندوستانی ۶ء۳۷٪، انڈونیشی ۲ء۱۵٪، حبشی ۴ء۹٪، یورپی ۱٪، چینی ۵ء۱٪، ریڈ انڈین ۱ء۲٪ ہیں۔ ان کے علاوہ بھی کچھ مخلوط آبادی ہے۔

پیشہ | سورینام کے اصل باشندوں کا پیشہ زراعت ہے، ساحلی علاقے کے لوگ مچھلیوں کا شکار کرتے ہیں۔ تجارت بھی یہاں کے لوگوں کا ذریعہ آمدنی ہے۔

سورینام میں اسلام کیسے پہونچا | افریقیوں کی آمد کے ساتھ سورینام کے افق پر اسلام کی کرنیں بھی پڑنے لگیں۔ کیونکہ ان میں بعض مغربی افریقہ کے مسلمان بھی تھے۔ جو سترہویں صدی عیسوی میں یہاں پہونچے تھے لیکن غلامی اور استحصال نے انہیں نہ اپنی اصلاح و تربیت

اور نہ اپنے بچوں کی بنیادی اسلامی تعلیم پر توجہ دینے کا کوئی موقع دیا، اس طرح ان کا دینی و معاشرتی نظام درہم برہم رہا مگر مسلسل دبے اور کچلے رہنے کی وجہ سے ان میں اضطراب اور بے چینی کا پایا جانا فطری تھا جس کے نتیجہ میں ڈچوں کے خلاف بغاوت بھی رونما ہوئی۔ جس کی قیادت ایک حبشی مسلمان نے کی پھر ان کے درمیان معاہدۂ "یوکا" عمل میں آیا اور بالآخر ڈچ استعمار کو جھکنا اور مجبوراً مسلمانوں کے حق آزادی کو تسلیم کرنا پڑا، آج بھی یہ مسلمان "جیوکا" کے نام سے مشہور ہیں! ور ان کے اکثر رسم ورواج اسلامی ہیں۔

ایشیائی مسلمان سورینام میں ان مزدوروں کے ساتھ بھی آئے جن کو ڈچ حکمراں انڈونیشیا، ہندوستان اور جنوب مشرق ایشیا سے بطور غلام لاکر ان سے کاشتکاری کراتے تھے، ان مزدوروں میں بڑی تعداد مسلمانوں کی ہوتی تھی۔ بعد میں شام کے علاقوں کے کچھ عرب قافلے بھی آئے۔ یہ سلسلہ موجودہ صدی کے نصف اول تک برابر جاری رہا۔ بعض اسلامی ذرائع کے مطابق سورینام میں مسلمانوں کی تعداد ایک لاکھ چھ ہزار ہے اور وہ وہاں کی مجموعی آبادی کا تیس فیصد ہیں۔ جن میں انڈونیشی پچہتر ہزار، ہندوستانی و پاکستانی تیس ہزار اور باقی افریقی مسلمان اور سورینام کے نومسلم ہیں۔ اس طرح جنوبی امریکا کے ملکوں میں مسلمانوں کا سب سے اچھا تناسب اسی جمہوریہ میں ہے، اسلام کی تبلیغ واشاعت کا ایک خاص ماحول بھی یہاں بننے لگا ہے۔

جمہوریہ سورینام میں انڈونیشیا کے مسلمان خاص طور پر زراعتی علاقوں میں بود و باش رکھتے ہیں اور چاول کی کاشت کرتے ہیں۔ ان کی زبان ملادی ہے اور یہ اسلامی روایات کے پابند ہیں۔ ہندوستانی مسلمانوں کی آبادی سورینام کے شہروں میں ہے۔

یہ تجارت پیشہ ہیں اور ان کی زبان اردو ہے، ڈچ وہاں کی سرکاری زبان ہے، لیکن ملک کے اکثر باشندوں کی بول چال کی زبان "تاکی تاکی" ہے یہ یہاں کی مقامی زبان ہے جو مختلف زبانوں سے مل کر بنی ہے۔ چنانچہ ہالینڈی، انگریزی، اسپینی کے ساتھ ساتھ اردو اور جاوی زبانوں کے الفاظ بھی اس میں شامل ہیں۔

افریقی نژاد باشندے اکثر کانوں میں کام کرتے ہیں، ان کی زبان بھی دوسروں سے جدا ہے۔ زبانوں کی کثرت اور اختلاف بعض دشواریوں کا سبب بھی ہے۔ اگر زبان کی دشواری نہ ہوتی تو جمہوریہ سورینام کی اکثریت کا مذہب اسلام ہوتا۔ غیر افریقیوں کی ایک معتد بہ تعداد اب قبول اسلام پر آمادہ ہو رہی ہے۔ حکومت و اقتدار میں بھی وہاں کے مسلمانوں کا عمل دخل ہونے لگا ہے، چنانچہ ایک مسلم شخص وزیر ہوا ہے اور قانون ساز اسمبلی کے ممبروں میں بھی ایک چوتھائی مسلمان ہوتے ہیں لیکن تناسب کے لحاظ سے انکی یہ نمائندگی بہرحال کم ہے۔

اسلامی ادارے سورینام میں برصغیر کے مسلمانوں کی ایک جماعت کی تشکیل اس وقت عمل میں آئی جب ۱۳۲۵ھ میں وہاں چند مسلمان ہندوستانی علماء پہونچے۔ اس تنظیم نے متعدد مسجدیں تعمیر کیں اور مسلم بچوں کی تعلیم کے لیے کئی مدارس بھی قائم کیے، دارالسلطنت کی ایک جامع مسجد اور مختلف آبادیوں میں چھ مساجد اور ایک اسلامی مدرسہ اور ایک ہائر سکنڈری اسکول کی تعمیر اسی جماعت کی کوششوں کا ثمرہ ہے۔ ڈچ زبان میں "اسلام" نامی ایک رسالہ بھی شایع کرتی ہے۔ اس کی ایک مجلس عاملہ بھی ہے۔ یہ جنوبی امریکا کی سب سے عمدہ اسلامی تنظیم سمجھی جاتی ہے، جس کی مختلف ذیلی کمیٹیاں ہیں۔ ایک اور قابل ذکر ادارہ "اتحاد اسلامی سورینائی" بھی ہے۔ جس کو انڈونیشی مسلمانوں نے قائم کیا ہے۔ اس کی سرگرمیاں بھی برصغیر کے مسلمانوں کی جماعت کے مانند ہیں۔ اب

کوشش یہ ہو رہی ہے کہ ان اسلامی تنظیموں کو ایک اکائی کی شکل دے کر زیادہ موثر اور فعال کر دیا جائے۔

اسلامی تعلیم مسلم اقلیت کے بچے دین کی بنیادی تعلیم مساجد کے تحت چلنے والے مکاتب میں حاصل کرتے ہیں، علاوہ ازیں ابتدائی و ثانوی مدارس میں بھی ان کے لیے دینی تعلیم کا بندوبست ہوتا ہے۔ ان تمام مدارس میں طلبہ کی تعداد تین ہزار سے زائد ہے۔ حال ہی میں سورینام میں ایک اسلامی مرکز بھی قائم کیا گیا ہے۔ جس کے قیام میں سعودی حکومت کے علاوہ ہالینڈ اور خود مقامی مسلمانوں کی کوشش اور مدد بھی شامل رہی ہے۔ رابطہ عالم اسلامی نے بعض ائمہ مساجد اور مدرسین کے مشاہرے مقرر کر دیے ہیں۔ درس و تدریس کے لیے جامعہ اسلامیہ مدینہ منورہ کی جانب سے بعض مبعوثین بھی مامور کیے جا رہے ہیں۔ سورینام کی پچاس سے زیادہ مسجدیں ملک کے مختلف حصوں خصوصاً راجدھانی پراماریبو اور اس کے اطراف میں پھیلی ہوئی ہیں اور اسلامی مدارس انہیں مساجد سے ملحق ہیں، جن کی بدولت مسلم معاشرہ میں اسلامی عقائد و روایات رچ بس رہے ہیں۔

سورینام کی مسلم اقلیت کو درپیش مسائل وہاں کی مسلم اقلیت کو درپیش مسائل میں سب سے اہم مسئلہ قادیانیوں کا ہے جن کی منفی سرگرمیاں ان میں شکوک و شبہات پیدا کرکے اسلام کے بنیادی عقائد رسالت کو متزلزل کر رہی ہیں۔ یہودیوں کی روایتی اسلام دشمنی کا سامنا بھی انہیں کرنا پڑ رہا ہے لیکن زیادہ افسوسناک امر یہ ہے کہ خود مسلمانوں ہی کے کچھ طبقے اسلام کی بنیادی تعلیمات سے ناآشنا اور بیگانہ ہیں۔

سورینام کے ان مسلمانوں کو اسلام کی صحیح ترجمانی کرنے والے مبلغین معلمین کی سخت احتیاج ہے۔

(ماخوذ التضامن الاسلامی مکہ مکرمہ)

ک۔ ص۔

باب التقریظ والانتقاد

سہ ماہی فکر و نظر: شبلی نمبر

از ضیاء الدین اصلاحی

مرتبہ جناب شہریار و محمد صابر صاحبان، تقطیع کلاں، صفحات ۳۹۲، قیمت ۵۰ روپے

پتہ: ادارۂ فکر و نظر، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ۔

علامہ شبلی کی شخصیت بڑی ہمہ گیر اور ہمہ جہت تھی، ان کے کمالات اور کارنامے گوناگوں ہیں، اردو کے کسی مصنف، ادیب اور انشاپرداز پر اتنا نہیں لکھا گیا جتنا علامہ شبلی پر لکھا گیا ہے اور یہ سلسلہ غیر مختتم ہے۔ ضخیم کتابوں اور طویل مقالات کے علاوہ اردو کے متعدد رسالوں نے ان پر خاص نمبر بھی نکالے ہیں۔ ۱۹۶۰ء میں جامعہ اردو علی گڑھ کے رسالہ ادیب نے مولانا پر ایک ضخیم نمبر نکالا تھا جو آج تک حوالہ د استناد کا کام دے رہا ہے اور اب وہیں سے مسلم یونیورسٹی کے سہ ماہی رسالہ فکر و نظر کا شبلی نمبر بڑی آب و تاب سے شایع ہوا ہے۔ جس کو کنور محمد اخلاق خاں شہریار نے اپنے شریک کار محمد صابر کی مدد سے مرتب کیا ہے۔

جناب شہریار و محمد صابر کی ادارت میں فکر و نظر کے کئی خصوصی شمارے نکل چکے ہیں شبلی نمبر اسی سلسلہ کی کڑی ہے، سرورق علامہ کی شاندار تصویر سے مزین ہے، مضامین کی تعداد ۱۲ ہے جو ان عنوانات کے تحت درج ہیں:

شعر و نقد شعر: نو مضامین۔ مشرق اور علوم مشرق کے زیر عنوان چار مقالے

سیرۃ النبی اور علم کلام کے تحت تین مضامین، علمی وادبی روابط میں چار مقالے اور آخری عنوان جہان معنی کتابوں اور مضامین کی فہرست کے لیے مختص ہے۔

پروفیسر آل احمد سرور کے مضمون سے اس خاص نمبر کا آغاز ہوا ہے، مولانا شبلی کی اردو شاعری پر ان کا تبصرہ نپا تلا اور متوازن ہے، ان کے خیال میں شبلی کی شاعری ان کی خلاقی کے بحر بیکراں کی ایک موج ہے، مگر یہ موج بھی کسی آب جو کی ہلکی سی لہر نہیں ہے بلکہ جوئے کوہستان کا سا جلال وجمال رکھتی ہے، ان کی مثنوی صبح امید میں جو مثنوی گلزار نسیم کی بحر میں سر سید کے متعلق ہے کئی جگہ دریا کو کوزہ میں بند کیا ہے، جس ایجاز واختصار کی وجہ سے گلزار نسیم کی شہرت ہے، وہی ایجاز واختصار اور بلاغت یہاں بھی جلوہ گر ہے، فرق یہ ہے کہ وہاں حسن وعشق اور جادو وطلسم کی منظر کشی ہے یہاں قوم کے امراض اور مریض غم کی چارہ گری کا بیان ہے۔ سرور صاحب نے مولانا کی اکثر نظموں پر اظہار خیال کیا ہے، عدل جہاں گیری میں نورجہاں کے بے مثال حسن کی تصویر جس طرح کھینچی گئی ہے اسے علامہ شبلی کی شاعری کے نقطۂ عروج اور بلاغت کلام کی معراج بتایا ہے اور اس شعر:

اس کی پیشانی نازک پہ جو پڑتی تھی گرہ ‏ ‏ ‏ جا کے بن جاتی تھی اوراق حکومت پہ شکن

کے بارے میں لکھا ہے "اردو میں اس معجز بیانی کی کوئی اور مثال اس وقت میرے ذہن میں نہیں ہے"۔

شعر ونقد شعر ہی کے زیر عنوان اردو کے مشہور اہل قلم پروفیسر گیان چند نے علامہ شبلی کے نقد مثنوی کے وہ اصول منضبط کیے ہیں جو ان کے ذہن میں تھے، مگر گیان صاحب کے بقول وہ ان کو باضابطہ طور پر پیش نہ کر سکے بلکہ ان کو دو ٹکڑوں میں منتشر

کر دیا، جین صاحب نے اس طرح سے دس اصولوں کی وضاحت کی ہے۔ پاکستان کے وزیر آغا نے مولانا شبلی کی سیاسی نظموں کی بعض خصوصیات پر اچھی بحث کی ہے۔

پروفیسر نیر مسعود لکھنؤ یونیورسٹی نے تردید موازنہ اور رد الموازنہ کا تعارف کرایا ہے، یہ دونوں کتابیں مولانا شبلی کی موازنہ انیس و دبیر کے جواب میں لکھی گئی تھیں۔ اسی حصہ میں علی گڑھ یونیورسٹی کے شعبہ انگریزی کے بزرگ استاد اسلوب احمد انصاری نے بھی موازنہ کو اہم کارنامہ قرار دینے کے باوجود اسے بہت کچھ مجروح اور داغ دار کرنے کی کوشش کی ہے، یہ عجیب بات ہے کہ موازنہ کی شہرت و مقبولیت میں کوئی کمی نہیں آئی مگر اس کی تردید میں لکھی جانے والی کتابیں اور تحریریں نسیاً منسیاً ہو چکی ہیں، مرزا خلیل احمد بیگ نے شعر العجم کے حوالہ سے مولانا کے تصور لفظ و معنی اور اسلوب کی وضاحت بہتر طور پر کی ہے، علی گڑھ یونیورسٹی کے سابق استاد اخلاق احمد صاحب کے مضمون "علامہ شبلی مکتوبات کے آئینہ میں" کچھ متضاد اور خیالی باتیں بھی آگئی ہیں۔ تاہم اپنے بے تکلف برجستہ اور بے ساختہ انداز بیان کی وجہ سے یہ کیفیت و دلآویزی سے خالی نہیں ہے مگر اس کو شعر اور نقد شعر کے زیر عنوان شامل کرنے کی وجہ سمجھ میں نہیں آئی۔

دوسرے حصے کے چاروں مضامین خوب ہیں، اس کی ابتدا برصغیر کے نامور مورخ پروفیسر خلیق احمد نظامی کے مضمون ادب اور مشرقی تاریخ کے مخزن "شبلی" سے ہوئی ہے، انہوں نے اپنے خوبصورت اور دلکش انداز میں ادب و تاریخ میں مولانا شبلی کی عظمت و بلند پائیگی دکھائی ہے، ان کی بعض تصانیف کو اردو لٹریچر میں سنگ میل قرار دیا ہے اور ان کی متعدد خصوصیات اور مولانا کی اولیات بتائی ہیں۔ علی گڑھ کے شعبہ عربی کے پروفیسر راشد ندوی نے مولانا شبلی کے سفرنامہ روم و مصر و شام سے

ان اسلامی ملکوں کے سیاسی، تہذیبی، تمدنی اور تعلیمی حالات کا مرقع تیار کیا ہے، جامعہ ملیہ کے شعبۂ فارسی کے پروفیسر شعیب اعظمی نے مولانا کے فارسی اشعار کی روشنی میں ان کا فنی و ادبی جوہر دکھایا ہے، جناب رئیس نعمانی کے سیر حاصل مضمون میں مولانا شبلی کے فارسی کلیات میں شامل مختلف اصناف کی ہر ہر نظم کے بارے میں یہ صراحت کی گئی ہے کہ وہ کب اور کس موقع پر کہی گئی ہے، نعمانی صاحب کو فارسی زبان و ادب پر عبور ہے، اس کا اندازہ اس زبان میں ان کے مضامین نظم و نثر سے ہوتا ہے، اس بنا پر انکے یہ اعترافات ماوزن سمجھے جائیں گے کہ مولانا شبلی چودہویں صدی کے چار بڑے فارسی کے شعراء میں تھے، ان کا کلام شعرائے اہل زبان کے کلام سے لگا کھاتا ہے، ان کا فارسی ادب و شاعری کا مطالعہ اپنے معاصرین میں غالباً سب سے وسیع اور ان کا ذوق سخن بہت معیاری تھا، گزشتہ سو سال کے اندر ہندوستان میں کوئی فارسی شاعر ایسا نہیں گزرا جس کے کلام میں شبلی کے معیار کا برجستہ، شگفتہ اور رچا ہوا تغزل پایا جاتا ہو۔

تیسرے حصہ کا پہلا مضمون اس ناچیز کا ہے جو خون لگا کر شہیدوں میں شامل ہو گیا ہے اور مولانا کی سیرۃ النبی میں ادبی رعنائی و گل کاری دکھانے کی کوشش کی ہے، دوسرا مضمون علی گڑھ کے شعبۂ اسلامیات کے پروفیسر یٰسین مظہر صدیقی کا بہت مفصل اور معلومات افزا ہے، اس میں سیرۃ النبی کی تالیف و اشاعت میں مصنف کو جو ہفت خواں طے کرنا اور خیال و عمل کے جن مراحل سے گزرنا پڑا ان سب کا استقصا کیا گیا ہے۔ بنارس یونیورسٹی کے ڈاکٹر ظفر احمد صدیقی نے یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ مولانا شبلی کی اصل جولان گاہ تاریخ نہیں علم کلام ہے، اس کی ترتیب و تدوین نیز علم کلام کی اصلاح و تجدید میں اولیت و انفرادیت کا شرف انہی کو حاصل ہے۔

چوتھے حصہ میں علی گڑھ کے استاذوں ڈاکٹر ظفر الاسلام اصلاحی اور ڈاکٹر ابوسفیان اصلاحی کے مضامین بڑے سیر حاصل اور معلومات سے پُر ہیں، اول الذکر نے علی گڑھ کے تعلق سے مولانا کے تمام واقعات و جزئیات قلم بند کر کے دکھایا ہے کہ مولانا نے علی گڑھ کو کیا دیا اور اس سے کیا لیا، ابوسفیان اصلاحی نے عربی زبان کے سلسلے کی مولانا کی ایک ایک خدمت کا ذکر تفصیل سے کیا ہے۔

اس نمبر کا سب سے آخری مگر بہت کارآمد مضمون وہ ببلوگرافی ہے جس کو ڈاکٹر محمد ضیاء الدین انصاری ڈپٹی لائبریرین مولانا آزاد لائبریری علی گڑھ یونیورسٹی نے بڑی محنت و کاوش سے مرتب کر کے علامہ شبلی پر علمی و تحقیقی کام کرنے والوں اور ان کے قدردانوں کو زیر بار احسان کیا ہے۔ اس سے یہ پتہ لگتا ہے کہ مولانا شبلی کی تصانیف اور مقالات کب اور کہاں سے شایع ہوئے۔ انکے کتنے ایڈیشن کس کس سال نکلے ہیں، کن زبانوں میں مولانا کی کس تصنیف کے ترجمے اور تلخیص ہوئی اور وہ کہاں سے اور کب شایع ہوئی۔ ان پر کون سی کتابیں اور مضامین دوسروں نے لکھے اور وہ کب اور کہاں سے شایع ہوئے۔ پی۔ ایچ ڈی کے مقالوں اور خاص نمبروں کا علحدہ ذکر ہے۔ گو یہ فہرست بالکل مکمل نہیں تاہم بڑی حد تک جامع ہے اور اسے دیکھ کر جہان شبلی کی نیرنگیوں کا پورا اندازہ ہو جاتا ہے کہ

جمع در پیکر شبلی جہانے بودہ است　　　　یوسف گم گشتہ ما کاروانے بودہ است

غرض پورا نمبر رنگا رنگ اور متنوع مضامین کا ایک حسین گلدستہ ہے کاغذ کتابت و طباعت نہایت دیدہ زیب ہے مگر علامہ شبلی نے علم و ہنر کا جو تازہ جہاں آباد کیا تھا وہ اتنا کثیر الجہات اور وسیع الاطراف ہے کہ اسکی پیمائش اور احاطہ مشکل ہے اس لیے اس میں مولانا کی شخصیت کے بعض گوشوں اور کچھ علمی، تعلیمی اور قومی خدمات کا نظر انداز ہو جانا تعجب خیز نہیں اور نہ اس کمی سے اس مفید نمبر کی قدر و قیمت میں فرق آتا ہے علامہ شبلی پر تحقیق و مطالعہ کے لیے اس کا مطالعہ ناگزیر ہے۔

مطبوعات جدیدہ

اطہر ہاپوڑی حیات و فن شاعری از شاہدہ افضال مرحومہ متوسط تقطیع، کاغذ، کتابت و طباعت عمدہ، مجلد مع گرد پوش، صفحات ۳۴۴، قیمت سو روپے، پتہ: نسیم بکڈپو، لاٹوش روڈ، لکھنؤ، یوپی۔

مولانا اطہر ہاپوڑی اس صدی کے نصف اول میں اس بزم دوشیں کے آخری رکن رکین تھے جسے امیر و داغ اور جلال و تسلیم جیسے باکمال اصحابِ شعر و سخن سے اصلاح و تلمذ کا شرف حاصل تھا، ان کی قادر الکلامی اور شاعرانہ عظمت کے لیے یہی کافی ہے کہ صرف فارسی میں انہوں نے ہزار غزلیں کہیں، اردو میں غزل کے علاوہ قصیدہ، مثنوی اور قطعات تاریخ مختلف اصناف سخن میں طبع آزمائی کی، ان کے نعتیہ قصائد اور ایک نعتیہ مثنوی "لیلۃ الاسرار" ان کے کمال فن کا آئینہ ہیں، مثنوی کے متعلق مولانا سید سلیمان ندوی نے لکھا تھا کہ "اردو میں اس نوعیت کی مثنوی نہیں دیکھی گئی جس میں حضرت اطہر کی شگفتہ بیانی اور نازک خیالی نے اور بھی تاثیر پیدا کر دی ہے"، وہ اردو زبان کے نباض تھے، فن عروض میں تو گویا درجۂ اجتہاد پر فائز تھے، ۱۹۲۵ء کے معارف کے ایک شمارہ میں فن عروض سے متعلق ان کا عالمانہ مضمون شایع ہوا تھا، حیرت اور افسوس بھی ہے کہ ابھی تک نہ ان کی کوئی تصنیف شایع ہوئی اور نہ ان کے حالات ہی قلم بند کیے گئے، زیر نظر کتاب نے جو دراصل پی ایچ ڈی کا مقالہ ہے یک گونہ اس کی تلافی کی ہے، اس میں ان کے سوانح، مضامین، مکتوبات اور

تصنیفات کا جائزہ سلیقہ سے پیش کیا گیا ہے، بعض نامور شعرا اور معاصروں پر انکی تنقیدیں باوزن ہیں، ماہر، میکش، جوش، سیماب، ریاض، فانی حتی کہ غالب کے بعض عروضی اسقام کی نشاندہی زبان و بیان پر ان کے عبور کا ثبوت ہے، غالب کو انھوں نے عروض سے قطعاً ناواقف بتایا ہے، ان کے ادبی خیالات کا بہترین مظہر ان کے مکتوبات ہیں، ایک خط میں لکھتے ہیں کہ "انبیائے اولوالعزم کے ساتھ جو برتاؤ عالم شعر میں کیا جاتا ہے، نعوذ باللہ منہا، شعر کے حدود جدا ہیں، شریعت کے جدا ... ہمیشہ وہی شعر اچھا ہوتا ہے جس میں سلاست بیان زیادہ ہو جس شعر کے معنی لیعنی کہہ کے سمجھائے جائیں وہ شعر لالیعنی ہے"۔ ایک جگہ لکھتے ہیں کہ "اہل زبان کی سند کے بغیر ہندی لغت نویسوں کے قول پر اعتبار نہیں کیا جاسکتا۔ افسوس ہے کہ ہونہار مصنفہ عین کم سنی میں کینسر کے موذی مرض کا شکار ہوگئیں، ان کے حالات ان کے بزرگ جناب نفیس سندیلوی کے پُر درد قلم سے ہیں جن کو پڑھ کر مغفرت اور صبر کے کلمات بے اختیار زبان پر آجاتے ہیں۔

شرف محنت وکفالت

از جناب شمیم طارق، متوسط تقطیع، عمدہ کاغذ و طباعت، صفحات ۱۶۴، قیمت درج نہیں، پتہ: ثنا پبلی کیشنز، ۵۹/ ۱۶/۳، لہری بلڈنگ، مولانا آزاد روڈ، ممبئی ۴۰۰۰۰۸۔

اسلام دین کامل ہے، عقائد و عبادات کی طرح اس نے وسائلِ رزق کی فراہمی، اکل حلال، محنت، مزدوری اور مال و دولت کے حصول کی ترغیب دی ہے، اور انفاق و صدقات و زکوٰۃ کا مکمل حکیمانہ مالی نظام پیش کیا ہے لیکن دوسرے عبادات کے برعکس اس پہلو سے کما حقہ اعتنا نہیں کیا گیا اور دولت و ثروت سے

استغنا کا رجحان بعض عوامل کی وجہ سے اس قدر غالب ہوتا گیا کہ اسے دینداری و تقویٰ کے منافی باور کر لیا گیا، لائق مولف کی نظر میں اس وقت صنعت و حرفت، زراعت و تجارت میں اجیر و مستاجر، کاشتکار و دستکار اور گھریلو خدمتگار جن مشکلات سے دوچار ہیں اس کی اصل وجہ اصول اسلام سے عدم واقفیت اور دین کو محض رسموں اور تبرک کی چیز سمجھ لینا ہے۔ لائق مولف نے محنت و اجرت اور انفرادی معاشی حقوق پر تفصیل سے بحث کر کے محنت اور پیشوں کے حقیر و مذموم ہونے کے جاہلی تصور کو غلط قرار دیا ہے، اس ضمن میں بتایا ہے کہ یہودی ساہوکاروں کے استحصالی کاروبار کا خاتمہ حضرات صحابہؓ کی محنت و صلاحیت نے کیا، انہوں نے یہ بھی ثابت کیا ہے کہ موجودہ دور کے اختصاص اور اسپیشلائزیشن کا اولین عملی نمونہ اسلام ہی نے پیش کیا۔ پہلے یہ مفید تحریریں ممبئی کے رسالہ البلاغ میں شایع ہوئی تھیں، اب کتابی شکل میں ان کی اشاعت افادیت میں اضافہ کا باعث ہوگی۔ کتاب کا مقدمہ مولانا سید محمد رابع ندوی اور پیش لفظ مولانا سید ابو الحسن علی ندوی کے قلم سے ہے۔

تعلیم، ایک تحریک از جناب محمد اسحق، متوسط تقطیع، عمدہ کاغذ و طباعت، صفحات ۱۱۲، قیمت ۵، روپے، پتہ: ۶/۱۴/۲-۴-۱۱، بازار گارڈ BAZAR GARD، حیدرآباد، اے پی۔ ۵۰۰۰۴۔

اس کتاب کے لائق مصنف عملاً تعلیم کے فروغ کے لیے وقف ہیں، اس سے پہلے ان کی ایک کتاب "تعلیمی مسائل" پر ان صفحات میں اظہار خیال کیا جا چکا ہے، زیر نظر کتاب بھی انکے اٹھارہ مضامین کا مجموعہ ہے جن میں تلقین و ترغیب و تحریک کے جذبہ کے زیر اثر اسرائیل کی ترقی کا راز تعلیم، الامین تحریک کے بانی، ابراہیم لنکن کا خط، انگریزی زبان کی اہمیت کے

علاوہ بچہ اسکول سے کیوں بھاگتا ہے تعلیم میں مسابقت کا جذبہ تعلیم ایک تحریک، اچھے اساتذہ کی تلاش اور دینی درسگاہوں میں عصری تعلیم کا امتزاج جیسے مفید اور اہم موضوعات پر اظہار خیال کیا گیا ہے، وہ مسلمانوں کی تعلیمی معاشی، تہذیبی اور سیاسی پسماندگی اور خستہ حالی کے ازالے کے لیے تعلیمی تحریک کو گوشے گوشے تک پہنچانا چاہتے ہیں، ایک مضمون میں محترمہ عائشہ بیگم کا ذکر ہے جنھوں نے اپنے بچوں کو اعلیٰ تعلیم سے آراستہ کیا اور اب وہ دوسرے بچوں کے لیے سرگرم عمل ہیں، یہ کتاب خاص طور پر تعلیمی اداروں کے ذمہ داروں کے مطالعہ میں آنے کی چیز ہے مگر کمپیوٹر کے اغلاط خاصے ہیں۔

دھوپ دریا از جناب شکیل اعظمی، متوسط تقطیع، بہترین کاغذ و طباعت، مجلد مع گردپوش، صفحات ۱۳۶، قیمت ۵۰ روپے، پتہ: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، جامعہ نگر، نئی دہلی ۲۵-۱۱۰۰

یہ مجموعہ غم امروز و فردا، عصری کرب و اضطراب اور لہجہ و آہنگ کی جدت و تازگی کے باعث عام شعری مجموعوں سے منفرد اور جدا ہے، جواں سال ہونے کے باوجود کلام میں پختگی ہے، پہلے ہی شعر میں۔ دعا کی گئی کہ ع مری غزل کو نیاپن بھی دے رچاؤ بھی دے، یہ مجموعہ اس کی قبولیت کا ثبوت ہے۔ ندی، جھیل، پانی، ناؤ، رات، جگنو، خانہ بدوشی اس مجموعہ کی محض چند علامات ہی نہیں، اعظم گڑھ سے سورت تک شاعر کی زندگی کی حقیقتیں ان میں پنہاں ہیں، خلیل الرحمن اعظمی اور جاں نثار اختر کے اثرات کے باوجود نوجوان شاعر کا اپنا منفرد انداز ہے، ماں کے نام کتاب کا انتساب میں یہ شعر ہے:

کبھی سوتے میں ایسا لگتا ہے سر کے نیچے تری ہتھیلی ہے

انتساب کی یہ پاکیزگی اور کرب روحانی، شاعر کے احساسات کو خود ہی متعین کر دیتے ہیں دیوان چھپانے کی ضرورت یہ بیان کی گئی ہے کہ ع جی میں آیا ہے کہ جذبات کا سودا کر لوں یقیناً اس سودے میں اردو شاعری کو نفع ہوا ہے۔

ع ۔ ص

جلد ۱۵۹ ماہ صفر ۱۴۱۸ھ مطابق ماہ جون ۱۹۹۷ء عدد ۶

فہرست مضامین

مقالات

استفسار و جواب

معارف کی ڈاک

وفیات

شذرات

اس وقت پوری دنیائے اسلام صیہونیت کے جال میں پھنسی ہوئی ہے، یہود شروع ہی سے اسلام اور مسلمانوں کے خلاف سازشوں میں پیش پیش ہیں اور اپنی عیاری سے وہ دوسری اقوام کو بھی مسلمانوں کے خلاف برانگیختہ کیے رہتے ہیں، یہی وجہ ہے کہ اس وقت تمام طاغوتی قوتیں مسلمانوں کو صفحۂ ہستی سے نیست ونابود کر دینا چاہتی ہیں۔ عالم اسلام میں گزشتہ چند برسوں میں جو ہولناک واقعات پیش آئے ہیں ان میں یہودی ذہن ہی کی کارفرمائی رہی ہے، اسرائیلی ریاست کا قیام، کیمپ ڈیوڈ معاہدہ، فلسطین کی جزئی خودمختاری پر عرفات کی رضامندی اور اس کے نتیجہ میں فلسطینیوں میں اختلاف، ایران، عراق جنگ، صومالیہ اور روانڈا جنگیں، الجزائر میں جمہوریت کشی، عراق پر کویت کا حملہ، پھر عراق کی سرزنش، سعودی عرب میں امریکی فوجوں کا تسلط، لیبیا، ایران اور سوڈان پر بین الاقوامی پابندی۔ لبنان میں امریکی و اسرائیلی جنگی تجربہ گاہ، بوسنیا ہرزیگووینا میں اسلامی حکومت کا انسداد، اخوان المسلمین کی دربدری، عمر عبدالرحمن کی قید، شاہ فیصل، جنرل ضیاء الحق اور ضیاء الرحمن کی شہادت، افغانستان کی خانہ جنگی، پاکستان میں مہاجر و غیر مہاجر اور شیعہ سنی اختلافات کے پس پردہ کون معشوق ہے..

ہندوستان میں ہندوتوا کے زور و شور، وشو ہندو پریشد کے جارحانہ عزائم اور دوسری فسطائی ہندو تنظیموں کی شرانگیزی کا سلسلہ بھی صیہونی سازش سے جڑا ہوا ہے، آئے دن ایک نہ ایک شاخسانہ کھڑا کر کے مسلمانوں کو اسی میں الجھا دینا ایک معمول ہوگیا ہے تاکہ وہ اپنی صلاح و فلاح سے غافل رہیں اور ان کی ساری قوت اپنے بچاؤ اور اپنے اوپر ہونے والے حملوں کے دفاع میں صرف ہوتی رہے اور وہ ملک کی تعمیر و ترقی میں کوئی حصہ نہ لے سکیں، مسلم کش فسادات، ٹاڈا، تعلیم کے ذریعہ نسل کشی، پرسنل لا میں مداخلت، مسلم خواتین کی ہندوؤں سے اجتماعی شادی، بابری مسجد کا انہدام اور کاشی و متھرا کے معابد پر یورش اور اب جامعہ ملیہ اسلامیہ کا نیا مسئلہ جو یکم مئی کو دہلی ہائی کورٹ کے ایک فیصلہ سے پیدا ہوا ہے جس کے نتیجہ میں اسکی اصل خصوصیت

اور اقلیتی کردار باقی نہیں رہے گا۔ ۱۹۸۸ء میں جامعہ کو سنٹرل یونیورسٹی کا درجہ دیا گیا تو اسکے ارباب حل وعقد یونیورسٹی پانے کی خوشی میں یہ نہ سمجھے کہ یہی اس کے اقلیتی کردار کو سلب کرنے کا پیش خیمہ بنے گا

خلافت اور ترک موالات کی تحریک کے زیر اثر گاندھی جی کی اس اپیل پر جامعہ کا قیام عمل میں آیا تھا کہ "برطانوی تعلیمی اداروں کا بائیکاٹ کیا جائے" چنانچہ مولانا محمد علی کی قیادت میں ایم۔اے۔او کالج کے طلبہ نے وہاں تعلیم حاصل کرنے سے انکار کر دیا، اس کے بعد کالج کی مسجد میں جمعہ کے دن ۲۹ اکتوبر ۱۹۲۰ء کو جامعہ کے قیام کا اعلان ہوا، جس کی تاسیس کی رسم شیخ الہند مولانا محمود الحسنؒ کے متبرک ہاتھوں سے ادا ہوئی، وہ اپنی ناتوانی کی وجہ سے اپنا خطبہ تاسیس خود نہ پڑھ سکے تو ان کے شاگرد رشید مولانا شبیر احمد عثمانیؒ نے یہ خطبہ پڑھا، جس میں حضرت نے فرمایا تھا "مسلمانوں کی تعلیم مسلمانوں کے ہاتھ میں ہو اور اغیار کے اثر سے مطلقاً آزاد۔ کیا باعتبار عقائد وخیالات اور کیا باعتبار اخلاق واعمال ہم غیروں کے اثرات سے پاک ہوں اور ہماری عظیم الشان قومیت کا اب یہ فیصلہ نہ ہونا چاہیے کہ ہم اپنے کالجوں سے بہت سستے غلام پیدا کرتے رہیں، بلکہ ہمارے کالج نمونہ ہونے چاہئیں، بغداد اور قرطبہ کی یونیورسٹیوں کے اور ان عظیم الشان مدارس کے جنھوں نے یورپ کو اپنا شاگرد بنایا، اس سے پیشتر کہ ہم اس کو اپنا استاد بناتے۔" اور بقول ڈاکٹر ذاکر حسین اس وجود مقدس کی ہڈیاں تیز جلا وطنی اور تفکرات ملی نے گھلا دی تھیں اور وہ نہ صرف ان نوجوانوں کو مخاطب فرما رہے تھے جو انکے سامنے تھے، ان کا روئے سخن قوم کی ساری آنے والی نسلوں کی طرف تھا۔"

ان برگزیدہ حضرات کی دعاؤں اور تدبیروں کے نتیجہ میں اتنے بلند مقاصد اور پاکیزہ عزائم کے ساتھ جامعہ ملیہ اسلامیہ کو قائم کرنے کا فیصلہ کیا گیا تھا، بے سروسامانی کا یہ عالم تھا کہ عمارت چند پھوس کے بنگلوں پر مشتمل تھی اور پڑھائی درختوں کے نیچے ٹاٹ کے فرش پر ہوتی تھی اور جب یہ بھی نہ ہوتا تو اپنے اپنے چھنے چٹائیوں کی طرح بچھا لیتے تھے، کون سوچ سکتا تھا کہ قوم وملت کے نام پر قائم

ہونے والا یہ مقدس ادارہ جب یونیورسٹی کا روپ اختیار کرے گا تو اس کی امتیازی خصوصیات باقی نہ رہیں گی اور اس کا اقلیتی کردار سلب کر لیا جائے گا اور مسلمانوں کے خون پسینہ، محنت مشقت اور مزدوری کے پیسوں سے بننے والی یونیورسٹی میں انہی کو نہ کوئی مراعات حاصل ہوگی اور نہ داخلے کی سہولتیں میسر آئیں گی۔ اس وقت جس عدالتی فیصلے نے مسلمانان ہند کو عموماً اور جامعہ کے طلبۂ اساتذہ اور ملازمین کو خصوصاً اس قدر ہیجان و اضطراب میں مبتلا کر دیا ہے، ہماری قومی حکومت کا فرض ہے کہ اسے دور کرے۔ اس کے لیے ۸۸ء کے ایکٹ میں بنیادی ضروری ترمیم لازمی ہے، طلبہ پر کسی طرح کا ظلم و تشدد نہ کیا جائے، خوش قسمتی سے اس وقت ملک کی سربراہی اردو کے ایک دانشور کر رہے ہیں اگر ان کے دور میں جامعہ کا اردو کلچر ختم ہوا تو یہ ایک بڑا المیہ ہوگا۔

اترپردیش اسمبلی کے ممبران عالم بدیع اور وسیم احمد کو جو اعظم گڈھ کے بعض حلقوں کی نمائندگی کر رہے ہیں اور جن کو علامہ شبلیؒ کے ہم خاندان و ہم وطن ہونے کا فخر حاصل ہے ابھی تک اس لیے حلف نہیں دلایا جا سکا کہ وہ اپنی مادری زبان اردو میں حلف لینا چاہتے ہیں جو ان کا آئینی، دستوری اور جمہوری حق ہے، کیونکہ دوسری زبانوں کی طرح اردو بھی ملک کی ایک تسلیم شدہ زبان ہے اور وہ اترپردیش کی دوسری سرکاری زبان بھی ہے، ریاستی حکومت اور اسمبلی کے اسپیکر انہیں اردو میں حلف نہ دلا کر تعصب و تنگ نظری کا ثبوت ہی نہیں دے رہے ہیں بلکہ اردو دشمنی کا رویہ اختیار کر کے آئین، انصاف، دستور اور جمہوریت کو پامال کر رہے ہیں، غالباً ڈاکٹر فریدی مرحوم کے علاوہ اسمبلی اور پارلیمنٹ کے کسی اردو نواز ممبر نے ابھی تک ایسا مبارک اور جرأت مندانہ قدم نہیں اٹھایا تھا، ہم ان دونوں ممبروں کی اردو دوستی پر انہیں مبارکباد دیتے ہیں کہ اس ظلمت و تیرگی میں انھوں نے امید کا دیا تو روشن کیا ؏

پیدا کہیں جنوں کے ساماں ہوئے تو ہیں۔

مقالات

علامہ شبلی نعمانی کی شخصیت کے امتیازی پہلو

از پروفیسر ریاض الرحمٰن شروانی۔ علی گڑھ

اردو کے مشہور صاحب طرز ادیب اور باذوق نقاد جناب مہدی حسن افادی الاقتصادی نے اپنے مضمون اردو لٹریچر کے عناصر خمسہ میں لکھا ہے: "سرسید سے معقولات اگر الگ کر لیجئے تو کچھ نہیں رہتے، نذیر احمد بغیر مذہب کے لقمہ نہیں توڑ سکتے، شبلی سے تاریخ لے لیجئے تو قریب قریب کورے رہ جائیں گے، حالی بھی جہاں تک نثر کا تعلق ہے سوانح نگاری کے ساتھ چل سکتے ہیں۔ لیکن آقائے اردو یعنی پروفیسر (محمد حسین) آزاد صرف انشا پرداز ہیں جن کو کسی اور سہارے کی ضرورت نہیں ہے" جب ہم مہدی افادی صاحب کی اس رائے پر علامہ شبلی نعمانی کے تعلق سے سنجیدگی سے غور کرتے ہیں تو ان کی انشا پردازی کی داد تو دے سکتے ہیں لیکن اس قول کی صداقت کو تسلیم نہیں کر سکتے۔ یہ صحیح ہے کہ علامہ شبلی نے سیرۃ النبی (ج ۱ و ۲) کے علاوہ الفاروق، المامون، الغزالی، سیرت النعمان، سوانح مولانا روم اور اورنگ زیب عالمگیر پر ایک نظر جیسی اہم تاریخی کتابیں لکھیں یا دوسرے لفظوں میں کہہ سکتے ہیں کہ انھوں نے تاریخی واقعات کے چوکھٹے میں اپنے لائق فخر و مباہات ہیروؤں کی قلمی تصاویر اس طرح سجائیں کہ ان کے جمیل و لطیف نقوش نے بلطرف ان کتابوں کا مطالعہ کرنے والوں کے دلوں میں ایمان و ایقان کی شمعیں فروزاں کیں، دوسری طرف ان کی آنکھوں کی روشنی بڑھائی۔ گویا علامہ نے اپنی

تصانیف کے ذریعے تاریخ و سوانح نگاری کا ایسا حسین و دقیع امتزاج پیش کیا جو ان سے پہلے اردو کے کسی دوسرے مصنف نے نہیں کیا تھا۔لیکن یہ سمجھنا درست نہیں ہے کہ علامہ شبلی کے علمی فتوحات کا دائرہ تاریخ و سوانح تک محدود ہے۔انھوں نے مسلمانوں کی گزشتہ تعلیم خصوصاً طرز تعلیم کا بھی نہایت تعمق فکر اور دیانت داری سے جائزہ لیا اور روم و مصر و شام کا سفرنامہ بھی لکھا اور اس وقت لکھا جب ہمارے یہاں بیرونی ممالک کے سفر اور سفرناموں کی روایت اتنی عام نہیں ہوئی تھی جتنی بعد میں ہوئی۔یہ سفر علامہ نے ۱۸۹۲ء میں کیا تھا اور سفرنامے کی تکمیل ۱۸۹۴ء میں ہوئی۔خود علامہ شبلی کے اعتراف کے بموجب یہ سفرنامہ مروج سفرناموں سے اس اعتبار سے مختلف ہے کہ اس میں بعض ایسی تفصیلات نہیں ہیں جو سفرناموں کا لازمی جزو سمجھی جاتی ہیں،یعنی "ملک کی حالت،انتظام کا طریقہ،عدالت کے اصول،تجارت کی کیفیت،عمارتوں کے نقشے"[۱] دراصل یہ سفرنامہ بڑی حد تک ان ملکوں کے علمی اور معاشرتی حالات تک محدود ہے۔اس کا سبب حیات شبلی کے فاضل مصنف مولانا سید سلیمان ندوی نے اس زمانے کی بین الاقوامی سیاست میں انگریزوں اور ترکوں کے اختلافات اور مسلمانان ہند کی ترکوں کے ساتھ ہمدردی کو قرار دیا ہے[۲] جو یقیناً درست ہے،لیکن میری ناچیز رائے میں اس کا ایک سبب خود علامہ شبلی کا ذوق بھی ہے جو ان کے دوسرے اذواق پر حاوی تھا۔انھوں نے اپنے اس سفرنامے میں مولانا ابوالکلام آزاد کے الفاظ میں سیاست کو احتیاط کی چھلنی میں کتنا ہی چھانا ہو پھر بھی سید صاحب کا ارشاد ہے کہ ایک طرف انگریزوں نے مولانا کے اس گناہ کو کبھی معاف نہیں کیا[۳] اور دوسری طرف "یہی وہ کتاب ہے جس سے کالج محمڈن اینگلو اورینٹل کالج علی گڑھ)اور مولانا کی تصنیفات میں ھد[ا]

فراق ہلینی و ہینگ کا اصول جاری ہوا[۵] علامہ کے متفرق مقالات و رسائل کا علمی محور جتنا وسیع ہے ان میں تحقیق و تفحص کا جو اعلیٰ اصول پیش نظر رکھا گیا ہے، معلومات کی جو فراوانی ہے اور اسلوب نگارش علمی ہونے کے ساتھ ساتھ جتنا شگفتہ اور دل نشین ہے اس کا اعتراف ہر صاحب نظر اور دیانت دار قاری اور نقاد کو ہے۔ ان میں سے کم دو رسالے ایسے ہیں جن کی طرف ہلکا سا اشارہ کرنا ضرور محسوس ہوتا ہے، ایک کتب خانہ اسکندریہ اور ایک الجزیہ۔ یورپین مصنفین نے اپنے خیال کے مطابق مسلمان فاتحین کی وحشت و بربریت ثابت کرنے کے لیے ان پر جو الزامات عائد کیے تھے ان میں ایک الزام جو بہت زور شور سے لگایا جاتا تھا، یہ تھا کہ جب حضرت عمرؓ کے دور خلافت میں مصر اور اسکندریہ فتح ہوئے تو عرب فاتحین نے وہاں کے قدیم اور مشہور یونانی کتب خانے کو جلا کر بھسم کر دیا۔ علامہ نے اس کی تردید میں جو مضمون لکھا اس نے دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی علٰحدہ علٰحدہ کر دیا یعنی یہ ثابت ہو گیا کہ یہ کتب خانہ مسلمانوں کی فتح مصر و اسکندریہ سے سینکڑوں برس پہلے برباد ہو چکا تھا[۶]

جزیہ ان امور میں سے ہے جن سے ماضی کے مسلمان خلفاء و سلاطین بلکہ (نعوذ باللہ) خود اسلام کو بدنام کرنے کا سب سے زیادہ کام لیا جاتا ہے۔ ایسے ہی بعض دوسرے امور جہاد، غلامی کی حلت، تعدد ازدواج وغیرہ ہیں۔ جزیے کا علامہ نے اپنے اس رسالے میں بہت غور و فکر اور شرح و بسط سے جائزہ لیا ہے اور ثابت کیا ہے کہ اس میں کوئی ایسی بات نہیں ہے جسے غیر مسلموں پر ظلم قرار دیا جا سکے۔ منجملہ دیگر تشریحات کے، جو دوسرے مسلمان اہل علم و قلم ہوا کرتے رہے ہیں، علامہ شبلی نے ایک ایسی بات لکھی ہے جو میرے نزدیک جزیے پر معاندین کے اعتراضات کو بالکل باطل کر دیتی ہے۔ یہ تو

سب جانتے ہیں کہتے ہیں کہ جزیہ ایک ایسا ٹیکس ہے جو اسلامی ریاست کے غیر مسلم شہریوں سے فوجی خدمت کے عوض لیا جاتا تھا۔ یہاں یہ سوال پیدا ہوتا تھا کہ اسلامی ریاست کے جو غیر مسلم شہری فوجی خدمت کے لیے آمادہ ہوں، ان کے ساتھ اس معاملے میں کیا رویہ ہوگا۔ بیشتر علماء کی رائے ہے کہ چونکہ جہاد اسلامی کا فریضہ ہے اس لیے اس میں غیر مسلموں کو شریک نہیں کیا جاسکتا لیکن علامہ شبلی نے بالتصریح لکھا ہے کہ اگر کسی موقع پر غیر قوموں نے فوج میں شریک ہونا یا شرکت کے لیے آمادہ ہونا گوارا کیا تو وہ جزیے سے بری کر دیے گئے"۔ اور پھر یہی موقف ترجمان القرآن میں مولانا ابوالکلام آزاد نے اختیار کیا ہے۔

تنقید کے میدان میں شعرالعجم علامہ شبلی کا شاہکار ہے۔ ہندوستان میں فارسی ادب وشعر کا ذوق آہستہ آہستہ ختم ہو رہا تھا، اس کو مہمیز کرنے میں اس کتاب کا بڑا حصہ ہے علامہ شبلی کی فارسی شعر وادب پر نگاہ وسیع بھی تھی اور عمیق بھی۔ ان کا ادبی ذوق نہایت لطیف تھا اور اس پر مستزاد ان کا دل نشین اسلوب نگارش۔ ان سب باتوں نے مل کر بلاشبہ اسے قدر اول کی تصنیف بنا دیا۔ یہ صحیح ہے کہ تحقیقی نقطۂ نظر سے اس پر ڈاکٹر محمود شیرانی اور بعد میں بعض دوسرے اہل علم نے اعتراضات کیے ہیں اور بعض کمیوں کی نشاندہی کی ہے۔ اول تو تحقیق ایسا موضوع ہے جس میں اختلاف اور اضافے کی گنجایش ہمیشہ رہتی ہے، دوسرے یہ فیصلہ تفصیلی محاکے کا محتاج ہے کہ اس معاملے میں کس کی رائے کس حد تک درست ہے۔ شعرالعجم کے علاوہ موازنہ انیس و دبیر اس میدان میں علامہ کا ایک دوسرا وقیع کارنامہ ہے، میں سمجھتا ہوں کہ میر انیس کو اردو شاعری میں ان کا جائز مقام دلانے میں موازنہ نے بڑا کام کیا ہے۔

علامہ شبلی شاعر بھی تھے۔ اردو اور فارسی میں ان کی قومی و ملی نظمیں اور فارسی میں انکی غزلیں انہیں شعراء کی صف میں بھی ممتاز مقام عطا کرتی ہیں۔ البتہ یہ صحیح ہے کہ شاعری کو انھوں نے اپنا روزمرہ کا مشغلہ نہیں بنایا تھا اور اس لیے وہ اس میں غالب یا اقبال نہیں بن سکے تاہم مولانا ابوالکلام کی رائے ہے کہ "ہندوستان میں فارسی شاعری غالب پر نہیں، ان پر ختم ہوئی"[۸]

میں نے ابھی تک علامہ کی دو نہایت اہم اور قابل ذکر لیکن اسی قدر متنازعہ فیہ تصانیف یعنی علم الکلام اور کلام کا تذکرہ نہیں کیا ہے۔ میری نظر سے اپنی تعلیم کے ابتدائی دور میں الفاروق گزر چکی تھی لیکن اس مطالعے کو میں سرسری مطالعہ ہی قرار دے سکتا ہوں۔ الفاروق اور علامہ کی بعض دیگر تصانیف کا توجہ سے مطالعہ کرنے کا موقع مجھے بعد میں ملا اور اس ذوق کی افزائش میں علم الکلام اور الکلام ہی نے حصہ لیا۔ بی۔ اے میں میرا ایک اختیاری مضمون فلسفہ بھی تھا اور ہمارے فلسفے کے نصاب میں ایک پرچہ مسلم فلسفے کا شامل تھا۔ جب میں نے فلسفہ خاص طور سے مسلم فلسفہ پڑھا تو طبیعت علامہ شبلی کی تصانیف علم الکلام اور الکلام کے مطالعے کی طرف راغب ہوئی۔ اس طرح علامہ کی یہ پہلی دو تصانیف ہیں جن کا میں نے کسی قدر غائر نظر سے مطالعہ کیا اور انہی کے مطالعے سے میرے اندر علامہ کی دیگر تصانیف کے مطالعے کا شوق پیدا ہوا۔ مولانا سید سلیمان ندوی کی شہادت کے مطابق علامہ شبلی علم الکلام اپنی ناقص تصنیف تسلیم کرتے تھے[۹] سید صاحب نے حیات شبلی میں علامہ کا یہ قول بھی نقل کیا ہے، بلکہ اس بارے میں ان کا عکس تحریر بھی حیات شبلی میں شامل کر دیا ہے کہ "میں عقائد اسلام اور مسائل فقہیہ دونوں میں حنفی ہوں۔[۱۰] لیکن میں اعتراف کر

چاہتا ہوں کہ ان دونوں کتابوں کے مطالعے کے بعد میری نظر میں کچھ مدت کے لیے معتزلہ کی وقعت پیدا ہو گئی تھی۔

چونکہ اس مقالے کا موضوع علامہ شبلی نعمانی کے تصنیفی کارنامے نہیں ہے، اس لیے ان کی گرانقدر تصانیف بالخصوص ان تصانیف کی طرف چند سرسری اشارے ہی کرنے پر اکتفا کی گئی ہے جو مہدی افادی صاحب مرحوم کے کھینچے ہوئے حصار سے باہر ہیں۔ اس کی ضرورت اس لیے محسوس کی گئی کہ بعض دیگر امور جو آیندہ صفحات میں زیر بحث آئیں گے ان کی کیفیت بھی ہمارے نزدیک اس سے کچھ زیادہ مختلف نہیں ہے جو علامہ کی تصنیفی حیثیت کے بارے میں ان کے ایک مخلص دوست اور مداح خصوصی نے غالباً محض جوش انشا پردازی میں ظاہر کی تھی۔

علامہ شبلی کی ولادت جیسا کہ معلوم ہے مئی[ع] ۱۸۵۷ء کے اس دور میں ہوئی تھی جب ہندوستان کی قسمت کا آخری فیصلہ ہو رہا تھا۔ اس فیصلے کے نتائج بہت ہمہ گیر، دور رس اور دیرپا ثابت ہوئے۔ ان نتائج سے نبرد آزما ہونے کے لیے ہندوستان کے بالعموم اور مسلمانوں کے بالخصوص جن باہمت، ذی شعور اور دور اندیش اکابر نے جو طریقے سوچے اور ان پر عمل پیرا ہونے کی کوشش کی ان میں سے بعض سے اپنے اپنے ذوق اور رجحان طبع کے مطابق اتفاق یا اختلاف کیا جا سکتا ہے، لیکن میری ناچیز رائے میں کسی کی نیک نیتی پر شبہ مناسب نہیں ہوگا۔ ان اکابر میں علامہ شبلی کا نام نامی بھی شامل ہے اور قدرتی طور پر جب انہوں نے اپنی سوچی سمجھی رائے اور لائحہ عمل کو بروئے کار لانے کی کوشش کی تو ان کا بعض دوسرے اکابر ملت سے ایک حد تک اختلاف ناگزیر تھا۔

ع اب یہ ثابت ہو چکا ہے کہ علامہ کی پیدائش ۴ جون کو ہوئی تھی۔ (ض)

علامہ شبلی کے تین بھائی تھے اور وہ ان سب میں بڑے تھے۔ یہ بہت عجیب اور بامعنی اتفاق ہے کہ ان کے والد ماجد شیخ حبیب اللہ نے اپنے اور سب بیٹوں کو تو انگریزی تعلیم دلائی لیکن بڑے بیٹے محمد شبلی کے لیے وقت کے رواج کے مطابق دینی تعلیم کا بندوبست کیا۔ اس کا ظاہری سبب جیسا کہ مولانا سید سلیمان ندوی نے حیات شبلی میں لکھا ہے' یہ تھا کہ سرسید کے تعلیمات کے زیر اثر شیخ صاحب کو اولاد کی انگریزی تعلیم کی طرف توجہ بعد میں ہوئی۔[۱] لیکن ہمارے عرض کرنے کا مقصد یہ ہے کہ اگر علامہ شبلی نے بھی وہی تعلیم حاصل کی ہوتی تو بعد میں وہ نہ بن سکتے جو بنے بلکہ اپنے دوسرے بھائیوں کی مانند یا ایک کامیاب وکیل ثابت ہوتے یا سرکار انگلشیہ میں اس وقت کے پیمانوں کے مطابق کسی اعلیٰ عہدے پر فائز ہو جاتے۔ یہ تو ممکن تھا کہ سرسید کی طرح کسی وقت قومی اور ملی خدمت کا جذبہ انہیں غیر ملکی حکومت کی ملازمت سے دست کش ہو کر اس خدمت کے لیے وقف کر دیتا، پھر بھی عالم دین ہوتے ہوئے یا عالم دین ہونے کے بسبب انہیں قدیم وجدید کی جس کش مکش سے گزرنا پڑا اور اس کش مکش نے ان کی شخصیت کے جو جوہر چمکائے اور ان کی ذات میں جو دلآویزی پیدا کی اس سے دنیا محروم رہ جاتی۔ یہاں ان کے تعلیمی کوائف کا ذکر ہمارے خیال سے غیر ضروری ہے کیونکہ یہ کوائف اس زمانے کے بیشتر اہل علم میں مشترک ہیں۔ ان کے اساتذہ میں یقیناً بعض بہت لائق فائق اور اپنے اپنے فن میں ماہر علماء شامل تھے، مثلاً حدیث میں مولانا احمد علی سہارنپوری اور ادب میں مولانا فیض الحسن لیکن وہ پارس جس سے مس ہو کر کے محمد شبلی خالص سونا بنے بلاشبہ مولانا محمد فاروق چریا کوٹی تھے۔ کبھی کبھی ایسا ہوتا ہے کہ کسی ایک استاد، شیخ یا مصلح کی صحبت وہ کام کر جاتی ہے جو دوسروں کا عمر بھر کا ساتھ نہیں کر سکتا ہے۔ ہاں البتہ

بعد کا مطالعہ و مشاہدہ سونے پر سہاگے کا کام ضرور کرتا ہے۔ مکاتیب ڈاکٹر سر محمد اقبال مرتبہ شیخ عطاء اللہ مرحوم کے پیش لفظ میں مولانا حبیب الرحمن خاں شروانی نے کتنا صحیح لکھا ہے: "اقبال کو خوش بختی سے اپنے وطن سیالکوٹ کے کالج میں بقول سر شیخ عبدالقادر علمائے سلف کی یادگار اور ان کے نقش قدم پر چلنے والے ایک بزرگ مولوی سید میر حسن صاحب کی شاگردی کی سعادت حاصل ہوئی۔۔۔ اقبال نے فارسی اور عربی کی تحصیل مولوی صاحب موصوف سے کی۔ اصل بنیاد اقبال کے اردو اور فارسی ادب میں بلند پایہ، ممتاز عصر، با معرفت ادیب ہونے کی یہ ہوئی۔ اس میں شک نہیں کہ یوروپ کی صحبت و تعلیم نے سونے پر سہاگے کا کام دیا مگر سونا پرانی کان کا تھا۔ آج کے تعلیم یافتہ سہاگہ ڈالتے ہیں مگر سونا کہاں۔ جلا آجاتی ہے، جوہر نہیں پیدا ہوتے"[۱۲] علامہ شبلی کو ڈاکٹر سر محمد اقبال کی مانند "یوروپ کی صحبت و تعلیم" تو میسر نہیں آئی لیکن علی گڑھ میں سر سید، پروفیسر آرنلڈ اور بعض دوسرے اہل علم اور علم دوست اکابر کی صحبت و رفاقت نے اس کمی کو ایک حد تک پورا کیا اور بقول مولانا سید سلیمان ندوی "مولانا کو کالج (ایم۔ اے۔ او کالج، علی گڑھ) آکر سب سے بڑا فائدہ یہ پہونچا کہ یوروپ کے خیالات اور علمی تحقیقات سے آگاہی کا موقع ملا"[۱۳] لیکن بات وہی ہے کہ سونا پہلے سے موجود تھا، سہاگہ پڑا تو جوہر چمک اٹھے۔ مولانا شروانی نے اس پہلو پر اظہار خیال کیا ہے "علامہ شبلی کی صداقت اور قوت دماغی یہ تھی کہ وہ جدید اصول کے طمطراق سے مرعوب نہیں ہوئے بلکہ اس پر اطمینان سے غور کیا، جو اصول عمدہ تھے ان کو اخذ کیا۔۔۔ نمائشی چیزوں کو رد کر دیا"[۱۴] بات آگے بڑھ گئی، ذکر علامہ شبلی کی تعلیمی زندگی کا ہو رہا تھا۔ اس کے لیے معذرت خواہ ہوں۔

علامہ شبلی نے والد ماجد کے حسب منشا وکالت کی تعلیم بھی حاصل کی اور کچھ مدت وکالت کرنے کی کوشش بھی کی لیکن طبیعت کا رجحان اُدھر نہیں تھا، جلدی چھوڑ بیٹھے۔ مختلف محکموں میں بعض چھوٹی موٹی ملازمتیں بھی کیں لیکن ان ملازمتوں کے آداب نبھانا دشوار تھا۔ لہذا ان سے بھی دست بردار ہو گئے۔ کچھ عرصہ پرانے زمینداروں کے طریقے کے مطابق والد محترم کے نیل سازی کے کام کی نگرانی بھی کی لیکن یہ بھی ان کے بس کا کام نہ تھا۔ زیادہ دیر تک اس سے بھی منسلک نہیں رہ سکے[15] اس پس منظر کے ساتھ علامہ شبلی ۱۸۸۱ء میں جب کہ ان کی عمر ۲۴ سال تھی، علی گڑھ پہونچے اور سرسید کی خدمت میں حاضر ہو کر ان کی شان میں ایک قصیدہ پیش کیا[16] یہ ملاقات پیش خیمہ ثابت ہوئی، ان کے علی گڑھ اور سرسید سے مستقل تعلق کا اور ان کی کتاب زندگی کے ایک نئے باب کے آغاز کا۔ ۱۸۸۳ء میں وہ ایم۔ اے۔ او کالج میں عربی کے استاد مقرر ہوئے[17]۔ یہاں یہ بات ذہن نشین رکھنی ضروری ہے کہ اس وقت سرسید کی عمر ۶۶ سال تھی اور علامہ شبلی کی ۲۶ سال۔ سرسید علامہ شبلی سے عمر میں ۴۰ سال بڑے تھے۔ پھر وہ کالج کے سکریٹری اور حاکم اعلیٰ تھے اور علامہ شبلی کا تقرر اس کے ایک شعبے میں معلم کی حیثیت سے ہوا تھا۔ گویا دونوں کی معاصرت محض برائے نام تھی، اصلی رشتہ بزرگی اور خوردی یا افسری اور ماتحتی کا تھا۔ سرسید نے علامہ شبلی کی ذہانت اور شوق مطالعہ کا اندازہ اول روز ہی کر لیا تھا اور ان کی ہمت افزائی پر آمادہ ہو گئے تھے۔ چنانچہ انھوں نے اپنا قیمتی کتب خانہ علامہ شبلی کے لیے وقف کر دیا اور علامہ شبلی نے اس سے جی بھر کر استفادہ کیا[18]۔ آہستہ آہستہ ان کے تعلقات کالج سے براہ راست اور بالواسطہ متعلق دیگر اہل علم سے استوار ہوئے۔ مختلف علمی موضوعات پر ان سے تبادلۂ خیال ہونے لگا اور علمی لین دین

کا سلسلہ شروع ہو گیا یعنی علامہ شبلی نے طالب علموں اور احباب کو کچھ دینے کے ساتھ
ان سے سیکھنے اور اخذ کرنے میں بھی تامل نہیں کیا۔ یہی قدیم علمائے اسلام کی روایت تھ
بالخصوص اسلام عربوں کے ذریعہ جن ممالک میں پہنچا عربوں نے جہاں انہیں ایمان
دولت عطا کی اور عربی زبان کا تحفہ پیش کیا وہاں جو کچھ لینے کے قابل تھا ان سے وہ لینے
بھی پس و پیش نہیں کی۔ یونان سے فلسفہ اور طب ایران سے فن تعمیر اور دیگر تہذیبی امو
اور ہندوستان سے ریاضی اور اقلیدس میں بہت کچھ حاصل کیا تاہم یہ بھی امر واقعہ
کہ ان ممالک سے جو کچھ لیا تھا اس میں اپنی طرف سے مزید اضافہ کرکے دنیا کے گوشے
گوشے میں پھیلا دیا۔ جو علوم زیر زمین دفن ہو چکے تھے یا جن کا حلقہ اثر کسی ایک ملک کی
چہار دیواری میں محدود تھا مسلمانوں کی بدولت ان کی روشنی ساری دنیا میں پھیلی اور
عہد تاریکی کا خاتمہ ہوا۔ اب یہ امر آخر ہے اور اس وقت ہمارے موضوع سے خارج
ہے کہ دوسروں بالخصوص مغربی ممالک نے ان علوم کو کہاں سے کہاں پہنچا دیا اور
ہم کہاں رہ گئے۔ بہر حال علامہ شبلی نعمانی اس روایت کے وارث تھے اور انہوں نے
اس وراثت کا حق ادا کیا۔ انہوں نے ایک طرف علی گڑھ کے طالب علموں میں عربی ز
و ادب سے شغف پیدا کرنے کی ہر امکانی کوشش کی اور دوسری طرف ان میں
جذبات کے فروغ سے پوری دلچسپی لی۔ کالج میں اور کالج سے باہر بھی علامہ کی شہرت
اور مقبولیت کا ایک بڑا ذریعہ ان کی شاعری ثابت ہوئی۔ علی گڑھ سے علامہ نے
استفادہ کیا اس کا اعتراف ان کے شاگرد رشید اور فاضل سوانح نگار مولانا سید سلیما
ندوی نے بہت فراخدلی سے کیا ہے اور بتایا ہے کہ وہاں رہ کر ان کی شاعری کا رنگ
بھی بدلا، انگریزی تعلیم کی ضرورت کا احساس بھی ہوا، بعض ایسی غیر ملکی بالخصوص م

تصانیف سے واقفیت بھی ہوئی جو اس سے پہلے نہیں ہوئی تھی اور تاریخی ذوق بھی نمایاں ہوا اور سب سے بڑھ کر یہ کہ یورپ کی تحقیقات علمیہ سے آگاہی ہوئی جس کا سب سے بڑا ذریعہ پروفیسر آرنلڈ بنے [۱۹] پروفیسر آرنلڈ اور علامہ شبلی کے تعلق کا کچھ ذکر اوپر گزرا ہے۔ دونوں میں دوطرفہ استادی شاگردی کا رشتہ بھی قائم ہوا یعنی علامہ شبلی نے پروفیسر آرنلڈ سے کسی قدر فرنچ سیکھی اور پروفیسر آرنلڈ نے ان سے عربی کی تحصیل کی [۲۰] یہاں موضوع سے کسی قدر انحراف کر کے جو دراصل انحراف ہے بھی نہیں، یہ عرض کرنا دلچسپی سے خالی نہیں ہوگا کہ علامہ شبلی اور پروفیسر آرنلڈ کے باہمی مراسم پر مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی کا جو اقتباس اوپر نقل کیا گیا ہے، اس پر شیخ محمد اکرام نے یادگار شبلی میں یہ اعتراض کیا ہے کہ "... آرنلڈ کالج میں ۱۸۸۸ء میں آیا ... اس وقت تک شبلی کی کایا پلٹ ہو چکی تھی۔ اس میں جتنا دخل سرسید کو تھا کسی اور کو نہ تھا" [۲۱]

توجہ طلب یہ امر ہے کہ پروفیسر آرنلڈ کے علامہ شبلی پر اثرات کے اعتراف کا یہ مطلب کیسے ہوا کہ کسی اور (بالخصوص سرسید) کا اثر انہوں نے قبول نہیں کیا تھا۔ یہاں یہ امر بھی پیش نظر رہنا چاہیے کہ جہاں علامہ شبلی نے علی گڑھ کے صالح اثرات قبول کیے، وہاں اس کے کمزور پہلو بھی ان کی نظر سے اوجھل نہیں رہے۔ انگریزی تعلیم کی سطحیت انگریزی تعلیم یافتہ نوجوانوں (بالخصوص اس وقت کے نوجوانوں) کی ظاہری ٹیپ ٹاپ اور پورے ماحول کا کھوکھلا پن ان پر شروع ہی سے آشکار تھا جس کا اظہار انہوں نے اپنے بعض اعزہ کے نام خطوط میں اول روز سے کیا۔ تاہم وہ برابر اس امر میں کوشاں رہے کہ وہاں طلبہ میں صحیح علمی ذوق پیدا ہو، بالخصوص عربی اور فارسی زبان وادب سے انہیں مناسبت ہو جائے اور اپنی اس کوشش میں وہ ایک حد تک کامیاب بھی

ہوئے۔ ساتھ ہی درس قرآن مجید کے ذریعہ اور اپنی تقریروں اور گفتگو کے وسیلے سے طلبہ میں مذہبی رجحانات پیدا کرنے کا عمل برابر جاری رکھا اور اس میں بھی نمایاں کامیابی حاصل کی۔ تاہم یہ ایک ایسی حقیقت ہے جس سے صرف نظر ممکن نہیں کہ ایم۔ اے۔ او کالج یا اس کی جانشین علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے مقاصد دارالعلوم دیوبند یا ندوۃ العلماء لکھنؤ کے مقاصد سے بنیادی طور پر مختلف تھے، اس لیے ان میں ہم آہنگی ایک حد تک ہی پیدا کی جاسکتی تھی اور اب بھی یہی صورت حال ہے۔ عرض کرنے کا مطلب یہ ہے کہ علامہ شبلی یا کوئی دوسرے بزرگ علی گڑھ میں نہ عربی علوم کی جڑیں اتنی گہری پیوست کر سکتے تھے جتنی عربی مدارس میں ہیں اور نہ وہ مذہبی ماحول پیدا کر سکتے تھے جو ان اداروں کا ہے۔ یہی بات دوسری طرح بھی عرض کی جاسکتی ہے یعنی دیوبند یا ندوۃ العلماء میں انگریزی اور عصری تعلیم کا اس حد تک نفاذ ممکن نہیں ہے جس حد تک مغربی طرز کی علمی درسگاہوں میں ہے۔

سرسید نے مسلمانوں کے امراض کے لیے جو نسخہ تجویز کیا تھا اس کا سب سے بڑا جز انگریزی زبان کے ذریعہ مغربی علوم کا حصول تھا۔ ایم۔ اے۔ او کالج میں عربی، فارسی اور دینیات کی تعلیم کا اہتمام بھی کیا گیا لیکن وہاں ان کی حیثیت ثانوی ہی رہی، بنیادی اہمیت انگریزی زبان و ادب، سائنس یا زیادہ سے زیادہ سماجی علوم کی تھی۔ بلکہ ایمانداری کی بات یہ ہے کہ حصولِ آزادی کے بعد وہ علوم جنھیں ہم مشرقی علوم کہتے ہیں انھوں نے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں نسبتاً زیادہ اہمیت حاصل کر لی ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ بدلے ہوئے حالات کا تقاضا ہے۔

یہاں سلسلۂ کلام میں تھوڑا سا خلل ڈال کر کچھ علی گڑھ تحریک کے بارے میں

عرض کرنا ضروری محسوس ہوتا ہے جیسا کہ اوپر عرض کیا گیا، ۱۸۵۷ء کے المیے کے بعد مسلمانان ہند میں بیداری اور بدلتے ہوئے حالات سے مقابلہ کرنے کی صلاحیت پیدا کرنے کے لیے مختلف گوشوں سے جو کوششیں کی گئیں ان میں ایک نہایت اہم اور بار آور کوشش وہ تھی جو علی گڑھ کی سرزمین سے سرسید احمد خاں نے کی۔ سرسید کی اپنی تعلیم قدیم طرز پر ہوئی تھی۔ وہ ۱۸۵۷ء کے المیے سے پہلے ایسٹ انڈیا کمپنی اور اس المیے کے بعد انگریزی سرکار میں مختلف عہدوں پر فائز رہے تھے لیکن ایک وقت آیا کہ انھوں نے محسوس کیا کہ مسلمانان ہند کی خدمت ذاتی منفعت کے کاموں پر فوقیت رکھتی ہے۔ چنانچہ وہ ملازمت سے دست بردار ہوکر اُدھر متوجہ ہوگئے۔ دراصل انھوں نے یہ کام اپنے دوران ملازمت ہی سے شروع کردیا تھا۔ انھوں نے اس سمت میں جو مختلف اقدامات کیے ان کا دائرہ بہت وسیع ہے۔ انھوں نے سائنٹفک سوسائٹی کی بنیاد رکھی، مدرسۃ العلوم قائم کیا، آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کی تاسیس کی، اسباب بغاوت ہند لکھی، تہذیب الاخلاق کا اجراء کیا، یہاں تک کہ قرآن مجید کی تفسیر بھی لکھی۔ سوچنے کی بات یہ ہے کہ کیا یہ سب سرسید کے جداگانہ نوعیت کے اقدامات تھے، یا ان میں کوئی رشتۂ اشتراک تھا۔ میری ناچیز رائے میں دراصل یہ ان کے ایک وسیع منصوبے کے اجزائے ترکیبی تھے اور وہ منصوبہ تھا مسلمانوں میں بیداری، روشن خیالی اور وسیع النظری پیدا کرکے انھیں باعمل بنانا اور مغرب سے درآمد شدہ نئے چیلنج کا مقابلہ کرنے کی ان میں صلاحیت ابھارنا۔ ان کا سارا زور سائنٹفک نقطۂ نظر اور عقل کی بالادستی پر تھا۔ ان کے نزدیک مسلمانوں میں یہ اوصاف انگریزی زبان کے ذریعہ مغربی علوم بالخصوص سائنس کی تحصیل ہی سے پیدا ہوسکتے تھے۔ سرسید سمجھتے تھے کہ

انہیں اپنے اس مقصد میں اس وقت تک کامیابی نہیں ہو سکتی جب تک حکومت وقت کا پورا تعاون حاصل نہ ہو، اسی لیے وہ انگریزوں سے موالات کے حامی تھے۔ انگریزی یا مغربی علوم کی تحصیل کے ساتھ مغربی تمدن کا سماج میں نفوذ اس وقت کے حالات میں ناگزیر تھا اور سرسید اور ان کے رفقا نے اس کی حوصلہ شکنی نہیں، حوصلہ افزائی کی۔

علامہ شبلی جس ذہنی اور علمی پس منظر کے ساتھ علی گڑھ آئے تھے اس کی موجودگی میں وہ ان اقدامات کا ایک حد تک ہی ساتھ دے سکتے تھے اور سرسید کے دوش بدوش کچھ فاصلے ہی تک چل سکتے تھے۔ شیخ محمد اکرام نے یادگار شبلی میں لکھا ہے "حقیقت یہ ہے کہ شبلی کی ذہنی اور علمی ساخت میں (ان کی غیر معمولی طبعی صلاحیتوں کو چھوڑ کر) سب سے بڑا حصہ دو شخصوں کا تھا، مولانا محمد فاروق چریاکوٹی اور سرسید کا۔ شبلی مولانا چریاکوٹی کے زیر اثر اس زمانے میں رہے جب ذہن انسانی ایک لوح سادہ کی طرح اثر پذیر ہوتا ہے۔ اس لیے مولانا محمد فاروق کا اثر سب سے دیرپا ثابت ہوا۔ پھر ایک زمانے میں شبلی سرسید کے رنگ میں رنگے گئے۔ یہ رنگ ایک زمانے میں دھلنا شروع ہو گیا"[۲۲]۔

شیخ صاحب نے تو یہ باتیں بطور تعریض لکھی ہیں لیکن یہ درست ہے کہ علامہ شبلی کی ابتدائی تعلیم و تربیت نے ان پر جو رنگ چڑھایا تھا کوئی دوسرا رنگ اس پر پوری طرح غالب نہیں آسکا۔ میرے خیال سے اثر اندازی اور اثر پذیری کا معاملہ بہت عجیب اور پیچیدہ ہے۔ کسی شخص پر کسی دوسرے شخص کے اثرات کا ذکر کرتے ہوئے اکثر مبالغے سے کام لیا جاتا ہے۔ ہر سوچنے والے ذہن اور محسوس کرنے والے دل کا حامل انسان اپنی زندگی کے مختلف مراحل پر مختلف شخصیتوں سے متاثر ہوتا ہے لیکن ایسا بہت کم ہوتا ہے کہ یہ اثر اس کی پوری زندگی پر حاوی ہو۔ اثر جزوی بھی ہو سکتا ہے اور وقتی بھی اور یہ نہ کوئی

حیرت انگیز بات ہے اور نہ لائق تحذیر اور پھر بعض اوقات طبائع کی یکسانیت کو اثر اندازی اور اثر پذیری کا نام دے دیا جاتا ہے۔

عرض کرنے کا مقصد یہ ہے کہ علامہ شبلی کے سرسید اور علی گڑھ تحریک سے اختلافات کے ظاہری اسباب جو بھی رہے ہوں میرے نزدیک اس کا بیج ان کی طبیعت میں ابتدا ہی سے موجود تھا۔ وہ ۲۴ سال کی مختصر عمر میں علی گڑھ آئے تھے لیکن اس وقت بھی انکی شخصیت ایک خاص سانچے میں ڈھل چکی تھی۔ البتہ یہ صحیح ہے کہ ابھی یہ سانچہ پختہ نہیں ہوا تھا۔ انہوں نے سرسید اور علی گڑھ کے بعض دوسرے اشخاص اور وہاں کے جدید علمی ماحول سے استفادہ کیا اور علی گڑھ کو بھی اپنی ذہنی اور علمی صلاحیتوں سے فائدہ پہنچایا۔ ان کی نظر میں علی گڑھ تحریک کی بعض خامیاں شروع سے تھیں اور وہ حتی الامکان ان خامیوں کو دور کرنے کی کوشش کرتے رہے۔

مولانا سید سلیمان ندوی نے حیات شبلی میں علامہ شبلی کے سرسید سے اختلافات کا تفصیلی جائزہ لیا ہے۔ ہمارے سامنے سرسید سے ان کا پہلا اختلاف الفاروق کی تصنیف کے سلسلے میں آتا ہے۔ علامہ شبلی نے مسلمانوں میں نئی روح اور تازہ زندگی پیدا کرنے کے لیے ناموران اسلام کے سوانح لکھنے کا ایک ہمہ گیر منصوبہ بنایا تھا۔ ان کی نظر میں اسلاف کرام میں سب سے جامع شخصیت حضرت عمر فاروقؓ کی تھی۔ اس لیے وہ قدرتی طور پر ان کے سوانح لکھنے کی طرف مائل تھے۔ سرسید کو اندیشہ تھا کہ یہ تصنیف شیعہ سنی اختلافات کو بڑھاوا دینے کا سبب ہو سکتی ہے جو کالج کے مفاد میں نہیں ہوگا۔ اس بارے میں نواب عماد الملک سید حسین بلگرامی کو حکم بنایا گیا۔ نواب صاحب ایک ممتاز شیعی رہنما اور ایم۔ اے او کالج کے ہمدرد اور معاون تھے۔ ان کا فیصلہ علامہ شبلی کے حق میں تھا۔

پھر بھی سرسید کا اندیشہ دور نہیں ہوا۔ اس اختلاف رائے نے علامہ شبلی کے ارادے میں بھی تزلزل پیدا کیا[۲۳] لیکن ہمیں اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرنا چاہیے کہ بالآخر یہ کتاب علامہ شبلی کے ذہن سے سفحۂ قرطاس پر منتقل ہوکر زیور طبع سے آراستہ ہوئی۔ کیونکہ اس سے ایک طرف ہمارے سوانحی لٹریچر میں بیش بہا اضافہ ہوا اور دوسری طرف اردو داں طبقے کی نظر میں حضرت فاروق اعظمؓ کا صحیح مقام متعین ہوا۔

سرسید سے علامہ شبلی کے اختلافات مذہبی آرا میں بھی تھے اور سیاسی امور میں بھی۔ ایک حد تک علامہ شبلی نے اپنے موقف میں لچک بھی پیدا کی لیکن جیسا کہ اوپر عرض کیا جا چکا ہے وہ ان مسائل میں سرسید کا ساتھ ایک حد تک ہی دے سکتے تھے اس سے زیادہ نہیں۔ جہاں تک مذہبی افکار کا تعلق ہے سرسید کا نقطۂ نظر کئی معاملات میں جمہور علماء سے مختلف تھا۔ وہ مسلمانوں کی نہ صرف دنیوی بلکہ دینی اصلاح بھی مغربی فکر سے ہم آہنگی میں مضمر سمجھتے تھے۔ اس رائے کا اظہار انہوں نے اپنے رسالے تحریر فی اصول التفسیر میں کیا ہے[۲۴] یہی ان کے اور جمہور علماء کے مذہبی مسلک کا نقطۂ انفصال ہے اور اس میں علامہ شبلی نعمانی کا استثنیٰ نہیں ہے۔ سیاسی امور میں علامہ شبلی ترکی خلافت کے مداح اور کانگریس کے حامی تھے۔ اس کے بخلاف سرسید انگریزی حکومت سے مکمل تعاون کے قائل تھے۔ ان کے نزدیک ۱۸۵۷ء کی بغاوت کی پسپائی کے نتیجے میں مسلمانوں کی تباہی کا مداوا اسی صورت میں ہو سکتا تھا کہ وہ سیاست سے کنارہ کش ہوکر ہمہ تن حصول تعلیم میں مشغول ہو جاتے۔ مولانا سید سلیمان ندوی نے حیات شبلی میں ان دونوں کے سیاسی اختلافات کا ایک سبب یہ بھی بتایا ہے کہ سرسید شخصی طرز حکومت کو ترجیح دیتے تھے اور علامہ شبلی جمہوری نظام حکومت کو[۲۵] ہم دیکھ چکے ہیں کہ اگرچہ علامہ شبلی نے

اپنے سفرنامہ مصر و روم و شام میں حتی الامکان سیاسیات کے ذکر سے پہلو تہی کی تھی تاہم علی گڑھ کی سیاست اس کی بھی روادار نہیں ہو سکی تھی۔ دراصل کسی ادارے کو چلانے کے لیے حکومت وقت کا تعاون خصوصاً اس صورت میں کہ وہ ادارہ حکومت سے امداد بھی لیتا ہو، ناگزیر ہے۔ خود علامہ کو بھی پہلے ایم۔ اے۔ او کالج اور پھر ندوۃ العلماء سے وابستگی کے دوران اپنی سیاسی آراء میں اعتدال پیدا کرنا پڑا تھا اور بعض ایسے امور انجام دینے پڑے تھے جو وہ شاید آزادانہ زندگی گذارنے کی صورت میں انجام نہ دیتے۔ تاہم اس میں شبہ نہیں کہ ان کا رجحان ان کے حبیب لبیب مولانا حبیب الرحمن خاں شروانی کی شہادت کے مطابق "جدید سیاسی تحریک" یعنی کانگریس کی قومی تحریک کی جانب ہو گیا تھا۔[26] اور وہ صدر اسلام کی روایات کے بموجب جمہوری نظام حکومت کو پسند کرتے تھے۔

(باقی)

حواشی

[1] مہدی افادی: افاداتِ مہدی، حیدرآباد، ۱۹۵۶ء: ۲۲۷ [2] سید سلیمان ندوی: حیاتِ شبلی، اعظم گڑھ، ۱۹۴۳ء: ۲۲۰ [3] ایضاً: ۲۲۰ [4] ایضاً: ۳۲۲ [5] ایضاً: ۲۲۴ [6] ایضاً: ۲۲۶ [7] مقالاتِ شبلی ج ۱، اعظم گڑھ، ۱۹۵۴ء: ۲۲۵ [8] ابوالکلام آزاد و صدر یار جنگ: کاروانِ خیال، بجنور، ۱۹۴۶ء: ۹۴ [9] حیاتِ شبلی: ۴۰۳ [10] ایضاً، مقابل ص ۴۲۸ [11] ایضاً: ۴۲۰ [12] حبیب الرحمن خاں شروانی: مقالاتِ شروانی، علی گڑھ ۱۹۴۸ء: ۳۹۰-۹۱ [13] حیاتِ شبلی: ۱۳۹ [14] ایضاً: ۱۳۹-۴۰ [15] ایضاً: ۱۱۱-۱۷ [16] ایضاً: ۱۱۸ [17] ایضاً: ۱۲۲ [18] شیخ محمد اکرام: یادگارِ شبلی، لاہور ۱۹۹۴ء: ۸۸ [19] حیاتِ شبلی: ۱۳۲-۳۹ [20] ایضاً: ۱۴۰ [21] یادگارِ شبلی: ۸۷ [22] ایضاً: [23] حیاتِ شبلی: ۲۳-۲۷ [24] پروفیسر ثریا حسین: سرسید احمد خاں اور ان کا عہد، علی گڑھ ۱۹۹۳ء: ۱۵۳ [25] حیاتِ شبلی: ۴۹۴ [26] حیاتِ شبلی: ۴۹۸

عباسی عہد کا مشہور زہدیہ شاعر ابوالعتاہیہ

از جناب عبدالجبار صاحب - علی گڑھ

(۲)

ابوالعتاہیہ کی زہدیہ شاعری

ابوالعتاہیہ کے مفصل حالات تحریر کرنے کے بعد ہم اب اس کی زہدیہ شاعری پر بحث و تبصرہ کرنا مقصود ہے، لیکن اس سے قبل ابوالعتاہیہ سے پہلے کی عربی شاعری میں بھی زہد کا عنصر تلاش کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے۔

جاہلی شاعری میں زہد کا عنصر دورِ جاہلیت کے شعراء کو ہم تین طبقوں میں تقسیم کر سکتے ہیں۔
(۱) یہودی و نصرانی شعراء، (۲) حنیفی یعنی حضرت ابراہیمؑ کو ماننے والے شعراء، (۳) بت پرست اور مشرک شعراء۔

اول الذکر دونوں طبقوں کے شعراء کے کلام میں دنیا سے بے رغبتی، آخرت کے لئے فکرمندی، قبر اور حشر و نشر کے تذکرے، دنیا کی ناپائداری اور دنیوی زندگی کی ناپائداری وغیرہ کا تذکرہ ملتا ہے۔ یہ لوگ اس بات کے قائل تھے کہ کائنات کا ایک خالق ہے جس کی عبادت کرنی چاہئے، مرنے کے بعد انسان کو اپنے اعمال کی جزا سزا ملے گی۔ اس لئے آخرت کی تیاری اور نیک اعمال کی جانب بیش از بیش توجہ کرنی چاہیے، اسی تصور نے زہدیہ افکار و خیالات کو جنم دیا اور ہر مکتبۂ فکر کے شعراء نے اپنے عقیدہ و نظریہ کے

مطابق اپنی شاعری میں زاہدانہ افکار و خیالات پیش کیے۔ اس اعتبار سے نصرانی شعراء میں قس بن ساعدہ الایادی امیہ ابن ابی الصلت، عدی بن زید، اور طرفہ ابن العبد کا نام سرفہرست ہے۔ امیہ وبن ابی الصلت کے اشعار ملاحظہ کیجئے:

الست ترىٰ فيما مضىٰ لك عبرة   فمه لا تكن يا قلب اعمىٰ ملدد

فكن خائفا للموت والبعث بعده   ولا تك ممن غره اليوم او غد

فانك فى دنيا غرور لاهلها   وفيها عدو كاشح الصدر يوقد[1]

ان اشعار میں شاعر دنیا کے رنگ بدلتے حالات اور انسانی احوال کے انقلاب کا ذکر کرنے کے بعد موت سے ڈرنے اور آخرت کی تیاری کی دعوت دیتا ہے اور ساتھ ہی دنیا کے دھوکہ سے بچنے کی تلقین کرتا ہے اور کہتا ہے کہ انسان کو ماضی پر نظر رکھنی چاہیے کیونکہ جس طرح وہ ختم ہوگیا اسی طرح کا حال اس کا بھی ہونے والا ہے۔

حنفیت سے تعلق رکھنے والے شعراء میں زہیر بن ابی سلمی، لبید بن ربیعہ کا نام زہدیہ افکار و خیالات پیش کرنے میں زیادہ مشہور ہے۔ خاص طور پر زہیر بن سلمی مواعظ و حکم بیان کرنے میں بہت ممتاز ہے۔ اسے صلح و آشتی کا پیامبر کہا جاتا ہے، لبید بن ربیعہ کی شاعری میں صوفیانہ رنگ زیادہ غالب ہے جس میں دنیا کی بے ثباتی اور زندگی کی ناپائداری کا ذکر ہے، اشعار ملاحظہ کیجئے:

بلينا وما تبلى النجوم الطوالع   وتبقى الديار بعدنا والمصانع

فلا جزع ان فرق الدهر بيننا   فكل امرئ يوما به الدهر فاجع

وما المرء الا كالشهاب وضوئه   يحور رمادا بعد اذ هو ساطع[2]

---

[1] شعراء النصرانیہ الاب لویس شیخو الیسوعی ۱/۲۸۲ [2] المقتبیہ فی الادب العربی، ص ۵۱۳۔

(ترجمہ: ہم ایک دن ختم ہو جائیں گے مگر دنیا کی چیزیں ایسے ہی برقرار رہیں گی اور زمانے نے اگر ہمارے درمیان جدائی کر دی ہے تو گھبرانے کی بات نہیں، اس لیے کہ ہر ایک کا یہی حال ہوتا ہے اور انسان کا حال چمکنے والے ستارہ کی طرح ہے کہ وہ چمکتا ہے اور ختم ہو جاتا ہے۔

جاہلی دور کی زہدیہ شاعری کے خاص موضوعات یہی ہیں۔ دنیا اور حیات انسانی کی بے اعتباری، انقلاب زمانہ، ماضی سے عبرت، موت کا استحضار وغیرہ۔

صدر اسلام میں زہدیہ افکار جاہلی اقدار کے ظلمت کدہ میں جب اسلام کی روشنی نمودار ہوئی تو اہل عرب کے اندر نئے خیالات نے جنم لیا، معیشت و سیاست کا ڈھانچہ تبدیل ہو گیا، معاشرت کے طور طریقے بدل گئے اور عقائد کی دنیا میں ایک ہلچل سی مچ گئی۔ اسلام نے لوگوں کو صلاح و تقویٰ اور اخروی زندگی کی طرف راغب کیا، اسی کے ساتھ دنیا کی بے ثباتی اور اس سے نفرت و حقارت کی تعلیم دی، ارشاد باری ہے:

فَلَا تَغُرَّنَّكُمُ الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا	تم کو دنیاوی زندگی دھوکہ میں نہ ڈال
وَلَا يَغُرَّنَّكُمْ بِاللّٰهِ الْغَرُوْرُ[1]	دے اور نہ تم کو وہ دھوکہ باز (شیطان)
	اللہ سے دھوکہ میں رکھے۔

حدیث شریف میں فرمایا گیا:

اَللّٰهُمَّ لَا عَيْشَ اِلَّا عَيْشُ	حقیقی عیش اور زندگی تو آخرت ہی
الْآخِرَةِ[2]	کی ہے۔

اس قسم کی آیات اور احادیث بے شمار ہیں، لیکن اس کا مطلب ہرگز نہیں کہ مذہب اسلام دنیا کو بالکل چھوڑ دینے اور اس کی نعمتوں سے دست کش ہو جانے کی دعوت

---

[1] سورۂ لقمان: ۳۳ [2] کتاب المغازی باب غزوۃ الخندق، ج ۲ ص ۵۸۸۔

دیتا ہے بلکہ ارشاد ربانی ہے:

كُلُوا مِمَّا رَزَقَكُمُ اللّٰهُ حَلٰلًا طَيِّبًا[1] — اللہ کی دی ہوئی حلال اور طیب چیزوں میں سے کھاؤ۔

تاہم جو مسلمان تقوی اور رضائے الٰہی کے طلبگار ہوتے ہیں وہ دنیاوی لذات اور مرغوبات نفس سے کنارہ کش رہتے ہیں، اپنے نفس کے خلاف مجاہدہ کرتے ہیں اور ایک مسافر کی طرح زندگی گزارتے ہیں اور دنیا اور اس کی دلفریبیاں ان کی نظر میں بہت ہی حقیر اور معمولی ہو جاتی ہیں۔

ادیان سابقہ کے زہاد کی رہبانیت اور تیاگ اسلام میں ممنوع ہے اسلام نے اور چیزوں کی طرح زہد کے اندر بھی اعتدال قائم رکھا ہے، چنانچہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے "وَابْتَغِ فِيْمَا آتَاكَ اللّٰهُ الدَّارَ الْآخِرَةَ وَلَا تَنْسَ نَصِيْبَكَ مِنَ الدُّنْيَا"[2] دنیا کے سب سے بڑے زاہد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تھے، ان کا اسی پر عمل تھا، ایک مرتبہ آپ کے پاس ایک شخص نے آکر عرض کیا، یا رسول اللہ مجھے ایسے عمل کی تلقین فرمائیے جس کی وجہ سے اللہ اور اس کے بندے مجھ سے محبت کرنے لگیں، حضورؐ نے فرمایا:

ازھد فی الدنیا وازھد فیما عند الناس یحبک الناس[3] — دنیا سے اور جو لوگوں کے پاس ہے اس سے بے نیاز ہو جا لوگ تجھ سے محبت کرنے لگیں گے۔

انہیں تعلیمات کے نتیجہ میں صحابۂ کرام کی ایک بڑی جماعت نے زہد و تقوی کی زندگی اختیار کر لی تھی، جن میں اصحاب صفہ کو خاص امتیاز حاصل ہوا جو ہمہ وقت ذکر و تلاوت

---

[1] سورۃ النحل: ۱۱۴ [2] سورۃ القصص: ۷۷ [3] البیان والتبیین، ص ۱۹۶/۳۔

اور اللہ کی عبادت ہی میں مشغول رہتے تھے، دوسرے صحابہ کرام حضرت ابوبکر صدیقؓ، حضرت عمرؓ، حضرت عثمانؓ، حضرت علیؓ، حضرت ابن عمرؓ اور حضرت ابوذر غفاریؓ وغیرہم نے بھی زاہدانہ زندگی پسند کی، اکثر لوگ دن میں روزہ رکھتے اور راتوں کو قیام میں گزارتے۔

اموی عہد میں زہدیہ افکار | لیکن جب اسلامی فتوحات کا دور شروع ہوا اور صحابہ کرامؓ کی تعداد بھی روز بروز کم ہونے لگی، دنیا کی نعمتوں اور قیصر و کسریٰ کے خزانوں کا ڈھیر لگ گیا تو مال و دولت کی جانب لوگوں کی رغبت بھی بڑھنے لگی اور فکر آخرت سے بھی لوگ غافل ہونے لگے تاہم اس زمانے میں بھی کچھ ایسے لوگ ضرور موجود رہے جو زہد و تقویٰ کو اپنا شعار بنائے ہوئے تھے اور عام لوگوں کو بھی اسی کی وعظ و نصیحت کرتے رہتے تھے۔ ان زہاد و نساک میں حضرت حسن بصریؒ اور رابعہ العدویہ بہت مشہور ہیں جن کا معاشرہ پر گہرا اثر پڑا، یہاں تک کہ بعض شعراء بھی ان کی تعلیمات سے متاثر ہوئے اور انہوں نے زہدیہ اشعار کہے جیسے عروہ ابن اذینہ، مسکین الدارمی، ابوالاسود الدؤلی سابق البربری وغیرہ۔

ابوالاسود الدؤلی مشہور تابعی اور ایک صالح و متقی انسان تھے، ان کو شعر و شاعری سے بھی شغف تھا، ان کے اشعار پر زہدیہ افکار و خیالات چھائے ہوئے ہیں، کہتے ہیں:

واذا طلبت من الحوائج حاجۃ فادع الالہ واحسن الاعمالا

فلیعطینک ما اراد بقدرۃ فھو اللطیف لما اراد فعالا

ان العباد وشأنھم وامورھم بید الالہ یقلب الاحوالا[1]

(جب بھی کوئی چیز طلب کرنی ہو تو اللہ ہی سے طلب کرو اور نیک اعمال کرو، جب اللہ سے خلوص سے مانگو گے تو وہ ضرور عطا کرے گا کیونکہ وہ بہت بڑا مہربان ہے اور جس چیز کا ارادہ کر لیتا ہے پس

---

[1] اغانی، ص ۲۹۷/۱۲۔

وہ چیز ہو جاتی ہے، بندے اور ان کے تمام احوال و معاملات اسی کے قبضہ قدرت میں ہیں، وہ ہی احوال کو بدلتا رہتا ہے۔

سابق البربری عہد اموی میں موصل کے قاضی اور امام تھے، ان کا شمار بھی اس دور کے زہاد اور نساک میں ہوتا ہے، انھوں نے اپنے اشعار میں زیادہ تر تقویٰ، دنیا سے بے رغبتی، موت وغیرہ جیسے مضامین کو ہی بیان کیا ہے اور امرا اور مالداروں پر سخت تنقید کی ہے، اشعار ملاحظہ ہوں:

فحتی متی تلھو بمنزل باطل　　کانک فیہ ثابت الاصل قاطن
وتجمع مالا تاکل الدھر دائما　　کانک فی الدنیا لغیرک خازن[1]

کب تک تو اس دھوکہ کی جگہ (دنیا) میں لہو و لعب میں مبتلا رہے گا، گویا کہ یہی تیرا اصلی مسکن ہے اور تو اس میں ہمیشہ رہے گا اور تو ایسے مال و دولت کو جمع کر رہا ہے جس کو تیرے بعد آنے والے کھاتے رہیں گے گویا کہ تو دنیا میں دوسروں کے خازن کی طرح ہو۔

یہ زمانہ چونکہ حضورؐ کے دور سے قریب تھا اور لوگوں پر آپؐ کی تعلیمات کا اثر غالب تھا، اس لیے شعرا کا بھی ان سے متاثر ہونا ایک طبعی چیز تھی چنانچہ ان کے اشعار میں قبر و حشر، موت و حیات، ثواب و عقاب اور زوال دنیا وغیرہ کا ذکر ملتا ہے مگر اس کے باوجود کسی شاعر نے بھی زہد کو ایک مستقل باب یا فن کی حیثیت سے نہیں پیش کیا۔

عباسی عہد میں زہد کا عنصر | عباسی عہد میں معاشرہ میں فسق و فجور نیز شرک و بے حیائی، شراب و کباب کی محفلیں، غلام باندیوں کی کثرت، مختلف اقوام اور تہذیبوں سے اختلاط کی بنا پر بہت سی خرابیاں اور غلط چیزیں پیدا ہو رہی تھیں اور ان کی ترجمانی کرنے والے

---

[1] تاریخ ابن عساکر: علی بن حسن بن ہبۃ اللہ، ص ۱۳۸، ج ۶۔

شعرا بھی ماحول کو گرمائے ہوئے تھے لیکن ظاہر ہے ہر طرف خرافات ہی کا دور دورہ نہ تھا، بلکہ یہ سب ایک خاص طبقہ تک محدود تھا، جن کی اکثریت عجمیوں کی تھی۔

اس کے برخلاف صلحا، زہاد اور واعظوں کی بھی کثیر تعداد تھی جو معاشرہ کی اصلاح اور وعظ و ارشاد کا کام انجام دے رہے تھے۔ خلفائے عباسیہ کے ابتدائی دور میں بہ کثرت عباد اور زہاد موجود رہتے تھے جو خالص تقوی اور زہد کی زندگی بسر کر کے دنیا اور اس کی فانی چیزوں سے قطع تعلق کیے ہوئے تھے، مثلاً سفیان بن عیینہ، فضیل بن عیاض، مالک بن دینار، عبداللہ ابن مبارک وغیرہ۔ شعرا میں بھی کثیر تعداد ان لوگوں کی تھی جو زہدیہ افکار کے ترجمان تھے، مثلاً محمد بن کناسہ، محمود الوراق، ابو نواس اور ابوالعتاہیہ وغیرہ۔ پہلے محمود وراق کے یہ اشعار ملاحظہ ہوں:

تعصی الالٰہ وانت تظہر حبہ ۔۔۔ ہذا محال فی القیاس بدیع

لوکنت تضمر حبہ لاطعتہ ۔۔۔ ان المحب لمن احب مطیع[۱]

تو اللہ سے محبت کا اظہار بھی کرتا ہے، اور نافرمانی بھی کرتا ہے، یہ طریقہ عقلاً محال ہے، اس لیے کہ اگر تیرے دل میں اس کی محبت ہوتی تو تو اس کی اطاعت کرتا، کیونکہ آدمی جس سے محبت کرتا ہے اس کا فرمانبردار بھی ہوتا ہے۔

ابو نواس اپنے دور کے صف اول کے شعرا میں تھا، شعرائے محدثین میں اس کے سب سے بڑے شاعر ہونے پر اتفاق عام ہے، خمریات میں اس کے پایے کا کوئی شاعر نہیں گزرا، مگر یہ امر بھی متفق علیہ ہے کہ اس کی عمر کا زیادہ حصہ لہو و لعب اور فسق و فجور کی محفلوں میں گزرا، لیکن عموماً دیکھا جاتا ہے کہ جب کوئی فسق و فجور چھوڑ کر اللہ کی

---

[۱] عقد الفرید: ابن عبد ربہ، ص ۲/۳۲۵۔

طرف رجوع ہوتا ہے تو وہ صدق دل سے رجوع ہوتا ہے، ابونواس کا بھی یہی حال ہے، جب اس میں توبہ و انابت کی کیفیت پیدا ہوئی تو وہ اپنی کرتوتوں پر پچھتانے اور اللہ کے سامنے صدق و اخلاص سے توبہ و استغفار کرنے لگتا ہے اور کبھی اپنی سابقہ زندگی کو اختیار کرنے کا دل میں خیال بھی نہیں لاتا، بلکہ مرتے دم تک توبہ و استغفار پر قائم رہتا ہے اور لوگوں کو بھی اس کی دعوت دیتا ہے، لیکن ابونواس کا زہدیہ کلام بہت کم ہے، تاہم جس قدر ہے اس میں ندامت اور توبہ و استغفار کا رنگ غالب ہے، اپنے گناہوں کا اعتراف کرتے ہوئے کہتا ہے:

یارب ان عظمت ذنوبی کثرۃ	فلقد علمت بان عفوک اعظم
ان کان لا یرجوک الا محسن	فبمن یلوذ و یستجیر المجرم
ادعوک رب کما امرت تضرعا	فاذا رددت یدی فمن ذا یرحم[1]

اے میرے اللہ میں بہت بڑا گنہگار ہوں لیکن مجھے یہ بھی معلوم ہے کہ تیرا عفو و درگزر اس سے بھی بڑھ کر ہے، مجرم اور گنہگار اپنے محسن سے ہی امید لگاتا ہے، اگر محسن معاف نہیں کرے گا تو مجرم کو کون پناہ دے گا، اے میرے خدا میں عاجزانہ تیرے سامنے ہاتھ پھیلائے ہوئے ہوں جیسا کہ تیرا حکم بھی ہے، اگر تو نے خالی ہاتھ واپس کر دیا تو پھر کون رحم کرے گا یعنی تیرے علاوہ ٹھکانہ نہیں ہے۔

ابوالعتاہیہ کے زہد کا پس منظر اس پر عام اتفاق ہے کہ ابوالعتاہیہ زہدیہ شاعری کے لیے وقف ہو گیا تھا، اس کی جد و جہد اور کاوش سے یہ عربی ادب کی ایک مستقل صنف ہو گئی تھی، لیکن پہلے یہ دیکھنا ہوگا کہ کن اسباب و علل کی بنا پر اس کے اندر یہ

---

[1] دیوان ابونواس: ص ۱۹۹۔

تبدیلی بلکہ انقلاب عظیم آیا اور وہ عام شعراء کی روش ترک کرکے زہدیہ شاعری کے راستہ پر گامزن ہوا، اکثر تذکرہ نگاروں اور مورخین کا خیال یہ ہے کہ عتبہ نامی باندی کی محبت میں ناکامی کے باعث اس نے سب کچھ خیر باد کہہ کر یہ راستہ اپنا لیا تھا، صاحب مروج الذہب نے لکھا ہے:

ان ابا العتاھیہ لبس الصوف لیاسہ من عتبۃ ۱؎
کہ ابو العتاہیہ عتبہ سے مایوس ہوکر ہی تصوف کے لبادہ میں آیا۔

یہ بھی ممکن ہے کہ شاعر کی خود فطری حالت و کیفیت اس تغیر و انقلاب کا ذریعہ بنی ہو جیسا کہ اس کے اشعار سے بھی ظاہر ہوتا ہے، وہ اپنی خاندانی پستی، غربت و افلاس اور ذلت و رسوائی کو زائل کرنے کے لیے دنیا کی طرف متوجہ ہوا، لیکن اس نے بھی یاوری نہیں کی جس کے نتیجہ میں دنیا اور اہل دنیا سے اس کے دل میں نفرت پیدا ہوگئی اور ان احساسات کا اس پر اتنا غلبہ ہوا کہ اس نے اسی کو اپنی شاعری کا موضوع بنا لیا اور زندگی بھر امارت اور امیروں کے خلاف علم بغاوت بلند کرتا رہا۔ اشعار دیکھئے:

یامن بنی القصر فی الدنیا وشیدہ اسست قصرک حیث السیل والغرق
والموت حوض کریہ انت واردہ فانظر لنفسک قبل الموت یامذق ۲؎

اے وہ شخص جو اس دنیا میں خوبصورت محلات کی تعمیر میں لگا ہوا ہے تو نے اپنے محل کی بنیاد غلط جگہ پر رکھی ہے یعنی یہاں ٹھہراؤ نہیں ہے، یہ دنیا رہنے کی جگہ نہیں ہے، موت ایک خوفناک گڈھا ہے اور تجھے اس میں ایک دن گرنا ہے، پس موت سے پہلے پہلے اپنے نفس کا محاسبہ کرلے۔

یہ بھی ہوسکتا ہے کہ اپنے زمانے کے اثرات کے تحت اس کے اندر زہد کا داعیہ ادر

۱؎ مروج الذہب: ابو الحسن علی ابن الحسین، ج ۳ ص ۲۸۲ ۲؎ الدیوان ص ۲۴۷۔

اس کی طرف رجحان و میلان پیدا ہوا کیونکہ اس کے عہد میں زہاد و نساک کا سکہ جما ہوا تھا، وہ عوام کے دلوں میں ان کی کافی عزت اور مقبولیت تھی اس لیے اس نے بھی عوام میں شہرت و مقبولیت حاصل کرنے کے لیے یہ طریقہ اختیار کیا ہو، وجہ جو کچھ بھی رہی ہو اس میں شبہ نہیں کہ اس نے زہدیہ شاعری کو بڑی آب و تاب بخشی اور ایک نیا انداز و اسلوب پیدا کیا۔

عکرمہ کا بیان ہے کہ خلیفہ امین کی بیعت کے سال میں بغداد کی ایک مسجد میں داخل ہوا تو ایک بوڑھے آدمی کے گرد لوگوں کا ہجوم دیکھا جو یہ اشعار پڑھ رہا تھا:

ذھب الشباب وبان عنی غیر منتظر الا باب

انی لآمل ان اخلد والمنیۃ فی طلاب[1]

شباب چلا گیا اور ایسا گیا کہ اب لوٹ کر آنے کی امید بھی نہیں، بندہ یہ خواہش کرتا ہے کہ وہ ہمیشہ اسی دنیا میں رہے اور موت اس کی تلاش میں لگی ہوئی ہے۔

اشعار پڑھتے وقت اس کے چہرے پر آنسو رواں تھے، عکرمہ بھی اس کی طرف متوجہ ہوئے اور اشعار لکھ لیے۔ بعد میں معلوم ہوا کہ یہ شیخ ابوالعتاہیہ تھے۔

جب ابوالعتاہیہ نے زہدیہ زندگی اختیار کی اور اپنے کلام کا رخ ہر طرف سے موڑ کر صرف زہد کی طرف کر دیا تو اس کو اس کی خواہش ہوئی کہ وہ اس میدان میں منفرد ہی رہے، کوئی دوسرا شخص اس کی ہمسری نہ کر سکے، اسی لیے اس نے ابونواس سے اس کی خواہش کی کہ وہ زہدیہ اشعار نہ کہے اور مجھے اس میں طبع آزمائی کرنے دے، مخلد الطائی کا بیان ہے "جانی ابوالعتاھیہ فقال لی ان ابانواس لایخالفک

---

[1] اغانی: ج ۴ ص ۴۶

وقد احببت ان تساله ان لا يقول فی الزهد شيئا۔ فانی قد ترکت له المدائح والهجاء والخمر والرقيق وما فيه الشعراء والزهد شوقی[1] (کہ میرے پاس ابوالعتاہیہ آیا اور کہا کہ ابونواس تمہاری مخالفت نہیں کریں گے، تم ان سے کہدو کہ وہ زہدیہ شاعری نہ کرے اس لیے کہ میں نے مدح وذم خمریات وغزلیات سب ان کے لیے چھوڑ دیا ہے زہد میرا شوق ہے)

ابوالعتاہیہ نے اس میدان میں قدم رکھا تو آخر تک اس میں طبیعت کی جولانی دکھاتا رہا، مگر افسوس کہ تیس سال کے عرصے کا کلام دستیاب نہیں ہے۔

ابوالعتاہیہ کا زہد اور معاصرین کے شبہات کچھ لوگوں نے ابوالعتاہیہ کے زہد کو شک کی نگاہ سے دیکھا ہے، جس کی تفصیل اس کے حالات کے ضمن میں قلم بند کی جاچکی ہے۔ یہاں صرف یہ دکھانا ہے کہ ابوالعتاہیہ حقیقی اور اصطلاحی زاہد اور صوفی نہیں تھا، بلکہ وہ صرف فنی نقطۂ نظر زہد کے اندر طبع آزمائی کرتا تھا، ابوالعتاہیہ نے اپنے اشعار کا موضوع خاص حالات کے اندر زہد کو بنایا تھا، لوگ سمجھ بیٹھے کہ یہ کہنے کے مطابق عملی طور پر بھی زاہد ہی ہوگا، حالانکہ ایسا نہیں تھا۔

زہدیہ شاعری میں ابوالعتاہیہ کا عام فہم اسلوب ابوالعتاہیہ کی مقبولیت میں جہاں اسکی زہدیہ شاعری کو دخل ہے وہاں اس کا اسلوب بھی بڑی جاذبیت اور کشش رکھتا ہے۔ وہ روزمرہ کی زبان ہی استعمال کرتا ہے اور اسے غرابت، تعقید اور عجمیت سے بھی بچائے رکھتا ہے تاکہ عام لوگ بھی اس سے مستفید ہوسکیں، اپنی پوری شاعری ہی میں ابوالعتاہیہ نے سہل پسندی سے کام لیا ہے اور مشکل وثقیل زبان سے احتراز کیا ہے، لیکن شاعری میں خاص طور پر اس کا التزام کیا ہے، چنانچہ ایک مرتبہ ابن ابی الابیض کے

---

[1] اخبار ابی نواس: ابن منظور، ص ۶۵۔

پاس آیا اور کہنے لگا کہ میں بھی زہدیہ شاعری میں دلچسپی رکھتا ہوں، کچھ اشعار بھی کہے ہیں اور اس موضوع کو پسند بھی کرتا ہوں، آپ کے اشعار بھی سُنے ہیں اور مزید سُننے کا خواہش مند ہوں، اس لیے زہد کے سلسلے میں آپ اپنا عمدہ کلام سُنایئے، ابو العتاہیہ نے اس سے کہا کہ تمہاری شاعری پست درجہ کی ہے، اس نے کہا کیسے؟ ابو العتاہیہ نے کہا کہ شاعری یا تو قدیم شعراء کے طرز پر ہونی چاہیے یا پھر بشار اور ابن صرفہ کے طرز پر، اگر اس درجہ کا کلام نہیں ہے تو پھر شاعر کے لیے مناسب یہ ہے کہ وہ عام فہم کلام کہے، جیسا کہ میرے اشعار ہیں، اس میں بھی زہدیہ اشعار کو خصوصیت حاصل ہے، اس لیے کہ زہد بادشاہوں، شعر کے راویوں اور نئی چیزوں کے طلبگاروں کا مذہب و مسلک نہیں ہے بلکہ یہ ان لوگوں کا مسلک ہے جو اس سے دلچسپی رکھتے ہوں، اس لیے اسے ان کے لیے لائق فہم ہونا چاہیے۔ ابن الابیض نے کہا! آپ نے سچ کہا، پھر ابو العتاہیہ نے اپنے زہدیہ اشعار سُنائے، دیکھئے:

لدوا للموت وابنوا للخراب فکلکم یصیر الی تباب

الا یا موت لم ار منک بدا اتیت وما تحیف وما تحاب

کانک قد هجمت علی مشیبی کما هجم المشیب علی شباب[1]

تم موت کے لیے جنتے ہو اور ویرانی کے لیے عمارتیں بناتے ہو کیونکہ تم میں سے ہر ایک کا انجام تباہی و بربادی ہے، اے موت میں نے نہیں دیکھا کہ تو آئی ہو اور تو نے ظلم و نیا دتی نہ کی ہو، گویا کہ تو بوڑھاپے پر ایسے حملہ آور ہوتی ہے جیسے جوانی پر بوڑھاپا۔

ابو العتاہیہ کا کلام زہدیہ افکار و معانی سے پر ہے، دنیا کا زوال حیات انسانی

---

[1] اغانی، ج ۴، ص ۴۴۔

ناپائداری، زمانے کا ظلم وستم، موت و قبر و حشر کا تذکرہ، طمع و حرص کی خرابیاں، تقویٰ
پرہیزگاری کی ترغیب، آخرت کے لیے تیاری، صبر و قناعت اور اعمال خیر پر تحریص وغیرہ
اس کی زہدیہ شاعری کا اصل موضوع ہیں

عام طور پر ابوالعتاہیہ کی زہدیہ شاعری کا رنگ واعظانہ ہے جس میں کبھی قرآنی
آیات، کبھی احادیث شریفہ، کبھی شعراء کے کلام اور حکماء اور دانشمندوں کے
اقوال سے بھی استدلال کرتا ہے۔

دنیا کے زوال اور اس کے دھوکہ سے بچنے کے بارے میں کہتا ہے:

الا نحن فی دار قلیل بقاؤھا　　سریع تداعیھا وشیک فناؤھا

غدا تخرب الدنیا ویذھب اھلھا　　جمیعا وتطوی ارضھا وسماؤھا[1]

ہم ایسی جگہ (دنیا) میں قیام پذیر ہیں کہ جس کا بقا بہت کم ہے اور فنا و زوال بہت قریب ہے،
کل یعنی قیامت کے دن یہ دنیا ویرانی میں بدل جائے گی اور تمام اہل دنیا ختم ہو جائیں گے، زمین
اور آسمان کو لپیٹ دیا جائے گا۔

دنیا کی حقارت اور نفرت کو مختلف انداز سے بیان کیا ہے:

الا انما الدنیا علیک حصار　　نیلک فیھا ذلۃ وصغار

ومالک فی الدنیا من اللہ راحۃ　　ولا لک فیھا ان عقلت قرار[2]

دنیا تیرے ارد گرد ایک ایسا حصار ہے کہ اس میں کچھ حاصل کرنا بھی ذلت و رسوائی ہے، دنیا
میں انسان کتنی بھی جد و جہد کر لے، لیکن اگر تجھ میں عقل ہے تو سمجھ لے کہ اس میں قرار نہیں ہے۔)

کبھی کہتا ہے کہ یہ دنیا دھوکہ باز ہے، کتنے انسانوں کو اس نے ہلاک کر دیا لیکن

---

[1] دیوان ابی العتاہیہ، ص ۱۵ [2] ایضاً ص ۱۸۶۔

انسان بھی عجیب ہے اس کے مکر اور دھوکہ کو جاننے کے باوجود اس کے پیچھے پڑا رہتا ہے اشعار دیکھئے :

لاتأمن من الدنیا علی غدرها فکم غدرت من قبل امثالها

فانظر سبیلا سلکوا ولا تحسب بان لست له سالکاله[1]

(دنیا کی بے وفائی سے بے فکر مت رہو، اس لیے کہ تجھ سے پہلے نامعلوم کتنوں کے ساتھ یہ غداری کر چکی ہے اور اس راستہ پر نظر رکھ جس پر وہ لوگ چلے ہیں، یہ مت گمان کر کہ تجھے اس راستہ پر نہیں جانا ہے۔)

حرص و طمع کے بارے میں کہتا ہے کہ اپنے ورثاء کے لیے مال جمع کرنے سے کیا فائدہ؟ اسے اللہ کی رضامندی کے لیے خرچ کرو۔

یاجامع المال فی الدنیا لوارثه هل انت بالمال بعد الموت تنتفع

لاتمسک المال واسترض الاله به فان حسبک منه الری والشبع[2]

(اے دنیا میں اپنے ورثاء کے لیے مال جمع کرنے والے کیا مرنے کے بعد یہ مال تجھے کوئی فائدہ دے گا، مال کو جمع کرکے مت رکھ اور اللہ کی رضا طلب کر اور گزارہ کے بقدر روزی پر قناعت کر)

قناعت کے بارے میں کہتا ہے :

ماشرف المرء کالقناعة لقناعة والصبر علی کل حادث یقع

لم یزل القانعون اشرفنا یاحبذا اللقانعین ماقنعوا[3]

(زمانے کے حوادث پر صبر اور قناعت سے بڑھ کر انسان کے لیے کوئی شرف نہیں ہے اور قناعت کرنے والے ہمیشہ عزت و شرف والے ہوتے ہیں۔)

---

[1] دیوان ابی العتاہیہ، ص ۱۸۷ [2] ایضاً ص ۲۳۹ [3] ایضاً ص ۱۵۶۔

موت سے ہر ایک آدمی لرزہ بر اندام رہتا ہے۔ تقریباً سبھی زہاد و نساک نے اس کا تذکرہ کیا ہے اور اس سے لوگوں کو ڈرایا ہے، ابو العتاہیہ نے بھی مختلف زاویوں سے اپنے اشعار میں اس کا تذکرہ کیا ہے، کبھی موت کی ہولناکیوں کا ذکر کرتا ہے تو کبھی قبر کے اندھیرے کا تذکرہ کرتا ہے۔ اس کے موت سے متعلق اشعار میں تین قسم کے نظریات ملتے ہیں، (۱) موت کا خوف اور ڈر (۲) اس کی عمومیت (۳) اور اس کا تذکرہ اس کو موت کا کھٹکا ہر دم متفکر رکھتا ہے اور مختلف انداز میں اسکا تذکرہ کرکے وعظ و نصیحت کرتا ہے:

مالی رایتک راکبا لھواکا　　اظننت ان اللہ لیس یراکا
انظر لنفسک فالمنیۃ حیث ما　　وجھت واقفۃ ھناک حذاکا[1]

(میں تجھے دیکھ رہا ہوں کہ تو غفلت کی سواری پر سوار ہے اور کیا تو نے یہ گمان کر لیا ہے کہ اللہ تعالیٰ تجھے نہیں دیکھ رہا ہے، اپنے نفس کا دھیان رکھ اس لیے کہ موت ہر وقت تیرے ساتھ ساتھ ہے۔)

کبھی کہتا ہے کہ موت کا خوف اور ڈر جو اس پر غالب آچکا ہے، اس کے علاوہ کوئی خوف اور ڈر ہی نہیں ہے۔

واصبح لی فی الموت شغل عن الصبا　　وفی الموت شغل شاغل لذوی العقل
اذا انا لم اشغل بنفسی فنفس من　　من الناس ارجوان یکون بھا شغلی[2]

(بچپن سے ہی موت میرے لیے ایک مشغلہ بن چکی ہے اور موت کے بارے میں عقلمند لوگ ہی متفکر رہتے ہیں اور اگر میں اپنے نفس کو موت کے سلسلے میں متفکر نہ رکھوں تو پھر کسی سے

---

[1] دیوان، ص ۱۸۳ [2] ایضاً: ص ۲۰۳۔

لیا تو قع کر وہ اس کی جانب سے متفکر رہے)

کبھی کہتا ہے کہ موت سب کے لیے ہے اس سے کوئی نہیں بچ سکتا، بڑے، چھوٹے، کمزور اور قوی سب کو اس کا مزہ چکھنا ہے، اشعار دیکھئے:

الموت بین الخلق مشترک — لاسوقة یبقی و لا ملک

الم یختلف فی الموت مسلکهم؟ — لا! بل سبیلا واحدا سلکوا[1]

(موت ہر کسی کو آتی ہے چاہے راجہ ہو یا پرجا، اس کے گھاٹ پر جانے کے لیے کسی کا راستہ مختلف نہیں ہے سبھی کو اسی ایک راستہ سے گزرنا ہے)

الست تری للدهر نقضا و إبراما — فهل تم عیش لامری او دام ما

ونحن مع الایام حیث تقبلت — فترفع اقواما وتخفض اقواما[2]

(کیا تونے زمانے کی بدعہدی اور استحکام نہیں دیکھا، کیا کسی آدمی کی خواہشات پوری ہوتی ہیں یا ہمیشہ رہتی ہیں اور ہم گردش ایام اور حوادث کے شکار ہوتے رہتے ہیں، زمانہ کسی قوم کو بلند کرتا ہے تو دوسری کو ذلیل و رسوا کرتا ہے)

زہدیہ شاعری میں ابوالعتاہیہ کا درجہ | ابوالعتاہیہ کو زہدیہ شاعری میں غیر معمولی شہرت حاصل ہوئی، وہ زہدیات کا امام اور قائد مانا جاتا ہے، اس نے اسے بام عروج پر پہونچا دیا اس کی شاعری کا یہ بھی کمال ہے کہ وہ سامع کے ذہن و دماغ کو متاثر کرتی ہے، خاص طور پر جب وہ قبر و حشر اور موت کے احوال کا تذکرہ کرتا ہے۔ عمدہ شاعری کی پہچان یہی ہے کہ وہ سننے والے پر اثر انداز ہو، ابوالعتاہیہ نے زہدیہ کلام کو پیش کرنے کا انداز نہایت آسان، دلکش اور دل پذیر اختیار کیا ہے، ابونواس نے جب اس کے یہ

---

[1] دیوان، ص ۱۸۶ [2] ایضاً ص ۲۴۱۔

اشعار سُنے:

لاترقدن لعینک السهر وانظر الی ما تصنع الغیر
انظر الی غیر مصر فۃ ان کان ینفع عینک النظر
واذا سالت فلم تجد احدا فسل الزمان فعنده الخبر[1]

تو بے ساختہ یہ کہنے لگا " افسحر ھذا ام انتم لا تبصرون" حالانکہ ان کے اندر کوئی خاص اور انوکھی بات نہیں کہی ہے، تاہم صرف زمانہ کے تقلب و تصرف کو ایک عمدہ پیرایہ میں بیان کیا ہے اور یہ کہا ہے کہ زمانے کے احوال پر نظر رکھنا انسان کے لیے لازم ہے۔

عمرو بن شیبہ کا بیان ہے کہ ایک عابد ایک راہب کے پاس سے گزرا تو نصیحت کرنے کی درخواست کی، راہب نے کہا بھلا میں تم کو کیا نصیحت کروں! جبکہ تمہارے پاس قرآن کریم اور نبی آخر الزماں کی تعلیمات بھی ہیں اور آخر میں کہا کہ" فاتعظ ببیت بین شعر شاعرکم ابی العتاہیہ" اور یہ شعر پڑھا:

تجرد من الدنیا فانک انما وقعت الی الدنیا وانت مجرد[2]

احمد امین لکھتے ہیں:

" اس نے زہد کو فلسفیانہ انداز میں پیش کیا اور ادب عربی کو اپنے زمانے میں موت کے خوف سے ڈر اور دنیا کی لذات سے نفرت و حقارت جیسے مضامین سے مالا مال کر دیا اور عام لوگوں کی رعایت سے آسان زبان استعمال کی[3]

ابو العتاہیہ کا اصل کارنامہ یہی ہے کہ اس نے زہد کو شاعری کا ایک مستقل موضوع بنا دیا ہے۔"

---

[1] ابو العتاہیہ، محمد احمد برانق، ص ۵۳ [2] ایضاً ص ۵ [3] ضحی الاسلام، ج ۱ ص ۱۸۵۔

مکتوبات صدی کے نسخہ عہد مصنف کا عکسی ایڈیشن

از جناب شمیم منعمی صاحب، پٹنہ

(۲)

حاشیہ نگار کون؟ (الف) عسکری صاحب نے حواشی نگار مولانا مظفر بلخی کو اور ان کا کاتب مخدوم حسین بلخی کو بتایا ہے جو قابل قبول نہیں، مرتب نے نہ اس سے انکار کیا ہے اور نہ اسے تسلیم کیا ہے (ص ۱۱ تا ۱۳)

(ب) حواشی میں حضرت مخدوم جہاں کے لیے اور خود حاشیہ نگار نے اپنے لیے بالترتیب القاب و آداب اور عجز و انکسار کا مظاہرہ کیا ہے، اس پر پروفیسر عسکری صاحب نے سیر حاصل گفتگو کرنے کی کوشش کی ہے۔ لیکن وہ غیر مفید ہیں، کیونکہ انہوں نے پہلے ہی سے یہ نظریہ قائم کر لیا تھا کہ یہ حاشیے مولانا مظفر بلخی کے ہیں اور کاتب مخدوم حسین بن معز بلخی ہیں جبکہ ان حواشی کا مطالعہ کرنے سے پہلے اگر ہم کوئی نظریہ قائم نہ کریں بلکہ ان حواشی میں جو اسلوب پایا جاتا ہے اور جو طرز تخاطب و طرز بیان استعمال ہوا ہے، اسے مندرجۂ ذیل حضرات کی دستیاب نگارشات سے موازنہ کیا جائے تو صحیح نتائج تک پہنچا جا سکتا ہے

(۱) مولانا مظفر بلخی (۲) مخدوم حسین نوشہ توحید بلخی (۳) حضرت زین بدر عربی۔

(ج) حاشیہ نگار نے حواشی میں اپنے لیے "بندۂ ضعیف"، "بیچارہ" کا استعمال بکثرت کیا ہے، غرضکہ حاشیہ نگار خود اپنے تئیں بندۂ ضعیف اور بیچارہ لکھنے کا عادی ہے۔ اس عادت کی تلاش جب ہم مکتوبات مولانا مظفر بلخی، مکتوبات مخدوم حسین بلخی، معدن المعانی، مخ المعانی، بحر المعانی، ملفوظ الصفر اور خود مکتوبات صدی کے مقدمہ میں

کرتے ہیں تو یہ پاتے ہیں کہ حضرت مولانا مظفر بلخی اور حضرت مخدوم حسین بن معز بلخی بے چارہ اور بندۂ ضعیف کے موقع پر التزاماً "حقیر فقیر" کے عاجزانہ الفاظ استعمال میں لاتے ہیں۔ واضح رہے کہ حواشی مذکورہ میں کہیں بھی حاشیہ نگار نے اپنے لیے حقیر فقیر کا استعمال نہیں کیا ہے۔ اس کے برخلاف حضرت زین بدر عربی کے مرتب کردہ ملفوظات میں حاشیہ نگار کی طرح خود اپنے لیے بندۂ ضعیف، بے چارہ کا بکثرت استعمال ملتا ہے، صرف مکتوبات صدی کا مقدمہ جسے زین بدر عربی نے ترتیب دینے کے بعد رقم فرمایا، اسے سامنے رکھا جائے تو میرے اندازے کی تائید ہو جاتی ہے۔

(د) حواشی میں حضرت مخدوم جہاں کے لیے "بندگی مخدوم" "مخدوم عظمہ اللہ" "خدمت شیخ" کے القاب وآداب کا استعمال زیادہ ہوا ہے۔ اس نہج پر بھی حضرت زین بدر عربی کے جمع کردہ ملفوظات کا جائزہ لینے پر بہ نسبت دوسروں کے زیادہ یکسانیت ملتی ہے۔

(س) اس میں شبہ نہیں کہ مراتب کے لحاظ سے جو قربت حضرت مولانا مظفر بلخی کو حضرت مخدوم جہاں سے حاصل تھی، وہ کسی دوسرے کو نہیں تھی لیکن بظاہر جو قربت شب وروز حضرت زین بدر عربی کو مخدوم جہاں کے حضور تھی وہ بھی اپنی جگہ مسلم ہے۔

حضرت مخدوم جہاں کا کوئی ملفوظ، مخدوم کا کوئی علمی سرمایہ حضرت مولانا مظفر بلخی کا جمع کردہ نہیں ملتا جبکہ حضرت زین بدر عربی ہر وقت حاضر باش نظر آتے ہیں۔ جمع کرتے ہیں۔ مدون کرتے ہیں۔ بلکہ انہیں کاموں کے لیے وقف نظر آتے ہیں اور حضرت مخدوم بھی انکی مصروفیات سے نہ صرف واقف تھے بلکہ بعض جگہ تو ان کی نگہداشت میں یہ کام عمل میں آتا رہا۔ خود مکتوبات صدی ۷۴۷ھ/۱۳۴۶ء میں حضرت زین بدر عربی نے ترتیب دی۔ اس پس منظر میں زیر تبصرہ نسخے کے حواشی کی مندرجہ ذیل عبارت پر نظر ڈالیے:

۱ "ایں رباعی۔ مخدوم جہاں فرمودند۔ بنویس خارج مکتوب است۔ رباعی"۔۔۔

(ق ۳۱۹ الف)

۲ "درکتاب ایں حاشیہ را داخل کنید"[1]

یہ خارج اور داخل کرنے کا حکم مولانا مظفر کے بجائے حضرت زین بدر عربی کو دیا جانا زیادہ قرین قیاس ہے۔

(۵) ان حواشی کو حضرت مولانا مظفر بلخی کا ماننے میں ایک اور بڑی قباحت یہ ہے کہ حواشی میں جن کتابوں کا حوالہ بطور ماخذ دیا گیا ہے ان میں دو خود حضرت مولانا مظفر بلخی کی مولفہ ہیں یعنی (۱) ترجمہ مشارق الانوار (۲) شرح العقیدہ اعنی شرح عقائد نسفی جس کا نسخہ قلمی خودخدا بخش میں موجود ہے، لیکن صفحہ اٹھارہ اور انیس پر ان دونوں کتابوں کے مصنفین سے لاعلمی کا اظہار کیا گیا ہے جو کہ افسوسناک ہے۔

حاشیہ نگار خود اپنی تالیف کا حوالہ دے سکتا ہے لیکن اس کا انداز جدا ہوتا۔

(۶) عکسی ایڈیشن کا ایک حاشیہ بھی حاشیہ نگار پر کچھ روشنی ڈالتا ہوا نظر آتا ہے اس حاشیے کا جو ترجمہ عسکری صاحب نے فرمایا ہے[2]۔ اس سے یہ باتیں معلوم ہوتی ہیں

(۱) دعا گوئے ضعیف (حاشیہ نگار) کا بہار سے تعلق تھا، جبکہ مولانا مظفر بلخی نہ صرف وطناً بلکہ مولداً بھی بلخی تھے، لیکن حضرت زین بدر عربی کے بارے میں یہ قرینہ ہے کہ وہ اصلاً عربی ہوں گے لیکن بہار میں ان کا خاندان مدت سے آباد تھا۔

---

[1] پروفیسر حسن عسکری نے اپنے مضمون کے صفحہ ۱ (عکسی ایڈیشن میں شامل ہے) پر اس کا حوالہ دیا ہے لیکن محولہ ورق پر عکس میں اس عبارت والا حاشیہ تا ایں دم تحریر نہیں ملا۔ [2] ان کے مضمون کا صفحہ ۳۵ ملاحظہ ہو۔

(۲) حاشیہ نگار کی مالی حالت کمزور تھی۔

(۳) حاشیہ کے تمام پہلوؤں پر سنجیدگی کے ساتھ غور کرنے سے مولانا مظفر بلخی کی شخصیت اس پر منطبق نہیں ہوتی۔

(۴) اس حاشیے میں مذکور "مولانا خواجہ" کا ذکر مغز المعانی (قلمی) میں بھی اس طرح ملتا ہے کہ اس ملفوظ کے جامع حضرت شہاب الدین عماد لکھتے ہیں:

"از جمع کردن مغز المعانی بجانب رفیع شیخ بزرگوار خود بواسطہ مولانا خواجہ عرضداشت والتماس نمود کہ نظر مخدوم جہاں بگذرد واز کمال شفقت ملتمس بیچارہ باجابت مقرون گردانید"۔

(۵) اس حاشیہ میں مذکور واقعہ کنز المعانی (قلمی) میں کچھ اس طرح ملتا ہے:

"سعادت آستانہ بوسی آستانہ علیا حاصل شد ذکرے در ہدیہ بردن افتادہ بود"

اس ملفوظ کے مرتب بھی زین بدر عربی ہیں۔

(ز) زیر تبصرہ عکسی اڈیشن کے سلسلے میں ایک بات اور قابل غور ہے اور وہ یہ کہ یہ نسخہ اس طرح ناقص الاول ہے کہ فہرست و متن مکتوبات سے قبل حضرت زین بدر عربی کا جو مقدمہ عام طور پر ملتا ہے، اس کے اخیر کا دعائیہ جملہ اور قطعہ و مناجات موجود ہیں جس سے پتہ چلتا ہے کہ اس نسخے میں بھی حضرت زین بدر عربی کا مقدمہ موجود تھا۔

اس مقدمہ کا موجود ہونا بڑی اہمیت کا حامل ہے، کیونکہ ہمیں معلوم ہے کہ سنہ ۷۴۷ھ/ ۱۳۴۶ء میں جبکہ یہ مکتوبات مکتوب الیہ قاضی شمس الدین حاکم چوسہ کو ارسال کیے جاتے تھے، حاضرین و خادمان بھی اپنے اپنے پاس اس کی نقلیں رکھتے تھے اور اسی ترتیب سے ہر صاحب کے پاس ان مکتوبات کا ایک ایک نسخہ جمع ہو گیا تھا۔ یہ کوئی ضروری نہیں ہے کہ

ان میں سے ہر ایک نے حضرت زین بدر عربی کے مرتب کردہ مکتوبات کے نسخے سے ان کا مقدمہ بھی اپنے نسخے میں نقل کیا ہو۔ اسلیے بہت ممکن ہے کہ بعض نسخے مکتوبات کے ایسے بھی رہے ہونگے جو کہ بلاواسطہ زین بدر عربی، سیدھے حضرت مخدوم جہاں کی تحریر سے نقل بر داشتہ ہوں اور ان پر اس کے ناقل کا ترقیمہ یا اپنا پیش لفظ ہو۔ چنانچہ میری واقفیت میں مکتوبات صدی کے دو ایسے خطی نسخے ہیں جن میں زین بدر عربی کا مقدمہ شامل نہیں ہے۔

(۱) کتاب خانہ ریاست کپور تھلہ میں مکتوبات کا ایک ایسا نسخہ موجود ہے جس میں دیباچہ خود مکتوب الیہ حضرت قاضی شمس الدین حاکم چوسہ کا ہے۔

(۲) جناب ڈاکٹر علی ارشد صاحب شرفی، گلزار ابراہیم بیگا سور بہار شریف کے پاس ۱۱۱۱ھ کا مکتوبہ ایک ایسا نسخہ مکتوبات صدی کا موجود ہے، جس میں زین بدر عربی کا دیباچہ نہیں ہے۔

حضرت مولانا مظفر بلخی نے بھی، جن کا ۷۴۰ھ میں مخدوم کی خدمت میں حاضر ہونا قرین قیاس ہے، یقیناً اپنے دست خاص سے ان مکتوبات کی نقل تیار کی ہوگی اور مجھے یقین ہے کہ اس پر ان کا اپنا پیش لفظ ہوگا۔ اتنا تو طے ہے کہ ان کے پاس مکتوبات کا ایک نسخہ تھا۔ چنانچہ مخدوم حسین بن معز بلخی نوشہ توحید کے مکتوبات میں اس جانب اس طرح اشارہ ملتا ہے کہ حضرت مولانا مظفر بلخی نے دہلی میں اپنا نسخہ مکتوبات حضرت مخدوم نصیر الدین محمود چراغ دہلوی کو مطالعہ کے لیے دیا تھا اور جس کے مطالعہ کے بعد انھوں نے فرمایا تھا:

"خدمت شیخ مسلمانی ما را بر خاک زدہ و زنار ہائے ما را پیدا کردہ ست۔"

ⓒ " مظفر شمس بلخی ۸ ویں صدی کے آغاز میں پیدا ہوئے، بہت دنوں تک مخدوم

شرف الدین احمد یحییٰ منیری کے ساتھ رہے اور یہ ساتھ ان کی وفات ۷۸۲ھ تک نبھایا
۸۰۳ یا بروایت دیگر ۸۰۸ھ میں ان کا انتقال ہوا" (ص ۶)

(الف) حضرت مخدوم جہاں کے وصال کے زمانے میں یعنی ۷۸۲ھ میں مولانا مظفر بلخی عدن میں تھے اور وصال مخدوم کے بعد بہار تشریف آئے۔

(ب) مناقب الاصفیا، تاریخ سلسلہ فردوسیہ وغیرہ میں آپ کا سن وصال ۸۰۸ھ ہی ہے۔ ۸۰۳ھ حسن عسکری صاحب نے لکھا ہے۔ پروفیسر عسکری صاحب نے اسکے علاوہ بھی لکھا ہے[1]

⑧ "ان حواشی میں منقول اشعار کو بھی الگ سے یکجا کرنے کی ایک سعی کی گئی، مگر اس کی بھی تکمیل نہیں ہو پائی۔ تاہم جتنا ہے اس سے لطف اٹھائیے اور باقی کے لیے حواشی کی اصل تو ہے ہی" (ص ۶)

حواشی کی نقل نامکمل، حواشی میں موجود اشعار کو یکجا کرنے کی سعی نامکمل۔ پتہ نہیں مکمل کیا ہے۔ چونکہ یہ کام سنجیدگی کے ساتھ نہیں کیا گیا اس لیے سنجیدگی کی تلاش اور سنجیدگی سے اس کا مطالعہ بھی ناممکن ہے ہاں لطف اٹھانے کی اجازت درست ہے۔

⑨ "اختلاف نسخ اور مسامحات کتابت میں متعدد جگہ پر جہاں ناگزیر تھا بعض نکات ہر دو جگہ لکھ دیے گئے ہیں تاکہ قاری کو آسانی ہو۔۔۔۔ اس مخطوطے اور مطبوعہ نسخے میں جو اختلاف ہے وہ بھی دے دیے جائیں" (ص ۷)

(الف) زیر تبصرہ ایڈیشن میں ص ۳۱۱ سے ۳۲۸ تک اختلاف نسخ کے عنوان سے اختلافات درج کیے گئے ہیں۔ اختلاف نسخ کے عنوان کے نیچے یہ عبارت درج ہے:

---

[1] دیکھیے ISLAM & MUSLIMS IN MEDIVEL BIHAR PUBLISHED BY K.B.L. ص ۶۱ -

"خ = مخطوطہ مکتوبات صدی ۱۳۹۲ HL ط = مطبوعات مکتوبات صدی HL 4997"

(الف) ع س ب کی اطلاع کے مطابق موازنے کا کام عکسی ایڈیشن والے مخطوطے سے مطبوعہ نسخے کے مابین ہوا ہے۔ اس بات سے قطع نظر کہ بجائے سن طبع اور مطبع کا ذکر کرنے کے HL نمبر لکھا گیا جب ہم اختلاف نسخ کا محولہ صفحات پر جائزہ لیتے ہیں تو زبان منھ کو آتی ہے۔ مثلاً یہ اطلاع دی جارہی ہے کہ:

" ۱۳/۶ خ : بیت ندارد"

یعنی ورق ۶ کی ۱۳ ویں سطر میں مخطوطہ میں بیت نہیں ہے جبکہ اس عکسی ایڈیشن میں ورق ۶ کی ۱۳ ویں سطر میں بیت موجود ہے۔

(ب) اختلاف نسخ کا ایک اور اندراج ملاحظہ ہو:

" ۱۷/۶ خ، ط : دل بندہ"

جبکہ عکسی ایڈیشن میں "دل بینندہ" ہے۔

(ج) غرضکہ اختلاف نسخ نہایت گمراہ کن ہے اور بیحد افسوسناک ہے۔ نہ صرف مندرجات بالکل غلط ہیں بلکہ موازنہ کا کام کیا ہی نہیں گیا ہے، چنانچہ میں نے فی الحال مکتوب اول در توحید کا عکسی ایڈیشن اور مطبوعہ نسخوں کے درمیان موازنہ کیا ہے جو ہدیۂ ناظرین ہے لیکن اس سے پہلے یہ بتاتا چلوں کہ اب تک متن مکتوبات صدی کے تین مطبوعہ نسخے مجھے ملے۔

(۱) مطبوعہ مطبع علوی محمد علی بخش خاں نقشبندی، لکھنؤ سن طباعت ۱۲۸۶ھ۔

(۲) مطبوعہ مطبع نولکشور لکھنؤ۔ جس کا تیسرا ایڈیشن (۱۹۱۱ء) میرے پیش نظر ہے۔

(۳) مطبوعہ پاکستان باہتمام سید نعیم الدین ندوی۔ یہ ایڈیشن نولکشور کے مطبوعہ نسخے پر منحصر ہے اس لیے مذکورہ بالا دونوں مطبوعہ نسخوں کے ساتھ عکسی ایڈیشن کا موازنہ پیش کیا جاتا ہے۔

اختلاف نسخ

مکتوب اول در توحید

ورق/سطر	عکسی ایڈیشن (ع)	مطبوعہ علوی لکھنؤ (ط ل)	مطبوعہ نولکشور (ط ن)
۶/۷	برادر شمس	برادرم شمس	برادر داغ شمس
۶/۷	اہل طریقت توحید را بر چہار درجہ نہادہ اند	توحید را اہل طریقت بر	توحید نزد اہل طریق بر چہار درجہ است
۶/۱۰	فردا ہیچ	فردائے قیامت	" (ع)
۶/۱۰	بزبان لا الہ الا اللہ بگوید	بزبان بگوید لا الہ الا اللہ	" (ط ل)
۶/۱۳	بیت	" (ع)	(بیت ندارد)
۶/۱۳	تو دیدہ بدست آر کہ ہر ذرہ خاک	رو دیدہ بدست آر کہ ہر ذرۂ خاک	" (ع)
۶/۱۵	خلود در دوزخ	" (ع)	خلود دوزخ
	(ع)	(ط ل)	(ط ن)
۶/۱۵	آن توحید	این توحید	ازین توحید
۶/۱۷	العجائز این	العجائز یعنی لازم گیرید دین زنان پیر را در حق آسانی و سہولت این	" (ع)
۶/۱۷	درجہ سیوم	درجہ سوم	" (ط ل)
۶/۱۷	دل بیننده	دل بنده	" (ط ل)
۶ب/۱	ہمہ کار از	ہمہ کارہا	" (ع)
۶ب/۲	دیگر را فعل	" (ع)	" دیگر را از فعل
۶ب/۳	بر دل	" (ع)	بدل

۶ب/۳ نوراست	نوریست	« (طل)
۶ب/۵ بدان دارد	بران دارد	« (عر)
۶ب/۶ آن تقلید	این تقلید	« (طل)
۶ب/۷ شنیده باشد	« (عر)	شنیده بود
۶ب/۸ سرامی بیند	« (عر)	سرای می بیند
۶ب/۹ آن مقدار	این مقدار	« (طل)
۶ب/۱۱ عارفست	عارفانست	« (عر)
۶ب/۱۱ کہ در درجہ سیوم گفتیم	کہ در درجہ سوم گفتم	کہ درجہ سوم گفتیم
۶ب/۱۲ خالق را دی داند	وخالق را بیند و میداند	وخالق رای داند
۶ب/۱۴ از نور ظهور	« (عر)	نور باطن ظهور
۶ب/۱۵ بر مثل	« (عر)	بر مثال
۶ب/۱۷ از انک ذره نیست	نیست شد و تا انکہ ذره آفتاب	آن ذره نیست شده بلکہ
شد بل از انکہ	شد بلکہ از انکہ	
۷/۱ تعالی اللہ علواً کبیرا	تعالی اللہ عن ذلک علواکبیر	« (طل)
۷/۳ نظم	مثنوی	« (عر)
۷/۴ پیش توحید او نہ کہنہ ونوست	پیش توحید او نہ کہنہ نہ نواست	پیش توحید تو نہ کہنہ است نہ نوست
۷/۵ کی بود ما زما	« (عر)	کی بود تو زما
۷/۵ تو ومن رفتہ	« (عر)	من وتو رفتہ
۷/۶ چون آئینہ نگری آئینہ نہ	در آئینہ نگری آئینہ را	« (طل)

۸/۷	دیدن	” (ع)	درین
۸/۷	مقدورات	” (ع)	مقدورست
۹/۷	گویند	خوانند	” (طل)
۹/۷	مثنوی	بیت	ـــہ
۱۱/۷	بسیار	” (ع)	پس بسیار
۱۲/۷	دیدہ فراز	دیدہ شدہ فراز	دیدہ شدہ از فراز
۱۳/۷	شربت قہر	شربت از قہر	” (ع)
۱۴/۷	آں حکایت	ایں حکایت	” (ع)
۱۶/۷	خویش بر	خویش را بر	” (ع)
۱۷/۷	ضَیَّعْتَ	” (ع)	ضنعت
۷ب/۱	در آبادان کردن باطن عمر ضائع کردی پس بتوحید	عمر در آبادان کردن باطن ضایع کردی پس در توحید	عمر در آبادان کردن باطن ضائع کردی پس در توحید
۷ب/۲	روندگان	کہ روندگان	” (ع)
۷ب/۲	درین مقام	” (ع)	برین مقام
۷ب/۵	مستغرق بود	” (ع)	مستغرق باشد
۷ب/۸	صدمت	صدمہ	” (طل)
۷ب/۹	ہم	ہمہ	” (طل)
۷ب/۱۲	مثنوی	بیت	ـــہ
۷ب/۱۳	تو در رہ گم شو کہ توحید	” (ع)	تو درو گم کرد توحید

۷ب/۱۴ از ینجاست..... کم کند[1]	(ندارد)	(ندارد)
۷ب/۱۵ نہ اسم است اینجا نہ رسم	نہ اینجا اسم است و نہ رسم	" (ع)
۸/۲ اینجا نشان	" (ع)	ورائے اینجا نشان
۸/۴، ۵ نیست و مثال آن	" (ع)	نیست در میان آئینہ وصورت نہ اتحاد بود نہ حلول تصور آن در مثال نہ حلول بود نہ اتحاد و مثال آن
۸/۷ سیوم	سوم	" (طل)
۸/۹ بدین	" (ع)	برین
۸/۹ مطلقاً ولیکن تفاوت درجات معلوم ہمہ است ہمچنین نام توحید بدین مجموع فتد	(نشان زدہ عبارت ندارد)	" (ع)
۸/۱۱ فواید	" (ع)	قواعد
۸/۱۲ و بحقیقت	و بہ تحقیق	" (ع)
۸/۱۴ علیہم	علیہم اجمعین	" (طل)
۸ب/۱ درآفت مبین	درآئی مبین	" (طل)
۸ب/۲ عابدان بودند از آب	" (ع)	عابدان بباد بی نیازی دادند

[1] یہ عبارت مثنوی سے پہلے گیارہویں و بارہویں سطر میں موجود ہے اور اسی طرح دونوں مطبوعہ نسخے بھی ہیں لیکن عکسی اڈیشن والے نسخے میں یہ عبارت مکرر لکھا گئی ہے۔

		ہمہ ہبا منثورا شد وایں بین کہ ازآب
۸ب/۴ خلیل اللہ می	» (ع)	خلیل اللہ علی نبینا وعلیہم السلام می
۸ب/۴ می سازند	می سازد	» (طل)
۸ب/۶ میکنند	میکند	» (طل)
۸ب/۷ روزی	» (ع)	(روزی) ندارد
۸ب/۱۰ رسید	» (ع)	رسد
۸ب/۱۰ لکام	» (ع)	لنبان
۸ب/۱۲ نہادہ اورا		نہادہ ایں مرد بہ غاست قصہ پرسید ایشان اورا
۹/۱ والسلام	» (ع)	(والسلام) ندارد

مکتوب اول کے متن کا موازنہ ملاحظہ کرنے کے بعد زیر تبصرہ ایڈیشن میں دیے گئے اختلاف نسخ کی حقیقت بالکل واضح ہو جاتی ہے۔

(۱۰) حواشی میں جو اقتباسات بغیر ماخذ کی وضاحت کیے نقل ہوئے ہیں، ان کی تلاش وجستجو پر بھی کوئی محنت نہیں کی گئی ہے۔ اطلاعاً عرض ہے کہ ق ۹۱. ق ۱۰۵، ق ۲۰۱ ب پر جو عربی اقتباسات بغیر کسی حوالے کے نقل کیے گئے ہیں وہ ارشاد المریدین مصنفہ شیخ الشیوخ عمر بن محمد شہاب الدین السہروردی (م ۶۳۲ھ) سے منقول ہیں، اس کا عربی مخطوطہ خدا بخش میں موجود ہے

(۱۱) یہ مکتوبات کس سن میں لکھے ؟ مکتوبات صدی کی جملہ طباعت جس میں متن بھی شامل ہے اور ترجمہ بھی حضرت زین بدر عربی کے پیش لفظ میں سن تالیف کا ذکر اس طرح ملتا ہے :

"وبا وقات مختلفہ از خطۂ بہار صانہا اللہ تعالیٰ عن الآفات وعن البوار در شہور سنہ سبع واربعین وسبعمائۃ در قصبۂ مذکور بہ سائل مذکور فرستادن فرمود"[1]

"اور مختلف اوقات میں خطۂ بہار سے اللہ تعالیٰ اس کو آفتوں اور ہلاکتوں سے محفوظ رکھے ۷۴۷ھ میں سائل مذکور کو ارسال فرمایا"[2]

لیکن کتب خانہ ریاست کپورتھلہ میں موجود مکتوبات صدی کا ایک نادر نسخہ مذکورہ سن تالیف ۷۴۷ھ پر سوالیہ نشان لگا دیتا ہے کیونکہ اس نسخہ موصوفہ میں خود مکتوب الیہ حضرت قاضی شمس الدین کا پیش لفظ موجود ہے اور انہوں نے لکھا ہے کہ میرے شیخ نے مجھے یہ خطوط ۷۴۹ھ کے مہینوں میں لکھے۔ حیدرآباد کی معروف اورینٹل مینسکرپٹ لائبریری میں موجود مکتوبات صدی کے دو خطی نسخے بھی اس کی تائید کرتے ہیں۔ ان دونوں نسخوں میں حضرت زین بدر عربیؒ کا ہی پیش لفظ ہے لیکن بجائے "سبع واربعین وستمائۃ" کے "تسع واربعین وسبعمائۃ" ملتا ہے۔ یہ بہت ممکن ہے کہ "تسع" سے سہو کتابت کی وجہ سے "سبع" بن گیا ہو، کاش زیر تبصرہ عکسی ایڈیشن مکمل دریافت ہوا ہوتا تو ہمیں زین بدر عربیؒ کی وہ عبارت بھی مل جاتی جس میں سن تالیف آیا ہے اور یقیناً وہ کسی حتمی فیصلے تک پہنچنے میں مددگار ہوتی۔

(۴) **مکتوبات صدی کا تحقیق متن اور مکتوبات دو صدی** | مکتوبات صدی کے متن کی تحقیق کے سلسلے میں مکتوبات دو صدی کے متن کو بھی پیش نظر رکھنا بے حد ضروری ہے۔ کیونکہ مکتوبات دو صدی میں قاضی شمس الدین (مکتوب الیہ مکتوبات صدی) کے نام بھی کئی مکتوبات ملتے ہیں۔ جن میں سے بعض مکتوبات صدی میں شامل بھی ہیں۔

---

[1] مکتوبات صدی، مطبوعہ مطبع علوی، لکھنؤ ص۳ [2] مکتوبات صدی، مترجمہ حضرت شاہ نجم الدین فردوسی و حضرت شاہ الیاس یاس بہاری، ص۵

وارستہ سیالکوٹی کے دو رسالے

جواب شافی و احقاق حق

از

ڈاکٹر سید حسن عباس

"مصطلحات[1] شعرا" کا مصنف وارستہ مل سیالکوٹی (م ۱۱۸۰ھ/ ۱۷۶۶ء) کسی تعارف کا محتاج نہیں ہے۔ مصطلحات کی [illegible] سے اس کا شمار فارسی کے ہندوستانی علما میں ہوتا ہے۔ وارستہ شاعر، ادیب، انشا پرداز اور نقاد کی حیثیت سے مشہور ہے۔ وہ میر محمد علی رائج سیالکوٹی (م ۱۱۴۹ھ/ ۱۷۳۶ء) کا شاگرد تھا اور شیخ علی حزیں، خان آرزو، حاکم لاہوری، میر غلام علی آزاد بلگرامی اور واقف بٹالوی کا معاصر۔ اس کی تصنیفات میں مصطلحات شعرا، صفات کائنات، رسالہ جواب شافی و رسالہ احقاق حق کے علاوہ گلدستہ برجستہ[2]

---

[1] مصطلحات کے سال تالیف کے سلسلے میں مولانا امتیاز علی عرشی مرحوم نے مکاتیب غالب میں لکھا ہے: اس کا سال تالیف ۱۱۴۹ھ ہے اور مصطلحات شعرا اس کا تاریخی نام ہے جس سے ۱۱۴۹ھ برآمد ہوتا ہے، مصطلحات الشعرا مشہور ہو جانے کی وجہ سے (ال) کے ۳۱ عدد زیادہ جوڑ لیے جاتے ہیں جس سے ۱۱۸۰ھ کا سال برآمد ہوتا ہے۔ ملاحظہ ہو مکاتب غالب ص ۱۶۳ (حواشی) تیسرا ایڈیشن ناظم برقی پریس رام پور۔ ۱۹۴۵ء [2] اس کا مخطوطہ کتابخانۂ مرکزی دانشگاہ تہران میں گلدستۂ برجستہ یا جنگ رنگا رنگ کے نام سے موجود ہے جو شاید بخط وارستہ ہے۔

کے نام سے اس کی بیاض کا ذکر کیا جا سکتا ہے۔ مصطلحات اور صفات کائنات شایع ہو چکی ہیں۔ پروفیسر نذیر احمد صاحب سابق صدر شعبۂ فارسی مسلم یونیورسٹی علی گڑھ نے جو ہندوستان کیا برصغیر کے سب سے بڑے فرہنگ شناس کی حیثیت سے تسلیم کیے جاتے ہیں اور فارسی فرہنگوں پر کافی کام کر چکے ہیں، غالب نامہ سلور جوبلی نمبر ۱۹۹۵ء میں مصطلحات شعراء پر نہایت مفصل مقالہ سپرد قلم کیا ہے۔ ان سے قبل ڈاکٹر سید عبداللہ مرحوم نے اپنی کتاب 'ادبیات فارسی میں ہندوؤں کا حصہ' میں اس پر سیر حاصل تبصرہ کیا تھا، یہ دونوں مقالے مصطلحات کی ادبی اور لسانی اہمیت سمجھنے میں بے حد مفید ہو سکتے ہیں۔

جواب شافی اور احقاق حق: یہ دو رسالے بھی وارستہ کی تصنیفات میں شامل ہیں لیکن ابھی تک ان پر خاطر خواہ روشنی نہیں ڈالی جا سکی تھی اور اس کی بنیادی وجہ مذکورہ دونوں رسالوں کے قلمی نسخوں کی کمیابی ہے۔ یہاں ان دونوں رسالوں کا تعارف کرایا جاتا ہے۔

جواب شافی: (سال تالیف ۱۱۶۳ھ) وارستہ نے یہ رسالہ حاکم لاہوری مصنف تذکرہ مردم دیدہ کے دیوان پر سراج الدین علی خان آرزو اکبرآبادی کے اعتراضات کے جواب میں لکھا۔ لکھتا ہے:

"... مخفی نماند کہ در شہور سنۂ ہزار و صد و شصت و سہ ہجری خان سخندان، حکیم بیگ خان حاکم تخلص از دہلی بہ لاہور نزول فرمود بندہ وارستہ، بہ حکم محبت ہای دیرین، دیدن خان، سری کشیدم و از دیوانش چشمی آب دادم دیدم بر حواشی صفحات' ایرادہای وارد و غیر وارد مرقوم است' و بر اکثر ابیات کہ از او صمت منقصت خط آزادی دارد' خط بیزاری کشیدہ اند قطع نظر از جہات دیگر

از ہر دری کہ در آمدہ اند، راہ در آمد ندارد و از ہر بابی کہ ابواب کردہ اند، در سخن گرفتہ است ... بعد استفسار معلوم شد کہ چراغ این اعتراضات بر کردۂ شعلۂ ادراک خانِ دقیقہ یاب، تحقیق مآب سراج الدین علی خان آرزو است۔"

وارستہ نے اس رسالے میں خان آرزو کے اعتراضات کا مدلل جواب دینے اور شعرائے فارسی کے اشعار سے شواہد پیش کرنے کی اچھی کوشش کی ہے۔ رسالے کے آخر میں خان آرزو کے منیر لاہوری کے اشعار پر اعتراضات کے جواب بھی وارستہ نے دیے ہیں۔ سب سے پہلے میر غلام علی آزاد بلگرامی نے خزانۂ عامرہ ص ۳۶۲ پر وارستہ کے رسالے جواب شافی کا ذکر کیا ہے، وہ لکھتے ہیں:

"حاکم لاہوری دیوان خود را نزد خان آرزو فرستاد و خواہش نمودہ کہ از حسن و قبح آن آگاہ سازد، خان آرزو ہر چہ بخاطرش رسید در حواشی دیوان حاکم لاہوری یادداشت کرد۔ چون وارستہ مل سیالکوٹی اعتراضات خان آرزو را دید، در جواب آن رسالہ ای بنام "جواب شافی" نوشت۔"

آزاد نے اس کے بعد خان آرزو کے اعتراضات اور وارستہ کے جوابات سے کچھ نمونے نقل کیے ہیں اور لکھا ہے کہ وارستہ نے خان آرزو کے بعض جوابات خوب دیے ہیں۔

جواب شافی سے کچھ اقتباسات لچھمی نرائن شفیق اورنگ آبادی نے بھی اپنے تذکرہ گل رعنا[1] میں درج کیے ہیں۔ ایک نمونہ ملاحظہ فرمائیں:

---

[1] گل رعنا: ص ۱۷۲-۱۷۹ و تین تذکرے (گل رعنا) ص ۳۴۳-۳۴۲۔

حاکم : سر بہ زانو در پی فکر سخن باید شدن
شاہد معنی درین آئینہ شاید رو دہد

می فرمایند : " در آئینہ رو دادن نیست، رو نمودن است" رو دادن بہ معنی توجہ کردن و حاصل شدن آمدہ اخوند سعید اشرف بہ ہر دو معنی بستہ است :

رو بہ ما بی چارگان کی آن پری رو می دہد
چون ببیند بوالہوس را خندہ اش رو می دہد

در بیت مذکور نیز یکی از این دو معنی مقصود شاعر است، ور رو دادن اسمٰعیل ایہام دارد، بیت :

اطوار زشت ہرگز مقبول طبع ما نیست
آئینہ دل ما کی رو دہد ووردہ را

امتیاز خان خالص ہم گوید، بیت :

پاک طینت را چہ باک از خوب و زشت عالم است
می کنم آئینہ خود را ہرچہ خواہد رو دہد

رسالہ جواب شافی کے قلمی نسخے کمیاب ہیں۔ ایک قلمی نسخہ پشاور میں مولانا اسرائیل[1] کے ذخیرۂ کتب میں تھا جس کے بارے میں معلوم کرنے سے پتہ چلا کہ اب موجود نہیں ہے وہاں سے نہ جانے کہاں منتقل ہوگیا۔ رامپور صولت پبلک لائبریری[2]

---

[1] فہرست مشترک نسخہ ہای خطی فارسی، پاکستان ۱۳/ ۲۴۲۴-۲۴۲۵ ABID RAZA[2]

BEDAR: CATALOGUE OF PERSIAN AND ARABIC MSS. OF SAULAT PUBLIC LIBRARY RAMPUR P. 66.

میں موجود ایک مجموعہ میں وارستہ کے دونوں رسالے جواب شافی اور احقاق حق موجود ہیں۔ ایک اور ناقص نسخہ ٹیگور لائبریری لکھنؤ یونیورسٹی میں محاکمہ کے عنوان سے موجود ہے، ان دونوں نسخوں کی مدد سے راقم السطور نے اس کا متن، تصحیح و حواشی کے ساتھ تیار کر لیا ہے۔

رسالہ احقاق حق : وارستہ نے یہ رسالہ شیخ علی حزیں پر خان آرزو کے اعتراضات بنام 'تنبیہ الغافلین'[۱] کے جواب میں لکھا ہے۔ وہ لکھتا ہے:

"بعد حمد خدائی کہ علام غیوب است و ستار عیوب، بر رای صدق گرای ارباب دانش و انصاف کہ غبار جور و اعتساف بہ دامن شان ننشستہ مکشوف باد کہ خان سراج المحققین زاد تحقیقہ بر اکثر اشعار شیخ دقت آئین، تفرد گزین، شیخ محمد علی حزین ایرادہا گرفتہ، رسالہ مسمی بہ تنبیہ الغافلین ترتیب دادہ، چون بندہ وارستہ رسالۂ مذکور را بہ نظر امعان دیدم و بہ کنہ آن وارسیدم، دریافتم کہ بیشتر ناشی از تعصب بی جا است، در ملت سخن شناسی، احقاق حق واجب دانستہ، این چند ورق بہ قلم آوردم و احقاق حق نام گذاشتم۔"

وارستہ نے رسالے کی ترتیب یوں رکھی ہے۔ پہلے قولہ کے تحت شیخ حزیں کا شعر لکھتا ہے پھر خان آرزو کے اعتراض/اعتراضات 'قال' کے عنوان سے درج کرتا ہے، اس کے بعد اقوال کے ذیل میں اپنے جواب/جوابات لکھتا ہے اور اپنی بات

---

[۱] یہ رسالہ ڈاکٹر محمد اکرم اکرام کی تصحیح کے ساتھ دانشگاہ پنجاب لاہور، پاکستان سے ۱۴۰۱ھ/۱۹۸۱ء میں شایع ہو چکا ہے۔

کی شہادت کے لیے فارسی کے معروف شعراء کے اشعار پیش کرتا ہے۔ ایک نمونہ ملاحظہ ہو:

"قولہ [شیخ حزیں]: شیرین لبان چو بزم می لالہ گون کنند
خونِ مرا بہ جرعہ برای شگون کنند

قال [خان آرزو]: می بہ ساغر و شیشہ کردن مسموع است و بہ جرعہ کردن شنیدہ
نشد و در صراح است جرعہ یک آب آشام

اقول [وارستہ]: جرعہ بہ معنی پیالہ در اشعار فصحا واقع است، اصطلاحاً و
لا مناقشہ فی الاصطلاح چنان کہ حیاتی گیلانی گوید، بیت:

رحیق ناب چہ پرسی چہ کیفیت دارد یکی بہ جرعہ فرو ریز خون ناب مرا

عرفی شیرازی ہم گوید، بیت: این جرعہ بنوش ای دل شو فرش درین بزم
کین جام نہ خمخانۂ جمشید نسیابی

رضی ارتیمانی ہم دارد، بیت:

بی می خرابیم و بی جرعہ مدہوش ز آن لعل میگون ز آن چشم جادو

سنجر کاشی گوید، بیت:

نرفت از خط بغداد بیشتر منصور فقیر بود کہ این جرعہ را تمام کشید

دیگران ہم دارند، اما ایراد آن مورث اطناب است۔"

رسالہ احقاق حق کے بھی ابتک دو مخطوطے معلوم ہو سکے ہیں اور دونوں رامپور میں ہیں۔ ایک صولت پبلک لائبریری میں اور دوسرا رضا لائبریری میں۔ ان دونوں نسخوں کی مدد سے راقم السطور نے اس رسالے کا متن بھی تیار کر لیا ہے اور عنقریب دونوں رسالے یکجا شایع کرنے کا خیال ہے۔

برصغیر میں فارسی تنقید نگاری اور خاص کر اشعار کی تنقید کے سلسلے میں یہ دونوں رسالے بڑی اہمیت کے حامل ہیں۔ ان میں الفاظ، اصطلاحات اور اضافات وغیرہ کی بڑی اچھی بحثیں مثالوں کے ذریعے پیش کی گئی ہیں [illegible] ہوتا ہے کہ وارستہ کس پایہ کا ادیب و انشا پرداز اور نقاد تھا۔

لفظ "کہف" کا ہندوستانی ماخذ

از جناب گوردیال سنگھ مجذوب، نئی دہلی

ہندوستانی زبان و ثقافت کی قدامت مسلّم ہے، گو اب انگریزی زبان کے عام استیلا و تسلط کی وجہ سے ہندوستانی زبان میں کئی اغریقی GREEK یا بازنطینی BY-ZANTINE الفاظ رائج ہوگئے ہیں تاہم عالمی سطح پر یوروپی زبان و ثقافت میں قدیم سنسکرت زبان کے متعدد الفاظ داخل ہیں جیسے SAINT جس کی اصل سنت ہے یا DENT جس کی اصل دانت ہے۔ دیو یعنی آسمانی صفت کے لیے DIVINE یا THEO استعمال ہوتا ہے، تلاش کرنے سے اس کی بہت سی مثالیں دستیاب ہوسکتی ہیں۔

افسوس کہ اردو، فارسی، ہندی اور پنجابی کے ماہرین لسانیات بھی اسی مرعوبیت کے نتیجے میں ان زبانوں کے الفاظ کا ماخذ یونانی زبان ہی بتایا کرتے ہیں۔

راقم نے اپنی ایک تحریر میں جو ۲۵ اپریل ۱۹۹۰ء کے روزنامہ پرتاب دہلی میں شایع ہوئی ہے۔ یہ ثابت کیا ہے کہ انگریزی لفظ THUNDER کا جس کے معنی آسمانی بجلی یا گرج ہیں ماخذ یونانی نہیں بلکہ فارسی زبان کا لفظ "تندر" ہے۔ جریدہ محولہ بالا کے ۲۸ اپریل ۹۰ء کے شمارے میں جناب غفران احمد صاحب نے قرآنی لفظ "کہف" کو بھی ہندی الاصل بتایا ہے، اس کی اصل ہیئت لفظ "کھوہ" ہے۔

یہ امر قدرے زیادہ وضاحت کا متقاضی ہے، ایک ہزار چار سو برس قبل جبکہ دنیا مذہب اسلام سے واقف بھی نہیں تھی اہل عرب "کہف" کا لفظ استعمال کرنے لگے تھے، جو ہندوستانی لفظ "کھوہ" سے لیا گیا ہے، راقم جناب غفران احمد صاحب کے دعوی

کی صرف تائید ہی نہیں کرتا بلکہ "کھوہ" سے "کہف" بننے تک اسے لغت و لہجہ کی جس تبدیلی کا سامنا کرنا پڑا ہے اس کی وضاحت بھی کر رہا ہے تاکہ معلوم ہو سکے کہ ہندوستان سے لمبا سفر طے کر کے عربی زبان میں یہ دخیل لفظ رواج پا چکا تھا۔

سب سے پہلے یہ بنیادی بات ذہن نشین کر لینی چاہیے کہ اصل عرب حرف "واؤ" کو حرف "ف" میں تبدیل کر دیتے ہیں، اس کی بعض مثالیں ملاحظہ ہوں:

لفظ لارڈ ویول LORD WAVEL کو عربی میں "ویول" کی بجائے "ویفل" لکھا جاتا ہے۔

لفظ SHIVA جو ہندوستانی عقیدہ کے مطابق برگزیدہ اور قابل احترام معبود کا نام ہے، اسے عربی میں "شیفا" لکھا جاتا ہے۔

اسی طرح لفظ "مہادیو" کو جب عربی زبان میں لکھا جائے گا تو "واؤ" کو "ف" میں تبدیل کرتے ہوئے "مہادیف" لکھا جائے گا۔ اس کے لیے راقم کی کتاب "تناغم المآسی" ملاحظہ کی جائے۔

علی ہذا القیاس "کہف" کو جس کے معنی غار کے ہیں، ہندوستانی زبان کے لفظ "کھوہ" سے اپناتے وقت حسب ذیل تبدیلیاں واقع ہوئی ہیں:

(الف) لفظ "کھوہ" میں اہل عرب نے آخری حرف "ھا" کو غیر ضروری یا زائد خیال کر کے حذف کر دیا کیونکہ انھوں نے اسے "ھا" ساکت کا درجہ عطا کیا۔

(ب) "کھوہ" کا لفظ چار حرفی (ک + ھ + و + ہ) تھا، اس کا آخری حرف "ھا" گرا دینے سے وہ محض تین حرفی "کھو" رہ گیا۔

(ج) پہلے ذکر کیا جا چکا ہے کہ عرب "واؤ" کو "ف" میں بدل دیتے ہیں، اس قاعدے کے بموجب انھوں نے "کھو" (ک + ھ + و) کے واو کو بھی ف سے بدل کر کہف (ک + ھ + ف) بنا لیا۔ میرے نزدیک جناب غفران احمد کی یہ لسانی و لغوی تحقیق قابل ستائش ہے۔

استفسار و جواب

دارالمصنفین کی بنیاد کس نے ڈالی تھی؟

ڈاکٹر ابرار اعظمی، سابق صدر شعبۂ تربیت اساتذہ، پوسٹ گریجویٹ کالج۔ مالٹا ڈی۔ اعظم گڈھ } محکمہ اطلاعات اترپردیش کی شایع کردہ کتاب "اودھ آئینۂ ایام میں" پیش نظر ہے، اس میں مولوی ندرالحفیظ ندوی نے تحریر کیا ہے کہ "ندوی فرزندوں نے میر کارواں حضرت سید سلیمان ندوی کی رہنمائی میں دارالمصنفین کی بنیاد ڈالی"۔ دارالمصنفین کی نظریاتی اور عملی تاسیس مولانا شبلی نعمانی کی فکر و عمل کی رہین منت ہے۔ براہ کرم دستاویزی شواہد کی روشنی میں حقیقت حال سے مطلع فرمائیں!

معارف: دارالمصنفین علامہ شبلی کے ذہن کی پیداوار ہے، وہی اس کے موسس اور اصل بانی تھے، دستاویزی شواہد کے لیے حیات شبلی مصنفہ مولانا سید سلیمان ندوی ملاحظہ کیجئے یہاں اسی کا ملخص پیش کیا جاتا ہے۔

مولانا مرحوم کے ذہن میں دارالمصنفین کی تجویز کتب خانہ ندوۃ العلماء کی عمارت کے سلسلہ میں سب سے پہلی بار آئی، مارچ ۱۹۱۰ء کے اجلاس دہلی میں دارالعلوم ندوۃ العلماء کی جو سالانہ رپورٹ انہوں نے لکھ کر پیش کی تھی اس میں اس کا ذکر کیا تھا اور اسی جلسے میں پڑھنے کے لیے "ندوہ میں ایک عظیم الشان کتب خانہ کی ضرورت" کا عنوان میرے (سید صاحب کے) حوالہ فرمایا تھا اور ارشاد ہوا تھا کہ اسی سلسلہ میں ایک دارالمصنفین کے قیام کی تجویز پیش کرو۔

اگست ۱۹۱۰ء میں نواب مزمل اللہ خاں نے سرکاری خطاب پانے کی خوشی میں مولانا شبلی کی تصنیفات کی یادگار میں دارالعلوم میں ایک کمرہ بنوانا چاہا تو مولانا نے اس کے بجائے اس کی خواہش کی کہ دارالعلوم میں ایک عمارت دارالمصنفین کے نام سے تعمیر ہو اور اس میں تالیف و تصنیف کا ایک دفتر قائم ہو اور نواب صاحب سے درخواست کی کہ وہ اپنی رقم کو اس مد میں منتقل فرمائیں بشرطیکہ ملک کے اور باہمت اور علم دوست حضرات اس سرمایہ میں اضافہ فرمائیں۔

جولائی ۱۳ء میں جب ندوہ سے الگ ہونے پر مجبور ہوئے تو اُدھر سے یکسو ہوکر ان کے ذہن میں ایک تصنیفی ادارہ کا خیال زور پکڑنے لگا، ۱۹۱۴ء میں الہلال کلکتہ کے ذریعہ اس تجویز کو عام طور پر پورے ملک کے سامنے پیش کیا اور انگریزی میں اس کا ترجمہ کرایا اور مخصوص احباب کو خاص طور پر اس کی طرف توجہ دلائی، عرصہ تک وہ اس بارے میں متردد رہے کہ دارالمصنفین کا مرکز کہاں ہو جس کا قطعی فیصلہ خود قاضی تقدیر نے کر دیا کہ اگست ۱۳ء میں مولانا کو اپنے عزیز بھائی مولوی محمد اسحٰق صاحب کی موت نے اعظم گڈھ آنے پر مجبور کیا، یہاں سکون و اطمینان نظر آیا تو اسی شہر کو اپنے مقاصد کا مرکز بنانے کا فیصلہ کر لیا، یہاں دارالمصنفین کی بنیاد ڈالنی چاہی تو سب سے پہلے مولانا نے اس کے لیے اپنے ذاتی باغ اور بنگلہ کو وقف کرنا چاہا، خاندان کے اور شرکا کی رضامندی حاصل کر کے وقف نامہ لکھوانا چاہا، ۱۰ اکتوبر ۱۹۱۴ء کو سید صاحب کو لکھا "کتابیں بقدر ضرورت مہیا ہوگئی ہیں، چھ سات الماریاں بھر گئی ہیں، وقف نامہ باغ زیر تحریر ہے۔ بنگلہ کے بغل میں مختصر سا دارالضیوف بن گیا ہے"۔ درجہ تکمیل کے وظائف کے لیے مولانا حمید الدین صاحب نے ۳۰ روپے ماہوار مقرر کیے، کتب خانہ، باغ اور

بنگلہ کی وسعت و ترمیم میں جو مصارف کثیر پڑنے والے تھے ان کا بار بھی مولانا نے خود اپنے سر لیا، دارالتصنیف اور دارالتکمیل کے طلبہ کے قیام کے لیے اپنے والد مرحوم کا مکان جو بنگلہ کے قریب اور دوسرے حصہ دار کے قبضہ میں تھا کرایہ پر لیا، باغ کے پہلو میں سڑک پر جو سرکاری مکان تھا اس کے خریدنے کا بھی سامان کرنا چاہا۔

ان تمام مراتب کے طے ہو جانے کے بعد طلبائے دارالمصنفین کے لیے قواعدِ داخلہ بنائے جو انہی کے ہاتھ کے لکھے ہوئے تھے اور حیات شبلی صفحہ ۶۹۹-۶۹۸ پر درج ہیں۔

ان سب مرحلوں کے طے ہونے کے بعد ندوہ کے فارغ التحصیل و غیر فارغ التحصیل طلبہ میں سے جن سے مولانا شبلی خود واقف تھے چند طلبہ کا انتخاب کیا، مولوی ابوالحسنات عبدالشکور ندوی مرحوم سابق رفیق دارالمصنفین کا انتخاب خود مولانا ہی نے فرمایا تھا، مولانا خلیل عرب، مولانا عبدالرحمٰن نگرامی اور مولوی محسن بہاری پر بھی ان کی نگاہِ انتخاب پڑی۔ ندوہ کے متعدد طلبہ نے داخلہ کی خواہش کی تھی، ان کو بقرعید بعد انٹرویو کے لیے بلایا تھا۔ ۲ نومبر ۱۹۱۴ء تک مولانا اس قابل ہو گئے تھے کہ دو تین ماہ بعد اپنے بعض احباب خاص[1] کو دارالمصنفین دیکھنے کے لیے مدعو کر سکیں۔ (ماخوذ از حیات شبلی ص ۷۶۹)

مولانا سید سلیمان ندوی کی مذکورۂ بالا تصریحات سے صاف ظاہر ہے کہ دارالمصنفین کی داغ بیل خود مولانا شبلی ڈال چکے تھے۔ لیکن ان کی زندگی میں وہ بالکل ابتدائی مرحلے میں تھا، حیات سلیمان کے مصنف مولانا شاہ معین الدین احمد ندوی لکھتے ہیں "سید صاحب کے علمی کارناموں میں سب سے بڑا کارنامہ دارالمصنفین کی تعمیر و ترقی ہے، اگرچہ اس کی بنیاد علامہ شبلی نے ڈالی تھی مگر ابھی وہ اس کے ابتدائی انتظامات سے فارغ بھی نہیں ہوئے تھے کہ ان کا وقت آخر ہو گیا"۔ (حیات سلیمان ص ۸۵)

---

[1] نواب علی حسن خاں وغیرہ۔

البتہ دارالمصنفین کے خاکے میں رنگ بھرنے اور اس کے باقاعدہ علمی جامہ پہننے کا کام ان کے بعد ہوا جب ان کی وصیت کے مطابق ان کے تلامذۂ خاص نے اسے تالیف و تصنیف اور اشاعت کا مرکز بنایا۔ حضرت سید صاحب رقمطراز ہیں تاہم مولانا نے دارالمصنفین کے متعلق جو یہ پیشین گوئی کی تھی کہ "شاید وہی میرا مدفن بھی ہو" وہ پوری ہوئی، ان کی نیک نیتی سے ان کے بعد ہی دارالمصنفین قائم ہوا۔" (حیات شبلی ص۸)

علامہ شبلی کے بعد دارالمصنفین کو کس کی رہنمائی میسر آئی اس کے متعلق بھی غلط بیانی کی گئی ہے، مولانا سید سلیمان ندوی فرماتے ہیں: "مولانا مرحوم کی وفات کے تیسرے روز گویا ماتم سے فارغ ہو کر مولانا حمید الدین صاحب نے مولانا کے ان چند شاگردوں کو لے کر جو اس وقت جمع تھے ایک مجلس اخوان الصفا کی بنیاد ڈالی اور اس کا مقصد یہ قرار پایا کہ مولانا مرحوم کے ادھورے کاموں کی تکمیل کی جائے، اس مجلس میں اس وقت مولانا حمید الدین صاحب کے علاوہ حسب ذیل اشخاص شریک تھے، مولوی مسعود علی صاحب ندوی، مولوی شبلی صاحب متکلم ندوی اور خاکسار۔" (حیات شبلی ص۷۸۹)

گویا سید صاحب کے نزدیک مولانا حمید الدین صاحب نے علامہ شبلی کے بعد ان کے ناتمام کاموں کی تکمیل اور دارالمصنفین کا نظام چلانے کے لیے مجلس اخوان الصفا کی بنیاد ڈالی تھی، جن کو اپنے ایک مکتوب میں خود مولانا شبلی نے لکھا تھا "اور اگر دارالمصنفین قائم ہوا تو تمہارے سوا کون چلائے گا۔" (حیات شبلی ص۷۲۳)

یہاں اس کی صراحت بھی ضروری ہے کہ مولانا سید سلیمان ندوی اس وقت دکن کالج پونا میں اسسٹنٹ پروفیسر تھے، ان کو اعظم گڑھ آنے میں وقت لگا، البتہ مولوی مسعود علی صاحب ندوی اس وقت یہیں مقیم تھے اور مولانا کے اعزہ اور مولانا حمید الدین فراہی کے

چھوٹے بھائی حاجی مولوی رشید الدین صاحب سے مل کر دار المصنفین کے لیے ضروری کارروائی میں مصروف تھے۔

بعد میں اس مجلس اخوان الصفا میں مولانا عبدالسلام ندوی کے نام کا اضافہ ہوا جو اس وقت الہلال کی ادارت سے وابستہ تھے اور سیرت نبوی کی تالیف میں علامہ شبلی کے لٹریری اسسٹنٹ بھی رہ چکے تھے۔ (حیات شبلی ص۱۳ ۷)

مولانا سید سلیمان ندوی دار المصنفین کی پہلی سالانہ روداد میں تحریر فرماتے ہیں :

" ۲۱ نومبر کو واقعہ[1] کے تیسرے دن برادر اعظم مولانا حمید الدین صاحب کی دعوت پر ہم نے مولانائے مرحوم کے اعمال متروکہ کی تکمیل کے لیے اخوان الصفا کے نام سے ایک مجلس تاسیس کی۔ اس مجلس کے حسب ذیل ممبر تھے۔

۱۔ مولانا حمید الدین صاحب صدر ۲۔ سید سلیمان ندوی ناظم ۳۔ مولانا عبدالسلام صاحب ندوی رکن ۴۔ مولوی مسعود علی صاحب ندوی رکن ۵۔ مولوی شبلی صاحب متکلم ندوی رکن۔" (بحوالہ حیات سلیمان ص۹۶)

مجلس دار المصنفین کے صدر مولانا حمید الدین صاحب نے بھوپال اور حیدر آباد کی ریاستوں سے سیرت اور دار المصنفین کے اجرائے وظائف کے لیے بھی جدوجہد کی، مولانا سید سلیمان ندوی ارقام فرماتے ہیں :

" اور آخر ۲۹ نومبر ۱۹۱۴ء میں مولانا حمید الدین صاحب اور خاکسار سرکار عالیہ[2] کی خدمت میں حاضر ہوئے اور اس بشارت کے ساتھ واپس آئے کہ سیرت کی ماہوار رقم بقیہ زمانہ مقررہ تک جاری رہے گی... مولانا حمید الدین صاحب کی

---

[1] یعنی مولانا شبلی کا واقعۂ وفات جو ۱۸ نومبر ۱۹۱۴ء کو پیش آیا تھا [2] بھوپال۔

تحریک اور نواب عمادالملک بہادر اور مسٹر حیدری بی۔اے معتمد عدالت و امور عامہ سرکار نظام کی سفارش سے سرکار نظام خلد اللہ ملکہ نے اپنی مشہور خسروانہ فیاضی اور علم دوستی کے ساتھ مولانائے مرحوم کے منصب (۳۰۰) ماہوار کو دارالمصنفین میں منتقل کرنا منظور فرمایا" (حیات سلیمان ص۹۶)

۲۵ مئی ۱۹۱۵ء کو دارالمصنفین کا جو پہلا جلسہ ہوا اس میں جن اشخاص کو دارالمصنفین کا رکن اساسی منتخب کیا گیا ان میں پہلا نام مولانا حمیدالدین صاحب صدر کا اور دوسرا مولانا سید سلیمان ندوی ناظم کا تھا (حیات سلیمان ص۱۰۱)

پتہ نہیں مقالہ نگار کو اس کی خبر ہے کہ نہیں کہ مجلس دارالمصنفین کا یہ سرپرست ندوۃ العلماء کا رکن بھی تھا اور علامہ شبلی نے اس کو بہ اصرار اس کی تعطیلوں میں بلوا کر ندوہ میں رکھا اور چند طلبہ کو اس سے الدروس الاولیہ[1] فی العلوم الطبیعۃ کے کچھ اسباق پڑھوائے۔ (حیات شبلی ص۴۳۱)

۱۹۰۸ء میں جب مولانا حمیدالدین صاحب مدرسۃ العلوم کراچی سے علی گڑھ کالج میں عربی لکچرر ہوکر آگئے تو مولانا شبلی نے ندوہ کے جلسۂ انتظامیہ میں یہ تجویز منظور کرائی کہ ایک طالب علم کو ندوہ کے خرچ پر علی گڑھ کالج ان سے الدروس الاولیہ اور ہیئت جدیدہ پڑھنے کے لیے بھیجا جائے، اس تجویز پر عمل ہوا، مگر مولوی حمیدالدین صاحب فوراً ہی علی گڑھ سے الٰہ آباد یونیورسٹی میں چلے آئے اس لیے تجویز کامیاب نہ ہوسکی (حیات شبلی ص۴۳۲)

مولانا شبلی نے اپنے بھائی اور شاگرد مولانا حمیدالدین صاحب مصنف نظام القرآن کو لکھا کہ وہ اپنی تعطیل میں آکر مدرسہ[2] کے لڑکوں کو قرآن پڑھا دیں، چنانچہ وہ دو سال

---

[1] یہ جدید طبیعیات کی ایک کتاب تھی جو بیروت سے شایع ہوئی تھی [2] دارالعلوم ندوۃ العلماء مراد ہے۔

تک اپنی تعطیل میں آکر قرآن پاک کا درس دیتے رہے (حیات شبلی ص ۴۳۳)

زیر بحث مقالہ پہلے محکمہ اطلاعات اتر پردیش کے ماہنامہ نیا دور کے اودھ نمبر میں شایع ہوا تھا جسے پڑھ کر ایک صاحب علم و نظر محقق کو دار العلوم ندوہ کی زمین کے بارے میں استفسار کرنا پڑا تھا جس کا جواب فروری ۱۹۹۶ء میں دیا جا چکا ہے، معلوم ہوتا ہے اب محکمہ نے اسی نمبر کو کتابی صورت میں شایع کیا ہے، کتاب ہماری نظر سے نہیں گزری تاہم دار المصنفین کے متعلق لکھنے میں اصل مراجع پیش نظر نہیں رکھے گئے ہیں، اسی لیے ہم کو اس قدر تفصیل سے لکھنا پڑا تاکہ زیر بحث مضمون سے پیدا ہونے والی غلط فہمی رفع ہو جائے اور دار المصنفین کی بنا و تاسیس اور تعمیر و ترقی میں جس کا جس قدر حصہ رہا ہے وہ اسے مل جائے وَاٰتِ کُلَّ ذِیْ حَقٍّ حَقَّہٗ۔

سید الطائفہ حضرت سید صاحبؒ ... کارنامے اور دار المصنفین پر ان کے احسانات مسلم ہیں، انکے کارنامے دار المصنفین کے چپہ چپہ پر ثبت ہیں، وہ اور دار المصنفین لازم ملزوم ہیں، وہی مولانا شبلی کے علمی وارث اور جانشین تھے، جن کی بدولت انکے ناتمام کام مکمل ہوئے، سیرۃ النبی کے بقیہ حصوں کی تکمیل کی سعادت انہیں میسر آئی، انہوں نے دار المصنفین کو مولانا شبلی کے تخیل سے زیادہ وسعت اور ترقی دیکر اسے بین الاقوامی ادارہ بنایا، انہی کی رہنمائی اور تربیت میں دار المصنفین کے رفقائے مصنفین نے جن میں اکثر ندوی اور بعض غیر ندوی فضلا بھی تھے، جنھوں نے محققانہ تصنیفات کا انبار لگا دیا۔ لیکن اس کی وجہ سے ان کو اور ان کے زیر رہنمائی ندوی فرزندوں کو دار المصنفین کا بانی قرار دینا حقائق و واقعات کے خلاف ہے، سید صاحب کے سوانح نگار اور جانشین مولانا شاہ معین الدین احمد ندوی نے بالکل بجا طور پر انہیں "معمار دار المصنفین" لکھا ہے (حیات سلیمان ص ۸۵ و ۸۸)

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ ندوی فرزندوں نے میر کارواں حضرت سید سلیمان ندوی کی رہنمائی میں دار المصنفین کو پروان چڑھایا اور بام عروج پر پہونچایا۔ "ض"

معارف کی ڈاک

مکتوب دہلی

ذاکر نگر۔ نئی دہلی

۳۰؍اپریل ۱۹۹۷ء

مجی ضیاء الدین اصلاحی صاحب! سلام ورحمت

جنوری ۱۹۹۷ء کے معارف میں پروفیسر ریاض الرحمن خاں شروانی صاحب کا خط چھپا تھا، جس میں موصوف نے لکھا ہے: "ضیاء صاحب نے انگریزی میں مولانا ابوالکلام آزاد کی جو سوانح لکھی ہے اور اس وقت زیر اشاعت ہے وہ مکمل نہیں ہے۔ بلکہ پہلی جلد ہے جو مولانا کی ۱۹۴۰ء تک کی زندگی کا احاطہ کرتی ہے۔ دوسری جلد لکھنے سے قبل افسوس ہے کہ ضیاء صاحب کی وفات ہوگئی"۔ اس مسئلے پر میرے اور شروانی صاحب کے خیالات میں کافی اختلاف ہے، جس سے معارف کے قارئین بخوبی واقف ہیں۔ ابھی حال میں مرحوم ضیاء صاحب کا ایک اہم خط دریافت ہوا ہے جو مرحوم کے قریبی عزیز ڈاکٹر سعید الوحیدی صاحب کے نام ہے جو ایک طویل عرصے تک سعودی عرب میں رہ چکے ہیں اور اب مستقل طور پر ذاکر نگر میں مقیم ہیں۔ اس خط پر ۲۵ فروری ۱۹۹۶ء کی تاریخ درج ہے۔ اس خط سے بہت سے اختلافی مسائل حل ہو جاتے ہیں، اس لیے اس کی ضروری تلخیص ذیل میں پیش کرتا ہوں۔ ملاحظہ ہو:

۲۵ فروری ۱۹۹۶ء

عزیز مکرم جناب سعید الوحیدی صاحب قبلہ، سلام وتحیات

مولانا آزاد کے سیاسی سوانح حیات پر میری پہلی جلد ۱۹۰۳ء/۱۹۰۲ء - ۱۹۴۰ء مکمل ہوگئی ہے۔ کسی اچھے پبلیشر کی تلاش ہے۔ انشاء اللہ جلد مل جائے گا۔ اس کا اردو ترجمہ بھی مکمل ہے۔ بیماری کے زمانے میں خاصا کام ہوا۔ دوسری جلد پہ انشاء اللہ جلد کام شروع کروں گا جو ۱۹۴۰ء تا ۱۹۵۸ء کی مدت پہ محیط ہوگا۔ اس زمانے کا MATERIAL۔ بھی زیادہ ہے اور یہ غیر دریافت شدہ بھی ہے یعنی UNEXPLORED ہے۔ دعا کیجئے کہ خدا اتنی مہلت دے کہ اس کام کو مکمل کر جاؤں۔ انگریزی میں بھی اور اردو میں بھی۔

آپ کا بھائی

ضیاء الحسن فاروقی

مکتوب اعظم گڈھ

اعظم گڈھ

۲۵ مارچ ۱۹۹۷ء

محترم مولانا ضیاء الدین صاحب السلام علیکم

مارچ ۹۷ء کے معارف میں جناب توقیر احمد ندوی کا مضمون "ہندوستان میں عربی سیرت نگاری" شایع ہوا ہے، وہ لکھتے ہیں کہ "مولانا اسمٰعیل مدراسی مرحوم نے علامہ شبلی کی سیرۃ النبی کے عربی ترجمہ کی ذمہ داری لی تھی مگر وہ اس کی تکمیل نہ کر سکے"۔ تعجب ہے کہ اس پہ آپ نے ادارتی نوٹ نہیں لگایا۔

سیرۃ النبی جلد اول مترجمہ مولانا اسمٰعیل ندوی مرحوم کا اصل مسودہ جامعہ اسلامیہ

مدینہ منورہ میں محفوظ ہے۔ جس کی ایک کاپی مولانا محمد اجمل اصلاحی سابق استاذ جامعہ اسلامیہ نے جناب سید صباح الدین عبدالرحمٰن صاحب مرحوم کو ان کے سفر عمرہ کے موقع پر مدینہ منورہ میں دی تھی۔ مرحوم نے یہ مسودہ جنوری ۱۹۷۶ء میں حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی ناظم دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ کے حوالہ کر دیا، اتفاق سے اس وقت ندوہ میں رابطہ ادب اسلامی کا سینار ہو رہا تھا جس میں شرکت کے لیے عبداللہ ابراہیم انصاری صاحب بھی تشریف لائے تھے۔ موصوف نے اس کی علی الفور طباعت پر زور دیا تھا۔ بعد میں معلوم ہوا کہ مولانا محترم نے سیرت کا عربی مسودہ نظر ثانی کے لیے مولانا عبداللہ عباس صاحب کے سپرد کیا ہے کیونکہ ان کے بقول اس پر حواشی کی ضرورت ہے۔ اس وقت سے ابتک محترم مولانا ابوالحسن علی ندوی صاحب متعدد بار فرما چکے ہیں کہ سیرۃ النبی جلد اول کا عربی ترجمہ جلد شایع ہو جائے گا۔ اسی طرح سیرت عائشہ مولفہ علامہ سید سلیمان ندوی، مترجمہ مولانا محمد ناظم ندوی صاحب (پاکستان) کا مسودہ بھی ۱۹۸۹ء میں ندوۃ العلماء بھیجا گیا تھا جس کے حوالوں کی مراجعت و تحقیق کا کام مولانا محمد عارف عمری صاحب رفیق دارالمصنفین نے انجام دیا ہے۔ لیکن سیرۃ النبی ہی کی طرح اس کی اشاعت میں بھی نہ جانے کیوں تاخیر ہو رہی ہے

خاکسار دارالمصنفین شبلی اکیڈمی کے سالانہ جلسوں میں ان مسودوں کے متعلق استفسار بھی کرتا رہا ہے۔

مخلص

سلمان سلطان

(رکن مجلس انتظامیہ دارالمصنفین شبلی اکیڈمی)

وفیات

مولانا محمد منظور نعمانی

گزشتہ مہینے کا معارف اشاعت کے مرحلے میں تھا کہ یہ افسوسناک خبر ملی کہ مولانا محمد منظور نعمانی ۴/۵ مئی کی درمیانی شب میں انتقال فرما گئے۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ ٥

اس قحط الرجال میں مولانا جیسے حکمت دین سے واقف، صاحب فہم و بصیرت اور مدبر عالم، قوم کے دردمند مصلح اور ملت کے ہمدرد و غم گسار کا اٹھ جانا کس قدر المناک سانحہ ہے۔

مولانا ایک عالم و مصنف اور صاحب سلوک و عرفان بزرگ ہی نہ تھے بلکہ زمانے کے نبض شناس، وقت کے تقاضوں اور حالات سے باخبر اور عاقبت بیں بھی تھے، جن کا عمل اس پر تھا کہ ؎

نکل کر خانقاہوں سے ادا کر رسم شبیری کہ فقر خانقاہی ہے فقط اندوہ و دلگیری

وہ مذہبی، اصلاحی، قومی، ملی، تعلیمی اور اجتماعی جد و جہد کے ہر محاذ پر سرگرم اور متحرک دکھائی دیتے تھے، انہیں مسلمانوں کی موجودہ پستی و زبوں حالی کا پوری طرح احساس بھی تھا اور وہ اس کے ازالے کے لیے نہایت فکرمند بھی رہتے تھے، آزاد ہندوستان میں جن مسائل نے مسلمانان ہند کی زندگی تلخ اور مکدر کر رکھی ہے، ان پر شور و غوغا مچانے، لچھے دار باتیں اور دھواں دار تقریریں کرنے اور پرجوش تحریریں لکھنے والے تو بہت سارے لوگ ہیں لیکن ان پر مولانا کی طرح تڑپنے، بے چین ہو جانے، درد و کرب اور

خلش و اضطراب میں مبتلا ہونے والے بہت کم لوگ ہیں، وہ مسلمانوں کی فلاح و بہبود کے لیے دعا و مناجات میں بھی مصروف رہتے تھے اور ملک کے گوشے گوشے کی خاک بھی چھانتے رہتے تھے، ان کے گریہ شب اور دعاہائے سحر گاہی سے گھبرا کر ابلیس بھی یہ کہتا رہا ہوگا کہ ؎

خال خال اس قوم میں اب تک نظر آتے ہیں وہ کرتے ہیں اشک سحر گاہی سے جو ظالم وضو

ایسے بیدار مغز و ہوش مند عالم کی وفات مسلمانوں کی بدنصیبی، قوم و ملت کا زیاں اور علم و دین کا ناقابل تلافی نقصان ہے۔

مولانا محمد منظور نعمانی مرادآباد ضلع کے قصبہ سنبھل میں ۱۹۰۵ء میں پیدا ہوئے۔ یہیں اردو، فارسی اور عربی کی ابتدائی کتابیں پڑھیں، دارالعلوم مئو میں بھی درسیات کی تحصیل کی اور آخر کے دو سال دارالعلوم دیوبند میں گزارے۔ اس وقت مولانا انور شاہ کشمیری صدر المدرسین اور شیخ الحدیث تھے، ان سے اور دوسرے اساتذۂ فن سے درس لیا، شاہ صاحب کے تلمذ پر ان کو ہمیشہ فخر رہا اور اپنے تمام اساتذہ میں ان ہی سے سب سے زیادہ محبت و عقیدت رکھتے تھے۔ ان سے بیعت بھی ہوئے۔ حضرت شاہ عبدالقادر رائے پوری سے بیعت اس کے بعد ہوئے تھے۔

مولانا نے تعلیم سے فراغت کے بعد چند برس تک بعض عربی مدارس میں تدریس کی خدمت انجام دی۔ اس زمانے میں بعض داخلی و خارجی فتنوں کا بڑا زور تھا، ان فتنوں سے اسلام کے عقیدہ توحید و رسالت کی بیخ کنی اور شرک و بدعت کے فروغ کے علاوہ علمائے دیوبند کی ذات و مسلک بھی مجروح ہو رہا تھا، اس لیے مولانا طالب علمی ہی کے زمانے سے ان کی سرکوبی کی تیاری کرنے لگے تھے اور اب تدریسی ذمہ داریوں کے ساتھ ہی ان کے خلاف محاذ آرائی میں حصہ لینا شروع کیا، چنانچہ ان کی ابتدائی زندگی بعض فرقوں کے

مقابلوں اور ان سے مناظروں کے لیے وقف رہی اور اس میں وہ بڑے کامیاب رہے۔ اسی سلسلے میں انہیں اپنے مخالفوں کے نظریات کے ابطال کے لیے ایک علمی و دینی ماہنامہ رسالہ نکالنے کا خیال بھی آیا جو محرم ۱۳۵۵ھ/۱۹۳۴ء سے اب تک ان کے انتقال کے بعد بھی الفرقان کے نام سے برابر شایع ہو رہا ہے اور وہ ملک کا مشہور علمی، دینی اور اصلاحی رسالہ خیال کیا جاتا ہے۔

مولانا کی یہ جرات و ہمت بھی قابل داد ہے کہ انہوں نے شروع میں رسالہ ایسی جگہ سے شایع کیا جو ان کے حریفوں کا خاص مرکز تھی۔ ان کی مہم جو اور حوصلہ پسند طبیعت کو ہمیشہ اپنی سرگرمی عمل کے لیے نئے میدانوں اور خوب سے خوب تر راہوں کی تلاش و جستجو رہتی تھی، عمر کی پختگی اور بعض تجربوں کے بعد جب وہ مولانا محمد الیاس کاندھلوی کی دینی تحریک سے متوسل ہو گئے تو مسلمانوں کی اصلاح کے اس محدود تصور پر قانع نہیں رہ سکے جس کی بنا پر بعض طبقوں کی اعتقادی و عملی غلطیوں کی بحث و تحیص اور ان کے افراط و تفریط کی تغلیط و تردید الفرقان کا خاص موضوع بن گیا تھا بلکہ یہی دینی دعوت ان کے دل و دماغ پر چھا گئی اور وہ ان کی زندگی اور ان کے اعمال کا خاص محور اور الفرقان کی اصل دعوت بن گئی۔

الفرقان کے متعدد خاص نمبر بھی شایع ہوئے جو بہت مقبول ہوئے، لیکن حضرت مجدد الف ثانی اور حضرت شاہ ولی اللہ پر اس کے خاص نمبر بڑی اہمیت و منفعت کے حامل ہیں اور یہ حقیقت ہے کہ ہندوستان کی ان مایہ ناز ہستیوں اور عظیم داعیوں کے اصلاحی و تجدیدی کارناموں اور ان کی دعوت و تعلیم کو جس بہتر انداز میں ان میں پیش کیا گیا ہے وہ اپنی مثال آپ اور صاحب الفرقان کا عظیم الشان کارنامہ ہے، اس کے

حج نمبر سے حاجیوں کو بڑا فائدہ پہونچا۔

تبلیغی و دعوتی اسفار اور الفرقان کی ادارت کے ساتھ ساتھ مولانا ہمیشہ تصنیف و تالیف میں بھی مشغول رہتے جس کا انہیں اچھا ذوق، خاص سلیقہ اور خدا داد ملکہ تھا، وہ اردو کے بہت اچھے اہل قلم تھے۔ ان کی تحریریں نہایت سلیس، شگفتہ اور رواں ہوتی تھیں۔ جن کی زبان آسان اور بڑی عام فہم ہوتی اور پیش کرنے کا انداز اتنا موثر اور دل نشیں ہوتا تھا کہ عام آدمی کو بھی ان کے سمجھنے میں کوئی دشواری نہیں ہوتی تھی، وہ جس موضوع پر بھی قلم اٹھاتے تھے اس پر ان کی مکمل گرفت ہوتی تھی اس لیے اپنے مدعا و مقصود کو کسی ایچ پیچ کے بغیر اچھی طرح واضح کر دیتے تھے۔

مولانا کی چھوٹی بڑی بے شمار تصنیفات ہیں اور وہ سب اس قدر مقبول ہوئیں کہ ان کے درجنوں ایڈیشن بھی نکلے اور ملک کی مختلف زبانوں کے علاوہ انگریزی اور عربی وغیرہ میں ترجمے بھی ہوئے، ان کی جن کتابوں کا فیض بہت عام ہوا ان کا تذکرہ کر دینا مناسب ہوگا۔

اسلام کیا ہے؟ یہ کتاب ۱۹۴۷ء کے بعد کے خاص حالات میں لکھی گئی ہے اس میں ایک عام مسلمان کے لیے مکمل دین کو آسان اور موثر دعوتی زبان میں پیش کیا گیا ہے تاکہ یہ رسالہ مسلمانوں کے لیے رجوع الی اللہ کا ذریعہ بنے اور غیر مسلموں میں بھی اسلام کی اصل صورت واضح ہو جائے۔

دین و شریعت: اس کا موضوع بھی وہی ہے مگر یہ کسی قدر اونچی سطح کے لوگوں کے لیے لکھی گئی ہے۔

قرآن آپ سے کیا کہتا ہے؟ اس میں قرآن مجید کی عمومی دعوت کا خلاصہ

بڑے موثر اور دل نشین انداز اور آسان و عام فہم زبان میں مرتب کیا گیا ہے۔

آپ حج کیسے کریں؟ اس کو لکھنے کا دو خاص مقصد تھا، ایک تو یہ کہ معمولی خواندہ آدمی کو بھی حج کے مناسک و ارکان ادا کرنے میں سہولت ہو، دوسرا مقصد یہ تھا کہ حج کے اعمال کو ادا کرنے کے وقت جن دینی جذبات سے حاجی کو سرشار ہونا چاہیے ان کی تحریک کا سامان کیا جائے۔ ان مقاصد کے لحاظ سے یہ کتاب بہت کامیاب ہوئی۔

آسان حج: اس میں وہی مضمون مزید مختصر اور آسان کر کے لکھا گیا ہے، راقم کو حج بیت اللہ کے سلسلے میں مولانا کے ان رسالوں سے بڑا فائدہ پہونچا۔

کلمہ طیبہ کی حقیقت: اس میں کلمہ کی حقیقت و مفہوم بہت سادہ اور آسان زبان اور عام فہم انداز میں بیان کیا گیا ہے۔

نماز کی حقیقت: اس میں آسان زبان اور دل نشیں انداز میں نماز کی روح بتائی گئی ہے، یہ رسالہ بھی بہت نفع بخش ہے۔

معارف الحدیث: یہ مولانا کی سب سے اہم اور مفید کتاب ہے جو اردو کے علمی و حدیثی ذخیرہ میں ایک بہت قیمتی اضافہ ہے، اس کو بڑی شہرت و قبولیت نصیب ہوئی، اس کی سات جلدیں خود مولانا نے مرتب کر کے شایع کی ہیں۔ آٹھویں جلد ان کے برادرزادہ مولوی محمد زکریا استاذ حدیث دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ مرتب کر رہے ہیں، یہ کتاب دور حاضر کے خاص حالات اور ایک عام پڑھے لکھے شخص کی ضرورت کو مدنظر رکھ کر لکھی گئی ہے، یہ دراصل حدیث نبوی کے ضخیم دفتر سے ایک انتخاب ہے جو ترجمے کے ساتھ ایسی سادہ اور مختصر تشریح پر مبنی ہے جس سے حدیث کا اصل مغز و مدعا اچھی طرح ذہن نشین ہو گیا ہے اور یہ کتاب انسان کی علمی و روحانی ترقی و اصلاح کا ذریعہ بھی بن گئی ہے، گو اس میں

فنی مسائل اور مہمات امور سے براہ راست تعرض نہیں کیا گیا ہے، تاہم اس سے احادیث کی بہت سی علمی و فنی گرہیں صاف طور پر حل ہو گئی ہیں، حدیثوں کے فقہی پہلو اور فقہا کے اختلافات کا تذکرہ بقدر ضرورت اس طرح کیا گیا ہے کہ افتراق باہمی کے رجحان کی ہمت شکنی ہو۔ اس لحاظ سے یہ کتاب اہل علم اور طلبہ حدیث کے لیے بھی بہت کار آمد ہے۔

ان کتابوں سے مسلمانوں کو بڑی رہنمائی اور تقویت ملی اور ان کی حیثیت دراصل صدقہ جاریہ کی ہے۔

مولانا کا شمار اس عہد کے ممتاز اور صف اول کے علما میں ہوتا تھا، دینی علوم میں ان کو بڑا رسوخ اور پختگی حاصل تھی۔ تفسیر، فقہ، کلام اور کتب معقولات پر ان کی وسیع اور گہری نظر تھی لیکن حدیث سے ان کو زیادہ شغف اور مناسبت تھی جس کی تحصیل ہندوستان کے مشہور و نامور اور نابغہ روزگار محدث مولانا محمد انور شاہ کشمیری سے کی تھی اور کئی برس تک خود بھی دار العلوم ندوۃ العلما میں کتب حدیث کا درس دیا، ان کی کتاب معارف الحدیث بھی حدیث میں ان کی ژرف نگاہی کا ثبوت ہے۔

کم لوگوں کو تحریر و تقریر دونوں پر قدرت ہوتی ہے، مگر مولانا کو تقریر کی بھی اچھی مشق تھی، مناظروں میں ان کی کامیابی میں اس کو بھی بڑا دخل تھا، تبلیغی جماعت کے اجتماعات اور دوسری ملی و دینی تحریکوں میں بھی وہ اپنی تقریروں کی اثر انگیزی اور دل پذیری کی بنا پر مدعو کیے جاتے تھے، آخر میں وہ مختصر تقریریں کرنے کے عادی ہو گئے تھے، راقم کو ایک مرتبہ انجمن تعلیمات دین کے جلسہ میں ان کی تقریر سننے کا اتفاق ہوا جو مختصر ہونے کے باوجود واضح، مدلل اور دل نشین تھی۔

مولانا قوم، ملک اور ملت کے مسائل سے کبھی بے تعلق اور بے گانہ نہیں رہے

تقسیم کے بعد مسلمانوں کو جس بحران اور پیچیدگی کا سامنا کرنا اور آئے دن جن نت نئے مسائل سے دوچار ہونا پڑا انکے حل کے لیے جو مخلصانہ کوششیں اور تدبیریں ہوئیں، ان میں ان کا بھی بڑا عمل دخل رہا۔ ۱۹۵۹ء میں دینی تعلیمی کونسل اترپردیش کا قیام عمل میں آیا تو جو سربرآوردہ علما اس میں پیش پیش رہے اور اس کے لیے مختلف جگہوں کے انھوں نے دورے کیے ان میں یہ بھی تھے اور آخر تک اس سے ان کا گہرا تعلق رہا۔

اسی زمانے میں انھوں نے اپنے بعض رفقاء کے تعاون سے ایک ہفت روزہ اخبار نکالنے کا فیصلہ کیا تاکہ آئے دن کے فسادات کے نتیجے میں مسلمانوں میں جو مایوسی، انتشار پست ہمتی اور احساس کمتری پیدا ہو رہا تھا اسے ختم کر کے ان کی صحیح رہنمائی کی جائے ہفت روزہ ندائے ملت کا اجرا اسی احساس کا نتیجہ تھا جس نے بڑی حد تک مسلمانوں کو قوت جرأت اور ہمت عطا کی، اب بھی یہ اخبار ڈاکٹر محمد اشتیاق حسین قریشی کی سرکردگی میں نکل رہا ہے اور مفید خدمت انجام دے رہا ہے۔

۱۹۶۴ء میں جمشید پور اور راوڑکیلا وغیرہ کے فسادات نے ملت کے دردمندوں کو گہری تشویش اور سخت اضطراب میں مبتلا کر دیا، اس کے نتیجہ میں ڈاکٹر سید محمود کی رہنمائی میں مسلم مجلس مشاورت قائم ہوئی۔ اس کے قیام میں مولانا منظور صاحب کا بھی مکمل تعاون رہا اور اس کے وفود میں شامل ہو کر انھوں نے بھی ملک کے اکثر مقامات کا دورہ کیا جس سے بڑی اچھی فضا بنی مگر بدقسمتی سے یہ اتحاد بہت عرصہ تک برقرار نہ رہ سکا۔ اس کی وجہ سے ڈاکٹر سید محمود بہت ملول و متفکر ہوئے ایک مرتبہ انھوں نے اس صورت حال کا درد وحسرت کے ساتھ ذکر کرتے ہوئے بعض حضرات کے رویے کی شکایت کی مگر مولانا محمد منظور نعمانی اور مولانا ابو اللیث اصلاحی ندوی کی سیاسی بصیرت، اصابت رائے اور

معاملہ فہمی کا اعتراف کیا۔

۱۹۷۲ء میں مسلم پرسنل لا بورڈ کی تشکیل میں بھی وہ شریک رہے اور اسکی سرگرمیوں میں بھی حصہ لیا اور اپنی تحریروں اور الفرقان کے ذریعہ اس تحریک میں جان وقوت پیدا کی۔

مولانا حالاتِ حاضرہ اور گرد وپیش کے واقعات سے پوری طرح باخبر رہتے، اخباروں کا مطالعہ پابندی سے کرتے، سیاسی اشخاص اور ملی رہنماؤں کی آمد ورفت کا سلسلہ بھی انکے یہاں رہتا، وہ مسلمانوں کے مسائل کی ترجمانی کے لیے انگریزی اخبار کی اشاعت ضروری سمجھتے تھے اور اس کے لیے اپنی جیسی کوشش بھی کی مگر ابھی تک یہ بیل منڈھے نہیں چڑھی۔

مولانا ہندوستان کے دو سب سے بڑے اور بین الاقوامی تعلیمی اداروں دارالعلوم دیوبند اور ندوۃ العلماء لکھنؤ کے رکن رکین تھے اور بعض نازک موقعوں پر ان کی خداداد ذہانت وصلاحیت اور بروقت قوت فیصلہ سے ان تعلیم گاہوں کے الجھے ہوئے مسائل کو سلجھانے میں بڑی مدد ملی۔ وہ رابطۂ عالم اسلامی کے بھی ممبر تھے اور جب تک ان کی صحت اچھی رہی اسکے جلسوں میں پابندی سے شریک ہوتے اور اسی بہانے حج وعمرہ اور زیارت حرمین کا ثواب بھی لوٹتے رہے۔

دارالمصنفین سے بھی مولانا کا تعلق تھا، مولانا سید سلیمان ندوی سے بعض مسائل میں استفسارات کرتے، مولانا شاہ معین الدین احمد ندوی اور جناب سید صباح الدین عبدالرحمٰن مرحوم سے بھی ان کا مخلصانہ ربط وتعلق تھا، اس کے موجودہ صدر محترم مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کے تو وہ "رفیق مکرم" ہی تھے، الفرقان نے شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا کاندھلوی پر اپنا خاص نمبر شایع کرنے کا اعلان کیا تو اس خاکسار نے بھی حضرت سے عقیدت کی بنا پر ایک مضمون اس میں اشاعت کے لیے بھیجا جس کی وصولی کی رسید فوراً دیتے ہوئے مولانا نعمانی نے مضمون کی تحسین فرمائی جو میرے لیے مایہ فخر ہے۔

مولانا نے بڑی مصروف و مشغول زندگی گزاری، وہ مدۃ العمر دین وملت کی خدمت و سربلندی اور مسلمانانِ ہند کی اصلاح و رہنمائی کا فرض انجام دیتے رہے، مولانا زہد وتقویٰ حسنِ سیرت اور خوش خلقی سے متصف تھے، طبیعت میں دردمندی اور قلب میں رقت تھی، سریع الحس تھے اس لیے واقعات وحالات سے بہت جلد متاثر ہوجاتے۔ دینی مسائل میں ان کا ذہن کھلا ہوا تھا، جزئیات میں متوسع تھے، شرعی امور میں تشدد و تصلب کے بجائے سہولت، تخفیف و عافیت پیدا کرنے کو بہتر سمجھتے تھے۔

اس دور کے اکثر اکابر علما و مشائخ سے ان کے تعلقات تھے اور وہ بالالتزام انکے یہاں حاضری دیتے تھے۔ ان کی سبق آموز زندگی کے واقعات وحالات سے خود بھی فائدہ اٹھاتے اور انہیں قلم بند کرکے دوسروں کو بھی ان سے مستفید ہونے کا موقع دیتے۔ اس ضمن میں ان کی یہ خوبی قابلِ ذکر ہے کہ جن اکابر کی وہ بڑی عزت اور خاص احترام کرتے تھے، ان کی کمزوریوں اور کمیوں پر بھی ان کی نظر پڑتی تھی اور کسی نہ کسی پیرایے میں بے جھجک وہ اس کا اظہار بھی کردیتے تھے، اس طرح یا تو وہ بزرگ اپنی کمی و کوتاہی کی اصلاح و تلافی فرمالیتے یا اگر خود مولانا کو کسی وجہ سے غلط فہمی ہوگئی ہوتی تو وہ دور ہوجاتی اور ان کی تسلی وتشفی کا سامان ہوجاتا۔

مولانا کی سیرت کا یہ پہلو بھی قابلِ ذکر ہے کہ وہ جس کام کو ٹھیک اور بہتر سمجھتے تھے اس میں تن من دھن سے لگ جاتے لیکن جیسے ہی اس کی غلطی ان پر منکشف ہوتی وہ اس سے فوراً اور بے تکلف کنارہ کش ہوجاتے، اس میں نہ انہیں اپنی سبکی کی پروا ہوتی اور نہ اپنے قدیم رفیقوں اور دوستوں کی خفگی کا خیال ہوتا۔

پچھلے دس برسوں سے وہ علیل تھے، بالآخر وقت موعود آگیا، اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت فرمائے اور پسماندگان کو صبر وشکیب عطا کرے۔ آمین

"ض"

مطبوعات جدیدہ

مشاہیر ادب اردو حصہ اول و دوم مرتبہ جناب عابد رضا

بیدار، متوسط تقطیع، عمدہ کاغذ و طباعت، مجلد، صفحات جلد اول ۴۴۵، قیمت ۴۴۵

قیمت ڈیڑھ ڈیڑھ سو روپے، پتہ: مکتبہ جامعہ لمیٹیڈ، جامعہ نگر، نئی دہلی ۱۱۰۰۲۵

'نام نیک رفتگاں ضائع مکن' کی نصیحت پر عمل کرتے ہوئے خدا بخش لائبریری نے اپنے طباعتی منصوبہ میں اردو زبان کے قدیم اور اہم اور اب نایاب رسائل کے مضامین کے انتخاب کی اشاعت کا پروگرام بنایا، مولانا ابوالکلام آزاد کے ہفتہ وار رسالہ پیغام کی تو اس نے مکمل فائل شایع کر دی، اس کے علاوہ ہندوستانی، ادیب، العصر صبح امید، معیار اور زبان جیسے رسائل وجرائد کا انتخاب بھی بڑے سلیقہ سے شایع کرکے بازخوانی کا موقع فراہم کیا، اسی فہرست میں کانپور کے منشی دیانرائن نگم کا مشہور زمانہ رسالہ زمانہ بھی شامل ہے، قریب نصف صدی تک اردو زبان و ادب کی خدمت میں مصروف رہنے والے اس رسالہ کے مضامین و مشمولات کو ہندوستانی مذاہب' ہندو مسلم مسئلہ، اسلامیان ہند، تاریخ ہند اور پریم چند وغیرہ موضوعات کے تحت گیارہ جلدوں میں شایع کیا گیا ہے اور اب مشاہیر ادب اردو کے زیر عنوان چار اور جلدیں شایع ہوگئی ہیں جن میں ہمارے پیش نظر حصہ اول و دوم ہیں، پہلے حصہ میں منشی محمد حسین آزاد سے جگر و جوش تک اور دوسری جلد میں حالی سے ریاض خیرآبادی تک قریب سو ادیبوں اور شاعروں کا احاطہ کیا گیا ہے' نام سے بظاہر اندازہ ہوتا ہے کہ یہ

سوانح پر مشتمل تحریریں ہیں مگر دراصل یہ ان مشاہیر کی تحریروں، خطوط، تصاویر اور ان کے متعلق دوسرے اہل قلم کی تحریروں پر مشتمل ہے، مثلاً اکبر الہ آبادی کے ذکر میں ان کی تصویر، خط، کلام اور ان کے متعلق دو مضامین جو رسالہ زمانہ کی زینت بنے ان کو جمع کر دیا گیا ہے، مقصود یہی ہے کہ متعلقہ شاعر یا ادیب کے متعلق رسالہ زمانہ کے حوالہ سے اگر تحقیق مقصود ہو تو اس طرح محقق کے لیے زیادہ آسانی مہیا کی جاسکے، اس کے لیے خدابخش لائبریری اور جناب عابد رضا بیدار دونوں مستحق تبریک وتحسین ہیں، امید ہے یہ سلسلہ یونہی قایم رہے گا۔

عقیدۂ اسلامی از جناب شاہ محمد عیسیٰ عثمانی فردوسی مرحوم، چھوٹی تقطیع، عمدہ کاغذ اور کتابت و طباعت، صفحات ۲۰۸، قیمت ۴۰ روپے، پتہ: مکتبہ اہل قلم ۱۵۳/۶۲۲، ذاکر نگر، جامعہ نگر، نئی دہلی ۲۵-۱۱۰۰ -

اس مفید و جامع کتاب کے مصنف بہار کے معروف عثمانی خانوادہ کے ولی صفت اور صاحب علم و فضل بزرگ تھے، دعوت وارشاد اور اصلاح معاشرہ کے لیے وہ مدت العمر سرگرم رہے، زیر نظر کتاب اسی سلسلہ کی ایک کڑی ہے، جس میں اصلاح عقائد و رسوم کو موضوع بنایا گیا ہے اور بڑے دل نشیں، آسان اور سادہ انداز میں ذات وصفات وافعال الٰہی، ملائکہ، انبیاء، کتب سماویہ، روح و مادہ، عرش و کرسی، لوح و قلم، جبر و اختیار، تقدیر، قیامت، جنت دوزخ کو بیان کیا ہے، شریعت، مقام صحابہؓ، افضلیت تابعینؒ واولیاء اور شعائر اسلامی کو بھی جمہور اہل سنت کے مسلک کے مطابق اعتدال و توازن سے پیش کیا گیا ہے، یہ کتاب عام مسلمانوں کے لیے نفع بخش اور مصنف مرحوم کے لیے توشۂ آخرت ثابت ہوگی۔

ع۔ ص۔

فہرست
مضمون نگاران معارف

۱۵۹ ویں جلد

ماہ جنوری ۱۹۹۷ء تا ماہ جون ۱۹۹۷ء

(بہ ترتیب حروف تہجی)

فہرست

مضامین معارف

جلد ۱۵۹

ماہ جنوری ۱۹۹۷ء تا ماہ جون ۱۹۹۷ء

(بہ ترتیب حروف تہجی)

جلد ۱۶۰ ماہ ربیع الاول ۱۴۱۸ھ مطابق ماہ جولائی ۱۹۹۷ء عدد ۱

فہرست مضامین

بسم اللہ الرحمن الرحیم

شذرات

لکھنؤ ادبی و تہذیبی امتیاز اور دوسری گوناگوں خوبیوں اور خصوصیتوں کے لیے مشہور تھا، لیکن اب یہی شہرۂ آفاق شہر شیعہ اور سنی جھگڑے کے لیے بدنام ہے، یہاں ایک عرصہ تک نوابانِ اودھ کی حکومت رہی جو شیعہ تھے ان ہی کے زمانے میں عزاداری کے جلوس نکلنا شروع ہوئے مگر کبھی سنی شیعہ جھگڑا نہیں ہوا، اس کا سلسلہ انگریزوں کے دور میں اس وقت شروع ہوا جب تبرابازی عزاداری کا جزءِ اعظم بنا۔ ۱۹۳۷ء میں کانگریسی حکومت قائم ہوئی اور پنڈت گووند ولبھ پنت نے شیعوں کی شدید مخالفت کے باوجود سنیوں کو مدحِ صحابہؓ کا جلوس نکالنے کی اجازت دیدی، اس سے تصادم اور ٹکراؤ کی مستقل بنیاد پڑ گئی، آخر ماتم و عزا کے جلوس کے لیے تبرابازی کیوں لازمی قرار دیدی گئی، کیا دنیا کے کسی مذہب کی بھی یہ تعلیم ہے کہ دوسرے فرقہ و مذہب کے مقدس لوگوں پر علی الاعلان سب و شتم کر کے اس کی دل آزاری کی جائے، قرآن مجید تو مشرکین اور ان کے معبودوں کو بھی برا بھلا کہنے سے منع کرتا ہے کہ مبادا وہ لوگ اللہ تعالیٰ ہی کو برا بھلا نہ کہنے لگیں، اگر عزاداری کا جلوس نکالنا شیعی نقطۂ نظر سے ضروری بھی ہو تو اس کو تبرابازی سے پاک ہونا چاہیے تاکہ دوسرے فرقہ میں خواہ مخواہ اشتعال اور ہیجان نہ بپا ہو۔

دوسری طرف مدحِ صحابہ کا جلوس بھی دین و ایمان کا ضروری تقاضا تو نہیں ہے، جب عید میلاد النبیؐ کے جلوس اور جشن کو اس لیے بدعت قرار دیا جاتا ہے کہ اس کا عہد رسالت اور عہد صحابہ میں کوئی وجود نہیں تھا تو سوال یہ ہے کہ کیا خیر القرون میں مدحِ صحابہ کے جلوس نکالے جاتے تھے؟ آخر مسلمانوں کا اتحاد و اتفاق ضروری ہے یا مدحِ صحابہ اور تبرابازی کا جلوس، کیا شریعت بیضا نے یہ تعلیم نہیں دی ہے کہ ایذا اور دل آزاری حرام ہے اور کیا نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ ارشاد نہیں فرمایا ہے کہ مسلمان وہ ہے جس کے ہاتھ اور زبان سے مسلمان سلامت رہیں۔ کیا آپ نے پڑوسیوں بلکہ عام انسانوں کے ساتھ اچھے سلوک کی تاکید نہیں کی ہے، کیا یہ سب ہدایات صرف وعظ و ارشاد کے جلسوں ہی میں بیان کرنے

کے لیے ہیں یا عمل کرنے کے لیے بھی ہیں، اگر عمل کرنے کے لیے ہیں تو مسلمانوں کے دو بڑے فرقوں کے افراد ایک دوسرے کے خون کے پیاسے کیوں ہیں۔

گزشتہ بیس برسوں سے حکومت نے دونوں فرقوں کے جلوس پر پابندی عائد کر رکھی ہے، اس کی وجہ سے فساد اور خون خرابہ نہیں ہو رہا تھا مگر یہ صورت نہ ہمارے خاموش نہ رہنے والے جوانوں کو پسند تھی اور نہ انکے دوست نما دشمنوں کو، چنانچہ اس ہجری سال کے آغاز ہی میں پُر جوش شیعی نوجوانوں نے اس پابندی کو مداخلت فی الدین کہہ کر حکومت سے اسے ختم کرنے کا مطالبہ کیا اور حکومت کے انکار پر احتجاج اور دوسرے ناروا طریقے اختیار کیے، یہانتک کہ بعض نوجوانوں نے خودسوزی بھی کی۔ اس پر بھی اکتفا نہ کر کے مشتعل اور بپھرے ہوئے جوانوں نے چہلم کے روز جلوس نکالنا طے کیا، جس کے پیش نظر حکومت نے غیر معینہ مدت کا کرفیو لگا دیا مگر اس کے باوجود وہ نہ مانے اور اخباری رپورٹ کے مطابق دس ہزار کا جلوس سڑکوں پر آگیا اور تشدد، توڑ پھوڑ، آتش زنی اور اشتعال انگیزی کرنے لگا، پولیس نے لاٹھی چارج کی جس میں پچاس سے زیادہ آدمی زخمی اور ایک ہزار گرفتار ہوئے اور بھاری مالی نقصان ہوا۔ خدا کا شکر ہے کہ مڈبھیڑ پولیس اور انتظامیہ ہی سے رہی اور شیعہ سُنی تصادم نہیں ہوا جب کہ اشتعال اور نفرت کا پورا سامان موجود تھا اور سُنی بھی جوش میں بپھرے ہوئے تھے اور پولیس بھی اسے شیعہ سُنی جھگڑے کا رنگ دینا چاہتی تھی غرض جو کچھ بھی ہوا اور جو ہو رہا ہے وہ بڑا افسوسناک اور سخت قابلِ مذمت ہے۔

کہا جا رہا ہے کہ اتر پردیش کی حکومت نے معاملات کو سلجھانے میں بے تدبیری اور کوتاہی کی۔ وہ بے جا سختی بھی کر رہی ہے اور جس طرح ایسے موقعوں پر حزب مخالف کے لوگ اختلافات کو ہوا دے کر سیاسی فائدہ اٹھانا چاہتے ہیں، کہا جا رہا ہے کہ اس مسئلہ کو بھی انھوں نے پیچیدہ اور پُر پیچ بنا کر دونوں فرقوں کے نوجوانوں کو تشدد اور اشتعال پر آمادہ کیا اور نفرت کے جذبات بھڑکائے ہیں، یہ امکانات اگر درست بھی ہوں تو بھی دونوں فرقوں کو ٹھنڈے دل سے غور کرنا چاہیے کہ

وہ کیوں دوسروں کا آلۂ کار بن جاتے ہیں، ان کو دوسروں کو کچھ کہنے کے بجائے خود اپنے گریبانوں میں منھ ڈال کر سوچنا چاہیے کہ ان جھگڑوں سے کس کا زیاں ہو رہا ہے اور کس کی ہوا خیزی ہو رہی ہے، کس کی امت کا شیرازہ درہم برہم ہو رہا ہے، کیا اس بے جا مذہبی جنون اور جوش کا مظاہرہ کرکے وہ خدا اور رسول کے احکام کی خلاف ورزی کے مرتکب نہیں ہو رہے ہیں، کیا یہی وقت انکے لڑنے بھڑنے کا ہے جب اقوام عالم ان پر پل پڑی ہیں، ہندو احیائیت پسندی ان کا بھارتیہ کرن کر رہی ہے صہیونیت کا سیلاب ان کو خس و خاشاک کی طرح بہالے جانا چاہتا ہے اور سرمایہ داری کا نہ ڈوبنے والا سفینہ ان کو غرق کر دینے پر لگا ہوا ہے جس کی تباہ کاریاں اور چیرہ دستیاں عالم اسلام کو تہہ و بالا کیے ہوئے ہیں، جس کے فتنے یم بہ یم دریا بہ دریا جو بجو ہیں، جس نے مرکز اسلام کو بھی بے دست و پا کر دیا ہے اور دور جانے کی کیا ضرورت، پاکستان میں شیعہ سنی اختلافات اور آئے دن کے قتل عام کے پردۂ زنگاری میں بھی تو یہی معشوق ہے۔

اگر ایسے حالات میں بھی مسلمان متحد نہ ہوئے اور شیعہ سنی جھگڑے ہوتے رہے اور خود سنی مسلمانوں کے مختلف فرقوں کا اختلاف بڑھتا رہا تو اس سے مسلمان کمزور، پسپا اور بالکل ہی بے دم ہو جائیں گے اور دشمنان اسلام اس سے فائدہ اٹھا کر انکا استحصال کرتے رہیں گے، شیعہ اور سنی دونوں کے سنجیدہ، متین اور ذمہ دار لوگوں کو مسئلہ کی سنگینی اور اس کی نزاکت کو اس کے وسیع پس منظر میں سمجھ کر دونوں فرقوں میں اتحاد و اتفاق کے نقطے تلاش کرنا چاہیے تاکہ انکی جو قوت برادر کشی اور اپنے ہی زیاں میں صرف ہو رہی ہے وہ دشمنوں کی ریشہ دوانیوں کے مقابلہ میں صرف ہو، کیا پورے ملک میں دونوں فرقوں میں چند نفوس بھی ایسے نہیں ہیں جو انہیں ایک دوسرے کے خلاف صف آرائی سے باز رکھیں، لکھنؤ کی پیچیدہ صورت اور شیعہ سنی کشمکش کو مرکزی اور صوبائی حکومتوں کے رحم و کرم پر نہیں چھوڑا جا سکتا ہے دونوں فرقوں کو خود مِل جُل کر اس کا حل ڈھونڈھنا ہوگا، چاہے اس کے لیے ایک دو بار نہیں دسیوں بار مل بیٹھنا پڑے اس وقت ملت کا اتحاد اہم فرض ہے اور شیعہ سنی نزاع کو ہمیشہ کے لیے دفن کر دینا سب سے مبارک اور مقدس کام ہے۔

اٹھو درگزر نا حشر نہ ہوگا پھر کبھی
دوڑو زمانہ چال قیامت کی چل گیا

مقالات

علامہ شبلی نعمانی کی شخصیت کے امتیازی پہلو

از پروفیسر ریاض الرحمٰن شروانی. علی گڑھ

(۲)

ان اختلافات کے علاوہ کیا اسباب تھے جن کی بنیاد پر علامہ شبلی نے علی گڑھ سے ملازمت کا رشتہ منقطع کیا، اس موقع پر ان کی تفصیلات میرے نزدیک غیر ضروری ہیں، کیونکہ اس طرح کی مزاجی اور انتظامی کش مکش بہت سوں کو بہت سے اداروں میں پیش آتی رہی ہے جس کے نتیجے میں بعض اوقات انہیں سبکدوشی حاصل کرنی پڑتی ہے۔ تاہم یہ امر قابل لحاظ ہے کہ علامہ شبلی کا علی گڑھ سے مکمل منصبی قطع تعلق ۱۸۹۸ء میں سرسید کی وفات کے بعد ہی ہوا۔ علی گڑھ چھوڑنے اور ندوۃ العلماء لکھنؤ سے وابستہ ہوجانے کے بعد ایک اور موقع ایسا آیا جب یہ اختلاف ابھر کر سامنے آیا اور یہ حیات جاوید کی اشاعت کا موقع تھا۔ مولانا سید سلیمان ندوی نے حیات شبلی میں بیان کیا ہے کہ سرسید کی نظر انتخاب اپنی سوانح عمری لکھانے کے لیے سب سے پہلے علامہ شبلی ہی پر پڑی تھی لیکن مندرجہ بالا اختلافات کی بنا پر وہ اس تجویز کو بالطائف الحیل ٹال گئے اور بالآخر یہ خدمت خواجہ الطاف حسین حالیؒ نے انجام دی۔ حیات جاوید سرسید کی زندگی اور کارناموں کی ایک مکمل دستاویز ہے اور بعد میں ان پر کام کرنے والوں کے لیے بنیادی ماخذ کا درجہ رکھتی ہے۔ اس پر علامہ شبلی کو اعتراض تھا کہ اس میں مدلل مداحی پائی جاتی ہے اور سرسید کی کمزوریوں کی نشاندہی نہیں کی گئی ہے۔ ہمارے بزرگوں کا ہمیشہ یہ شیوہ

رہا ہے اور آج بھی ہے کہ وہ جن اکابر سے عقیدت رکھتے ہیں جب ان پر قلم اٹھاتے ہیں تو ان کی شخصیت کے روشن پہلوؤں ہی کو اجاگر کرتے ہیں اور اگر ان میں کچھ داغ دھبے ہوتے ہیں تو ان سے صرف نظر کرنا مناسب سمجھتے ہیں۔ حیات جاوید کے بعد لکھی جانے والی بیشتر سوانح عمریوں، یہانتک کہ خود حیات شبلی اور بعد ازاں حیات سلیمان کی بھی یہی کیفیت ہے۔ اس لیے میں سمجھتا ہوں کہ علامہ شبلی کے قائم کردہ معیار پر کم سے کم ہمارے قدیم خیال کے بزرگوں کی تحریر کردہ سوانح عمریوں میں شاید ہی کوئی سوانح عمری پوری اتر سکے۔ حیات جاوید پر علامہ شبلی کے تبصرے سے بھی زیادہ مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی کا تبصرہ تنازعہ فیہ قرار پایا۔ مولانا شروانی نے اپنے اس تفصیلی تبصرے میں جو علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ میں ۱۹۰۲ء میں شایع ہوا۔ خواجہ حالی اور ان کے اس کارنامے کی دل کھول کر داد دی ہے بلکہ یہانتک لکھ دیا ہے کہ "اگر کوئی شخص دنیا میں بڑے بڑے کام کر کے اس شوق میں جان دیدے کہ اس کو ایسا بیاگرافر ملے گا جیسا سرسید کو ملا تو ہمارے خیال میں یہ کہنا حق بجانب ہوگا کہ اس سے سستا سودا خریدا"[۱۲] البتہ جہاں انھیں حیات جاوید میں سرسید کے مذہبی خیالات کی تائید و حمایت نظر آئی اس پر انھوں نے سخت تعریض کی ہے، نیز یہ اعتراض کیا ہے کہ حیات جاوید کریٹیسزم سے خالی ہے[۱۳] ظاہر ہے اس معاملے میں وہ اور علامہ شبلی ہم خیال تھے لیکن شیخ محمد اکرام کا یادگار شبلی میں یہ کہنا کہ مولانا شروانی نے یہ تبصرہ علامہ شبلی سے متاثر ہو کر لکھا تھا ہمارے خیال سے درست نہیں ہے۔ اس سے بھی بڑھ کر شیخ صاحب کی عبارت سے تو شبہ ہوتا ہے کہ دراصل اس تبصرے کے پیچھے علامہ شبلی کا ذہن ہی کارفرما تھا[۱۴] ہمارے اکابر کے بارے میں ایسے خیالات کا اظہار عموماً اس وجہ سے کیا جاتا ہے کہ ان خیالات کا اظہار کرنے والے اہل قلم ان اکابر کے مزاج و عادات سے واقف

نہیں ہوتے ہیں ورنہ جو شخص مولانا شروانی کے مزاج و کردار سے تھوڑی سی واقفیت بھی رکھتا ہے وہ اچھی طرح جانتا ہے کہ وہ اپنے ضمیر کے خلاف کسی کے اثر سے کچھ کہنے یا کرنے کے روادار ہرگز نہیں ہو سکتے تھے۔ مولانا عبدالماجد دریابادی نے مولانا شروانی مرحوم پر اپنے فاضلانہ مضمون مطبوعہ معارف، اعظم گڈھ بابت دسمبر ۱۹۵۰ء میں ندوۃ العلماء لکھنؤ کے ایک ایسے جلسے کی روئداد لکھتے ہوئے جس میں علامہ شبلی اور ان کے مخالفین میں اختلاف رائے کے سبب بدمزگی پیدا ہونے کا اندیشہ تھا مولانا شروانی کی غیر جانبداری کا جو دلکش نقشہ کھینچا ہے وہ ہماری اس رائے کی پوری طرح توثیق کرتا ہے۔ بات سے بات نکلتی ہے، اس مسئلے کا ایک دلچسپ پہلو یہ بھی ہے کہ مولانا ابوالکلام آزاد نے اپنے معروف جریدے لسان الصدق کی ۲۰ فروری ۱۹۰۴ء کی اشاعت میں مولانا شروانی کے اس تبصرے سے شدید اختلاف کیا تھا۔ اس وقت تک وہ سرسید کی فکر سے پوری طرح متاثر تھے اور نہ ان کا علامہ شبلی سے رابطہ قائم ہوا تھا اور نہ مولانا شروانی سے تعلقات استوار ہوئے تھے۔ یہاں یہ ذکر بھی غیر مناسب نہ ہوگا کہ علی گڑھ سے منصبی تعلق ختم ہو جانے کے باوجود جب نواب محسن الملک کی ایم۔ اے۔ او کالج اور آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کی سکریٹری شپ کے دوران سر آغا خاں کی قیادت میں مسلم یونیورسٹی کے قیام کا غلغلہ بلند ہوا تو علامہ شبلی نے قلمے اور قدمے دونوں طرح اس کی تائید کی اور مسلم یونیورسٹی فاونڈیشن کمیٹی کے رکن منتخب ہوئے[۵]

تحریک ندوۃ العلماء سے علامہ شبلی نعمانی کا قریبی تعلق ابتدا ہی سے پایا جاتا ہے۔ اس کے پہلے اجلاس منعقدہ کانپور اپریل ۱۸۹۴ میں وہ نہ صرف شریک تھے بلکہ اس کی کارروائی میں انھوں نے عملی حصہ لیا تھا۔ بعد کے کئی اجلاسوں میں بھی وہ پابندی

سریک ہوتے رہے اور ان میں ان کی کارکردگی نمایاں رہی۔ حکومت وقت کی ندوۃ العلماً
بدگمانی اور اس بدگمانی کو رفع کرنے کی مساعی کا ذکر مولانا سید سلیمان ندوی نے ندوۃ العلماء
نحویں اجلاس منعقدہ کانپور ۱۸۹۸ء کے تناظر میں کیا ہے[۶] گویا سرکار انگلشیہ کی اس سے
انی اس کے قیام کے ابتدائی برسوں ہی میں شروع ہو گئی تھی اور اس کا سبب ما سوا
کے کچھ نہ تھا کہ انگریزی حکام ہندوستانیوں کی بالعموم اور ہندی مسلمانوں کی بالخصوص
الیسی تنظیم کو (خواہ اس کی نوعیت علمی یا تعلیمی ہی کیوں نہ ہوتی) پنپتا ہوا نہیں دیکھنا چاہتے
تس میں ان کی اجتماعیت کے جراثیم انہیں خوردبین سے بھی نظر آنے لگتے تھے۔ موجودہ
ی کے دوسرے دہے میں جب ایم۔ اے۔ او کالج کو مسلم یونیورسٹی بنانے کی تجویز
غور تھی اور ہمدردان و معاونین کالج چاہتے تھے کہ اسے مسلمانوں کے دوسرے کالجوں
لحاق کا حق حاصل ہو تو برسر اقتدار انگریز اسی بنا پر اس کے لیے تیار نہیں ہوئے
لہ اس طرح علی گڑھ کو مسلمانوں میں مرکزیت حاصل ہو جانے کا اندیشہ تھا۔ ندوۃ العلماً
ں وقت کے اکابر نے انگریزوں کی غلط فہمی دور کرنا مناسب سمجھا کیونکہ جیسا کہ عرض
یا کوئی ادارہ چلانے کے لیے حکومت وقت کی غلط فہمی اور بدگمانی دور کرنی ہی پڑتی
۔ ۱۸۹۷ء ہی سے علامہ شبلی ایم۔ اے۔ او کالج سے دوری اختیار کرنے کی تدابیر سوچ رہے
اور اس کے لیے بعض اقدامات بھی کیے تھے۔ ہمارے خیال سے ندوۃ العلماء سے وابستگی
ہو ران کے ذہن میں اسی وقت سے تھا اگرچہ انہیں اس کا اندیشہ بھی تھا کہ ان کی اور ان کی
کردہ تجاویز کی پذیرائی شاید وہاں ان کے حسب منشا نہیں ہوگی۔ اس دوران انہوں نے
ہ کے چند سالانہ اجلاسوں میں شرکت بھی نہیں فرمائی۔ حیات شبلی کی شہادت ہے کہ
ولانا نے گونڈہ سے ۱۸۹۹ء میں مولانا حبیب الرحمن خاں شروانی کو ایک خط میں لکھا تھا کہ

اگر آپ یا ارکان (ندوہ) مجھ سے کام لینا چاہتے ہیں تو بتائیں کہ میں کیا کام کروں۔ میری جو تجاویز ہیں وہاں چلنے نہ پائیں گی[۷] درمیان میں علامہ کا تعلق ریاست حیدرآباد سے رہا لیکن ہم جس زاویۂ نگاہ سے ان کی شخصیت کا جائزہ لینے کی کوشش کر رہے ہیں اس میں تعلق حیدرآباد کی چنداں اہمیت نہیں ہے بلکہ اصل اہمیت علی گڑھ کے تعلق کی ہے اور پھر ندوۃ العلماء کے تعلق کی۔ علی گڑھ اور ندوہ کی یہ تقدیم و تاخیر زمانی اعتبار سے ہے اہمیت کے اعتبار سے نہیں ہے۔ ندوۃ العلماء میں ان کی توجہ کا مرکز سب سے پہلے اور سب سے زیادہ نصاب تعلیم کی تعیین و ترمیم کا مسئلہ رہا اور یہی بعض دوسرے علماء سے ان کے اختلاف رائے کا اصلی سبب ہوا۔ اس مقصد سے ندوہ میں ۱۹۰۲ء میں جو مجلس مقرر ہوئی تھی اس کے معتمد مولانا حبیب الرحمن خاں شروانی تھے لیکن علامہ کا نام اس کے اراکین کی فہرست میں شامل نہیں تھا[۸] چنانچہ انہوں نے ایک خط میں مولانا شروانی کو لکھا "آپ لوگ ایسا ڈرتے ہیں کہ میں شریک ہوا اور میں نے مذہب کو اور طرز تعلیم کو الٹ دیا"[۹] مولانا شروانی ان سے ندوہ سے اپنا تعلق برقرار رکھنے اور اس کے معاملات میں عملی دلچسپی لینے کے لیے برابر اصرار کرتے رہے چنانچہ وہ اسی سال ندوہ کے سالانہ اجلاس منعقدہ امرتسر میں شریک ہوئے اور نہ صرف شریک ہوئے بلکہ اپنی رجز خوانی اور گوہر افشانی سے حاضرین جلسہ کی عقیدت و شیفتگی کا مرکز بنے[۱۰] اگرچہ درس نظامی میں تبدیلی اس موقع پر منظور کر لی گئی لیکن اس کا نفاذ نہیں ہو سکا۔ غالباً اس کا سبب یہ تھا کہ بعض امور بھی مختلف فیہ اور تصفیہ طلب تھے۔ اس بارے میں علامہ شبلی کے مولانا شروانی کے نام خطوط کا لہجہ خاصہ تلخ ہے[۱۱] ۱۹۰۵ء میں حیدرآباد کی ملازمت سے مستعفی ہو کر انہوں نے مستقل لکھنؤ میں قیام فرمایا اور ندوۃ العلماء کے معتمد تعلیم منتخب ہوئے[۱۲] گویا اب ان کا ندوہ سے منصبی تعلق قائم ہو گیا اور خدمت دین

وملت کا ایک وسیع میدان انہیں میسر آگیا۔ جیسا کہ مولانا سید سلیمان ندوی نے تحریر فرمایا ہے:" دارالعلوم کے قائم کرنے کا اصلی مقصد عربی طریقۂ تعلیم اور نصاب تعلیم میں اصلاح کرنا تھا"[۱۳] اور علامہ شبلی سب سے زیادہ اہمیت اسے ہی دیتے تھے۔ وہ ان علوم کی جگہ جو بالذات مقصود نہیں بلکہ مقصود اعلیٰ کے حصول کا ذریعہ ہیں، مثلاً صرف و نحو اور منطق و فلسفہ، ان علوم کو نصاب میں زیادہ رائج کرنے کے قائل و حامی تھے جو مقصود بالذات ہیں یعنی ادب، دینی علوم اور علم عقائد۔ مختلف علوم میں بعض کتابوں کی تبدیلی بھی پیش نظر تھی اور اسی کے ساتھ انگریزی زبان کی نصاب میں شمولیت اور جو طلبہ اس میں امتیاز حاصل کرنا چاہیں ان کے لیے عربی تعلیم سے فراغت کے بعد دو برس خالص انگریزی تعلیم کا درجۂ تکمیل[۱۴]۔

عربی مدارس کے نصاب میں انگریزی زبان کی شمولیت ایک ایسا مسئلہ ہے جو میرے نزدیک آج تک پوری طرح حل نہیں ہوا ہے۔ چونکہ اتفاق سے میرا پیشہ یونیورسٹی میں عربی کی تدریس رہا ہے اور میرا سابقہ عربی مدارس کے فارغ التحصیل طلبہ سے مسلسل رہا ہے اور آج بھی کسی نہ کسی نوعیت سے ہے، اس لیے میں اپنے مشاہدے اور تجربے کی بنیاد پر عرض کر سکتا ہوں کہ بالعموم انگریزی میں ان کی صلاحیت برائے نام ہوتی ہے اور اس سے وہ فوائد حاصل نہیں ہو رہے ہیں جو علامہ شبلی نعمانی اور ان کے یا بعد کے دور کے بعض دیگر علما کے پیش نظر تھے یعنی ملک اور بیرون ملک اسلام کی تبلیغ، معترضین اسلام کا ان ہی کی زبان میں جواب اور تحقیق و تفحص میں انگریزی کی کتابوں سے بھرپور استفادہ۔ مختلف زبانوں کے ادب کا تقابلی مطالعہ اس کی ایک اور شق ہے اور اس کی اہمیت سے بھی انکار ممکن نہیں ہے۔ مولانا سید سلیمان ندوی نے حیات شبلی میں ایسے کئی ندوی بزرگوں کے نام لکھے ہیں (اور ان میں خود ان کا نام نامی بھی شامل ہے) جنھوں نے انگریزی سے اپنی واقفیت حاصل کرلی تھی کہ وہ بعض

اہم علمی و عملی خدمات انجام دے سکے۔ حیات شبلی غالباً ۱۹۴۳ء میں شایع ہوئی تھی۔ ۱۹۴۳ء اور ۱۹۹۶ء کی درمیانی مدت میں اور بھی کئی ایسے ناموں کا اضافہ کیا جا سکتا ہے لیکن یہ سب مستثنیات ہیں، یہاں گفتگو عام طلبہ سے ہو رہی تھی۔ موجودہ دور میں انگریزی کے ساتھ ہندی سے اچھی واقفیت بھی ضروری ہو گئی ہے۔ ہمیں علامہ شبلی نعمانی کی فراست، دوربینی اور اصابت رائے کا اعتراف کرنا چاہیے کہ انہوں نے وقت کے تقاضے کو سمجھا تھا اور اس پر عمل درآمد کے لیے بے چین تھے اگرچہ شاید دیگر علماء کے رجحان طبع کا لحاظ رکھتے ہوئے انہوں نے اس میں اتنی ترمیم فرما دی تھی کہ "حالانکہ تمام طالب علموں کو انگریزی پڑھانا مقصود نہیں، نہ یہ میرا خیال ہے۔ صرف اس قدر مقصود ہے کہ دو چار لڑکے انگریزی بھی پڑھیں"[۱۵] ظاہر ہے کہ دو چار لڑکوں کا انگریزی پڑھنا کافی نہیں تھا بلکہ اس کے جزو نصاب ہونے کا سوال تھا۔ ان کی اس ذہنی تربیت میں علی گڑھ کا یقیناً اثر تھا۔ اس معاملے میں انہیں مولانا سید عبدالحئی سے بھی شکایت تھی اور مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی سے بھی کیا یہ امر موجب حیرت نہیں ہے۔ علامہ شبلی انگریزی کو ندوۃ العلماء کی نصاب میں شامل کرانا چاہتے تھے اور مولانا شروانی کو، جن کے بارے میں مولانا سید سلیمان ندوی نے بالکل درست لکھا ہے کہ سرسید تحریک کے پرانے حامی تھے[۱۶] اس میں تذبذب تھا۔ مولانا شروانی نے خود علامہ شبلی سے فرمایا کہ ان کے تذبذب کا سبب علامہ کی بدنامی کا ڈر تھا۔[۱۷] آج جب کہ بیسویں صدی آخری سانسیں لے رہی ہے، ممکن ہے یہ ڈر عجیب محسوس ہو لیکن اس صدی کے آغاز میں اتنا بے بنیاد نہیں تھا کیونکہ یہ علماء بقول مولانا سید سلیمان ندوی ان اثرات سے ڈرتے تھے جو اس زبان کے ساتھ نادانستہ طور پر عربی کے طالب علموں میں سرایت کریں گے۔[۱۸] تاہم علامہ شبلی کو اپنی بدنامی کی پرواہ نہیں تھی اور وہ اپنی رائے پر اٹل تھے۔ میری ناچیز رائے میں

آج اس ساری بحث کا پیش منظر تبدیل ہوگیا ہے، کیونکہ ہم دیکھتے ہیں کہ بغیر انگریزی پڑھے ہوئے یا بہت کم انگریزی پڑھ کر عربی مدارس کے تعلیم یافتہ حضرات کی اچھی خاصی تعداد ہے جو ان اثرات سے بچی ہوئی نہیں ہے جن کے ان میں سرایت کر جانے کا اندیشہ ہمارے علماء کو تھا[1]۔

علامہ شبلی کے ذہن میں ندوۃ العلماء سے ایک ایسے علمی رسالے کے اجراء کا خیال جو شایان شان ہو، دو تین سال قبل سے جاگزیں تھا۔ ان کے نزدیک اس کا اصلی مقصد "طلبائے دار العلوم کی ذہنی تربیت" تھا۔ رسالے کا اجرا طے ہوا لیکن اس کی ادارت کیلئے مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی کا نام تجویز ہوا۔ مولانا شروانی کی خود خواہش تھی کہ یہ ذمہ داری علامہ شبلی کو سونپی جائے کیونکہ ان کے نزدیک وہی اس کے سب سے زیادہ اہل تھے۔ خود علامہ کی [illegible] بھی یہی تھی کیونکہ وہ بجا طور پر سمجھتے تھے کہ اس کام کو سب سے بہتر طور پر انجام دے سکتے ہیں۔ انہیں شبہ تھا کہ ناظم ندوۃ العلماء مولانا محمد علی مونگیری اس منصب کے لیے ان کا نام پسند نہیں کریں گے۔ بہرحال ۱۹۰۳ء میں علامہ رسالہ "الندوہ" کے مدیر مقرر ہو گئے[2]۔ کافی غور و خوض کے بعد اس کا نظم اس طرح قرار پایا کہ دو ایڈیٹر مقرر ہوئے، علامہ شبلی اور مولانا شروانی۔ اس وقت علامہ شبلی حیدرآباد میں رہ رہے تھے

---

[1] معارف: فاضل مقالہ نگار کا تجزیہ درست ہے اور یہ قوم کی بدنصیبی ہے کہ اب تک عربی مدارس کے طلبہ کو اور جدید تعلیم گاہوں کے فضلا کو عربی جیسی آنی چاہیے نہ آئی لیکن اس کی وجہ سے اسکی ضرورت سے کیسے انکار کیا جا سکتا ہے، معیار تو وہی ہونا چاہیے جو علامہ چاہتے تھے کیونکہ تقاضائے وقت اب تو مستثنیٰ افراد بھی نہیں پیدا ہو رہے ہیں جو قدیم و جدید علوم کے واقف کار ہوں، جس کی سخت ضرورت ہے اور ظاہر ہے کہ کسی چیز کے عملاً نہ ہونے سے ضرورت تو ختم نہیں ہو جاتی

اور مولانا شروانی حبیب گنج ضلع علی گڑھ میں۔ مقام اشاعت شاہجہاں پور تھا کیونکہ مددگار ناظم مولانا سید عبدالحیٔ کا قیام ان دنوں وہاں تھا۔ چھپائی کا انتظام مطبع مفید عام آگرہ میں تھا۔ اس کی لوح پر درج ہوتا تھا کہ اس کا مقصد "علوم اسلامیہ کا احیاء، تطبیق معقول و منقول اور علوم قدیمہ و جدیدہ کا موازنہ" تھا۔ اس کا اجراء اگست ۱۹۰۴ء مطابق جمادی الاولیٰ ۱۳۲۲ھ سے ہوا[۱۱]۔ ۱۹۰۵ء میں علامہ شبلی کے لکھنؤ منتقل ہونے کے بعد "الندوہ" کی اشاعت کا یہ انتشار دور ہوا۔ اس نے جلدی ہی علمی حلقوں میں اعتماد و افتخار پیدا کر لیا۔ علامہ شبلی اور مولانا شروانی کے علاوہ اس کے حلقہ ادارت میں یکے بعد دیگرے مولانا ابوالکلام آزاد، مولانا سید سلیمان ندوی، مولانا عبداللہ العمادی اور مولانا عبدالسلام ندوی شامل رہے۔ یہ سلسلہ ۱۹۱۲ء تک چلتا رہا۔ اس سال باہمی اختلافات کی بنا پر اس کا دور اول جو علامہ شبلی سے منسوب تھا اختتام کو پہونچا۔ اگرچہ "الندوہ" ۱۹۱۶ء تک جاری رہا لیکن ۱۹۱۲ء کے بعد علامہ شبلی سے اس کا تعلق نہیں رہا۔ اس آٹھ سال کی مدت میں اس میں متعدد گرانقدر مضامین شایع ہوئے جو مختلف اہل علم کے زور قلم کا نتیجہ تھے لیکن اس میں کلام نہیں کہ اس کی روح رواں علامہ شبلی ہی تھے اور زیادہ تر مضامین ان ہی کے لکھے ہوئے ہوتے تھے[۱۲]۔ الندوہ کی اشاعت کی یہ تفصیل اس لیے گوش گزار کی گئی کہ علامہ نے ندوۃ العلماء کی ترقی اور فروغ کے سلسلے میں جو خواب دیکھے تھے اور جنھیں بروے کار لانے کی کوشش کی تھی ان میں اصلاح نصاب کے بعد ان کے منصوبے کا سب سے اہم جز ندوۃ العلماء کے آرگن کے ذریعہ اعلیٰ لٹریچر کی افزائش اور اردو داں طبقے میں اس ذوق کی آبیاری تھا۔ اس طرح وہ مسلمانوں کو اپنے اسلاف کے کارناموں سے روشناس کرانا چاہتے تھے اور خود ان میں تحقیق و تفحص کا جذبہ بحال کرنے کے خواہشمند

تھے۔ یہاں یہ امر قابل لحاظ ہے کہ جب اکابر ندوۃ العلماء نے اس کا اجرا منظور کیا تو پہلے انکے بجائے مولانا حبیب الرحمن خاں شروانی کو اس کا مدیر مقرر کیا اور جب ادارت ان کے سپرد بھی کی تو مولانا شروانی کا نام بہرحال ان کے ساتھ وابستہ رکھا۔ اس کا واضح مطلب یہ ہے کہ ان بزرگوں کو علامہ شبلی کے مقابلے میں مولانا شروانی کے اعتدال و توازن فکر پر زیادہ اعتماد تھا۔

علامہ شبلی نعمانی کے بعض دیگر بزرگان ندوۃ العلماء سے انتظامی امور یا ایسے ہی دوسرے مسائل میں جو اختلافات تھے ان سے ہم اسی طرح صرف نظر کریں گے جس طرح علی گڑھ کے تعلق سے کیا ہے۔ کیونکہ یہاں ہمارا مقصد علامہ کی علمی، مذہبی یا سیاسی فکر کے تناظر میں ایک طرف جدید اور دوسری طرف قدیم خیالات کے حامل حضرات سے انکے اختلاف رائے کی نشاندہی کرنی ہے اور یہ دیکھنا ہے کہ اس کشمکش کے نتیجے میں علامہ کی شخصیت کا جو نقش ابھرتا ہے وہ کتنا روشن، تابناک اور دل افروز اور جان فزا ہے۔ بہرحال ان اختلافات کا یہ نتیجہ ضرور ہوا کہ علامہ نے جولائی ۱۹۱۳ء میں ندوۃ العلماء کی معتمدی سے استعفیٰ دیدیا۔[۳۴] اگرچہ ندوۃ العلماء اور وہاں کے طلبہ سے ان کا قلبی تعلق برابر قائم رہا۔ بعد میں کچھ ایسے واقعات پیش آئے جن کی بنا پر طلبہ نے ایک عظیم الشان اسٹرائک کیا۔ اس اسٹرائک کی حمایت میں اردو کا قومی و ملی پریس پیش پیش تھا۔ بعض حضرات جن میں حکیم محمد اجمل خاں اور مولانا محمد علی کے نام سب سے نمایاں ہیں درمیان میں پڑے اور مصالحت ہوئی لیکن اس مصالحت سے پہلے علامہ شبلی نعمانی کی وفات ہو چکی تھی۔[۳۵]

علامہ شبلی کے کئی اور اہم کارنامے ہیں جن میں ہمارے نزدیک وقف علی الاولاد اور اشاعت اسلام کے مسائل سے متعلق ان کی مساعی کو خصوصی اہمیت حاصل ہے اور ان سے

ؤ ایمانی پر بہت اچھی روشنی پڑتی ہے اور یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اسلامی معاشرے
لی انہیں کتنی فکر تھی۔ تاہم یہ امور ایسے ہیں جو جداگانہ مطالعے کا موضوع ہیں اور
ہیں ان پر تفصیلی گفتگو ممکن نہیں ہے۔

زمانۂ حیات میں انہوں نے جن کاموں میں خصوصی دلچسپی لی ان میں اعظم گڑھ
ول جو اب شبلی ڈگری کالج کے نام سے معروف ہے، ان کی توجہ کا خاص مرکز تھا۔
ل سے انہیں ابتدا ہی سے بہت تعلق خاطر تھا لیکن اپنی دوسری مصروفیات کے پیش نظر
سوں میں عملی حصہ لینے سے معذور تھے۔ اب موقع ملا تو ادھر توجہ فرمائی۔ یہ اسکول
ارج سے گزر کر اپنی موجودہ حیثیت تک پہنچا ہے۔ کاش اہل اعظم گڑھ کی خصوصاً
لمانان ہند کی نہیں تو مسلمانان یو۔ پی کی عموماً جد و جہد سے یہ ادارہ صحیح معنی میں
ن شایان شان یادگار بن جائے۔ بلاشبہ اس وقت ان کی سب سے عظیم یادگار
ن ہے۔ دار المصنفین کے قیام کا تخیل بھی ان کے ذہن میں مدت سے تھا۔ مولانا سید
ردی کی شہادت کے مطابق یہ تجویز سب سے پہلے ۱۹۱۰ء میں کتبخانہ ندوۃ العلماء
لمکے نام نامی سے منسوب ہے، کی عمارت کے سلسلے میں انہوں نے پیش کی تھی۔
ن بنیادی اہمیت "ایک قومی کتب خانۂ اعظم" کی تھی جسے مرکز بنا کر تصنیف و تالیف
جائے۔ اس وقت اس منصوبے کی تکمیل کے لیے ان کے ذہن میں ندوۃ العلماء
تھا لیکن ندوہ کے باہمی اختلافات کی بنا پر یہ منصوبہ برگ و بار نہیں لا سکا
اء میں جو ان کا سال وفات ہے، الہلال کلکتہ کے ذریعہ یہ تجویز ملک کے سامنے
دار المصنفین کی ہیئت ترکیبی اور اس کی جائے وقوع کے سلسلے میں مختلف تجاویز
یں۔ بالآخر فیصلہ اعظم گڑھ کے حق میں ہوا چنانچہ اس کے لیے علامہ نے اپنے قریبی

عزہ سے اجازت لے کر اپنی خاندانی جائداد وقف فرمائی[۲۷] اس منصوبے کو بروئے کار لانے کی مساعی کے ساتھ ساتھ سیرت النبی کی تصنیف میں بھی برابر انہماک رہا اور ابھی دونوں کام نامکمل تھے کہ ۱۸ نومبر ۱۹۱۴ء مطابق ۲۸ ذی الحجہ ۱۳۳۲ھ کو پیغام قضا آگیا۔[۲۸] اِنَّا لِلّٰہِ وَ اِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ ٭ ان دونوں کاموں کی تکمیل ان کے شاگرد رشید اور وقت کے فاضل اجل مولانا سید سلیمان ندوی کے لیے مقدر تھی اور سید صاحب نے ان کی جس طرح تکمیل فرمائی اس سے اہل نظر بخوبی واقف ہیں۔

مندرجۂ بالا معروضات کی روشنی میں علامہ شبلی نعمانی کی شخصیت اور کارناموں کی جو تصویر بنتی ہے وہ مختلف الابعاد اور کثیر الجہات ہے۔ اس میں اسلام کی سربلندی، ملت کی دردمندی، قوم و وطن کی خیرخواہی، علمی اشتغال، ادبی حسن و زیبائی، عملی اور انتظامی صلاحیت ان سب رنگوں کی ایسی آمیزش ہے کہ اس نے اسے بہت جاندار اور جاذب نظر بنا دیا ہے۔ ان کے یہاں سیکھنے کا جو جذبہ تھا اور وہ اخذ ما صفی ودع ما کدر کے اصول پر جس حد تک کاربند تھے اس کی نظیر ان کے معاصرین میں ملنی دشوار ہے، ان کی نظر مستقبل پر تھی لیکن ان کی جڑیں ماضی میں پیوست تھیں اور وہ حال کے تقاضوں سے بے خبر نہیں تھے۔ یہ ضرور ہے کہ اپنی ابتدائی اور بنیادی تعلیم کے طفیل وہ ماضی کے تابندہ نقوش سے حال کو منور کرنا چاہتے تھے اور اس کی روشنی مستقبل تک پہنچانے کی تدبیریں سوچتے اور حتی الامکان ان پر عمل پیرا ہونے کی کوشش کرتے رہتے تھے، اس جد و جہد میں ان کا تصادم ان لوگوں سے بھی ہوا جو حال اور مستقبل کو ماضی کی گرفت سے آزاد کرانا چاہتے تھے اور ان لوگوں سے بھی جو ماضی کی حکمرانی ہر صورت اور بہر حال قائم رکھنا چاہتے تھے، میرے نزدیک یہ تصادم ہی علامہ شبلی نعمانی

کی شخصیت اور کارناموں کو عظمت عطا کرنے کا موجب ہوا۔

حواشی

[1] حیات شبلی: ۱/ ۲۹۱-۹۲ [2] مقالات شروانی: ۴۸ و ۴۸ [3] ایضاً: ۶۱ [4] یادگار شبلی: ۲۳۹ [5] حیات شبلی: ۵۳-۳۵ [6] ایضاً: ۳۱۷ [7] ایضاً: ۳۴۶-۴۷ [8] ایضاً: ۳۸۷ [9] ایضاً: ۳۸۸ [10] ایضاً: ۳۸۹-۹۰ [11] ایضاً: ۳۹۲-۹۶ [12] ایضاً: ۴۱۲ [13] ایضاً: [14] یہ بحث حیات شبلی کے متعدد صفحات پر پھیلی ہوئی ہے اور کئی مقامات پر اس کا اعادہ ہوا ہے [15] حیات شبلی: ۴۱۷ [16] ایضاً: ۲۹۸ [17] ایضاً: ۴۱۷ [18] ایضاً: ۴۲۰ [19] ایضاً: ۴۲۷ [20] ایضاً: ۴۳۷-۳۹ [21] ایضاً: ۴۳۹-۴۰ [22] ایضاً: ۴۴۳-۴۶ [23] ایضاً: ۶۴۸ [24] ایضاً: ۶۵۳-۶۰ [25] ایضاً: ۶۸۸ [26] ایضاً: ۶۹۲ [27] ایضاً: ۶۹۵ [28] ایضاً: ۷۲۳۔

نور محمدی اور حدیث جابرؓ

از ڈاکٹر سید رضوان علی ندوی، کراچی

عام لوگوں میں مشہور ہے کہ اللہ تعالیٰ نے سب سے پہلے نور محمدی کی تخلیق کی اور اس کے بعد اسی سے ساری کائنات بلکہ نعوذ باللہ اپنا عرش و کرسی تک پیدا کیا۔ افسوس ہے کہ کتب میلاد یا سیرت نبوی پر لکھی گئی بعض متاخر کتابوں میں مذکور بعض روایات کی وجہ سے یہ خیال اس قدر عام ہوا کہ بعض محترم و مقدس سیرت نگاروں نے بھی بغیر کسی تحقیق کے اس روایت کو اپنی کتابوں میں شامل کر لیا ہے، مذکورہ حدیث کا پہلا ٹکڑا یہ ہے کہ "اللہ نے جو چیز سب سے پہلے پیدا کی وہ میرا نور تھا" لیکن اس طویل حدیث میں جو کچھ مذکور ہے اور جس کو ہم آگے بیان کریں گے وہ ہماری عام کتابوں میں نہیں پایا جاتا، ہندوستان میں درود شریف اور سیرت نبوی پر ایک تازہ کتاب صل علیٰ محمد کے نام سے چھپی ہے، اس میں یہ پوری حدیث موجود ہے۔ آئندہ صفحات میں اس کا محققانہ جائزہ لینا مقصود ہے۔

یہ حدیث کافی طویل ہے، مشہور صحابی حضرت جابر رضی اللہ عنہ نے تخلیق کائنات کے بارے میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا تو آپ نے ارشاد فرمایا کہ "اول ما خلق اللہ نور نبیک یا جابرؓ" اے جابر! سب سے پہلے جو چیز اللہ نے پیدا فرمائی وہ تمہارے نبی کا نور تھا۔ پھر حدیث کا تکملہ اس طرح ہے کہ "اللہ تعالیٰ نے تمام چیزوں سے

پہلے اپنے نور سے تمہارے نبی کا نور پیدا کیا پھر اس کو جہاں چاہا پھیلا دیا، اس وقت نہ تو لوح تھا نہ قلم، نہ جنت نہ جہنم، نہ فرشتہ نہ آسمان نہ زمین نہ سورج نہ چاند، نہ جن نہ انس پھر جب اللہ کی مشیئت ہوئی کہ مخلوق کو پیدا کرے تو اس نے اس نور کو چار اجزاء میں تقسیم کر دیا۔ پہلے جزء سے قلم پیدا کیا۔ دوسرے جزء سے لوح، تیسرے سے عرش، پھر چوتھے جزء کو چار مزید اجزاء میں تقسیم کر دیا اور اس کے پہلے جزء سے حاملین عرش کو پیدا کیا، دوسرے جزء سے کرسی اور تیسرے سے باقی فرشتے پیدا کیا اور چوتھے جزء کو پھر سہ بارہ چار اجزاء میں تقسیم کر دیا اور اب اس کے پہلے جزء سے آسمان پیدا کیے دوسرے جزء سے زمین، تیسرے سے جنت اور جہنم پیدا کیے پھر چوتھے جزء کو مزید چار اجزاء میں تقسیم کر دیا اور اس نئی تقسیم میں پہلے جزء سے مومنین کی آنکھوں کا نور پیدا کیا، دوسرے جزء سے ان کے دلوں میں نور پیدا کیا جو اللہ کی معرفت ہے اور تیسرے جزء سے ان کے انس کا نور پیدا کیا جو توحید ہے لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ۔"

حدیث کے یہ الفاظ قسطلانی کی کتاب مواہب لدنیہ[1] میں مذکور ہیں، انہوں نے حدیث کو عبدالرزاق بن ہمام الصنعانی الیمنی (م ۲۱۱ھ) سے منسوب کیا ہے۔ جنھوں نے اپنی سند سے اسے مصنف میں روایت کیا ہے۔

ایک ترکی مصنف علاء الدین علی ددّہ السکتواری نے بھی اپنی کتاب "محاضرۃ الاوائل ومسامرۃ الاواخر" (ص ۲۱) میں یہ حدیث ذکر کی ہے جو ۹۹۸ ہجری میں تصنیف کی گئی ہے۔ تعجب کی بات یہ ہے کہ اس کتاب اور مواہب لدنیہ میں مذکور حدیث کے الفاظ ایک دوسرے سے بہت مختلف ہیں۔ "صلی علی محمدؐ" کے مصنف کے سامنے علی ددّہ السکتواری

---

[1] المواہب اللدنیہ (شرح الزرقانی علی المواہب) ج ۱، ص ۴۶۔

کی ہی عربی کتاب یا اس کا ترجمہ تھا جس پر اعتماد کرکے انہوں نے اس حدیث کو مستند باور کر لیا ہے اور غالب خیال یہ ہے کہ سیرت نبوی کی بعض اردو کتابوں میں بھی یہی الفاظ زیادہ متداول و رائج ہیں جن کو اوپر ہم بڑی حد تک مختلف اور اضافہ شدہ بتا چکے ہیں ملاحظہ ہو: "اے جابر! سب سے پہلے اللہ تعالیٰ نے تمہارے نبی کا نور پیدا کیا، اس کے بعد اسی سے ہر اچھی چیز پیدا کی۔ اس کے بعد تمام چیزیں پیدا کیں اور جب اس نور کو پیدا کیا تو اس کو اللہ تعالیٰ نے اس نور کو پیدا کرنے کے بعد بارہ سال تک اپنے مقام قرب میں رکھا پھر اس کی چار قسمیں کیں، ایک قسم سے عرش پیدا کیا اور دوسری قسم سے کرسی کو، تیسری سے حاملین عرش کو اور چوتھی قسم سے کرسی سنبھالنے والے اور انتظام کرنے والے فرشتوں کو پیدا کیا اور چوتھی قسم کو بارہ سال تک مقام محبت میں رکھنے کے بعد اسکے چار حصے بنائے، ایک حصے میں قلم پیدا کیا، دوسرے سے لوح، تیسرے سے جنت اور چوتھے حصے کو بارہ سال تک مقام خوف میں رکھا پھر اس کو چار اجزاء میں تقسیم کیا، ایک جزء سے فرشتے پیدا کیے، ایک سے سورج اور چاند اور تیسرے سے ستارے اور چوتھے جزء کو بارہ سال تک مقام رجاء (امید) میں رکھا، پھر اس سے چار اجزاء تخلیق کیے، پہلے جزء سے عقل تخلیق کی، دوسرے سے علم اور حلم، تیسرے سے پاکیزگی اور توفیق اور چوتھے حصے کو بارہ سال تک مقام حیاء میں رکھا، پھر اللہ تعالیٰ نے اس کی طرف دیکھا تو اس نور (میرے نور سے) پسینہ ٹپکنے لگا اور اس سے ایک لاکھ چوبیس ہزار قطرے ٹپکے پھر اللہ نے ہر قطرے سے ایک نبی اور رسول کی روح پیدا کی اس کے بعد ان انبیاء کی روحیں سانس لینے لگیں تو اللہ تعالیٰ نے ان کی سانسوں سے اولیاء، نیک بختوں اور شہداء اور اطاعت شعار مومنین کی روحوں کا نور پیدا کیا۔

روز قیامت تک کے لیے۔ اس طرح عرش اور کرسی میرے نور سے ہیں۔ ملائکہ مقربین اور روحانیین میرے نور سے ہیں اور ساتوں آسمان کے فرشتے میرے نور سے ہیں۔ جنت اور اس میں جو کچھ نعمتیں ہیں وہ میرے نور سے ہیں۔ سورج چاند ستارے میرے نور سے ہیں۔ عقل، علم اور توفیق خداوندی میرے نور سے ہیں۔ انبیاء اور رسولوں اور شہداء اور صالحین اور خوش نصیبوں کی روحیں میرے نور سے ہیں۔ پھر اللہ تعالیٰ نے بارہ ہزار حجاب (پردے) تخلیق کیے اور میرے نور (جو چوتھا جزء رہے) اس کو ہر پردے میں ایک ہزار سال رکھا اور یہ مقامات عبودیت ہیں، یہ بارہ پردے اس طرح ہیں:

حجاب کرامت، حجاب سعادت، حجاب ہیبت، حجاب رحمت، حجاب رافت، حجاب علم، حجاب حلم، حجاب وقار، حجاب سکینت، حجاب صبر، حجاب صدق اور حجاب یقین، پھر اس نور نے ہر ایک حجاب میں ایک ہزار سال اللہ کی عبادت کی پھر جب ان تمام پردوں سے میرا نور نکلا تو اللہ تعالیٰ نے اس کو مٹی سے مرکب کیا اور اس سے مشرق و مغرب اس طرح روشن ہو گئے جیسے چراغ سے اندھیری رات روشن ہو جاتی ہے، پھر اللہ تعالیٰ نے زمین سے آدمؑ کو پیدا کیا اور ان کی پیشانی میں یہ نور رکھ دیا پھر ان سے یہ حضرت شیثؑ کو منتقل ہوا۔ پھر یہ نور برابر طاہر سے طیب اور طیب سے طاہر کو منتقل ہوتا رہا۔ یہاں تک کہ عبداللہ بن المطلب کی پشت میں منتقل ہوا اور اس سے میری والدہ کے رحم میں منتقل ہوا، پھر اللہ تعالیٰ نے مجھے دنیا میں نکالا اور مجھے سید المرسلین خاتم النبین، رحمۃ للعالمین اور قائد المجلین (یہ نور پیشانی والوں کے سردار) بنا کر بھیجا۔ اے جابر۔ اس طرح تمہارے نبی کی تخلیق ہوتی ...۔

آگے ہم اس حدیث کو روایت و درایت کے اصول پر جانچنے کی کوشش کریں گے۔

نقد حدیث از روئے اصول حدیث :

حقیقت یہ ہے کہ حضرت جابر بن عبداللہ انصاری سے منسوب یہ حدیث نہ تو صحاح ستہ میں وارد ہے اور نہ حضرت جابر بن عبداللہ کی جمع کردہ اس مجموعۂ احادیث میں شامل ہے جو مسند جابر کے نام سے حدیث نبوی کی عظیم و ضخیم قدیم کتاب مسند امام احمد بن حنبل کا جزو ہے، علاوہ ازیں بعد کے جمع کردہ مجموعۂ احادیث میں بھی اس کا کوئی ذکر نہیں ملتا، جیسے امام سیوطی کی جمع الجوامع اور علی المتقی ہندی کی کنز العمال وغیرہ میں۔

اوپر عرض کیا گیا تھا کہ سب سے پہلے دسویں صدی ہجری کے مصری مصنف قسطلانی (م ۹۲۳ھ) نے اپنی سیرت نبوی المواہب اللدنیہ میں اس حدیث کو عبدالرزاق ابن ہمام الیمنی (م ۲۱۱ھ) کے حوالے سے نقل کیا ہے۔ جس کو المواہب کے حوالے سے بعد کے عرب اور غیر عرب مصنفین نے کتب سیرت میں درج کیا ہے۔ عرب مصنفین میں شیخ اسماعیل عجلونی (م ۱۱۶۲ھ) نے اپنی کتاب "کشف الخفاء و مزیل الالباس عما اشتہر من الاحادیث علی السنۃ الناس" (ج ۱/ص ۲۶۵-۲۶۶) میں قسطلانی ہی کے الفاظ میں ان کی روایت لکھی ہے۔ اسی طرح ہندوستان کے شیخ عبدالحق محدث دہلوی نے اپنی کتاب مدارج النبوۃ کی جلد اول میں اس حدیث کی طرف اشارہ کیا ہے اور ان کے بعد مولانا اشرف علی تھانوی نے اپنی کتاب نشر الطیب فی ذکر الحبیب میں اس حدیث کے ابتدائی ٹکڑے کا مختصر ذکر کیا ہے۔

اس طرح جو حدیث نہ تو قدیم کتب سیرت میں موجود تھی اور نہ معتبر مجموعہ ہائے حدیث میں، وہ قسطلانی کے بیان کے بعد دور آخر کے مصنفین کی کتابوں میں راہ پاگئی ہے۔ افسوس ہے کہ ان حضرات نے اس کی تحقیق کی ضرورت محسوس نہیں کی۔

سطور بالا میں ہم نے حدیث زیر بحث کے دو نمونے پیش کیے ہیں ان سے صاف واضح ہوتا ہے کہ نئی تصنیف "اللھم صلی علی محمد" میں جیب البشر خیری صاحب کی نقل کردہ روایت قسطلانی کی بیان کردہ حدیث سے بالکل مختلف اور ترکی کے دسویں صدی ہجری کے ایک عام مصنف علی ددہ السکتواری کی کتاب کے مطابق ہے جس کے اندر بارہ بارہ ہزار سال نور محمدی کو مختلف مقامات: مقام قرب، مقام محبت، مقام خوف وغیرہ میں رکھنے پھر نور محمدی سے جو پسینے کے قطرے ٹپکے تو اس سے ایک لاکھ چوبیس ہزار نبی و رسول پیدا کیے جانے وغیرہ کا ذکر ہے، لیکن ہزاروں سال کے اس لمبے چوڑے حساب کا تذکرہ اس روایت میں نہیں ہے جو قسطلانی نے المواہب اللدنیہ میں مصنف عبدالرزاق کے حوالہ سے لکھی ہے۔ ذیل میں دونوں مصنفین کی روایتوں پر الگ الگ بحث و کلام کیا جاتا ہے:

(الف) پہلے المواہب اللدنیہ کی روایت کو لیجئے جس کو بعض ثقہ و معتبر مصنفین نے بھی نقل کیا ہے اور جس کے لیے قسطلانی نے مصنف عبدالرزاق کا حوالہ دیا ہے حالانکہ یہ حدیث مصنف میں کہیں نہیں پائی جاتی۔ معلوم ہوتا ہے کہ یہ قسطلانی کا ایک سہو ہے کیونکہ اگر یہ حدیث مصنف عبدالرزاق کے کسی دوسرے نسخہ میں ہوتی تو امام سیوطی اور علی المتقی الہندی وغیرہ اس کو اپنے مجموعہ ہائے احادیث میں ضرور ذکر کرتے۔ یہاں قابل ذکر بات یہ بھی ہے کہ علامہ شبلیؒ نعمانی نے سیرت النبی کی پہلی جلد کے مقدمہ میں اپنے مآخذ پر کلام کرتے ہوئے المواہب اللدنیہ کے بارے میں لکھا ہے کہ اس میں ہزاروں موضوع اور غلط روایتیں موجود ہیں[1] اس طرح مغرب اقصیٰ کے مشہور

---

[1] شبلی نعمانی، سیرت النبی، ج ۱ ص ۷۲، دارالاشاعت کراچی ۱۹۸۵

مصنف علامہ عبد الحئی کتانی نے اپنی کتاب التراتیب الادار یہ کے مقدمہ (۲۳) میں قسطلانی پر تنقید کرتے ہوئے لکھا کہ انہوں نے اس کتاب کو قاضی عیاض کی کتاب الشفاء کے مطابق مرتب کیا ہے بلکہ خطبہ میں بھی انہی کا اتباع کیا ہے[1]۔ اس طرح یہ حدیث روایتاً ثابت نہیں، اب رہی درایت تو اس کی رو سے بھی یہ حدیث قابل قبول نہیں ہوسکتی کہ اس میں چار چار مرتبہ جن تقسیمات کا ذکر ہے اور اس بات کی صراحت کہ عرش و کرسی بھی نور محمدی سے پیدا کیے گئے ہیں وہ قرآن و حدیث کے بیانات کے بالکل خلاف ہے، جس کا ذکر ہم آگے چل کر کریں گے۔

(ب) یہ حدیث نور محمدی کی وہ روایت ہے جو ہم کو دسویں صدی ہجری کے بعد کے ثقہ سنی مصنفین کی کتابوں میں ملتی ہے لیکن جہاں تک اس کی اس روایت کا تعلق ہے جو عوام میں زیادہ متداول و مقبول ہے تو وہ وہی ہے جو "اللھم صلے علی محمد" کے مصنف نے اختیار کی ہے اور جس کا حوالہ ہم ترکی مصنف علی وتّا کی کتاب سے دے چکے ہیں تو یہ روایت درحقیقت ایک شیعی مصنف ملا محمد معین کاشغی فراہی المعروف بملا مسکین (م ۹۰۷ھ) کی کتاب "معارج النبوۃ و مدارج الفتوۃ" سے منقول ہے، اس کتاب کا ترجمہ اردو زبان میں بھی ہو چکا ہے اور تازہ شائع شدہ کتاب "اللھم صلی علی محمد" کے مصنف نے راقم الحروف کو اپنے ایک خط میں اس کتاب کے حوالہ سے بلکہ ان دونوں کتابوں کے حوالہ سے آگاہ کیا، کیونکہ موصوف نے اپنی کتاب میں یہ حدیث بغیر کسی حوالے کے ذکر کی ہے اور میرے استفسار پر انہوں نے یہ حوالہ دیا۔

---

[1] عبد الحئی کتانی، التراتیب الاداریہ، مقدمہ ص ۲۳، دار الکتاب العربی۔

ملا محمد حسین کاشفی ہرات کے رہنے والے تھے، شیعہ مصنفین کے بارے میں مشہور کتاب "الذریعہ الی تصانیف الشیعہ" تصنیف آغا بزرگ تہرانی میں اس کتاب کا ذکر ہے[1]

دلچسپ بات یہ ہے کہ آغا بزرگ تہرانی نے ملا معین کا ذکر کرتے ہوئے ان کو مجنوں بھی لکھا ہے اور یہ کہ وہ ایک ایسے شہر میں رہنے کی وجہ سے جہاں سنیوں کی اکثریت تھی (یعنی ہرات) تقیہ کرتے تھے۔ آغا بزرگ نے ان کی اور کتابوں کا ذکر بھی کیا ہے جن میں ان کا ایک شعری دیوان بھی ہے، اہم بات یہ ہے کہ آغا بزرگ نے معارج النبوۃ پر جو فارسی زبان میں ہے کلام کرتے ہوئے لکھا ہے کہ:

ویظهر من المعارج هذا انه عامی یحتمل تقیته بمقتضیٰ بلده وعصره ..."	کتاب معارج النبوۃ سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ (ملا معین) عوام میں سے تھے اور اپنے شہر اور زمانے کے حالات کے تقاضوں کے پیش نظر تقیہ کرتے تھے[2]

اس طرح نور محمدی سے متعلق دوسری تفصیلی نام نہاد حدیث جس میں متعدد بار بارہ بارہ ہزار سال نور محمدی کے مختلف مقامات میں رہنے کا ذکر ہے وہ اسی شیعہ مصنف یعنی ملا مسکین (معین کاشفی) کی پیش کردہ روایت ہے جس کو ترکی کے مصنف علی ودہ نے اس کتاب سے نقل کیا اور وہ حدیث اس طرح عام ہو گئی۔

حقیقت یہ ہے کہ نور محمدی سے متعلق احادیث شیعی مصنفین ہی کی اختراع کردہ ہیں

---

[1] آغا بزرگ تہرانی، الذریعہ الی تصانیف الشیعہ۔ ج ۹ ص ۱۰۲۸ [2] ایضاً ج ۲۱ ص ۱۸۴۔

اس ضمن میں مشہور شیعی مصنف ملا محمد باقر مجلسی (م ۱۱۱۱ھ) کی کتاب بحار الانوار ج ۱۵ قابل ذکر ہے جو حضورؐ کی سیرت سے متعلق ہے اور اس کا عنوان ہے "تاریخ نبینا"۔ اسکے ص ۲۳-۲۴ میں نور محمدی سے متعلق چار حدیثیں ا ہم تا ہم ہم پیش کی گئی ہیں، ان میں پہلی حدیث دوسری صدی ہجری کے مشہور شیعی راوی جابر الجعفی کی ہے جو امام باقر سے مروی ہے اور اس حدیث کا پہلا جملہ "یا جابر" سے شروع ہوتا ہے۔ اس کا مضمون بھی یہی ہے کہ سب سے پہلے اللہ تعالیٰ نے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو پیدا کیا، انہی کے ساتھ اپنی عظمت کے نور سے اہل بیت کو پیدا کیا۔

اس کتاب کی دوسری حدیث امام احمد بن حنبل سے مروی ہے، لیکن اس میں صحابی کا ذکر نہیں۔ اس میں یہ ہے کہ:

کنت انا وعلی نورا بین یدی الرحمٰن قبل ان یخلق عرشہ باربعۃ عشر الف عام۔	میں اور علی اللہ کے سامنے عرش کی تخلیق سے چودہ ہزار برس قبل نور (کی صورت میں) تھے۔

تیسری روایت جابر بن عبد اللہ سے مروی ہے، یعنی حضرت جابر بن عبد اللہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا کہ:

اول شئی خلقہ اللہ تعالیٰ ما ھو؟ فقال نور نبیک یا جابر خلقہ اللہ ثم خلق منہ کل خیر۔	حضرت جابر بن عبد اللہ کہتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کی کہ سب سے پہلی چیز جو اللہ نے پیدا کی وہ کیا ہے؟ تو آپ نے فرمایا تمہارے نبی کا نور اے جابر!

اللہ نے اس کو پیدا کیا پھر اس سے
ہر چیز پیدا کی۔

چوتھی حدیث ان الفاظ کے ساتھ ہے :

وعن جابر ایضاً قال قال	جابرؓ ہی سے روایت ہے کہ رسول اللہ
رسول اللہ صلی اللہ علیہ	صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ سب سے
وسلم اول ما خلق اللہ	پہلی چیز جو اللہ نے پیدا کی میرا نور
نوری ابتدعہ من نورہ	ہے، اسے اپنے نور سے تخلیق کیا اور
واشتقہ من جلال	اپنی عظمت کے جلال سے اس کا استخراج
عظمتہ۔	کیا۔

قابل ذکر بات یہ ہے ملا باقر مجلسی نے تصریح کی ہے کہ انھوں نے یہ چاروں احادیث یک مصنف فضل اللہ بن محمود فارسی کی کتاب "ریاض الجنان" سے نقل کی ہیں۔ یہ کتاب ابھی تک مخطوط ہے۔ لیکن اس کے بارے میں آغا بزرگ تہرانی نے اپنی کتاب "الذریعہ الی تصانیف الشیعہ" میں یہ تحریر کیا ہے کہ :

فیہ اخبار غریبۃ فی	اس میں مناقب کے بارے میں بڑی
المناقب۔	عجیب وغریب باتیں مذکور ہیں۔

آغا بزرگ کے اس بیان سے "ریاض الجنان" میں مذکور نور محمدی سے متعلق احادیث کی حقیقت عیاں ہے کہ وہ ناقابل اعتماد ہیں پھر یہ کہ شیعہ حضرات کی مشہور ترین اور مستند ترین کتاب اصول کافی کی جلد اول کتاب الحجہ میں ایک حدیث نور محمدی سے متعلق منقول ہے جو صرف اسی قدیم شیعی راوی جابر الجعفی سے مروی ہے جس کا پورا نام

جابر ابن یزید ہے وہ یہ حدیث امام محمد الباقر سے روایت کرتا ہے اور وہ اس طرح شروع ہوتی ہے۔

یا جابر ان اللہ اول ماخلق	اے جابر اللہ نے سب سے پہلے جو
خلق محمداً وعترتہ الھداۃ	چیز پیدا کی وہ محمد اور ان کے اہل بیت
المھتدین فکانوا اشباح	ہیں جو ہدایت دینے والے اور ہدایت
نور بین یدی اللہ قلت	یافتہ ہیں وہ اللہ کے سامنے نوری اشباح
وما الاشباح؟ قال ظل النور	تھے، میں نے کہا اشباح کا کیا مطلب ہے؟
ابدان نورانیۃ بلا ارواح	فرمایا نور کا سایہ، نورانی جسم بغیر
...... الخ۔	روحوں کے۔

اس کے بعد حدیث میں اہل بیت کے اخلاق، علم وحلم اور عبادات وغیرہ کا ذکر ہے لیکن وہ سب تفصیل میں جو ہمیں ملا معین کاشفی کی کتاب "معارج النبوۃ ومدارج الفتوۃ" میں اور اس کے فوراً بعد علی ددہ کی کتاب "محاضرۃ الاوائل" میں ملتی ہے۔

ہماری ذاتی رائے ہے کہ نور محمدی سے متعلق جو حدیث عوام الناس اور بعض اہل سنت مصنفین کے ہاں مشہور ہے اس کا اصل منبع مشہور شیعی راوی جابر بن یزید الجعفی (م ۱۲۸ھ) ہے جس کو کبھی کبھی شیعی کتابوں میں صرف جابر بھی لکھا جاتا ہے اور عام لوگ دھوکہ کھا کر اس سے جابر بن عبداللہ الانصاری مراد لے لیتے ہیں اور اس نام نہاد مشہور حدیث کا پہلا لفظ بھی جیسا کہ مذکور ہوا "یاجابر" ہے، ہمارا خیال ہے کہ اس لفظ یا جابر سے مراد وہی جابر بن یزید الجعفی ہے جو اہل سنت کی کتابوں میں یا خود شیعہ مصنفین نے جابر بن عبداللہ بنا دیا ہے۔

مزید برآں کہ کہ خود عبدالرزاق بن ہمام الصنعانی اپنے تشیع کے لیے مشہور ہیں۔ امام ذہبی نے سیر اعلام النبلاء میں ان کی مفصل سوانح "عبدالرزاق بن ہمام الصنعانی الشیعی" کہہ کر شروع کی ہے۔ تاحال ہم کو مصنف عبدالرزاق کے مطبوعہ نسخہ (بیروت ۱۳۹۰ھ و مابعد) میں یہ حدیث نہیں ملی، اگر کسی نسخہ میں پائی بھی جاتی ہو تو اغلب گمان یہ ہے کہ عبدالرزاق نے اس کو جابر الجعفی سے روایت کیا ہوگا۔

ثانیاً جہاں تک قرآن کریم کا تعلق ہے اور جس کا حوالہ سب سے زیادہ بنیادی بات ہے اس سے بھی اس نام نہاد حدیث کی تائید ہوتی ہے بلکہ قرآن کریم میں جو کچھ ہے وہ اسکے برعکس ہے۔ اس نام نہاد حدیث میں تو یہ کہا گیا ہے کہ نعوذ باللہ عرش وکرسی بھی دوسری تمام مخلوقات اور آسمان وزمین کے علاوہ نور محمدی سے پیدا کیے گئے جبکہ قرآن کریم اس کے برخلاف سورۂ ہود میں فرماتا ہے:

وَهُوَ الَّذِي خَلَقَ السَّمٰوَاتِ	وہی ہے جس نے چھ دن میں آسمان
وَالْأَرْضَ فِي سِتَّةِ أَيَّامٍ	اور زمین پیدا کیے اور اس کا عرش
وَكَانَ عَرْشُهُ عَلَى الْمَاءِ (ہود: ۷)	پانی پر تھا۔

اس آیت سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ آسمان وزمین اور کسی چیز کی پیدائش سے پہلے عرش الٰہی موجود تھا۔ امام محمد ابن جریر الطبری (م ۳۱۰ھ) نے اپنی مشہور ومستند تفسیر میں وکان عرشہ علی الماء کی تفسیر بیان کرتے ہوئے حضرت عبداللہ بن عباسؓ کے مشہور شاگردوں مجاہد اور قتادہ وغیرہ سے روایت کی ہے کہ اس سے پہلے کہ اللہ تعالیٰ آسمان وزمین یا کوئی چیز بھی پیدا کرے اس کا عرش موجود تھا (تفسیر طبری، آیت ۷ سورۂ ہود)

یہی بات امام رازی نے اس آیت کی تفسیر میں لکھی ہے، صحیح بخاری کی ایک حدیث سے بھی اس کی تصدیق ہوتی ہے جس کا ذکر ہم آیندہ صفحات میں کریں گے۔

حافظ ابن کثیر نے بھی اپنی تفسیر میں سورۂ ہود کی اس آیت کی تفسیر میں یہ کہا ہے کہ کسی چیز کی پیدائش سے قبل اللہ تعالیٰ کا عرش موجود تھا اور انہوں نے ترمذی اور ابن ماجہ کا حوالہ عرش کی تخلیق کے بارے میں دیا ہے۔ علاوہ ازیں سورۃ القلم کی تفسیر میں حافظ ابن کثیر اور دوسرے مفسرین حضرت ابن عباسؓ کی یہ حدیث نقل کرتے ہیں کہ:

اول ما خلق اللہ القلم۔ سب سے پہلے جو چیز اللہ تعالیٰ نے پیدا کی وہ قلم ہے۔

اس طرح یہ ثابت ہوتا ہے کہ قرآن کریم کی رو سے نور محمدی کو سب سے پہلے پیدا نہیں کیا گیا بلکہ اس سے پہلے عرشِ خداوندی یا پھر قلم کو پیدا کیا گیا، بعض حضرات یہ کہتے ہیں کہ سورۂ مائدہ کی آیت نمبر ۱۵ میں جو آخری الفاظ ہیں " قَدْ جَآءَكُمْ مِنَ اللّٰهِ نُوْرٌ وَّكِتٰبٌ مُّبِيْنٌ "۔ یہاں نور سے مراد محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔

غالباً سب سے پہلے یہ بات امام محمد ابن جریر الطبری نے اس آیت کی تفسیر میں لکھی ہے، مگر یہاں قابل ذکر بات یہ ہے کہ یہ تفسیر جو ماثور تفاسیر[1] میں سب سے قدیم ہے اس میں اس آیت کی تفسیر میں کسی صحابی یا تابعی مفسر جیسے مجاہدؒ سعید بن جبیر، قتادہ اور عکرمہ وغیرہ کا کوئی قول نقل نہیں۔ نہ سلف میں سے کسی اور مفسر کا ذکر ہے، حالانکہ طبری کا عام طریقہ یہ ہے کہ وہ صحابہ اور تابعی مفسرین کے اقوال نقل کرنے کے بعد اپنی ترجیح بیان کرتے ہیں یا پھر اپنی تفسیر بیان کرنے کے بعد مفسرین سلف کے اقوال سے اس کی تائید پیش کرتے ہیں،

---

[1] ماثور تفاسیر سے وہ کتب تفسیر مراد ہیں جو صحابہ و تابعین کے اقوال کا مجموعہ ہیں۔

لیکن امام موصوف نے " قَدْ جَآءَكُمْ مِنَ اللّٰهِ نُوْرٌ " کی تفسیر میں نور سے رسولؐ مراد لیتے ہوئے کسی صحابی یا تابعی مفسر کا قول نقل نہیں کیا، اسلیے یہ ان کی ایک ذاتی رائے ہے جس کے لیے کوئی دلیل بھی نہیں دی گئی لیکن اگر مکمل آیت اور اس کے سیاق و سباق کو مدنظر رکھا جائے تو یہاں لفظ نور سے رسولؐ مراد لینا کسی طرح درست نہیں ہوگا کیونکہ آیت اس طرح شروع ہوتی ہے :

يَا أَهْلَ الْكِتَابِ قَدْ جَآءَكُمْ رَسُوْلُنَا يُبَيِّنُ لَكُمْ كَثِيْرًا مِّمَّا كُنْتُمْ تُخْفُوْنَ مِنَ الْكِتَابِ وَيَعْفُوْا عَنْ كَثِيْرٍ قَدْ جَآءَكُمْ مِنَ اللّٰهِ نُوْرٌ وَّكِتَابٌ مُّبِيْنٌ۔	اے اہل کتاب تمہارے پاس ہمارے رسول آگئے جو (تمہاری) کتاب کی بہت سی چیزوں کو وضاحت سے بیان کرتے ہیں جن کو تم چھپاتے تھے اور بہت سی چیزوں سے درگزر کرتے ہیں۔ تمہارے پاس اللہ کا نور آگیا ہے اور واضح کتاب آگئی ہے۔

غور کیجئے جب آیت کے شروع ہی میں رسولؐ کے آنے کا ذکر کر دیا گیا ہے تو دوبارہ نور کے لفظ سے اس کو دہرانے کی کیا ضرورت تھی پھر یہ کہ دوسری آیت (۵/۱۶) کے اندر جو آیت نمبر ۵ سے مربوط ہے اس میں ہے کہ " يَهْدِي بِهِ اللّٰهُ " یعنی اس (قرآن) کے ذریعہ اللہ ہدایت دیتا ہے اب اگر پہلی آیت میں لفظ نور سے مراد محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور کتاب مبین سے مراد قرآن ہوتا تو عربی قاعدے کی رو سے اس دوسری آیت کے پہلے جملے میں يَهْدِي بِهِ اللّٰهُ کے بجائے يَهْدِي بِهِمَا اللّٰهُ (اللہ ان دونوں کے ذریعہ ہدایت کرتا ہے) ہونا چاہیے تھا۔ یہی بات شیخ رشید رضا نے اس آیت کی تفسیر میں اپنی

تفسیر المنار جلد ۶ ص ۳۰۴ پر لکھی ہے۔

امام رازی نے " قَدْ جَآءَكُمْ مِّنَ اللّٰهِ نُوْرٌ وَّكِتَابٌ مُّبِيْنٌ " کی تفسیر میں تین اقوال نقل کیے ہیں، پہلا یہ کہ نور سے مراد محمد صلے اللہ علیہ وسلم ہیں، دوسرا یہ کہ نور سے مراد اسلام اور کتاب سے مراد قرآن ہے۔ تیسرا قول یہ کہ نور اور کتاب دونوں سے مراد قرآن ہے۔ انہوں نے آخری قول کو ضعیف قرار دیا ہے، اس بنا پر کہ واو عطف مغایرت کے لیے ہوتا ہے اس لیے ان کے نزدیک یہی بات درست ہے کہ نور سے محمدؐ اور کتاب سے قرآن مراد ہے۔ لیکن انہوں نے یہاں اس بات سے تغافل برتا کہ واو یہاں عطف بیان کے لیے ہے یعنی واوٗ سے لفظ نور کی تفسیر بیان کی گئی ہے، اس طرح اس سے مراد قرآن کریم ہے۔ آگے خود امام صاحب نے بھی آیت نمبر ۱۶ کے پہلے جملہ "يَهْدِيْ بِهٖ" کے معنی قرآن کریم لکھے ہیں جو عربی قواعد کی رو سے اسی وقت درست ہو سکتا ہے جب نور اور کتاب مبین کو ایک ہی چیز سمجھا جائے اور یہی بات درست ہے، قرآن کریم میں اس کی بہت سی مثالیں ہیں۔

بیسویں صدی عیسوی کے بہت مشہور مصری مفسر شیخ رشید رضا نے اس قرآنی آیت کی تفسیر میں وہی بات کہی ہے جو ہم نے بیان کی ہے، انہوں نے امام رازی کا نام لیے بغیر قَدْ جَآءَكُمْ مِّنَ اللّٰهِ نُوْرٌ وَّكِتَابٌ مُّبِيْنٌ میں لفظ نور کے بارے میں تین مختلف اقوال نقل کیے ہیں، اس کو ترجیح دیا ہے کہ نور سے مراد یہاں قرآن کریم ہے گو عطف میں ہے کہ معطوف اور معطوف علیہ میں مغایرت ہوتی ہے تاہم وہ تفسیر و بیان کے لیے بھی آتا ہے۔ ثانیا یہ کہ لفظ "يَهْدِيْ بِهٖ" سے بھی اس معنی کی تائید ہوتی ہے، ورنہ "يَهْدِيْ بِهٖ" کی بجائے یہاں " يَهْدِيْ بِهِمَا " ہوتا۔ ثالثاً یہ کہ قرآن مجید کے لیے لفظ نور متعدد آیات میں

آیا ہے مثلاً: فَالَّذِيْنَ آمَنُوْا بِهٖ وَعَزَّرُوْهُ وَنَصَرُوْهُ وَاتَّبَعُوا النُّوْرَ الَّذِيْٓ اُنْزِلَ مَعَهٗٓ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ (اعراف : ۱۵۷) دوسری جگہ ہے فَاٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَالنُّوْرِ الَّذِيْٓ اَنْزَلْنَا (التغابن : ۸)

غرض قرآن شریف کی اس آیت سے نور محمدی مراد لینا درست نہیں۔ ثالثاً: جہانتک احادیث نبویہ کا تعلق ہے تو ان میں بھی کسی صحیح حدیث سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ اللہ تعالیٰ نے سب سے پہلے جو چیز پیدا کی وہ نور محمدی تھا بلکہ اس کے برخلاف صحیح احادیث میں یہ ملتا ہے کہ سب سے پہلے اللہ تعالیٰ نے جو چیز پیدا کی وہ عرش الٰہی تھا یا یہ کہ عرش الٰہی ذات الٰہی کے ساتھ موجود تھا اور سب سے پہلے جو چیز اللہ نے تخلیق کی وہ قلم تھا، صحیح بخاری کی کتاب التوحید میں حضرت عمران بن حصین سے ایک روایت ہے کہ حضورؐ نے فرمایا:

کان اللّٰہ و لم یکن شئی قبلہ	اللہ تعالیٰ موجود تھا اور اس سے پہلے
وکان عرشہ علی الماء ثم	کوئی چیز موجود نہ تھی اور اس کا عرش
خلق السموات والارض۔	پانی پر تھا پھر اللہ تعالیٰ نے آسمان اور
	زمین پیدا کیے۔

ترمذی میں حضرت ابو رزینؓ سے یہ حدیث مروی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے سب سے پہلے عرش کو پیدا کیا۔ (باب التفسیر۔ تفسیر سورۂ ہود) امام ترمذی نے حضرت عبادہ بن صامتؓ سے یہ مرفوع حدیث بھی روایت کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ پہلی چیز جو اللہ نے تخلیق فرمائی وہ قلم ہے (باب التفسیر سورہ نٓ والقلم) اسی طرح حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے اسی سورہ القلم کی پہلی آیت "نٓ وَالْقَلَمِ وَمَا يَسْطُرُوْنَ" کی تفسیر میں حضرت ابوہریرہؓ سے یہ حدیث مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے سب سے پہلے

قلم کو تخلیق کیا (سورۃ القلم، قرطبی ۱۸ : ۲۲۳)

رابعاً : عام مستند و قدیم کتب سیرت جیسے سیرت ابن اسحاق (ترتیب ابن ہشام) طبقات ابن سعد (سیرت نبوی سے متعلق پہلی دو جلدیں) بلاذری کی کتاب انساب الاشراف (جلد اول جو سیرت نبوی پر ہے) اور بیہقی کی دلائل النبوۃ اور اسی طرح ابو نعیم کی دلائل النبوۃ۔ قاضی عیاض الاندلسی کی کتاب الشفاء۔ ابن سید الناس کی عیون الاثر فی فنون المغازی والشمائل والسیر اور شیخ الاسلام الذہبی کی تاریخ الاسلام (جلد اول و دوم جو سیرت نبوی پر ہیں) نیز حافظ ابن قیم کی زاد المعاد وغیرہ ان میں سے کسی کتاب میں اس نام نہاد نور محمدی کی حدیث کا ذکر نہیں اور یہیں یہ بات ملحوظ رکھنا پڑتی ہے کہ یہ حدیث شیعہ مصنفین کی اختراع کردہ ہے، ان کا منشا یہ ہے کہ اس کے ساتھ وہ اپنے ائمہ اثنا عشر کے نور کی تخلیق کی تائید بھی کر سکیں جیسا کہ ملا باقر مجلسی کی مجمع بحار الانوار کی پندرہویں جلد سے واضح ہے، جس میں نور محمدی کی تخلیق کے ساتھ ہی حضرت علی کرم اللہ وجہہ اور دوسرے ائمہ اہل بیت کے نور الٰہی یا نور محمدی سے پیدا ہونے کے متعلق مختلف اقوال نقل کیے گئے ہیں۔

اس تحریر کا مقصد ہرگز یہ نہیں ہے کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات مبارک کو نور الٰہی سے کچھ حصہ ہی نہیں ملا تھا بلکہ اللہ تعالیٰ نے تو یہ نور عام صالح مسلمانوں کے لیے بھی تخلیق کیا ہے جس کا ذکر متعدد مقامات پر قرآن کریم میں آیا ہے مثلاً :

يَوْمَ تَرَى الْمُؤْمِنِينَ وَالْمُؤْمِنَاتِ	وہ دن جب تم مومنین اور مومنات کو
يَسْعَىٰ نُورُهُم بَيْنَ أَيْدِيهِمْ	دیکھو گے کہ ان کا نور ان کے آگے اور
(الحدید : ۱۲)	ان کے دائیں طرف چل رہا ہے۔

ہے اللہ کے آخری نبی اور اشرف المرسلین سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم تو انہیں سے حصہ او فر ملا تھا لیکن یہ کہنا درست نہیں کہ اللہ نے سب سے پہلے نور محمدی ر اسی سے اپنے عرش و کرسی وغیرہ کو بھی پیدا کیا۔ اس طرح تو اللہ تعالیٰ جس کی صمد ہے یعنی وہ ہر چیز سے بے نیاز ہے، وہ اپنے عرش وغیرہ کی تخلیق کے لیے عوذ باللہ، محتاج ٹھہرے گا۔ نور محمدی سے متعلق حدیث پر نقد و جرح کرنے ب ہم رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی وہ صحیح حدیث نقل کرتے ہیں جو آپ سے سچی محبت اور آپ کے حقیقی متبعین کے لیے مشعل راہ ہے۔

طرونی کما اطرت النصاری	میری ایسی (مبالغہ آمیز) تعریف نہ کرو
ی بن مریم فتھلکوا کما	جیسی عیسائیوں نے حضرت عیسیٰ بن
لکوا۔	مریم علیہما السلام کی کی اور اس کے
	نتیجہ میں تم اسی طرح ہلاک ہو جس طرح
	وہ ہوئے۔

اور صحیح حدیث بھی جو بخاری و مسلم وغیرہ میں ہے، اس نام نہاد حدیث کے جھوٹی ہونے پر دلالت کرتی ہے' یہ ہے:

ہم اجعل فی قلبی نوراً وفی	یا اللہ تو میرے دل میں نور عطا فرما،
نی نوراً، وفی بصری نوراً،	میری زبان میں نور دے، میری آنکھوں
سمعی نوراً، وعن یمینی	کو نور دے، میری سماعت کو نور دے،
اً، وعن یساری نوراً، ومن	میرے دائیں کو نور دے، میرے بائیں
نوراً، ومن تحتی نوراً،	کو نور دے، میرے اوپر نور دے،

ومن امامی نوراً، ومن خلفی نوراً،	میرے نیچے نور دے، میرے آگے نور
واجعل فی نفسی نوراً، واعظم	دے، میرے پیچھے نور دے، میرے
لی نوراً،	نفس میں نور دے اور مجھے عظیم نور عطا فرما۔

اب یہ واضح ہے کہ اگر اس مذکورہ صدر حدیث کے مطابق ساری کائنات اور عرش و کرسی حضورؐ کے نور سے پیدا کیے گئے ہوتے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم یہ دعا نہ فرمایا کرتے جس میں اللہ تعالیٰ سے نور کی طلب ہے۔

استدراک مضمون تحریر کرنے کے بعد ایک کرم فرما نے امام غزالی سے منسوب ایک کتاب مجربات امام غزالی کی طرف مجھ کو توجہ دلائی، جس کا ترجمہ تقریباً نوے سال قبل مولانا سید حافظ یاسین علی حسنی نظامی نے کیا تھا اور وہ پہلی بار ۱۳۲۸ھ میں چھپی تھی، اب لاہور کے ایک ناشر الفیصل کتب خانہ نے اس کو فوٹو کاپی کر کے شایع کیا ہے، افسوس یہ ہے کہ امام غزالی کی اصل کتاب کا نام اس میں نہیں دیا گیا ہے، ہو سکتا ہے کہ پہلی اشاعت کے دیباچے میں مذکور ہو، اس کا ایک باب طب جسمانی پر ہے جس میں تشریح بدن اور کچھ دواؤں کا ذکر ہے اور دوسرا طویل باب (مقالہ) الٰہیات پر ہے۔ امام غزالی کی تصنیفات میں طب سے متعلق باتوں کا ذکر کسی کتاب میں نہیں اس لیے میرے خیال میں یہ کتاب امام غزالی کی نہیں معلوم ہوتی۔

اس کے دوسرے باب یا مقالے میں نور محمدی سے متعلق زیر بحث حدیث کا ذکر ہے جس میں مضمون کی تفصیلات یعنی نور محمدی کے چار حصوں میں تقسیم کا ذکر نئے انداز میں ہے (ص ۲۶۳ اور ساتھ ہی اس کے برعکس صفحہ ۱۰۲ پر یہ درج ہے کہ اللہ تعالیٰ نے سب سے پہلے عقل کو پیدا کیا اور یہ بھی کہ سب سے پہلے قلم کو پیدا کیا۔ نور محمدی سے متعلق حدیث کے اس تیسرے صیغہ سے بھی اس کے موضوع ہونے پر روشنی پڑتی ہے، ویسے بھی اس کتاب میں امام غزالی کی احیاء العلوم کی طرح بہت سی ضعیف اور موضوع احادیث مذکور ہیں اور لائق اعتماد نہیں۔ وما توفیقی الا باللہ۔

تلوار ہے تیزی میں صہبائے مسلمانی

از

جناب محمد بدیع الزماں صاحب، پٹنہ

اقبال کے کلام میں "مسلمانی" ایک اصطلاح ہے جس سے تیرہ اشعار ہیں۔ ان میں ایک ترکیب "صہبائے مسلمانی" ہے جس سے ایک ہی درج ذیل شعر "محراب گل افغان کے افکار" کے آخری بند کا آخری شعر ہے ؎

صدیوں میں کہیں پیدا ہوتا ہے حریف اس کا تلوار ہے تیزی میں صہبائے مسلمانی

"صہبائے مسلمانی" سے اقبال کی مراد اسلام کی شراب ہے، جس شراب کی تندی و تیزی تلوار کی تیزی جیسی ہے۔ کیونکہ اسلامی تعلیمات کی بدولت ایک مومن میں شمشیر بُراں کی صفت پیدا ہو جاتی ہے۔

"مسلمانی" کی اصطلاح کو گرفت میں لانے کے لیے ہمیں پہلے "اسلام" اور "مسلمان" کی خاصیت جو قرآن مجید میں وارد ہے، اسے پیش نظر رکھنا ضروری ہے۔ سورۂ آل عمران ۳ کی آیت ۱۹ میں فرمایا گیا ہے کہ "اللہ کے نزدیک دین صرف اسلام ہے"۔ یعنی اللہ کے نزدیک انسان کے لیے صرف ایک ہی نظام زندگی اور ایک ہی طریقہ حیات صحیح اور درست ہے۔ اور وہ یہ کہ انسان اللہ کو اپنا مالک و معبود تسلیم کرے اور اس کی بندگی و غلامی میں اپنے آپ کو بالکل سپرد کر دے اور اپنے پیغمبروں کے ذریعہ سے جو ہدایات اسے پہنچی ہیں صرف انہی

کی پیروی کرے۔ اسی طرزِ فکر و عمل کا نام "اسلام" ہے۔

پھر سورۃ البقرہ ۲ کی درج ذیل آیات ۲۰۸ اور ۲۰۹ میں ارشاد ہے کہ:۔

"اے ایمان لانے والو! تم پورے کے پورے اسلام میں آجاؤ اور شیطان کی پیروی نہ کرو کہ وہ تمہارا کھلا دشمن ہے۔ جو صاف صاف ہدایات تمہارے پاس آچکی ہیں، اگر ان کو پالینے کے بعد پھر تم نے لغزش کھائی تو خوب جان لو کہ اللہ سب پر غالب اور حکیم و دانا ہے"۔

علاوہ ازیں سورۃ الانعام ۶ کی آیت ۱۶۱ میں دینِ اسلام کو "صراطِ مستقیم" سے تعبیر کرتے ہوئے درج ذیل اگلی دو آیات میں "مسلمانی" کی قرآنی ماہیت سامنے آتی ہے، جہاں رسول اللہؐ کو مخاطب فرما کر ہدایت دی گئی ہے کہ:۔

"کہو: میری نماز، میرے تمام مراسمِ عبودیت، میرا جینا اور میرا مرنا، سب کچھ اللہ رب العالمین کے لیے ہے جس کا کوئی شریک نہیں۔ اسی کا مجھ کو حکم دیا گیا ہے اور سب سے پہلے سرِ اطاعت جھکانے والا میں ہوں"۔

ان آیات کی رو سے قرآن میں "مسلم" اسے کہتے ہیں جو خدا کے آگے سرِ اطاعت خم کر دے، خدا ہی کو اپنا مالک، آقا، حاکم اور معبود مان لے، جو اپنے آپ کو بالکلیہ خدا کے سپرد کر دے اور اس ہدایت کے مطابق دنیا میں زندگی بسر کرے جو خدا کی طرف سے آئی ہے۔

"اسلام" اور "مسلمان" کی مندرجہ بالا خاصیت کے پیشِ نظر "مسلمانی" نام ہے پورے کے پورے اسلام میں آجانے کا، جہاں ایک مومن سورۂ یونس ۱۰ کی آیت ۱۰۵ کے بموجب یکسو ہو کر اپنے آپ کو ٹھیک ٹھیک دینِ اسلام پر قائم کر دے اور اس دین کا اس بندگی خدا کے طریقے کو، اس طرزِ زندگی کو کہ پرستش، بندگی، غلامی، اطاعت، فرمانبرداری

سب کچھ صرف اللہ رب العالمین ہی کی کی جائے، ایسی یکسوئی کے ساتھ اختیار کرے کہ کسی دوسرے طریقے کی طرف ذرہ برابر میلان و رجحان بھی نہ ہو اور ان ٹیڑھے راستوں پر ایک غلط انداز نگاہ بھی نہ ڈالے جن پر دنیا چل رہی ہے۔ بالفاظ دیگر" مسلمانی" نام ہے اسلام کو اپنے لیے ضابطۂ حیات کی حیثیت سے قبول کر لینے کا، اسلام کے دیے ہوئے طریق فکر اور طرز زندگی کے خلاف کسی قسم کی مزاحمت باقی نہ رکھنے کا اور یہ طے کر لینے کا کہ اب وہ اسی کی پیروی میں زندگی بسر کریں گے۔ ان کی یہ اطاعت محض ظاہری نہیں بلکہ دل سے اسلام کی رہنمائی کو حق ماننے کی وجہ سے ہے۔ ان کا ایمان یہی ہے کہ فکر و عمل کا جو راستہ قرآن اور رسول اللہؐ نے دکھایا ہے وہی سیدھا اور صحیح راستہ ہے اور اسی کی پیروی میں انکی فلاح ہے۔

ایمان کی صحیح کیفیت جو" مسلمانی" کی راہ اختیار کرنے سے پیدا ہوتی ہے اسے ایک حدیث میں رسول اللہؐ نے یوں بیان فرمایا ہے:۔

" ایمان کا لذت شناس ہو گیا وہ شخص جو راضی ہوا اس بات پر کہ اللہ ہی اس کا رب ہو اور اسلام ہی اس کا دین ہو اور محمدؐ ہی اس کے رسول ہوں"۔ (مسلم)

اب اقبال جب کہتے ہیں کہ:" تلوار ہے تیزی میں صہبائے مسلمانی" تو ان کی مراد صہبائے اسلام کے پیدا شدہ اس سرور سے ہے جو ایک مومن کے پورے کے پورے اسلام میں آجانے اور یکسو ہو کر اللہ کی بندگی بجالانے کو اپنی زندگی کا شعار بنا لینے سے پیدا ہوتا ہے اور جس سرور کی بدولت وہ بے اختیار پکار اٹھتا ہے کہ:

" مالک، ہم نے ایک پکارنے والے کو سنا جو ایمان کی طرف بلاتا تھا اور کہتا تھا کہ اپنے رب کو مانو۔ ہم نے اس کی دعوت قبول کر لی۔ پس اے ہمارے آقا، جو قصور

ہم سے ہوئے ہیں ان سے درگزر فرما، جو برائیاں ہم میں ہیں انہیں دور کر دے اور ہمارا خاتمہ نیک لوگوں کے ساتھ کر۔ (سورۂ آل عمران ۳۔ آیت ۱۹۳)

اقبال نے اسی سرور کے لیے استعارے کے طور پر "صہبائے مسلمانی" کو تلوار کی تیزی سے تعبیر کیا ہے۔ جس سرور پر "بال جبریل" کی غزل ۲ (دوم) کے یہ اشعار بھی ہیں جو "مسلمانی" کی ماہیئت پر مزید روشنی ڈالتے ہیں:

اے حلقۂ درویشاں وہ مردِ خدا کیسا ہو جس کے گریباں میں ہنگامۂ رستاخیز
جو ذکر کی گرمی سے شعلہ کی طرح روشن جو فکر کی سرعت میں بجلی سے زیادہ تیز

دوسرے شعر میں ذکر سے مراد ہے عشقِ رسولؐ جن کی بدولت قلب منور ہو جاتا ہے اور فکر سے مراد ہے ذہن میں چند مسلمات کو اس طرح ترتیب دینا کہ ان کی مدد سے نئے معارف حاصل ہو سکیں اور جو حقیقت رسی بجلی سے بھی زیادہ تیز ہو۔

گرچہ "مسلمانی" سے اقبال کے کلام میں تیرہ اشعار ہیں مگر انکے بارہ میں درج ذیل تین اشعار میں صرف "مسلمانی" لایا گیا ہے اور باقی میں تراکیب وضع کی گئی ہیں جن میں ایک ترکیب "صہبائے مسلمانی" اوپر گزر چکی ہے۔ ان تین اشعار میں پہلا شعر "بال جبریل" کی غزل ۱۲ (دوم) کا ہے اور باقی "علی الترتیب" ضرب کلیم کی نظمیں "سلطانی" اور "فقر و راہبی" کے ہیں مگر "مسلمانی" کی ماہیئت ہر جگہ وہی ہے جن پر اوپر روشنی ڈالی گئی ہے۔

اگر ہو عشق تو ہے کفر بھی مسلمانی نہ ہو تو مردِ مسلماں بھی کافر و زندیق
مثالِ ماہ چمکتا تھا جن کا داغِ سجود خریدلی ہے فرنگی نے وہ مسلمانی
کچھ اور چیز ہے شاید تیری مسلمانی تری نگاہ میں ہے ایک فقر و رہبانی
ہزار پارہ ہے کہسار کی مسلمانی کہ ہر قبیلہ ہے اپنے بتوں کا زناری

پہلے شعر میں اقبال کی مراد یہ ہے کہ اسلام کا معیار فقہی احکام نہیں بلکہ عشقِ رسولؐ ہے۔ اقبال فقہی احکام کے منکر نہیں مگر ان کے نزدیک عشقِ رسولؐ سے سرشار ہونے والے شخص سے اگر ارکان اسلام کی تعمیل میں کوتاہی بھی ہو جائے تو بھی وہ مسلمان رہتا ہے لیکن اگر ایک شخص ارکانِ اسلام تو بجالاتا ہے مگر اس کا دل عشقِ رسول سے خالی ہے تو اس پر قرآنی معنوں میں "مسلمانی" کا اطلاق نہیں ہو سکتا۔ دوسرے شعر میں اقبال مغربی تعلیم اور اس کے زیرِ اثر مغربی تہذیب و تمدن کی ملامت کرتے ہوئے مسلمانوں پر تُف کرتے ہیں کہ اس نے زندگی کے چند روزہ عیش و آرام کی خاطر فرنگیوں کی غلامی قبول کر لی ہے اور ان کے تہذیب و تمدن کو اپنا شعار بنا کر خود کو دینِ اسلام سے بیگانہ کر لیا ہے۔ تیسرے شعر میں اقبال نے فقر و رہبانیت کے فرق کو واضح کیا ہے۔ اقبال "مسلمانی" کا اطلاق اس مسلمان پر نہیں کرتے جو فقر و رہبانیت کو ایک ہی چیز سمجھتا ہے۔ وہ بلا واسطہ سورۃ الحدید ۵۷ کی آیت ۲۷ کی طرف مسلمانوں کا دھیان مبذول کراتے ہیں جہاں "رہبانیت" کو "بدعت" قرار دیتے ہوئے خدا نے اسے نصرانیوں کی ایجاد فرمایا ہے اور پھر حضور انورؐ کا ارشاد ہے: " لارھبانیۃ فی الاسلام"۔

"مسلمانی" سے متذکرہ بالا تین منفرد اشعار کے علاوہ آٹھ تراکیب ہیں جن سے نو اشعار ہیں۔ ان آٹھ میں ایک "صہبائے مسلمانی" بھی ہے۔ اس سے دوسری ترکیب "شرعِ مسلمانی" ہے جس سے دو اشعار علی الترتیب "بال جبریل" کی غزلیات ۱۸ اور ۴۴ میں ہیں اور تیسری ترکیب "جذبِ مسلمانی" ہے جس سے ایک ہی شعر متذکرہ بالا غزل ۱۸ میں "شرعِ مسلمانی" کے ساتھ آئی ہے۔ دونوں اشعار درج ذیل ہیں:۔

اک شرعِ مسلمانی اک جذبِ مسلمانی ہے جذبِ مسلمانی سِرِّ فلک الافلاک

یا شرعِ مسلمانی، یا دیر کی دربانی یا نعرۂ مستانہ، کعبہ ہو یا بت خانہ

یہ دونوں اشعار قطعہ بند ہیں جن کا مطلب یہ ہے کہ دینِ اسلام دو چیزوں کا مجموعہ ہے۔ ایک کا نام "شریعت" ہے اور دوسری کا نام اسی شریعت کا باطنی پہلو ہے جسے "طریقت" کہتے ہیں۔ شریعت سے مراد وہ احکام اور پابندیاں ہیں جو شرائع الٰہیہ نے عائد کی ہیں۔" جذبِ مسلمانی" شریعت کا باطنی پہلو ہے۔ اقبال کا کہنا ہے کہ صرف ارکانِ اسلام جیسے روزہ اور نماز اور اس طرح کی دیگر عبادات کر کے یہ نہ سمجھ لینا چاہیے کہ شریعت کے تقاضے پورے ہو گئے۔ "شرعِ مسلمانی" یعنی پابندیِ ارکانِ اسلام سے بھی بالاتر ایک درجہ ہے جسے وہ "جذبِ مسلمانی" کا نام دیتے ہیں۔ یہ "جذب" ہے مقامِ عشقِ الٰہی بتوسط عشقِ رسولؐ (بمصداق سورۂ آلِ عمران ۳۔ آیات ۱۳۱ اور ۱۳۲) کیونکہ اس کے بغیر نہ تو عملِ صالح ممکن ہے اور نہ دل میں یقین کا رنگ پیدا ہو سکتا ہے۔ "جذبِ مسلمانی" یعنی مقامِ عشق و محبت وہ درجہ ہے کہ جب مسلمان اسے حاصل کر لیتا ہے تو فلک الافلاک یعنی ساری کائنات کے اسرار و حقائق اس پر کھل جاتے ہیں۔

"مسلمانی" سے چوتھی ترکیب "اندازِ مسلمانی" ہے جس سے ایک ہی شعر "بانگِ درا" کی نظم "جوابِ شکوہ" کے بیسویں بند کا ہے ؎

ہر کوئی مستِ مئے ذوقِ تن آسانی ہے تم مسلماں ہو؟ یہ اندازِ مسلمانی ہے؟

اس شعر میں اس ترکیب سے مراد اتباعِ رسولؐ ہے بمصداق اس حدیث کے کہ :۔

"تم میں کوئی شخص مومن نہیں ہوتا جب تک کہ اس کی خواہشِ نفس اس چیز کی تابع نہ ہو جائے جسے میں لایا ہوں۔" (شرح السنۃ)

"مسلمانی" سے پانچویں ترکیب "رمزِ مسلمانی" ہے جس سے ایک ہی شعر "بانگِ درا" کی

نظم "طلوع اسلام" کے چوتھے بند کا ہے ؎

یہی مقصودِ فطرت ہے، یہی رمزِ مسلمانی اخوت کی جہانگیری، محبت کی فراوانی

اس شعر میں اقبال نے بلاواسطہ مسلمانوں کو "رمزِ مسلمانی" پر سورۃ الانفال ۸ کی پہلی آیت، سورۃ الفتح ۴۸ کی آیت ۲۹ اور سورۃ الحجرات ۴۹ کی آیت ۱۰ کی یاد دلائی ہے جہاں مومنوں کو "آپس کے تعلقات میں" "اخوت کی جہانگیری" اور "محبت کی فراوانی" کا درس دیا گیا ہے۔ اس "رمزِ مسلمانی" پر مسلم و بخاری میں حضرت نعمان بن بشیر سے ایک روایت منقول ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا :

"تم مومنوں کو آپس کے رحم اور محبت اور ہمدردی کے معاملہ میں ایک جسم کی طرح پاؤگے"

"مسلمانی" سے چھٹی ترکیب "ننگِ مسلمانی" ہے جس سے ایک ہی شعر "بالِ جبریل" کی غزل ۱۵ (دوم) کا ہے ؎

مجھ کو تو سکھا دی ہے، افرنگ نے زندیقی اس دور کے ملا ہیں کیوں ننگِ مسلمانی

اس شعر میں اقبال کہتے ہیں کہ مسلمانوں کا انگریزی داں طبقہ تو مغربی تعلیم کی بدولت دین سے برگشتہ ہوگیا ہے مگر اس زمانہ کے ملانے تو کسی کالج میں تعلیم نہیں پائی تو پھر وہ کیوں دینِ اسلام کے لیے موجب ننگ و عار ہیں۔

"مسلمانی" سے ساتویں ترکیب "معراجِ مسلمانی" ہے جس سے کلام میں ایک ہی شعر "بالِ جبریل" کی نظم "ایک نوجوان کے نام" میں ہے ؎

نہ ڈھونڈ اس چیز کو تہذیبِ حاضر کی تجلی میں کہ پایا میں نے استغنا میں معراجِ مسلمانی

اس شعر کو گرفت میں لانے کے لیے اس سے قبل کا شعر پیشِ نظر رکھنا ضروری ہے

امارت کیا، شکوہ خسروی بھی ہو تو کیا حاصل ﴿﴾ نہ زورِ حیدری تجھ میں نہ استغنائے سلمانیؓ

اس ترکیب سے اقبال مسلمانوں کو اپنے میں شانِ استغنا پیدا کرنے کی تلقین کرتے ہیں جو صحابۂ کرامؓ کا طرۂ امتیاز تھا۔ واضح ہو کہ صفتِ استغنا اقبال کے نظامِ افکار میں بنیادی حیثیت رکھتی ہے، "بالِ جبریل" کی غزل ۱۱ (دوم) میں کہتے ہیں ؎

خدا کے پاک بندوں کو حکومت میں غلامی میں ﴿﴾ زرہ کوئی اگر محفوظ رکھتی ہے تو استغنا

اور پھر "ضربِ کلیم" کی نظم "فقر و راہبی" میں کہتے ہیں ؎

یہ فقرِ مسلماں نے کھو دیا جب سے ﴿﴾ رہی نہ دولتِ سلمانی و سلیمانی

اس شعر میں "دولتِ سلمانی" سے شانِ استغنا ہی مراد ہے۔

استغنا سے اقبال کی مراد بے نیازی کا رنگ ہے جو ایک مومن کی مختلف شانوں میں ایک شان ہے اور یہ رنگ صرف شانِ فقر سے پیدا ہو سکتا ہے جو منحصر ہے اتباعِ رسولؐ پر۔ خدائے تعالیٰ نے سورۂ یونس ۱۰ کی آیت ۶۸ اور سورۂ ابراہیم ۱۴ کی آیت ۸ اور سورۂ لقمٰن ۳۱ کی آیت ۱۲ میں اپنی ایک صفت "غنی" (بے نیازی) بتائی ہے جو اللہ کے ناموں میں ایک نام بھی ہے۔ اقبال اپنے فارسی مجموعۂ کلام "رموزِ بے خودی" میں کہتے ہیں:

بے نیازی رنگِ حق پوشیدن است ﴿﴾ رنگِ غیر از پیرہن شوئیدہ است

چونکہ خدائے تعالیٰ نے سورۃ البقرہ ۲ کی آیت ۱۳۸ میں اللہ کا رنگ اختیار کرنے کی تلقین کی ہے اس لیے اقبال مسلمانوں کو خدا کی اس صفت استغنا کا رنگ خود میں پیدا کرنے کی تلقین کرتے ہیں جسے وہ "معراجِ مسلمانی" کا نام دیتے ہیں۔

"مسلمانی" سے آٹھویں اور آخری ترکیب "میراثِ مسلمانی" ہے جس سے ایک ہی شعر "بالِ جبریل" کی نظم "فقر" کا ہے

اک فقر ہے شبیریؓ اس فقر میں ہے میری ﴿﴾ میراثِ مسلمانی، سرمایۂ شبیریؓ

ایسا ہے کہ جس کی تاثیر سے مٹی سونا بن جاتی ہے یعنی جس سے کوئی قوم دنیا میں سربلند ہوتی ہے۔ اس شعر میں "سرمایۂ شبیری" کا نام اقبال نے "میراثِ مسلمانی" رکھا ہے۔ جس کا نام حضرت امام حسینؓ نے دنیا کے سامنے پیش کیا۔

اقبال نے "مسلمانی" کے تضاد میں ایک اصطلاح "نامسلمانی" بھی وضع کی ہے جس سے کلام میں درج ذیل دو اشعار دو رباعیوں میں ہیں۔ پہلی رباعی "بالِ جبریل" کی ہے اور دوسری ارمغانِ حجاز کی :۔

حکیمی نامسلمانی خودی کی کلیمی رمزِ پنہانی خودی کی

تجھے گُر فقر شاہی کا بتا دوں غریبوں میں نگہبانی خودی کی

خرد کی تنگ دامانی سے فریاد تجلی کی فراوانی سے فریاد

گوارا ہے اسے نظارۂ غیر نگہ کی نامسلمانی سے فریاد

پہلی رباعی میں اقبال یہ نکتہ ذہن نشین کرتے ہیں کہ فلسفہ اور منطق کے مطالعہ یا ان فنون میں مہارت حاصل کرنے سے خودی کے اندر اسلام کا رنگ پیدا نہیں ہو سکتا بلکہ بسا اوقات یہ علوم و فنون اللہ اور بندہ کے درمیان پردہ بن جاتے ہیں۔ اقبال نے "بالِ جبریل" کی غزل ۱۶ (دوم) میں کہا ہے ؎

صحبتِ پیرِ روم سے مجھ پہ ہوا یہ راز فاش لاکھ حکیم سربجیب، ایک کلیم سربکف

"ارمغانِ حجاز" کی رباعی میں اقبال عقل و نگہ کا موازنہ کرتے ہیں۔ اقبال کے نزدیک عقل انسان کو کبھی حقیقت شہودی میں مدد نہیں کر سکتی جس کے لیے نظر کی ضرورت ہے۔ اقبال کے نزدیک مثالی نظر حضرت ابراہیمؑ کی ہے جس کے لیے انھوں نے "براہیمی نظر" کی اصطلاح وضع کی ہے اور جس سے ایک ہی شعر "بانگ درا" کی نظم "طلوعِ اسلام" کے پانچویں بند کا چوتھا شعر ہے۔ یہ عقل کا نہیں بلکہ نظر کا فیضان تھا کہ ؎

بے خطر کود پڑا آتشِ نمرود میں عشق
عقل ہے محوِ تماشائے لبِ بام ابھی (بانگ درا، غزلیات حصہ سوم تیسری غزل)

ابتدائی دور کا گوجری ادب

از پروفیسر نثار احمد انصاری۔ احمد آباد

(یہ مقالہ گجرات ودیا پیٹھ احمد آباد میں فروری ۱۹۹۱ء میں منعقدہ "گوجری ادب" سیمنار میں پڑھا گیا تھا، محترم ڈاکٹر ضیاء الدین صاحب ڈیسائی کی خواہش پر نظر ثانی کے بعد قارئین معارف کی نذر کیا جا رہا ہے۔ نثار انصاری)

ایک مخلوط بولی کی حیثیت سے گجرات میں اردو کی پیش رو ایک نئی زبان کی بنیاد آٹھویں صدی ہجری / تیرہویں صدی عیسوی سے کافی پہلے پڑ چکی تھی۔ تیرہویں صدی کے اختتام پر سلطان علاء الدین خلجی کے عہد میں گجرات فتح ہوا، اس سے صدیوں پیشتر ہی سے وہاں عرب اور ایرانی سیاحوں، تاجروں، جہاز رانوں اور دوسرے طبقے کے لوگوں کی آمد و رفت شروع ہو چکی تھی اور وہ بھدریشو (ضلع کچھ) سومناتھ ویراول، دیو کھمبات، راندیر (سورت) سوپارہ وغیرہ ساحلی مقامات کے علاوہ نہروالہ پٹن جیسے اندرون ملک کے شہروں میں بھی بکثرت آباد ہونے لگے تھے جس کا ثبوت کتبوں اور معاصر تاریخی آثار سے ملتا ہے[۱] اس کے برعکس دکن کا خطہ جس میں جنوبی ہند کے مغربی ساحلی علاقے کوکن اور شمالی ملیبار اپنی مخصوص جغرافیائی جائے وقوع کی بنا پر شامل نہیں تھے، بیرونی اثرات قبول نہیں کر سکتا تھا، نیز گجرات کی بندرگاہیں از منۂ قدیم سے شمالی مغربی ہند، افغانستان وغیرہ ممالک کے تاجروں اور بیرونی دنیا کے مسافروں کی آمد و رفت اور کاروبار کا ذریعہ تھیں۔

اس مختصر مضمون میں اس بحث کی گنجائش نہیں کہ قدیم اردو زبان کی پیدائش اور نشوونما گجرات میں ہوئی یا دکن میں، تاہم اردو زبان کی تاریخ وارتقاء سے دلچسپی رکھنے والوں کے لیے اس امر کا ذکر دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ اس موضوع پر لکھنے والے تمام اہل قلم محققین اس تاریخی حقیقت کو نظرانداز کر جاتے ہیں کہ جن خطوں کا اطلاق خاص دکن پر عائد ہوتا ہے وہ جنوبی ہند کے تلنگ، مرہٹواڑہ اور کرناٹک کا شمالی حصہ وغیرہ علاقے اور ان کے شہر گلبرگہ، بیجاپور، گولکنڈہ اور حیدرآباد جو دکنی زبان وادب کے گہوارے رہ چکے ہیں۔ وہ ہندوستان کے دوسرے خصوصاً شمالی علاقوں اور بیرونی ہند کے مذکورہ بالا ممالک سے تقریباً کلی طور پر آمد و رفت کے وسائل کی کمی اور پہاڑوں کے دشوار گزار راستوں کی وجہ سے کٹے ہوئے تھے۔ آٹھویں صدی ہجری / تیرہویں صدی عیسوی تک ایک دو بڑے فوجی حملوں کو چھوڑ کر شمالی اور جنوبی ہند کے بڑے پیمانے پر باہمی میل جول کے شواہد پیش کرنے سے تاریخ قاصر ہے اور یہ بھی تاریخی حقیقت ہے کہ آٹھویں نویں صدی ہجری تک شمالی ہند سے دکن جانے کا آسان ترین راستہ گجرات سے ہی تھا۔ دہلی وغیرہ کے کئی خاندان جن میں خانوادہ ہائے اہل عرفان شامل ہیں دکن کا رخ کرتے تو گجرات کا راستہ اختیار کرتے اور ان میں سے اکثر و بیشتر گجرات کی مہمان نواز زمین کو ہی اپنا مسکن بنا لیتے تھے۔ آٹھویں صدی کے اواخر میں گلبرگہ (دکن) کے مشہور و معروف بزرگ حضرت سید محمد حسین گیسو دراز بھی پٹن، بھروچ، کھمبایت وغیرہ مقامات سے ہوتے ہوئے گلبرگہ تشریف لے گئے تھے۔ اوپر گزرا ہے کہ از منۂ قدیم سے گجرات کی بندرگاہیں شمالی ہند ہی نہیں افغانستان اور وسط ایشیا کے اسلامی ممالک کے باشندوں کے لیے باب الحرمین بنی ہوئی تھیں۔ جوناگڈھ شہر میں تیرہویں صدی میں

پائے گئے۔ عربی کتبے میں ایک باثر شخصیت عفیف الدنیا والدین ابو القاسم علی الامیرجی کو ملک الصدور والنواخذ عماد الحاج والحرمین کے القاب سے یاد کیا گیا ہے[۲] گجرات میں دہلی کے سلاطین کی حکومت کے قیام کے نتیجے میں شمالی ہند کے اہلِ دولت اور اہلِ لشکر کے علاوہ مختلف پیشوں اور گروہوں کے جو لوگ بکثرت سکونت پذیر ہوئے ان میں عربی، فارسی زبانیں جاننے والوں کی اکثریت تھی۔ ان مخصوص حالات کے پیشِ نظر گجرات میں گوجری جیسی مخلوط زبان کا جنم لینا اور پرورش پانا بدیہی اور فطری امر تھا۔

علمی دنیا کا یہ بہت بڑا المیہ ہے کہ آج تاریخ سے دلچسپی کے فقدان اور علم کی جانب سے بے توجہی کے نتیجے میں گجرات جو عرصہ دراز تک علم و عرفان اور فضل و دانش کا گہوارہ رہا ہے اس کی عظمت رفتہ کا نوحہ خواں بھی ڈھونڈھنے سے بڑی مشکل سے ملے گا، گجرات کے علمی ادبی اور ثقافتی کارناموں کی طرف ماضی قریب میں بیرونِ گجرات کے علم دوست اور دانش پرور حضرات کی توجہ مبذول ہوئی تھی، جنھوں نے اس خطے کی علمی اور ثقافتی تاریخ کا جائزہ لے کر علمی دنیا کو ان سے روشناس کرایا۔ اس نہایت پسندیدہ کام میں اولیت کا سہرا اپنے عہد کے تبحر عالم اور جامع العلوم مولانا حکیم سید عبد الحئی مرحوم کے سر ہے جو دورِ حاضر کے عظیم مفکرِ اسلام اور مصنف حضرت مولانا ابو الحسن علی ندوی صاحب کے والد محترم ہیں انھوں نے محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس علی گڑھ کے سالانہ اجلاس کے لیے نواب صدر یار جنگ مولانا حبیب الرحمن خاں شروانی مرحوم کی فرمائش پر گجرات کی علمی خدمات پر ایک جامع اور پر از معلومات مقالہ لکھا جو دسمبر ۱۹۱۸ء میں جنوبی گجرات کے مشہور اور اردو زبان و ادب اور تعلیم کے اہم مرکزی شہر سورت میں پڑھا گیا جسے ان کے صاحبزادے حکیم ڈاکٹر سید عبد العلی صاحب نے یاد ایام کے نام سے کتابی

صورت میں ۱۹۱۹ء میں شایع کیا۔[۳] اس کے بعد دارالمصنفین کے سابق رفیق اور علامہ سید سلیمان ندوی مرحوم کے حقیقی بھتیجے مولوی سید ابوظفر ندوی صاحب نے گجرات کی سیاسی اور تمدنی تاریخ پر نہایت وقیع کتابیں لکھیں اور گجرات کے سلسلۂ مغربیہ کے مشہور بزرگ شیخ کھٹو سرکھیجی[۴] کے دو غیر مطبوعہ فارسی ملفوظ تحفۃ المجالس اور مرقاۃ الوصول الی اللہ والرسول کا اردو ترجمہ سیرت احمدیہ کے نام سے شایع کر کے گجرات کی تاریخ و تمدن اور اس کے روحانی بزرگوں کے فیض وارشاد سے اردو قارئین کو روشناس کرایا۔ علامہ سید سلیمان صاحب کے ایک اور عزیز اور دارالمصنفین کے سابق رفیق سید نجیب اشرف صاحب مرحوم احمد آباد کی گورنمنٹ اعلیٰ تعلیم گاہ گجرات کالج میں فارسی کے لکچرار کی حیثیت سے تشریف لائے اور انھوں نے یہاں کے اپنے مختصر قیام کے دوران حافظ محمود خاں شیرانی مرحوم کی "پنجاب میں اردو" اور نصیر الدین ہاشمی صاحب مرحوم کی "دکن میں اردو" کے نہج پر "گجرات میں اردو" کے نام سے ایک مبسوط کتاب کی تالیف کا منصوبہ بنایا اور اس کے لیے اس وقت اور بعد میں بھی تلاش و تحقیق کا سلسلہ جاری رکھ کر کافی مواد بھی جمع کیا، جن کی نگرانی میں ڈاکٹر سید ظہیر الدین مدنی مرحوم نے ڈاکٹریٹ کا مقالہ قلمبند کیا، جو ندوی صاحب کے مقالہ ہی کی نئی شکل ہے، مدنی صاحب نے اپنی کتاب سخنوران گجرات میں لکھا ہے کہ بمبئی میں تبادلہ ہو جانے کی وجہ سے یونیورسٹی کی ذمہ داریاں اور انتظامی مصروفیتیں اتنی بڑھیں کہ ندوی صاحب کوئی اہم علمی و ادبی کام انجام نہیں دے سکے اس طرح گجرات میں اردو والا ان کا منصوبہ بھی بالائے طاق نسیاں ہو کر رہ گیا۔[۵] البتہ انھوں نے گوجری کے ایک نصاب نامہ کی اشاعت کی جس کا نام لغات گجری ہے اور جو ان کی بڑی اہم اور مفید خدمت ہے[۶]

گوجری زبان کی ابتدا اور نشو و نما کی تاریخ کے صحیح مرتب ہونے کا سہرہ مرحوم بابائے اردو ڈاکٹر مولوی عبدالحق اور حافظ محمود خاں شیرانی مرحوم کے سر ہے۔ اول الذکر کی اردو کی ابتدائی نشو و نما میں صوفیائے کرام کا کام نے ایک مختصر رسالہ ہونے کے باوجود گجرات میں اردو زبان کی تاریخ کے لیے ایک نئی راہ نکالی چنانچہ حافظ محمود خاں شیرانی کے متعدد مقالوں نے مولوی عبدالحق صاحب کی کھینچی ہوئی تصویر کے نقشے میں رنگ آمیزی کا کام کیا اور گوجری زبان کی تاریخ میں دلچسپی رکھنے والوں کے لیے ایک لائحہ عمل مہیا کیا[۱۲]۔ ان دو بزرگوں کی کوششوں کا مختصر جائزہ کچھ مزید توضیح و اضافے کے ساتھ پروفیسر محمد ابراہیم ڈار[۱۳] مرحوم نے لیا، انہوں نے گجرات کالج میں تقریباً بارہ سال تک فارسی اور اردو کی ... خدمات انجام دیے تھے اور گجرات کی علمی اور ادبی خدمات پر ایک بصیرت افروز معلوماتی مقالہ انگریزی زبان میں شایع کیا تھا، اپنے ایک اور انگریزی مقالے میں انہوں نے "گجرات کا گوجری ادب" میں بھی اس پر روشنی ڈالی ہے جسکا اردو ترجمہ انہی کے قلم سے کراچی کی انجمن ترقی اردو پاکستان کے رسالہ اردو میں شایع ہوا[۱۴]۔

ان کوششوں کے بعد گجرات میں اس موضوع پر مزید کام کرنے والا کوئی نظر نہیں آتا۔ دکن میں نصیر الدین ہاشمی مرحوم، سید محی الدین قادری زور مرحوم اور ان کے رفقا اور شاگردوں نے دکنی زبان کی تاریخ میں مولوی عبدالحق کے کام کو آگے بڑھانا اپنی زندگی کا نصب العین قرار دیا اور دکنی زبان کے بیسیوں مخطوطات کو گوشۂ گمنامی سے نکال کر ان کو شایع کیا اور دکنی زبان و ادب کی تاریخ اور لغت وغیرہ مرتب کی۔ اس کے برعکس بدقسمتی سے گجرات اس قسم کی فداکارانہ کوششوں سے بیگانہ رہا۔ ڈاکٹر

ظہیر الدین مدنی صاحب مرحوم کی سخنوران گجرات البتہ گجرات میں اردو زبان و ادب کی تاریخ کی ایک مستند اور مفید تالیف ہے، لیکن جہاں تک گجرات میں اردو کے ابتدائی یعنی گوجری دور کا تعلق ہے وہ جیسا کہ سطور آیندہ سے عیاں ہوگا پیشروؤں کی دی ہوئی معلومات میں کچھ بھی اضافہ نہیں کر سکی۔

اردو زبان کی تاریخ سے متعلق مرتبین کا خیال ہے کہ گوجری ادب کی تشکیل دسویں صدی کے اواخر اور گیارہویں صدی کے اوائل میں ہوئی اس سے قبل اور مابعد کا زمانہ (ولی گجراتی اور امین گجراتی یعنی بارہویں صدی کی ابتدا تک) گوجری ادب سے خالی ہے۔ اس غلط خیال کے رواج پانے کی وجہ گوجری تالیفات کا منظر عام پر نہ آنا ہے۔ گوجری زبان کی نویں صدی سے قبل ادبی تشکیل ہو چکی تھی لیکن اس دور کی ادبی نگارشات کی بازیافت تو کیا نشاندہی بھی نہیں کی گئی اور ان میں اکثر و بیشتر دستبرد زمانہ کی نذر ہو گئیں۔ گجرات میں بارہویں صدی ہجری کے نصف دوم کے سیاسی حالات، مرہٹوں کی لوٹ مار وغیرہ کے دوران خانقاہ حضرت شاہ عالم (م ۸۸۰ھ) اور دیگر خانقاہوں کے قیمتی مخطوطات کے ذخیرے جن میں یقیناً گوجری کی کتابیں بھی ہوں گی وہ شاہ بہاء الدین باجن (م ۹۱۲ھ) شاہ علی جیو گام دھنی (م ۹۷۳ھ) قاضی محمود دریائی بیرپوری (م ۹۴۱ھ) اور شاہ خوب محمد چشتی (م ۱۰۲۳ھ) کے مدون اور غیر مدون کلام کو چھوڑ کر ضائع ہو گئے۔

بہر حال یہ حقیقت ہے کہ کم از کم گوجری ادب کے دسویں صدی قبل کے ادبی آثار یا زبان کے نمونے بہت کم دستیاب ہوئے ہیں، اردو زبان کی تاریخ کا ایک عام قاری محض شاہ بہاء الدین باجن (م ۹۱۲ھ) قاضی محمود دریائی بیرپوری (م ۹۴۱ھ) شاہ علی جیو گام دھنی (۹۷۳ھ) اور خوب محمد چشتی (م ۱۰۲۳ھ) کے گوجری کلام یا مستقل تصانیف

کے ناموں یا ان کے نمونۂ کلام سے آشنا ہیں۔ جیسا کہ سطور بالا میں عرض کیا جا چکا ہے نویں صدی ہجری کے گوجری زبان کے جملوں اور دوہے جو حضرت سید برہان الدین عبداللہ قطب عالم بخاری (م ۸۵۰ھ) اور ان کے صاحبزادے حضرت سید سراج الدین محمد شاہ عالم (م ۸۸۰ھ) وغیرہ کے کہے ہوئے ہیں، ان کو بابائے اردو مولوی عبدالحق نے اپنی مختصر لیکن جامع اور اہم کتاب اور حافظ محمود خاں شیرانی صاحب مصنف "پنجاب میں اردو" نے اپنے مضمون گوجری یا گجراتی اردو سولہویں صدی عیسوی میں نقل کیے ہیں، شیرانی صاحب کا مضمون لاہور کے اورینٹل کالج میگزین کے نومبر ۱۹۳۰ء اور فروری ۱۹۳۱ء کے شمارے میں شایع ہوا ہے[۵]۔ اسی صدی کے نصف دوم میں گجرات کے مایۂ ناز عالم اور استاد الاساتذہ حضرت شاہ وجیہ الدین علوی صاحب (م ۸۹۸ھ) کے بھی اسی زبان کے اقوال ملتے ہیں جو ان کے فارسی ملفوظ کی کتابوں میں ملتے ہیں، ان میں سے صرف ایک ملفوظ بحر الحقائق کے گوجری زبان کے نمونے کچھ سال پیشتر مولانا عبدالرحمٰن پرواز اصلاحی مرحوم نے مہاتما گاندھی میموریل ریسرچ سینٹر بمبئی کے رسالہ "ہندوستانی" میں شایع کیے تھے لیکن یہ بھی حقیقت کہ ہماری موجودہ معلومات کی روشنی میں مستقل گوجری تصنیفات میں صرف شاہ علی جیو گامدھنی کی جواہر اسرار اللہ اور شاہ خوب محمد چشتی کی خوب ترنگ کو جو گجرات میں شایع ہوئی تھی چھوڑ کر مستقل ادبی تالیف سے ہم ناآشنا ہیں۔ ان کتابوں میں خوب محمد چشتی کی "خوب ترنگ" کے سوا کوئی کتاب طباعت سے آراستہ نہیں ہوئی لیکن اس کی طباعت اول کا علم بھی بہت کم لوگوں کو ہونا تو سمجھ میں آسکتا ہے لیکن تعجب ہے کہ بمبئی کے ڈاکٹر علی محمد عالی جعفر بھٹ کے مرتب کردہ اس کے تنقیدی ایڈیشن کا علم بھی کم ہی لوگوں کو ہے جس کو گجرات اردو اکادمی کے سرگرم رکن، گجرات ودیا پیٹھ کے وظیفہ یاب

صدر شعبۂ اردو اور درگاہ حضرت پیر محمد شاہ کے کتب خانہ کے اعزازی نگراں پروفیسر محی الدین بمبئی والا کی مساعی جمیلہ سے اردو اکادمی گجرات اسٹیٹ نے حال ہی میں شایع کیا ہے۔

نویں صدی ہجری کے ان منتشر اقوال، جملوں اور بعض شعروں کے علاوہ گوجری ادب کی کوئی چیز ہمارے سامنے نہیں آئی۔ مثلاً سلطان قطب الدین احمد شاہ دوم کے شاہ عالم کی مدح میں کہے ہوئے قصیدے کے دو شعر ہیں جن کی طرف سب سے پہلے ڈاکٹر سید اکبر علی صاحب ترمذی نے اپنے مقالے جلالی احمد آبادی میں توجہ دلائی تھی[۹]۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ کم از کم نویں صدی ہجری میں گوجری زبان ایک ادبی حیثیت اختیار کر چکی تھی۔ اس کے شواہد کا ذکر میرے اس مختصر مقالے کا موضوع ہے۔ مجھے ان دنوں ہمہ گیر یا کم از کم وسیع طور پر مروج جکریوں کی صورت میں گوجری کے دو نمونے اور دیگر جکریوں کی تصنیف و تالیف کے شواہد ملے ہیں[۱۰]۔ احمد آباد کے مشہور بزرگ حضرت شاہ عالم کے منشی خاص دولت شاہ آفرید کا جمع کردہ ملفوظ کنوز محمدی (نویں صدی ہجری) بدقسمتی سے دستیاب نہیں ہے۔

خوش قسمتی کی بات یہ ہے کہ شاہ عالم صاحب ۸۶۰ھ سے مستقل طور پر نماز جمعہ اور قبل عصر عوام و خواص کو باریاب فرماتے تھے۔ اس وقت ان با تعظیم لیکن ایک گونہ بے تکلف مجلسوں میں مختلف موضوعات پر جو سوال و جواب اور تصوف کے اسرار و غوامض کی تشریح و توضیح ہوتی تھی اور فقہی مسائل اور ارکان دین پر بحث و مباحثہ ہوتا تھا یا صاحب مجلس کے عربی فارسی رسالوں اور اقوال کی قرأت ہوتی تھی یا ان کی مدح میں مریدین اور دیگر شعرا جو کلام سناتے تھے، اس قسم کے تفصیلی حالات کنوز محمدی سے لے کر مزید اضافوں اور معلومات کے ساتھ حضرت شاہ عالم صاحب کے سجادہ اور معروف و مشہور عالم و مصنف

فارسی اور گوجری کے شاعر سید محمد مقبول عالم المتخلص بہ جلالی (م ۱۰۴۵ھ) نے جمعات شاہیہ کے نام سے ایک مجموعہ فارسی میں مرتب کیے تھے۔ انہوں نے چھ سال کے جمعات کی مجلسوں کے حالات کی چھ جلدیں مرتب کرلی تھیں لیکن ساتویں جلد نامکمل چھوڑی جس کی تکمیل ان کے پوتے اور صاحب سجادہ، محدث، عالم، مصنف، فارسی اور گوجری کے شاعر سید جعفر بدر عالم نے کی کچھ عرصہ پہلے تک ان سات جلدوں میں سے لگ بھگ چوتھی اور پانچویں جلدوں کے وجود کا علم تھا اور ایک جلد کا پتہ لگ بھگ ۱۹۱۵ء میں چلا۔ باقی جلدیں نایاب تھیں۔ خوش قسمتی سے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کی مولانا آزاد لائبریری کے دو ذخیروں میں اس کی دو جلدیں چھٹی اور ساتویں دستیاب ہوئی ہیں، ان میں ایک تو وہی ہے جس کی نشاندہی ۱۹۱۵ء کے لگ بھگ ہوئی تھی۔

چھٹی جلد کے مطالعے سے گوجری زبان و ادب کے گجرات میں چلن کا پتہ چلتا ہے خود حضرت شاہ عالم صاحب کے حلقے میں گوجری زبان اور اس کی مخصوص صنف جکری کا نہایت وسیع اور زیادہ رواج تھا۔ اس کتاب میں صرف ان حالات یا واقعات کا ذکر ہے جو حضرت شاہیہ کی جمعہ کی مجلسوں میں پیش آئے اور جو ان سے ہی متعلق تھے لیکن اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ اس زمانے میں گوجری زبان عوام وخواص کی مروجہ زبان تھی۔

جمعات شاہیہ کی اس جلد میں کم از کم چار پانچ گوجری نظمیں یا موسیقی کے سروں تانوں اور لے پر بٹھائی ہوئی مخصوص ۔ ۔ ۔ نظم کا ذکر ہے۔ ان میں سے دو جکریاں پوری کی پوری اس کتاب میں درج ہیں۔ ان جکریوں کے کہنے والوں میں عوام وخواص دونوں شامل ہیں۔ ان میں ایک ملک مبارک بن کالو ہے جس کے نام سے شہر احمد آباد کا

مشہور محلہ کالوپور موسوم ہے وہ سلطان محمود بیگڑہ امیر ملک کالو کا بیٹا تھا۔ جمعات شاہیہ میں مذکور ہے کہ مبارک کالو نے بھی متعدد بار حضرت شاہ عالم کے سامنے جکریاں سنائیں۔ جمعات شاہیہ میں ایک جگہ لکھا ہے کہ مرید خاص مبارک کالو آپ کی مدح میں جکری کہہ کر تان باندھ کر لایا تھا جسے آپ کو سُنایا۔

خود حضرت شاہ عالم کے اشعار بھی جمعات شاہیہ میں مذکور ہیں۔

قوالوں نے ایک مرتبہ حضرت سرور عالم کی مدح میں کہے ہوئے اشعار کو جو حضرت شاہ عالم صاحب کی زبان پر آئے تھے سُنایا جن کو آپ نے کھڑے ہو کر پوری توجہ اور تعظیم سے سُنا۔ اس کا ایک شعر یوں ہے:

خلیل اللہ کل ملک دنا را شاہ رسل جی واٹ ادھارا

ایک اور جکری گو شاعر شیخ بابو ہیں جنھیں حضرت شاہ عالم سے عقیدت تھی مولف جمعات شاہیہ رقمطراز ہیں کہ اس دوران آپ کے یعنی شاہ عالم کے وزیر با اعتقاد حضرت میاں مخدوم نے شیخ نام ایک عزیز کو جو مولانا جانی کے نواسے تھے آپ کی ملازمت میں پیش کیا۔ وہ حضرت شاہ عالم کی مدح میں جو جکری کہہ کر لایا تھا اسے سُنایا۔ جکری یوں ہے:

دیہے بیٹھے بیٹا بلائے تم بن سائیں پیٹر نہ جائے
سمرن کرنے تن بدن لیتی جانی ہیٹرا کی جن دیتی
پنجر پس نہ دیکھے کوئی اوکھ لائیں کھو گیا کوئی
کرتا ک کبھی کھو سکھ کدھیا جیوڑے انکیت ہے بلی سدھیا
حسن جمال دیا تیرے ہوئے کیورے بجھاوے دوجا کوئے
دکھ نہ جانیں بانہا تولیں جیو سدھارے جاناں بولیں

قطب برہان کا پوت سو پیارا　　جو سوہی جانیں دکھ ہمارا
بابو جنھوں لاگے پائے　　منجھن میری پیٹر بنچھانے

ان کے علاوہ مولانا شرف الدین نامی ایک صاحب نے گوجری میں جکری تصنیف کی جس کی دھن باندھ کر حضرت شاہ عالم صاحب کو سُنائی گئی۔

خود حضرت شاہ عالم صاحب بھی گوجری جکریاں تصنیف کیا کرتے تھے۔ صاحب جمعات شاہیہ فرماتے ہیں کہ حضرت شاہیہ کی روایت کے مطابق انہوں نے اپنے بچپن میں ایک جکری حضرت رسالت آبؐ کی شان میں کہی تھی، اس کے چھ اشعار بھی انہوں نے اپنی کتاب میں درج کیے ہیں۔ جمعات شاہیہ میں ہے کہ:

" حضرت شاہیہ فرمودند در صغر سن . . . جکری بنام سلطان الانبیاؐ سرودہ بستہ بودم"۔ یعنی حضرت شاہیہ نے فرمایا میں نے بچپن میں سلطان الانبیاؐ کے نام ایک جکری دھن پر باندھی تھی یہ جکری اس طرح ہے:

نس جاکندری میں کچھ دیٹھا　　مسی میرنی تہس ہی میٹھا
جب میں ہنس ہنس اتر کیتا　　جب یہ جیو بدھاوی دیتا
جگ سبا ہی لاکھوں پائے　　اسبا بسر جن دین ہتائے
بہوت لاڑ لیوں بچپنا لادھا　　کھینچ انچل میں اس سوں باندھا
شاہ رسول ہوں بلہارا　　میں کوں لائیں اس کی بارا

ظاہر ہے حضرت شاہ عالم صاحب کی طبع موزوں نے گوجری زبان میں جکریاں یا اشعار کہنے کا سلسلہ ضرور جاری رکھا ہوگا اور وہ ان کے ملفوظ اور دیگر کتابوں میں درج کیے گئے ہوں گے لیکن بدقسمتی سے کچھ تو زمانے کے حوادث اور اسلاف کی

بے توجہی کی نذر ہو کر تلف ہو گئیں اور بچی کھچی صاحبان سجادگان کے بخل سے منظر عام پر نہیں آسکیں۔ محترم ڈاکٹر ضیاء الدین ڈیسائی صاحب نے مجھے بتایا کہ حضرت شاہ عالم کے موجودہ سجادہ حضرت موسیٰ میاں صاحب رضوی مدظلہٗ کے کتاب خانے میں جمعات شاہیہ کی ایک جلد ہے لیکن آج تک اس جلد کی زیارت نہ ہو سکی لہذا یہ بھی نہ معلوم ہو سکا کہ یہ کون سی جلد ہے۔ انہوں نے یہ بھی بتایا کہ احمد آباد کے مشہور چشتی خانوادہ کے ایک بزرگ حضرت شیخ رشید الدین مودود لالا کی تیرہویں صدی ہجری میں تصنیف کردہ ہندوستان بالخصوص گجرات اور احمد آباد کے بزرگوں کے حالات اور نادر معلومات پر مشتمل نہایت ہی اہم اور ضخیم کتاب "مخبر الاولیا" میں گجرات کے بعض بزرگوں کے گوجری کلام کے بارے میں بہت مفید اور نایاب معلومات درج ہیں۔ غالباً مصنف کا خود نوشت اس کا نسخہ شاہی باغ احمد آباد میں واقع خانقاہ چشتیہ میں موجود ہے۔ مگر بدقسمتی سے اس کتاب تک بھی ہماری رسائی نہیں ہوئی ۔ اس کے ایک نہایت ہی ناقص اور غلط مگر نسبتاً جدید نسخے کو دیکھنے کا موقع ڈیسائی صاحب کو ملا ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ اس کتاب میں گجرات کے کئی بزرگوں کے گوجری اشعار کہنے کا ذکر ہے۔ مثلاً اورنگ زیب کے عہد کے مشہور عالم و فاضل شیخ عبد الفتاح عسکری جو مولانا روم کی مثنوی کے مشہور شارح اور مثنوی داں کے لقب سے مشہور ہیں ان کے بھی گوجری اشعار اس میں نقل کیے گئے ہیں۔ اس کے علاوہ خود دسویں صدی ہجری کے شیخ عیسیٰ چشتی اور دیگر بزرگوں کی جکری گوئی کا ذکر ہے۔ نیز کچھ اور بزرگوں مثلاً شاہ علی جیوگام دھنی کے بھی حسب موقع گوجری اشعار اور اقوال نقل کیے ہیں۔ ان میں قابل ذکر اس منظوم مکالمہ کا ٹکڑا ہے جو ان کے اور شاہ وجیہ الدین علوی صاحب کے

پیرومرشد اور شطاری سلسلے کے مشہور و معروف بزرگ شیخ محمد غوث گوالیاری کے درمیان احمد آباد کے شہر دہلی دروازے کے قریب ہوا۔

سطور بالا میں اشارہ کیا جا چکا ہے کہ آٹھویں نویں صدی ہجری کے مغربی سلسلے کے بزرگ شیخ احمد کھٹو جو اپنے زمانے کے ایک بڑے برگزیدہ ولی ہوئے ہیں اور جن کا مزار مبارک احمد آباد سے متصل سرکھیج نامی گاؤں میں واقع ہے۔ انہوں نے بھی گوجری زبان میں کچھ دوہے اور اشعار وقتاً فوقتاً کہے ہیں۔ ان میں سے کچھ آپ کے ملفوظ مرقاۃ الوصول الی اللہ والرسول میں ملتے ہیں۔ مثلاً ایک بار کسی شاعر نے آپ کے سامنے یہ شعر پڑھا:

تو جانا کرتا رجی مجھ سائیں بے پیرا ساس سری سی سار کرو تمہاری بالہا

اس کے جواب میں آپ نے یوں فرمایا:

تو جانا کرتا رجی مجھ سائیں بے پیرا سائیں کی ہے سار با نجر باہا جو من بستا

ایک بار ایک لڑکی کی آنکھ میں لگے ہوئے کاجل کو ناپسند فرماتے ہوئے آپ نے کہا:

دو کھا (دوکھا) کاجل جو کرو ن تو سو کن سکھ دینا نہ پیو دیکھن دیکھیں مجھ نہ آپ دیکھ سکیں

بھوں بوجھوں پند تا دو دن کیتی ماس دیا بجھری ایک نل جانوں برس پچاس

اس کے علاوہ بھی آپ کے اشعار ملتے ہیں۔

یہاں جملہ معترضہ کے طور پر ایک اور مفروضہ کی طرف اشارہ کرنا بے جا نہ ہوگا۔ عام طور پر یہ مانا جاتا ہے کہ گیارہویں صدی ہجری کے اواخر کے ولی گجراتی سے پہلے گوجری ادب کا سرچشمہ خشک ہو چکا تھا۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ گیارہویں صدی میں شاہ خوب محمد چشتی (م ۱۰۲۳ھ) کے ہم عصر مگر عمر میں چھوٹے سید محمد مقبول عالم جلالی (م ۱۰۴۵ھ) جن کا ذکر سطور بالا میں آچکا ہے وہ بھی گوجری میں اشعار کہتے تھے۔ ان کے پوتے جن کا

آگے ذکر آچکا ہے، سید جعفر بدر عالم نے سادات بخاری، رضوی شاہی کے حالات میں آنحضرت ﷺ سے لے کر حضرت شاہ عالم تک کے حالات اور ان کے سلسلے کے بزرگوں کے اقوال و عقاید اور تصوف کے نکات اور متعلقہ بیسیوں امور پر ایک کتاب لکھی تھی جس کو انھوں نے روضات شاہی نام دیا تھا۔ کتاب کی ضخامت کے پیش نظر انھوں نے اس کو چوبیس حصوں میں ترتیب دیا۔ اس کتاب کی جلدوں کا پتہ نہیں چلا۔ ابھی ایک سال قبل تک اس کی ایک ناقص الوسط اور ناقص الآخر جلد کا پتہ تھا جو احمد آباد کے مشہور قاضی خاندان کے کتب خانہ میں موجود تھی اور اب نیشنل آرکائیوز آف انڈیا کے کتب خانے میں ہے[۷]۔ اس کی پہلی جلد کے وجود کا پتہ حال ہی میں چلا ہے، یہ کراچی کے ہمدرد یونیورسٹی کے کتب خانے میں ہے۔ اس کے نسخے کا تعارف جناب خضر نوشاہی صاحب معارف کے ایک شمارے میں کرا چکے ہیں[۸]۔ سنا ہے کہ حضرت موسیٰ میاں رضوی سجادہ نشین خانقاہ شاہ عالم کے کتب خانے میں اس کی چھ، سات جلدیں ہیں، ان تک رسائی نہیں ہو سکی۔ بہر حال نیشنل آرکائیوز والے نسخہ روضات شاہی کے آخر میں سید محمد مقبول عالم جلالی (م ۱۰۴۵ھ) ان کے صاحبزادے اور مغل بادشاہ شاہجہاں کے صدر الصدور سید جلال مقصود عالم المتخلص بہ رضا (م ۱۰۵۷ھ) اور ان کے صاحبزادے سید جعفر بدر عالم المتخلص بہ صفا (م ۱۰۸۹ھ) اور ان تینوں کے جد امجد حضرت شاہ عالم کی مدح میں کہے ہوئے فارسی اور گوجری اشعار درج ہیں[۹]۔ اس حصے کی زیروکس کاپی محترم ڈیسائی صاحب نے حاصل کر کے درگاہ حضرت پیر محمد شاہؒ کے کتب خانے کو دی ہے۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ گیارہویں صدی ہجری میں بھی گوجری زبان کی شاعری کا چلن حسب دستور جاری رہا۔ اگر باقاعدہ تلاش و تفتیش کی جائے تو مزید معلومات کے انکشاف کا قوی امکان ہے۔

اسی طرح دلی کے بعد تا حال گجرات میں اردو ادب کے جائزے کے موضوع پر ڈاکٹر ظہیر الدین مدنی صاحب کی سخنوران گجرات ایک بڑا علمی کارنامہ ہونے کے باوجود کماحقہ روشنی نہیں ڈال سکی۔ مثال کے طور پر مدنی صاحب نے حضرت پیر محمد شاہ تخلص اقدس کے گوجری کلام کا تو سرسری طور پر ہی سہی ذکر کیا ہے لیکن ان کے ایک ڈیڑھ درجن مریدوں کے جن میں خواتین بھی شامل ہیں اپنے پیر و مرشد کی مدح میں کہے ہوئے قصاید و مراثی کو بالکل نظر انداز کر دیا ہے۔ ان نظموں اور مرثیوں کے مجموعے درگاہ حضرت پیر محمد شاہ کے کتبخانے میں موجود ہیں۔ اسی طرح تیرھویں صدی کے اواخر اور چودھویں صدی کے اوائل کے متعدد اردو شعرا کے ذکر سے بھی سخنوران گجرات خالی ہے۔ مدنی صاحب مرحوم کی نظر سے جلوۂ یار، پیام یار وغیرہ جیسے میرٹھ، لکھنؤ وغیرہ مقامات سے شایع ہونے والے طرحی رسالے نہیں گزرے۔ ان میں گجرات کے مختلف مقامات احمد آباد، بھڑوچ، سورت، بیرگام، بیتھاور، جوناگڈھ، راموں وغیرہ دور افتادہ شہروں اور چھوٹے گاؤں کے رؤسا، مدرس، پوسٹ مین، پولس کانسٹبل، کتاب فروش، گل فروش وغیرہ مختلف طبقے کے لوگوں اور پیشہ وروں کی غزلیں شایع ہوتی رہی ہیں۔ ان غزلوں کا ان رسالوں میں شایع ہونا ہی خود ان کے معیار کی ضمانت ہے، اس موضوع پر بھی تلاش و تفتیش سے مزید معلومات حاصل کرنے اور انہیں منظر عام پر لانے کی ضرورت ہے۔

مندرجہ بالا معروضات سے ثابت ہوتا ہے کہ گوجری زبان نویں صدی ہجری کے نصف اول میں جو بیجاپور میں شاہ میراں جیو شمس العشاق کے غالباً بچپن کا زمانہ تھا صرف بول چال کی حد تک ہی نہیں بلکہ ایک ترقی یافتہ ادبی شکل اختیار کر چکی تھی اور اس عہد کے نمونوں کے پیش نظر یہ کہنا بیجا نہ ہوگا کہ اس کی ادبی تشکیل اس سے بھی کافی پہلے

تھی۔ اس موضوع پر مزید تلاش و تحقیق سے معلومات میں نہ صرف اضافہ ہو سکتا ہے بلکہ اردو ادب کی نشو و نما میں گجرات کا جو اہم حصہ رہا ہے اس سے اردو دنیا اچھی طرح سے روشناس ہو سکتی ہے۔

حوالے

لہ انگریزی رسالہ ایپیگرافیا انڈیکا عربی اینڈ پرشین سپلیمنٹ (کتبہ ہائے ہند کا عربی اور فارسی ضمیمہ) ۱۹۶۱ ص ۲۴-۱۰ نیز جرنل آف دی اورینٹل انسٹی ٹیوٹ، مہاراجہ سایاجی راؤ یونیورسٹی، بڑودہ۔ اس کی کچھ تفصیلات کے لیے دیکھئے: سخنوران گجرات، از ڈاکٹر سید ظہیر الدین مدنی، ترقی اردو بیورو، نئی دہلی سنہ ۱۹۸۰ء ص ۳۴-۳۲ سے ایضاً ص ۱۹ تصویر ۶۔ اے سے اس کتاب کی افادیت اور مقبولیت کا اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس کا تیسرا ایڈیشن اہم اضافوں کے بعد مجلس تحقیقات و نشریات اسلام لکھنؤ کی جانب سے سنہ ۱۹۸۳ء میں اور اس کا گجراتی ایڈیشن بلساڑ، گجرات سے شایع ہوا کہ سخنوران گجرات: ص ۷ شہ مقالات شیرانی، مرتبہ مظہر محمود شیرانی، مجلس ادب لاہور جلد اول سنہ ۱۹۶۶ء، مقالہ "گوجری یا گجراتی اردو دسویں صدی عیسوی میں" ص ۲۰۰-۱۵۹ سے اسلامک کلچر حیدرآباد جلد ۲۷/ ۱۹۵۳ء ص ۳۶-۱۸، اردو کراچی سنہ ۱۹۵۳ء سے اس بات کا بہت کم لوگوں کو علم ہے کہ خود حضرت قاضی محمود دریائی کے خاندان کے افراد اور مریدین بھی گوجری میں فکریاں کہتے تھے، مولوی عبدالحق اور حافظ محمود خاں شیرانی صاحب نے تو قاضی محمود دریائی کے ملفوظ مفتاح القلوب اور ان کے حالات پر مشتمل تصنیف تحفۃ القاری نہیں دیکھی لیکن ڈاکٹر ظہیر الدین مدنی صاحب نے اپنی کتاب سخنوران گجرات میں تحفۃ القاری کا حوالہ دیا ہے۔ معلوم ہوتا ہے مدنی صاحب نے اس کے نسخے کا بغور مطالعہ نہیں کیا، ان کتابوں میں کم از کم مذکور پانچ حضرات کی گوجری زبان میں کئی پوری فکریاں موجود ہیں۔ ان کتابوں کے نسخے احمد آباد میں درگاہ

حضرت پیر محمد شاہ میں موجود ہیں اور تحفۃ النصاری کا ایک نسخہ بمبئی کی رائل ایشیاٹک سوسائٹی کے
کتاب خانے میں بھی ہے۔ تحفۃ النصاری کی اشاعت کا درگاہ حضرت پیر محمد شاہ ٹرسٹ کی جانب سے
اہتمام ہو رہا ہے اور امید ہے کہ انشاء اللہ سال آئندہ کے اوائل میں اس کا مطبوعہ نسخہ منظر عام
آجائے گا ۵ دیکھئے نوٹ نمبر ۵ ۹ نوائے ادب بمبئی، جنوری اپریل ۱۹۵۱ء، وغیرہ ۱۰ لفظ
جکری کو جگری یا دل سے نکلی ہوئی بات یا ذکری کی بگڑی ہوئی شکل بتایا گیا ہے۔ دیکھئے سخنوران
گجرات ص ۵۰۔ ضیاء الدین ڈیسائی صاحب نے جمعات شاہیہ جلد ششم کے علی گڑھ نسخے میں اس
املا جکڑی کا حوالہ دے کر یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ "یہ جکری" یعنی چکر (چرخ) سے ہے اور
انہوں نے اس کو مولانا جلال الدین رومی کے WHIRLING DARWISHES
کے نہج پر صوفیائے کرام کے حلقوں میں رقص کے ساتھ گائی جانے والی تالبدہ تصنیف بتایا ہے
دیکھئے شاہ بہار الدین باجن زندگی اور کلام۔ از ڈاکٹر شیخ فرید، مطبوعہ درگاہ شریف
حضرت پیر محمد شاہ ٹرسٹ احمد آباد ۱۹۹۲ء مقدمہ ص ۱۸-۴ ۱۱ حوالوں کے لیے دیکھئے
دیوان جلالی احمد آبادی، سید مقبول احمد رضوی (شاہی)، مرتبہ پروفیسر محی الدین بمبئی والا مط
درگاہ حضرت پیر محمد شاہ ٹرسٹ، احمد آباد ۱۹۹۵ء ص ۱۴ ITRODUCTION BY DR.
Z. A. DESAI ۱۲ دیکھئے معارف اکتوبر ۱۹۹۳ء ۱۳ ڈاکٹر سید اکبر علی ترمذی صاحب
اپنے مضمون میں اس کا ذکر کیا ہے۔ نوائے ادب ممبئی جنوری، اپریل ۱۹۵۱ء۔

ف...ارف کی ڈاک

مکتوب علی گڑھ

جون ۱۹۹۷ء

مکرمی و محترمی، السلام علیکم

جون ۱۹۹۷ء کے معارف میں جناب گوردیال سنگھ مجذوب کا مضمون "لفظ کہف"
ندوستانی ماخذ نظر سے گزرا۔ اس میں تحریر کردہ دیگر امور سے قطع نظر جہاں تک
ن 'واو' کے حرف 'ف' میں تبدیل کیے جانے کا تعلق ہے اصلی صورت حال یہ ہے
رب حرف W کو نہیں بلکہ صرف حرف V کو ف میں تبدیل کرتے ہیں اور اس کا
سد W اور V کے درمیان امتیاز کرنا ہوتا ہے اسی لیے WAVELL میں
واو ہی رہا البتہ V ف ہو گیا یعنی عرب فیفل نہیں لکھتے ہیں، ولفل لکھتے ہیں۔
معاملہ لفظ SHIVA کے ساتھ بھی ہے۔ مہادیو کو بھی عربوں نے رومن رسم خط
پڑھا ہوگا یعنی MAHADEV۔ اس لیے V کو ف میں تبدیل کر دیا۔ یہ بات
پر صادق نہیں آتی ہے۔ اس لیے کہف کی اصل کھوہ قرار دینا محض قیاس آرائی
اسکے لیے مزید ثبوت درکار ہے۔

نیاز مند

ریاض الرحمن شروانی

مکتوب دہلی

ابوالفضل انکلیو، نئی دہلی

۲۵ جون ۹۷ء

جناب ضیاء الدین اصلاحی صاحب! السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

جناب گوردیال سنگھ مجذوب صاحب (معارف جون ۱۹۹۷ء ص ۴۵۹) فرماتے ہیں کہ عرب حرف "واؤ" کو "ف" میں بدل دیتے ہیں، جس کی انہوں نے "دیول" اور "شیوا" سے مثال دی ہے۔

یہ تبصرہ درحقیقت ایک غلط فہمی پر مبنی ہے جس کا ازالہ ضروری ہے۔ ہندوستان کے بہت سے عربی داں عربی لکھتے ہوئے اس غلطی کا ارتکاب کرتے ہیں۔ حرف "واؤ" کو "ف" میں بدلنے کا کلاسیکل عربی میں کوئی رواج نہیں ہے اور نہ ہی شاید اس کی کوئی پرانی مثال دی جاسکتی ہے۔ دراصل جب پچھلی دو صدیوں سے عربوں کو یوروپین زبانوں سے واسطہ پڑا اور انہیں یوروپین الفاظ عربی زبان میں لکھنے پڑے تو ان کے سامنے یہ مسئلہ پیش آیا کہ "ڈبلیو" (W) و "وی" (V) کو صحیح طریقے سے کس طرح منتقل کیا جائے کہ پڑھنے والے جان جائیں کہ یہ W ہے یا V۔

یہ کام زیادہ تر مصر میں انجام پا رہا تھا اور وہاں کے خواص نے انگریزی سامراج کے تسلط کے خلاف خاموش احتجاج کے طور پر انگریزی کے بجائے فرانسیسی زبان یوروپ سے علمی تعلق قائم کرنے کے لیے اپنائی تھی۔ اس لیے فرانسیسیوں کی نقل کرتے ہوئے "V" کو "ف" کی طرح لکھا جانے لگا۔ (فرانسیسی "V" کو F کی طرح بولتے ہیں)۔ اس کی تقلید میں ہمارے بعض ہندوستانی عربی داں لوگوں نے ایسے ہندوستانی الفاظ کو جو انگریزی میں

"S" سے لکھے جاتے ہیں (مگر دراصل "W" کی طرح بولے جاتے ہیں) عربی میں "ف" سے لکھنا شروع کر دیا مثلاً "شیوا" کے بجائے "شیفا"، جبکہ صحیح یہ تھا کہ اس کو "شیوا" ہی لکھا جائے تاکہ اگر عربی سے کسی اور زبان میں اس کا ترجمہ ہو تو SHIFA نہ ہو جائے۔

والسلام : ظفر الاسلام خان

مکتوب مدراس

۲۰ محرم ۱۴۱۸ھ / ۴ جون ۱۹۹۷ء

مدراس

محترم جناب ضیاء الدین اصلاحی صاحب! السلام علیکم

امید ہے کہ مزاج بخیر ہوگا۔

مارچ ۱۹۹۷ء کا "معارف" پیش نظر ہے، جناب توقیر احمد اعظمی ندوی علی گڑھ کے مضمون 'ہندوستان میں عربی سیرت نگاری' (صفحہ ۲۱۳ - سطر ۸) میں تحریر ہے "شیخ احمد بن صبغۃ اللہ مدراسی کی "تاریخ احمد" قابل ذکر ہے"۔ تاریخ احمد کے متعلق تفصیل معلوم ہو جائے تو عین نوازش ہوگی۔

حاجی احمد بن مولانا صبغۃ اللہ امام العلماء قاضی بدر الدولہ کی ایک تالیف 'تاریخ احمدی' بہ زبان فارسی خاندانی کتب خانہ میں موجود ہے، اس مخطوطہ میں صرف اہل عشیرہ کا تذکرہ ہے۔

البتہ قاضی بدر الدولہ نے سیرت النبیؐ پر ایک ضخیم کتاب فوائد بدریہ ۱۲۵۵ھ میں تالیف کی تھی۔ پہلی طباعت ۱۲۶۳ھ میں ہوئی، غالباً زبان اردو میں سیرت النبیؐ پر پہلی کتاب ہے ؟ یہ چار ابواب پر مشتمل ہے۔ اس کتاب کے کئی اڈیشن طبع ہوئے ہیں۔ پہلا باب جو نبی کریمؐ کی بعثت سے رحلت تک کے واقعات پر مشتمل ہے، انجمن اصلاح

العشیرہ حیدرآباد (اے۔پی) کی جانب سے ۱۴۱۶ھ میں طبع کیا گیا ہے۔

قاضی بدرالدولہ (المتوفی ۱۲۸۰ھ) عالم اسلام کے مشہور محقق ڈاکٹر محمد حمید اللہ (پیرس) کے دادا اور حاجی احمد (المتوفی ۱۳۰۶ھ) حقیقی چچا ہوتے ہیں۔

آپ کا مخلص

عبیداللہ (خریدار نمبر ۱۴۲۳ ۔ ای)

مکتوب لکھنؤ

لکھنؤ

۲۸ جون ۱۹۹۷ء

فاضل گرامی قدر جناب مولانا ضیاء الدین اصلاحی صاحب! زید مجدہٗ السلام علیکم و رحمۃ اللہ و برکاتہٗ

امید ہے مزاج گرامی بخیر ہوگا۔

معارف کا تازہ شمارہ (جون) دیکھا، اس میں آپ نے دارالمصنفین کی بنیاد کس نے ڈالی کے عنوان سے ہماری قلمی لغزش پر تنبیہ کیا ہے، جزاکم اللہ حیرت ہے کہ کیسے یہ جملہ ہمارے قلم سے نکل گیا، اتنی بدیہی حقیقت ہماری نظروں سے اوجھل رہی، قلم کی لغزش ہی ہے اور کچھ نہیں ورنہ ہم سب اس حقیقت سے اچھی طرح واقف ہیں کہ علامہ شبلی ہی نے اسکی بنیاد ڈالی تھی، آپ سے دو سال کے اندر برابر ملاقاتیں ہوتی رہیں لیکن آپ نے اس لغزش کی طرف ہمیں متوجہ نہیں فرمایا[۱]، ورنہ اسی وقت اس غلطی کا ازالہ رسالہ میں شایع کرادیا جاتا۔

ہم ایک مراسلہ اڈیٹر نیا دور کو بھی لکھ رہے ہیں۔　　والسلام

مخلص: نذرالحفیظ ندوی

---

[۱] آپ کا مضمون نیا دور میں سرسری دیکھا تھا، اب ڈاکٹر ابرار اعظمی جو اردو کے اچھے شاعر و نقاد ہیں کے استفسار پر اس کی طرف توجہ ہوئی۔ "ض"

وفیات

مولانا قاضی محمد زاہد الحسینی

از جناب حافظ نثار احمد الحسینی صاحب

یہ خبر افسوس کے ساتھ سنی گئی کہ ۶ محرم الحرام ۱۴۱۸ھ مطابق ۱۴ مئی ۱۹۹۷ء کو ممتاز عالم دین و مصنف مولانا قاضی محمد زاہد الحسینی رحلت فرما گئے۔

قاضی صاحب کا خاندان علوم دینیہ کی خدمت میں مشہور ہے۔ اس خاندان کے مورث اعلیٰ حضرت بانکے مرحوم حضرت سید گیسو درازؒ کی اولاد سے تھے اور حضرت سید احمد شہیدؒ کے قافلۂ جہاد میں شامل تھے۔ بالاکوٹ کے سقوط کے بعد ہزارہ سے نقل مکانی کرکے پنجاب کے مشہور علمی خطہ علاقہ چھچھ کے موضع شمس آباد تشریف لے آئے۔ قاضی صاحبؒ کے دادا قاضی نادر دینؒ اپنے وقت میں پنجابی کے مشہور شاعر اور مصلح دین تھے۔ ان کے والد مولانا مفتی قاضی غلام جیلانی مرحوم مناظر اور صاحب قلم عالم دین تھے۔ تقریباً پچاس اصلاحی کتابیں لکھیں۔ سلسلۂ نقشبندیہ میں خانقاہ موسیٰ زئی شریفؒ کے سجادہ نشین حضرت مولانا سراج الدینؒ سے مجاز طریقت تھے۔ متنبی قادیان مرزا قادیانی کا مقابلہ تحریر و تقریر اور مناظرہ سے کیا۔ "تیغ غلام جیلانی برگردن قادیانی" آپ کی مشہور تصنیف ہے ۱۹۲۸ء میں اپنے آبائی گاؤں شمس آباد میں انتقال کیا اور وہیں مدفون ہوئے۔

مولانا قاضی محمد زاہد الحسینی ۲۴ ربیع الاول ۱۳۳۱ھ مطابق یکم فروری ۱۹۱۳ء بروز ہفتہ پیدا ہوئے۔ قرآن پاک اور ابتدائی عربی فارسی تعلیم گھر ہی میں حاصل کی۔ ۱۹۲۸ء میں شمس آباد سے مڈل پاس کیا۔ ۱۹۲۵ء میں آپ میزان منشعب المفصل اور ہدایت النحو وغیرہ ابتدائی کتابیں

پڑھ رہے تھے کہ والدگرامی کا سایہ سر سے اٹھ گیا۔ لیکن داغ یتیمی آپ کے شوق اور حصول علم کی ہمت کو کم نہ کر سکا۔ علاقہ چھچھ میں اس وقت شیخ الہند مولانا محمود الحسن اور مولانا عبد الحی لکھنوی کے تلامذہ موجود تھے ان سے تحصیل علم کرنے کے بعد ۱۹۳۰ء میں مظاہر العلوم سہارنپور میں داخلہ لیا اور وہاں کے جید اساتذہ سے استفادہ فرمایا، پھر محدث العصر مولانا محمد انور شاہ کشمیری سے استفادہ کے لیے ڈابھیل تشریف لے گئے، طالب علمی ہی کے زمانے میں فلسفہ کی مشہور کتاب صدرا کی شرح البدر الحل الصدرا لکھی جس کی تحسین حضرت مدنی نے بھی فرمائی ہے۔

"یہ کتاب خدا کے فضل وکرم اور مولف کی عرق ریزی اور کمالات علمیہ کی وجہ سے مستقل کتاب اور صدرا کی شرح بن گئی ہے، مجھ کو قوی امید ہے کہ اس کتاب سے شائقین علوم عقلیہ کو بہت زیادہ فائدہ پہنچے گا۔"

سنہ ۱۹۳۲ء میں دار العلوم دیوبند کے دورہ حدیث شریف میں داخلہ لیا اور حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی سے بخاری اور ترمذی پڑھی، حضرت مدنی کی اردو تقریر کو آپ دوران سبق ہی عربی میں قلمبند فرماتے رہے۔ مسلم شریف مولانا رسول خان ہزاروی سے، ابوداؤد شریف مولانا میاں اصغر حسین سے، طحاوی شریف مولانا محمد ابراہیم بلیاوی سے، شمائل ترمذی مولانا اعزاز علی سے اور موطا امام محمد مفتی محمد شفیع سے پڑھی۔

آپ کے دور طالب علمی میں ایک مرتبہ مشہور شاعر اور زمیندار کے اڈیٹر مولانا ظفر علی خان دار العلوم دیوبند تشریف لائے، ان کے اعزاز میں دار الحدیث میں تقریب استقبالیہ منعقد ہوئی۔ اساتذہ اور طلبا نے نظم و نثر میں انھیں خوش آمدید کہا۔ اس موقع پر قاضی صاحب نے اپنی نظم میں مرزا قادیانی کے خلاف اکابر دیوبند کی خدمات کا

تذکرہ کرتے ہوئے فرمایا ع انہی کی ذاتِ اقدس سے بشیر الدین نالاں ہے۔

اس نظم سے متاثر ہوکر مولانا ظفر علی خان نے فی البدیہ دیوبند کی شان میں مشہور نظم کہی جس کا پہلا شعر مندرجہ ذیل ہے:

شاد باد و شاد ذی اے سرزمین دیوبند ہند میں تونے کیا اسلام کا پرچم بلند

صوفیانہ مسلک: قیام سہارنپور کے زمانہ میں حضرت مدنی سے عقیدت پیدا ہوگئی جو بالآخر حضرت مدنی کے دامنِ فیض سے وابستگی کا سبب بنی، حضرت قاضی صاحب خود اس کی تفصیل میں فرماتے ہیں:

"حضرت (مدنی) کانگرس یا جمعیت العلماء کی دعوت پر سہارنپور تشریف لاتے اور فرودگاہ میں تقریر فرماتے۔ اسی وقت سے آئینہ دل میں حضرت کا نقش اسی طرح ثبت ہوگیا کہ آج تک باقی ہے اور انشاء اللہ باقی رہے گا۔ مگر زیادہ قرب دارالعلوم دیوبند میں دورۂ حدیث کے داخلہ پر نصیب ہوا۔ کئی بار (بیعت کی) درخواست کی گئی، یہی جواب ملا کہ استخارہ کرلیا جائے۔ ایک رات سید دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے بیعت کا حکم ملا۔ وہ پورا خواب لکھ کر ارسال کر دیا تو جواب فرمایا کہ ملاقات پر انشاء اللہ بیعت کر لی جائے گی۔ آخر وہ سعادت آفرین گھڑی آگئی کہ مورخہ ۲۶ شعبان ۵۵ھ/ ۱۳ نومبر ۳۶ء بروز جمعرات نماز مغرب کے بعد اسی مسجد میں چند دیگر سعادت مندوں کے ساتھ بیعت کا شرف حاصل ہوگیا"۔

قاضی صاحب کی باطنی ترقیات دیکھ کر حضرت مدنی نے سلسلۂ چشتیہ کے اذکار و اشغال کی تلقین کی اجازت عنایت فرمادی۔

۱۹۳۶ء میں جب حضرت مدنی کی زیارت کے لیے دیوبند تشریف لے گئے تو وہاں سے

واپسی پر حضرت مدنی نے حضرت[1] لاہوری کے نام آپ کو دستی رقعہ عنایت فرمایا۔ جس میں آپ کے متعلق بھی ایک جملہ لکھا "علمی اور عملی حالت ماشاء اللہ قابل اطمینان ہے"۔ اب حضرت لاہوری کے ہاں بھی آپ کا آنا جانا شروع ہوگیا۔ بلکہ ۱۹۳ء میں جب پہلی مرتبہ حج بیت اللہ کو جا رہے تھے تو حضرت لاہوری نے آپ کو اپنے قلمی دستخطوں سے مزین اپنا ترجمۂ قرآن پاک عنایت فرمایا یہ محض ایک تحفہ نہ تھا بلکہ حضرت لاہوری نے بقول آپ کے اپنا فیض قرآنی آپ کو منتقل فرمادیا۔ ۱۹۶۱ء میں جب حضرت لاہوری ایبٹ آباد تشریف لائے تو از خود فرمایا "میں چاہتا ہوں کہ سلسلۂ قادریہ میں آپ کی تکمیل کرا دوں"۔ ابتدائی اسباق بھی تلقین فرمائے۔ ۱۵ مئی ۱۹۶۱ء ایبٹ آباد تشریف آوری پر آپ کو اپنا مجاز فرمایا۔

حضرت لاہوری نے آپ کی تصنیف معارف القرآن کی تقریظ میں لکھا "محترم المقام حضرت مولانا قاضی محمد زاہد الحسینی صاحب موجودہ دور کے ان علمائے کرام میں سے ہیں جنھیں اللہ تعالیٰ نے محض اپنے فضل وکرم سے کتاب و سنت کے سمجھنے کے لیے ایک خصوصی ملکہ عطا فرمایا ہے"۔

تدریسی خدمات: دارالعلوم دیوبند سے فارغ ہونے کے بعد ۱۹۳۲ء میں اپنے آبائی گاؤں شمس آباد میں "مدرسہ محمدیہ" کی بنیاد رکھی جس میں طلبہ دور دور سے آتے تھے۔ یہاں آپ نے بخاری سے لے کر کافیہ تک علوم وفنون کی تمام کتب پڑھائیں، تعلیم وتدریس کے ساتھ علاقہ کی مذہبی ضروریات کا خیال رکھا۔ ۱۹۳۵ء میں کامرہ میں مشہور شیعہ مناظر شبیر احمد فاضل لکھنؤ کے ساتھ حضرت ابوبکر صدیقؓ کی صداقت پر مناظرہ کیا اور اسے شکست فاش دی۔ ۱۹۴۲ء میں مولانا اعزاز علی کے فرمانے پر ڈالوال ضلع

---

[1] معارف: غالباً مولانا احمد علی لاہوری مفسر قرآن مراد ہیں۔

جہلم تشریف لے گئے اور قادیانیوں کے خلاف سرگرم عمل رہے ۱۹۴۹ء میں اٹک کی جامع مسجد میں خطابت کے فرائض انجام دیے اسی دوران جامعہ اسلامیہ اکوڑہ خٹک میں بخاری شریف اور ترمذی شریف پڑھائی۔ علامہ سید سلیمان ندویؒ کے ارشاد پر ۱۹۵۱ء میں اٹک کالج میں عربی اور اسلامیات کے پروفیسر ہوئے اور ۱۹۷۲ء میں ریٹائرڈ ہوئے ۱۹۵۲ء میں مدینہ مسجد کی بنیاد رکھی تھی، ریٹائرڈ ہونے کے بعد زندگی کی آخری ساعتوں تک یہیں مدینہ مسجد میں علوم اسلامیہ کی نشر و اشاعت اور تصوف و سلوک کی خدمت اور مخلوقِ خدا کی رہنمائی فرمائی۔

درس قرآن مجید سے خصوصی شغف: دوسرے علمائے دیوبند کی طرح قاضی صاحب کو بھی قرآن مجید سے شغف تھا اور اس کے مختلف پہلوؤں پر متعدد کتابیں مرتب فرمائیں، درس قرآن مجید معمول بن گیا تھا، اس میں کبھی ناغہ نہ ہوتا، ایبٹ آباد کے قیام میں دن میں تین تین مقامات پر عرصہ تک درس دیتے رہے۔

تنظیمی و ملی خدمات: گو آپ کا خاص مشغلہ درس و تدریس، تصنیف و تالیف اور ارشاد و ہدایت تھا تاہم قومی و ملی مسائل سے بھی یک گونہ سروکار رکھتے۔ ۱۳۶۲ھ میں جمعیت علمائے اٹک کی بنیاد رکھی۔ جس نے گرانقدر دینی خدمات انجام دیں۔ بعض مذہبی مسائل پر علماء کے اختلاف رائے کی وجہ سے مذہبی انتشار پیدا ہوجاتا تھا۔ اس کے لیے آپ نے مجلس تنقیح فتویٰ قائم کی اور علماء کو ایک پلیٹ فارم پر جمع کردیا۔ ۱۹۴۷ء میں نواب زادہ لیاقت علی خاں کے زیر صدارت ایک اسلامی کانفرنس ہوئی جس میں آپ نے پورا حصہ لیا۔ دوسری دینی و ملی تنظیموں میں بھی حصہ لیا اور مختلف وقتوں میں ہفتہ وار اخبار اور رسالے بھی نکالے۔

تصنیفی خدمات : اللہ تعالیٰ نے آپ کو تحریر و تصنیف کا ملکہ بھی عنایت فرمایا تھا اور آپ کا ذوق بڑا متنوع تھا اس لیے مختلف موضوعات پر درجنوں چھوٹی بڑی کتابیں لکھیں۔

۱۵ اگست ۱۹۸۹ء کو آپ کو دل کا شدید دورہ پڑا دوبارہ پھر پڑا اور ڈاکٹروں کی ممانعت کے باوجود علمی و عملی اشغال کا سلسلہ جاری رکھتے، بالآخر وقت موعود آگیا اور عین تہجد کے وقت ڈو سوا دو بجے تین مرتبہ اللہ اللہ اللہ فرمایا اور جان جان آفرین کے سپرد کر دی۔

اولاد : اللہ تعالیٰ نے آپ کو تین بیٹے اور چار بیٹیاں عنایت فرمائیں۔ سب آپ کے حسن تربیت سے نیک صالح، متقی پرہیزگار اور حافظ و قاری اور عالم فاضل ہیں۔ بڑے صاحبزادے مولانا قاضی محمد ارشد الحسینی جامعہ اشرفیہ سے فاضل ہیں، منجھلے صاحبزادے مولانا قاضی محمد راشد الحسینی اور چھوٹے صاحبزادے مولانا قاضی محمد ابراہیم ثاقب الحسینی دارالعلوم حقانیہ اکوڑہ خٹک کے فاضل ہیں۔

تیرہ خوش نصیبوں کو آپ نے اپنا مجاز فرمایا جن کے اسم گرامی درج ذیل ہیں:

۱۔ مولانا صاحبزادہ قاضی محمد ارشد الحسینی اٹک ۲۔ مولانا ڈاکٹر سید سعید اللہ جان پشاور ۳۔ مولانا قاری محمد سلیمان ٹیکسلا ۴۔ مولانا محمد زمان بنوں ۵۔ جناب کرنل محمد جمیل کرک کوہاٹ ۶۔ مولانا مفتی محمد حسین شورکوٹ ۷۔ حافظ نثار احمد الحسینی حضرو، ۸۔ حاجی عبدالعزیز ایبٹ آباد ۹۔ صاحبزادہ مولانا قاضی محمد راشد الحسینی اٹک ۱۰۔ صاحبزادہ مولانا محمد ابراہیم ثاقب الحسینی اٹک ۱۱۔ مولانا قاری غلام نبی افغانی ۱۲۔ حافظ عطاء اللہ وہاڑی ۱۳۔ مولانا قاری محمد ادریس اسلام آباد۔

ڈاکٹر سید محمد فاروق بخاری

از ضیاء الدین اصلاحی

مئی کے آخر یا جون کے شروع میں جناب شوکت حسین کینگ مدیر ماہنامہ الاعتقاد سری نگر کے ایک مکتوب سے یہ معلوم کرکے بڑا دکھ اور سخت افسوس ہوا کہ ریاست کشمیر کے مشہور صاحبِ علم و قلم پروفیسر ڈاکٹر سید محمد فاروق بخاری طویل علالت کے بعد ۱۹؍ ذی الحجہ ۱۴۱۷ھ/ ۲۷؍ اپریل ۱۹۹۷ء کو رحلت فرماگئے، یہ اطلاع خود ہی تاخیر سے ملی تھی اور باوجود کوشش کے جون کے معارف میں ان پر نوٹ شایع کرنے کی گنجایش نہیں نکلی۔

بخاری صاحب کی عمر ابھی زیادہ نہ تھی اور ان سے بڑی توقعات وابستہ تھیں مگر موت کا وقت معین ہے، اس میں تقدیم و تاخیر نہیں ہوتی، فاروق صاحب ۲۷؍ جون ۱۹۴۹ء کو پیدا ہوئے تھے، ان کا خاندان علمی، دینی اور روحانی فضیلت کا حامل تھا، ان کے والد بزرگوار مولانا سید محمد قاسم بخاری کو جو ابھی خدا کے فضل سے بقید حیات ہیں مولانا مفتی کفایت اللہ دہلوی سے شرف تلمذ حاصل تھا۔ موصوف انجمن تبلیغ الاسلام جموں و کشمیر کے صدر اور حنفی عربی کالج سری نگر کے بانی مہتمم ہیں، کشمیر کے اس بخاری خانوادے کا نسبی سلسلہ حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ سے ملتا ہے مولانا سید عطاء اللہ شاہ بخاری بھی اسی خاندان کے چشم و چراغ تھے۔

ڈاکٹر مولوی فاروق بخاری کی تعلیم کی ابتدا کشمیر میں ہوئی اور کشمیر یونیورسٹی ہی سے انہوں نے مولوی فاضل کیا، لیکن عربی میں ایم۔ اے اور پی۔ ایچ۔ ڈی کی ڈگری علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے حاصل کی۔ موصوف کا خاص مشغلہ درس و تدریس

تھا اور اب وہ امر سنگھ کالج سری نگر میں شعبۂ عربی کے ہیڈ آف ڈپارٹمنٹ تھے۔ لیکن تصنیف و تالیف کا بھی ان کو اچھا ملکہ تھا، کشمیر کی علمی، ادبی، ثقافتی اور مذہبی تاریخ ان کا خاص موضوع تھا اور اس پر ان کا مطالعہ وسیع تھا، اس موضوع اور اس کے متعلقات پر ان کے مضامین برابر شایع ہوتے تھے اور حسب ذیل کتابیں بھی شایع ہوئیں۔

۱۔ کشمیر میں اسلام کی اشاعت ۲۔ کشمیر میں عربی شعر و ادب کی تاریخ۔ ۳۔ کشمیر میں عربی علوم کی اشاعت ۴۔ کشمیر میں اسلامی ثقافت کے تاریخی مراحل۔

ان میں سے بعض کتابیں راقم کی نظر سے گزری ہیں جن سے مصنف کی تلاش، محنت اور تحقیق کے علاوہ موضوع پر ان کی اچھی دسترس کا بھی اندازہ ہوتا ہے۔ ان کی دوسری کتابوں کے نام یہ ہیں:۔

۵۔ البصائر ۶۔ سیرت شیخ نجم الدین احمد الکبریٰؒ ۷۔ سیرت حضرت امیر کبیر میر سید علی ہمدانیؒ ۸۔ سیرت حضرت میر محمد ہمدانیؒ ۹۔ سیرت علامہ انور شاہ کشمیریؒ ۱۰۔ علامہ انور شاہ اور ان کے تذکرہ نگار ۱۱۔ دینیات دو حصے۔

کشمیر کی طرح تصوف بھی ان کی دلچسپی کا خاص موضوع تھا۔

ڈاکٹر صاحب دار المصنفین کے بڑے قدر داں تھے، اس کی مطبوعات آرڈر دے کر منگاتے تھے، معارف بھی شوق اور پابندی سے پڑھتے تھے اور ایک عرصہ سے اس میں ان کے مضامین بھی چھپتے تھے۔ وہ دینی حمیت اور اسلامی جذبہ سے سرشار تھے جس کا اندازہ ان کی تحریروں سے ہوتا تھا۔ کشمیر کے موجودہ حالات

سے بڑے شکستہ خاطر رہتے تھے، چند برس پہلے انھوں نے اس کے متعلق ایک طویل اور غمناک خط بھی مجھ کو لکھا تھا جو معارف میں شایع ہوا تھا۔ راقم سے اکثر خط و کتابت رہتی تھی، ادھر عرصہ سے ان کا کوئی خط نہیں آرہا تھا جس کی وجہ سے بڑی خلش تھی، کئی بار خیال ہوا کہ میں خود خط لکھ کر مزاج پرسی کرلوں اور مضمون کی فرمایش کردوں، مگر اس کی نوبت نہیں آئی اور وہ سفر آخرت پر روانہ ہوگئے، اللہ تعالیٰ انہیں اپنی رحمت کاملہ سے نوازے اور اعزہ و متعلقین کو صبر جمیل عطا کرے۔ آمین۔ "ض"

پنڈت آنند نرائن ملا

۱۲ جون کو اردو تحریک کے قائد پنڈت آنند نرائن ملا چل بسے، ۱۹۰۱ء میں لکھنؤ میں پیدا ہوئے تھے جہاں انکے والد پنڈت جگت نرائن ملا چوٹی کے وکیل تھے، آنند نرائن ملا بھی تعلیم سے فارغ ہوکر وکالت کے پیشہ سے وابستہ ہوئے، پھر الہ آباد ہائی کورٹ کے جج اور سینیئر جسٹس ہوئے ۱۹۶۱ء میں ریٹائر ہوئے تو سپریم کورٹ میں وکالت شروع کی، لوک سبھا اور راجیہ سبھا کے ممبر بھی منتخب ہوئے لیکن انکی اصل شہرت و امتیاز کا باعث یہ ہے کہ وہ اردو کے ایک بڑے شاعر، نقاد، ادیب، سیکولر، انسان دوست اور گنگا جمنی تہذیب کا نمونہ تھے، اردو کی محبت انکے رگ و پے میں رچی بسی ہوئی تھی اور وہ اسکے اپنی مادری زبان ہونے پر فخر کرتے تھے اور کہتے تھے کہ "میں مذہب چھوڑ سکتا ہوں لیکن مادری زبان نہیں چھوڑ سکتا"، ان کا شعر ہے:

آ تجھ کو گلے لگا کے مٹتی اردو
اک آخری گیت گا لیں تو چلیں

منظوم تصنیفات کے علاوہ بعض نثری تصنیفات بھی یادگار ہیں، نظم و غزل دونوں پر قدرت تھی۔ روایت کی پاسداری کے باوجود کلام میں فرسودگی نہیں۔ مشاعرہ کے شاعر نہ تھے مگر اس میں شرکت کرتے تھے، دارالمصنفین کی گولڈن جبلی کے مشاعرہ کی صدارت کی تھی۔ اب غیر مسلموں میں اردو کے ایسے عالم، دانشور اور اس سے گہرا لگاؤ رکھنے والے عنقا ہوتے جارہے ہیں اس اعتبار سے انکی وفات اردو کا واقعی ناقابل تلافی نقصان ہے۔ "ض"

مطبوعات جدیدہ

کاروانِ زندگی حصہ ششم

از مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی، متوسط تقطیع، کاغذ، کتابت و طباعت اچھی صفحات ۳۰۹، مجلد مع گردپوش قیمت تحریر نہیں، ناشر: مکتبۂ اسلام ۵/۲/۴، محمد علی لین، گوئن روڈ، لکھنؤ۔

حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی مدظلہ "کاروانِ زندگی" کے نام سے اپنی پُر از معلومات "آپ بیتی" لکھ رہے ہیں، یہ اس کا چھٹا حصہ ہے جو ۹۴ء تا ۱۹۹۶ء کی سرگزشت ہے، اس میں ملک و بیرونِ ملک مولانا کے اسفار، دینی، دعوتی، قومی، ملی، تصنیفی و تحریری اور دوسری گوناگوں اور مختلف النوع سرگرمیوں کا تذکرہ ہے، مولانا کی بین الاقوامی شخصیت کا دائرۂ عمل ہندوستان اور عالم اسلام ہی نہیں یورپ و امریکہ تک وسیع ہے، ہندوستان کے دور دراز علاقوں کے علاوہ اس عرصہ میں جہاں جہاں جانے اور وہاں تبادلۂ خیال اور خطاب کا موقع ملا اس کی روداد بیان کی گئی ہے۔ جیسے حجاز، وجدہ، سوڈان، دوحہ (قطر) قاہرہ، استنبول، لندن اور دبی۔ حجاز مقدس کئی بار جانا ہوا اور آخری بار کے سفر میں کلیدِ کعبہ مولانا کو سپرد کی گئی اور در کعبہ کھولنے کا شرف حاصل ہوا، استنبول میں رابطۂ ادب اسلامی کے جلسہ میں شرکت کے لیے گئے تو وہاں کے قدردانوں نے آپ کی شخصیت اور کمالات پر ایک سمینار کیا، مولانا کا اصل تعلق دارالعلوم ندوۃ العلماء سے ہے اور ان کا زیادہ وقت یہیں بسر ہوتا ہے، کتاب کی ابتدا ندوہ کے اہتمام کے نئے انتخاب کے ذکر سے ہوئی ہے، دوسرا اہم واقعہ ندوہ پر پولیس کے شب خوں کا ہے،

جو مولانا کے لیے نہایت روح فرسا اور جاں گسل تھا اور جس کا ہندوستان اور دنیائے اسلام میں شدید ردعمل ہوا، اس کی اور اس سے متعلق دوسری ضروری باتیں بھی حیطۂ تحریر میں آگئی ہے، ندوہ میں رواقِ عبدالحیٔ کے افتتاح اور اس کے جلسۂ انتظامی میں خطاب اور علامہ یوسف القرضاوی کی ندوہ میں تشریف آوری اور ان کے داعیانہ خطبوں کا ذکر بھی ہے۔ مولانا رابطۂ ادب اسلامی، دینی تعلیمی کونسل، آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ، تحریک پیامِ انسانیت اور دوسرے کئی اداروں کے صدر ہیں اور شروع ہی سے رابطۂ عالم اسلامی کے باوقار رکن ہیں، ان سب کی سرگرمیوں اور ان کے جلسوں میں مولانا کی وقت اور موقع کے مناسب تقریروں اور تحریروں کے اقتباسات دیے گئے ہیں، دوسری کانفرنسوں، سمیناروں، اصلاحِ معاشرہ کے جلسوں اور علمی و تعلیمی اجتماعات کی روداد بھی درج ہے۔ گزشتہ تین سال کے اندر جن عزیزوں، اہل تعلق یا علمی و دینی حیثیت سے ممتاز اشخاص کی وفات ہوئی ہے، مولانا کے طاقت ور قلم نے ان کے نمایاں خط و خال بیان کر کے انہیں زندۂ جاوید بنا دیا ہے۔ مگر اس میں مولانا بدرالدین اصلاحی ناظم مدرسۃ الاصلاح کا ذکر رہ گیا ہے۔ حکیم عبدالرحیم اشرف صاحب کی وفات کا تذکرہ کرتے ہوئے انہیں مدیر الاعتصام لکھا ہے، یہ غالباً سہو قلم ہے، وہ المنبر کے مدیر تھے۔

مولانا کی طبیعت میں دردمندی ہے۔ مگر وہ مسلمانوں کی زبوں حالی، بے راہ روی، اخلاقی و معاشرتی پستی، مذہب سے انحراف اور جاہلانہ رسوم و عادات اختیار کر لینے ہی پر متفکر اور دل گیر نہیں ہیں بلکہ ملک کے اخلاقی، علمی اور روحانی زوال، اس میں بڑھتی ہوئی فرقہ واریت و فسطائیت، تشدد پسندی، خود غرضی، رشوت اور بدعنوانی پر بھی اشکبار ہیں۔ ان کی نظر نہ صرف ہندوستان اور اپنے صوبہ کے حالات پر ہے بلکہ دنیائے اسلام کے

واقعات سے بھی بے خبر نہیں ہیں، یہی وجہ ہے کہ وہ ہندوستان کے انتخابات اور اترپردیش میں حکومتوں کے عزل ونصب، فیروزآباد کے بھیانک ریلوے حادثہ کی طرح عالمی حوادث کا بھی ایک ماہر مورخ اور مبصر کی حیثیت سے تذکرہ کرتے ہیں۔ قوم و ملک کے ابتر حالات کو درست کرنے کے لیے ہندوستانی وزیر اعظم دیوگوڑا اور ترکی وزیر اعظم نجم الدین اربکان کو خطوط لکھتے ہیں، مولانا کو سب سے زیادہ تشویش دو باتوں کی ہے، ایک تو یہودی سازش و شطارت جو امریکہ کے بل پر عالم اسلام کو تہہ و بالا کیے ہوئے ہے، دوسری ہندوستان میں ہندو احیائیت کا فروغ جو مسلمانوں کی نسل کشی اور ان کے ارتداد کے لیے منظم جد و جہد کر رہی ہے۔ اس کے ساتھ جابجا مولانا نے مسلمانوں کو اصلاح حال اور فریضۂ احتساب کائنات کا درس دیا ہے غرض یہ کتاب ایک تاریخی دستاویز اور پڑھنے اور سبق حاصل کرنے کے لائق ہے، اللہ تعالیٰ آگے کی جلدوں کو مکمل کرنے کے لیے مصنف کی عمر و صحت میں برکت عطا فرمائے۔ آمین۔

مباحث القرآن

مرتبہ مولانا عبدالرحمٰن ناصر اصلاحی، جامعی تقطیع متوسط، کتابت ٹائپ، کاغذ و طباعت بہتر، صفحات ۱۳۰، قیمت ۳۵ روپے، پتہ: دائرۂ حمیدیہ، مدرسۃ الاصلاح سرائمیر، اعظم گڈھ، یو۔ پی۔

مولانا اختر احسن اصلاحی مرحوم مولانا حمید الدین فراہیؒ کے ارشد تلامذہ میں تھے۔ ان کی زندگی درس و تدریس اور مدرسۃ الاصلاح کی خدمت میں بسر ہوئی اور انکو تصنیف و تالیف کی طرف متوجہ ہونے کا موقع نہیں ملا تاہم اپنے رفیقِ درس مولانا امین احسن اصلاحی صاحب کے اصرار پر ماہنامہ الاصلاح کے لیے بعض مضامین تحریر کیے تھے، جو ان کے رسوخ فی العلم اور قرآن مجید کے فہم اور اس میں وسعت نظر کے علاوہ اس کا بھی ثبوت ہیں کہ اگر وہ تحریر و تصنیف کے میدان کا رخ کرتے تو اچھے اہلِ قلم ہوتے۔

مولانا کے عزیز شاگرد مولانا عبد الرحمن ناصر اصلاحی جامعی نے ان مضامین کو یکجا کرکے
ئع کیا ہے، پہلے مضمون میں حافِظُوا عَلَى الصَّلٰوٰتِ وَالصَّلٰوةِ الْوُسْطٰى الخ (بقرہ) کا ماقبل
بعد سے تعلق واضح کرنے کے لیے سورہ کے مطالب کا عالمانہ تجزیہ اور پورے نظام پر
ی لطیف و دل آویز بحث کی ہے، دوسرے میں وَمَا اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رَّسُوْلٍ وَّ
نَبِيٍّ اِلَّآ اِذَا تَمَنّٰٓى الخ (حج) کی بعض غلط تاویلوں کی تردید اور سیاق و سباق اور نظائر
روشنی میں صحیح تاویل بیان کی گئی ہے، تیسرا مضمون مشہور منکر حدیث چودھری غلام احمد
ویز کے اس خیال کی مدلل تردید ہے کہ "مسلمانوں میں رائج تصور نجات یکسر غیر قرآنی ہے"۔
خری مضمون میں استکبار کو ام المعاصی بتا کر اس کے سیاہ کن اثرات و نتائج دکھائے ہیں۔
سارے مضامین قرآنی حقائق و بصائر پر مشتمل ہونے کی بنا پر اہل علم اور قرآن مجید کے
یدائیوں کے لیے ایک قیمتی سوغات ہیں، ان کی اشاعت ایک مفید علمی و قرآنی خدمت
ہے، اگر آیات و احادیث کی تخریج اور ان تفسیری اقوال کے حوالے دے دیے جاتے
مولانا نے جا بجا نقل کیے ہیں تو مجموعہ کا فائدہ بڑھ جاتا۔ آخری مضمون مولانا ابو اللیث
سلامی ندوی مرحوم کی ادارت میں نکلنے والے ماہنامہ فاران بجنور میں شایع ہوا تھا،
س کا حوالہ نہیں دیا گیا ہے۔

تحدیث نعمت مرتبہ مولانا عتیق الرحمن سنبھلی، تقطیع متوسط، کاغذ، کتابت و طباعت
اچھی، صفحات ۳۵۲، مجلد مع گرد پوش، قیمت ۵۰ روپے، پتے: (۱) الفرقان بکڈپو
۱۱۴/۳۱ نظیر آباد، لکھنؤ۔ (۲) فرقان پبلیکیشنز، ۹۰۔ بی۔ ہنیلے روڈ۔ لندن۔

یہ کتاب مولانا محمد منظور نعمانی مرحوم کی آپ بیتی ہے لیکن اس کی نوعیت اس طرح کی دوسری
ابوں سے مختلف ہے، اس میں قرآن مجید کے ارشاد وَاَمَّا بِنِعْمَةِ رَبِّكَ فَحَدِّثْ کے بموجب

مولانا نے اپنے اوپر اللہ کے علمی، عملی، اور دینی احسانات کی تفصیل قلمبند کی ہے جو دو طرح کے ہیں اور اسی لحاظ سے یہ کتاب بھی دو حصوں پر مشتمل ہے، پہلے کا عنوان نعمت علم اور توفیق عمل ہے اور دوسرے کا بندگان حق کی یافت، پہلے میں ان انعامات خداوندی کا ذکر ہے کہ مولانا ایک خوشحال دیندار گھرانے میں پیدا ہوئے دینی تعلیم سے بہرہ ور ہوئے، دارالعلوم دیوبند کے ممتاز و فائق اساتذہ سے تحصیل علم کی سعادت میسر آئی جن میں سرفہرست مولانا انور شاہ کشمیری تھے، تعلیم سے فراغت کے بعد احقاق حق و ابطال باطل کی خدمت انجام دی، ماہنامہ الفرقان جاری کیا جس کے ذریعہ دین کی اشاعت کی اور اس کے متعدد اہم اور خاص نمبر نکالے، جماعت اسلامی کی تاسیس میں شریک ہوئے، مگر انکے بقول فکر و نظر کی اس غلطی سے واپسی کے لیے بالکل ابتدائی مرحلے ہی میں توفیق الٰہی نے دستگیری کی اور مولانا محمد الیاس کی خدمت میں رسائی ہوئی اور الفرقان تبلیغی تحریک کا نقیب بن گیا، تقسیم ملک کے بعد بہت سے دینی و ملی کام انجام دیے، رابطۂ عالم اسلامی کی ممبری کے طفیل میں حرمین شریفین میں باربار حاضری ہوئی، مسلمانوں کی اصلاح و ہدایت کے لیے بہت سے کتب و رسائل تصنیف کیے، دوسرے حصہ میں جن بندگان حق اور خاصان خدا سے ملاقات کا شرف حاصل ہوا اور انکے جو واقعات مولانا کے مشاہدہ میں آئے یا انکی سیرت و شخصیت کے جو نمایاں جوہر سامنے آئے اور انکی تعلیم و ارشاد اور اصلاح خلق کے جو مفید انداز دیکھے ان سب کو بڑے اچھے اور موثر انداز میں پیش کیا ہے، یہ حصہ شیخ الہند مولانا محمود الحسن، مولانا مفتی عزیز الرحمٰن، مولانا حبیب الرحمٰن عثمانی، مولانا اشرف علی تھانوی مولانا محمد الیاس، مولانا حسین احمد مدنی، مولانا شاہ عبدالقادر رائے پوری، مولانا محمد زکریا، مولانا شاہ وصی اللہ، مولانا حسین علی شاہ مجددی، حاجی عبدالغفور جودھ پوری کی روح پرور صحبتوں کے حال، ان کی زندگیوں کے خط و خال اور ان کے ممتاز اوصاف و خصوصیات پر مشتمل ہے، اس کتاب سے موجودہ صدی میں ہندوستانی مسلمانوں کی بعض ملی و دینی سرگرمیوں کا حال بھی معلوم ہوتا ہے اور یہ مولانا کے حسن بیان اور دلکش و دلآویز تحریر کا نمونہ بھی ہے۔

"ض"

جلد ۱۶۰ ماہ ربیع الآخر ۱۴۱۸ھ مطابق ماہ اگست ۱۹۹۷ء عدد ۲

فہرست مضامین

شذرات

اس وقت تمام ابلیسی قوتیں اور اسلام دشمن طاقتیں اپنی سازشوں اور ریشہ دوانیوں سے مسلمانوں کو باہم متحارب اور ایک دوسرے کے خلاف صف آرا رکھنا چاہتی ہیں تاکہ مسلمانوں کے استیصال اور بیخ کنی کا جو منصوبہ ان کے پیش نظر ہے اس کے لیے انہیں زیادہ پاپڑ نہ بیلنا پڑے بلکہ مسلمان خود ہی آپس میں لڑ بھڑ کر اپنے آپ کو تباہ و برباد کر لیں اور وہ اس کا تماشا دیکھیں، رائی کو پربت بنانے اسلامی ملکوں کی معمولی کمزوریوں کو طوفان بلاخیز میں تبدیل کر دینے اور اپنے اثر و نفوذ سے ان میں ہلچل اور ہیجان برپا کر دینے میں انہیں خاص مہارت ہے۔ افغانستان کی خانہ جنگی، پاکستان کا شیعہ سنی جھگڑا اور مہاجرین کا فتنہ سب ان کے اسی کرتب کا نمونہ ہے، لکھنؤ کا شیعہ سنی جھگڑا بھی اسی کی ایک کڑی ہے اسی لیے گزشتہ مہینہ ان صفحات میں گرفتارانِ بو بکر و علی سے ہم نے عرض کیا تھا کہ وہ سازشوں کا شکار ہو کر اپنی قوت و وحدت کو پارہ پارہ نہ کریں اور خود اپنے ہی ہاتھوں اپنی تباہی کا سامان نہ کریں۔ گو اکثر لوگوں کو ہمارے معروضات پسند آئے اور بعض اخباروں نے ان کو اپنے کالموں میں نقل کیا مگر ہمارے ڈاکٹر کرم فرماؤں کے لیے ہمارا نالہ نیم شبی باعثِ کرب بن گیا۔

ہمارے بڑے مخلص کرم فرما اور دارالمصنفین کے خاص عاشق و فدائی ایک شیعہ بزرگ کے خیال میں اخلاص اور نیک نیتی کے باوجود ہماری تحریر شیعہ سماج سے بیگانگی اور کم واقفیت کا پتہ دیتی ہے، لیکن انہوں نے جو باتیں تحریر فرمائی ہیں ان کے متعلق عرض ہے کہ مجھے شیعہ سنی میں باہم شادی و مناکحت کا علم ہے، میرے وطن کے قریب ایک موضع میں ایک ہی خاندان کے کچھ افراد شیعہ اور بعض سنی ہیں اس سے اور دوسرے شیعہ خاندانوں سے ہمارے خاندانی روابط بھی تھے، مجھے اس کی بھی خبر ہے کہ میر صاحبان کے سارے خدمتگار سنی ہوتے تھے لیکن یہ بالکل ناخواندہ اور [illegible]

سُنّی ہوتے تھے، ان کا نہ کوئی خاص دین و عقیدہ تھا اور نہ ان میں ایسی ایمانی حمیت ہی تھی کہ تبرے یا محرم کی ان رسوم کی وجہ سے جو سُنی نقطۂ نظر سے صحیح نہیں ہیں، اپنی خدمت سے دستکش ہو جاتے۔ اس لیے ان کی موجودگی تبرے کے لیے رکاوٹ نہیں بن سکتی تھی۔

البتہ ہم کو یہ معلوم نہیں کہ شیعوں کی اذان یا ان کی مجالس اور ذکر حسین کی محافل پر بھی سُنی معترض ہوتے ہیں، ہمارے خیال میں سڑکوں اور شاہراہوں پر نکلنے والے جلوس ہائے عزا میں ہونے والی تبرے بازی سے سنیوں کو اصل شکایت ہے لیکن فاضل مکتوب نگار نے اس کی نفی فرماتے ہوئے یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ "جن ذاکروں کے یہاں کبھی بے اعتدالی کا مظاہرہ ہوتا ہے اور کبھی کبھی معقولات سے زیادہ مطاعن راہ پا جاتے ہیں" تو اس کا باعث بعض وہ سُنی حضرات ہیں جو برسر منبر "فلاں ابن فلاں رافضی بود۔ بر پدرش لعنت" کہتے ہیں۔ دراصل ہماری تحریر کا منشا دونوں فرقوں کے اسی طرح کے لوگوں کو متنبہ کرنا تھا کہ وہ امت کے وسیع تر مفاد میں اب اس طرح کی باتیں کہنے سے باز آجائیں لیکن ہمارے نزدیک مکتوب نگار کی یہ شکایت بیجا ہے کہ تقویۃ الایمان جیسی کتابوں کے قدرداں ان کی مجالس سے کنارہ کرنے لگے۔ تقویۃ الایمان اہل تشیع کے نزدیک خواہ کتنی ہی قابلِ اعتراض کیوں نہ ہو لیکن یہ تو ضروری نہیں کہ سُنی بھی اسے قابلِ اعتراض سمجھیں، آخر وہ انکی مجالس سے کیوں نہ کنارا کریں جب کہ ان کے عقیدے کے مطابق یہ درست ہی نہیں ہیں، شکایت اس وقت بجا ہوتی جب سُنی ان مجالس اور ان کے اندر ہونے والی باتوں کے خلاف علی الاعلان لب کشائی کرتے۔

ہمارے انھی کرم فرما بزرگ کی مہربانی سے ہم کو نئی دہلی سے شایع ہونے والے "سیکولر قیادت" اخبار میں ڈاکٹر مولانا کلب صادق کا یہ فراخدلانہ اور صلح پسندانہ بیان پڑھنے کو ملا کہ لکھنؤ کے بعض اہلسنت حضرات کا خیال ہے کہ شیعہ حضرات جلوس ہائے عزا میں تبرا پڑھتے ہیں جب کہ واقعیت اس کے خلاف ہے، تاہم اس بحث میں میں نہیں پڑتا، میں تمام علمائے شیعہ لکھنؤ کی

طرف سے برادرانِ اہلسنت کو یقین دلاتا ہوں کہ جلوس ہائے عزا میں تبرا ہرگز نہیں پڑھا جائے گا۔ ہم سب ہر اس بات پر عمل کے لیے تیار ہیں جس سے برادرانِ اہلسنت کو اس بات کا یقین ہو جائے کہ ان جلوس ہائے عزا میں صرف و صرف ماتم حسین و شہدائے کربلا ہی کیا جائے گا۔ امید ہے کہ اس تحریر کے بعد غلط فہمیاں دور ہو جائیں گی، ویسے ہمارے تمام مجتہدین نے جن کی شیعہ فرقہ تقلید کرتا ہے متفقہ طور پر یہ فتویٰ دیا ہے کہ شیعوں کو ہرگز کسی ایسی بات کو انجام دینے کی اجازت نہیں ہے جس سے صفوفِ مسلمین میں انتشار پیدا ہو اور وحدتِ مسلمین متاثر ہو، میں یہ فتویٰ اجلیل القدر علمائے اہلسنت کو دکھا چکا ہوں"۔

اس قول فیصل اور صریح ذمہ دارانہ بیان کے بعد سنی حضرات کو جلوس ہائے عزا پر معترض نہیں ہونا چاہیے اور اگر حکومت اس پر عائد پابندی ختم کر دے تو نہ اس کی شکایت ہونی چاہیے اور نہ مدح صحابہؓ کے لیے انہیں اصرار کرنا چاہیے کیونکہ دینی نقطۂ نظر سے دونوں جلوسوں کی کوئی دینی حیثیت نہیں ہے۔ مولانا کلب صادق پر سنی حضرات بھی متفق ہیں وہ مسلم پرسنل لا بورڈ کے نائب صدر اور کئی ملی تنظیموں سے وابستہ ہیں۔ اتر پردیش کی حکومت نے ان سے ملنے سے انکار کر کے اور مولانا کلب جواد کو گرفتار کر کے جو نار وا اقدام کیا تھا ہم اس کی پر زور مذمت کرتے ہیں۔

ہمارے جن عزیز سنی دوست نے ہماری دعوتِ اتحاد کا برا مانا ہے اور اسے ہماری انتہائی سادہ لوحی قرار دیا ہے، اب وہ لکھنؤ میں نہیں رہتے لیکن انکا وطن یہیں ہے اسی لیے اس معاملہ میں انکی شدت و غلظت زائل نہیں ہوئی ہے ہمیں انکے ذاتی خیالات سے بحث نہیں لیکن ہم نے یہ کہاں کہا تھا کہ شیعہ سنی جھگڑے کو دفن کرنے کے لیے دونوں اپنے دین و عقیدہ ہی کو خیرباد کہدیں ہماری گزارش تو صرف اس قدر ہے کہ دونوں اپنے اپنے اعتقادات پر قایم رہتے ہوئے تصادم اور ٹکراؤ سے بچیں اور اپنی تفضیح اور رسوائی کا سامان نہ کریں اگر انکے نزدیک دونوں میں اتحاد صرف سماجی بنیاد پر ہو سکتا ہے تو اسکی کیا صورت ہوگی آپ شیعوں کو جو بھی سمجھیں لیکن یہ یاد رکھیں کہ اسلام نے غیر مسلموں سے بھی میل ملاپ کی تعلیم دی ہے لکھنؤ میں امن و امان قائم کرنا شیعہ اور سنی کا فرض ہے جس کے لیے دونوں کا اتحاد ضروری ہے خواہ وہ کسی بنیاد پر ہو، اسکے لیے فصل کے بجائے وصل کا رویہ اپنانا ہوگا

مقالات

تمدن ہائے قدیم میں جرم و سزا

از

جناب نور احمد شاہتاز صاحب۔ کراچی

جرم و سزا کا سلسلہ کبھی بھی تمدن میں اہم حیثیت رکھتا ہے بلکہ کوئی بھی قوم نظام جرم و سزا کو قائم کیے بغیر متمدن نہیں بن سکتی کیونکہ یہ تو ناممکنات میں سے ہے کہ کسی معاشرہ میں مجرموں کو کھلی چھٹی دے دی جائے اور ان کی من مانی کارروائیوں سے معاشرہ میں کوئی بگاڑ پیدا نہ ہو۔ متمدن قوم یا معاشرہ وہی ہے جس میں بگاڑ کم سے کم ہو اور جرائم کو کنٹرول کرنے یا کم سے کم سطح پر لانے کے لیے لازمی طور پر نظام جرم و سزا قائم ہو[1]۔

زیر نظر مضمون میں اس بات کا جائزہ لیا جائے گا کہ معروف تمدنوں میں نظام جرم و سزا کی کیا کیفیت تھی۔ اس نظام میں قابل سزا (قابل حد) جرائم کیا کیا تھے اور ان کی سزا کی نوعیت کیا تھی؟

ماہرین عمرانیات کا خیال ہے کہ اب تک دریافت ہونے والے آثار قدیمہ سے جس قدیم ترین تمدن کے نظام قضا کا علم ہو سکا ہے وہ بابلی Sumarians تمدن ہے۔

تاریخ تمدن کے ایک نامور تاریخ نگار ول ڈیورنٹ کہتے ہیں:

" Written History is atleast six thousand years old. During half of this period the centre of Human

Affairs so far as they are now known to us was in the near east. . . . " (2)

یعنی تحریر شدہ تاریخی سرمایہ زیادہ سے زیادہ چھ ہزار سال قدیم ہے، اس پورے عرصہ کا کم از کم نصف حصہ ایسا ہے جس کے بارے میں حالیہ معلومات کے مطابق انسانی امور کا مرکز مشرق قریب رہا ہے۔

انسائیکلو پیڈیا آف امریکانا میں Civilization کے حوالہ سے ولیم ایچ مکنیل (William H. Mcneill) لکھتے ہیں :

"تقریباً تمام محققین اس بات پر متفق ہیں کہ قدیم ترین تہذیب جس کے بارے میں ہمیں علم ہو سکا ہے وہ میسو پوٹیمیا میں سمیریوں کی ہے۔ ۱۹۲۰ء اور ۱۹۳۰ء میں دریافت ہونے والے آثار سے معلوم ہوتا ہے کہ عرفات کے دہانے پر درجنوں دیہات اور شہر آباد تھے جن کا تعلق ۳۵۰۰...۳ قبل مسیح سے ہے۔"

بابلی یا سومری تمدن کے بعد دوسرے نمبر پر مصری اور پھر ہندی تمدن کو قدیم مانا گیا ہے، انسائیکلو پیڈیا آف امریکانا کے مقالہ نگار بسلسلہ CIVILIZATION کا کہنا ہے کہ :

"وادی نیل اور وادی سندھ میں بھی تمدن نے سمیریوں کے تمدنی اسٹرکچر کی طرح لیکن یکسر مختلف انداز میں سمیرین تہذیب کے جلد ہی بعد جنم لیا، اس بات کے ناقابل تردید شواہد موجود ہیں کہ سومیریوں اور قدیم مصریوں کے مابین تجارتی روابط تھے اور امکاناتی شواہد سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ وادی سندھ میں ابتداءً جب تمدن نے سر ابھارا تو سندھیوں اور سمیریوں کے مابین بھی تجارتی مراسم تھے۔"

رواں صدی کے اوائل تک مورخین کا خیال تھا کہ مصری تمدن ہی سب سے قدیم ترین

تمدن ہے اور بعض معاصرین بھی وادی نیل کے تمدن ہی کو نوع انسانی کا اولین گہوارہ خیال کرتے ہیں[۵] لیکن تاریخ نگاروں کی اکثریت نے اس رائے سے اتفاق نہیں کیا بلکہ ان کا خیال ہے کہ تمدن کی داغ بیل عراق میں ڈالی گئی اور اس پہلو سے سمیریوں کو شرف اولیت حاصل ہے، وہ سامی الاصل نہیں تھے بلکہ سامیوں سے بہت پہلے تمدن کی برکات سے روشناس ہو چکے تھے۔ ان کا تمدن پانچ ہزار سال قبل مسیح تک کا پرانا ہے[۶]

مندرجہ بالا تاریخی شہادت کے پیش نظر مذکورہ تمدنوں میں نظام جرم وسزا کا جائزہ لیتے ہوئے زیر نظر مقالہ میں بابلی تمدن کو سرفہرست رکھا گیا ہے۔

۱۔ قدیم بابلی تمدن | قدیم بابلی تمدن میں نظام جرم وسزا کیا تھا اور کن کن جرائم کو اس وقت بھی سخت قابل سزا سمجھا جاتا تھا اور ان کے لیے کیا سزائیں مقرر تھیں ؟ اس کا اندازہ اس دور کے قانون کے مطالعہ ہی سے ہو سکتا ہے۔ بابلی تمدن کے مجموعہ قانون کا جو حصہ اب تک منظر عام پر آیا ہے وہ دسمبر ۱۹۰۱ء جنوری ۱۹۰۲ء کے دوران ایران کے ایک قدیم شہر "سوس" کی کھدائی کے دوران دریافت ہوا جسے "قانون حمورابی" کہا جاتا ہے[۷]۔ قانون حمورابی جو پتھر کے ٹکڑوں پر کندہ تحریری شکل میں دستیاب ہوا، یہ ایک قدیم قانونی دستاویز ہے جس کے بارے میں ماہرین آثار قدیمہ کا کہنا ہے کہ حمورابی بادشاہ نے پتھر کے مینار پر یہ قوانین کندہ کرائے تھے[۸] حمورابی حضرت مسیح علیہ السلام کی ولادت سے کوئی دو ہزار سال قبل عراق (بابل) کا بادشاہ گزرا ہے۔ یہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کا ہم عصر تھا۔ عہدنامۂ قدیم میں اس کا ذکر ملتا ہے۔

معروف مصری اسکالر عبدالسلام الترمانینی کہتے ہیں :

" وضع ھذا القانون الملک حمورابی اشھر ملوک بابل (وھو سادس ملوک

بابل) عام ۲۰۰۰ ق م، وهو مجموعته لتقليدهم ترجع الى عهد اقدم بكثير من العهد
الذى وضع فيه، وقد اكتشفته بعثه فرنسيه اثريه فى مدينة سوس (دولة
الايرانيه) عام ۱۹۰۲ م ووجد منقوشا على مسلة حجريه اسطوانيه الشكل
محفوظه فى متحف اللوفر بباريس...[۹]

قانون حمورابی میں جن جرائم کا ذکر ہے ان میں سرقہ، زنا، حرابہ اور قذف شامل ہیں[۱۰]۔
بابلی تمدن کے قوانین سے متعلق دریافت ہونے والی تحریروں میں سے یہ مفصل ترین تحریر ہے[۱۱]۔
ماہرین کا کہنا ہے کہ قانون حمورابی سے قبل بھی قدیم (عراق) بابل میں قوانین کا وجود تھا[۱۲]۔ چنانچہ
قدیم بابلی قوانین میں سے جو کچھ اب تک دریافت ہو سکا ہے ان میں "اورنمو" کے قانون کو قدیم
ترین مانا گیا ہے، فوزی رشید کہتے ہیں:

"الملک اورنمو يعتبر موسس سلالته اور (URR) الثالثه ۲۱۱۵-
۲۰۰۲ ق م) والذى بدا حكمه ۲۱۱۱ ق م وشريعته تعتبر فى الوقت
الحاضر اقدم شريعته معروفته لدى الانسان[۱۳]"۔

(ارنمو بادشاہ کو تیسرے خاندان ار (۲۱۱۱ - ۲۰۰۲ ق م) کا بانی سمجھا جاتا ہے جسکا
دور اقتدار ۲۱۱۱ ق م سے شروع ہوا اور موجودہ دور میں دنیائے انسانیت میں
اسی کے مجموعہ قوانین کو سب سے قدیم ترین مانا گیا ہے۔)

علاوہ ازیں قدیم بابلی تہذیب میں قانونی ارتقاء کی ایک شکل قانون "ایشنونا" ہے جو
بغداد کے قرب وجوار کی کھدائی کے دوران ۱۹۴۵ء میں دریافت ہوا، فوزی رشید لکھتے ہیں:

"فى عام ۱۹۴۵ م قامت مديريته الآثار العامته بتنقيبات فى موقع
حرمل الواقع فى مدينته بغداد ووجدا لوحان مدونان بقانون ايشنونا

وھذان اللوحان باللغۃ السامیۃ البابلیۃ[۱۴]

(۱۹۴۵ء میں ڈاکٹر کنریٹ جنرل آثار قدیمہ نے بغداد میں واقع ایک مقام "تدیرا" کی کھدائی کے دوران دو ایسی تختیاں دریافت کیں جو قانون الیشنونا پر مشتمل تھیں اور یہ دونوں تختیاں بابل کی سامی زبان میں تھیں۔)

۲۰۱۷ ق م سے ۱۷۹۴ ق م کے عرصہ میں بابلی تہذیب جس قانون کے تابع تھی وہ "لبت عشتار" (LIPT ISHTAR) کے نام سے موسوم ہے۔ لبت عشتار "ایسن" فیملی کا پانچواں بادشاہ گزرا ہے، امریکن جورنل آف آرکیولوجی کے حوالہ سے فوزی رشید لکھتے ہیں:

لبت عشتار ھو خامس ملوک سلالۃ ایسن (۲۰۱۷-۱۷۹۴ ق م) وحکم من ۱۹۳۴ ق م - ۱۹۲۴ ق م، اما اللغۃ التی کتبت بھا الشریعۃ ھی اللغۃ السومریۃ رغم ان مقننھا سامی الاصل ولیس سومریا، وفی عام ۱۹۴۷ء عام کشف النقاب عن شریعۃ لبت عشتار...[۱۵]

(لبت عشتار خاندان ایسن ۲۰۱۷ - ۱۷۹۴ ق م کا پانچواں بادشاہ ہوا ہے اس نے ۱۹۳۴ ق م سے ۱۹۲۴ ق م تک حکومت کی۔ قوانین کا دریافت شدہ مجموعہ سومارین زبان میں ہے باوجودیکہ اس کا بنانے والا اصلاً سامی نسل کا ہے اور سومری نہیں ہے۔ ۱۹۴۷ء میں لبت عشتار کا قانون منظر عام پر آیا)

محولہ بالا مجموعہ قوانین میں جرائم حدود اور ان کی سزائیں مذکور ہیں، چونکہ یہ مجموعہ ہائے قوانین مکمل نہیں مل سکے بلکہ ان میں سے بعض کے بعض حصے ہی دریافت ہوسکے ہیں، اس لیے اس دور کے جرائم حدود کی مکمل تصنیفات سامنے نہیں آسکیں، تاہم دستیاب ہوا ہے

یہ تو واضح ہوتا ہے کہ اس دور قدیم میں بھی کم و بیش یہی جرائم قابل مواخذہ شدید متصور ہوتے تھے اور ان کی کڑی سزائیں مقرر تھیں۔ ذیل میں ان کا ترتیب وار تفصیلی جائزہ پیش کیا جاتا ہے۔

حد زنا اور قدیم بابلی تمدن | فعل زنا قدیم بابلی تمدن میں قبیح خیال کیا جاتا تھا اور زانی و زانیہ کے لیے حالات و زمانہ کی رعایت کرتے ہوئے سزا مقرر تھی تاہم فعل زنا کی انتہائی سخت سزا "قتل" یعنی سزائے موت مقرر تھی، قدیم بابلی قانون' قانون اور نمو میں زنا کی سزا کا ذکر ملتا ہے قانون اور نمو کا ضابطہ نمبر ۴ اور ۵ جو کہ زنا سے متعلق تھا (کا عربی ترجمہ حسب ذیل ہے۔)

اذا غوت زوجۃ رجل بمفاتنہا رجلا اخر بحیث انہ جامعہا، فللزوج الحق فی ان یقتل المرأۃ (زوجتہ) ولکن یجب اطلاق سراح الرجل الذی اغوتہ تلک المرأۃ[۱۵]

(اگر کسی کی بیوی کسی غیر شخص کو اپنے دامن فریب میں اس طرح گرفتار کرلے کہ وہ اجنبی شخص اس سے جماع کر بیٹھے تو اس عورت کے شوہر کو حق حاصل ہے کہ وہ اپنی (اس بدکار) بیوی کو قتل کر ڈالے' جبکہ اس زانی شخص کو جسے اس عورت نے پھسلایا ہو چھوڑ دیا جائے گا)

زنا بالجبر کی سزا اس سے بھی مختلف تھی، لونڈی سے زنا کرنے والے پر پانچ شیقل چاندی جرمانہ لگایا جاتا تھا۔

اذا ازال رجل بکارۃ امۃ رجل اخر بالاکراہ' علیہ ان یدفع (کغرامۃ) خمسۃ شیقلات من الفضۃ[۱۶]

(یعنی اگر کوئی مرد کسی دوسرے مرد کی بیوی کی بجبر بکارت زائل کردے تو اس پر لازم

تھا کہ وہ چاندی کے ۵ شیقل جرمانہ ادا کرے)

جبکہ آزاد لڑکی کی زنا بالجبر کی سزا موت تھی (ضابطہ نمبر ۱۳۰)

شادی شدہ عورت اگر مرتکب زنا ہوتی تو اسے باندھ کر دریا میں ڈالدیا جاتا تھا تاہم اگر اس کا شوہر یا بادشاہ معاف کرنا چاہتا تو اسے معافی کا اختیار تھا۔ قانون حمورابی کا ضابطہ نمبر ۱۲۶ اس سلسلہ میں یوں ہے:

اما المراة المتزوجة التی تزنی فتلقی مقیدة فی النھر الا اذا عفا عنھا زوجھا ا و یخلی الملک سبیلھا۔[۱۸]

(یعنی شادی شدہ زانیہ عورت کو باندھ کر دریا میں ڈالا جاتا۔ ہاں اگر اس کا شوہر اسے معاف کر دیتا یا بادشاہ اسے چھوڑ دیتا تو خلاصی ممکن تھی۔)

قانون ایشنونا میں بھی زنا کی سزا موت مقرر تھی جیسا کہ اس قانون کے ضابطہ نمبر ۲۹ میں ہے:

اذا قبض علی الزوجة فی حضن رجل آخر فیجب ان تقتل[۱۹]

(اگر کوئی بیوی کسی دوسرے شخص کے جنوں سے پکڑی جائے تو اسے قتل کرنا چاہیے)

زنا کے الزامات کا تدارک کرنے کی غرض سے قانون ایشنونا میں زواج شرعی کی تعریف درج تھی تاکہ شرعی اور غیر شرعی جوڑوں میں تمیز ہو سکے، قانون کا ضابطہ نمبر ۱۲۸ اس کی وضاحت اس طرح کرتا ہے:

اذا تزوج رجل امراة بدون سوال ابیھا و امھا ولم یقم بولیمة لیلیة ولم یکتب (بذلک) عقدا مختوما مع ابیھا و امھا فلا تکون ھذہ المراة زوجة شرعیة حتی لو عاشت فی بیتہ سنة کاملة (المادة الثامنة والعشرون من قانون ایشنونہ)[۲۰]

یعنی جب کوئی شخص کسی لڑکی سے بغیر اس کے والدین کی رضامندی کے شادی کرلے اور شب زفاف کے بعد ولیمہ کا اہتمام نہ کرے اور نہ ہی لڑکی کے والدین کا دستخط شدہ یا مہر کردہ کوئی وثیقہ نکاح لکھوائے تو ایسی لڑکی اس کی شرعی (قانونی) بیوی متصور نہ ہوگی اگرچہ وہ سال بھر اس کے گھر میں پڑی رہے۔

اس سے متصل ضابطہ نمبر ۲۹ میں ہے کہ:

اگر ولیمہ شب زفاف میں اہتمام کیا جائے اور لڑکی کے والدین سے وثیقہ نکاح لکھوا لیا جائے تو اس صورت میں یہ لڑکی اس کی قانونی بیوی ہوگی اور جب بھی کسی دوسرے شخص کے پہلو میں پائی جائے گی تو اسے سزائے موت دی جائے گی۔ اسے زندہ نہ چھوڑا جائے گا۔

اس ضابطہ کے (عربی ترجمہ کے) الفاظ یوں ہیں:

ولکن اذا اقام ولیمۃ لیلۃ الزفاف وکتب العقد مع ابیھا وامھا ودخل بھا فانھا (فی ھذہ الحالۃ) زوجۃ شرعیۃ یوم یقبض علیھا فی حضن رجل اخر یجب ان تموت ولا تستمر فی قید الحیاۃ (المادۃ التاسعۃ والعشرون من شریعۃ وقانون ایشنونتہ)[1]

اس طرح قدیم بابلی تمدن کے قوانین میں زنا بالتراضی، زنا بالجبر، زانی محصن، زانی غیر محصن، زنا بالحرۃ اور زنا بالامۃ کی سزائیں مقرر تھیں۔

۲۔ قدیم مصری تمدن | قدیم مصری تمدن میں نظام عقوبات کیا تھا اس کے بارے میں تاریخ کے صفحات مصدقہ معلومات بہت کم فراہم کرسکے ہیں جو کچھ فراعنہ مصر کے دور سے متعلق مواد قدیم تاریخی دستاویزات سے محفوظ کیا جا سکا ہے اس سے کسی مدون و مرتب مجموعہ قوانین کا پتہ نہیں چلتا۔ اس صورت حال پر گفتگو کرتے ہوئے مصر کے ایک معروف ماہر قانونیات

ڈ بومی مہران لکھتے ہیں :

" ومن اسف ان معلوماتنا عن شئون القضاء فی مصر قلیلة وبینما ومن الناس قوانینهم فی بابل لم تصل الینا صورة واحدة لای قانون مصری کتب علی بردیة من عصر الدولة القدیمة ولیس معنی هذا ان المصریین لم یعرفوا القانون بل اننا لا زلنا نعتقد هذه الوثیقة التی لابد وانها کانت موجودة ولم تصل الینا بعد۔ [۲۲]

(افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ (قدیم) مصر میں رائج نظام قضاء کے بارے میں ہماری معلومات بہت کم ہیں۔ جس زمانہ میں بابل میں لوگوں نے اپنے قوانین مرتب کیے اس دور قدیم کے کسی مصری نسخہ قانون تک ہماری رسائی نہیں ہو سکی لیکن اس کا یہ مطلب بھی نہیں کہ عہد قدیم میں مصر کے لوگ کسی قانون سے نابلد تھے بلکہ ہمارا اب بھی یہ خیال ہے کہ اس دور کا کوئی نہ کوئی مرتب شدہ قانون ہوگا اور اس کی باقاعدہ تحریری دستاویز بھی ہوگی جو اب تک ہمیں دستیاب نہیں ہو سکی۔)

قدیم مصری قانون کے بارے میں کچھ اس طرح کے خیالات کا اظہار دیگر مورخین نے بھی کیا ہے۔ مثلاً اکبر شاہ خان نجیب آبادی کہتے ہیں کہ :

" مصر قدیم کا کوئی مجموعہ قوانین بائیبل یا منوسمرتی کی طرح مرتب و مدون اگرچہ موجود نہیں تاہم مصر کے حالات جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے چودہ سو [۱۴۰۰] سال قبل کی تاریخوں کے ذریعہ معلوم ہو سکے ہیں ان سے کچھ نہ کچھ اندازہ قوانین مصر قدیم کا کیا جا سکتا ہے [۲۳]

مورخین اس بات پر متفق ہیں کہ قدیم مصر کے بادشاہوں کی حیثیت دیوتاؤں

کی تھی اور وہ پورے ملک کے مختار کل تصور کیے جاتے تھے۔ تاہم نظام حکومت چلانے کے بہت سے عہدیدار مقرر تھے۔ متحدہ مصر میں کوئی تحریری قانون نہ تھا بلکہ بادشاہ ماعت (MAAT) کے اصولوں کے مطابق حکم صادر کرتا تھا[۲۴]۔ مات کے اصولوں کی روشنی دیوانی و فوجداری قوانین بھی تھے، زنا قابل سزا جرم تھا اور اس کی سزا بہت سخت تھی مجرموں کو کوڑے بھی مارے جاتے تھے۔ ناک کے بدلے ناک اور کان کے بدلے کان کا قانون بھی رائج تھا۔ جلا وطنی کی سزا بھی تھی، زندہ جلا دینا، سولی دینا اور گلا گھونٹنا گردن مارنے کا بھی رواج تھا، سب سے سخت سزا زندہ ممی بنا دینے کی تھی، جان و مال حفاظت اور قانون پر عمل درآمد کرنا فرعون کے اہم ترین فرائض میں سے تھا[۲۵]۔ ذیل میں دستیاب بعض تاریخی شواہد پیش کیے جاتے ہیں:

قدیم مصری تمدن اور جرائم کی سزائیں

(۱) **جرم زنا**: زنا مصری تمدن میں اور سخت قابل سزا تھا اور زانی و زانیہ کو دریا برد یا نذر آتش کر دیا جاتا تھا، گویا انتہائی اذ طریقہ سے سزائے موت دی جاتی تھی۔ محمد بیومی مہران کہتے ہیں:

"وصلتنا بعض احکام من قانون العقوبات فی بوردیته وستکار حیث کان یکتب علی الزانیه والزانی الموت غرقا او حرقا ففی روایتها عن علاقة الشاب بامراة کاهن ان الشاب قد افترسه تمساح من صنع الکاهن نفسه وان المراة المعرب انما قد اقتیدت الی ساحة شمالی القصر حیث احرقت حملنا والقی ببرادها فی النهر ولعل ذلک کان عقاب الزانیة المحصنة وعلی ای حال من الاحوال فهناک ما یشیر الی تخفیف هذه العقوبة فیما تلا ذلک من العصور فاصبحت جدع الانف[۲۶]۔

(بعض قوانین سے پتہ چلتا ہے کہ زانی اور زانیہ کو دریا برد کرکے یا نذرِ آتش کرکے سزائے موت دی جاتی تھی، اس سلسلہ میں ایک روایت یوں ملتی ہے کہ ایک نوجوان کا کسی کاہن کی بیوی سے ناجائز تعلق قائم ہو گیا۔ چنانچہ کاہن نے اس نوجوان کو مگرمچھ کے منہ میں ڈلوا دیا جبکہ اپنی فاحشہ بیوی کو محل کے شمالی میدان میں جلوا دیا اور اسکی راکھ کو دریا میں ڈالدیا گیا۔ غالباً یہ زانیہ محصنہ کی سزا تھی تاہم بہت سے شواہد اس بات کا پتہ دیتے ہیں کہ اس جرم کی سزا میں بعد کے زمانوں میں تخفیف ہوتی چلی گئی تا آنکہ صرف ناک کاٹنے پر اکتفا کیا گیا۔)

انسائیکلوپیڈیا آف ریلیجن اینڈ ایتھکس کے مطابق مصر کے ایک شخص ابانیر کا واقعہ ہے کہ اس کی بیوی نے کسی دہقان سے زنا کرایا۔ چنانچہ دہقان کو مگرمچھ کو کھلا دیا گیا اور عورت پبلک کے سامنے زندہ جلا کر اس کی راکھ دریا میں بہا دی گئی۔[۲۷]

اسی طرح ایک اور واقعہ میں ایک عورت کے اپنے دیور سے زنا کرنے کی خواہش کا اظہار کرنے اور دیور کے انکار پر عورت کی طرف سے اس پر تہمت لگانے اور عورت کے خاوند کی طرف سے عورت کو کتوں کے آگے ڈلوانے کا ذکر بھی ملتا ہے۔[۲۸]

علاوہ ازیں قدیم مصری تہذیب میں ایک دستور یہ بھی رہا کہ اگر کسی عورت کے پاس اس کے گھر میں کسی اکیلے غیر مرد کو پایا جاتا تو اسے موت کے گھاٹ اتار دیا جاتا، کبھی بدکار عورت کی زبانیں گدی سے کھینچ لی جاتی تھیں اور زنا بالجبر کے مجرم کو آختہ کر دیا جاتا تھا۔ الغرض قدیم مصری معاشرہ میں مختلف اوقات و اماکن میں مختلف النوع سزائیں رائج تھیں تاہم قدیم مصری تہذیب میں زنا ناقابل مواخذہ جرم کبھی نہیں رہا۔

(۲) جرم سرقہ اور حرابہ : چوری قدیم مصری معاشرہ میں ناسور کی شکل

اختیار کر چکی تھی اور اس کے نت نئے طریقے ایجاد کیے جاتے تھے۔ بعض تاریخی مصادر اس بات کی نشاندہی کرتے ہیں کہ اس دور میں چوری کو کوئی بڑا جرم نہیں سمجھا جاتا تھا، اکبر شاہ خان نجیب آبادی کے بقول :

"مصر میں چوری کوئی بڑا جرم نہیں سمجھا جاتا تھا، بلکہ وہاں چوری کا ایسا عجیب وغریب طریقہ رائج تھا کہ جس کی نظیر دنیا کے کسی ملک اور کسی قوم میں تلاش نہیں کی جاسکتی جس کی تفصیل یہ ہے کہ جو شخص پولیس کا افسر اعلیٰ ہوتا وہی چوروں کا سب سے بڑا سرغنہ بھی ہوتا تھا جو شخص چوری کا پیشہ اختیار کرتا وہ اپنا نام اور پتہ مذکورہ افسر اعلیٰ کے دفتر میں درج کرا دیتا اور جب چوری کرتا تو اس کی پوری کیفیت یعنی چوری کرنے کا وقت اور مال مسروقہ کی مالیت وغیرہ بھی آکر درج کرا دیتا، اب جس کا مال چوری کیا گیا ہے وہ شخص جب پولیس افسر کے یہاں آکر چوری کی اطلاع کرتا اور سراغ رسانی کی التجا کرتا تو وہ پولیس افسر چوری کے مال کی چوتھائی قیمت بطور تاوان اصل مالک سے وصول کر کے مال اس شخص کو دلا دیتا۔ وصول شدہ تاوان میں سے کچھ حصہ چور کو مل جاتا اور کچھ سرکاری خزانہ میں داخل ہوتا، گویا چوری کو ایک جائز پیشہ قرار دیدیا گیا تھا"[29]

عموماً ڈکیتی اور چوری کی سزائیں معمولی ہوتی تھیں تاہم کسی مستند ذریعہ سے ان کی کیفیت کا علم نہیں ہو سکا۔ جرائم قذف و شرب خمر کے سلسلہ میں تاریخی و قدیم مصری مصادر خاموش ہیں۔ مصر میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ورود کے بعد قانونی ارتقاء کا عمل شروع ہوا اور بہت سے قدیم قوانین کی جگہ الہامی قوانین نے لے لی۔ چنانچہ زنا، سرقہ، قذف اور حرابہ وغیرہ کی سزائیں تورات میں مذکور ہیں جن کا ذکر "حدود شرائع سابقہ میں" کے

عنوان سے شامل مقالہ ہے۔

۲۔ قدیم تمدن روما اور جرائم | رومن تہذیب قدیم تہذیبوں میں سے ایک ہے اس کا اپنا ایک مجموعۂ قوانین ہے جسے بارہ الواح کا قانون کہا جاتا ہے اس قانون میں سرقہ اور رہزنی (حرابہ) کا ذکر ملتا ہے۔ سر ہنری سمنرمین قدیم قانون روما کے بارے میں لکھتے ہیں:

"قدیم اقوام کا قانون فوجداری قانون جرائم نہیں بلکہ وہ قانون افعال ناجائز ہے اگر اس کے لیے انگریزی اصطلاح استعمال کی جائے تو یہ ٹارٹ (TORT) یعنی قانون ہرجہ کہلائے گا، قانون روما کی ابتدا سرقہ سے ہوتی ہے اور وہ خلاف ورزیاں جنھیں ہم خالص جرائم سمجھنے کے عادی ہیں افعال قابل ہرجہ متصور ہوتے ہیں، مقننین نے صرف سرقہ ہی کو نہیں بلکہ حملہ اور سخت رہزنی (حرابہ) کو بھی مداخلت بیجا۔ ازالہ حیثیت عرفی اور غلط الزام کے ساتھ ملا دیا ہے"[۳۰]

گویا رومن تہذیب میں جرائم سخت قابل سزا نہیں بلکہ معمولی جرائم سمجھے جاتے تھے اور ان کی سزائیں جرمانوں تک محدود تھیں۔ بارہ الواح کے قانون کے مطابق سرقہ کو دو اقسام میں تقسیم کیا گیا ہے۔

۱۔ سرقہ FURTUM　۲۔ سرقہ بالجبر (حرابہ) ROPINA۔

اگر چور سرقہ ظاہرہ کرتا یعنی سرقہ کے وقت مقام سرقہ سے گرفتار کر لیا جاتا تو اسے سزائے تازیانہ دی جاتی بشرطیکہ وہ مال مسروقہ سمیت جائے واردات سے گرفتار ہوا اور اگر مال مسروقہ لے کر اپنے گھر پہنچ جائے تو یہ سرقہ غیر ظاہرہ سمجھا جاتا تھا، سرقہ ظاہرہ میں تازیانہ لگانے کے بعد سارق مالکِ مال کا غلام بنا لیا جاتا اور اگر کوئی غلام سرقہ کرتے ہوئے پکڑا جاتا تو اسے پہاڑی سے گرا دیا جاتا اور گرانے سے قبل سزائے تازیانہ دی جاتی۔ بعد میں اس میں

...ت کر دی گئی اور آزاد یا غلام دونوں کو مال مسروقہ کا چار گنا لے کر چھوڑ دیا جاتا[۱]

قدیم رومن ایمپائر میں ۷۵ سے ۲۱۲ ق م میں رائج قانون رومانی کے مطابق سزائیں ...ہ کے جذبہ تسکین کی خاطر دی جاتی تھیں اور وہاں مقصود جرم کی اصلاح یا معاشرہ کی فلاح ...ہوتا تھا۔[۳۲]

قدیم رومن تہذیب میں شراب نوشی عام تھی اور زنا پر کوئی پابندی نہ تھی، ول ڈیوران ...روما کا حال بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ "قانونی طور پر ایک سے زیادہ شادی کرنے ...بندی تھی مگر جنسی خواہشات کی تسکین کا مکمل سامان موجود رہتا تھا"[۳۳]

ول ڈیوران کہتے ہیں پروکوپیوس (PROCOPIUS) نے اپنی کتاب سیکرٹ ہسٹری (SECRET HISTOR...) میں لکھا ہے کہ "اس کے زمانہ کی تمام عورتیں علانیہ بدکار تھیں، قحبہ خانے تھے اور زناکاری کا کاروبار کھلے بندوں جاری تھا"، جسٹینین اور اس کی ملکہ نے عصمت ...ی کو ختم کرنا چاہا، انہوں نے عصمت فروشی کا دھندا کرنے والے مرد و زن کو قسطنطنیہ سے ...جانے کا حکم دیا لیکن انہیں کوئی خاطر خواہ کامیابی نہ ہوئی۔[۳۴]

قدیم تمدن ہند اور جرائم کی سزائیں ہندوستان کی ہندو اقوام وید اور منوسمرتی کو ...بل کی طرح اپنے قدیم صحیفے خیال کرتی ہیں، ایرانیوں کے مہر آبادی صحائف موجود نہیں ...ژند اوستا کے جو اجزا موجود ہیں وہ بہت مشتبہ اور ناکافی ہیں جن سے یہ اندازہ کرنا خاصا ...دشوار ہے کہ اس دور میں نظام حدود (جرم و سزا) کیا تھا۔[۳۵] تمدنِ ہند کی قدامت کا اندازہ ...اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ مورخین نے اس کی اساس منوسمرتی کو ہزاروں لاکھوں ...بلکہ کروڑوں سال قدیم کہا ہے۔

کلیات آریہ مسافر صفحہ ۰ کالم ۲ کے مطابق منوسمرتی بارہ کروڑ سال قبل کی تصنیف

ہے ایک سابق گورنر بمبئی مسٹر الفنسٹن اپنی کتاب تاریخ ہند میں منوسمرتی کو ۹۰۰ ق م کا بتاتے ہیں، ان کا خیال ہے کہ منوسمرتی کا مصنف منوجی حضرت عیسی علیہ السلام سے نوسو برس قبل گزرا ہے

ڈبلیو ڈبلیو ڈاکٹر ہنٹر جو کہ امپیریل گزٹ آف انڈیا کے ڈائریکٹر تھے اپنی کتاب تاریخ ہند میں کہتے ہیں کہ منوسمرتی ۵۰۰ ق م میں تصنیف ہوئی جبکہ زردشت کے بارے میں مورخین کا خیال ہے کہ یہ ۱۲۰۰ ق م یا اس سے بھی قبل ہوئے ہیں[۳۶]

تمدن ہند کے بارے میں مختلف آرا پائی جاتی ہیں، میکڈونلڈ کا خیال ہے کہ یہ تمدن سمیریا کی فرع تھا جبکہ ہال کے خیال میں سمیریا کا تمدن بذات خود ہڑپائی تمدن کی ایک شاخ ہے، تاہم یہ بات یقینی ہے کہ وادی سندھ کے جہاز راں بحری سفر کر کے سمیریا بابل تک جایا کرتے تھے اور اس بات کے شواہد بھی موجود ہیں کہ جب مصر میں بڑا اہرام تعمیر کیا گیا اس وقت ہڑپا اور موئن جو داڑو کا تمدن عروج پہ تھا۔ وادی سندھ کا تمدن جس کے آثار موئن جو داڑو اور ہڑپا سے ملے ہیں جناب مسیح علیہ السلام کی پیدائش سے تین ہزار برس پہلے موجود تھا[۳۷]

قدیم ہندی تمدن اور جرم سرقہ منوسمرتی میں جسے ہندو اپنی تہذیب کا سرمایہ قانون و تمدن اور دھرم شاستر بتاتے ہیں بعض تعزیرات کا ذکر ہے، سرقہ کے بارے میں منوسمرتی میں مختلف النوع سزائیں پائی جاتی ہیں۔ مثلاً:

" خاندانی عورت یا عمدہ جواہر کو اگر کوئی چرالے تو اسے قتل کر ڈالنا چاہیے"[۳۸]

" جو چور نقب زنی کر کے رات میں چوری کا کرتے ہیں ان کے دونوں ہاتھ کاٹ کر ان کو تشہیر کرنا چاہیے، جو چور اول مرتبہ گرہ کاٹے اس کی انگوٹھے کے پاس کی انگلی کاٹنا چاہیے، دوسری مرتبہ ارتکاب جرم ہو تو ہاتھ یا پاؤں کاٹنا چاہیے اور

تیسری مرتبہ قتل کرنا مناسب ہے۔[۳۹]

" برہمن کی گائے چرانے والے کا آدھا پاؤں کاٹ لینا چاہیے "[۴۰]

منو نے یہ تجویز کیا کہ اگر کوئی شودر چوری کرے تو وہ بطور جرمانہ مال مسروقہ کی قیمت کا آٹھ گنا ادا کرے جبکہ ویشیوں، کھشتریوں اور برہمنوں کے لیے بھی جرمانہ مال مسروقہ کی مالیت کا علی الترتیب سولہ گنا، بتیس گنا اور چونسٹھ گنا تجویز کیا گیا ہے۔[۴۱]

البیرونی ہندوستان کے جرم و سزا کا ذکر کرتے ہوئے کہتے ہیں:

" اما السرقہ فعقوبتہ السارق بمقدارھا فانھا ربما اوجبت التنکیل بالفراط والتوسط وربما اوجبت التادیب التغریم وربما اوجبت الاقتصار علی الفضیحۃ والتشھیر فان کان المقدار عظیما سمل الولاۃ البرھمن او قطعوہ من خلاف و قطعوا کشتو ولم یسملوہ وقتلوا غیرھا[۴۲]

گویا چوری کی سزا مال مسروقہ کی مالیت کے پیش نظر اور ذات پات کی تقسیم کے لحاظ سے ہوتی تھی، اگر مالیت بہت زیادہ ہوتی تھی تو راجا برہمن چور کو اندھا کر دیتا تھا اور اس کا دایاں ہاتھ اور بایاں پاؤں کاٹ دیتا تھا۔ کھشتری چور صرف اندھا نہیں کیا جاتا تھا باقی پوری سزا اسے دی جاتی تھی۔

ہندوستان میں چوروں کی سزا کے مختلف طریقے مختلف اوقات میں رائج رہے۔ ان میں سے ایک یہ بھی ہے کہ ایک لمبی لکڑی کے دونوں کناروں کو تیز کر کے اس کی دھار بنا دی جاتی تھی اور چور کو اس پر بٹھا دیا جاتا تھا تاکہ لکڑی اس کے جسم میں گھس جائے نیز رہزنوں کو قتل کرنے کا رواج بھی تھا۔[۴۳]

حوالہ جات

[1] شاہ ولی اللہ حجۃ اللہ البالغہ ۲-۱۱۱ [2] Will Durant The Story of Civiliza
tion P 1 [3] W. H. Mcneill Encyclopaedia Americana
Vol 7 P 3 [4] ایضاً [5] پیر محمد کرم شاہ الازہری، ضیاء النبی، ج ۱، ص ۵۴۱ [6] علی عباس،
روایات تمدن قدیم، ص ۱۲ [7] فوزی رشید الشرائع العراقیہ القدیمہ ص ۱۳ [8] عبد القیوم جالندھری،
قوانین اسلامی ممالک، ص ۵۰ [9] عبد السلام الترمانینی، محاضرات فی تاریخ القانون، ص ۵۲ نیز فوزی
رشید، الشرائع العراقیہ القدیمہ، ص ۸۱ [10] ایضاً [11] ایضاً [12] ایضاً [13] ایضاً [14] ایضاً : نیشنر
American Journal of Archaelogy V II No. 3CJuly - Sept
1984 [15] فوزی رشید، الشرائع العراقیہ القدیمہ، ص ۳۸ [16] ایضاً : ص ۱۷ [17] ایضاً [18] سامی سعید
المدخل الی التاریخ العالم القدیم، ج ۲، ص ۲۵۲ [19] ایضاً [20] فوزی رشید، الشرائع العراقیہ القدیمہ، ص ۶۶
[21] ایضاً [22] محمد بیومی مہران، تاریخ الشرق الادنی القدیم، ص ۳۲۵ [23] اکبر شاہ خان نجیب آبادی، مقدمہ
تاریخ ہند، ج ۲، ص ۸۹ [24] سراج الاسلام سید، عہد قدیم و جدید، ص ۴۶ [25] ایضاً [26] محمد بیومی مہران، تاریخ
الشرق الادنی، القدیم، ص ۲۲۶ [27] انسائیکلوپیڈیا آف ریلیجن اینڈ ایتھکس، ج ۱، ص ۱۲۷ [28] ایضاً [29] نجیب آبادی
اکبر شاہ خان مقدمہ تاریخ ہند، ج ۲ ص ۹۱ [30] سرمنظر حسین سید قدیم قانون روما، ص ۳۲ [31] احمد عبد اللہ المسدوسی
قانون روما، ص ۱۶۵ [32] فرید وجدی، دائرۃ المعارف القرن الرابع العشرین، ج ۳، ص ۳۰۸ [33] قیمر و سمیع عاطف الزین،
لمن الحکم ص ۲۰۰ [34] پیر محمد کرم شاہ الازہری ضیاء النبی ج ۱، ص ۴۰ [35] ایضاً [36] نجیب آبادی اکبر شاہ خان، مقدمہ
تاریخ ہند، ج ۲، ص ۷۰ [37] ایضاً، ص ۸۰ [38] علی عباس، روایات قدیم، ص ۱۸۴ [39] نجیب آبادی اکبر شاہ خان،
مقدمہ تاریخ ہند، ج ۲، ص ۱۲۳ (بحوالہ منوسمرتی ۸ ر ۳۲۳) [40] ایضاً [41] ایضاً [42] الہاشم AL-BASHEM -
ہندوستان کا شاندار ماضی، ص ۱۶۴ - [43] البیرونی، تاریخ الہند ص ۵۴ [44] مناظر احسن گیلانی، ہزار سال
پہلے، ص ۵۹-۶۰

ملفوظاتِ اقبال کی ادبی اہمیت

از ڈاکٹر محمد یٰسین مظہر صدیقی ندوی علیگڑھ

علامہ اقبال (۱۸۷۷ء-۱۹۳۸ء) بڑے جامع کمالات شخص تھے۔ علوم اسلامی پر ان کی نظر اتنی ہی گہری تھی جتنی علوم عصری پر، جس طرح تہذیب مشرق کے وہ رازداں تھے ویسے ہی مغربی ثقافت کے رمز شناس تھے، وہ انسانی نفسیات کے جس قدر ماہر نباض تھے اسی قدر اقوام و ملل کی نفسیات کے گہرے ماہر تھے۔ ڈاکٹر صاحب تصورات و معتقدات مبادیات وحقائق اور تحریکات و مذاہب سے بھی پوری طرح باخبر تھے۔ فلسفہ و حکمت تو ان کی گھٹی میں پڑے تھے، وہ زبان و ادب کے ادا شناس اور مزاج داں تھے۔ کئی زبانوں پر ان کو ماہرانہ قدرت تھی، ان کے دل و دماغ اور ذہن و عقل کے دریچے بھی کھلے ہوئے تھے اور وہ وجدان و الہام، جذبِ دروں اور کیفیات قلب کی دولت ربانی سے بہرہ ور بھی تھے۔

ان کے ملفوظات انہی کثیر الجہات اور رنگارنگ پہلوؤں سے معمور ہیں۔ بقول نذیر نیازی:

"... معمولی سے معمولی مسائل، معمولی سے معمولی واقعات اور حوادث سے پھیلتے پھیلتے اسلام، عالم اسلام، تاریخ، تمدن، سیاست اور معیشت سب پر چھا گئی۔ انسان، کائنات، علم و عقل، فکر و وجدان، ادب اور فن سب اس کی زد میں ہیں۔ اس پر حضرت علامہ کا حسن بیان، صاف و سادہ اور دلنشیں الفاظ، فصاحت و بلاغت، برجستگی

اور بے ساختگی، توجہ اور التفات، شفقت اور تواضع، خلوص اور دردمندی کہ جو ارشاد ہے دل میں اتر رہا ہے، جو بات ہے ذہن میں بیٹھ رہی ہے۔ پھر انکا انکسار علم، شگفتگی اور زندہ دلی کہ ادعا ہے نہ تعلّی، نہ غرور نہ تمکنت۔ متانت بھی ہے تو ظرافت کی چاشنی سے خالی نہیں ...'' (اقبال کے حضور، ص۹)

سرِدست ہم کو ان کے تنوع، رنگا رنگی اور بوقلمونی سے سروکار نہیں ہے بلکہ صرف ...کا ادبی تجزیہ کرنا مقصود ہے، اس سے بھی موضوعات و مضامین کی بوقلمونی کا جلوہ سامنے ...گا۔ عام شہرت یہ ہے کہ اقبال کی نظم شان و شکوہ اور ادبی لطافت و رعنائی سے معمور ...ی ہے لیکن اس کے مقابلے میں ان کی نثر روکھی پھیکی اور بے کیف ہوتی ہے، گو یہ تاثر عام ...گر گہرے مطالعہ کا نتیجہ نہیں ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ان کی نثر بھی ادبیت سے عاری نہیں ہوتی ...برجستہ و برمحل ہونے کی وجہ سے ملفوظات میں بے ساختگی، برجستگی آمد، بے تکلفی اور روانی ...دتی ہے۔ پھر اقبال کوئی عام شخص نہ تھے اور نہ ان کے سامعین و حاضرینِ مجلس معمولی ...اص ہوتے تھے، بلکہ ان میں تعلیم یافتہ، مہذب اور رچے بسے ذوق کے حامل چیدہ اصحابِ ...و نظر ہوتے تھے اور خود میرِ مجلس حکیم الامت شاعر، فلسفی اور ادیب۔ لہٰذا ان کی زبانی نثر ...ی ملفوظات کا ادبی محاسن سے آراستہ ہونا فطری اور لازمی تھا۔

ملفوظات تاریخی ترتیب کے مطابق دن وار یا تاریخ وار مرتب کیے جاتے ہیں اور یہ ...ان اور ایک طرح سے اچھا طریقہ ہے لیکن ان کے تجزیے کے لیے خواہ وہ ادبی مقصد سے ...موضوعاتی طریقہ زیادہ مستحسن نظر آتا ہے کہ اس میں خیالات و افکار کے تسلسل و تناسب، ...و نظر کی ہم آہنگی و ہم رنگی، علم و فن کی پرورش و بالیدگی، حکمت و فقاہت کی نشو و نما ...غیرہ ہماری نگاہوں کے سامنے آتی ہیں اور صاحبِ ملفوظات کی عظمت و مرتبہ کے شاہد

عدل ہونے کے علاوہ قاری و سامع کے لیے جنت نگاہ اور فردوس گوش بنتی ہیں۔ لہذا ہم اس مختصر مقالے میں حکیم الامت کے ملفوظات کا ایک موضوعاتی تجزیہ کریں گے۔

حضرت علامہ اسلام کے حدی خواں اور اسلامی تہذیب و ثقافت کے مداح تھے۔ وہ اسلامی فلسفۂ حیات کو صرف بازیافت کرکے اس کا قصیدہ ہی لکھنا پڑھنا نہیں چاہتے تھے بلکہ سارے عالم میں اور تمام انسانوں میں اسکو خون حیات کی مانند جاری ساری کرنا اور افراد و طبقات کی رگوں میں آب حیات بناکر دوڑانا بھی چاہتے تھے۔ اس لیے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ان کے ملفوظات عالیہ کے تجزیہ کا آغاز کلام الٰہی پر ان کے خیالات و ارشادات سے کیا جائے جو باعث سعادت و برکت بھی ہے

قرآنیات سے متعلق ارشادات مطالعۂ قرآن کریم کے تعلق سے حضرت علامہ کا ارشاد گرامی ہے کہ:

> "قرآن پاک کا مطالعہ کیجئے تو اس کا مقابلہ دوسرے مذہبی صحائف سے بھی کرتے جائیے، یوں اس کا فہم زیادہ آسان ہوجائے گا۔ عہد نامۂ عتیق میں ہے: خداوند نے زمین و آسمان کو چھ دنوں میں پیدا کیا، ساتواں دن خداوند کے آرام کا تھا، اس کے مقابلے میں قرآن مجید کا ارشاد ہے کہ بے شک زمین و آسمان کی پیدائش چھ دنوں میں ہوئی مگر اللہ تعالیٰ کو آرام کی ضرورت پیش نہیں آئی ... یہ لفظ خداوند بھی بڑا غور طلب ہے۔ ... ایسے ہی ہندو اور بدھ دھرم کے تصورات ہیں، مثلاً مایا اور آنند۔ قرآن مجید نے ان کے برعکس حقیقت اور فلاح پر زور دیا ہے..."۔

علامہ موصوف تقابلی مطالعۂ صحائف کے بغیر بھی قرآن کے صحیفۂ ہدایت ہونے کے قائل تھے: "... قرآن سرتاسر ہدایت ہے اور ہر حال میں رہنما۔ یہ کتاب اللہ ہے اور لفظ کتاب غور طلب"۔

اس کے بعد فہم قرآن و تفہیم کتاب الٰہی کے راستوں کی نشاندہی اس طرح فرماتے ہیں:

"بات اصل میں یہ ہے کہ قرآن مجید قلب کے راستے سے بھی شعور میں داخل ہوتا ہے اور دماغ کی راہ سے بھی سمجھ میں آتا ہے۔ دماغ کی راہ سے سمجھ میں آنے کا مطلب ہے حقایق کا ادراک، علم اور فکر، تجربے اور مشاہدے کی روشنی میں .... حقایق کا ادراک ہوتا رہا اور ہوتا رہے گا۔ قرآن مجید ان سب حقایق کا جامع ہے جو ہمارے ادراک میں آچکے ہیں اور ان کا بھی جن کا ادراک باقی ہے۔ خواہ یہ حقایق سنوسی کی زبان سے ادا ہوں خواہ لینن کی، حقایق بہرحال حقایق ہیں۔ ان کو سمجھنے کی جس طرح بھی کوشش کی جائے اپنی جگہ پر ٹھیک ہے۔ مقصد ہے ان کا سمجھنا اور قبول کرنا۔ لہذا انہیں جس طرح بھی سمجھیں یہ قرآن پاک ہی کا سمجھنا ہوگا ....." (اقبال کے حضور اول: ص ۵۹-۵۶)

تفسیر قرآن مجید کے بارے میں حضرت اقبال ایک فلسفیانہ اصول وضع کرتے ہیں اور حقایق قرآنی کو بشری شعور سے جوڑ کر فرماتے ہیں :

"ان آیات میں جن حقایق کی طرف اشارہ کیا گیا ہے، ان کا فہم تو آسان ہے، لیکن غلطی یہ ہے کہ ہم ان کی تاویل شعور کے اس مرحلے کی رعایت سے کرتے ہیں جس سے سردست ہمارا گزر ہو رہا ہے، حالانکہ تاویل سے مقصود کسی حقیقت کو سمجھنا اور اس کی تہ تک پہنچنا ہے ... تاویل اور موضوع تاویل میں لازم و ملزوم کا تعلق ہے، ایک منطقی، حقیقی اور واقعی رشتے کا تعلق۔ یہ نہیں کہ ہم اسے اپنے ہی خیالات اور مرغوبات کی تائید کا ذریعہ بنائیں"۔ (اقبال کے حضور اول، ص ۶۴-۶۳)

مفسرین کی تفسیر اسلام و قرآن کی ایک غلطی کو متکلمین کے حوالے سے یوں واضح کرتے ہیں: "... متکلمین اسلام نے البتہ اس باب میں جو غلطی کی وہ یہ کہ یونانیت کے زیر اثر اس نکتے

کو نظر انداز کر دیا جو خودی میں مضمر ہے ..." (اقبال کے حضور اول ص۱۰۱)

حکیم الامت کی انگلی ہمیشہ قوم اور اس کے اکابر کی نبض پر رہتی تھی اور نگاہ حق اور صرف حق پر۔ وہ اس باب میں خاص کر قرآن کریم اور اسلام کی تعلیمات کے باب میں کسی مصلحت؛ سہل انگاری یا مداہنت کے قائل نہ تھے، مجلس میں ایک بار جب تفسیر قرآن کریم اور بعض دوسرے موضوعات کے حوالے سے مولانا ابوالکلام آزاد کی تفسیر ترجمان القرآن کا ذکر آگیا اور ساتھ ہی مدیر معارف حضرت علامہ سید سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ کے اس پر تبصرہ کا تو مبصر گرامی قدر اور صاحب تفسیر سامی کے فضل وعلم اور بصیرت وحکمت کے بہمہ وجوہ قائل ہونے کے باوجود حضرت علامہ نے اپنی بے لاگ رائے کا اظہار کیا۔ اس کا ایک سبب یہ تھا کہ مبصر گرامی نے اپنی رائے میں تبدیلی کر کے مفسر اور صاحب تفسیر کے بارے میں خاموشی اختیار کرنے کی مصلحت کا ذکر کیا تھا۔ وہ علامہ اقبال کی رائے ہی نہیں ایک اہم اصول تفسیر بھی ہے کہ متاخرین اسی طرح اپنے جلیل القدر متقدمین کی غلطیوں پر پردہ ڈالتے ہیں:

" یہ امر بڑا افسوسناک ہے کہ کسی شخص کا علم وفضل یا احترام ذات ہمیں حق گوئی سے باز رکھے اور وہ بھی ان مسائل میں جن کا تعلق اسلام کی بنیادی تعلیمات سے ہے"۔ (اقبال کے حضور، اول: ص ۵۳-۵۲)

حدیث و سنت نبوی ملفوظات اقبال میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور حدیث و سنت کے تعلق سے اسی طرح ادبی جواہر ریزے ملتے ہیں جن کی ادبیت کے ساتھ ساتھ معنوی بلاغت وفصاحت اور مقصدی حکمت بھی ایک امر مسلم ہے۔ اہل علم وصاحبان دل پر یہ حقیقت روز روشن کی طرح عیاں ہے کہ حضرت اقبال کو قرآن مجید سے نزول کتاب کا تعلق تھا۔ اسی طرح ان کو رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے والہانہ عشق تھا۔ ان کا عشق،

ان کی شیفتگی اور ان کی محبت وجدانی ہی نہیں شعوری بھی تھی اور یہ شعور و وجدان ان کی حکمت اور علم و فضل سے سیراب ہوئے تھے اور ان کے جذب دروں کے بحر ناپیدا کنار سے بھی۔ ان دونوں عظیم وگرامی موضوعات پر اپنے والد ماجد کی تعلیم کا ذکر اپنے الفاظ عالیہ میں یوں فرماتے ہیں:

"اللہ تعالیٰ کا ارادہ عالم انسانیت کو جس معراج کمال تک پہنچانے کا تھا۔ اس کا آخری اور کامل و مکمل نمونہ ہمارے نبی اکرم محمد مصطفیٰ احمد مجتبیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام کی ذات ستودہ صفات میں ہمارے سامنے پیش کر دیا۔ لہذا ہم کہیں گے کہ آدم علیہ السلام سے حضور رسالتمآب صلی اللہ علیہ وسلم تک کے خاتم الانبیاء ہیں، جتنے بھی نبی مبعوث ہوئے، ان میں سے ہر ایک کا گزر مدارج محمدیہ ہی میں سے ہو رہا تھا۔ وہ گویا ایک سلسلہ تھا، جس کا خاتمہ ذات محمدیہ کی تشکیل پر ہوا۔" (اقبال کے حضور، اول ص۶۱)

شعور نبوت کے بارے میں ان کا حکیمانہ ارشاد ہے:

"شعور نبوت کو یہ امتیاز حاصل ہے کہ اس میں زمانے کی ساری وسعتیں سمٹ کر ایک نقطے پر آجاتی ہیں، ماضی و حال اور مستقبل کا امتیاز قائم نہیں رہتا۔ لہذا ہمارے لیے جو بات آنے والی ہوتی ہے شعور نبوت کو پہلے ہی اس کا علم ہوتا ہے اسی طرح جیسے اسکا ظہور ہو رہا ہو۔ یہی وجہ ہے کہ انبیاء علیہم السلام ہر حقیقت اور ہر صداقت کو اپنے سامنے عیاں رکھتے ہیں اور یہی وجہ ہے وحی الہٰی میں ان کے کامل یقین کی۔ لہذا جس علم کا سرچشمہ ہے وحی الہٰی اس میں یقین ہی یقین ہوگا..." (اقبال کے حضور، اول ص ۶۲)

اسی بنا پر حضرت اقبال سنت نبوی کے کامل اتباع میں فوز و فلاح دیکھتے ہیں:

"جہاں تک فرد کی ذات اور معاشرے کی تہذیب و ترقی یا دوسرے لفظوں میں معراج انسانیت کا تعلق ہے یہ مقصد حضور رسالتمآب صلی اللہ علیہ وسلم کے اتباع ہی سے

حاصل ہوگا۔ البتہ یاد رکھنے کی بات یہ ہے کہ کوئی بھی نصب العین ہو اس کے
یقین کامل شرط ہے۔ یقین نہیں تو عمل بھی نہیں، نہ آرزو، نہ ولولہ، نہ جد و جہد۔ (ا
کے حضور، اول ص ۹۲)

جدید اور اسلامی قانون | علامہ اقبال معاصر جدید قانون کے ایک مسلمہ ماہر تھے اور
"قانونِ فقہ پر بہت گہری نظر رکھتے تھے، ان کی ایک دوسری خصوصیت یہ بھی تھی کہ و
قوانین کے تقابلی مطالعہ، جائزہ اور تجزیہ کے علاوہ ان دونوں کی روح سے آشنا
دوسری بات ہے کہ ٹھیٹ علمائے کرام اور فقہائے عظام ان کے بعض فرمودات، او
معتقدات سے مطمئن و متفق نہ ہوں:

"اسلامی فقہ کی رو سے جائیداد میں، خواہ اس کی نوعیت کچھ بھی ہو، وقف یا
منقولہ اور غیر منقولہ کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا نہ اس پر کوئی حق ملکیت ق
ہو سکتا ہے، نہ قانون جدید املاک کا اطلاق ممکن ہے۔ دراصل ضرورت اس ا
ہے کہ ہمارے فقہاء نے زمین کے مسئلہ میں جو کچھ لکھا ہے اس کا تحقیقی مطالعہ کیا
پھر ماہرین فن موجودہ حالات کی رعایت سے اس مسئلہ پر غور کریں۔ زمین کی ب
یہ حیثیت نہیں کہ ہم اس پر عام اشیائے استعمال کی طرح افراد کا حق ملکیت ت
مفکر اسلامی کا خیال تھا کہ فقہ کے مسائل ہوں یا سیاسی نظریات و معاملات
کوئی اور شعبۂ شریعت کا فہم روز بروز کم ہو رہا ہے۔ اسلامی شریعت کی جڑیں خ
"...احکام شریعت کا تعلق صرف فرد کی ذات سے تو نہیں، جماعت سے بھی ہے۔ اح
جس طرح حیات فرد کے ضابطہ ہیں بعینہ انسانی معاشرے کے صورت گر اور ا
ضامن۔ ان سے روگردانی اسلام سے روگردانی ہے۔" (اقبال کے حضور اول ص

ص۳۱۹ اور ص۳۳۳ بالترتیب)

فقہ و کلام، شریعت اور متعدد دوسرے موضوعات سے فنِ استقرار کا تعلق جوڑا ہوا ہے:

"استقرار مسلمانوں کی ایجاد ہے، اسلام ہی نے خیالی کے مقابلہ میں حقیقی اور مجرد کے برعکس محسوس پر زور دیا۔ تجربہ و مشاہدہ اور علم و عقل کو ادراکِ حقیقت کا ذریعہ ٹھہرایا۔ انسان کو دعوت دی کہ اپنی استعداد علم سے کام لے۔ استقرار کی روایت عالم اسلام سے شروع ہوتی ہے۔" (ایضاً ص۱۱۱)

کلام مسلمانوں کی ایجاد ہے اور اس کا نشو ونما عالم اسلام سے مخصوص ـ"... یہ صحیح ہے کہ یہودیوں اور عیسائیوں میں بھی متکلمین پیدا ہوئے اور انھوں نے کوشش کی کہ اپنے عقائد کی تطبیق فلسفۂ یونان سے کریں۔ لیکن بات دراصل یہ ہے کہ مسلمانوں سے پہلے الٰہیات کا کہیں وجود ہی نہیں تھا ... یہ کلام نہیں اس کو لاسٹزم ہے۔ ہمیں دونوں میں فرق کرنا چاہیے ...:"

(ایضاً: ص۱۱۲-۱۱۳)

علامہ شبلی، مولانا سلیمان ندوی اور متعدد دوسرے اہل نظر نے سیرت نگاری اور سوانح نویسی کو جدید علم کلام کا ایک شعبہ قرار دیا تھا، مفکر ملتِ اسلامی نے اسے اجتماعیت یا علم عمران کی شاخ اور امت کی شیرازہ بندی اور بلند اقبالی کا ایک ذریعہ قرار دیا:

"ہمیں بھی اہلِ یورپ کی طرح اپنے رجال اور مشاہیر کی شخصیتوں پر قلم اٹھانا چاہیے مگر افسوس ہے ہم میں کوئی سیرت نگار ہے نہ کسی کو سیرت نگاری کے فن سے دلچسپی ہے، حالانکہ سیرت نگاری حیات ملی کے استحکام کا بہت بڑا ذریعہ ہے۔" (ایضاً ج۲-۳-۲)

امت کی زبوں حالی جس ملت کے وہ مفکر اور جس امت کے وہ مصلح و قائد تھے، اس کی فلاح و بہبود، شیرازہ بندی، دینی و دنیاوی ترقی پر انھیں جتنی خوشی ہوتی تھی اس سے کہیں زیادہ

اس کی پامالی بربادی اور زبوں حالی پر رنج واندوہ ہوتا تھا، وہ ہر ممکن طریقے سے اس کی فکری رہنمائی کی سبیل نکالتے، عملی قیادت کی راہ سجھاتے، اس کی شیرازہ بندی اور اجتماعیت کی فکر کرتے اور اس کی گزشتہ عبقریت اسے واپس دلانے کی کوشش کرتے۔ اس عظیم ملی مسلہ پر ان کے ارشادات عالیہ اور ملفوظات سامیہ آبِ زر سے لکھنے کے لائق ہیں۔ "قوموں کی زندگی کا راز اس جدوجہد میں مضمر ہے کہ اپنا وجود ملی قائم رکھیں اور نہیں بھولیں کہ ان کا ایک اپنا نصب العین ہے۔ لہذا اس موقع پر جب یہ کوشش کی جارہی ہے کہ ہماری جداگانہ قومیت کو ہمیشہ کے لیے ختم کر دیا جائے ہمیں اپنے موقف کا اعلان دلیری سے کرنا چاہیے۔

"...دراصل ہماری مشکل یہ ہے کہ ہم اپنے ملی نصب العین صحت کے ساتھ متعین نہ کرسکے۔ ہماری نظر زیادہ تر اخلاقی اور مذہبی مسائل پر رہی اور ہم سمجھے کہ یہی بہ مقابلہ دوسروں کے ہمارا مابہ الامتیاز ہے۔ اس میں کچھ حالات کو بھی دخل ہے، کچھ ہمارے زوال اور تاریخی روایات کو۔ یہی وجہ ہے کہ ہم وہ قیادت پیدا نہ کرسکے جس کی آج ہمیں ضرورت ہے' (ص ۹-۴۸)... بحیثیت ایک نظامِ مدنیت اسلام ابھی تک ہمارے سامنے نہیں آیا یہ نظامِ مدنیت ایک نہ ایک دن سامنے آئے گا لیکن اس وقت جب مسلمانوں کا شعور ملی بیدار ہوگا اور وہ سمجھیں گے کہ حیات عبارت ہے، ایک سیاسی اجتماعی ہیئت (سے) نہ کہ محض ایک اخلاقی، مذہبی نظام سے ... (ص ۵۰) سیاسی جوڑ توڑ سے کچھ نہیں ہوتا، ہوگا تو یونہی کہ مسلمانوں کی سیاسی اور اجتماعی تحریکات میں اسلام کا رنگ پیدا ہو... ضرورت ہے اسلامی نظامِ مدنیت کے احیاء کی (ص ۱۵۰) ہماری کوشش بہرحال یہ ہونی چاہیے کہ اپنے دل ودماغ اور سیرت وکردار میں وہ رنگ پیدا کریں جس کی اسلام نے تلقین کی ہے اور جس میں شریعت کا اتباع لازم ٹھہرتا ہے..." (ص ۱۵۱)

شاعر مشرق اور فلسفی اسلام نے اسلامی امت کی تاریخ کا گہرا مطالعہ کیا تھا۔ وہ فن تاریخ کے مقصد اور وسائل سے بھی واقف تھے اور اس کے صحیح طریق مطالعہ اور قومی زندگی میں اسکے صحیح مقام سے۔ امتِ اسلامی کوئی ایک محدود جغرافیائی حقیقت نہیں ہے بلکہ وہ آفاقی اور عالمی حقیقت ہے جس کی بنیاد و اساس عقیدہ پر ہے نہ کہ وطن، زبان، رنگ، رسم، رواج یا کسی اور چیز پر۔ حکیم الامت نے اسی لیے پہلے اصل اسلامی امت اور نبوی ریاست کا گہرا مطالعہ کیا جو رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے میثاق مدینہ اور مواخاۃ کی بنیادوں پر قائم کی تھی اور سارے عالم میں پھیلی ہوئی آفاقی امت اسلامی کو بطور کل اور اس کے مختلف حصوں۔ ملتوں کو بطور جزو دیکھا اور سمجھا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے ارشادات میں ہندی ملت کے ساتھ دوسری ملتوں کا ذکر بھی ملتا ہے اور ان کی ساخت پر داخت اور انحطاط و زوال کا تجزیہ بھی:۔

"عرب و عجم دونوں ہمارے ماضی کا تار و پود ہیں۔ ہم عرب کو نظر انداز کر سکتے ہیں نہ عجم کو۔ ہمیں چاہیے ماضی کی تنقید میں مستقبل کو فراموش نہ کریں۔ ... اسلام بنائے قومیت ہے اور اس کا سرچشمہ ہے رسالت؛ لہذا اسلام ایک سیاسی اجتماعی معاشرہ ہے (ص۲۰۴ اور ص۲۱۳) ... اسلام سے پہلے قوموں کی تشکیل جس اصول پر ہوئی تھی اسلام نے اسے تسلیم نہیں کیا اور آج بھی وہ اصول جسے بنائے قومیت ٹھہرایا جاتا ہے ہمارے لیے قابل تسلیم نہیں۔ ... ہمیں تو قومیت کے اس جدید تصور سے اختلاف ہے جو مغرب کے سیاسی فکر کی پیداوار ہے اور جس کا آغاز لوتھر کی تحریک سے ہوا۔ یہ تصور سرتاسر کفر ہے ..." (ص۲۱۹-۲۲۰)

حضرت علامہ کو اندلس کی تاریخ سے بہت دلچسپی بلکہ شیفتگی تھی:

"اسپین کو اسلامی تاریخ سے بڑا گہرا تعلق ہے لیکن اسپین کی تاریخ ابھی تک پردۂ خفا

میں ہے۔ ... اسپین کیا، مسلمان اپنی ساری تاریخ سے بے خبر ہیں۔ ... ص۲۰۳ اندلس اور صقلیہ میں مسلمانوں کی تباہی امت کے ایک جزو کی تباہی تھی۔ امت کا وجود تو بہرحال قائم ہے۔ البتہ یہ ٹھیک ہے کہ قومیں پیدا بھی ہوتی رہتی ہیں اور مر بھی جاتی ہیں۔ قرآن پاک کا بھی یہی فیصلہ ہے۔" (ص ۱۹۶)

حکیم الامت کا تجزیہ بجا ہے کہ اسلامی روح کی پامالی نے یہ دن دکھائے تھے۔

"... یہ حقیقت سامنے آئی کہ یہ صرف تقلید اور فقہی جمود ہی نہیں بلکہ منجملہ اس کے اور بھی کئی خرابیاں ہیں جن سے اسلام کی روح پائمال ہو رہی ہے مثلاً ملوکیت، خانقاہی، علم و حکمت کا زوال، سیاسی اور معاشی ابتری، مغربی تہذیب اور مغربی شہنشاہیت کے غلبہ و استیلار کا بڑھتا ہوا ریلا ..." (ص۳۲۲)

ان کا خیال تھا کہ صورت حال کی اصلاح کے لیے داعیوں کے ساتھ ساتھ صحیح قیادت ضروری ہے۔

" عالم اسلام کے حالات بدل رہے ہیں، یوں بھی مسلمانوں میں اعلیٰ صلاحیتوں کی کمی نہیں۔ اسلام سے بھی ان کا رشتہ بہرحال قائم ہے، ان کی اصل ضرورت ہے قیادت، صحیح قیادت میسر آجائے تو وہ کیا کچھ نہیں کر سکتے۔ ... مجھے تو یوں نظر آتا ہے کہ ہمیں میں سے کوئی صاحب ایمان اٹھ کھڑا ہوگا اور اس کا خلوص اور دیانت ساری قوم کو ایک مرکز پر جمع کر دے گا ... یہ محض خیال ہی خیال نہیں ہے، حقیقت ہے ..." (ص۱۴۶-۱۴۵)

مسلمانوں کی ترقی کا راز اور مغرب کے داؤں پیچ اضمحلال، پسماندگی اور دربدری کو بالعموم قومی ملی اور امتی زوال و انحطاط کا سبب قرار دیا جاتا ہے اور یہ صحیح بھی ہے۔ لیکن اس کے نتیجہ میں ترقی، اقدام اور حرکت کا جو تصور و نمونہ پیش کیا جاتا ہے وہ خطرناک مضمرات اور گمراہ کن

امکانات کا حامل ہے۔ حضرت حکیم الامت کا خیال و عقیدہ اور اعلان تھا کہ اسلام ہی مسلمانوں کی ترقی کا راز ہے جسے بالعموم سربستہ سمجھا جاتا ہے مگر ہے وہ بالکل برجستہ و علانیہ۔ صحیح ملی نشوونما اور امتی ترقی کے لیے اسلامی شریعت کی تابعداری، پیروی اور شیفتگی لازمی ہے۔ یورپ و مغرب کی ترقی کو نہ صرف کھوکھلا اور بے بنیاد سمجھتے تھے بلکہ فرمایا کرتے تھے کہ جن قوموں نے اسکو اپنایا وہ قعر ذلت میں ضرور گریں گے اور خود یورپ کا حال اسی کے سبب ابتر ہے۔ ترقی کے خود ساختہ انسانی تصور کے متعلق حکیمانہ اصول بیان فرماتے ہیں:

"بعض اوقات بات تو ذرا سی ہوتی ہے لیکن انسان اپنے مستقبل سے کہیں دور ہٹ جاتا ہے۔ ہم ایک قدم اٹھاتے ہیں۔ سمجھتے ہیں آگے بڑھیں گے لیکن یہی قدم ہمیں پیچھے لے جاتا ہے، ایک چیز ہاتھ آتی ہے خیال ہوتا ہے بہت بڑی نعمت مل گئی لیکن آگے چل کر وہی چیز زنجیر پا ہو جاتی ہے اور انسان ہے کہ بے بس ہو کر رہ جاتا ہے"۔ (ص ۲۰-۲۱)

یہ حکیمانہ ارشاد ترقی اور بالخصوص یورپی مغربی ترقی ہی پر صادق نہیں آتا بلکہ انسانی فطرت اس کی مساعی اور اعمال کے بارے میں بھی اتنا ہی صحیح ہے۔ معاملہ سارا انسان کی اپنی سوچ و سمجھ کا ہے جو محدود ہے ہر لحاظ سے، وقت سے تصور سے، زمان سے، مکان سے اور حالات و واقعات کے بہاؤ سے۔ اس پر مستزاد ہے فیصلۂ ربانی اور تقدیر الٰہی۔ جب اتنی ساری چیزوں سے انسان لاعلم ہے تو وہ اپنی سمجھ پر کتنا بھروسہ کر سکتا ہے یا اسے کرنا چاہیے، دوسری حکیمانہ بات یورپ کے بارے میں یہ ارشاد فرمائی:

"اطمینان قلب بڑی نعمت ہے اور یہی نعمت ہے جو یورپ نے اپنی مادیت پرستی میں کھو دی ہے (ص ۲۲)۔ ۔ ۔ ۔ ۔ انگریز بڑا کائیاں ہے۔ سیاست کے داؤں پیچ خوب سمجھتا ہے اس نے وہاں بھی جود و سخا سے کام لیا جہاں وفاداری میں ابھی محکومی پر قناعت اور

رضامندی کا رنگ پیدا نہیں ہوا تھا۔ (ص۲۳) "غلامی اور محکومی بہت بڑی لعنت ہے حکومت اور اقتدار ایک سحر ہے جس سے محکوموں کے دل و دماغ ماؤف ہوجاتے ہیں ... انسان جب کسی تہذیب سے متاثر ہوتا ہے تو اس کی اچھی بری باتیں سب اختیار کر لیتا ہے۔ مغربی تہذیب کی نقالی اور اس کے ظاہری اور سطحی پہلوؤں کی دلکشی بجائے خود ایک مصیبت تھی۔ مغربی تعلیم نے ہمارے لیے اور بھی فتنے پیدا کر دیے ... آج کی بات اور ہے۔ آج اس تعلیم کے مضر نتائج ہمارے سامنے ہیں جسے کبھی ترقی کا واحد ذریعہ ٹھہرایا جاتا تھا ہم اس تعلیم کا ماتم کہاں کہاں نہیں کرتے۔ سیاست میں اخلاق میں، فکر و فرہنگ میں تمدن اور معاشرت میں۔ لیکن اس کی خرابیاں تو ابتدا ہی سے عیاں تھیں، یہ دوسری بات ہے کہ یوں دلوں میں جو فساد پیدا ہوا اس کے اثرات بہت آگے چل کر سامنے آئے"۔ (ص۲۵-۲۶)

مفکر اسلامی کے ان خیالات، افکار اور ارشادات سے جو یورپ، مغربی تہذیب، جدید تعلیم اور اس کے جلو میں آنے والی خباثتوں سے ہر صاحب علم و فضل واقف ہے لیکن ان کے ارشادات کی اہمیت یہ ہے کہ وہ دانائے راز، آشنائے حقیقت، محرم درون خانہ اور فیلسوف و حکیم کے تجربات و مشاہدات اور تجزیوں پہ مبنی ہیں جبکہ بیشتر مغربی علماء و فضلاء کے ارشادات محض ان کے خیالات اور سنی سنائی باتوں پر منحصر ہوتے ہیں، اس کو علامہ اقبال انگریزیت یا فرنجیت سے تعبیر کرتے تھے کہ بے بنیاد یا بے خبری کے خیالات پر کسی طرح کا تجزیہ تیار کیا جائے۔ جدید تعلیم اور فرنگی تہذیب نے جو تصورات و افکار، خیالات و مبادیات اور رجحانات و میلانات جنم دیے تھے ان کا بہترین ادراک صرف انہیں کو تھا کہ وہ دونوں جہاں کے مرد میدان تھے۔ اس کھوکھلی مگر بظاہر پرکشش تہذیب نے ہمارے عظیم ترین علماء اور اہل علم کو بھی منفی انداز سے بڑی حد تک متاثر کیا تھا۔ ان اثرات میں سے ایک قومیت کا تصور تھا، مفکر اسلامی کا خیال

تھا کہ افرنجیت نے قومیت کا روپ دھار لیا ہے۔ اسی بنا پر وہ کانگریس کی لادینی سیاست یونینسٹ پارٹی کی وطن پرستی، قوم پرست مسلمانوں کی وطنی سیاست یا قومیت اور ان سے علمائے کرام کی سیاسی مرعوبیت پر شدید تنقید کرتے تھے۔

قومیت، وطنیت اور لادینیت ان تصورات و تحریکات کے بارے میں ان کے ملفوظات و ارشادات میں بہت مواد ہے جس کا صرف ایک ایک نمونہ پیش ہے:

"کانگریس کا موقف تو یہ ہے کہ ہندوستان ایک جغرافیائی وحدت ہے لہذا اس میں بسنے والے ایک قوم۔ مذہب افراد کا ذاتی معاملہ ہے۔ سیاست سے بے تعلق۔ کانگریس کیسے گوارا کرے گی کہ حصول آزادی کے بعد وہ اس وحدت سے دست کش ہو جائے جس پر آج اسے اصرار ہے اور جس کی بنا پر وہ مسلمانوں کے جداگانہ ملی وجود سے انکار کر رہی ہے ... (ص۲۴)... صوبوں میں اس قسم کی جماعت بندی ضرور ہو سکتی ہے جیسی آج یونینسٹ پارٹی نے قائم کر رکھی ہے لیکن اس کی ترکیب بھی وہی ہوگی جو اس پارٹی کی ہے یعنی مفاد پرست عناصر کا اتحاد سیاسی، معاشی بنا پر۔ چنانچہ اس پارٹی کے سامنے صرف زمینداروں کا مفاد ہے۔ ... یہ پارٹی بظاہر مسلمانوں کی نمائندگی کر رہی ہے۔ اس میں اکثریت بھی مسلمانوں کی ہے۔ لیکن اس کے مسلمانی عناصر اسلام ہی کے نام پر اسلام کی نفی کر رہے ہیں۔ مسلمانوں کو بحیثیت مسلمان نہ اس سے کوئی فائدہ پہنچ رہا ہے نہ تقویت ... (ص۴۸) وطنیت پسند مسلمان تو خیر اپنی تعلیم و تربیت سے مجبور ہیں۔ ان کا دل و دماغ مغربی تعلیم کے زیر اثر اس حد تک بدل چکا ہے کہ وہ کسی دوسرے رنگ میں سوچ ہی نہیں سکتے، یوں ہی دنیا میں ہر کہیں وطنیت کا غلبہ ہے اور بلاد اسلامیہ میں بھی یہ جذبہ ہر کہیں ابھر رہا ہے۔ اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ محکوم قومیں جب

کسی قوم کے ہاتھوں اپنی آزادی کھو بیٹھتی ہیں اور دوسری قوموں کو آزاد یا آزاد ہوتے دیکھتی ہیں تو ان کے اندر بھی قومی اور نسلی عصبیتوں کو تحریک ہوتی ہے، لہذا آج کل کے نوجوان اگر نشۂ قومیت میں سرشار ہیں تو اس میں تعجب کی کوئی بات نہیں ۔ لیکن علماء کو کیا ہو گیا ہے ؟ علماء کیوں نہیں سمجھتے کہ اسلام اور وطنیت ایک دوسرے کی ضد ہیں، اسلام لاوطن ہے" (ص۱۳۱)۔ ... ان میں علماء کا ایک گروہ بھی شامل ہے... اس میں اگرچہ ان کی مخصوص فرقہ بندی اور انگریز دشمنی کو بھی دخل ہے لیکن اس کی اصل وجہ ہے برسوں کے تعطل اور سیاست سے بے تعلقی کے خلاف وہ ردعمل جو انہیں مجبور کر رہا ہے کہ سیاسی اعتبار سے بھی اپنی ہستی منوائیں... لیکن یہ جماعتی مفاد کا اس درجہ پاس ہمارے ملی مفاد کے منافی ہے..." (ص۵۰)

حکیم و مفکر اور فلسفی کا ایک اہم میدان فکر اور جولانگاہ عقل مبادیات و تصورات اور نظریات کا ہوتا ہے جہاں وہ اپنے علم و حکمت، فضل و بینش اور تدبر و تفکر کے جواہر ریزے بکھیرتا چلا جاتا ہے۔ علامہ اقبال تو کل وقتی حکیم و مفکر تھے لہذا ان کے افکار و ارشادات میں ان جواہر ریزوں کی شمولیت و موجودگی لازمی اور مستقل تھی۔ مختلف تصورات و افکار اور مبادی پر ان کے ملفوظات کو عنوان وار پیش کیا جا رہا ہے۔

الہام اور اس کے وقت کے بارے میں ان کا ایک طنزیہ جملہ ہے "اب میں سمجھا۔ صاحب کو پچھلی رات میں کیوں الہام ہوا کرتا تھا (ص۲۵۵)

وحدت خیال کے بارے میں ایک ملفوظہ اقبال ہے کہ "خیال تو ایک ہی ہوتا مگر زمانہ ہے کہ اپنے ذوق حیات اور احوال کے مطابق اسے مختلف شکلوں میں پیش کرتا ہے ہمیں اس نکتہ کو نظر انداز نہیں کرنا چاہیے" (ص۶۶)

حق و صداقت کے حوالہ سے ان کا ایک ارشاد ایک دوسرے پس منظر میں گزر چکا ہے
... دوسرا اسلام کے اصل الاصول کی حیثیت سے یہ ہے :

"یہ بہت بڑی غلطی ہوگی کہ جب ہم حق و صداقت پر زور دیں یا اسلام کے حوالے سے اسے سمجھانے کی کوشش کریں تو اس طرح کہ بجائے اس کے کہ لوگ اسلام کی طرف آئیں ہمارا اپنا ایمان و یقین اس میں مضمحل ہو جائے، حتیٰ کہ بطور ایک ہیئت اجتماعیہ اور نظام مدنیت کے کہ ہم اس کی جامعیت اور کلیت کو نظر انداز کر دیں۔ یہ سمجھیں کہ یہ انسانی روابط ہوں یا تہذیب و تمدن کی دنیا ہم اس میں اسلام کے پہلو بہ پہلو دوسری گروہ بندیاں بھی قائم کر سکتے اور اس کے باوجود اپنا مخصوص نصب العین اور جداگانہ تشخص برقرار رکھ سکتے ہیں۔ اسکا مطلب تو یہ ہوگا کہ ہم اسلام کو چھوڑ کر کبھی ایک اصول حیات کا رخ کریں گے کبھی دوسرے کا۔ یہ امر تو دین کے منافی ہے۔ دین کا ایک ہی اصل الاصول ہے اور وہ اسلام"۔ (ص ۳۳-۲۳۲)

عشق کو بطور اصول کائنات اس طرح واضح فرماتے ہیں:

"... عشق ہی جوہر ہے زندگی کا۔ عشق ہی ہمارے جملہ مسائل کا حل اور مداوا ہے، یہ ہمارا باہمی تعلق ہی تو ہے جس کی بدولت ہم ایک دوسرے سے ربط و ضبط اور اتحاد و اشتراک پیدا کرتے ہیں۔ انسان کا انسان سے میل جول ایک دوسرے کی الفت اور محبت و مودت روزمرہ کی بات ہے اور یہی بات ہے جس سے زندگی کا کارخانہ چل رہا ہے۔ ہمارا کوئی جذبہ اتنا موثر نہیں جتنا عشق۔ عشق کی خاطر انسان بڑی سے بڑی قربانی سے بھی دریغ نہیں کرتا۔ عشق ہی سرچشمۂ اور وجود کا سہارا ہے اور عشق ہی بطور ایک اصول کائنات میں کارفرما ہے"۔ (ص۱۶۳)

ختم نبوت کے بعد کے مدعیانِ نبوت

از جناب سید علیم اشرف جائسی۔ لیبیا

"خمسة عشر قرنا علی اختتام النبوة" کے عنوان سے ۱۲ نومبر ۱۹۹۱ء کو جمعیة الدعوة الاسلامیہ کے زیر اہتمام طرابلس میں منعقد ایک بین الاقوامی دینی علمی سمینار میں جو مقالہ پڑھا گیا تھا، ذیل میں اس کا ملخص ترجمہ پیش کیا جا رہا ہے، مقالہ نگار مصر کے معروف عالم دین اور جامعة الازہر کے استاذ شیخ محمد السید البلاسی ہیں۔

جب انسانیت شباب و پختگی کی عمر کو پہونچ گئی تو گذشتہ شریعتوں کی تکمیل کرنے و پیغام کے ساتھ حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت ہوئی، اللہ تعالیٰ نے آپ کے ذریعے سلسلۂ نبوت و رسالت کا خاتمہ فرمایا اور قرآن کریم کو آسمانی کتابوں کا خاتم بنا

وَمَا کَانَ مُحَمَّدٌ اَبَآ اَحَدٍ مِّنْ	محمد باپ نہیں کسی کا تمہارے مردوں
رِّجَالِکُمْ، وَلٰکِنْ رَّسُوْلَ اللّٰہِ	میں سے، لیکن رسول ہے اللہ کا اور
وَخَاتَمَ النَّبِیّٖنَ، وَکَانَ اللّٰہُ	مہر سب نبیوں پر اور ہے اللہ سب
بِکُلِّ شَیْءٍ عَلِیْمًا۔ (احزاب ۳۳: ۴۰)	چیزوں کا جاننے والا۔

اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ:

"میری اور انبیائے سابقین کی مثال ایسی ہے جیسے اس شخص کی مثال جس نے ایک گھر بنایا اور اس کی خوب تزئین و آرائش کی لیکن اس کے ایک کونے کی ایک

اینٹ نہیں لگائی، لوگ اسے دیکھتے اور پسند کرتے اور کہتے کہ، آخر تم نے یہ ایک اینٹ کیوں نہیں لگائی؟ حضور فرماتے ہیں کہ: میں ہی وہ اینٹ ہوں اور انبیاء کا خاتم ہوں"۔(مسلم شریف)

آسمانی کتابوں نے آپ کی آمد کی بشارت دی، حضرت امام احمد عطا بن یسار سے روایت کرتے ہیں کہ انہوں نے فرمایا کہ میں عبداللہ بن عمرو بن عاص سے ملا اور ان سے کہا کہ مجھے تورات میں مذکور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صفات سے آگاہ کیجیے، انہوں نے کہا ٹھیک ہے، خدا کی قسم وہ تورات میں قرآن کریم کی ذکر کردہ صفات کے ساتھ متصف ہیں:

"اے نبی! ہم نے آپ کو گواہ، خوش خبری دینے والا، ڈرانے والا اور امیین (عرب) کے لیے پناہ گاہ بنا کر بھیجا ہے، آپ میرے بندے اور رسول ہیں اور میں نے آپ کا نام متوکل رکھا ہے"۔

حضرت مسیح علیہ السلام نے بھی آپ کی بشارت دی، جیسا کہ فرمان الٰہی ہے:

وَاِذْ قَالَ عِيْسَى ابْنُ مَرْيَمَ يٰبَنِيْ	اور جب حضرت عیسیٰ نے فرمایا اے
اِسْرَآئِيْلَ اِنِّيْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَيْكُمْ	بنو اسرائیل! میں تمہاری طرف اللہ کا
مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيَّ مِنَ التَّوْرٰةِ	رسول بنا کر بھیجا گیا ہوں، تورات کی
وَمُبَشِّرًا بِرَسُوْلٍ يَّاْتِيْ مِنْ بَعْدِي	تصدیق کرتا اور اپنے بعد آنے والے
اسْمُهٗ اَحْمَدُ ..." (صف ۶۱: ۶)	نبی کی بشارت دیتا ہوں، جن کا نام
	احمد ہوگا۔

اور احمد مجتبیٰ صلی اللہ علیہ وسلم ایک ایسی رسالت کے ساتھ تشریف لائے جس نے تمام گذشتہ رسالتوں کو منسوخ کر دیا، ارشاد ربانی:

قُلْ یٰاَیُّهَا النَّاسُ اِنِّیْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَیْكُمْ جَمِیْعًا (اعراف ۷: ۱۵۸) اے لوگو میں تم سب کی طرف رسول بنا کر بھیجا گیا ہوں۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں:

" اس ذات اقدس کی قسم جس کے قبضۂ قدرت میں میری جان ہے، اس امت کا کوئی بھی یہودی اور عیسائی میرے بارے میں سُن کر بھی مجھ پر ایمان لائے بغیر اگر مرگیا تو وہ اہلِ نار میں سے ہوگا۔" (بخاری و مسلم)

اللہ تعالیٰ کا دین ایک ہے اور وہ ہے اسلام اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم اسلام کے نبی اور انبیاء و مرسلین کے خاتم ہیں[1]

آغازِ اسلام میں مدعیان نبوت

لیکن جھوٹی نبوت کی دعویداری کا سلسلہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے آخری عہد ہی میں شروع ہوگیا تھا، قبائلی عصبیت اور قریش سے سیادت و قیادت میں مقابلہ آرائی اس کا بنیادی محرک تھی یمن میں اسود عنسی نے نبوت کا دعویٰ کیا اور اس کے متبعین کی بڑی تعداد ہوگئی، مگر یہ تحریک اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال سے قبل ہی ٹھنڈی ہوگئی۔

یمامہ میں مسیلمہ بن حبیب نے جو مسیلمہ کذاب کے نام سے مشہور ہوا، اپنے نبی ہونے کا دعویٰ کیا، اس نے ہجرت کے دسویں سال حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے نام

---

[1] دیکھئے: سیرت ابن ہشام، بیروت، دار التراث العربی، ۱۹۷۹ء، ۳: ۲۴۴ و السیرۃ النبویہ، ڈاکٹر عبد المقصود وغیرہ، المطابع الامیریہ، ۱۹۸۹ء، ۳: ۳۳ و معالم التاریخ الاسلامی، رشاد عبد الواحد، ص ۳۲، ۳۳۔

ایک خط میں لکھا کہ:

"میلمہ رسول اللہ کی جانب سے محمد رسول اللہ کے نام، آپ پر سلامتی ہو، میں آپ کے ساتھ اس امر (نبوت) میں شریک کیا گیا ہوں، نصف زمین ہمارے لیے ہے اور نصف قریش کے لیے لیکن قریش زیادتی کرنے والے ہیں۔"

اس خط کو لے کر میلمہ کے دو ایلچی حضورؐ کے پاس آئے، ابن اسحاق کہتے ہیں کہ:

"مجھ سے اشجع کے ایک بزرگ نے میلمہ بن نعیم بن مسعود اشجعی سے روایت کی ہے کہ ان کے والد نے کہا کہ: میلمہ کے خط کو پڑھنے کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دونوں قاصدوں سے فرمایا کہ: "تم دونوں کیا کہتے ہو؟" بولے وہی جو میلمہ نے کہا ہے۔ تو آپؐ نے فرمایا کہ: "خدا کی قسم، اگر ایسا نہ ہوتا کہ قاصدوں کو قتل نہیں کیا جاتا تو میں تم دونوں کی گردنیں اڑا دیتا۔" پھر آپؐ نے میلمہ کو خط لکھوایا:

"بسم اللہ الرحمن الرحیم، محمد رسول اللہ کی جانب سے میلمہ کذاب کے نام، سلامتی ہو ہدایت کی پیروی کرنے والوں پر، زمین اللہ تعالیٰ کی ہے، اپنے بندوں میں سے جسے چاہے اس کا وارث بنائے اور عاقبت پرہیزگاروں کے لیے ہے۔"

بنو اسد میں طلیحہ بن خویلد ظاہر ہوا اور نبوت کا دعویٰ کیا، حضورؐ کے وصال کے بعد یہ مسئلہ کافی سنگین ہو گیا، اسد، غطفان اور طئی کے قبیلے اس کے پیچھے چل پڑے۔ بنو یربوع کی ایک عورت نے بھی ادعائے نبوت کیا جس کا نام سجاح بنت حارث تمیمیہ تھا، متنبئ یمامہ میلمہ نے اس سے شادی کر لی تو سجاح اور تغلب کے اس کے ساتھیوں نے میلمہ کے ساتھ اتحاد کر لیا۔

حضرت ابوبکرؓ کے عہد خلافت میں مرتدین سے قتال اور تحریک ارتداد کی سرکوبی کے لیے کیے گئے حملے کامیابی سے ہمکنار ہوئے، ان حملوں میں سب سے اہم اور شدید ترین معرکہ مسیلمہ اور اس کے ساتھیوں کے ساتھ پیش آیا، مسیلمہ کی شکست اور قتل پر اسکا خاتمہ ہوا۔

عجیب بات ہے بعض مدعیان نبوت نہ صرف ہوش وخرد کی طرف لوٹ آئے بلکہ اسلامی فتوحات جیسے فتح عراق و فارس میں خوب داد شجاعت دی، حضرت طلیحہ اسدی بھی انھیں میں ایک تھے۔

اسلام سے منسوب جماعتوں کے بانیوں کا دعوائے نبوت

۱۔ سلسلۂ شیخیہ | احمد احسائی مولود ۱۱۵۷ھ کو سلسلۂ شیخیہ کا بانی مرشد مانا جاتا ہے، یہ ایک باطنی متصوف تھا، جو مہدی منتظر کی تبلیغ کرتا تھا، احسائی کے مرنے کے بعد سلسلہ کی شیخیت کو اس کے شاگرد کاظم رشتی نے سنبھالا جس کی پیدائش ۱۲۰۹ھ/۱۷۹۵ء میں ہوئی تھی اور وفات ۱۲۵۹ھ/۱۸۴۳ء میں کربلا میں ہوئی[1]

۲۔ بابیت | رشتی کے مرنے کے بعد سلسلۂ شیخیہ کے پیرو کار تین فرقوں میں تقسیم ہو گئے۔ جن میں سب سے مضبوط اور طاقتور فرقہ وہ تھا جس کی قیادت ملاحسین بشرونی کے ہاتھ میں تھی، احسائی اور رشتی کی بشارتوں کے مصداق مہدی منتظر کی تلاش میں ملاحسین اور ان کی جماعت نے شہروں شہروں کا گشت کیا اور اس جہاں گردی کا خاتمہ شیراز میں ہوا، جہاں ملاحسین کی ملاقات انتہائی عجیب وغریب انداز اور بعید مشکوک حالات میں علی محمد شیرازی نام کے ایک شخص سے ہوئی، ملاحسین نے دعویٰ کیا کہ

---

[1] المذاهب والافكار المعاصرة في التصور الاسلامي، محمد حسن، الدوحة: الموسسة العالمية للطباعة والنشر، بار اول، ۱۹۸۶ء، ۳۰۳۔

مہدی منتظر کی تمام تر صفات علی محمد پہ منطبق ہیں، یہیں سے سلسلۂ شیخیہ ایک نئے موڑ میں داخل ہوا اور بابی تحریک اس کے قائم مقام ہوگئی، یہ واقعہ ۲۳ مئی ۱۸۴۴ء کو پیش آیا، علی محمد شیرازی نے باب کا لقب اختیار کیا اور ملا حسین بشروئی کو باب الباب کا خطاب دیا اور تحریک کے پہلے آٹھ داعیوں کو "حی" کا خطاب دیا گیا، جنھوں نے تحریک کی تبلیغ و اشاعت کی۔

ڈاکٹر عبد الفتاح برکہ اپنی ایک تقریر میں اس تحریک کے بانیوں کی حقیقت سے پردہ اٹھاتے ہوئے کہتے ہیں کہ: جب ۱۹۱۷ء میں زار روس کی حکومت کا خاتمہ ہوا تو کمیونسٹوں نے زار حکومت کی خفیہ رپورٹوں کو شایع کر دیا، ایک رپورٹ کے مطابق حکومت نے دو مبلغوں کو فرضی ناموں سے ایران بھیج رکھا ہے، جن کے نام احمد احسائی اور کاظم رشتی ہیں، اس رپورٹ کے شایع ہوتے ہی حکومت برطانیہ نے تیزی کے ساتھ ان دونوں سے رابطہ کیا اور ان کی مالی مدد کی تاکہ ان کی تخریبی کوششوں سے فائدہ اٹھا سکے۔

ملا حسین بشروئی اور علی محمد شیرازی کی ملاقات میرے خیال میں کسی اتفاق کا نتیجہ نہیں تھی بلکہ غالب گمان یہ ہے کہ شیرازی مغربی استعمار کے ایجنٹوں میں سے تھا اور نئے مرحلے میں تحریک کی قیادت کے لیے نامزد کیا گیا تھا، رشتی پہلے ہی سے اس سے واقف تھا اور اسے خفیہ کلمات سے آگاہ کر دیا تھا اور اسی کے کہنے پر ہی شیرازی نے بشروئی سے ملاقات کی اور یہ دعویٰ کیا کہ اس کی صفات مہدی منتظر کی صفات کے مطابق ہیں اور ہوا بھی وہی جو رشتی نے چاہا تھا۔

بابی افکار و عقائد محمد علی شیرازی نے ۲۵ سال کی عمر میں مہدی موعود ہونے کا دعویٰ

یا مقامی اداروں نے اس کے اس دعوے کی ترویج و اشاعت کی اور بہت سے لوگ
ں کی سحر انگیزی کا شکار ہو گئے، اپنے استاد رشتی کے مرنے کے بعد اس نے اپنا نام
ب" رکھ لیا اور دعویٰ کیا کہ وہ اللہ تک پہونچنے کا راستہ ہے اور حدیث شریف :
انا مدینۃ العلم وعلی بابھا" (میں شہر علم اور علی اس کے دروازے ہیں)
تاویل یہ کی کہ "حدیث میں مذکور "علی" سے اسی کی ذات مراد ہے[1]

پھر اس نے دعویٰ کیا کہ اس کی طرف وحی آتی ہے اور اس پر "بیان عربی" نامی
لڈر کی کتاب نازل ہوئی ہے، اسی بنیاد پر اس نے تمام سابق شریعتوں کی منسوخی کا اعلان
یا، وہ تناسخ کا قائل اور بعثت کا منکر تھا، اپنی دعوت کی ترویج و اشاعت کے لیے
س نے خواتین کا بھی استعمال کیا۔

ایران کے شہر قزوین کے برغانی خاندان بالخصوص ملا محمد اور اس کی بیٹی نے جسکا
ام قرۃ العین تھا بابی مذہب قبول کر لیا، قرۃ العین بیحد خوبصورت اور ذہین تھی
چنانچہ بابی تحریک میں اسے بہت اعلیٰ مقام حاصل ہو گیا۔

تونس کے ایک رسالے "جوھرۃ" نے اپنے چوتھے سال کے آٹھویں شمارے
میں صفحہ نمبر ۷ پر قرۃ العین کی ایک تقریر نقل کی ہے، وہ کہتی ہے کہ :

"میرے احباب و اغیار! باب کی پیروی کرنے والو اور نہ کرنے والو، سنو!
جان لو کہ باب کے ظہور کے بعد شریعت محمدیہ کے احکام و قوانین منسوخ ہو چکے
ہیں اور تمہارا نماز پڑھنا، روزہ رکھنا، زکوۃ دینا اور محمد (صلی اللہ علیہ وسلم)

---

[1] تفصیل کے لیے دیکھئے: البابیۃ، عرض و نقد، احسان الٰہی ظہیر، لاہور، ادارۃ ترجمان السنۃ
بار سوم، ۱۹۸۱ء، ۹۰۔

کے لائے ہوئے احکام پر عمل کرنا لغو اور بیکار ہے، آج کے بعد ان احکام پر صرف کوئی غافل یا جاہل ہی عمل کرے گا، عنقریب ہی ہمارے آقا باب تمام ممالک کو فتح اور تمام لوگوں کو اپنا مطیع کرلیں گے اور ساتوں اقالیم ان کے زیر نگیں آجائیں گے اور وہ جلد ہی روئے زمین پر موجود تمام مذاہب و ادیان کو ایک کر دیں گے اور اس دین کے سوا کوئی دوسرا دین باقی نہ رہ پائے گا"

اس کے بعد قرۃ العین اباحیت کی دعوت دیتے ہوئے کہتی ہے کہ:

"اے لوگو! اپنے اور خواتین کے درمیان موجود حجاب کو ٹکڑے ٹکڑے کر دو اور انہیں تمام اعمال و افعال میں اپنا شریک بنالو، انہیں دلبستگی کے لیے استعمال کرو اور خلوت سے باہر نکالو، عورتیں زندگی کا پھول ہیں اور پھول کی تخلیق توڑنے اور سونگھنے کے لیے ہوتی ہے، عورت کی تخلیق ہی ہم آغوشی اور بوس و کنار کرنے کے لیے ہے، اس زندگی میں جو کچھ میسر ہے اس سے لطف اندوز ہو کیونکہ مرنے کے بعد کچھ بھی نہیں ہے"[1]

اس میں حیات بعد الموت کا واضح انکار ہے۔

قرۃ العین نوخیزی کی عمر میں اپنے شوہر کے ہمراہ حصول علم کے لیے کربلا گئی تھی، اس کی ملاقات رشتی سے ہوئی، وہ اس کی دعوت و تحریک سے متاثر ہوئی تھی، رشتی کے بعد وہ شیراز میں بابی تحریک سے وابستہ ہوگئی اور اعلان کیا کہ باب کے ظہور سے احسائی اور رشتی کی کتابیں بھی منسوخ ہوگئی ہیں، نتیجے میں خود اس کے پیروکار اس سے بدظن ہوگئے اور وہ بغداد چلی گئی، جہاں اس نے شریعت اسلامیہ کی تجدید کی ضرورت

[1] دیکھیے: المذاہب والافکار المعاصرۃ، ۳۰۳-۳۰۵۔

اور قرآن کے بجائے "البیان" پر اعتماد کرنے کی اپنی دعوت کا نئے سرے سے آغاز کیا، بغداد کے ترکی حاکم نے اسے شہر چھوڑنے کا حکم دیا، وہاں سے وہ ایک بڑے قافلے کو لے کر کرمن شاہ پہونچی جہاں کے حاکم نے بھی اسے شہر بدر کر دیا چنانچہ وہاں سے وہ اپنی جائے پیدائش قزوین چلی گئی، حاکم شہر نے اسے قید کر دیا مگر وہ اپنے ایک پیرو کار مرزا حسین "بہا" کی وساطت سے قید خانے سے فرار ہونے میں کامیاب ہو گئی، اس نے قرۃ العین کو طہران میں واقع اپنے گھر میں چھپا لیا۔

ادھر والی شیراز نے علی محمد باب کے صریح کفر کے ثبوت کے بعد اسے قید کر دیا تھا اور شاہ ناصر الدین نے شیرازی کے دعوائے نبوت، انکار بعثت، عقیدۂ تناسخ اور شریعت اسلامیہ کی منسوخی جیسے اقوال کے ثابت ہونے کی بنیاد پر اس کے قتل کا حکم جاری کر دیا تھا، دوسری طرف ۱۸۴۸ء میں بدشت کے مقام پر بابیوں نے ایک اجتماع کیا تاکہ باب کو بچانے کے لیے کوئی لائحہ عمل تیار کیا جا سکے اور شریعت اسلامیہ کی تنسیخ کے تعلق سے کسی موقف کو متعین کیا جا سکے، اچانک اس اجتماع میں قرۃ العین پہنچ گئی، اس نے پہلی بار اپنے خوبصورت چہرے کو بے نقاب کر رکھا تھا، وہ اپنے بہترین لباس اور انتہائی زیب و زینت میں تھی، وہاں پہونچ کر اس نے بلند آواز میں اعلان کیا کہ:

"وہ صاحب خطاب ہے حاضرین میں سے ہر شخص کھڑا ہو کر اپنے ساتھی کا بوسہ لے اور بیشک باب کے آنے کے بعد شریعت اسلامیہ منسوخ ہو گئی ہے"۔

بیشتر حاضرین نے ناگواری محسوس کی اور کچھ نے اسے قتل کرنے کی بھی کوشش کی مگر اس کے ساتھی حالات پر قابو پانے اور مرکزی قیادت پر قبضہ کرنے میں کامیاب ہو گئے، اس نے مکمل طور سے اور کھل کر اسلام کی مخالفت کرنے کا راستہ اختیار کیا۔

۸ جولائی ۱۸۵۰ء کو صبح میں "ماکو" کے قلعہ میں قید باب کو پھانسی دے دی گئی، بابیوں نے اس کی لاش کو تحریک کے نئے مرکز "عکا" میں لاکر دفن کیا۔

قرۃ العین ۳۰ اگست ۱۸۵۲ء کو بغداد کے اپنے تیس[۳۰] جانباز پیرو کاروں کو لے کر خاموشی سے طہران میں داخل ہوئی تاکہ شاہ ناصر الدین کو قتل کرکے باب کی موت کا بدلہ لے سکے مگر اس کی یہ کوشش ناکام رہی اور اس کو اس کے تمام ساتھیوں کے ساتھ پھانسی پر چڑھا دیا گیا۔

جب قرۃ العین جلاد کے سامنے کھڑی ہوئی تو اسے اپنی دعوت کی طرف مائل کرنے کی کوشش کی اور تحفے میں اسے اپنا ریشمی رومال پیش کیا مگر جلاد نے اسی رومال سے اسکا گلا گھونٹ دیا اور اس طرح بابی تحریک کا خاتمہ ہوگیا اور اس کی جگہ ایک نئی تحریک قائم ہوئی جسے بہائی تحریک کے نام سے جانا جاتا ہے[۱]

۲۔ بہائیت: اس کی بنیاد مرزا حسین علی نوری مولود ۱۸۳۳ء نے ڈالی تھی، مرزا حسین قرۃ العین کے پیروکاروں میں تھا، اسی نے قرۃ العین کو قید خانے سے نکال کر طہران میں اپنے گھر میں چھپایا تھا، شاہ ایران نے اسے اس کے متبعین کے ساتھ ملک بدر کردیا تھا، وہ بغداد چلا گیا اور وہاں اپنی سرگرمی شروع کردی اور "سلیمانیہ" اور کردوں کے علاقوں میں چکر لگانے لگا وہ اپنے بارے میں یہ کہتا کہ وہ نیا باب ہے جس کے بارے میں سابق باب نے بشارت دی ہے، اس نے عوام میں اپنے بہت سے حامی و مددگار بنالیے، والی بغداد نے اس کو "آستانہ" کی طرف بھگا دیا، جہاں تحریک کی قیادت کے موضوع پر اس کا اپنے بھائی سے اختلاف ہوگیا مگر اس میں اسے کامیابی ملی، آستانہ سے وہ "عکا" چلا گیا اور اسے اپنی

---

[۱] المذاہب والافکار المعاصرۃ، ۳۰۶ اور مزید تفصیل کے لیے دیکھیے؛ البابیۃ عرض ونقد، ۲۳۰۔

مستقل قیام گاہ بنالیا۔

مرزا حسین نے پہلے یہ دعوی کیا کہ وہ باب ہے، پھر یہ کہ وہ مہدی منتظر ہے، پھر خاص نبوت کی بات کی اور پھر عام نبوت کا دعوی کر بیٹھا اور کہنے لگا کہ وہ ساری انسانیت کے لیئے نبی ہے اور اپنی آخری عمر میں نظریہ حلول کی بنیاد پر خدائی کا دعویٰ کر دیا اور کہنے لگا کہ خدا اس کے اندر حلول کر گیا ہے (معاذ اللہ) وہ بازاروں میں اپنے چہرے کو نقاب سے ڈھنک کر نکلتا تھا، تاکہ کوئی مخلوق خدا کی دلکشی (بہا) کا نظارہ نہ کر سکے اور اپنے آپ کو "بہا" کے لقب سے ملقب کیا، اسی سبب اس کی تحریک بہائی تحریک کے نام سے معروف ہوئی۔

مرزا حسین (بہاء اللہ) نے بہت سی کتابیں بھی لکھیں، جیسے کتاب اقدس، کتاب ایقان، کتاب اشراقات و تجلیات اور کلمات فردوسیہ وغیرہ، مئی ۱۸۹۲ء میں اللہ تعالیٰ نے اسے ہلاک فرمایا۔ فلسطین میں کرمل پہاڑ کے دامن میں اسے دفن کیا گیا اور اس کے مقبرے کا نام بیت البہجت رکھا گیا۔[1]

بعض علمی دستاویزات کی روشنی میں یہ بات ثابت ہو چکی ہے کہ بہائی تحریک اور صہیونیت و مغربی استعمار کے درمیان گہرے تعلقات ہیں جس کا ایک بین ثبوت فلسطین میں یہودی آبادکاری کو بہاء اللہ کے بیٹے اور خلیفہ عبدالبہاء کی صریح تائید ہے، کتاب "مفاوضات عبدالبہا" صفحہ نمبر ۹ پر مذکور ہے کہ: "اس امتیازی عہد میں اور اس (مبارک دور) میں بنو اسرائیل ارض مقدس میں مجتمع ہوں گے اور یہودی امت جو مشرق و مغرب اور شمال و جنوب میں منتشر ہو گئی ہے، اکٹھا ہو گی اور فلسطین

---

[1] المذاھب والافکار المعاصرۃ، ۳۰۷۔

اس کا وطن ہوگا" ۱۹۶۸ء میں مقبوضہ بیت المقدس میں عالمی بہائی کانفرنس منعقد ہوئی جس کی میزبانی یہودیوں نے کی تھی، اس کانفرنس میں پیش کیے جانے والے مقالات سے صہیونی۔ بہائی تحریکوں کے باہمی ربط وتعلق پر روشنی پڑتی ہے، کانفرنس کے اختتامی جشن میں اعلان کیا گیا کہ "یہودیت اور بہائیت ایک دوسرے کی تکمیل کرتی ہیں اور بیشتر موضوعات پر آپس میں ہم خیال اور متفق ہیں"

یہ بات پایۂ ثبوت کو پہونچ چکی ہے کہ عرب ملکوں میں بہائی انجمنیں اسرائیل کے لیے جاسوسی کرتی ہیں، ۱۹۷۰ء میں اس بات کے مکمل ثبوت فراہم ہونے کے بعد مصری حکومت نے بہائی تنظیموں اور انجمنوں پر پابندی لگادی تھی، اسی سے ملتا جلتا واقعہ عراق میں بھی پیش آیا مگر اس کے باوجود بھی اس تحریک کی خفیہ سرگرمیاں آج بھی جاری ہیں۔

پہلی جنگ عظیم میں بہائیوں کی صہیونی اصلیت اس وقت ظاہر ہوگئی تھی جب انہوں نے برطانوی فوج کے "حیفا" میں داخل ہونے پر فاتحین کی حیثیت سے اس کا استقبال کیا تھا، اسرائیل میں آج بھی بہائیوں کے ساتھ یہودیوں ہی جیسا سلوک کیا جاتا ہے اور صہیونی تحریک اور فری مسن کے دباؤ میں ہی اقوام متحدہ نے بہائیت کو عالمی مذہب کا درجہ دیا ہے۔[1]

---

[1] بہائیت اور فری مسن تحریک ایک ہی سکے کے دو مختلف رُخ ہیں، دونوں ہی عالمی بھائی چارے اور انسانی فلاح وبہبود کی علمبردار ہونے کا دعویٰ کرتی ہیں، دونوں ہی اباحیت اور لامحدود آزادی کی حامی ہیں اور دونوں تحریک کا آغاز ۱۸۴۴ء سے ساتھ ساتھ ہوتا ہے۔
تفصیل کے لیے دیکھئے: خطر الماسونیہ القادم، محمد السید علی بلاسی، "اخبار العالم الاسلامی" عدد۔ ۹۴۳، ص/ ۹۔

اسرائیل کے بائیکاٹ کرنے سے متعلق کمیٹی نے صہیونیت سے تعلقات کی بنیاد پر بہائی تحریک کا نام بھی بلیک لسٹ میں رکھا ہے اور تنظیمات اسلامی کانفرنس نے اتفاق سے یہ قرارداد منظور کی تھی کہ بہائی تحریک ایک غیر اسلامی صہیونی تحریک ہے، یہ کانفرنس ۱۹۹۳ء میں مکہ مکرمہ میں رابطۂ عالم اسلامی کی دعوت پر منعقد ہوئی تھی اور اس میں ۱۵۰ سے زیادہ اسلامی تنظیمات اور اداروں نے شرکت کی تھی[1]

۴۔ قادیانیت | اس کی بنیاد مرزا غلام احمد نے ڈالی جو ۱۸۳۰ء میں پاکستانی پنجاب کے ایک گاؤں "قادیان" میں پیدا ہوا، قادیانیوں نے اپنے مؤسس کی جائے پیدائش کو "ربوۃ" کا نام دیا تاکہ یہ آیت کریمہ ان پر صادق آجائے:

وَآوَيْنَاهُمَا إِلَىٰ رَبْوَةٍ ذَاتِ	اور ہم نے عیسیٰ اور ان کی ماں کو
قَرَارٍ وَّمَعِيْنٍ ۝	ٹھکانا دیا ایک ٹیلہ پر جہاں ٹھہرنے
(المومنون ۲۳: ۵۰)	کا موقع تھا اور پانی ستھرا۔

غلام احمد کی پیدائش و پرورش ایک ایسے گھرانے میں ہوئی جو برطانوی استعمار کا ایجنٹ تھا، اس کا باپ ان غداروں میں سے ایک تھا جنھوں نے مسلمانوں سے خیانت کی اور ان کے خلاف سازشیں کیں اور عزت و جاہ کی طلب میں استعمار کے ساتھ تعاون کیا، اس کا ذکر خود غلام احمد قادیانی نے "تحفۂ قیصریہ" ص ۱۶ میں کیا ہے: "میرے والد غلام مرتضیٰ اور انگریزی حکومت کے درمیان بے حد خوشگوار روابط اور دوستانہ تعلقات تھے، دربار حکومت میں ان کا مخصوص مقام تھا، ۱۸۵۷ء میں جب ان کے ہم وطن اور ہم مذہب لوگوں نے حکومت کے خلاف بغاوت کی تھی تو انھوں نے حکومت کی بہت

---

[1] المذاهب والافكار المعاصرة، ۳۰۷، ۳۰۹۔

مدد کی تھی....."

غلام احمد نے غیر معروف اساتذہ سے اردو اور عربی کی چند کتابیں پڑھیں اور قانون کی تھوڑی تعلیم حاصل کی اور سیالکوٹ میں ۱۵ روپے ماہوار کی ملازمت کی [۱]

۱۹۰۰ء میں اس نے اپنی دعوت کا باضابطہ آغاز کیا اور دعویٰ کیا کہ وہ نبی مرسل ہے اور اس کی رسالت کا منکر کافر ہے، نہ اس کا ذبیحہ کھایا جائے گا اور نہ اس کی نماز جنازہ پڑھی جائے گی اور نہ ہی اسے مسلمانوں کے قبرستان میں دفن کیا جائے گا، جب اس کے ایک بیٹے کا انتقال ہوا جو اس کے بیٹے کا منکر تھا تو مرزا اور اس کے پیروکاروں نے اس کی نماز جنازہ نہیں پڑھی،... غلام احمد نے "براہین احمدیہ" نامی ایک کتاب لکھی جس کا ایک حصہ ۱۸۸۰ء میں شایع ہوا، اس میں اس نے اپنے مہدی منتظر ہونے کا دعویٰ کیا۔[۲]

قادیانیت اپنے آغاز کے فوراً بعد ہی دو فرقوں میں تقسیم ہوگئی: ایک فرقہ "احمدیہ" یا لاہوری جماعت کے نام سے معروف ہوا جسے بعض حضرات پوشیدہ قادیانیت کا نام دیتے ہیں، اس فرقے کی قیادت خواجہ کمال الدین اور مولانا محمد علی وغیرہ نے کی، ایشیا، افریقہ اور یورپ میں اس کی سرگرمیاں بے حد وسیع ہیں۔

۱۹۲۰ء میں محمد علی نے قرآن پاک کا انگریزی میں ترجمہ کیا اور ۱۹۲۶ء میں "اسلام" نام کی اپنی کتاب لکھی، اس فرقے کے پانچ ہزار سے زیادہ داعی صرف براعظم افریقہ میں اپنے فکر و عقیدے کی نشر و اشاعت میں مصروف ہیں، اس فرقے کا اپنا انسائیکلوپیڈیا ہے اور عربی و انگریزی کی سیکڑوں کتابیں ہیں جو اس امر کا واضح ثبوت ہے کہ ہے کہ اس کو غیر معمولی خارجی امداد و تعاون حاصل ہے۔

---

[۱] المذاهب والافکار المعاصرة، ۲۱۱ [۲] نفس مرجع، نفس صفحہ

دوسرا فرقہ قادیانی کہلاتا ہے، جس کی قیادت خود مرزا نے کی تھی، اس کے بعد اس کے خلیفہ نور الدین نے اور پھر مرزا کے بیٹے اور اس کے دوسرے خلیفہ بشیر الدین محمود نے کی

احمدی اور قادیانی فرقوں میں فرق یہ ہے کہ قادیانی مرزا غلام احمد کی نبوت پر یقین رکھتے ہیں جبکہ احمدی جماعت کا دعویٰ ہے کہ وہ انہیں صرف ایک دینی مصلح کی حیثیت سے دیکھتی ہے[1]

حقیقت میں دونوں جماعتیں ایک ہی تحریک کے دو مختلف پہلو ہیں اور ایک دوسرے کی متمم ہیں، مگر ان میں احمدی کہلانے والا فرقہ اسلامی عقیدے کے خلاف سب سے خطرناک تخریبی تحریک ہے، کیونکہ یہ تحریک کتاب و سنت کی طرف دعوت کے اپنے نعروں اور قرآن کے ترجمہ وغیرہ کے ذریعے اپنی حقیقت کو چھپانے اور اسلامی سوسائٹی میں بہت اہم مقامات پر قبضہ کرنے میں کامیاب رہی ہے .....

قادیانیت : برطانوی استعمار کی ایجنٹ برطانوی استعمار نے اسلام سے مقابلے کے لیے ایک اسکیم کے مطابق، تمام دنیا کے مسلم ممالک میں ایجنٹوں کی تلاش شروع کی، دنیا کی کوئی قوم غداروں اور خائنوں سے خالی نہیں ہوئی مگر ہندوستان میں انگریزوں کو ملنے والا ایجنٹ غلام احمد سب سے خطرناک تھا کیونکہ یہ تجدید دین اور مہدویت کے نقاب میں ظاہر ہوا ... پھر دعویٰ کیا کہ اس پر وحی نازل ہوتی ہے لیکن وہ مستقل نبی نہیں ہے، بلکہ تابع نبی ہے جیسا کہ حضرت ہارون حضرت موسیٰ کے تابع تھے۔ اس طرح اس نے مسلمانوں کی صف میں رہ کر استعمار کی وہ جلیل القدر خدمت انجام دی جو وہ دائرہ اسلام سے نکل کر نہیں کر سکتا تھا۔ برطانوی حکومت کے لیے اس کی سب سے بڑی خدمت اس کا

---

[1] المذاہب والافکار المعاصرہ، ص ۳۱۴، ۳۱۵۔ معمولی رد و بدل کے ساتھ۔

فتویٰ ہے کہ انگریزوں کے خلاف مسلمانوں کو ہتھیار اٹھانے سے منع کیا گیا ہے کیونکہ حکم جہاد ختم ہوگیا ہے اور چونکہ انگریز زمین پر خدا کے خلیفہ ہیں لہذا ان کے خلاف بغاوت جائز نہیں۔

مرزا غلام احمد اپنی کتاب "شہادۃ القرآن" میں کہتا ہے کہ:

"انگریزی حکومت کی تائید وحمایت میں میں نے اپنی عمر صرف کردی اور جہاد کے ممنوع ہونے اور انگریز صاحبان امر کی اطاعت کے واجب ہونے کے بارے میں اتنی کتابیں اور رسائل لکھ چکا ہوں کہ اگر سب کو جمع کیا جائے تو پچاس صندوق بھر جائیں۔۔۔۔" (صفحہ)

نوآبادکار اس کی ان خدمات سے بے حد خوش ہوئے اور مال و دولت اور حفاظت وحمایت کے ساتھ اس کی مدد کی چنانچہ ایک ایسا شخص جس نے زندگی میں کبھی سو روپے نہ دیکھے ہوں لاکھوں میں کھیلنے لگا اور پندرہ روپے ماہانہ کی معمولی سی نوکری کرنے والا اور طلب معاش میں شہر شہر اور گاؤں گاؤں پھرنے والا عالی شان محل تعمیر کرنے لگا، یہ سب برطانوی استعمار کی دین تھی، جس کا اعتراف خود غلام احمد نے اس یادداشت (میمورنڈم) میں کیا ہے جسے اس نے ملکہ برطانیہ کی ہندوستان آمد پر ان کو پیش کیا تھا، اس احسان مندی کا ذکر "ملفوظات احمدیہ" نامی کتاب میں بھی ہے، مرزا غلام احمد برطانوی حکومت کی تعریف کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ: "اس حکومت کے ہمارے اوپر غیر معمولی احسانات ہیں ۔۔۔۔۔

مئی ۱۹۰۸ء میں غلام احمد ہیضہ کے مرض میں گرفتار ہو کر مرگیا، اس کے خلیفہ حکیم نورالدین نے اس کے نقش قدم کی پیروی کرتے ہوئے انگریزوں سے دوستی برقرار رکھی، انگریز آقاؤں نے یورپ اور افریقہ وغیرہ میں مختلف ذرایع سے اس کی مدد کی۔

۷ نومبر ۱۹۱۸ء کو اخبار "الفضل" میں مرزا کے لڑکے بشیر الدین کا ایک بیان شایع ہوا ہے، وہ کہتا ہے کہ:

"انگریزوں کے مشرق وسطیٰ میں داخلے پر ہم کیوں نہ خوش ہوں، ہمارے امام غلام احمد نے فرمایا ہے کہ: میں مہدی منتظر ہوں اور برطانوی حکومت ہماری تلوار ہے، ہمیں اس فتح سے بے حد مسرت ہے اور اس تلوار کی چمک و دمک کو ہم شام و عراق اور ہر جگہ دیکھنا چاہتے ہیں۔"

قادیانی۔ یہودی تعلقات اسرائیل کے وجود سے بھی پہلے احمدی قادیانیوں نے "یافا" شہر میں اپنا مرکز قائم کیا تھا تاکہ انہیں انگریزی حمایت حاصل رہے اور جیسے ہی اسرائیلی حکومت قائم ہوئی انگریزوں نے ان قادیانیوں کو برطانوی پاسپورٹ جاری کر دیے اور حکومت اسرائیل نے بھی انہیں احمدیت کی تبلیغ و اشاعت کی پوری آزادی دیدی ایک عرب قادیانی محمد خیر قادری اپنی کتاب "القادیانیۃ" میں لکھتا ہے کہ:

"اسرائیل کے حیفا شہر کے جبل کرمل نامی علاقے میں احمدی تبلیغی مرکز قائم ہے جس میں مسجد، کتب خانہ، مدرسہ اور ایک اشاعتی مرکز ہے، مرکز سے "بشریٰ" نام سے ایک ماہنامہ بھی نکلتا ہے، جو عرب ملکوں میں تقسیم ہوتا ہے، اس مرکز سے مسیح موعود کی بہت سی تعلیمات کو عربی میں منتقل کیا ہے، کچھ عرصہ قبل ہمارے ایک مبشر نے بلدیہ حیفا کے چیرمین سے ملاقات کی اور ان کے ساتھ بہت سے موضوعات پر گفتگو کی جن میں جبل کبابیر کے پاس ایک مدرسے کا قیام بھی ہے (بعد میں) چیرمین صاحب اور چار اہم شخصیات نے مرکز تشریف لاکر ہماری عزت افزائی کی ہماری جماعت نے ان کا استقبال کیا اور ان کے اعزاز میں ایک پروگرام کا انعقاد کیا۔ جب ہمارے مبشر نے پاکستان واپسی کا ارادہ کیا تو اسرائیل کے صدر نے خط بھیج کر پاکستان واپسی سے قبل ان سے ملاقات کی خواہش کا اظہار کیا۔"

آج بھی حکومت اسرائیل کی حمایت و حوصلہ افزائی کے سائے میں احمدی جماعت سرگرم عمل ہے۔[1]

قادیانی عقاید و افکار | ۱۔ دعوئے نبوت۔ مرزا "حقیقۃ الوحی" ص/۲ کے حاشیے میں لکھتا ہے کہ: "میں تمام انبیاء و مرسلین سے افضل ہوں" اور ص/۱۶۳ پر ہے کہ "جو مجھ پر ایمان نہیں رکھتا وہ اللہ اور رسول پر ایمان نہیں رکھتا"۔[2]

۲۔ آیت کریمہ (... خاتم النبین) کے معنی میں تحریف کر کے اسے مہر اور زینت انبیاء کے معنی میں کر دیا۔ مرزا بشیر الدین کی کتاب "حقیقۃ النبوۃ" ص/۲۸۸ پر ہے: "یہ بات آفتاب نیمروز کی طرح واضح ہے کہ باب نبوت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد بھی کھلا ہے"۔[3]

۳۔ مسیح موعود ہونے کا دعویٰ کیا اور بخاری و مسلم اور حدیث کی دوسری بہت سی کتابوں میں نزول مسیح سے متعلق احادیث کو غلام احمد نے ذات پر چسپاں قرار دیا ہے۔ اپنے مجموعۂ بیانات" ۱۰ : ۱۸ میں کہتا ہے کہ: "خدا کی قسم جس نے مجھے بھیجا ہے اور جس کی ذات پر کسی لعنتی کے سوا کوئی بھی افترا نہیں کر سکتا، میں مسیح موعود بنا کر بھیجا گیا ہوں"۔ "تحفۂ گولڑۃ" ص/۱۹۵ میں لکھتا ہے کہ: میں وہی مسیح موعود ہوں آخری زمانے میں جسکے ظہور کی خبر تمام آسمانی کتابوں نے دی ہے۔

۴۔ حضرت عیسیٰ کے بارے میں ان کا عقیدہ ہے کہ وہ اپنی قبر سے زندہ ہو کر اٹھے اور کشمیر ہجرت کر گئے جہاں ۱۲۰ سال کی عمر میں انکا انتقال ہوا۔

---

[1] القادیانیہ، دراسات و تحلیل، احسان الٰہی ظہیر، لاہور: ادارۂ ترجمان السنۃ، بار سیزدہم، ۱۹۸۳ء، ۴۵ [2] مرجع سابق، ۳۱۲ [3] ایضاً۔

اپنی کتاب "براہین احمدیہ" میں مرزا نے انگریزی میں الہام ہونے کا دعویٰ کیا، صفحہ ۴۸۰ پر لکھتا ہے کہ: "کئی بار مجھے انگریزی میں الہام ہوا اور لہجے سے مجھے ایسا لگا جیسے کوئی انگریز میرے سر پہ کھڑا بول رہا ہے۔"

۵۔ قرآن کے مقابلے میں ایک کتاب تیار کی جس کا نام "الکتاب المبین" رکھا، مرزا کا خلیفہ اخبار "الفضل" کے ۱۵ جولائی ۱۹۲۴ء کے شمارے میں لکھتا ہے کہ: "مسیح موعود کے پیش کردہ قرآن کے سوا کوئی قرآن نہیں ہے۔

۶۔ اللہ تعالیٰ کے بارے میں اپنے عقیدے کا اظہار کرتے ہوئے اپنی کتاب "بشریٰ ۲: ۹۷" میں مرزا لکھتا ہے کہ: "اللہ تعالیٰ نے مجھ سے کہا کہ میں رسول کے ساتھ محیط ہوں میں رسول کے ساتھ جواب دیتا ہوں جو کبھی صحیح ہوتا ہے کبھی غلط ... میں روزہ رکھتا ہوں، نماز پڑھتا ہوں، سوتا اور جاگتا ہوں..."

۷۔ جہاد فی سبیل اللہ کی منسوخی کا عقیدہ۔ اپنے مجموعۂ بیانات" ۴: ۴۹ میں لکھتا ہے کہ: "اب جہاد کی فکر ترک کر دو، دین کے لیے جہاد کرنا اب حرام ہے .... اب جہاد باقی نہیں رہا بلکہ جو جہاد فی سبیل اللہ کرے گا وہ اللہ کا دشمن ہوگا.."

انہیں افکار و عقاید کی بنیاد پر علمائے مسلمین نے اجماعی طور پر اس فرقے کو اسلام سے خارج قرار دیا اور یہ فیصلہ ۱۹۵۳ء میں کراچی میں منعقد ایک کانفرنس میں کیا گیا جس میں مشرقی اور مغربی پاکستان کی تمام اسلامی جماعتوں کے نمائندوں اور منتخب علمائے کرام نے شرکت کی اور قانون ساز اسمبلی میں ایک سفارش پیش کرتے ہوئے یہ مطالبہ کیا کہ قادیانیوں کو غیر مسلم اقلیت قرار دیا جائے اور صوبۂ پنجاب سے انکے لیے اسمبلی کی ایک سیٹ مخصوص کر دی جائے، پاکستان میں منعقد تنظیم اسلامی کانفرنس

نے بھی اپنے فیصلے میں قادیانیت کو غیر اسلامی تحریک قرار دیا، اس طرح رابطۂ عالم اسلامی کی دعوت پر دنیا بھر کی اسلامی تنظیموں کی نمایندہ کانفرنس ۱۳۹۳ھ کو منعقد ہوئی اور جس میں ۱۴۴ اسلامی تنظیمات کے مندوبین شریک ہوئے، اس کانفرنس نے اجماعی طور پر قادیانیوں کی تکفیر کا حکم جاری کیا، یہ فیصلہ تمام امت کا فیصلہ تھا اور ان قرار دادوں کے سلسلے کی آخری کڑی، پاکستان پارلیمنٹ کا وہ فیصلہ تھا جس کے مطابق قادیانی فرقے کے لوگوں کو غیر مسلم اقلیت قرار دیا گیا[1]۔

۵۔ باطنیت[2] باطنی مذہب کی بنیاد ایسے لوگوں نے ڈالی جو اسلام اور رسول اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے اپنے دلوں میں شدید بغض و نفرت رکھتے تھے، ان میں فلاسفہ ملحدین، مجوسی اور یہودی وغیرہ شامل تھے تاکہ اسلام کو طاقتور نہ ہونے دیں اور اسے کمزور کرسکیں اور لوگوں کو اس سے دور کرسکیں اور اپنی کھوئی ہوئی قوت و حکمرانی کو پاسکیں اور مذہب اسلام کا خاتمہ کرسکیں، لیکن ... یَاْبَی اللّٰہُ اِلَّا اَنْ یُّتِمَّ نُوْرَہٗ ...؟

کہا جاتا ہے کہ اس ناپاک تحریک کا آغاز ۱۷۹ھ میں میمون بن قداح کے کوفے میں ظہور سے ہوا جس نے مسلمانوں کے لیے یہ جال بچھایا اور حق و باطل کو خلط ملط کرنے کی کوشش کی، قرآن کی ہر آیت کی نئی تفسیر کی اور احادیث کی طرح طرح سے تاویلات کی، وہ کہتا تھا کہ تمام فرائض و سنن صرف رموز و اشارات ہیں، ان کا ظاہر صرف چھلکا ہے

---

[1] تفصیل کے لیے دیکھئے: القادیانیۃ المستترۃ، اخطر الحرکات الھدامۃ علی عقیدۃ المسلمین شیخ علی عیسیٰ، "الاخبار العالم الاسلامی" عدد ۔ ۱۱۸۸، ص/۱۰ [2] اس گمراہ اور بدمذہب فرقے کے سلسلے میں دیکھیے: "بیان مذہب الباطنیہ و بطلانہ" منقول از کتاب" قواعد عقائد آل محمد" تصنیف محمد بن الحسن دیلمی، تصحیح و تحقیق: رشد و طمان، لاہور: ادارۂ ترجمان السنۃ، بار دوم، ۱۹۸۲ء۔

اور ان کا مغز ان کے باطن میں پوشیدہ ہے، یہ شخص اصلاً یہودی تھا اور خود کو مسلمان ظاہر کرتا تھا، اس کا مقصد اسلام کو ڈھا دینا تھا جیسا کہ یہودی عام طور پر دشمن اسلام ہوتے ہیں۔

اس مذہب کے دس مختلف القاب ہیں: اسماعیلیہ، باطنیہ، قرامطہ، سبعیہ، خرمیہ، بابکیہ، محمرۃ، تعلیمیہ، قرمطیہ اور خرمدینیہ۔

باطنی مذہب کا مقصد مسلمانوں کو ورغلانا اور انہیں ان کے سچے مذہب سے دور رکھنا تھا مگر یہ بات ممکن نہ تھی کہ مسلم حکومتوں میں رہکر صراحت کے ساتھ اس کا اعلان کریں چنانچہ اس کے لیے انہوں نے کچھ حیلے تیار کیے تاکہ لوگوں کو اپنے افکار و مقاصد سے مطلع کر سکیں، یہ حیلے مرحلہ وار ایک کے بعد ایک نو عدد ہیں: رزق[1]، فکر[2]، موانسہ[3]، تشکیک[4]، تعلیق[5]، ربط[6]، تدلیس[7]، تاسیس[8]، خلع[9]، اور مسخ اور ان حیلوں کا نام بلاغ اکبر رکھا جو زیادہ تر فلسفیانہ افکار پر مشتمل ہیں۔

یہ لوگ دو ازلی خداؤں کے قائل ہیں، جن کے وجود کا کوئی آغاز نہیں ہے اور یہ دونوں عقل و نفس، یا علت و معلول، یا سابق و لاحق، یا لوح و قلم، یا مفید و مستفید ہیں، بقول ان کے باری تعالیٰ کو نہ تو وجود کے ساتھ متصف کیا جا سکتا ہے اور نہ عدم کے ساتھ، نہ وہ معلوم ہے نہ مجہول، نہ موصوف ہے نہ غیر موصوف، نہ قادر ہے نہ غیر قادر اور نہ عالم ہے نہ غیر عالم، یہ لوگ طبیعت اور ستاروں کی تاثیر کے قائل بھی ہیں، مختصر یہ کہ ان کا مقصد خالق سبحانہٗ و تعالیٰ کا انکار ہے مگر اتنی صفائی کے ساتھ کہ خلق پر ظاہر نہ ہو سکے۔

نبوت کے سلسلے میں اس مذہب کا نظریہ عام فلسفیوں جیسا ہے، وحی الٰہی،

نزول ملائکہ اور معجزات کا انکار کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ یہ سب رمز و اشارات ہیں اور ایسی مثالیں ہیں جنھیں اہل نظر نہیں جانتے، حضرت موسیٰؑ کے اژدھے کا مطلب آل فرعون پر ان کا غلبہ ہے، اظلال غمام یعنی بادلوں کے سایہ فگن ہونے کا معنی بنو اسرائیل پر حضرت موسیٰؑ کی سیادت و قیادت ہے، ان لوگوں نے حضرت عیسیٰؑ کے بغیر باپ ہونے کا بھی انکار کیا، ان کے نزدیک ان کے بنا باپ ہونے کا مطلب یہ ہے کہ انہوں نے کسی امام سے علم حاصل نہیں کیا، بلکہ نائب امام سے حاصل کیا۔ قرآن کے بارے میں کہتے ہیں کہ یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا کلام ہے کیونکہ اللہ تعالی کا فرمان ہے کہ: "اِنَّہٗ لَقَوْلُ رَسُوْلٍ کَرِیْمٍ" انگلیوں سے پانی جاری ہونے کی تاویل یہ کی ہے کہ اس سے مراد کثرت علم ہے اور مغرب سے سورج نکلنے کا مطلب امام کا ظاہر ہونا ہے۔

فرقہ اسماعیلیہ کے ایک امام محمد بن اسمٰعیل کے بارے میں کہتے ہیں کہ وہ نبی ہیں اور شریعت محمدیہ کو منسوخ کرنے والے ہیں، بلکہ ان میں سے ایک گروہ کا کہنا ہے کہ محمد بن اسماعیل زندہ ہیں اور اس وقت تک نہیں مریں گے جب تک زمین کو عدل سے معمور نہ کر دیں۔

اس فرقے کا حال یہاں تک پہونچا کہ وہ اپنے اماموں کو خدا کہنے لگے۔ معاذ اللہ اور اس کے علاوہ بھی بہت سے امور ہیں جو ان کے کفر اور خروج پر صراحت سے دلالت کرتے ہیں، اگرچہ یہ لوگ زبردستی اپنے کو اسلام کے نام سے منسوب کرتے ہیں۔

نبوت کے دعوے لگاتار چلے آرہے ہیں، سوڈان میں محمد محمود طاہر نے

نبوت کا دعویٰ کیا اور "الاخوان الجمہوریین" کے نام سے ایک جماعت بنائی مگر یہ تحریک کچل دی گئی، امریکہ میں رشاد خلیفہ نامی ایک شخص نے نبوت کا دعویٰ کیا مگر چند ماہ قبل اسے بھی قتل کر دیا گیا، ان کے علاوہ بھی بہتوں نے دعوئے نبوت کیا، اس میں کوئی تعجب نہیں بلکہ یہ ہمارے رسول کی نبوت کے دلائل میں سے ایک دلیل ہے کہ آپ کو ایسے علم غیب سے باخبر کیا گیا ہے جس کا علم اللہ علیم وخبیر کے سوا کسی کو بھی نہیں ہے۔ ابن اسحٰق حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے :

"اس وقت تک قیامت قایم نہ ہوگی جب تک تیس دجال ظاہر نہ ہوں اور یہ سب کے سب نبوت کا دعویٰ کریں گے"[1] صلی اللہ تعالیٰ علیٰ سیدنا محمد خاتم الانبیاء والمرسلین الذی لا نبی بعدہ وسلم تسلیما کثیرا، والحمد للہ رب العالمین۔

---

[1] دیکھئے سیرۃ ابن ہشام، ۴ : ۳۴۳۔

الکلام

علامہ شبلی نعمانیؒ

دستاویز

بہار قانون ساز کاؤنسل کی کارروائیوں کی اردو رپورٹ

از جناب عبدالمنان ہلالی

گزشتہ کئی برسوں سے مسٹر لالو پرشاد یادو بہار کے وزیر اعلیٰ ہیں۔[o] گو ان کے پیش رو جناب جگن ناتھ مصرا کے زمانے ہی میں اردو کو دوسری سرکاری زبان کا درجہ مل چکا تھا لیکن اس میں شبہ نہیں کہ مسٹر یادو کے دور میں اردو کا فروغ زیادہ ہو رہا ہے، خصوصاً جب سے پروفیسر جابر حسین بہار قانون ساز کونسل کے چیرمین مقرر ہوئے ہیں اس وقت سے اردو کے لیے متعدد عملی اقدامات کیے جا رہے ہیں، انہوں نے کونسل کی کارروائی سے متعلق اردو میں دستاویز کے نام سے تین کتابیں شایع کی ہیں، اور ابھی یہ سلسلہ جاری ہے جناب عبدالمنان ہلالی جوائنٹ سکریٹری دارالمصنفین نے تینوں دستاویزوں کے مشمولات کا جائزہ و تعارف کرایا ہے تاکہ بہار قانون ساز کونسل میں اردو کے تعلق سے ہونے والی کارروائی اور دیگر سرگرمیوں کا اندازہ ہو۔ "ض"

پروفیسر جابر حسین چیرمین بہار قانون ساز کاؤنسل نے کاؤنسل کی کارروائیوں سے متعلق اردو میں دستاویز کے نام سے تین کتابیں شایع کی ہیں۔

پہلی کتاب میں بہار کی دوسری سرکاری زبان اردو کو قانون ساز کونسل کی آئینی زبان ماننے کی کارروائی، کاؤنسل میں اردو شعبے کا قیام، اس کے عہدوں کی تشکیل، ہندی کے ساتھ اردو زبان و رسم الخط میں بہار گزٹ کی اشاعت، اردو ڈائرکٹریٹ کے قیام سے متعلق ہوئی نشست کی رپورٹ، دوصد سالہ تقریبات غالب وغیرہ کا ذکر ہے۔

---

[o] ان سطور کی اشاعت کے وقت وہ مستعفی ہو گئے ہیں۔

پروفیسر جابر حسین صاحب نے ۱۰/ اپریل ۱۹۹۵ء کو بہار قانون ساز کاؤنسل کے کارگزار چیرمین کی حیثیت سے اپنے عہدے کی ذمہ داریاں سنبھالیں۔ اسی دن انہوں نے کاؤنسل کے ذمہ داروں اور عہدیداروں سے دریافت کیا کہ دوسری سرکاری زبان ہونے کی حیثیت سے اردو کے آئینی حقوق کے لیے کاؤنسل میں اس وقت تک کیا پیش رفت ہوئی۔

اسی نشست میں انہوں نے یہ بھی دریافت کیا کہ تقریباً پانچ دہائیوں سے شیڈول کاسٹ اور شیڈول ٹرائب طبقوں کے لیے سرکاری اداروں کی سیدھی بحالیوں میں بنائے گئے ریزرویشن قوانین کاؤنسل میں نافذ ہیں یا نہیں؟ ۱۹۷۸ء سے پورے صوبے میں پسماندہ طبقوں کے لیے بھی ایسے ہی ریزرویشن قوانین نافذ ہیں، ان کا اطلاق کاؤنسل کی بحالیوں میں ہوا ہے یا نہیں؟ ۹۳-۱۹۹۲ء سے جن قوانین کا نفاذ شیڈول کاسٹ، شیڈول ٹرائب اور پسماندہ طبقوں کے ریزرویشن کے لیے لازمی قرار دیا گیا ہے، ان کی خلاف ورزی کرنے والوں کے لیے سزا بھی مقرر کی گئی ہے، ان کا عملی نفاذ کاؤنسل میں ہوا کہ نہیں؟

جب سارے ہی سوالات کے جواب نفی میں ملے تو پروفیسر جابر حسین کی ہدایت پر اسی دن متذکرہ نکات کے نفاذ کی جانب ضروری کارروائی مکمل کر لی گئی۔ اور اس طرح ایک آئینی ادارے میں آئینی مراعات و اختیارات سے چشم پوشی اور خلاف ورزی کی یہ دیرینہ روایت اپنے اختتام کو پہنچی۔

اردو بہار کی ثانوی سرکاری زبان تو گزشتہ تقریباً دو دہائیوں سے تھی مگر یہ قانون ساز کاؤنسل کی آئینی زبان نہیں تھی، اسے کاؤنسل کی زبان کا درجہ دینے کے لیے پروفیسر جابر حسین نے ۲۶/ دسمبر ۱۹۹۵ء کو ایک نوٹیفکیشن جاری کیا، اس کے ذریعہ بہار قانون ساز کاؤنسل کے ضابطہ نامہ، طریقہ کار اور دستور العمل کی دفعہ

۲۰؍ (۴) کے تحت دفعہ ۱۱۷ میں ترمیم کا اعلان کیا۔ اسکے تحت اب کاؤنسل کا سارا کام ہندی زبان (دیوناگری رسم الخط) اور اردو زبان و رسم الخط میں انجام پانے لگا۔ ۱۹۹۵ء اجلاس، روزانہ فہرست امور" "توجہ طلب نوٹس" "روزانہ تفصیلات" وغیرہ ہندی ہی کی طرح اردو میں بھی تیار کر کے اراکین تک وقت سے پہلے پہنچائے جانے لگے۔ ۳۰ اگست ۱۹۹۵ء ایک تاریخی دن تھا جب بہار گزٹ ہندی کے ساتھ ساتھ اردو میں بھی شایع ہوا۔

"سماجیاتی تقاضوں کا پس منظر اور اردو کی عملی ترجیحات" ایوان کی میز پر رکھی جانے والی ایک رپورٹ ہے، اس میں آنے والے پانچ برسوں کا ایکشن پلان مرتب کیا گیا ہے اس کی ایک جھلک ملاحظہ ہو:

آڈیو ویژول میڈیا کے ذریعہ اردو۔ سماجی علوم کی کتابیں اردو میں۔ ثانوی سرکاری زبان اردو کے نفاذ کی جہتیں۔ مراسلاتی نظام اردو میں۔ اردو نظام املا کی معیار سازی۔ اردو کتب خانوں کا جال۔ اردو اور روزگار۔ اساتذہ کے لیے تربیتی نظم۔ مردم شماری اور اردو۔ انتخابات اور اردو۔ وغیرہ وغیرہ۔

مذکورہ رپورٹ پر ایوان میں جو مباحثہ ہوا اس میں اردو کے برمحل اشعار کے استعمال نے کارروائی رپورٹ کو ادب پارہ بنا دیا ہے:

لمحوں نے خطا کی تھی صدیوں نے سزا پائی

اس مصرعے سے مقرر نے گاگر میں ساغر بھر دیا اور جب یہ شعر پڑھا گیا:

گھروں پہ نام تھے، ساتھ نام کے عہدے ؛؛ بہت تلاش کیا کوئی آدمی نہ ملا

تو اردو میں خیال کی ایسی جامع اور موثر ادائیگی پر شریک مباحثہ خراج تحسین پیش کیے بغیر

۱؎ اتر پردیش میں گزٹ اردو میں بہت پہلے چھپتا تھا۔

نہیں رہ سکا۔

پروفیسر جابر حسین صاحب کی دوسری کتاب "دستاویز۔ ۲" ریاست بہار کے تعلیمی اور تدریسی مسائل سے متعلق ہے۔ اس کتاب میں ودیالیہ سیوا بورڈ کے تحت ۲۴۸ اردو اساتذہ کی تقرری سے متعلق التوا میں پڑے معاملے پر پروفیسر جابر حسین صاحب کی صدارت میں متعلقہ محکمہ کے ذمہ دار افسران کی جو نشست ہوئی اس کی رپورٹ،

• دوران اجلاس اراکین کاؤنسل کے ذریعہ اقلیتی تعلیمی اداروں کے اساتذہ سے متعلق سوالات' ان پر حکومت کا جواب اور چیرمین کی رولنگ شامل ہیں۔

اس میں پرمانند سنگھ مدن و دیگر اراکین کے ذریعہ اقلیتی اسکولوں کے اساتذہ کو پندرہ مہینوں سے تنخواہ کی ادائیگی نہ ہونے سے متعلق سوال وجواب، پروفیسر جابر حسین چیرمین کی رولنگ اور تنخواہ کی ادائیگی سے متعلق ایوان میں کیا گیا اعلان بھی شامل ہیں۔

نیلا مبر چودھری کے سوال "یونیورسٹیوں اور کالجوں میں مستقل اساتذہ نہیں" پر ایوان کی کارروائی، حکومت کا جواب اور چیرمین جابر حسین کی رولنگ، مولانا مظہر الحق عربی و فارسی یونیورسٹی کے قیام سے متعلق جناب شکیل احمد خاں کی توجہ طلب نوٹس اور اس پر چیرمین جابر حسین کی رولنگ جگہ پائے ہوئے ہیں۔ واضح رہے کہ بہار اسٹیٹ یونیورسٹی ایکٹ ۱۹۹۲ء کے تحت بہار میں گیارہ یونیورسٹی قائم کرنے کا نظم کیا گیا، لیکن مولانا مظہر الحق یونیورسٹی کے سواسب کا قیام عمل میں آچکا ہے۔

مباحثے کی کارروائیوں کو پڑھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ انسانی گروپ کا دماغ (بشرطیکہ وہ لوگوں کی بھیڑ نہ ہو) ایک فرد کے دماغ سے بہر حال زیادہ نمو خیز

ہوتا ہے، جب کسی مسئلہ پر ایوان میں بحث ہوتی ہے تو موضوع کے بہت سارے پہلو سامنے آجاتے ہیں جو انفرادی سوچ سے نہیں آسکتے۔

پروفیسر جابر حسین تنقید اور نکتہ چینی سے بالکل نہیں گھبراتے بلکہ ان کا استقبال کرتے ہیں مگر نکتہ چینی سے لہولہان ہونے کی ان کی خواہش کچھ عجیب سی لگتی ہے۔ یہ صحیح ہے کہ انھوں نے جو کام کیا ہے وہ اب تک اردو کے کسی اور بھی خدواہ سے نہیں ہوسکا، اسکے لیے وہ مبارکباد کے مستحق ہیں۔

تیسری کتاب "دستاویز۔۳" میں روایتی دستکاروں کی مشکلات پر ایوان میں مباحثہ، بہار قانون ساز کاؤنسل کی حقوق انسانی کمیٹی کے دائرہ کار اور طرز عمل سے متعلق عبوری رپورٹ، دیپا مرمو کے ساتھ زنا بالجبر حادثے سے متعلق بہار قانون ساز کاؤنسل کی حقوق انسانی کمیٹی کی جانچ رپورٹ، چیرمین کے آفس چیمبر میں اقلیتوں اور پس ماندہ برادریوں کے لیے ریزرویشن کے نفاذ سے متعلق نشست کی کارروائی۔ آرٹ کلچر، اقلیتی فلاح سے متعلق ایوان کی نشست کی کارروائی، گیا اور چترا ضلع کے اقلیتی فرقہ کے لوگوں کے قتل پر جانچ کمیٹی کی عبوری رپورٹ شامل ہیں۔

دستکاروں کی دشواریوں سے متعلق جو بحث ایوان میں ہوئی اس سے پتہ چلتا ہے کہ جو رقم کھادی بورڈ کو دستکاروں کی ترقی کے لیے ملتی رہی وہ کھادی بورڈ اپنے رکھ رکھاؤ پر خرچ کرتا رہا۔ گوتم ساگر رانا نے کہا اگر دستکاروں اور محنت کشوں کو کام نہیں ملے گا تو وہ اوزار کی جگہ ہتھیار اٹھانا پسند کریں گے۔ انھوں نے یہ کہا کہ ہم مانتے ہیں کہ ہندوستان صنعتی ترقی میں دسویں، اٹامک انرجی میں ساتویں اور خلائی سائنس میں چھٹویں نمبر پر ہے مگر دنیا کی انسانی ترقی میں ۴۳ ملکوں میں ہندوستان ۱۳۴ ویں نمبر پر ہے۔ انھوں نے

تاریخ کا حوالہ دیا کہ ۱۸۹۰ء میں پرتگال کے پاس تین سمندری تجارتی جہاز تھے، ہالینڈ کے پاس پانچ، ڈنمارک کے پاس ایک، امریکہ کے پاس پانچ اور ہندوستان کے پاس بچھتر تھے۔

بہار میں جہاں آج بھی جاگیردارانہ اور زمیندارانہ نظام کا راج ہے، ان طبقوں کو جنھیں ریزرویشن دیے گئے ہیں ان کو اس کا فائدہ نہیں پہنچ سکا ہے، بلکہ اس میں طرح طرح کی نامناسب رکاوٹیں کھڑی کی گئی ہیں۔ مثلاً میڈیکل کالجوں کے پوسٹ گریجویٹ کلاسوں کے اساتذہ کی تقرری میں ریزرویشن کا اصول نافذ ہے، مگر اساتذہ کی کم سے کم لیاقت پوسٹ گریجویٹ رکھی گئی جس کے داخلے کے لیے ریزرویشن کا نظم نہیں نافذ کیا گیا، نتیجہ یہ ہوا کہ ریزرویشن طبقے کا ایک بھی امیدوار پوسٹ گریجویٹ ڈگری کے ساتھ نہیں مل سکا۔

پروفیسر جابر حسین نے ریاست بہار میں حقوق انسانی کمیٹی کی بھی تشکیل کی۔ پورے ملک میں اس کمیٹی کو کسی ریاست کی واحد کمیٹی ہونے کا فخر حاصل ہے۔ اقلیتی فلاحی محکمہ کا ذکر پہلے ہو چکا ہے، یہ بھی بہار میں سب سے پہلے قائم ہوا۔ پروفیسر جابر حسین ہی کی کوششوں سے اردو بہار قانون ساز کاؤنسل کی آئینی زبان بنی، کاؤنسل میں اردو شعبہ اور اردو کمپیوٹر سیکشن قائم ہوئے۔ کاؤنسل کی تمام نشستوں کی اطلاعات اور کارروائیوں کی رپورٹ اردو میں وقت سے آنے لگیں۔ پروفیسر جابر حسین کے ان کارناموں نے انہیں ان کے سراپا احتجاج کے باوجود اردو، اقلیتوں اور پسماندہ طبقوں کے رضاکار کی جگہ سپہ سالار بنا دیا۔

معارف کی ڈاک

مکتوب دہلی

مکرمی! سلام مسنون

جون، ۱۹۹۷ء کے معارف میں جناب گوردیال سنگھ مجذوب نے کہف کے بارے میں جو تحقیق پیش کی ہے وہ ان کے وسیع مطالعہ کو ظاہر کرتی ہے۔ لیکن انہوں نے کہف (غار۔ کھوہ) کے لیے انگریزی لفظ C O V E پر غور نہیں فرمایا، یہ بھی کہف کی بدلی ہوئی شکل ہے اور تبدیلی بھی وہی وی (V) اور ف کے تلفظ کی بنیاد پر ہے۔انہوں نے یہاں ف کی جگہ وی (V) کا تلفظ لے لیا ہے باقی سارے الفاظ وہی ہیں جو عربی میں ہیں چھوٹی ہ کو اے (A) سے بدل دیا گیا ہے کیونکہ اہل یوروپ عام طور پر تلفظ ACCENT لہجہ میں ایسی تبدیلی کرلیتے ہیں، انگریزی میں بہت سے ایسے الفاظ ہیں جن کی اصل عربی ہے اور تلفظ کے فرق سے اس کی صورت بدل گئی ہے، کچھ ایسے انگریزی الفاظ ہیں جو عربی میں مستعمل ہیں لیکن اپنی اصل سے بیگانہ نہیں ہوئے ہیں، دراصل اندلس میں عربوں کے طویل اقتدار کے دوران یوروپ نے مسلمانوں سے بہت کچھ حاصل کیا۔اس دور میں جسے یوروپ کا دور ظلمت کہا جاتا ہے، قرطبہ و غرناطہ کی دانشگاہیں علوم وفنون کی مشعلِ فروزاں تھیں۔ عربوں نے ترجمہ کے ذریعہ اغریقی (یونانی) فلسفہ وعلوم کو زندہ کیا، جالینوس، سقراط، بقراط فیثاغورث وغیرہ فکری طور پر زندہ ہوئے طب، فلسفہ، سائنس اور ٹیکنالوجی میں عربوں نے جو ایجادات کیں انہوں نے اہلِ یوروپ کو مبہوت کر دیا تھا۔روایت ہے کہ جب

عربوں نے آلۂ اصطرلاب ایجاد کیا تو ایک مسیحی دانشور اس سے اتنا متاثر ہوا کہ اس نے اپنے بیٹے کا نام ہی اصطرلاب ASTRALOBE رکھا۔ اسی طرح ایک روایت ہے کہ ایک عرب سردار عمرو بن لحی علاج کی غرض سے شام گیا وہاں اس نے یونانی صنمیات کا مشہور بت اپالو (APOLLO) دیکھا، یہ عقیق کا بنا ہوا بڑا خوبصورت بت تھا، یونان میں اپولو موسیقی محبت اور شباب کا دیوتا مانا جاتا ہے۔ عمرو اپولو کا ایک بت اپنے ساتھ لایا اور اسے کعبہ میں رکھ دیا۔ پہلے یہ اپولو کہلایا اور پھر ہبل بن گیا۔

بہرکیف عرب اور یورپ کے تہذیبی رشتے بہت گہرے ہیں۔ ذیل میں ایسے چند الفاظ کی فہرست پیش کی جارہی ہے جو صوتی و معنوی اعتبار سے ایک جیسے ہیں۔

ارض	EARTH	(زمین)	قطن	COTTON	کپاس
قندیل	CANDLE	موم بتی	قط	CAT	بلی
عقیق	ANTIQUE	قدیم	اسطوری	STORY	حکایت
جمل	CAMEL	اونٹ	شربت	SYRUP	مشروب
بیل الفیل	ELEPHANT	ہاتھی	الکحل	ALCOHOL	
الاکسیر	ELIXIR	اکسیر	بیطار	VATERINAY	علاج مویشیاں
طریق	TRACK	راستہ	صفر	CYPHER	صفر
	(TREAD)	چلنا	اثیر	ETHERE	آسمانی
جرائم	CRIME				
قنطار	QUINTAL	سو کلوگرام	قانون	CANON	شرعی ضابطہ
قیراط	CARAT	سونے کا وزن	فرس	HORSE	گھوڑا
کیل	SCALE	پیمانہ	حشیشی	ASCASSIN	باطنیوں کا قاتل گروہ (قاتل)

الوداع	ADIEU	(فرانسیسی متبادل)	الحمدللہ	ALLEBNIA	حمد باری
واللہ	OLE	اظہار مسرت کے لیے اسپینی لفظ			

اسی طرح سنسکرت اور فارسی کی قربت کی بات ہے، ماہرین لسانیات کا کہنا ہے کہ یہ دونوں زبانیں حقیقی بہنیں ہیں۔ اس میں الفاظ کی مماثلت بہت عام ہے۔ یہاں صرف ایک لفظ نم کا حوالہ دیا جاتا ہے۔ اس کے معنے سر جھکانا، تعظیم کرنا (نمستے) ہے، فارسی میں یہ لفظ نماز (عبادت) بن گیا ہے۔ نم دونوں میں مشترک ہے۔

یہ بڑا دلچسپ موضوع ہے اور ماہرین لسانیات نے اس پر کافی کام کیا ہے۔ عربی عبرانی اور سریانی سامی زبانوں کی قربت تو واضح بات ہے سنسکرت کے اثرات بھی عرب علاقوں میں گہرے رہے ہیں۔ اسلام سے قبل عربوں کے آس پاس کے علاقے خصوصاً وسطی ایشیا میں بودھ مذہب کو عروج حاصل تھا۔ اس لیے بہت سے سنسکرت، پالی اور اس وقت رائج زبانوں کے الفاظ بودھ بھکشوؤں کے ذریعہ وہاں پہنچتے رہے اور اہل عرب جو کہ تجارت کے لیے ہندوستان، شام، سمرقند و بخارا وغیرہ کے سفر کرتے تھے اور خود بودھ مبلغین کی اپنے مذہب کی اشاعت میں دور دراز کے علاقوں میں سرگرمیاں اس لسانی قربت و ہم آہنگی کا خاص سبب تھیں۔

والسلام

نیازمند

اطہر نقوی

جامعہ نگر، نئی دہلی

۲۰/۷/۹۷۔

آثار علمیہ و تاریخیہ

قرن اول کی کتابیں

از مولانا عبداللہ عمادی

عام طور پر لوگوں کا خیال ہے کہ دوسری صدی ہجری سے قبل مسلمانوں نے تصنیف و تالیف کا آغاز نہیں کیا تھا اور اسلامی تعلیمات کا وہ ایمان افروز مجموعہ جسے حدیث اور اخلاقیات کہتے ہیں تقریباً ایک صدی تک غیر مرتب رہا۔ ان کے خیال میں تصنیف کی ابتدا ابن جریج (وفات ۱۵۰ھ) سے ہوئی اور پھر امام مالک (وفات ۱۷۹ھ) نے "موطا" لکھ کر متعاقبین کے لیے تصنیف و تالیف کا راستہ کشادہ کر دیا۔ پس کتاب ابن جریج اور موطا دوسری صدی ہجری کی تالیفات ہیں۔

اس طرح رسول اللہ ؐ کی تعلیمات کا ایک صدی تک غیر منضبط رہنا ایک نکتہ سنج کی نگاہ میں ضرور کھٹکتا ہے اور اسی بنا پر یوروپی اقوام نے اسلام پر صدہا اعتراضات کیے ہیں۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ ایک فاش تاریخی غلطی ہے اور افسوس کی بات ہے کہ امام ذہبی اور حافظ ابن حجر جیسے نامور اور باکمال محدثین بھی اس غلط فہمی میں مبتلا ہیں۔

اگرچہ مسلمان ہمیشہ مذہبی تعلیمات کے لیے قرآن حکیم ہی کو حرف اول و آخر سمجھتے رہے لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ وہ قانون تمدن کی پہلی دفعہ (تصنیف و تالیف) سے بے خبر رہے۔ بلا شبہ عرب میں کتابت کا رواج نہ تھا۔ نزول قرآن سے قبل بمشکل بارہ یا تیرہ اشخاص کو لکھنا آتا تھا اور اگر کوئی لکھائی کے ساتھ تیر اندازی و پیراکی بھی جانتا تو وہ

صاحب کمال سمجھا جاتا۔ تمام ملک عرب اسی جہالت میں مبتلا تھا لیکن آفتاب اسلام کے طلوع ہوتے ہی ان ہی عربوں نے "طلع الصباح وطفی المصباح"[۱] کے نقرہ کو سچا ثابت کر دکھایا۔ مسلمانوں نے تمدن کی مختلف شاخوں میں ترقی کی۔ حدیث کی کتابیں اسی زمانہ میں تالیف ہوئیں لیکن تالیف کے لیے جس تہذیب و ترتیب کی ضرورت پڑتی ہے اس کے آثار دوسری صدی ہجری میں قائم ہوئے۔ مولفین ان ہی مکمل و مرتب تالیفات کو دوسری صدی ہجری کی یادگار بتاتے ہیں۔ ورنہ یہ ایک حقیقت ہے کہ حضرت علیؓ کی کتاب القضایا اور حضرت ابن عباسؓ کی حدیث کی کتاب تیسویں ہجری سنہ ۳۰ھ تک تالیف ہو چکی تھیں۔

مگر یہ کتابیں مختصر و ناکافی تھیں۔ یہی وجہ ہے کہ ابن شہاب زہری نے جب ایک مبسوط کتاب لکھی تو یہ بات مشہور ہوئی کہ حدیث کے سب سے پہلے مولف و مدون ابن شہاب زہری ہیں۔ جن کو حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ نے اس کام پر مامور کیا تھا[۲]۔ اسی طرح ابوبکر خرمی نے بھی حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کی ترغیب پاکر حدیث کی کتابیں تالیف کی تھیں۔ حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کی وفات سنہ ۱۰۱ھ میں ہوئی، لہذا اس کام کے آغاز کو پہلی صدی ہجری سے ہی نسبت ہوتی ہے۔ مسلمان عموماً اس غلط فہمی میں مبتلا ہیں کہ حدیث کی کتابیں دوسری صدی میں ابتداً سعید بن ابی عروبہ، ربیع بن صبیح، ابن جریج اور مالک بن انس نے تالیف کیں۔ ان میں کی آخری تالیف (موطا) موجود ہے جسے اسلامی تمدن کی پہلی کتاب کہتے ہیں[۳]۔

---

[۱] یعنی صبح ہوتے ہی شمعیں بجھا دی جاتی ہیں، اسی طرح اسلام آتے ہی تمام جھوٹی روایات اور بے بنیاد قوانین پر پانی پھر گیا [۲] زرقانی ص ۱۰ [۳] زرقانی ص ۱۰، یہ اور اس سے قبل کا حاشیہ نہیں ملا۔ (معارف)

تاریخ شاہد ہے کہ ہجرت کے پچیس تیس سال بعد مسلمانوں نے کتابت کی طرف توجہ کی اور مختلف عنوانات پر کتابیں لکھنی شروع کیں[1]۔ زائدہ بن قوامہ نے جو حسن بن عطیہ کے ساتھ جنگ روم میں شہید ہوئے فن حدیث، تفسیر، تجوید اور اخلاقیات پر کئی کتابیں لکھی تھیں۔ ابن الندیم نے ان کی کتاب السنن، کتاب القراءت، کتاب التفسیر، کتاب الزہد اور کتاب المناقب کا تذکرہ کیا ہے۔

امیر معاویہ کے حکم سے عبید بن شریہ جرہمی نے اقوام عالم کی ایک تاریخ مرتب کی عوانہ نے سوانح حیات پر ایک کتاب لکھی اور امیر معاویہ کی سوانح بھی لکھی۔ کتاب الفہرست کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ یہ دونوں ایک ہی کتاب ہیں۔

فن تفسیر کی ابتدا بھی اسی عہد میں ہوئی۔ حضرت علیؓ اکثر اوقات قرآن مجید کے مطالب بیان کرتے۔ حضرت ابو حمزہ ثمالی سنا کرتے۔ انہیں اسی طرح تفسیر قرآن لکھنے کا شوق پیدا ہوا۔ چنانچہ ان کی تیار کردہ تفسیر کئی جلدوں پر مشتمل تھی اور ایک جلد میں بسا اوقات سات سو یا اس سے زیادہ اوراق ہوتے[2]۔

ان کتابوں میں عنوان ہمیشہ مختلف النوع ہوتے۔ مثلاً مسئلہ خلافت کے متعلق ابن ہثیم کی کتاب الامامہ" اور" کتاب الاستحقاق"۔ علم تاریخ میں اشنانی کی کتاب" فضائل علی و مقتل حسن بن علی" اور علم کلام میں" سلیم بن قیس ہلالی" نامی کتابوں میں یہ جدت بہ وضاحت نظر آتی ہے۔

اس قرن اول (ساتویں صدی عیسوی) میں نہ صرف حدیث، تفسیر، کلام اور سیرت میں تصنیف و تالیف کا آغاز ہوا بلکہ حسب ضرورت اکثر علوم و فنون مثلاً علم طب

---

[1] فتوح البلدان۔ بلاذری۔ ص ۴۷۹، [2] کتاب الفہرست۔ مطبوعہ لیپزنگ جرمنی۔ ص ۱۰۷۔

وکیمیا کی طرف بھی توجہ کی گئی اور ان پر متعدد کتابیں لکھی گئیں۔

غیر زبانوں کے عربی ترجمہ اسی عہد کی پیدا وار ہیں۔ مثلاً خالد بن یزید کے لیے کئی کتابیں یونانی سے عربی میں ترجمہ ہوئیں[1] لیکن واقعات سے پتہ چلتا ہے کہ خالد کے دادا حضرت معاویہؓ اس سلسلے میں اولیت کے مستحق ہیں جن کے حکم پر ملک شام کے ایک عیسائی طبیب "ابن اثال" نے طبی کتابیں یونانی سے عربی میں ترجمہ کیں۔ خالد بن یزید نے چند یونانیوں کو جو مصر میں پناہ گزیں تھے ملک شام میں طلب کیا اور ان سے فن کیمیا و طب کی یونانی اور قبطی کتابوں کا عربی ترجمہ کرایا۔ علامہ ابن ندیم نے کتاب الفہرست میں پہلی صدی ہجری کی کیمیائی تصانیف اور تراجم کی ایک طویل فہرست پیش کی ہیں۔ مثلاً کتاب الحرارت کتاب الوصیت وغیرہ[2]

عموماً خالد بن یزید کا "خزانۃ الکتب" پہلا اسلامی کتابخانہ سمجھا جاتا ہے اور ہم بھی اس کتاب خانہ کی وسعت، حسن انتظام، کتابوں کی فراوانی اور خوبی و کمال کو دیکھ کر اس رائے کو تسلیم کرتے ہیں لیکن فی نفسہ اس سے قبل بھی کتابخانے کا وجود ثابت ہوتا ہے تاریخ بتاتی ہے کہ ابن ابی بعرہ کا کتابخانہ ہر لحاظ سے قابل قدر تھا جو ۶۲ھ کے بعد قائم ہوا تھا۔ محمد بن اسحاق صاحب مغازی متوفی ۱۵۰ھ نے بچشم خود اس کتابخانے کو دیکھا اور ان کا بیان ہے کہ ابن ابی بعرہ کو ان کے ایک دوست نے جو کوفہ کے سربرآوردہ تھے مرتے وقت یہ کتابخانہ ہبہ کیا تھا۔ واللہ اعلم۔

---

[1] کتاب الفہرست۔ مطبوعہ لیپزنگ جرمنی۔ ص ۱۰۷ [2] ایضاً: ص ۳۵۱ تا ۳۶۰

مکاتیب علامہ سید سلیمان ندوی

بنام

مفتی ظہور احمد دربھنگوی و مولوی وحید احمد صاحب

اعظم گڑھ

مجی تسلیم

میں اس وقت سفر کے لیے پا بہ رکاب ہوں، "بلبل" میرے خیال میں فارسی ہے، بلبل عرب میں نہیں ہوتا، نہ شعرائے عرب بلبل باندھتے ہیں، وہاں "عامہ" باندھتے ہیں، اس وقت دلائل اور اسناد سے معاف کیجیے۔

والسلام

سید سلیمان

۹ مارچ ۱۸ء

اعظم گڑھ

محب مکرم السلام علیکم

محبت نامہ مسرت افزا ہوا، آپ کی علالت اب کی طول پکڑ گئی، شاید ورم طحال کا کوئی اثر معلوم ہوتا ہے، دعائے صحت کرتا ہوں، عجل اللہ شفاءک۔

آپ نے اپنے جس عزیز کی نسبت لکھا ہے، افسوس ہے کہ ایک سال کے لیے اس کا وقت گزر گیا، ہر سال کے تمام پر عرضیاں آجاتی ہیں اور مدرسہ کھلتے فیصلہ ہو جاتا ہے، چونکہ عرضیاں کثرت سے آتی ہیں اس لیے بڑی دشواری پیش آتی ہے، صرف ۲۵ جگہیں ہیں سال میں دو تین جگہیں خالی ہوتی ہیں۔

نیا نصاب ابھی چھپا نہیں، قواعد وغیرہ البتہ ہیں، جو ہر وقت چھپے ملتے ہیں، فیس ماہوار ہے، قواعد نسخہ دفتر ندوہ سے منگوا لیجئے، آٹھ درجے تعلیم مولویت کے ہیں، تکمیل کے، چار ٹکٹ واپس مرسل ہیں۔

خواجہ عبد الواجد مدت کے بعد امسال دارالمصنفین آئے تھے۔ کئی روز رہے۔ . . .[1]

. . . .

والسلام

سید سلیمان

۹ جولائی ۲۳ء

اعظم گڑھ

محب محترم دام لطفہ

السلام علیکم۔ تاتار خان پر ایک مضمون فروری ۳۲ء کے معارف میں چھپ چکا ہے، کیا آپ نے نہیں دیکھا،

اس کا آبائی وطن خراسان تھا اور صغر سنی میں ایک خراسانی حملہ کے وقت ہندوستان میں چھوٹ گیا اور یہیں شاہ دہلی کے محل میں تعلیم و تربیت پائی۔

ولادت غالباً ۷۱۵ھ کے قریب یا بعد اور وفات ۷۶۰ھ اور ۷۷۰ھ کے بیچ میں۔

امید کہ مزاج بخیر ہوگا۔ ندوہ ہوں اور طالب دعا ہوں۔

والسلام

سید سلیمان

۳۲ء

---

[1] آخری سطر کرم خوردہ ہے۔

برادرم مولوی وجیہ احمد صاحب دام لطفہ

السلام علیکم حسب الارشاد مولوی ظہور احمد صاحب کو جواب دیدیا کہ سال گزر گیا اور غیر مستطیع طلبہ کا انتخاب ہو چکا۔

آپ کی علالت کا حال سُن کر افسوس ہوا، آخر یہ لنگ پائی کب تک رہے گی، عید الضحیٰ کے موقع پر "بیگم" مظفر پور جائیں گی، میں بھی ہمرکاب ہوں گا، اگر آپ عید منانے گھر نہ چلے جائیں تو "تقابل" ہوگا۔

والسلام

سید سلیمان

۹ جولائی ۱۳۲۳ھ

دار المصنفین کا سلسلۂ مکاتیب

مکاتیب شبلی : حصہ اول، علامہ شبلی کے ان خطوط کا مجموعہ جو انہوں نے عزیزوں اور دوستوں کے نام لکھے جن میں ملکی، قومی، مذہبی خیالات و مسائل کا بڑا ذخیرہ موجود ہے۔ قیمت ۴۰ روپے

مکاتیب شبلی : حصہ دوم، علامہ شبلی نعمانی کے ان خطوط کا مجموعہ جو انہوں نے اپنے تلامذہ کے نام لکھے اور جن میں زیادہ تر علمی اور اصلاحی خیالات کی ان کو تلقین کی۔ قیمت ۳۵ روپے

برید فرنگ : مولانا سید سلیمان ندوی کے ان خطوط کا مجموعہ جو انہوں نے یورپ سے اپنے عزیزوں کے نام لکھا اور جن میں یورپ اور دنیائے اسلام کے سیاسی و اجتماعی حالات و تبصرے اور اکابر اسلام کی ملاقاتوں کا حال بیان ہوا ہے۔ قیمت ۳۵ روپے

مشاہیر کے خطوط : اس میں سید سلیمان ندوی کے نام مولانا حالی، مہدی، افادی، سید اکبر حسین الہ آبادی، علامہ اقبال وغیرہ کے خطوط ہیں جو پڑھنے سے تعلق رکھتے ہیں۔

مطبوعات جدیدہ

ایشیاٹک سوسائٹی کی خدمات فارسی

از ڈاکٹر خالدہ حسینی

متوسط تقطیع، بہترین کاغذ اور کتابت و طباعت، مجلد مع گرد پوش، صفحات ۳۱۲،

قیمت ۲۰۰روپے، پتہ: قاسمی دواخانہ ۸۳ کولوٹولہ اسٹریٹ کلکتہ ۷۰۰۰۷۳ اور

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، جامعہ نگر، نئی دہلی ۱۱۰۰۲۵۔

کلکتہ کی ایشیاٹک سوسائٹی بجا طور پر ان چند قدیم اہم علمی اداروں میں ہے جنھوں نے
طوطات و مطبوعات کے جمع و تحفظ کے علاوہ علوم و فنون کی تحقیق، فروغ اور ترقی میں
یاں حصہ لیا ہے، ۱۹۸۴ء میں اس نے اپنے قیام کے دو سو سال پورے کر لیے،
بلکن اس قدر قدیم اور اہم ادارہ کی تاریخ اور اس کے خزانۂ نوادر سے خواص تک بھی
ہی واقف ہیں، اس کتاب کی حوصلہ مند مصنفہ نے اس ضرورت کو محسوس کر کے
سے اپنے پی ایچ ڈی کا مقالے کا موضوع بنایا اور گو اس بحر زخار میں صرف فارسی
بان پر توجہ مرکوز کی لیکن ساڑھے چار ہزار فارسی مخطوطات اور ادارہ کی وسیع فارسی
رمات کا مکمل جائزہ بھی آسان نہیں تھا، لیکن لائق مصنفہ اس دشوار گزار مرحلے سے
سن و خوبی گزریں، انھوں نے ابتدا میں بنگال میں فارسی زبان و ادب کے فروغ
ور سوسائٹی کے بانی سر ولیم جونس کے متعلق معلومات افزا ابواب سپرد قلم کیے اور
س کے بعد مذہب، تاریخ، تذکرہ، سوانح، تصوف، ادب و شعر، قواعد لغت، علوم
فنون، قصص و حکایات اور ترجمہ کے زیر عنوان اہم اور نادر مخطوطات کا جس

سلیقہ سے تعارف کرایا وہ ان کے ذوق تحقیق و سلیقہ تصنیف کا عمدہ نمونہ ہے، ابن جریر طبری کی تفسیر کے فارسی ترجمہ کے مخطوطہ کا چند سطروں میں تعارف اس کی ایک مثال ہے، جس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ مخطوطہ برٹش میوزیم میں موجود نسخہ سے قدیم تر ہے، سوسائٹی کے ایک صدر کول بروک کی خدمات کے ضمن میں لکھا کہ "راجہ رام موہن رائے کے ستی پر رسالہ لکھنے کے بیس سال پہلے کول بروک نے ہندوؤں کی ابتدائی کتابوں سے یہ ثابت کیا تھا کہ ستی، مذہب کی روایات کے برعکس ہے"۔ بجا طور پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ یہ اپنے موضوع پر اردو میں اولین تحقیقی کاوش ہے، البتہ بعض طویل فارسی اور انگریزی اقتباسات بغیر ترجمہ کے ہیں، ظاہری لحاظ سے بھی کتاب بڑی دلکش ہے، اعلیٰ درجہ کے کاغذ اور طباعت اور بامعنی سرورق نے اس کے حسن میں اور اضافہ کر دیا ہے۔

مطالعہ مثنویات مصحفی

از محترمہ ڈاکٹر سعیدہ وارثی، متوسط تقطیع عمدہ کاغذ و کتابت و طباعت، مجلد، صفحات ۲۳۶، قیمت ۱۰۰ روپے پتہ: مکتبہ جامعہ، دہلی۔

متقدمین شعرائے اردو میں شیخ حافظ غلام ہمدانی مصحفی کی حیثیت مسلم الثبوت استاد کی ہے، میر و سودا و سوز بلکہ پیش رو اساتذہ کے کمالات و خصائص ان میں اس طرح یکجا ہو گئے تھے کہ بلاشبہ وہ اپنے ہم عصروں سے فائق و برتر ہوئے، ان کے شاگردوں کی کثرت بھی ان کے کمال کا بین ثبوت ہے، پختگی و بلندی و صفائی اور شیرینی و رنگینی ان کے کلام کا خاص جوہر ہے، اصلاً وہ غزل کے شاعر تھے، فارسی اور اردو کے متعدد کلیات و دواوین ان کی یادگار ہیں، صنف مثنوی میں بھی ان کی تقریباً بیس نظمیں ہیں جو ان کی غزلوں کی شہرت میں دب سی گئیں اور ان سے اعتنا کم کیا گیا، اس کتاب میں اس کمی کو بحسن و خوبی پورا کیا گیا ہے، مصحفی کے حالات اکثر مستند تذکروں کی مدد سے بیان

کرنے کے بعد ان کی مثنویوں کا تعارف اور پھر مصحفی کا بحیثیت مثنوی نگار مبصرانہ جائزہ لیا گیاہے، ایک باب میں دوسرے اہم مثنوی نگار شعراء مثلاً میر، سودا، انشاء، میر حسن، میر اثر اور جرأت سے ان کا موازنہ کیا گیاہے اور غیر جانبداری سے محاسن و نقائص کو واضح کیا گیاہے، مصنفہ کا خیال ہے کہ مجموعی حیثیت سے مثنوی نگاری میں مصحفی دوسرے درجہ کی صف کے آدمی ہیں لیکن کہیں کہیں یہ بھی تحریر کیاہے کہ "ان کی مثنویاں رعایت لفظی اور خیال بندی کے لحاظ سے دبستان لکھنؤ کا شاہکار ہیں" مصحفی کی پُرگوئی، مضمون آفرینی، طرز ادا اور پُر تکلف اسلوب بیان کی داد دیتے ہوئے ایک جگہ لکھاہے کہ داستان کو آگے بڑھانے اور پھیلانے کا سلیقہ اور اجزائے داستان برمحل نمایاں کرنے کا شعور، میر کی دریائے عشق سے زیادہ مصحفی کی بحر المحبت میں ملتاہے، اس کے باوجود مصحفی کو مطلق دوسرے درجہ کا مثنوی نگار قرار دیا جانا ممکن ہے تضاد پر محمول کیا جائے۔ کتاب کی بڑی خوبی یہ ہے کہ اس میں مصحفی کی اکیس مثنویاں بھی تعلیق و تحشیہ کے ساتھ شامل کی گئی ہیں جو اس سے پہلے متفرق و منتشر تھیں۔

شمع فروزاں مرتبہ جناب عمر خالدی، متوسط تقطیع، کاغذ، کتابت اور طباعت عمدہ، مجلد، صفحات ۱۸۶، قیمت ۵۰ روپے، پتہ: اسٹوڈنٹس بک ڈپو، چارمینار، حیدرآباد، اے۔ پی۔

حیدرآباد دکن کا خطہ زر و سیم و جواہر کی قدرتی دولت سے مالامال ہونے کے علاوہ کاملان علم و فن کی ثروت سے معمور رہا، ان میں سے بعض گو ناموری اور شہرت سے دور ہیں لیکن ان کے سوانح، ان کی عظمت و جلالت کے خود داستان گو ہیں، اس کتاب میں مولوی جمیل الدین احمد، مولوی سید قطب الدین محمودی، مولانا سید

عبدالباقی شطاری اور ابوہاشم سید یوشع کا شمار ایسی ہی شخصیات میں ہوتا ہے، سید مبارز الدین رفعت اور ڈاکٹر ابوالنصر محمد خالدی اہل علم میں محتاج تعارف نہیں، ان تمام فاضل ہستیوں کے ذکر سے مقصود یہی ہے کہ استفادہ کے لیے ان کے کارناموں کو بطور یادگار محفوظ کرلیا جائے۔

پہلا مضمون رائے جگن ناتھ پرشاد معروف بہ مولوی جمیل الدین پر ہے اور اس درجہ دلچسپ اور موثر ہے کہ بار بار پڑھنے سے بھی طبیعت سیر نہیں ہوتی، اس کے فاضل مضمون نگار ابوالنصر خالدی مرحوم پر خواجہ معین الدین غزمی کا مضمون بھی اسی درجہ دلچسپ ہے، ایک اضافی خوبی پروفیسر مبارز الدین رفعت مرحوم کے نام مجموعہ مکاتیب ہے، یہ کتاب واقعی اسم بامسمیٰ ہے جس سے نور و سرور حاصل ہوکر رہتا ہے۔

آئینہ در آئینہ از جناب اثر انصاری، متوسط تقطیع، کاغذ اور کتابت و طباعت عمدہ، مجلد مع گرد پوش، صفحات ۱۵۲، قیمت ۳۰ روپے، پتہ: نکھار پبلی کیشنز، مئوناتھ بھنجن، یوپی۔

جناب اثر انصاری کہنہ مشق اور استاد شاعر ہیں، اس سے پہلے ان کی غزلوں کے تین مجموعے شایع ہوچکے ہیں، زیر نظر مجموعہ نظموں پر مشتمل ہے، انہوں نے علامہ اقبال اور جوش ملیح آبادی سے متاثر ہوکر نظم گوئی کی جانب توجہ کی، ایک موثر نعت پاک سے اس مجموعہ کا آغاز کیا گیا ہے لیکن زیادہ تر نظمیں ملک کے نصف صدی کے سیاسی ماحول کی عکاس ہیں، ہندوستان کی آزادی، عصر جدید، افسانہ غارتگری، خلش نامعلوم، بازگشت اور انتظار وغیرہ سے نظم گوئی میں ان کی قادرالکلامی ظاہر ہوتی ہے، بعض نظمیں اہم علمی و ملی شخصیتوں کی مدح و رثا میں ہیں، جناب سید صباح الدین عبدالرحمٰن مرحوم کے متعلق پُر اثر نظم کا آخری شعر ہے:

تو نہیں لیکن تحریر تو رخشندہ ہے صفحۂ تاریخ میں تو زندہ و پائندہ ہے

ع۔ ص۔

جلد ۱۶۰ ماہ جمادی الاول ۱۴۱۸ھ مطابق ماہ ستمبر ۱۹۹۷ء عدد ۳

فہرست مضامین

مقالات

معارف کی ڈاک

ادبیات

شذرات

ان صفحات میں متعدد بار اس کا تذکرہ آیا ہے کہ بعض خود غرض ناشرین دارالمصنفین کی اجازت کے بغیر اس کی مطبوعات چھاپ رہے ہیں۔ ہم کو زیادہ شکایت پاکستان کے ناشروں سے تھی، لیکن ہندوستان اس معاملے میں پیچھے نہیں ہے، چوری ہمیشہ ہی ہوتی تھی لیکن یہ بہت پست اور معمولی لوگ کرتے تھے اور وہ بھی رات کے سناٹے میں، یا سنسان جنگلوں اور بیابانوں میں ڈاکو راہ گیروں کو لوٹ لیتے تھے، مگر حکومتیں ان کی روک تھام کی پوری کوشش کرتی تھیں اور جو لوگ پکڑ میں آتے تھے انہیں سخت سزا ملتی۔ لیکن اب اونچے طبقوں کے لوگ بھی یہ کام کر رہے ہیں اور شاید ہی کبھی ماخوذ ہوتے ہوں، انہوں نے چوری کے ایسے ایسے طریقے اور صورتیں ایجاد کر لی ہیں جن کی وجہ سے ہر شخص کے لیے یہ آسان ہو گئی ہے اور ہر قدم پر اس کی گنجایش بھی پیدا ہو گئی ہے ؎

شہر یست پر ز خوباں و ز ہر طرف نگارے　　یاراں صلائے عام است گر می کنید کارے

ہم جس طرح کے لوگوں سے دوچار ہیں وہ ناشروں اور تاجران کتب کا گروہ ہے یہ بڑی ڈھٹائی سے دارالمصنفین کی کتابیں چھاپ کر اس کے لیے مصیبتیں اور مشکلات پیدا کر رہے ہیں، ان میں دہلی اور دیوبند کے بعض ناشرین بھی ہیں جو تقدس کا لبادہ اوڑھے ہوئے ہیں، پتہ نہیں ان کے نزدیک یہ چوری، ڈاکہ زنی اور اکل اموال بالباطل ہے بھی یا نہیں، فقہی تاویلوں اور حیلوں سے تو ہر چیز جائز کر لی جا سکتی ہے۔

سر دست یہ گفتگو یہیں ختم کر کے ہم دارالمصنفین کے خیر خواہوں اور قدردانوں کو یہ خوش خبری سناتے ہیں کہ اس کی اشاعتی سرگرمیاں اس وقت تیز اور بہتر ہو گئی ہیں، الحمد للہ ایک نئی کتاب "تذکرۃ الفقہاء" حصہ اول چھپ کر تیار ہو گئی ہے، جس کے مرتب مولوی عمیر الصدیق رفیق دارالمصنفین ہیں، ایک اور نئی کتاب "اسلام و مستشرقین" حصہ ششم کی کتابت ہو چکی ہے اور جلد ہی ان شاء اللہ طباعت شروع ہوگی

اس وقت ملک میں آزادی کی گولڈن جبلی منائی جا رہی ہے لیکن یہ بڑی تکلیف دہ بات ہے کہ مسلمان رہنماؤں کا نام نہیں لیا جاتا، مولانا ابو الکلام آزاد جیسے جنگ آزادی کے ممتاز رہنما بھی فراموش کیے

جارہے ہیں، مولانا دارالمصنفین کے بڑے محسن اور علامہ شبلی کے احباب خاص میں تھے ان کے اس گہرے تعلق کی بنا پر اس موقع پر ان سے متعلق ایک کتاب شایع کرنے کا ارادہ ہے جس کی کمپوزنگ شروع ہوگئی ہے علی گڑھ یونیورسٹی کے شعبۂ عربی کے اسکالر جمشید ندوی صاحب مضامین معارف کا اشاریہ تیار کر رہے ہیں جو تکمیل کے مرحلے میں ہے۔

دارالمصنفین کی پرانی مطبوعات کی طباعت کا کام بھی ہورہا ہے، اسی مہینے میں تذکرۃ المحدثین حصہ دوم کا دوسرا ایڈیشن نکلا ہے مختصر تاریخ ہند کورس کی کتاب ہے حال ہی میں اس کا ایک اچھا اڈیشن چھپا ہے اس سے پہلے گمہاری بادشاہی شایع ہوئی تھی، اسلام و مستشرقین حصہ اول اور تاریخ دولت عثمانیہ عرصے ختم تھیں انکے نئے ایڈیشن بھی نکلے ہیں سیرۃ النبی حصہ سوم اور سیرۃ النعمان کی کمپوزنگ ہورہی ہے۔ کمپوزنگ یا کتابت کیلئے جو کتابیں دی جاتی ہیں انہیں بغور پڑھ کر غلطیوں کی تصحیح، چھوٹ جانے والے یا نامکمل حوالوں کی تخریج کے بعد ہی دیا جاتا ہے پروف اور کاپیوں کی دیدہ ریزی سے تصحیح کی جاتی ہے اور سیرت وغیرہ کے اشاریے اور انڈکس بھی تیار کیے جارہے ہیں، اسکی اور بجلی کے وقت بے وقت اور مسلسل آٹھ آٹھ دس دس گھنٹوں تک غائب رہنے کی وجہ سے اشاعتی مہم میں تاخیر ہورہی ہے اس وقت ارض القرآن، تاریخ اسلام، تاریخ فقہ اسلامی اور انقلاب الامم کی مراجعت کا کام ہورہا ہے اور تذکرۃ الفقہاء اور تذکرۂ مفسرین ہند کے دوسرے حصوں اور تذکرۃ المحدثین حصہ چہارم کی تالیف و ترتیب کا کام بھی جاری ہے۔

متحد: ہندوستان میں اس وقت کے ممتاز قومی لیڈروں میں مولانا ابوالکلام آزاد ہی وہ شخص تھے جو آخر آخر تک ملک کی تقسیم پر راضی نہیں ہوئے تھے مگر یہاں ایک خاص ذہن اور طرز فکر کے لوگ مولانا کو بالکل ہی فراموش کر دینا چاہتے ہیں، اسکے برعکس پاکستان میں جس کے وجود میں آنے سے قبل تک وہ اسکے شدید مخالف رہے مگر وجود میں آنے کے بعد وہ ہمیشہ اس کی ترقی و استحکام کے آرزومند رہے انکے دو بڑے عقیدتمند اور عظمت شناس مولانا غلام رسول مہر اور شورش کاشمیری برابر ان کی شرح و ترجمانی کرتے رہے اور اب انکی خالی مسند پر ڈاکٹر ابوسلمان شاہجہانپوری نے سنبھال لی ہے اور اس وقت وہ مولانا کے سب سے بڑے محقق و ترجمان سمجھے جاتے ہیں،

مولانا ابوالکلام کے یہ پاکستانی محقق و ترجمان ان پر کتب کثیرہ شایع کرچکے ہیں لیکن وہ اس پر مطمئن نہیں ہیں، نئی کتابوں کی ترتیب و تسوید کے ساتھ ہی مولانا سے متعلق پرانی کتابوں کے نئے ایڈیشن اضافہ و تحشیہ کے ساتھ شایع کرنا ان کی زندگی کا محبوب مشغلہ ہوگیا ہے، پاکستان و ہندوستان کی آزادی کے پچاس سالہ جشن کی مناسبت سے انہوں نے سات کتابیں شایع کی ہیں، ابھی ہم کو پانچ کتابیں ملی ہیں جن میں یہ تین مولانا پر ہیں، انڈیا ونس فریڈم۔ مولانا ابوالکلام آزاد اور انکے چند بزرگ دوست اور عقیدتمند۔ کلیات آزاد دو اور کتابوں کا تعلق بھی تحریک آزادی کے دو قائدین سے ہے، مکاتیب مولانا عبیداللہ سندی اور مناقب شیخ الاسلام (مدنی) موخرالذکر کے علاوہ چاروں کتابیں ان ہی نے مرتب کی ہیں۔ انڈیا ونس فریڈم (اردو ترجمہ پروفیسر مجیب) میں فاضل مرتب کے محققانہ حواشی نے چار چاند لگا دیے ہیں۔ اس میں وہ ۳۰ صفحے بھی شامل ہیں جو ۳۰ برس کے لیے محفوظ کیے گئے تھے اور کئی اہم ضمیموں کے اضافے بھی ہیں۔ یہ علمی خدمت بجائے خود نہایت لایق تحسین ہے لیکن یہ کتابیں دونوں ملکوں میں خوشگوار تعلقات کی استواری کے جس جذبہ سے شایع کی گئی ہیں وہ بھی بڑا قابل قدر ہے۔ انکا پتہ ہے: ابوالکلام آزاد ریسرچ انسٹی ٹیوٹ، پاکستان، کراچی۔

آل انڈیا شیعہ کانفرنس کے صدر پرنس انجم قدر کی وفات ملک و ملت کا بڑا حادثہ ہے سنیوں سے بھی ان کے روابط تھے، وہ دونوں فرقوں میں اتحاد و مفاہمت کے بڑے حامی تھے اور مشترکہ ملی مسائل کے حل کے لیے سنیوں کے ساتھ ہر جد و جہد میں شریک رہتے تھے، مسلم پرسنل لا بورڈ، مسلم مجلس مشاورت اور بابری مسجد تحریک سے ان کا گہرا تعلق تھا، دوسرا حادثہ میجر علی حماد عباسی کی اچانک وفات ہے، وہ شبلی کالج میں انگریزی کے استاد اور آخر میں پرنسپل ہوئے، پڑھنے لکھنے کا اچھا ذوق تھا اور مشرقی و مغربی ادب پر خاصی نظر تھی، وقتاً فوقتاً طنزیہ و مزاحیہ اور ادبی و تنقیدی مضامین لکھتے تھے جن کے بعض مجموعے چھپ گئے ہیں، طالب علمی کے زمانے ہی سے دارالمصنفین برابر آتے تھے جس کا سلسلہ آخر تک قایم رہا۔ پروفیسر محب الحسن کی کتاب کشمیر انڈر سلاطین کا اردو ترجمہ "کشمیر سلاطین کے عہد میں" کے نام سے کیا جو دارالمصنفین

مقالات

دنیائے نباتات میں خدائی نظارے

از

مولانا محمد شہاب الدین ندوی۔ بنگلور

برگ درختانِ سبز در نظر ہوشیار ہر ورقے دفتر یست معرفتِ کردگار

شیخ سعدیؒ کا یہ شعر حقایق کی ایک دنیا اپنے دامن میں سمیٹے ہوئے ہے جو عالم نباتات سے تعلق رکھتے ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ خدا پرستانہ نقطۂ نظر سے نباتاتی مظاہر کی اس سے بہتر تعریف نہیں ہو سکتی۔ امام غزالیؒ نے جدید سائنس کی ترقی سے صدیوں پہلے کہہ دیا تھا کہ حیوانات و نباتات میں صرف ایک فرق ہے اور وہ یہ ہے کہ حیوانات" چلتے پھرتے پودے ہیں" جب کہ نباتات زمین میں " گڑے ہوئے حیوانات" ہیں جو منھ کے بل دھنسے ہوئے ہیں۔ باقی سارے کام دونوں میں یکساں طور پر انجام پا رہے ہیں۔ چنانچہ نباتات بھی حیوانات ہی کی طرح غذا کے محتاج ہیں۔ لہذا وہ اپنی جڑیں زمین کے اندر گاڑ کر پانی اور غذا چوستے ہیں، جو ڈالیوں سے ہوتی ہوئی پتیوں تک پہونچتی ہے۔ اس اعتبار سے نباتات کی جڑوں کی مثال ان کے منھ جیسی ہے۔ جس طرح کہ حیوانات اپنی ماؤں کی چھاتیوں سے دودھ چوستے ہیں بالکل اسی طرح نباتات بھی زمین سے اپنی غذا چوستے ہیں۔ ۱ خلاصہ از الحکمۃ فی مخلوقات اللہ

جدید سائنس کی تصدیق | چنانچہ جدید سائنس نے تصدیق کر دی ہے کہ پانی اور دیگر نمکیات (جیسے کیلشیم، سوڈیم، پوٹاشیم، فاسفورس اور لوہا وغیرہ، جو پانی کے اندر گھلے رہتے ہیں)

جڑوں اور ڈالیوں سے ہوتے ہوئے پتیوں تک جا پہنچتے ہیں اور پتیاں پانی اور زمینی نمکیات کی مدد سے مواد نشاستہ یعنی کاربوہائیڈریٹ تیار کرتی ہیں جو غذا اور پھلوں کا غالب جزو ہوتا ہے۔ نیز جدید تحقیقات کی رو سے ثابت ہو چکا ہے کہ نباتات بھی حیوانات ہی کی طرح سانس لیتے ہیں، احساس و ادراک رکھتے ہیں، کھاتے پیتے ہیں اور "شادی بیاہ" کر کے بچے پیدا کرتے ہیں۔ ان کے بچے وہ بیج یا پھل ہوتے ہیں جو انجام کار ان سے برآمد ہوتے ہیں اور پھر یہی بیج دوبارہ نشو و نما پا کر اپنی ہی جیسی نسل کو وجود میں لاتے ہیں اور یہ چکر اسی طرح چلتا رہتا ہے۔

ایک عام آدمی روزانہ پیڑ پودوں سے حاصل کی ہوئی غذا کھاتا ہے، انواع و اقسام کی ترکاریاں اور قسم قسم کے پھل استعمال کرتا ہے، مگر وہ کبھی غور نہیں کرتا کہ یہ ساری چیزیں کارخانۂ قدرت میں کس حیرت انگیز طریقے سے وجود میں آرہی ہیں اور ان کو ظہور میں لانے کے لیے زمین اور آسمان کی تمام قوتوں کو مل کر کس طرح کام کرنا پڑتا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ نباتاتی دنیا کے مطالعہ سے اتنے سارے حقایق و اسرار سامنے آتے ہیں جو انسان کی فکر و نظر کو صیقل کرنے اور اسے درس عبرت دینے والے ہیں۔ حیوانی اور انسانی زندگی کا سارا دارومدار نباتات پر ہے اور حیوانات و نباتات کے باہمی تبادلے سے باعث فضا میں آکسیجن اور زمین میں نائٹروجن کا تناسب قائم ہے۔ اگر اس تناسب میں ذرا سا بھی بگاڑ آجائے تو سارا نظام عالم درہم برہم ہو جائے گا اور انسانی وجود خطرے میں پڑ جائے گا۔

اللہ ہر چیز کا خالق و نگران اللہ تعالیٰ اس کارگاہ عالم کا رب اور کارساز ہے۔ لہذا اس نے اس عالم رنگ و بو کی ہر چیز حد درجہ حکمت اور منصوبہ بندی کے ساتھ

پیدا کی ہے، جس میں کسی قسم کا نقص یا عیب نہیں ہے۔ اس کی ربوبیت و کارسازی سارے جہاں کا احاطہ کیے ہوئے ہے۔ وہ جس طرح عالم جمادات و سماوات کا رب ہے اسی طرح وہ عالم حیوانات و نباتات کا بھی رب ہے۔ وہ مظاہر عالم کی صرف تخلیق ہی نہیں کرتا بلکہ ان کے طبیعی ضوابط بھی مقرر کرکے ان کی نگرانی اور دیکھ بھال کرتا ہے جیساکہ حسب ذیل آیات کریمہ سے ظاہر ہوتا ہے:

خَلَقَ كُلَّ شَيْءٍ فَقَدَّرَهُ تَقْدِيرًا	اس نے ہر چیز کو پیدا کیا اور اس کا
(فرقان: ۲)	ایک (طبیعی) ضابطہ مقرر کیا۔
اَللّٰهُ خَالِقُ كُلِّ شَيْءٍ وَّهُوَ عَلٰى	اللہ ہر چیز کا پیدا کرنے والا اور ہر چیز کا
كُلِّ شَيْءٍ وَّكِيْلٌ (زمر: ۶۲)	نگہبان ہے۔

اللہ تعالیٰ کی ربوبیت و نگرانی ایک لمحے کے لیے بھی اگر اپنی مخلوقات سے ہٹ جائے تو پھر یہ سارا نظام آن کی آن میں منتشر و پراگندہ ہو سکتا ہے۔ لہذا وہ اپنی مخلوقات اور ان کی دیکھ بھال سے کبھی غافل نہیں رہتا۔

ربوبیت کی ہمہ گیری غرض اللہ تعالیٰ اپنی ربوبیت کے ذریعہ سارے جہاں پر حکمرانی کر رہا ہے اور اس کی ربوبیت و کارسازی اتنی ہمہ گیر ہے کہ اس جہان آب و خاک کی کوئی بھی مادری شئے مطلق و آزاد نہیں ہے بلکہ ہر ایک مظہر فطرت طبیعی ضوابط کی زنجیروں میں جکڑا ہوا اپنے خالق و کارساز کے اشاروں پر سرگرم عمل ہے اور اس کے حکم سے ذرا بھی سرتابی نہیں کر سکتا۔ اسی بنا پر یہ ارشاد ہے:

كُلٌّ لَّهُ قَانِتُوْنَ (بقرہ: ۱۱۶)	ہر ایک (مظہر فطرت) اس کی بارگاہ میں
	جھکا ہوا ہے۔

یعنی طبیعی اعتبار سے اس کا مطیع و فرمانبردار ہے، اسی بنا پر وہ سارے جہان اور تمام مظاہر کائنات کا رب قرار پاتا ہے۔ چنانچہ قرآن مجید کی پہلی سورت کی پہلی ہی آیت میں اس حقیقت کی راہ نمائی اس طرح کی گئی ہے:

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ	تعریف کا مستحق اللہ ہے جو تمام عالموں کا
(فاتحہ: ۱)	رب ہے۔

اور رب کے مفہوم میں اشیائے عالم کی تخلیق و تربیت اور نگرانی و کارسازی کا وسیع مفہوم پایا جاتا ہے، جس کی تعبیر "ربوبیت" کے مفہوم سے کی جاتی ہے اور حسب ذیل آیت کریمہ کے مطابق اپنی مخلوقات پر حکم چلانا بھی ربوبیت میں شامل ہے:

اَلَا لَہُ الْخَلْقُ وَالْاَمْرُ تَبٰرَکَ	ہاں تو جان لو کہ پیدا کرنا اور حکم چلانا
اللّٰہُ رَبُّ الْعٰلَمِیْنَ۔	اسی کا کام ہے۔ بڑا ہی بابرکت ہے
(اعراف: ۵۴)	وہ جو سارے جہاں کا رب ہے۔

ایک خلاق و کارساز ہستی اس اعتبار سے نباتات (پیڑ پودوں) کا خالق و مربی، ان کا ضابطہ ساز اور ان کی نگرانی و دیکھ بھال کرنے والا اللہ تعالیٰ ہے جو اپنی ربوبیت کے اظہار کی غرض سے طبیعیات کی دنیا میں فوق الطبیعی کرشمے دکھا رہا ہے اور ان ضوابط کے ملاحظہ سے انسانی عقلیں چکرا جاتی ہیں، لہذا لامحالہ طور پر ایک فوق الفطرت ہستی کا وجود تسلیم کیے بغیر چارہ نہیں رہ جاتا۔ چنانچہ اس عالم رنگ و بو میں ہر سو اس کی صناعیوں اور گلکاریوں کے نظر افروز جلوے بکھرے ہوئے ہیں جو واقعتاً "معجزاتِ ربوبیت" میں شمار کیے جا سکتے ہیں۔ غرض اس موقع پر دنیائے نباتات سے متعلق چند ایسے حقائق پیش کرنا مقصود ہے جن کو جدید سائنس نے دریافت تو کر لیا ہے مگر مادہ پرستانہ نقطۂ نظر

وہ ان کی توجیہ و تعلیل سے قاصر ہے۔ لہذا یہ معمے صرف اسی صورت میں حل ہو سکتے ہیں جبکہ ان تحیر خیز مظاہر کے ظہور کے لیے ایک خلاق و کارساز ہستی کا وجود تسلیم کر لیا جائے۔

پتیوں کا حیرت ناک عمل چنانچہ ہم سب سے پہلے پتیوں کے عمل کا مظاہرہ کریں گے جو عالم نباتات کا ایک بنیادی اور مشترک عمل ہے۔ جدید سائنس نے خوردبین کی مدد سے بڑی باریک بینی کے ساتھ تجربہ و مشاہدہ کرکے ثابت کر دیا ہے کہ پتیوں میں ایسے ذرات پائے جاتے ہیں جن میں ہرے رنگ کا ایک مادہ ہوتا ہے جسے کلوروفل کہتے ہیں اور انھی ہرے رنگ کے ذرات کی بنا پر پتیاں ہری دکھائی دیتی ہیں۔ نیز انھی پتیوں میں بے شمار ننھے ننھے سوراخ بھی ہوتے ہیں جن کے ذریعہ فضا میں پائی جانے والی کاربن ڈائی آکسائیڈ اندر جاتی اور آکسیجن باہر آتی ہے، کیا آپ کو معلوم ہے کہ اس عمل میں ہوتا کیا ہے؟ ہوتا یہ ہے کہ پتیوں کے اندر پائے جانے والے یہ ہرے رنگ کے ذرات ایک عجیب و غریب کرتب دکھاتے ہیں، چنانچہ وہ جڑوں اور ڈالیوں کی مدد سے حاصل کردہ پانی میں کاربن ڈائی آکسائیڈ کو سورج کی روشنی کی مدد سے گھول کر ایک میٹھا سا رس دار مادہ تیار کر دیتے ہیں جسے مواد نشاستہ (کاربوہائیڈریٹ) کہا جاتا ہے۔ واضح رہے کاربن ڈائی آکسائیڈ ایک ناکارہ اور بے ذائقہ چیز ہے اور اس کی زیادتی انسان اور حیوان کے لیے ہلاکت کا باعث ہوتی ہے۔ مگر اسی بے کار اور مضر چیز سے ایک خوش ذائقہ مادہ تیار کر دینا ربوبیت کا ایک انوکھا کارنامہ ہے، جس کی صحیح حقیقت تک سمجھنے سے سائنس داں عاجز ہیں۔ چنانچہ ایک ماہر سائنس اس سلسلے میں صاف صاف اعتراف کرتا ہے کہ انسان پتیوں کے اس اندرونی عمل کی حقیقت سے ناواقف ہے۔

Unfortunately , we do not understand the

machanism of this process . (Coll Physiology and Biochemistry , P . 111)

غرض ہر درخت کی ہر پتی اپنی جگہ پر ایک مکمل فیکٹری کی طرح کام کرتی ہے اور مشترکہ عمل کے ذریعہ بہت سی پتیاں مل کر پھول اور پھل تیار کرتی ہیں۔ واضح رہے ہماری غذا ترکاریوں اور پھلوں وغیرہ کا اکثر و بیشتر حصہ مواد نشاسئیہ پر مشتمل ہوتا ہے اور دنیا بھر میں پائے جانے والے لاکھوں قسم کے نباتات میں یہ عمل یکساں طور پر پایا جاتا ہے جو انسانی دانش کو ورطۂ حیرت میں مبتلا کرنے والا ہے۔

ذٰلِكُمُ اللّٰهُ رَبُّكُمْ ج لَآ اِلٰهَ اِلَّا	یہی ہے اللہ تمہارا رب، اس کے سوا
هُوَ ج خَالِقُ كُلِّ شَيْءٍ فَاعْبُدُوْهُ	دوسرا کوئی معبود نہیں ہے۔ وہ ہر
وَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ وَّكِيْلٌ۔	چیز کا پیدا کرنے والا ہے۔ لہذا تم
(انعام: ۱۰۲)	اسی کی عبادت کرو۔ وہ ہر چیز کا نگراں ہے۔

آکسیجن کا تبادلہ و تناسب نیز پتیوں کا ایک دوسرا عمل بھی ہے جو اس سے بھی زیادہ حیرتناک ہے، چنانچہ ہرے رنگ کے تمام پیڑ پودے مذکورۂ بالا عمل کے ذریعہ فضا سے کاربن ڈائی آکسائیڈ حاصل کرکے ایک تو مواد نشاسئیہ تیار کرتے ہیں اور دوم آکسیجن کو فضا میں خارج کردیتے ہیں۔ اگر پودے آکسیجن خارج نہ کرتے تو آپ جانتے ہیں کہ اس کا نتیجہ کیا ہوتا؟ اس کا نتیجہ یہ ہوتا کہ فضا میں پائی جانے والی تمام آکسیجن بتدریج ختم ہوجاتی اور پھر حیوانی و انسانی زندگیاں خطرے میں پڑ جاتیں۔ کیونکہ نباتات کے برعکس تمام حیوانات سانس کے ذریعہ آکسیجن لے کر کاربن ڈائی آکسائیڈ خارج کرتے ہیں اور اس دوطرفہ عمل کے باعث فضا میں توازن قائم ہے۔ غور فرمایئے خلاق ازل کی یہ کتنی بڑی رحمت و مہربانی ہے کہ

چیز ہمارے لیے غیر ضروری تھی اسے نباتات کی غذا بنادی اور جو چیز نباتات کے لیے غیر ضروری تھی سے حیوانات کی بقا کا ذریعہ بنادیا چنانچہ یہ اللہ تعالیٰ کی ربوبیت اور اس کی میزانِ عدل کا یک واضح نشان ہے۔

وَالسَّمَاءَ رَفَعَهَا وَوَضَعَ الْمِيزَانَ	اور اس نے آسمان کو بلند کر کے اس میں
أَلَّا تَطْغَوْا فِي الْمِيزَانِ۔	میزان رکھ دی ہے۔ اور (تمام مظاہر فطرت
(رحمٰن: ۷-۸)	کو حکم ہے کہ) تم اس میزان سے تجاوز کیمہ و۔

ایک سائنس داں نے حساب لگا کر بتایا ہے کہ ایک سال میں سبز پودے مذکورۂ بالا عمل کے ذریعہ ایک لاکھ پچاس ہزار ملین ٹن کاربن استعمال کر کے تقریباً چار لاکھ ملین ٹن آکسیجن خارج کرتے ہیں۔ (اسیموس گائیڈ ٹو سائنس، ۲/۱۱۵)۔

اسی لیے ارشاد باری ہے:

صُنْعَ اللّٰهِ الَّذِي أَتْقَنَ	یہ اللہ کی کاریگری ہے جس نے ہر چیز کو
كُلَّ شَيْءٍ۔ (نمل: ۸۸)	استحکام بخشا ہے۔

وجودِ خداوندی کی ایک حیرتناک دلیل پتیوں کے مذکورۂ بالا فعل میں ایک تیسری حقیقت ملاحظہ ہو جو حیرتناک ہی نہیں بلکہ عبرتناک بھی ہے، جس کے مشاہدہ سے مادیت کی چولیں ہل جاتی ہیں اور چاروناچار ایک کرشمہ ساز ہستی کا وجود تسلیم کرنا پڑتا ہے۔ چنانچہ کیا آپ جانتے ہیں کہ آکسیجن اور کاربن ڈائی آکسائیڈ کیا ہے، جسے اندر باہر کر کے پودے اپنی جادوگری دکھاتے ہیں؟ کاربن ڈائی آکسائیڈ (CO_2) کا مطلب ہے ایک ایسا سالمہ (مالیکیول) جس میں کاربن کا ایک اور آکسیجن کے دو جواہر (ایٹم) ہوتے ہیں۔ اب سبز ذرات جو کچھ کرتے ہیں وہ یہ ہے کہ کاربن کو تو وہ اپنی غذا کے طور پر خود رکھ لیتے ہیں، مگر

آکسیجن کے سالمے (O_2) کو واپس کر دیتے ہیں اور تمام پودوں اور درختوں میں (جو لاکھوں کی تعداد میں ہیں) یہی مشترکہ عمل ہو رہا ہے، جس میں کبھی کسی قسم کا فرق نہیں ہوتا۔ سائنسی نقطۂ نظر سے یہ ایک مبہوت و ششدر کر دینے والا عمل ہے جو تمام نباتات میں یکساں طور پہ ہو رہا ہے قسم ہا قسم کے پودے دن رات مصروف رہ کر مواد نشاستہ دھڑا دھڑ تیار کر رہے ہیں اور پھر لطف کی بات یہ ہے کہ ہر نوع کی خاصیت مختلف ہونے کے باوجود پورے عالم نباتات میں مواد نشاستہ کا کیمیائی فارمولا مشترک ہے۔ یعنی مواد نشاستہ کا ایک سالمہ کاربن، ہائیڈروجن اور آکسیجن کے بالترتیب ۶، ۱۲ اور ۶ جواہر سے مرکب ہوتا ہے، جس میں کبھی تفاوت نہیں ہوتا۔ گویا کہ ان کے اندر کوئی انجینئر بیٹھا ہوا ہے جو ایٹموں کو گن گن کر ڈال رہا ہے اور گویا کہ انواع و اقسام کے یہ تمام درخت اور پودے کسی ایک ہی کارخانے کے مزدور یا کارندے ہیں۔ بہر حال اگر ان کی تعداد یا ترتیب میں ذرا سا بھی فرق آجائے تو چیزیں کچھ سے کچھ ہو سکتی ہیں اور غذا زہر بھی بن سکتی ہے۔

چنانچہ دنیائے کیمیا کا ایک اور عجوبہ ملاحظہ ہو کہ کاربن ڈائی آکسائیڈ (CO_2) اور کاربن مونو آکسائیڈ (CO) میں صرف ایک جوہر کا فرق ہے۔ اول الذکر میں کاربن کا ایک اور آکسیجن کے دو جواہر ہوتے ہیں، جب کہ آخر الذکر میں کاربن کا ایک اور آکسیجن کا بھی ایک ہی جوہر ہوتا ہے۔ لیکن کیا آپ کو معلوم ہے کہ کاربن ڈائی آکسائیڈ کے برعکس کاربن مونو آکسائیڈ ایک انتہائی زہریلی گیس ہے؟ اب فرض کیجئے پیڑ پودے بجائے آکسیجن (O) خارج کرنے کے کاربن مونو آکسائیڈ (CO) خارج کرتے تو تمام حیوانات اس میں سانس لینے کی وجہ سے ہلاک ہو جاتے اور کوئی بھی متنفس زندہ نہ رہتا۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ نباتات پورے "شعور" کے ساتھ اپنا یہ فعل انجام دے رہے ہیں۔ تو اب سوال

ہے کہ نباتات میں اتنا شعور کہاں سے آیا کہ وہ ہمیشہ اس عمل کو بغیر کسی کوتاہی کے
ںاں طور پر دہرایا کریں؟ کیا ایک اندھا بہرا مادہ اس قدر شعور و تعقل کا مظاہرہ کر سکتا ہے؟
رہے کہ اس قسم کا کوئی بھی جواب ایک خدائے برتر کا وجود تسلیم کیے بغیر ممکن نہیں ہو سکتا۔
سب تماشائے ربوبیت ہیں۔

فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّکُمَا تُکَذِّبٰنِ (رحمٰن) — توتم اپنے رب کے کن کن کرشموں کو جھٹلاؤ گے۔

وں کے عمل میں خدائی کرشمے | آپ پھلوں اور میووں کا کیمیائی نقطۂ نظر سے تجزیہ کیجئے تو
ں میں مختلف قسم کے نمکیات (منرل سالٹس) بھی ملیں گے، جیسے کیلشیم، پوٹاشیم، فاسفورس
لوہا وغیرہ جو زمین کے اندر پانی میں گھلے ملے رہتے ہیں اور جب جڑیں زمین کا پانی چوس کر
لیوں کی مدد سے پتیوں تک پہونچاتی ہیں تو یہ نمکیات بھی غذا میں شامل ہو کر اس کا
ر بن جاتے ہیں اور یہ انسانی صحت کو برقرار رکھنے میں بہت اہم رول ادا کرتے ہیں
ن ہر پھل اور میوے میں ان کا تناسب مختلف ہوتا ہے مثلاً فاسفورس ہر سو گرام
ام میں ۵۰۴ ملی گرام، سیب میں ۱۰ ملی گرام، گاجر میں ۳۶، کاجو میں ۳۰۳، کافی میں
۳۸، ککڑی میں ۲۷، انگور میں ۱۲، زیتون میں ۱۷، اور مٹر میں ۲۶۸ ملی گرام
جاتا ہے۔ اسی طرح سوڈیم ہر سو گرام بادام میں ۴، سیب میں ۱، گاجر میں ۴۴، کاجو
۱۵، کافی میں ۲۷، ککڑی میں ۶، انگور میں ۳، زیتون میں ۳ ۸ ور مٹر میں ۰.۴ ملی گرام
تا ہے۔

لیکن تعجب ہے کہ ہر پودا ہر چیز ایک متعین مقدار ہی میں لیتا ہے اور اس میں کبھی
ئی غلطی نہیں کرتا۔ حالانکہ پانی میں ہر قسم کے نمکیات گھلے ملے رہتے ہیں اور سب کے سب
سے ہی خطۂ ارض میں سیراب کیے جاتے ہیں تو اب مادہ پرستانہ نقطۂ نظر سے قدرت کے

اس عجیب و غریب فعل کی توجیہ کسی بھی طرح نہیں ہوتی کہ آخر ہر نوع کا پودا صرف اپنی ہی آبائی خصوصیت کے مطابق بغیر کسی ادراک و احساس کے کس طرح یہ نمکیات گن گن کر حاصل کر رہا ہے ؟ تو کیا ان کی جڑوں میں کسی قسم کا میٹر لگا ہوا ہے ؟ ظاہر ہے کہ یہ پوری دنیائے سائنس کیلئے ایک چیلنج ہے کہ وہ اس معمہ کو حل کرے ۔ مگر وہ ایک عظیم ہستی کا وجود تسلیم کیے بغیر اس منظر قدرت کی گرہ کشائی نہیں کر سکتی ۔

ذٰلِكُمُ اللّٰهُ رَبُّكُمْ لَهُ الْمُلْكُ	یہی ہے اللہ تمہارا رب، سارا اقتدار
لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ج فَاَنّٰى تُصْرَفُوْنَ	اسی کے پاس ہے، اس کے سوا دوسرا
(زمر : ۶)	کوئی معبود نہیں، تو تم کدھر بہکے جا رہے ہو؟

واقعہ یہ ہے کہ سائنس ہمیں مظاہر عالم کا صرف ایک تصوراتی ڈھانچہ ہی دے سکتی ہے، حقیقت حال سے آگاہ نہیں کر سکتی ۔ جیسا کہ تاریخ سائنس کا مصنف ڈامپیر اس حقیقت کا اعتراف اس طرح کرتا ہے :

Science gives only a conceptual model of Phenomena and enables us only to trace a routine sensations.(A History of Science . P 472)

رنگوں کے اختلاف میں دلیل ربوبیت | عالم نباتات میں چار لاکھ سے زیادہ پیڑ پودے پائے جاتے ہیں، جن میں سے بعض غذا کے کام آتے ہیں تو بعض ترکاریوں کے طور پر استعمال کیے جاتے ہیں۔ بعض روغنیات کی حیثیت سے مستعمل ہوتے ہیں تو کچھ مصالحہ جات کے طور پر ۔ چند شیریں و خوش ذائقہ پھلوں کی شکل میں کام و دہن کو لذت آشنا کرتے ہیں تو کچھ دواؤں کے طور پر کام آتے ہیں۔ بعض مویشیوں کے لیے چارہ فراہم کرتے ہیں

تو بعض دیگر بہت سی تمدنی ضروریات پوری کرتے ہیں۔ غرض انواع و اقسام کے پیڑ پودے اپنی مختلف طبیعی خصوصیات کی بنا پر انسانی و حیوانی ضروریات کو اس طرح پورا کرتے ہیں کہ ہمیں اس کارخانۂ ربوبیت میں کسی قسم کی کمی محسوس نہیں ہوتی، مگر اس سلسلے میں ربوبیت کا کمال یہ ہے کہ گوناگوں خصوصیات کے حامل قسم باقسم کے یہ درخت اور پودے ایک ہی پانی سے سیراب، ایک ہی مٹی اور ایک ہی خطۂ ارض میں اگتے اور ایک ہی سورج سے توانائی حاصل کرتے ہیں۔ مگر اس کے باوجود ان کے رنگ و روپ مختلف، سراپا جدا جدا، شکل و صورت الگ الگ اور خواص و تاثیرات ایک دوسرے سے بالکل ممتاز ہوتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ اگر یہاں پر ربوبیت و خلاقیت کارفرما نہ ہوتی تو پھر یہ اختلافِ رنگ و لون، اختلافِ لذت و ذائقہ اور اختلافِ خصائص ممکن نہ ہوتا۔ اسی بنا پر اختلافِ الوان اور اختلافِ خواص و تاثیرات کو دلیل ربوبیت قرار دیا گیا ہے۔ جیسا کہ ارشادِ باری ہے:

اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰہَ اَنْزَلَ مِنَ السَّمَاءِ مَاءً ج فَاَخْرَجْنَا بِہٖ ثَمَرَاتٍ مُّخْتَلِفًا اَلْوَانُہَا۔	اے مخاطب کیا تو نے مشاہدہ نہیں کیا کہ اللہ نے آسمان سے پانی برسایا پھر ہم نے اس پانی کے ذریعہ رنگ برنگے
(فاطر: ۲۷)	پھل نکال دیے۔

چنانچہ بعض دیگر مقامات میں صراحت موجود ہے کہ عالم نباتات کی ان رنگا رنگیوں اور ان میں ودیعت شدہ حیرت انگیز خواص میں غور و فکر کرنے والوں کے لیے اللہ تعالیٰ کی قدرت و خلاقیت کی نشانیاں ودیعت کر دی گئی ہیں جو مخلوق پر درس کے طور پر ہیں:

وَمَا ذَرَاَ لَکُمْ فِی الْاَرْضِ مُخْتَلِفًا	اور اس نے تمہارے لیے زمین میں

اَلْوَانُہٗ ؕ اِنَّ فِیْ ذٰلِکَ لَاٰیَۃً لِّقَوْمٍ یَّذَّکَّرُوْنَ۔ (نحل: ۱۳)

جو رنگ برنگی چیزیں پھیلا رکھی ہیں ان میں سوچنے والوں کے لیے ایک بڑی نشانی موجود ہے۔

وَ فِی الْاَرْضِ قِطَعٌ مُّتَجٰوِرٰتٌ وَّجَنّٰتٌ مِّنْ اَعْنَابٍ وَّزَرْعٌ وَّنَخِیْلٌ صِنْوَانٌ وَّغَیْرُ صِنْوَانٍ یُّسْقٰی بِمَآءٍ وَّاحِدٍ وَنُفَضِّلُ بَعْضَہَا عَلٰی بَعْضٍ فِی الْاُکُلِ ؕ اِنَّ فِیْ ذٰلِکَ لَاٰیٰتٍ لِّقَوْمٍ یَّعْقِلُوْنَ (رعد: ۴)

اور زمین میں ایسے خطے بھی ہیں جو ایک دوسرے سے ملے ہوئے ہیں اور انگور کے باغ، کھیتیاں اور کھجور کے شاخ دار درخت ہیں، جو (سب کے سب) ایک ہی پانی سے سیراب کیے جاتے ہیں لیکن ہم ذائقہ میں ایک پھل کو دوسرے سے برتر رکھتے ہیں۔ اس باب میں عقلمندوں کے لیے بڑی نشانیاں موجود ہیں۔

اختلاف خواص میں وجود باری کا نظارہ چنانچہ طبی نقطۂ نظر سے ان انواع و اقسام کے پھلوں میووں، غذائی، جناس، ترکاریوں، مختلف قسم کے مصالحہ جات اور جڑی بوٹیوں کا جائزہ لیا جائے تو ایسے بے شمار حقائق ہمارے سامنے آتے ہیں جو صانع عالم کی حکمت تخلیق اور اس کی حیرت انگیز ربوبیت ظاہر کرتے ہیں۔ چنانچہ روئے زمین پر پائے جانے والے ہزاروں لاکھوں درختوں کے خواص مختلف ہوتے ہیں۔ ہر ایک کا ذائقہ دوسرے سے مختلف اور اس کی تاثیر جدا ہوتی ہے۔ اسی طرح ہر ایک کا چہرہ مہرہ اور رنگ روپ الگ الگ اور بوباس جداجدا ہوتی ہے۔ حالانکہ یہ سب ایک ہی پانی سے سیراب، ایک ہی زمین اور ایک ہی ہوا میں اگتے بڑھتے ہیں تو پھر ان گھاس، رنگ رنگ اور

اختلاف خواص کی توجیہ ایک برتر ہستی کا وجود تسلیم کیے بغیر کس طرح ہوسکتی ہے؟ ہر پیڑ پودا ایک لگے بندھے اصول کے تحت ہزاروں سال سے اپنی نوعی خصوصیات آخر کس طرح دہرائے چلا جارہا ہے جس میں ایک سرمو بھی فرق نہ آتا ہو؟ چنانچہ آپ ایک قطعۂ ارض میں پچاس قسم کے پودے بودیجیے، ہر ایک اپنے اپنے نیچر اور طبیعت کے مطابق برآمد ہوگا اور دوسرے کا اثر کبھی قبول نہیں کرے گا۔ مثال کے طور پر آم امرود کے اثرات کبھی قبول نہیں کرے گا اور امرود انار کے درخت سے ہرگز متاثر نہ ہوگا۔ سنترہ سیتا پھل کا رنگ کبھی نہیں اختیار نہیں کرے گا۔ اسی طرح پپیتا ناریل یا ناریل پپیتا کبھی نہیں بن سکے گا۔ وقس علیٰ ذٰلک ۔

اسی طرح کوئی پھل اپنے مزاج کے اعتبار سے گرم و تر ہوتا ہے جیسے: انجیر، بادام، پستہ، کھجور اور کاجو، تو کوئی گرم و خشک ہوتا ہے جیسے اخروٹ، انگور اور مونگ پھلی۔ اس کے برعکس کوئی پھل سرد و تر ہوتا ہے جیسے امرود، انار، انناس، سنترہ، تربوز، ککڑی اور لیموں، تو کوئی سرد و خشک ہوتا ہے جیسے آم اور جامن۔

غرض یہ وہ عجائبات قدرت ہیں جن کی بنا پر ایک حیرت انگیز افعال والی ہستی کا وجود تسلیم کرنا پڑتا ہے۔ اسی بنا پر فرمایا گیا ہے:

اَللّٰہُ خَالِقُ کُلِّ شَیْءٍ وَ ھُوَ	اللہ ہر چیز کا پیدا کرنے والا اور ہر
عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ وَّکِیْلٌ ۔ (زمر: ۶۲)	چیز کا نگراں ہے۔

نیز اسی طرح ہر غلے، پھل اور میوے کے فوائد جدا جدا رکھے گئے ہیں۔ کوئی ایک بیماری کے لیے مفید ہے تو کوئی دوسری بیماری کے لیے تریاق کا حکم رکھتا ہے۔ چنانچہ جتنی بھی انسانی اور حیوانی بیماریاں ہیں ان سب کا علاج پودوں ہی کے ذریعہ ہوتا ہے چاہے

طب قدیم ہو یا طب جدید۔ مثال کے طور پر پنسلن جیسا قیمتی انجکشن کائی جیسی ایک معمولی چیز سے بنتا ہے جو تالابوں اور سمندروں میں اُگتی ہے اور اس اعتبار سے کارخانۂ ربوبیت میں کوئی بھی چیز بیکار اور بلا وجہ نہیں ہے۔

رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هٰذَا بَاطِلًا (آل عمران : ۱۹۱) — اے ہمارے رب یہ سب کچھ تو نے بیکار نہیں پیدا کیا ہے۔

قرآن کی جامعیت کا ایک حیران کن نمونہ قرآنِ حکیم کا اصلی اعجاز یہ ہے کہ وہ نہایت درجہ مختصر الفاظ میں ایسے جامع اصول بیان کر دیتا ہے جو مختلف علوم و ابواب کے عناوین کی حیثیت رکھتے ہیں اور ان کی شرح و تفصیل میں متعلقہ علوم کے دفتروں کو کھنگالنا پڑتا ہے چنانچہ حسب ذیل آیتِ کریمہ ایک ایسے ہی جامع ترین کلیہ پر مشتمل ہے جس کی شرح میں پوری نباتاتی سائنس (باٹنی) کو پیش کیا جا سکتا ہے۔ گویا کہ اس میں نباتاتی سیرتوں کی پوری روح یا ان کی تصویر کھینچ کر رکھ دی گئی ہے اور یہ جامع اصول دنیائے نباتات کے لیے طبعی و کیمیائی حیثیت سے ایک شاہ کلید کی حیثیت رکھتا ہے یعنی اس پیمانے کے ذریعہ تمام نباتاتی مظاہر کو طبعی و کیمیائی اعتبار سے ناپا اور تولا جا سکتا ہے اور یہ کلیہ ہر حیثیت سے عالمِ نباتات پر صادق آئے گا۔ چنانچہ ارشادِ باری ہے:

وَاَنْبَتْنَا فِيْهَا مِنْ كُلِّ شَيْءٍ مَّوْزُوْنٍ (حجر : ۱۹) — اور ہم نے زمین میں ہر چیز وزن کی ہوئی پیدا کی ہے۔

اس موقع پر "شَيْءٍ مَّوْزُوْنٍ" کے الفاظ حد درجہ بلیغ اور معنی خیز ہیں اور ما کا مفہوم ہے: "ایک معین مقدار" یا "نپی تلی چیز"۔ اس آیتِ کریمہ کا ایک محدود مفہوم ہے اور ایک وسیع مفہوم اور ان دونوں اعتبارات سے اس موقع پر مختصر بحث کی جاتی ہے کیونکہ

تفصیل بحث کے لیے ضخیم جلدیں درکار ہوں گی اور پھر بھی تشنگی باقی رہے گی۔

بہر حال اس کا محدود مفہوم یہ ہے کہ اس کلیہ کو غذا اور پھلوں پر محمول کیا جائے چنانچہ غذا میں چند بنیادی مادے ہوتے ہیں جن کو سائنس کی اصطلاح میں مواد لحمیہ (پروٹینز) مواد نشائیہ (کاربوہائیڈریٹس) مواد شحمیہ (فیٹس) معدنی نمکیات (منرل سالٹس) اور حیاتین (وٹامنز) کہتے ہیں اور یہ مادے مختلف اشیاء میں مختلف تناسب کے ساتھ مرکب ہوتے ہیں، جن کی کمی بیشی کی وجہ سے ان کی خصوصیات بدل جاتی ہیں۔ گویا کہ ان میں یہ مادے تول تول کر اور ناپ ناپ کر ڈالی جارہی ہیں اور ان کی یہ خصوصیات ہمیشہ برقرار رہتی ہیں۔ چنانچہ حسب ذیل چند منتخب اشیاء کا ایک غذائی چارٹ ملاحظہ ہو جس کے ذریعہ ربوبیت کی کاریگری کا پتہ چلے گا۔

	مواد لحمیہ	مواد نشائیہ	مواد شحمیہ
گیہوں	۱۱٫۸ فیصد	۷۱٫۲ فیصد	۱٫۵ فیصد
چاول	۷٫۵ 〃	۷۸٫۷ 〃	۰٫۰۱ 〃
مٹر	۱۹٫۷ 〃	۵۶٫۶ 〃	۰٫۰۷ 〃
مونگ	۲۴٫۹ 〃	۶۰٫۱ 〃	۳٫۲ 〃
گاجر	۰٫۹ 〃	۱۰٫۷ 〃	۰٫۲ 〃
کھجور	۳ 〃	۶۷٫۳ 〃	۰٫۲ 〃
انگور	۰٫۸ 〃	۱۰٫۲ 〃	۰٫۱ 〃

معدنی نمکیات میں کیلشیم کا تناسب ملاحظہ ہو، ہر سو گرام خشک بادام میں وہ ۲۳۴ ملی گرام، سیب میں ۷، خوبانی میں ۳۱، گاجر میں ۳۸، کھجور میں ۵۹، زیتون میں ۸۴،

انار میں ۳، آم میں ۱۱۰ اور لیموں میں ۳۳ ملی گرام پایا جاتا ہے۔

اسی طرح پوٹاشیم ہر سو گرام بادام میں ۷۷۳، سیب میں ۱۱۰، کیلے میں ۳۷۰، کاجو میں ۴۶۴، کھجور میں ۶۴۸، انگور میں ۱۵۸، انجیر میں ۱۹۴، زیتون میں ۵۵، مٹر میں ۸۹۵، تربوز میں ۱۰۰، نارنگی میں ۲۰۰، انار میں ۲۵۹ اور لیموں میں ۱۰۲ ملی گرام کی مقدار میں پایا جاتا ہے (ایک ملی گرام ایک گرام کا ایک ہزارواں حصہ ہے۔

غرض تناسب کے انہی تمام اختلافات کی وجہ سے غلوں اور پھلوں کا ذائقہ اور انکے خواص بدل جاتے ہیں اور پھر ان غذائی مادوں کا "سالماتی" نقطۂ نظر سے مطالعہ کیا جائے تو اور زیادہ حیرت ہوتی ہے کہ مختلف عناصر و جواہر ان مادوں کو تشکیل دینے میں کتنی "سوجھ بوجھ" اور نظم و ضبط کا مظاہرہ کرتے ہیں اور یہ سب وسیع علوم ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ عناصر اور سالمات کی دنیا جادو کی نگری یا طلسم ہوش ربا سے کسی بھی طرح کم نہیں ہے ان تمام اعتبارات سے " شَيْءٍ مَوْزُوْنٍ" ایک ہمہ گیر اور صداقت سے بھرپور کلیہ ہے۔

نباتات کا نپا تلا انداز آیت کا وسیع مفہوم یہ ہے کہ یہ کلیہ نباتات کے تمام مظاہر پہ پوری طرح صادق آتا ہے، خواہ اس کا تعلق جڑوں اور تنوں سے ہو یا ڈالیوں اور پتیوں سے، غنچوں سے ہو یا پھولوں اور پھلوں سے۔ پیڑ پودوں سے تعلق رکھنے والی ہر چیز ایک خاص شکل و صورت اور ایک متعین مقدار کے ساتھ زمین سے نمودار ہوتی ہے۔ چنانچہ ہر پیڑ پودے کے چار اعضا ہوتے ہیں: جڑ، تنا، ڈالیاں اور پتیاں۔ پھر ایک مخصوص وقت میں ان میں پھول اور پھل ظاہر ہوتے ہیں۔ آپ کسی نوع کا ایک ننھا سا بیج مرطوب زمین میں دبا دیجئے تو اس کے برگ و بار اپنی مخصوص نوعیت کے مطابق نمودار ہوں گے۔ ڈالیاں اور شاخیں بالکل اسی انداز میں ظاہر ہوں گی جو اس کی نسلی خصوصیات کے

عین مطابق ہوگی۔ اس کی ہر پتی ایک ہی تراش خراش اور ایک ہی سائز کی ہوگی۔ گویا کہ کسی ماہر کاریگر نے انہیں چھیل چھیل کر اور تراش تراش کر بنایا ہے۔ آپ کسی ایک ہی نوع کے ہزاروں بیج بو دیجئے اس نوع کے ہزاروں درختوں میں کسی قسم کا فرق نہ ہوگا اور یہ یکسانیت ایک نامعلوم مدت دراز سے اسی طرح قائم ہے۔ ہر نوع کی جڑ، تنا، ڈالیاں، شاخیں، پتیاں، پھول اور پھل سب کے سب اپنی نوعی خصوصیات کے ساتھ اپنا وظیفۂ حیات انجام دے رہے ہیں۔ ان کے تناسب اور رکھ رکھاؤ میں کسی قسم کی بے قاعدگی نظر نہیں آرہی ہے۔ چنانچہ پتیوں ہی کو دیکھ لیجئے کسی درخت کی پتی لمبی ہوتی ہے تو کسی کی چوڑی، کوئی بہت بڑی ہوتی ہے تو کوئی ننھی منی، کوئی منقش ہوتی ہے تو کوئی سیدھی سادی، کوئی گول گول ہوتی ہے تو کوئی سُوئی جیسی۔ مثال کے طور پر آپ آم، انجیر، پپیتے، ناریل، نیم، پیپل، املی، کیلے، ببول اور سرو کی پتیوں کی بناوٹ اور ان کے اختلافات دیکھئے تو ہر ایک میں زمین و آسمان کا فرق نظر آئے گا۔ بعض درخت اور پودے ایسے بھی ہوتے ہیں کہ اگر ان کی تمام شاخیں اور ڈالیاں جڑ تک کاٹ دی جائیں تو پھر ان کے اندر سے ویسی ہی ڈالیاں، پتیاں اور پھل پھول برآمد ہوتے ہیں جو ان میں پہلے سے موجود تھے اور ان کی صورت و سیرت میں ایک سرمو بھی تفاوت نہیں ہوتا۔ حتیٰ کہ ان میں موجود کانٹے بھی دوبارہ اسی طرح اور انہی مقامات پر نکل آتے ہیں، جیسے گلاب کا پودا۔ اس اعتبار سے نباتات کے تمام اعضا ایک متعین شکل و صورت، نپی تلی مقدار اور منصوبہ بند تناسب کے ساتھ ظہور پذیر ہوتے ہیں اور انہیں ایک موزوں و متناسب قالب عطا کیا جاتا ہے، گویا کہ ہر چیز ناپ کر اور تول تول کر پیدا کی جارہی ہے۔ غرض ان تمام اعتبارات سے "شَيْءٍ مَوْزُوْنٍ" ایک حقیقت افروز کلیہ ہے اور اس کی ایک تعبیر یہ بھی ہے:

وَكُلُّ شَيْءٍ عِندَهُ بِمِقْدَارٍ۔ (رعد : ۸)
اس کے نزدیک ہر چیز ایک خاص مقدار کے ساتھ ہے۔

ایک ہمہ دان ہستی کا ثبوت | مذکورۂ بالا حقائق کے ملاحظہ سے ثابت ہوتا ہے کہ اس کلام برحق کا "مصنف" کوئی انسان نہیں بلکہ وہی ہستی ہے جس نے یہ رنگارنگ کائنات تخلیق کی ہے۔ اسی بنا پر اس نے اپنی تخلیقات کے تمام بنیادی اصول وضوابط اپنے کلام میں بذریعہ وحی درج کرا دیے ہیں، تاکہ علوم وفنون کی ترقی کے بعد انکی صداقت ظاہر ہو جائے۔ ظاہر ہے کہ علوم وفنون کی ترقی سے پہلے اس قسم کے اصول وضوابط وضع کرنا کسی انسان کا کام نہیں ہو سکتا۔ اس سے تین ابدی صداقتیں ثابت ہوتی ہیں :

۱۔ اس کائنات میں کوئی علیم وخبیر ہستی ضرور موجود ہے جو اس کائنات مادی کے تمام بھیدوں سے واقف ہے، یہی خدا ہے، چنانچہ قرآن مجید میں صراحت کی گئی ہے کہ اللہ چونکہ تمام اشیاء کا خالق ہے اسلیے وہ ہر چیز سے بخوبی واقف ہے :

وَخَلَقَ كُلَّ شَيْءٍ وَهُوَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيمٌ۔ (انعام : ۱۰۱)
اس نے ہر چیز کو پیدا کیا ہے اور وہ ہر چیز سے آگاہ ہے۔

ایک دوسرے موقع پر استفہامیہ انداز میں اس حقیقت پر اس طرح روشنی ڈالی گئی ہے :

أَلَمْ تَعْلَمْ أَنَّ اللَّهَ يَعْلَمُ مَا فِي السَّمَاءِ وَالْأَرْضِ (حج : ۷۰)
کیا تجھے معلوم نہیں کہ اللہ آسمان اور زمین کی تمام چیزوں کو جانتا ہے ؟

۲۔ قرآن مجید ایک سچا اور برحق کلام ہے جو حقائق ومعارف سے پُر ہے۔

۳۔ حضرت محمد مصطفے صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے سچے نبی تھے جن پر بذریعہ وحی یہ کلام نازل کیا گیا۔

بہرحال ربوبیت کے ان جلوؤں سے مادیت کا رد وابطال اور خدا پرستی کا بول بالا ہوتا ہے اگر یہ کائنات محض "بخت واتفاق" کا نتیجہ ہے تو پھر ان ابدی حقائق کی تاویل کیا ہوگی ؟ قُلْ هَاتُوا بُرْهَانَكُمْ إِن كُنتُمْ صَادِقِينَ (نمل ۶۴)

ورق تمام ہوا اور مدح باقی ہے
سفینہ چاہیے اس بحر بیکراں کے لیے

تمدن ہائے قدیم میں جرم و سزا

از

جناب نور احمد شاہتاز صاحب

(۲)

قدیم ہندی تمدن اور جرم زنا

جرم زنا میں ماخوذ افراد کے لیے جسمانی سزائیں نافذ تھیں گویا زنا کو جرم قابل عقوبت شدیدہ تصور کیا جاتا تھا، یوں بھی ہندوستان میں زنا کے علاوہ دیگر بعض جرائم میں قطع اعضاء کی سزائیں رائج تھیں ہاشم نے اس پر ان الفاظ میں روشنی ڈالی ہے وہ کہتے ہیں:

"قطع اعضاء اور جسمانی اذیتیں بہت سے جرائم کے لیے عام سزائیں تھیں اور قانون کے موضوع پر لکھنے والوں نے سزا کی متعدد دوسری شکلوں کا بھی ذکر کیا ہے ان سزاؤں کو ایک طرح کی عقوبت نفس تصور کیا جاتا تھا اور جرائم کی سزا پر غور کرتے وقت سمرتیوں کے لکھنے والوں کے ذہن سے مذہبی عقوبتِ نفس کا تصور کبھی بھی مکمل طور پر اوجھل نہیں رہا، عام طور پر یہ یقین تھا کہ اس کی زندگی سزا بھگت لینے کے بعد مجرم اپنے جرم کے سلسلہ میں دوسری دنیا کی شدید عقوبتوں سے محفوظ ہو جاتا ہے۔"[۱]

منو سمرتی میں زنا بالجبر کی سزا قطع عضو تناسل ہے لیکن چونکہ برہمنوں کو جسمانی سزا دینے کی ممانعت ہے اس لیے اسی میں سفارش کی گئی ہے کہ برہمنوں کو یہ سزا نہ دینی چاہیے[۲]

تاہم زنا کے مختلف طریقوں کے لحاظ سے سزا کی مختلف صورتیں مقرر کی گئی ہیں، منو نے

جنسی جارحیت کے مرتکب افراد کی سزا بغاوت اور غداری کے لیے سزائے موت بطرق مختلف تجویز کی ہے[۹۴]۔ یہی صورت حال ہندوؤں کے فیاض اور خیر پسند اشوک کے ہاں بھی ہے وہ باوجودیکہ سزائے موت کو سخت ناپسند کرتے ہیں، زنا کے معاملہ میں سزائے موت کو انہوں نے بھی ختم نہیں کیا[۹۵]۔

زنا بالجبر کی صورت میں اگرچہ منوسمرتی میں قطع تناسل کی سزا تجویز کی گئی ہے تاہم ہندوستانی معاشرہ میں ایسے زانی کو قتل کرنے کا نظام بھی رائج رہا ہے۔ ہاں البتہ اگر زنا شوئی کا عمل عورت کی رضامندی سے ہوا ہو تو اس صورت میں زانی اور زانیہ دونوں واجب القتل ٹھہرتے ہیں۔ زانی محصن کو قتل کرنے کی سزا تو قدیم ہندوستان میں کم و بیش ہر حکومت میں رائج رہی ہے[۹۶]۔ سزائے موت کے لیے زانی کو برسر عام لوہے کے تپتے ہوئے پلنگ پر لٹا کر جان سے مار دینے اور زانیہ کو جیتے جی کتوں سے پھڑوا دینے کا طریقہ بھی اختیار کیا جاتا تھا[۹۷]۔

قرون وسطیٰ میں ہندوستان میں جلاوطنی و جرمانہ، قید، قطع اعضاء جیسی سزائیں دی جاتی تھیں، تاہم برہمن سخت قسم کی سزاؤں سے محفوظ رہتے تھے۔ صیغۂ انصاف کے لیے الگ افسر ہوتا اور اس کے ماتحت مختلف مقامات اور صوبہ جات میں اہلکار ہوتے جو نظام جرم و سزا کے قائم کرنے کے لیے مقرر کیے جاتے تھے[۹۸]۔

البیرونی کہتا ہے کہ ہندوستان میں بدکار عورت کو خاوند کے گھر سے نکال کر ملک بدر کر دیا جاتا تھا[۹۹] اور شراب خوری پر سزا دی جاتی تھی، وہ کہتا ہے:

"عقوبۃ الزانیۃ ان تخرج من بیت الزوج وتنفی وکنت اسمع ان من یھرب من السمایک الھندیین عائدا الی بلادھم ودینھم یفرض علیہ ککفارۃ صیام و ینقع فی اخثاء البقر و ابوالھا و البانھا ایاما معدودات

حتی یختمر فیہا و یخرج من النجاستہ و یطعم ما یشبہ ما ھو فیہ وامثال ذلک ۔[۹]

۵۔ قدیم تمدن ایران اور جرائم کی سزائیں ایرانی تمدن کا آغاز نویں صدی قبل مسیح سے ہوتا ہے جب آریانسل میڈیا کے علاقوں میں آباد ہوئی۔ یہ لوگ ماد کہلائے ان کی حکومت کا پایہ تخت سوسہ تھا جو دریائے فرات کے مشرق اور خلیج فارس کے شمال میں واقع تھا۔ ۶۴۸ یا بعض مورخین کے بقول ۵۵۵ ق م میں اس حکومت کا خاتمہ ہوگیا۔ ان کا آخری بادشاہ آستیاکس (ASTY-AGES) تھا جس پر ہخامنشی خاندان کے خورس یا کورش اعظم نے فتح پائی۔[۱۰]

کوروش اعظم (۵۴۹ - ۵۲۹ ق م) عہد ہخامنشی کا موسس مانا جاتا ہے۔ جبکہ ۴۳۶ - ۳۲۳ ق م ہخامنشی عہد کے عروج کا زمانہ سمجھا جاتا ہے۔ اس عہد میں ایران ۲۴ سے ۳۰ صوبوں پر مشتمل تھا۔

اس زمانے میں بادشاہ، قوانین سلطنت امرائے سلطنت کے مشورے سے بناتا تھا۔ جرائم کی سزائیں بہت سخت تھیں۔ قتل، زنا اور بغاوت جیسے جرائم کی سزا موت تھی، دیگر سزاؤں میں کوڑے مارنا، زہر دینا، اندھا کرنا، قید کر دینا، داہنا ہاتھ پاؤں کاٹ دینا اور اسی قسم کی دوسری سزائیں شامل تھیں، کوڑوں کی سزاؤں میں ہر کوڑے کے بدلے چھ روپے ادا کرنے پر کمی ہوسکتی تھی۔[۱۱]

عدل وانصاف کے لیے مملکت میں اہل دیانت افراد کو دادور کے عہدہ پر فائز کیا جاتا تھا دادوروں سے اوپر دیوان عالی تھا جو بادشاہ یا اس کے کسی نائب کے ماتحت ہوتا تھا۔[۱۲]

قدیم تمدن ایران میں نظام جرم وسزا کیا تھا؟ تاریخی مصادر و مراجع اس سلسلہ میں ساسانی عہد[۱۳] تک تو شواہد مہیا کرتے ہیں تاہم اس سے ماقبل کے احوال کے بارے میں

ی اور قطعی طور پر کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ ایران کے معروف مورخ عبداللہ رازی ساسانی عہد
مت کے نظام جرم و سزا سے متعلق لکھتے ہیں :

"مرتکب جرم دو قسم مجازات داشتہ، مجازات دنیوی و مکافات اخروی۔
مجازات دنیوی عبارت بود از اعدام (مرگ ارزان) یا تازیانہ
(تعداد ضربت بر حسب نوع جرم یا خلاف متفاوت بودہ)
زنجیر زندان اعمال شاقہ داغ و مثلہ ہم در موارد مخصوص
اجرا می گشت"[۱۲]

یعنی مجرم کو دو طرح کی سزا ملے گی ایک دنیاوی اور دوسرے اخروی' دنیاوی سزا لق سزائے موت یا درہ زنی وغیرہ سے ہے۔ (کوڑوں کی تعداد جرم کی نوعیت کے لحاظ مختلف اور کم و بیش مقرر ہے) علاوہ ازیں قید و بند اور قید با مشقت یا داغنا یا مثلہ رہ کرنا ہے جو کہ مخصوص حالات میں دی جاتی ہے۔

ساسانی دور حکومت میں مجرموں کو قید اور کوڑوں کی سزاؤں کے علاوہ قطع اعضاء سزا کا قانون موجود تھا، اگر کوئی سارق کسی کا مال چراتا تو چور سے بجائے ایک درہم کے درہم یعنی مال مسروقہ سے دوگنا وصول کرنے کا قانون تھا، علاوہ ازیں چور کے کان و بھی کاٹ دی جاتی تھی اور دس کوڑے بھی لگائے جاتے تھے اگر چور دوبارہ چوری کرتا سے پہلے سے دوگنا جرمانہ کیا جاتا اور پورا کان کاٹ دیا جاتا تھا بیس کوڑے بھی لگائے تے اور قید کی سزا بھی دی جاتی، یہ صرف ایک درہم کی چوری کی سزا تھی اور اگر سارق ن یا چار درہم کی چوری کرتا تو اس کا داہنا ہاتھ کاٹ دیا جاتا تھا اور پانچ سو درہم کی چوری سزائے موت دی جاتی تھی۔ اس طرح کے قوانین چار سو سال سے زائد عرصہ تک ایران میں

رائج رہے[۱۵]

ساسانی عہد میں اوستا اور اس کی تفاسیر اور اجماع نیکاں یعنی "فقہاء کے فتاوی" قانون کے ماخذ تھے اور مجموعۂ قوانین کی کوئی خاص کتاب موجود نہ تھی، تاہم محققین نے ایک قانونی دستاویز کا ذکر کیا ہے جسے فرخ مردنے" مادیگان ہزار داد ستان" کے نام سے تالیف کیا، اس کے صرف چند صفحات ہی دستیاب ہو سکے ہیں جن میں قوانین کی کوئی تفصیل نہیں ملتی، تاہم قدیم قانونِ جرم و سزا میں تین طرح کے جرائم قابل مواخذہ قرار دیے گئے تھے۔

۱۔ جرائم خلافِ مذہب و خدا ۲۔ جرائم خلافِ بادشاہ یا حکومت ۳۔ جرائم خلافِ عامۃ الناس۔

تیسری قسم کے جرائم میں چوری، ڈکیتی وغیرہ شامل تھے جن میں سے بعض میں جسمانی سزائیں اور بعض میں سزائے موت دی جاتی تھیں۔ زنا اور شراب نوشی جرائم میں شمار نہ ہوتے تھے بلکہ حد تو یہ کہ ایک دور ایران پر ایسا بھی گزرا جب قدیم "متمدن ایران" میں زنا کی اجازت سرکاری طور پر دے دی گئی، مزدک نے جو ایرانیوں کا روحانی پیشوا خیال کیا جاتا تھا یہ اعلان کر دیا کہ صرف دو چیزیں انسانوں کو مختلف طبقات میں تقسیم کرنے کا باعث ہیں جائیداد اور عورت اور چونکہ سب انسان برابر ہیں اس لیے کسی خاص انسان کو کسی خاص جائیداد کے حقوقِ ملکیت حاصل نہیں ہونا چاہئیں اور کوئی عورت کسی ایک شخص کی منکوحہ بن کر نہیں رہ سکتی۔ لہذا ہر شخص ہر قسم کی جائیداد اور ہر عورت سے استفادہ کر سکتا ہے[۱۶]۔ یہ اس زمانہ کی بات ہے جب ایران پر نوشیروان کے باپ کیقباد کی شہنشاہیت قائم تھی۔ علامہ ابن اثیر کے مطابق مزدک کے نظریات کو پروان چڑھانے میں کیقباد کا حصہ زیادہ ہے جس نے ملک کے طول و عرض میں مزدک کی تعلیمات کو فروغ دینے کے وسائل

مہیا کیے اور خود اس کا حد درجہ معتقد تھا[۱۵]

اس دور میں زنا اور بدکاری گویا عام تھی اور شراب کھلے بندوں پی جاتی تھی۔ مذہبی تقریبات میں شراب پلانے کا خاصا اہتمام کیا جاتا تھا۔ تاجداران آل ساسان کا دربار شراب نوشی کی بڑی آماجگاہ تھی[۱۶]

۶۔ قدیم یونانی تمدن | یونانی قوم جس نے سقراط، افلاطون اور ارسطو جیسے فلاسفر پیدا کیے، ایک مہذب و متمدن قوم ہونے کا شہرہ رکھتی ہے۔ مگر جرم و سزا کے حوالے سے اس قوم کے تہذیب و تمدن کا مطالعہ کیا جائے تو صورت حال کچھ عجیب سی بنتی نظر آتی ہے۔ فلسفہ کی موشگافیوں میں دنیا کو مات دینے کا دعویٰ رکھنے والی قوم کے عظیم سپوت جرائم کے بارے میں کیا نقطۂ نظر رکھتے تھے۔ افلاطون کا بیان اس کی وضاحت کے لیے کافی ہے۔ وہ کہتا ہے:

"... شہر کے باشندوں کو تین طبقوں میں تقسیم کیا جانا چاہیے۔ حکام، لشکر اور عوام ان میں پہلے دو طبقے اس مثالی شہر کے نگہبان ہیں۔ داخلی انتشار اور بیرونی حملوں سے بچانا ان کی ذمہ داری ہے، اس لیے ان دو طبقوں کی طرف خصوصی توجہ دی جائے اور ان کو مالی پریشانیوں سے بچانا حکومت کا فرض ہے، اس طرح حکومت پر لازم ہے کہ ان کے دلوں سے خاندانی جذبات کی بیخ کنی کر دے اور انھیں اپنا علیحدہ خاندان بنانے سے قانونی طور پر روک دے۔ حکومت کو خوشگوار اوقات میں ایسے مذہبی تہوار منعقد کرنے چاہئیں جن میں یہ چنے ہوئے مرد صحت و جمال میں ہر طرح ممتاز عورتوں کے ساتھ وقتی طور پر رشتۂ ازدواج قائم کر سکیں اور اس کا مقصد صرف حکومت کے لیے بہترین بچوں کا پیدا کرنا ہو۔ جب وہ عورتیں بچے جنیں تو ان بچوں کو ان سے لے لیا جائے اور تمام بچوں کو ایک مکان میں رکھا جائے، وہ عورتیں آکر انھیں دودھ پلائیں اور

کوئی عورت یہ امتیاز نہ کرے کہ یہ کس کا بچہ ہے اور نہ ان کو پہچان سکے۔ اس طرح اس طبقہ میں کوئی مخصوص رشتہ داری نہیں پائی جائے گی وہ سب ایک خاندان کے افراد شمار ہوں گے۔ سب کے ساتھ یکساں نوعیت کی قرابت داری ہوگی ..." [۱۹]

یونانی تہذیب کا ذکر کرتے ہوئے عموماً یونان کی دو معروف ریاستوں سپارٹا اور ایتھنز کا حوالہ دیا جاتا ہے حالانکہ ان دو ریاستوں کے باشندے ہمیشہ طبقاتی تقسیم کا شکار رہے اور دونوں ریاستوں نے دو مختلف نظام ہائے حکومت کو جنم دیا۔ سپارٹا کے شہریوں کو عسکری تربیت سختی سے دی جاتی تھی اور چشم بد دور تہذیب اس قدر عروج پر تھی کہ جو لوگ جسمانی اعتبار سے عیب دار ہوتے تھے انہیں ایک غار یا پہاڑ کے ویرانے میں چھوڑ آتے تھے تاکہ وہ سردی سے مر جائیں یا درندے انہیں کھا جائیں یا کوئی رحم دل غلام انہیں اپنا بچہ بنا لے۔ تندرست بچوں کو دیگر فنون کے ساتھ ساتھ چوری کے فن میں بھی تربیت دی جاتی تھی اور انہیں یہ سکھایا جاتا تھا کہ وہ چوری کرتے ہوئے اپنے آپ کو گرفتاری سے کس طرح بچائیں اور اگر گرفتار ہو جائیں تو کسی صورت بھی اعتراف سرقہ نہ کریں۔ سپارٹا کے ایک چوری کرنے والے بچے کی کہانی یوں بیان کی جاتی ہے کہ "اس نے لومڑی چرائی اسے اپنے کپڑے میں چھپا لیا، اکابر اس سے پرسش کرتے رہے، اس اثنا میں لومڑی بچے کا پیٹ کاٹ کاٹ کر کھاتی رہی یہاں تک کہ بچے نے جان دے دی مگر چوری کا اعتراف نہ کیا۔ چنانچہ اس بچہ کو ہیرو کی حیثیت حاصل ہوگئی۔" [۲۰]

محولہ بالا عبارت سے یہ اندازہ لگانا چنداں دشوار نہیں کہ یونانیوں کے ہاں نظام عدل مساوات کے اصول پر قائم نہ تھا بلکہ ہندی تمدن کی طرح ذات پات اور طبقاتی اونچ نیچ کا شکار تھا۔ خود یونانی حکماء اس تقسیم کے محرک و موید تھے۔ ارسطو کا بیان اس حقیقت کو ادر بھی

آشکارا کرتا ہے وہ لکھتا ہے:

"ان القانون لا ینبغی ضرورة ان یطبق الاعلی افراد متساویین بالمولد بالملکات غیران القانون لم یشرع قط لهولاء الناس الا فذاذ انهم هم انفسهم القانون ومن السخریة ان یحاول اخضاعهم للدستور"[۲۱]

"یعنی تمام قانون تمام اہل ملک کے لیے یکساں نہیں ہوتا بلکہ اس کا مساویانہ انطباق صرف ان افراد پر ہوگا جو نسب اور قابلیت کے لحاظ سے مساوی ہیں۔ رہا حکمراں طبقہ تو ان لوگوں کے لیے قانون نہیں بنایا جاتا بلکہ یہ لوگ بذات خود قانون ہیں اور یہ کھلا مذاق ہے کہ ان اکابر کو دستور کی پابندی پر مجبور کیا جائے ..."[۲۲]

ارسطو نے اپنے اس نظریہ کو ثابت کرنے کے لیے ایک حکایت بیان کی ہے وہ کہتا ہے کہ:

"خرگوشوں کا ایک جلسہ ہوا جس میں ایک قرارداد منظور کی گئی کہ تمام حیوانات میں مساوات کا قاعدہ جاری ہونا چاہیے۔ جب شیروں نے یہ ریزولوشن (RESOLUTION) سُنا تو انہوں نے کہا کہ پہلے ہمارے جیسے طاقتور پنجے اور تیز دانت لاؤ پھر ہمارے ساتھ مساوات کا مطالبہ کرو"[۲۳]

جس تمدن میں عدل کا دوہرا معیار ہو اور مساوات کے اصول کی قوم کے ہیرو نفی کر رہے ہوں وہاں کے نظام جرم و سزا میں افراط و تفریط کا اندازہ کرنا چنداں دشوار نہیں۔

مذکورہ بالا سطور سے یہ بات بھی واضح ہوئی کہ یونانی تمدن میں مے نوشی اور زنا جرائم کی فہرست میں نہ آتے تھے بلکہ انہیں افلاطون جیسے شہرۂ آفاق فلاسفر کی سرپرستی حاصل تھی۔ سرقہ کو بھی جرم نہ سمجھا جاتا تھا بلکہ اس کی تربیت دی جاتی تھی۔ اگرچہ یہ بات عجیب سی لگتی ہے لیکن تاریخی مراجع کو صرف اس بنا پر جھٹلایا نہیں جا سکتا کہ کوئی بات خلافِ عقل ہے،

۷۔ قدیم چینی تمدن اور جرائم کی عقوبتیں | چین کے تمدن میں سات ہزار برسوں کا تسلسل ہے اور اس کا شمار دنیا بھر کے قدیم تمدنوں میں ہوتا ہے۔ علمائے آثار قدیمہ کے خیال میں یہ تمدن ۳۵۰۰ ق م سے بھی پہلے کا ہے۔

لیکن قدیم چینی تمدن میں جرائم سخت قابل سزا (مقابل حدود) کیا تھے اس کا کوئی ثبوت دستیاب نہیں ہو سکا[۲۴]

کیونکہ دنیا سے الگ تھلگ رہنے اور شی ہوانگ ٹی کے عہد میں تمام قدیم تحریری ریکارڈ کے تباہ و برباد ہو جانے کی وجہ سے پردہ پڑا ہوا ہے۔ قدیم زمانہ کے حالات اکثر قصوں اور کہانیوں کی صورت میں ملتے ہیں۔ ہوانگ ٹی نے ۲۶۹۷ ق م سے ۲۵۹۷ ق م تک حکومت کی، اس کے بعد جس معروف چینی بادشاہ کے عہد کا پتہ چلتا ہے وہ کینفوشس ہے جس نے پانچ چنگ یا کتابیں چھوڑی جو شرعی کتابوں کے نام سے جانی جاتی ہیں[۲۵]

قدیم چینی تمدن میں فوجداری سزاؤں کے سخت ہونے کا پتہ چلتا ہے جس میں بال کاٹنے، کوڑے مارنے، شہر بدر کرنے اور سزائے موت تک شامل تھی۔ چوری، ڈکیتی اور شراب نوشی، فوجداری جرم تھے یا نہیں اور ان جرائم پر کس قسم کی سزائیں دی جاتی تھیں، ان کے بارے میں کوئی حتمی بات تاریخی شواہد سے ثابت نہیں۔ تاہم یہ بات طے شدہ ہے کہ زنا اور ہم جنس پرستی کا کاروبار سرکاری سرپرستی میں ہوتا تھا۔ قحبہ خانے اور بیسواؤں کے کوٹھے موجود تھے جہاں مرد اپنی جنسی بھوک مٹایا کرتے۔ اس ہم جنسی مباشرت کو جائز تصور کیا جاتا تھا۔ بیسواؤں کو اپنا دھندا چلانے لیے حکومت سے اجازت نامہ ملتا تھا۔ حسین و جمیل بیسوائیں بیرونی سفراء کو بھی

پیش کی جاتی تھیں۔ دارالسلطنت میں حسین و جمیل بیسواؤں کی کافی تعداد ہوگئی تھی [۲۶]

مندرجہ بالا سطور سے یہ اندازہ لگانا ہرگز دشوار نہیں کہ قدیم ثقافتوں، تہذیبوں اور معاشروں میں جرم و سزا کی صورت حال کس قدر ابتر تھی، کہیں تو معمولی سے جرم پر سخت تر سزا اور کہیں شدید ترین جرائم سرکاری سرپرستی کی چھتری میں۔

ان حقائق کو جان لینے سے ایک انصاف پسند شخص خود بخود یہ نتیجہ اخذ کر سکتا ہے کہ افراط و تفریط سے پاک اور عدل و انصاف پر مبنی اگر کوئی تہذیب و ثقافت ہو سکتی ہے تو وہ اسلامی تہذیب و ثقافت ہی ہے اور عدل اجتماعی کی جو رعایت اسلام نے کی ہے وہ کسی اور کے حصے میں نہیں آئی۔

حواشی

لہ الباشم، ہندوستان کا شاندار ماضی، ۱۶۹ سلہ نجیب آبادی اکبر شاہ خان، مقدمہ تاریخ ہند، ج ۲، ص ۱۲۴ (بحوالہ منو سمرتی ۸ / ۳۷۴ سلہ علی عباس، روایات تمدن قدیم، ص ۲۲۹ سلہ الباشم، ہندوستان کا شاندار ماضی، ص ۱۶۷ شہ مناظر احسن گیلانی، ہزار سال پہلے، ص ۱۸۶ سلہ علی عباس، روایات تمدن قدیم، ص ۲۲۹ شہ منشی پریم چند، قرون وسطیٰ میں ہندوستانی تہذیب، ص ۱۸۶ شہ البیرونی، سخاؤ، ج ۲، ص ۱۶۲ ۹ البیرونی تاریخ الہند قدیم، ص ۵۰۴ سلہ قاسم محمود، اسلامی انسائیکلو پیڈیا، ص ۲۶۸ سلہ سراج الاسلام عہد قدیم مشرق و مغرب، ص ۱۲۵ سلہ مقبول بیگ بدخشانی، تاریخ ایران، ج ۱، ص ۱۹۰-۱۹۸ سلہ ساسانی سلطنت کی بنیاد ۲۲۶ء میں رکھی گئی اور یہ ایران کی آمد تک قائم تھی، ایران میں اس سے قبل پارتھیائی شہنشاہیت قائم تھی۔ ساسانی سلطنت کا بانی مبانی اردشیر کو سمجھا جاتا ہے۔ اردشیر ایک عدل پسند شہنشاہ تھا، اس کے نزدیک عدل ہی سے حکومت طاقتور اور

خوش حال ہوسکتی تھی، اس کا ایک مقولہ عدل کے سلسلہ میں مشہور ہے۔ فوج کے بغیر کوئی طاقت نہیں ہوسکتی، پیسے کے بغیر فوج نہیں رکھی جاسکتی، زراعت کے بغیر پیسہ نہیں مل سکتا انصاف کے بغیر زراعت کامیاب نہیں ہوسکتی۔ (ص ۴۴، ضیاء النبی جلد اول) (نجیب آبادی ص ۱۵۹)

تیسری صدی سے چھٹی صدی عیسوی تک کا ایران مندرجہ ذیل علاقوں پر مشتمل تھا۔ افغانستان بلوچستان، سومیانہ، بلخ، عراق اور پرشیا (فارس) بعض مورخین نے مندرجہ ذیل علاقے تیسری سے چھٹی صدی عیسوی کے عرصہ میں ایرانی علاقے شمار کیے ہیں۔ بلوچستان، کیچ، مکران، غور، بامیان ہندوکش، سیستان، زابلستان، خراسان، ماوراء النہر، دشت، اصفہان، مازندران، فارس، کوزستان، افغانستان، کابلستان، پنجاب، بابل، موصل اور دیار بکر وغیرہ (اردو دائرہ معارف اسلامیہ جلد ۳، ۱۹۶۸ء) ۱۴؎ عبداللہ رازی، تاریخ کامل ایران (فارسی) ص ۳۴۱۲ ۱۵؎ نجیب اکبر آبادی، اکبر شاہ خان، مقدمہ تاریخ ہند، ج ۲، ص ۱۵۹ ۱۶؎ آرتھر کرسٹن۔ ایران بعہد ساسانیان، ص ۹۹۳۔۔۔۴ ۱۷؎ بریگیڈ سیئر، ہسٹری آف پرشیا (لندن، ۱۹۴۹ء) ج ۱، ص ۴۴۲ ۱۸؎ ابن اثیر، الکامل (حیدرآباد دکن، دارالطبع جامعہ عثمانیہ ۱۹۳۸ء) ج ص ۱۹؎ WILL DURRANT THE AGE OF FAITH (SIOMN AND SCHUS TER NEW YOUR 1954) P.149) ۲۰؎ پیر محمد کرم شاہ، الازہری، ضیاء النبی، ج ۱ ص ۱۱۱ (بحوالہ البرنصری نادر، مقدمہ کتاب الجمع بین رای الحکیمین) ۲۱؎ ایضاً۔ ص ۱۰۹ ۲۲؎ ایضاً۔ ج ۱، ص ۱۱۱ (بحوالہ السیاسیۃ الشرعیہ، ص ۲۱۷) ۲۳؎ ایضاً۔ (ایضاً۔ ص ۳۴۳) ۲۴؎ ایضاً (ایضاً) ۲۵؎ علی عباس، روایات تمدن قدیم، ص ۲۴۹ ۲۶؎ سراج الاسلام عہد قدیم مشرق ومغرب، ص ۱۸۳، ۱۸۵ ۲۷؎ ایضاً۔ ص ۲۳۰۔

ملفوظات اقبال کی ادبی اہمیت

از ڈاکٹر محمد یٰسین مظہر صدیقی ندوی۔ علیگڈھ

(۲)

عشق اور خودی کے باہمی تعلق کے سلسلہ میں ارشادِ اقبال ہے:

"... یہ درست ہے کہ خودی کا تقاضا ہے عشق، اس لیے عشق کے بغیر جسے میک ٹیگرٹ بھی اصول کائنات قرار دیتا ہے، خودی میں استحکام پیدا نہیں ہوتا۔ لیکن اگر خودی میں استحکام پیدا کرنا مقصود ہے تو پھر اس کے فنا کا کوئی جواز نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ جذبۂ عشق میں جب ہم فنا پر زور دیتے ہیں تو اس کا مطلب بجز اس کے کچھ نہیں ہوتا کہ ہماری توجہ صرف اس چیز پر ہے جو عشق کا مقصود ہے۔۔ لیکن یوں کے اس عالم تصوّر پر استدلال کرنا غلطی ہے جس کا مطلب ہے نفی ذات۔ اس کے معنی تو یہ ہیں کہ ہماری ہستی ہمارے مقصود سے ہے۔ یہ فنا تو عین بقا ہے، صوفیا اسلام نے بھی اسی لیے فنا کو بقا سے تعبیر کیا ہے" (ص ۱۶۴-۱۶۵)

حضرت علامہ کا خیال ہے کہ تشخص ذات دراصل شعور پر مبنی و منحصر ہے:

"... لہذا شعور کا تسلسل حیات بعد الموت پر بھی قائم رہتا ہے، چنانچہ قرآن کریم میں آیا ہے قیامت کے روز کافر کہیں گے: لَوْ كَانَ لَنَا كَرَّةً (البقرہ ۱۶۷) ... تشخص ذات کا تعلق حافظے پر موقوف نہیں۔ اس کا تعلق خودی کے احساس سے ہے۔ یہ احساس یا

شعور اپنی جگہ پر ایک حقیقت ہے ... احساس ذات کی مسلسل اور ہر لحظہ موجودگی خودی کے اسرار میں ہے۔ یہ نتیجہ ہے خودی کے استحکام کا ...' (ص ۲۰۱-۲۰۲)

شاعر مشرق اور فلسفی اسلام کا ایک انتہائی محبوب موضوع "خودی" کا فلسفہ ہے جو ان کے کلام وارشادات میں جا بجا اور مربوط طریقہ سے پایا جاتا ہے۔ اس پر ان کے ارشادات عالیہ کا دفتر تیار کیا جا چکا ہے۔ اس کے بارے میں ایک آخری ارشاد:

" ... خودی تربیت یافتہ ہو یا غیر تربیت یافتہ ہر حالت میں خودی ہی رہے گی۔ اس کا جوہر ہے یکتائی۔ ہر خودی اپنی جگہ پر یکتا ہے۔ ہر خودی کا ایک تشخص اور ایک انفرادیت ہے کہ جب تک قائم ہے خودی قائم ہے ورنہ اس کا وجود ختم ہو جائے گا۔" (ص ۸۳)

خودی کا تعلق شعور وحفظ ذات سے ہے۔ علامہ اقبال اس باب میں ارشاد فرماتے ہیں کہ "حفظ ذات کی خواہش بہر حال اتنی عام ہے جتنی انسانیت بلکہ زندگی۔ لہذا بقائے دوام کا امکان ہر شخص کے لیے موجود ہے۔ اسلام عبارت ہے فطرۃ اللہ سے۔" (ص ۸۳) "بقائے دوام ایک انعام ہے، ہمارا حق نہیں۔ ہمیں چاہیے اپنے آپ کو اس کے لیے تیار کریں۔" (ص ۱۶۱) "دنیا کے ہر مذہب نے حیات بعد الموت کی تائید کی ہے، لیکن عجیب بات ہے عہد نامۂ عتیق اس باب میں خاموش ہے۔" ... (ص ۹۱) حضرت علامہ نے اس تصور حیات بعد الموت کو خودی کے تصور سے مربوط کر کے ان کے تعلق، فرق اور اختلاف پر بھی بحث کی ہے۔ یہ ایک لمبی فلسفیانہ گفتگو ہے جس کا ماحصل یہ ہے کہ اسلامی تصور خودی اور تصور حیات بعد الموت میں کوئی اختلاف نہیں ہے مگر متکلمین اسلام نے جو تصورات پیش کیے ہیں وہ اسلام سے میل نہیں کھاتے۔ حضرت علامہ کے ارشادات وملفوظات اس موضوع پر بالخصوص اور دوسرے تصورات جیسے زمان ومکان وغیرہ پر بہت اہم اور دقیق ہیں۔

مغربی فلاسفہ اور ان کے افکار و تصورات زمان و مکان پر بہت کچھ لکھا جا چکا ہے۔ حضرت علامہ کے نظریہ زمان و مکان پر بھی پورے دفتر کے دفتر تیار کیے گئے ہیں۔ خود حضرت علامہ نے اس موضوع خاص پہ اپنے قلم سے مستقل تصنیف بھی فرمائی تھی جو بدقسمتی سے یا تقدیر الٰہی سے ضایع ہوگئی۔ ان کے اشعار و کلام میں بھی اس موضوع پر بہت مواد ملتا ہے۔ تاہم ان کے ملفوظات میں ان کے افکار خاص کی ایک دوسری شان نظر آتی ہے۔ جس میں ان کی تنقید بھی ہے، تنقیح بھی، مختصر جملوں میں ان کی تفہیم بھی ہے اور تشریح بھی اور اسی کے ساتھ ساتھ ادبیت بھی ملتی ہے۔

"یورپ کے لیے برگساں کا نظریہ شاید نیا ہو۔ عالم اسلام کے لیے زمانے کی بحث کوئی نیا مسئلہ نہیں ہے۔ اسلامی الٰہیات، حدیث و قرآن اور فلسفہ کا مطالعہ کیجیے تو میری بات کی تصدیق بھی ہو جائے گی"۔

علامہ نے اسی سلسلہ میں کیمبرج میں لکھے گئے اپنے مقالہ کا ذکر بھی بہت خوبصورت اور اندوہ آگیں انداز میں کیا ہے جس سے یورپی مغربی فلاسفہ اور دانشوروں کی روشن خیالی اور پرورش لوح و قلم کا بھی سچا اندازہ ہوتا ہے۔

دہریت بھی انہیں تصورات اور گورکھ دھندوں میں سے ایک ہے جس نے ہر دور جہالت میں انسان کی فکر کو گمراہ اور اس کے زاویے کو کج کیا ہے۔ موجودہ دور میں یورپ اور اس کے زیر اثر دوسرے ممالک کے اہل فکر و نظر کی عقلوں پر پتھر پڑ گئے ہیں لیکن دہریت کی کتنی انواع و اقسام ہیں اور ان کے اسباب و اثرات کیا ہیں اس پہ علامہ کی نظر بہت گہری ہے۔ فرماتے ہیں:

"دہریت کی ایک نہیں کئی شکلیں ہیں، ایسے ہی اس کے الگ الگ اسباب بھی۔ ...

ایک اہل سائنس کی دہریت ہے۔ ان کی نظر مادے اور اس کے شئون سے آگے نہیں بڑھتی ایک اہل فلسفہ کی کہ اپنے فکر کی نارسائیوں میں گم ہیں۔ ایک عام دنیادار کی۔ میک ٹیگرٹ کا معاملہ ان سب سے مختلف تھا۔ اس نے ہستی باری تعالیٰ سے انکار کیا تو اس لیے کہ اسے مسیحیت کا شخصی خدا پسند تھا نہ فلسفہ کا واجب الوجود۔ وہ دونوں سے بیزار تھا۔" (ص ۶۶-۶۶)

حضرت علامہ نے اسی طرح نیٹشے کے تصور مافوق البشر اور دوسرے فلاسفہ یورپ کے تصورات سے بھی اظہار خیال وارشاد فرمایا ہے۔ مگر ان سب کا جمع کرنا طویل بحث کا باعث ہے۔

مفکر اسلامی اور حکیم الامت نے صرف اسلام اور یورپ کے فلسفیانہ اور مذہبی ومعاشرتی افکار و تصورات سے سروکار نہیں رکھا کہ ایک سے ان کی اپنی ذاتی وابستگی تھی اور دوسرے سے علمی۔ انہوں نے اپنے ملکی فلاسفہ اور برادران وطن کے تصورات وخیالات سے بھی بحث کی ہے کہ وہ ان کے درمیان رہتے بستے تھے اور یہ بھی کہ ان کے فلسفہ ومذہب کی ملت اسلامیہ ہندیہ کی زندگی میں ایک خاص اہمیت ہے۔ ان کے ملفوظات عالیہ میں ہند و تصورات، معتقدات اور خیالات پر بہت خوبصورت جملے اور ادبی نکتے ملتے ہیں۔

تخلیق کائنات کے ایک ہندو تصور کے بارے میں ارشاد فرماتے ہیں"... لطف کی بات ہے کہ اگر قرآن کسی افسانے کا ذکر نہ کرے جب بھی معلوم ہو جاتا ہے کہ اس کا اشارہ کس افسانے کی طرف ہے۔ مثلاً قرآن میں ہے ہم نے کائنات کو کھیلتے ہوئے نہیں پیدا کیا۔ اس سے ہمارا ذہن خود بخود اس افسانے کی طرف منتقل ہو جاتا ہے جو ہندوؤں میں رائج ہے اور جس سے بیان کرنا مقصود ہے کہ دنیا کیا ہے؟ ایک کھیل جسے رام نے اپنی دل لگی کے لیے رچایا۔۔۔ ہندوؤں کے یہاں ایک دیوتا ہے جس کا نام ہے نٹ راجن یعنی کھلاڑیوں کا راجہ۔ وہ اس کی

موسیقی بھی تیار کرتے ہیں تو اس طرح جیسے یہ دیوتا راگ رنگ میں مشغول ہے... ایسے ہی صفات باری تعالیٰ کے ذکر میں جب قرآن یہ کہتا ہے کہ لا تاخذہ سنۃ ولا نوم (البقرہ ۲۵۵) تو بے اختیار ہندوؤں کا یہ قول یاد آجاتا ہے کہ کائنات پرماتما کا خواب ہے۔ ادھر اس کی آنکھ کھلی اور ادھر یہ خواب پریشاں ہو گیا... ہمارے ہاں بعض صوفیہ نے بھی اس قسم کے خیالات کا اظہار کیا ہے۔" (ص ۶۰-۵۹) حضرت علامہ نے ہندو تصور مایا پر بھی اسی طرح ارشاد فرمایا ہے۔ (ص ۸۶-۸۳)

مفکر اسلامی کا ایک اہم کارنامہ یہ بھی ہے کہ وہ تقابلی مطالعہ اور ملفوظہ ارشاد کیے بغیر نہیں رہ سکتے کیونکہ اس کے بغیر بات مکمل نہیں ہوتی۔ جسم و جسد کے فلسفہ پر بحث کرتے ہوئے فرماتے ہیں: "خودی کے لیے شاید کوئی جسد ناگزیر ہے' یا یہ کہنا بہتر ہو گا کہ ہمیں جسد کی بربادی کا غم نہیں ہونا چاہیے پھر یہ ضروری کیا ہے اور غیر ضروری کیا۔ یہ ارشاد بڑا معنی خیز ہے بلکہ ایک راز۔ شاہ صاحب نے بھی تو جسد بعد الموت کے لیے نسمہ کی اصطلاح وضع کی ہے۔ ہندو ادب میں بھی اسی طرح کا ایک لفظ موجود ہے"۔ (یعنی شریر/سریر) (ص ۸۸-۸۷) حضرت علامہ نے ہندو تصورات و افکار کے علاوہ ان کی شخصیات پر بھی اپنے ملفوظات میں اظہار خیال کیا ہے، جس کا ذکر ہم بعد میں کریں گے۔

ملفوظاتِ اقبال میں سماجی اور معاشرتی موضوعات پر بھی خاصے کے ارشادات ملتے ہیں۔ ان کی خصوصیت یہ ہے کہ ادبیت کے ساتھ ساتھ وہ اسلامی فکر و عقیدہ سے ان کو مربوط کرتے چلے جاتے ہیں۔ حکیم الامت ہونے کے ناطے وہ اسباب' آغاز اور نتائج کا بھی تجزیہ کرتے ہیں، شادی کے مسئلہ پر ارشاد فرماتے ہیں:

"اسلام نہ کسی عورت کو کسی مرد سے نکاح کرنے پر مجبور کرتا ہے نہ روکتا ہے۔ یہ معاملہ

ان کی اپنی پسند کا ہے۔ لہٰذا اسلام کا فیصلہ ہے کہ ایک مسلمان عورت جس مسلمان مرد سے چاہے شادی کر سکتی ہے۔ اس نے یہ بات ہر شخص کے ذاتی انتخاب پر چھوڑ دی ہے جس میں ممکن ہے وہ غلطی بھی کرے . . . ہندوستان میں مغلوں نے راجپوت شاہزادیوں سے محض اس لیے شادیاں کیں کہ راجپوت ایک جنگجو قوم ہیں ... مغل سمجھتے تھے کہ ان سے ازدواجی تعلقات قائم کیے گئے تو مغلوں کے نسلی خصائل کو کوئی نقصان نہیں پہونچے گا۔" (ص ۱۴۷)

حضرت علامہ نے اسی حقیقت کو دوسری حقیقت نسلی اختلاط اور تعصبات سے جوڑ دیا:

"نسل کا مسئلہ خاصا پریشان کن ہے، لیکن اب کون سی نسل محفوظ ہے؟ اسلام نے شادی بیاہ کے ذریعہ نسلی تعصبات کو بڑی حد تک ختم کر دیا۔ یوں بھی نسلیں کب سے خلط ملط ہو رہی ہیں ... اب خالص نسلیت کا دعویٰ محض ایک افسانہ ہے، یہ دوسری بات ہے کہ نسلی امتیازات ابھی دیر تک قائم رہیں گے۔" (ص ۱۴۸)

خالص نسلیت سے ذاتی شرف اور خاندانی وجاہت کا نظریہ پیدا ہوتا ہے۔ حضرت علامہ نے اس پر بھی ارشاد فرمایا:

"اسلام کی نظر فرد کے ذاتی شرف پر ہے۔ حسب و نسب پر نہیں ہے۔ نسل اور رنگ کا اختلاف کوئی عیب کی بات نہیں۔ قرآن پاک نے اس کا شمار آیات الٰہیہ میں کیا ہے۔ البتہ ہمیں اس باب میں اقل قلیل مزاحمت (LINE OF LEAST RESISTANCE) سے کام لینا چاہیے۔" (ص ۱۴۹)

اسلامی معاشرہ کے دوادوار کے موازنہ میں یہ فصاحت و بلاغت اور حکمت ملاحظہ

"مسلمانوں کی زندگی کیسی شگفتہ تھی انہوں نے حتی الوسع اسے ہر آلائش سے پاک رکھا۔ وہ اس سے لطف اٹھانا اور اس میں حسن و جمال، طاقت و قوت کے جو لامتناہی امکانات موجود

ہیں، ان کی قدر کرنا خوب جانتے تھے۔ ..... مسلمانوں کا زوال کیسا حسرتناک ہے ..." (ص۲۴۳)

ان کا خیال تھا کہ اسلام ایک سیاسی اجتماعی معاشرہ ہے۔ جیسا کہ عہد نبوی و خلافت اسلامی میں تھا، مگر بعد میں اسلام کو چند اخلاقی اور عقائدی چیزوں تک محدود کر کے اسکی اجتماعی ہیئت کو بالکل نظر انداز کر دیا گیا۔ (ص۲۱۳ وغیرہ)

اسلامی معاشرہ میں ہر شخص کو بلا تفریق ذات پات ترقی کے مواقع حاصل ہیں کہ وہاں نسلی برتری کمتری کا تصور ہے نہ عمل لیکن غیر اسلامی معاشروں کے اثرات کا نتیجہ ہے کہ مسلم معاشرہ بالخصوص ہندی معاشرہ میں ذات پات اونچ نیچ کی تفریق نہ صرف پیدا ہوئی بلکہ قانون فطرت بن کر رہ گئی۔ اس سے متعلق میاں محمد شفیع نے ایک واقعہ اور اس پہ حضرت علامہ کا ارشاد نقل کیا ہے، واقعہ یہ ہے کہ گھر میں کام کرنے کے لیے جو بھنگن آتی تھی اس کا ایک ہم عمر بچہ ساتھ آتا اور ماں کی مصروفیت کے دوران جاوید منزل میں کھیلتا رہتا۔ ایک دن حضرت حکیم الامت نے ارشاد فرمایا:

"میں جب بھی اس بچے کو دیکھتا ہوں تو میرا دل اضطراب سے پارے کی طرح تڑپ اٹھتا ہے اور میں سوچتا ہوں کہ سماج کی زنجیروں کی وجہ سے یہ بچہ زندگی میں صرف خاکروب بن سکے گا حالانکہ اس میں اور جاوید میں جہانتک انسان ہونے کا تعلق ہے کوئی فرق نہیں۔ اگر جاوید ذہانت میں اس لڑکے سے کم بھی ہو تو محض اس وجہ سے کہ وہ میرا بیٹا ہے، اس پر ترقی کے راستے کھلے رہیں گے ..." (نقوش، اقبال نمبر دوم ص۴۵۶، تصانیف اقبال ص۳۹۴-۵)

حکیم الامت کو مسلم تحریکات سے خصوصی اور غیر مسلم یا دوسری تحریکات سے عمومی دلچسپی رہی تھی جس کا اظہار ان کے کلام و نثر کی طرح ان کے ملفوظات میں بھی خوب خوب

ہوتا ہے۔ ہندوستان یا برصغیر پاک و ہند کی دو تحریکات سے ان کی دلچسپی بہت خصوصی نوعیت کی تھی اور ان دونوں کے بارے میں ان کے ارشادات ان کی حکیمانہ نظر، دانشورانہ فکر اسلامی تدبر اور حقیقی تعقل کی بھی نشاندہی کرتے ہیں اور ان کے فکری توازن و اعتدال انصاف و عدل اور معروضی انداز و طریق کو بھی پوری طرح اجاگر کرتے ہیں۔

حضرت سید احمد شہیدؒ کی تحریک جہاد کے بارے میں کیا خوبصورت تجزیہ کرتے ہیں:

"یوں جن تحریکوں کا ظہور ہوا ان میں ایک علاقہ سا قائم ہوگیا۔ حالانکہ اکثر و بیشتر ان میں باہم کوئی تعلق نہیں تھا بجز سطحی مشابہت کے۔ مثلاً یہی کہ جہاں کہیں بدعات کے خلاف کوئی آواز اٹھی اسے بھی وہابیت سے تعبیر کیا گیا۔ حتیٰ کہ حضرت سید احمد کی تحریک جہاد بھی وہابی تحریک ہی سے موسوم ہوئی ... کوئی بھی تحریک ہو اسے ناکامی اور ناکامرانی ہر طرح کے مراحل سے گزرنا پڑتا ہے۔ تحریک جہاد کا ایک مرحلہ وہ تھا جو بالاکوٹ میں ختم ہوا۔ دوسرا وہ جب یہ تحریک سرحد میں محدود ہوکر رہ گئی اور گو ۱۸۶۳ء کے بعد انگریزی حکومت کے خلاف ان کی سرگرمیاں سست پڑگئیں بایں ہمہ حکومت کو ان کی طرف سے کبھی اطمینان نہ ہوا۔ اس تحریک کے پیچھے کچھ عناصر ہندوستان میں بھی موجود تھے ..." (ص ۳۲۲)

فکری تحریک ولی اللهی کے بارے میں بھی کیا خوبصورت بات کہتے ہیں:

"شاہ صاحب ہی کو دیکھئے کیسے بالغ نظر اور صاحب بصیرت انسان تھے۔ ان کی ذات جس تحریک کا سبب بنی اور یہ تحریک جہاں تک بھی کامیاب ہوئی ان کی دور اندیشی اور امت کے لیے غیرت و حمیت کا ناقابل انکار ثبوت ہے، ان کے ارشادات کی قدر و قیمت آج واضح ہورہی ہے۔" (ص ۳۲۱)

وہابی تحریک کے بارے میں فرماتے ہیں:

"وہابی تحریک ایک چنگاری تھی جس نے عالم اسلام میں ہر کہیں تقلید اور استبداد کے خلاف ایک آگ بھڑک اٹھی (بھڑکا دی) صدیوں کا جمود ٹوٹا۔ قوائے علم و عمل شل ہو رہے تھے ان میں پھر سے حرکت پیدا ہوئی۔ یہ بات سمجھ میں آئی کہ مغرب کے سیاسی اور معاشی تغلب کے خلاف ایک محاذ قائم ہونا چاہیے۔" (ص ۳۲۱)

علی گڑھ تحریک کے بارے میں ان کا خیال تھا کہ"... علی گڑھ کی بدولت ایک عام بیداری پیدا ہوئی اور قوم کے قوائے علم و عمل حرکت میں آئے، یہ گویا ہماری نشاۃ الثانیہ ہی کی ایک تحریک تھی"۔ اس کا تعلق دیوبند تحریک سے یوں جوڑتے ہیں: "دیوبند ایک ضرورت تھی۔ اس سے مقصود تھا ایک روایت کا تسلسل۔ وہ . . . ت جس سے ہماری تعلیم کا رشتہ ماضی سے قائم ہے، یہ ضرورت پوری ہوئی ... لیکن دیوبند کو چاہیے تھا اس روش پر قائم رہتا، سیاست کے چکر میں نہ آتا..." (ص ۳۹۳)

حکیم الامت کے ملفوظات میں شخصیات کا ذکر بھی بہت دلآویز انداز اور علمی تجزیے کی صورت میں ملتا ہے۔ اس کا مرکزی نکتہ حق و صداقت کا اظہار اسلام کی کسوٹی پر افراد کی پرکھ، خوبیوں کی وسیع القلبی کے ساتھ تعریف و توصیف، خامیوں پر شرافت کے ساتھ تنقید و تنقیح اور معروضی انداز میں اپنے فہم و فراست اور علم و یقین کے ساتھ شخصیت کی تصویر کشی ہوتی ہے، حضرت علامہ کا معیار حق و صداقت خالص اسلامی ہے اور نادر بھی بعض اسلامی شخصیات کا ذکر دوسرے عناوین کے تحت پہلے آچکا ہے، اب خالص عنوان کے ساتھ ان کے بعض اوصاف وجہات کا تذکرہ انہیں کے الفاظ میں پیش کیا جاتا ہے۔

امام غزالی اور ان کے علمی کارنامے کو ایک ہی ساتھ کس خوبصورتی کے ساتھ اجاگر

کرتے ہیں:

"احیاء العلوم بڑی چیز ہے۔ اس کی علمی اور فلسفیانہ قدر و قیمت کا ٹھیک ٹھیک اندازہ ابھی تک نہیں کیا گیا۔ غزالی بہت بڑا انسان تھا... احیاء کی تصنیف سے فکرِ انسانی کی تاریخ میں ایک نئے باب کا افتتاح ہوتا ہے۔ "تہافت" کو اس کا مقدمہ کہیے۔ وہ فکرِ انسانی کا ایک اچھوتا مظہر ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ غزالی کے مقاصد مذہبی تھے، لیکن فکر کی تنقید میں انہوں نے جو منہاج وضع کیا اسکے لیے فلسفہ ہمیشہ انکا مرہونِ منت رہے گا۔ یہ منہاج وضع نہ ہوتا تو عقل و فکر کا قدم آگے نہ بڑھتا۔ غزالی کا مذہبی درجہ بھی بڑا بلند ہے لیکن فلسفیانہ حیثیت سے بھی ہم ان کی ذہانت و طباعی سے انکار نہیں کر سکتے... فلسفیانہ اعتبار سے دیکھا جائے تو ڈیکارٹ کے مباحث وہی ہیں جو غزالی کے۔ لیکن ہو سکتا ہے کہ غزالی کے یہ مباحث کسی دوسرے ذریعے سے یعنی بالواسطہ یورپ میں پہنچے ہوں، یہ بھی ممکن ہے کہ اس نے ایک طرح سے تہافت کا سرقہ کیا ہو اسلامی افکار کے نفوذ و اشاعت میں ابھی ہماری معلومات بڑی محدود ہیں۔" (ص۳۰۵-۶)

امام ابن رشد سے امام غزالی کا موازنہ کرتے ہوئے دونوں اماموں کی خصوصیات و امتیازات کو کس حکیمانہ اور بلیغ انداز میں واضح فرماتے ہیں:

"ابن رشد ارسطو کا شاگرد ہے۔ وہ ارسطو سے خوب واقف تھا لیکن اس کی شخصیت عظمت سے خالی ہے۔ غزالی کی شخصیت اس کے مقابلے میں بڑی عظیم ہے۔ دراصل ابن رشد کی عظمت کا راز ہے اس کی علمی اور فقہی حیثیت۔ فلسفہ میں ارسطو نے اسے ابھرنے نہیں دیا۔ گو یورپ اس سے متاثر ہوا۔ پاڈوآ (اٹلی) ابن رشد کی تعلیم کا خاص مرکز تھا۔" (ص۳۰۵)

جامع ملفوظات کا بیان ہے کہ :

" اٹلی اور فرانس میں ابن رشد کے اتباع میں جو فلسفیانہ تحریک چلی اس نے ایک حد تک مذہبی عقیدے کی حیثیت اختیار کر لی تھی۔ مسیحی کلیسا کو اس تحریک کے رد میں بڑی سر توڑ کوششیں کرنا پڑیں۔" (ص ۳۰ حاشیہ ۲)

امام ابن تیمیہ اور شیخ شہاب الدین سہروردی کے بانیِ فن استقرا ہونے اور یورپی فلاسفہ و مفکرین پر ان کے اثرات کا جائزہ لیتے ہوئے ارشاد فرماتے ہیں :

" نووم آرگینان (NOVUM ORGANON) نام ہی اعتبار سے ایک نئی منطق ہے۔ لیکن مطالعہ کیجئے تو پتہ چلے گا کہ اس میں ابن تیمیہ اور سہروردی کی عبارتیں جوں کی توں موجود ہیں۔ مصنف نے یہ کیسے کہہ دیا کہ منہاج استقرا یورپ کی دریافت ہے۔ استقرا اور تجربے کا سہرا مسلمانوں کے سر ہے۔" (ص ۱۱۷)

ائمۂ ثلاثہ امام ابن تیمیہ، امام محمد بن عبدالوہاب نجدی اور شاہ ولی اللہ دہلوی کا تقابلی مطالعہ کرتے ہوئے ان کے کردار، عمل اور امتیاز کو کتنی خوبصورتی اور بلاغت کے ساتھ ایک ہی سانس میں پیش کرتے ہیں :

" محمد بن عبدالوہاب نے جو تحریک اٹھائی اس کا سلسلہ امام ابن تیمیہ تک جا پہنچتا ہے۔ رد تقلید کا قدرتی تقاضا تھا کہ مطالعۂ حدیث پر زور دیا جاتا۔ ہندوستان میں شاہ صاحب بھی تو حدیث کی ضرورت پر قلم اٹھا چکے ہیں۔ البتہ اس تحریک کا سیاسی پہلو جسے عرف عام میں وہابیت کا نام دیا گیا اور جس سے نجد و حجاز میں باہم جنگ کی نوبت آئی از حد افسوسناک ہے۔ اس سے عالم اسلام کے اتحاد و استحکام کو خاصا ضعف پہنچا۔۔۔ میرے نزدیک وہابیت کی سب سے بڑی کمزوری اس کا عقائد میں تشدد اور ظواہر پر اصرار ہے۔۔" (ص ۱۲۹)

شاہ ولی اللہ دہلوی کے امتیازات و اوصاف اجاگر کرتے ہوئے ان کی بعض کمزوریوں پر بھی اظہار خیال کرتے ہیں اور اس میں ان کی عظمت کسی طرح حائل نہیں ہوتی۔ علامہ اقبال کا یہی توازن فکر و عمل ان کی نادر صفت بیان ہے :

"شاہ صاحب ہی کو دیکھئے کیسے بالغ نظر اور صاحب بصیرت انسان تھے۔ ان کی ذات جس تحریک کا سبب بنی اور یہ تحریک جہاں تک بھی کامیاب ہوئی ان کی دور اندیشی اور امت کے لیے غیرت و حمیت کا ناقابل انکار ثبوت ہے۔ ان کے ارشادات کی قدر و قیمت آج واضح ہو رہی ہے ... (ص ۳۲) ... شاہ صاحب کی شخصیت بڑی عظیم ہے مگر ان کی حقیقی عظمت کا اظہار حجۃ اللہ البالغہ میں ہوا۔ باقی تصنیفات بھی غنیمت ہیں لیکن تصوف میں انھوں نے جو کچھ لکھا ہے میں اس کا قائل نہیں۔ مثلاً افادات ہی میں ... کوئی خاص بات نہیں ... شاہ صاحب کے کچھ رسائل ہیں تصوف میں، غیر ضروری اور لاحاصل"

(ص ۳۰۱-۳ بالترتیب)

سرسید علیہ الرحمہ کے بارے میں عجیب افراط و تفریط پائی جاتی ہے۔ جدید تعلیم یافتہ بالخصوص علی گڑھ سے وابستہ حضرات کیلئے مسیحائے قوم تھے اور ہر مرض کی دوا۔ جبکہ علمائے کرام بالخصوص تشدد و تقشف پسند لوگوں کے ہاں وہ صرف ایک گمراہ و رہزن عقل و خرد تھے۔ علامہ اقبال نے انکے کردار و شخصیت کا صحیح ادراک کیا ہے۔

"مولانا محمد قاسم کے نام سرسید کا ایک خط ہے جس میں وہ اپنے عقائد فہرست وار بیان کرتے ہوئے پوچھتے ہیں کہ ان میں کون سی بات ہے جس کی بنا پر علمائے سہارنپور انہیں کافر ٹھہراتے ہیں ... یہاں بحث سرسید کے معتقدات سے نہیں۔ بحث اس امر سے ہے کہ اسلام اور کفر کا مابہ الامتیاز کیا ہے ؟ ... علمائے سہارنپور نے یہ نہیں سوچا کہ سرسید نے

قرآن مجید کی تفسیر لکھی، تہذیب الاخلاق نکالا، علی گڑھ کالج قایم کیا یا مسائل الٰہیات پر قلم اٹھایا تو اس سے ان کا مدعا کیا تھا؟ یہی کہ مسلمانوں کو اپنی وحدت کا شعور رہو۔ وہ ایک قوم ہیں، لہذا بحیثیت ایک قوم انہیں۔۔۔ سمجھ لینا چاہیے کہ مغرب کے سیاسی معاشی استیلا یا علوم و فنون میں انکے اجتہادات اور اختراعات نے ہمارے لیے کیا مسائل پیدا کر دیے ہیں۔ وہ اعتماد دیکھیں کہ مغربی تہذیب و تمدن اور علم و حکمت کی جو رو انگریزی تسلط کے ساتھ آگئی ہے ڈرنے کی چیز نہیں ہے۔ ہم اس سے استفادہ کر سکتے ہیں اور کرنا چاہیے اسلامی عقائد کو اس سے کوئی خطرہ نہیں۔" (ص ۲۸۳-۸۵)

حضرت اقبال کو سرسید کے سیاسی نقطۂ نظر، قومی سیاست میں موقف اور مسلم قو سیاسی تحریک سے اتفاق تھا جبکہ نیشنلسٹ علمار اور قوم پرست مسلمانوں کو ان سے اختلا حضرت علامہ کے ارشادات میں اس موضوع پر بہت زیادہ مواد ہے اور اسی کے سا مولانا مدنی کی سیاست اور ان کے طرز فکر سے اختلاف بھی۔

مولانا حسین احمد مدنی کانگریس کے ساتھ اشتراک اور متحدہ قومی سیاست کے قا تھے خواہ وطنی قومیت اور ہندو مسلم قومیت کے اتحاد کے قائل ہوں یا نہ ہوں۔ حضرت عا مولانا مرحوم سے تا زندگی اختلاف رہا جو ان کے کلام نثری تحریروں اور ملفوظات میں جا موجود ملتا ہے۔ علامہ کو وطنیت کے بنائے قومیت ہونے سے اختلاف تھا اور وہ اس قائل تھے کہ اسلام لاوطن اور آفاقی ہے۔ جبکہ مولانا مرحوم کو اصرار تھا کہ موجودہ دو وطن و جغرافیہ ایک وجہ قومیت ہے۔ حضرت علامہ نے اس موضوع پر آخر دم تک ان خیالات کی تغلیط و تردید کی۔ فرماتے ہیں:

"مولوی حسین احمد کے اس غلط خیال کی تردید مقصود ہے کہ قومیں اوطان سے بنتی

ہیں... (صفحہ ۸) اسی سے متعلق ان کے تین مشہور شعر ہیں جن کے اندراج کی تاریخ ۲۸ جنوری ۱۹۳۸ء بروز جمعہ ہے" (ص ۲۶ - ۱۲۵)

جب ان کے گوش گذار کیا گیا کہ مولانا مدنی کے حامی فرماتے ہیں کہ مولانا مرحوم کا یہ مطلب نہیں ہے تو حضرت علامہ نے فرمایا:

"... ہمیں ان سے کوئی ذاتی پرخاش تو ہے نہیں۔ وہ ایک بیان شایع کر دیں اور صاف صاف فرما دیں کہ اسلام کی رو سے وطن بنائے قومیت نہیں۔ وہ ایسا کریں تو ہم ان کی جرأت ایمانی کے اعتراف میں تین کے بجائے چھ شعر کہہ دیں گے:

ندانی نکتۂ دین عرب را　　کہ گوئی صبح روشن تیرہ شب را
اگر قوم از وطن بودے محمد　　ندادے دعوت ابی لہب را

... آگے چل کر یہی وطنیت دہریت کا سبب بنی۔ مولانا حسین احمد اس سادہ سی بات کو نہیں سمجھتے۔ وہ تاریخ سے ناواقف ہیں۔" (صفحہ ۱۶۲)

حضرت علامہ کے ملفوظات میں حضرت مدنی اور ان کے قومیت کے نظریہ پر بہت سا مواد ان میں شعر و شاعری کے علاوہ نثر و ملفوظ بھی بہت کچھ ہے صفحہ ۱۷۳، صفحہ ۱۸۶، صفحہ ۲۳-۲۰۷، صفحہ ۲۶۵ وغیرہ۔

اسی وطنیت، قومیت اور نسلی عصبیت کے حوالے سے حضرت علامہ نے مصطفیٰ کمال پاشا ۱۸۸۱ء کے بارے میں بھی اپنا وہی معروف تجزیہ پیش کیا ہے:

• وطنی قومیت اگرچہ اتحاد اسلامی کے خلاف سب سے بڑا خطرہ ہے۔ لیکن افسوس ہے ترک خود ہی اس تحریک کا شکار ہو گئے جو ان کے خلاف اٹھائی گئی تھی... مصطفیٰ کمال، کمال پاشا سے اتاترک بنے اور انجام کار ان کی تقلید میں ہر کہیں اسلام کی تعبیر نسلی اور وطنی

نقطۂ نظر سے ہونے لگی" (ص۳۲۶)

مولانا ابوالکلام آزاد کا تذکرہ ان کے ترجمان القرآن اور تفسیر کے حوالے سے الفاظ اقبال میں کیا جا چکا ہے۔ حضرت علامہ کو ان کے تفسیری نقطۂ نظر اور سیاسی موقف دونوں سے اختلاف تھا اور انہیں دونوں کے حوالے سے ملفوظات اقبال میں ارشادات حکیم الامت ملتے ہیں:

"مسلمان بڑے سادہ ہیں اس قسم کی تعبیریں قبول کر لیتے ہیں وہ نہیں سوچتے مولانا کہنا کیا چاہتے ہیں۔ کیا یہ کہ اسلام کی اس تعبیر کے پیش نظر جو انہوں نے "الدین" اور "الاسلام" کی شکل میں کی ہے مسلمان سیاست کو مذہب سے الگ رکھیں۔ اپنے لیے جداگانہ قومیت کا مطالبہ نہ کریں۔ اس گروہ بندی میں شامل ہو جائیں جس کی بنا اشتراک وطن پر ہے اور یہ سب قطع نظر اس تصور کے جسے ہندوستانی قومیت کے نام سے ابھارا جا رہا ہے اس لیے کہ ادیان اصلاً سب ایک ہیں (ص۳۰۰)

حضرت علامہ مولانا آزاد کے "غور و فکر میں لادین سیاست" کو کارفرما دیکھتے تھے (ص۳۰۰، ۳۰۹ نیز ص۳۰۲-۳۰۳) اور اسلام کے سیاسی نقطۂ نظر کے خلاف گردانتے تھے۔ یہی بنائے اختلاف و تبصرہ ہے۔ ورنہ ذاتیات پر بحث نہیں ہے[1]

اپنے ہم فکر و خیال شعراء میں وہ رومی کے معنوی شاگرد تھے اور ان سے کسب فیض کر کے گمرہی سے بچے رہے (ص۱۰۱) لیکن غالب کی عظمت کے بھی قائل تھے: "غالب واقعی بہت بڑا شاعر تھا... غالب کا کلام فارسی ہی میں ہے۔ غالب کا فارسی کلام پڑھیے اور ضرور پڑھیے۔ غالب کا

معارف: مولانا مدنی اور مولانا آزاد کے تعلق سے ڈاکٹر صاحب کے بعض خیالات غلط فہمی پر مبنی تھے جس پر متعدد اہل قلم پہلے لکھ چکے ہیں، معلوم ہوتا ہے مقالہ نگار نے ان چیزوں کو سامنے نہیں رکھا ہے، اسلیے ان کا تجزیہ یک رخا ہو گیا ہے۔

فارسی کلام بڑی چیز ہے ... لیکن محض پنشن میں اضافے کے خیال سے سرکار انگلشیہ کی مدح میں قصائد لکھنا بڑے افسوس کی بات ہے۔ غالب کی اس روش سے بڑا دکھ ہوتا ہے"۔ (ص ۲۷۸)

ملفوظات میں صاحب ملفوظات کی شخصیت و کردار، ان کے ترکیبی عناصر، ماضی حال اور مستقبل کی پرچھائیاں اور اوصاف و خصوصیات کے دوش بدوش کمزوریاں اور خامیاں اجاگر نہ ہوں ایسا ممکن نہیں ہے۔ حضرت علامہ کی بیماری آزاری، جسمانی کمزوری، فطری و خلقی کاہلی اور فلسفیانہ تصوراتی فضا کی جھلک بھی آجاتی ہے اور ان کے فکر و تدبر کی دنیا بھی جگ مگ کرنے لگتی ہے۔ یہ وسیع و عریض باب ہے جس کے صرف چند پہلو ہی پیش کیے جاسکتے ہیں۔ ان میں ان کے والد ماجد شیخ نور محمد، فرزند جاوید اقبال، ملازم علی بخش اور دوسرے ارکان خاندان کے علاوہ ان کے احباب و نفیس یا فتگان کی تصویریں بھی ہیں۔

حضرت حکیم الامت کے ارادۂ حج و سفر مبارک پر ایک ملفوظ ہے:

"ارادہ تو ہے بشرطیکہ صحت اجازت دے، ورنہ اب کے نہیں تو اگلے سال سہی، آگے جو اللہ کو منظور رہو ... ایک طرح سے تو میں حج ہی کے راستے میں ہوں۔ چاہتا ہوں یہ راستہ جلد طے ہو جائے ... یہ راستہ طے تو ہو جاتا ہے لیکن مجھے اپنے آپ پر قابو نہیں رہتا، میں تو اب جو کچھ کہتا ہوں وہیں کے لیے کہتا ہوں ... آستانہ اقدس پر پہونچ جاؤں تو کچھ اور بھی عرض کروں"۔ (ص ۳۰-۳۱)

مشہور واقعہ ہے کہ ڈاکٹر لوکس پرنسپل فارمن کرسچین کالج لاہور کے اس سوال کے جواب میں کہ کیا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر قرآن کریم مع الفاظ نازل ہوتا تھا، حضرت حکیم الامت نے فرمایا:

" یہ عبارت ہی اتری تھی ... میرا تجربہ ہے۔ مجھ پر پورا شعر اترتا ہے تو پیغمبر پر عبارت

کیوں نہیں اتری ہوگی ... جب شعر کہنے کی کیفیت مجھ پر طاری ہوتی ہے تو یہ سمجھ لو کہ ایک ماہی گیر نے مچھلیاں پکڑنے کے لیے جال ڈالا ہے۔ مچھلیاں اس کثرت سے جال کی طرف کھنچی چلی آرہی ہیں کہ ماہی گیر پریشان ہوگیا۔ سوچتا ہے کہ اتنی مچھلیوں میں سے کسے پکڑوں اور کسے چھوڑ دوں... یہ کیفیت تو مجھ پر سال بھر میں زیادہ سے زیادہ دو بار طاری ہوتی ہے لیکن فیضان کا یہ عالم کئی کئی گھنٹے طاری رہتا ہے اور میں بے تکلفی سے شعر کہتا چلا جاتا ہوں پھر عجیب بات ہے کہ جب طویل عرصے کے بعد یہ کیفیت طاری ہوتی ہے تو پہلی کیفیت میں کہا گیا آخری شعر، دوسری کیفیت کے پہلے شعر سے مربوط ہوتا ہے۔ گویا اس کیفیت میں ایک قسم کا تسلسل بھی ہے یا یوں کہنا چاہیے کہ یہ فیضان کے لمحے دراصل ایک ہی زنجیر کی مختلف کڑیوں کی حیثیت رکھتے ہیں۔ جب یہ کیفیت ختم ہوجاتی ہے تو میں ایک قسم کی تکان عصبی اضمحلال اور پژمردگی محسوس کرتا ہوں... ایک مرتبہ چھ سات سال تک مجھ پر یہ کیفیت طاری نہ ہوئی تو میں یہ سمجھا کہ خدا تعالیٰ نے مجھ سے یہ نعمت چھین لی ہے، چنانچہ اس زمانے میں میں نے نثر لکھنے کی طرف توجہ کی۔ یک بیک ایک روز پھر یہی کیفیت طاری ہوگئی ان لمحوں میں میری طبیعت ایک عجیب لذت محسوس کر رہی تھی۔ بس ایسا محسوس ہوتا تھا کہ اشعار کا ایک بحر موج ہے کہ اُمڈا چلا آتا ہے۔ یہ کیفیت سرور و نشاط اتنی دیر تک قائم رہی کہ اس نے چھ سات سال کے جمود و تعطل کی تلافی کر دی۔ مشہور جرمن شاعر گوئٹے کے متعلق ایک کتاب میں لکھا ہوا ہے کہ جب اس نے جرمن زبان میں قرآن کریم کا ترجمہ پڑھا تو اس نے اپنے بعض دوستوں سے کہا کہ میں یہ کتاب پڑھتا ہوں تو میری روح میرے جسم میں کانپنے لگتی ہے۔ اصل بات یہ ہے کہ شاعر کو بھی ایک قسم کا الہام ہوتا ہے۔ اس لیے جب وہ کوئی الہامی کتاب پڑھتا ہے تو اپنی روح کو اس کی معنویت سے ہم آہنگ پاتا ہے۔

اور اس کی طبیعت ایک خاص اہتزاز محسوس کرتی ہے۔ یہ چیز دوسرے لوگوں کو نصیب نہیں ہو سکتی"۔ (روزگار فقیر اول صـ۲۲-۲۱)

آخر میں خاتمۂ کلام اسی موضوع پر جس سے آغاز ہوا تھا: "صبح سویرے میں حسب معمول ن پاک کی تلاوت کر رہا تھا والد ماجد مسجد سے واپس آئے ... اپنے پاس بٹھا کر بڑی نرمی سے گے: بیٹا قرآن مجید وہی شخص سمجھ سکتا ہے جس پر اس کا نزول ہو، مجھے تعجب ہوا کہ حضور رسالتمآب ، اللہ علیہ وسلم کے بعد قرآن پاک کیسے کسی پر نازل ہو سکتا ہے .. تم اس کی تلاوت اس طرح و جیسے یہ تم پر نازل ہو رہا ہے۔ ایسا کرو گے تو یہ تمہاری رگ و پے میں سرایت کر جائے گا (اقبال کے حضور اول صـ۶۱-۶۰)

موصیات | حکیم الامت علامہ اقبال کے ملفوظات کی امتیازی خصوصیات کا تعلق علم و فضل، مطالعہ و مشاہدہ، غور و فکر، ادراک و شعور اور حکمت و فلسفہ کے علاوہ ادب و تہذیب اور فصاحت و بلاغت کے بہت سے پہلوؤں سے ہے اور یہاں بعض اہم خصوصیات کی طرف اشارہ کیا جا سکتا ہے۔

۱۔ حضرت اقبال کے ارشادات و ملفوظات کا دامنِ موضوعات اور دائرۂ عنا وین ن کے علم و فضل کی طرح وسیع ہے۔ اس میں مختلف موضوعات سمٹ آئے ہیں۔ قرآنیات، حدیث، فقہ، قانون، کلام، فلسفہ، منطق، سماجیات، معاشیات، ادب، تہذیب غرضیکہ وہ کونسا موضوع ہے جو ان کی گرفت یا دسترس سے باہر ہے۔ تبحر علمی اور وسعتِ معلومات کا یک بحرِ ناپیدا کنار ہے جو ہر آن ٹھاٹھیں مارتا نظر آتا ہے۔

۲۔ موضوعاتِ زیرِ بحث اور مضامین و کلام میں وہ جو کچھ فرماتے ہیں وہ وسیع مطالعہ مہرے مشاہدہ، ہمہ جہت شعور، غیر معمولی تدبر اور اسلامی حکمت کی بھٹی سے تپ کر نکلتا ہے

اور کندن ہوتا ہے۔ ان کا معمولی سا معمولی ملفوظ اور عام سا عام کلمہ بھی ان کے تدبر و تفکر اور تعقل کا زائیدہ و پروردہ ہوتا ہے۔

۳۔ ان کے ملفوظات و ارشادات کی اسلامیت ان کی ایک اور نمایاں خصوصیت ہے جو ان کی روح و بدن کی طرح شدید اسلامی عصبیت کی پیکر تھی۔ لڑکپن میں انھوں نے قرآن کریم کا جو مطالعہ کیا تھا وہ ان کی روح کی پنہائیوں میں، ان کے رگ و پے میں، ان کے دل و دماغ میں، ان کے وجدان و قلب میں الہام ربانی کی طرح سما گیا تھا۔ بعد کے مطالعۂ اسلامی نے ان کے قلب و جگر اور فکر و نظر اور زبان و بیان کو اسلامیت کے رنگ میں رنگ دیا تھا، موضوع، مضمون، خیال، فکر اور اظہار و ابلاغ کچھ بھی ہو وہ اسلامیت کی کسوٹی پر بھی پرکھے جانے کے بعد ہی زبان و قلم پر آتا تھا۔

۴۔ خلوص ان کی ایک اور اہم صفت ہے۔ ان کی پوری زندگی اخلاص سے عبارت ہے۔ ان کے ہاں دہرا معیار تھا نہ مداہنت و مسابقت کا شائبہ۔ وہ اندر باہر روح و جسم، زبان و قلب میں یکساں تھے۔ ان کی فکر و ادراک جو انہیں باور کرا دیتی تھی اسی کو وہ حرز جاں اور حفظ زباں بنا لیتے تھے۔ قرآنی الفاظ میں وہ جو کرتے تھے وہی کہتے تھے، وہ وادیوں میں نہیں بھٹکتے تھے، گمراہوں کے امام نہ تھے بلکہ وہ ان ایمان و عمل صالح والے شاعروں اور کاتبوں میں سے تھے جو کثرت سے یادِ الٰہی کرتے تھے اور مومن خالص تھے۔

۵۔ حکمت و فلسفہ ان کا خصوصی موضوع تھا مگر اس پر بھی اسلامی رنگ حاوی تھا۔ ان کے ملفوظات بھی حکیمانہ ہوتے تھے۔ کہا جا سکتا ہے کہ ان کو رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے عشق کی بدولت، ان کی پیروی کے صدقے اور ان کی شیفتگی کے طفیل میں جوامع الکلم سے

نوازا گیا تھا۔ ان کے ملفوظات میں حکمت و تعقل کا گہرا اثر نظر آتا ہے جو اسلامی حکماء کے فیضان کا نتیجہ بھی کہا جا سکتا ہے اور عطائے حکیم اول کی داد و دہش کا عطیہ بھی۔

۶۔ بایں ہمہ ان کے ہاں خاص کر ان کے ملفوظات میں ان کا انکسار علم، تواضع، فضل، اور خاکساری ذہن کا ایک نادر نمونہ نظر آتا ہے۔ اگر انہیں کسی چیز کا علم نہ ہوتا تو وہ اپنے ساتھیوں، شاگردوں اور دوسرے اصحاب علم و شرکائے مجلس سے استفسار کرنے میں جھجک نہ محسوس فرماتے تھے معلومات حاصل کرتے، ان کا تجزیہ کراتے، خود غور و فکر فرماتے اور پھر ارشادات سے ان کو آراستہ کرتے کہ یہی ہے انداز علم و فکر اور طرز اظہار و ابلاغ جو اہلِ علم پر سجتا ہے۔

۷۔ اقبال کے ملفوظات میں ایک دلکش، دل کشا اور دل آسا فضا ملتی ہے۔ قاری کو گھٹن کا احساس نہیں ہوتا صاحب ملفوظات ایسا محسوس نہیں ہوتا کہ اپنی شخصیت کی تشکیل و تعمیر کرنے یا اسے قد آدم سے زیادہ بڑا بنا کر دکھانے کی کوشش میں مصروف ہیں شخصیت سازی اور اظہار عظمت کا جذبہ کبھی کبھی تو صاحبِ ملفوظات میں ہوتا ہے اور اکثر و بیشتر جامع ملفوظات میں "پیراں نمی پرند مریداں می پرانیند" اور یہی شئے ہے جو فکری اور علمی گھٹن پیدا کرنے کی اہم ترین وجہ ہوتی ہے۔ طنز و ظرافت کے نمونے بھی اسی کا اظہار ہیں۔ ملفوظاتی طنز و ظرافت پر ایک کتابچہ لکھا جا سکتا ہے۔

۸۔ ملفوظات حکیم الامت میں تقشف و تشدد اور فکری و علمی عصبیت کا احساس بھی نہیں پیدا ہوتا۔ ایک وسیع القلبی، وسیع المشربی اور وسیع الفکری کی فضا نظر آتی ہے، وہ تحریکات، شخصیات، افراد، طبقات، تصورات، افکار غرضکہ ہر میدان میں کھلے دل و دماغ تازہ تر ذہن اور بالیدہ ترین فکر و ظرف کا ثبوت دیتے نظر آتے ہیں۔ بسا اوقات وہ مخالف

ومنکر کے نظریات وافکار کی تعریف وتحسین بھی کرتے ہیں باوجود اس کے کہ وہ اس سے کسی طرح متفق نہ تھے۔ البتہ وہ یہ ضرور چاہتے تھے کہ اس کے لیے اسلام یا کسی دوسرے اصول کا سہارا غلط انداز سے نہ لیا جائے۔

۹۔ مفکرِ اسلامی اور شاعرِ حکیم کی شخصیت اور اس کے ایک آئینہ دار ملفوظات کی غالب اہم ترین خصوصیت ان کی حق پرستی، صدق نوازی اور حقیقت پر دری ہے۔ وہ سچ بات کہنے، کہلانے اور اس کا اظہار کرنے میں نہ شخصیت کے قدوقامت کو خاطر میں لاتے ہیں نہ اس کے تبحر علمی کے سحر و شہرت کو اور نہ ہی دوستی، تعلق اور ذاتی ربط کو اس میں راہ دیتے ہیں، بسا اوقات انہوں نے تمام اعتراف عظمت وا قبال صلاحیت کے باوجود اپنے معاصرین اور متقدمین کی غلطیوں اور کمزوریوں کی گرفت کی ہے۔ کیونکہ ان کے سامنے صرف ایک معیار تھا۔ حق جو انہیں اسلام نے سکھایا تھا اور قرآن نے سمجھایا تھا اور رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے تعلیم کیا تھا۔

۱۰۔ شرافتِ کردار کی مانند حضرت اقبال کی تحریروں، نگارشات، شعرو شاعری میں شرافتِ قلم بھی تھی اور یہی شرافت اظہار بن کر ان کی زبانِ شرافت ترجمان سے پھول بن کر جھڑتی تھی۔ ان کا اختلاف وتنقید اور اعتراض ونقد بھی شرافت، تہذیب اور تادیب کے دائرہ سے خارج نہیں ہوتا ہے۔ وہ کسی مخالف کی کردار کشی نہیں کرتے، کسی طبقہ کے خلاف زہر نہیں اگلتے۔ تعریف میں قصیدہ نگاری نہیں کرتے، تحسین میں زمین آسمان کے قلابے نہیں ملاتے کہ وہ طیش میں خوفِ خدا رکھتے ہیں اور عیش میں یادِ خدا۔

ادبی اعتبار سے ملفوظات اقبال کا پایہ بہت بلند ہے اور کہا جا سکتا ہے کہ سادہ اسلوب، سادہ تر زبان اور سادہ ترین بیان میں سلاست وسادگی کا ایک بہترین نمونہ

پیش کیا گیا ہے۔ کلام اقبال کی طرح شان و شوکت، جاہ و جلال اور گھن گرج والے الفاظ ہیں نہ تراکیب اور ایسا گفتگو، کلام زبانی میں ممکن بھی نہ تھا اور اگر وہ اسلوب شاعری وہاں اختیار کیا جاتا تو تصنع اور آورد ہوتا جو ہر طرح سے تنفر آمیز ہوتا۔ مگر یہ بھی نہیں کہا جاسکتا کہ وہ حسن اسلوب اور جمالِ بیان سے عاری ہے۔ اس کا اسلوب سادہ ہے مگر دل نشیں و دلآویز۔

۱۲۔ لفظیات کے اعتبار سے دیکھا جائے تو واضح ہوتا ہے کہ ملفوظات اقبال میں ان کے منثور تحریر کی مانند ایک بھی سوقیانہ لفظ نہیں آتا۔ وہ سادہ مگر باوقار الفاظ استعمال کرتے ہیں۔ ان میں تنافر تو دور کی بات ہے اس کا شائبہ بھی نہیں ہوتا۔ تراکیب میں سادگی کے ساتھ کہیں کہیں ندرت بھی ملتی ہے۔ انگریزی کے الفاظ کا استعمال بھی کہ وہ ان جیسے تعلیم یافتہ شخص کے لیے تقریباً ناگزیر تھا۔

۱۳۔ ان کے ملفوظات کے جملے بالعموم چھوٹے چھوٹے ہوتے ہیں جو گفتگو اور زبانی کلام کی ایک خصوصیت ہے۔ ان جملوں میں سادگی و برجستگی ہوتی ہے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ فکر و تدبر کے سوتے سے بے ساختہ نکلے ہوں۔

۱۴۔ علامہ اقبال کے ملفوظات میں ایک اہم خصوصیت یہ نظر آتی ہے کہ وہ تشبیہات تلمیحات، استعارہ، کنایہ وغیرہ ادبی خصائص اور امتیازات کا استعمال بہت کم کرتے ہیں، کہیں کہیں تو ان کا در آنا ناگزیر ہے کہ اس کے بغیر ترسیل و ابلاغ ممکن نہیں ہوتا لیکن عموماً وہ براہِ راست اور بلا واسطہ انداز اور زبان میں اپنے مافی الضمیر کو بڑی خوبصورتی اور خوبی کے ساتھ سامعین کے سامنے پیش کرتے ہیں۔

۱۵۔ ارشادات اقبال میں تمام تر سادگی، سلاست اور مصنوعی آراستگی سے خالی ہونے

کے باوجود ایک قسم کی شاعرانہ نغمگی اور شعری موسیقیت بھی پائی جاتی ہے۔ ظاہر ہے کہ جس دماغ میں ہزاروں اشعار اور ان کے مفاہیم موجود ہوں، جس دل میں شاعر وطن کا نغمہ و آہنگ بسا ہوا ہو اس کی گفتگو، اس کا زبانی کلام اور اس کی بات چیت اس شاعرانہ نغمگی اور شعری موسیقیت سے کیسے محروم رہ سکتی ہے۔

مراجع

۱۔ سید نذیر نیازی، اقبال کے حضور، اقبال اکادمی پاکستان لاہور ۱۹۸۱ء اول ۲۔ ڈاکٹر ابواللیث صدیقی (مرتب) ملفوظات اقبال، اقبال اکادمی، پاکستان لاہور ۱۹۷۷ء ۳۔ فقیر سید وحید الدین، روزگار فقیر، لائن آرٹ پریس لاہور ۱۹۶۳ء۔ اول دوم ۴۔ ڈاکٹر ابواللیث صدیقی، ڈاکٹر اقبال اور مسلک تصوف، اقبال اکادمی پاکستان لاہور ۱۹۷۷ء ۵۔ مرزا محمد منور، میزان اقبال ۸۶/۱۹۸۲ء ایقان اقبال ۸۸/۱۹۷۷ء، برہان اقبال ۸۶-۱۹۸۲ء، اقبال اکادمی پاکستان لاہور ۶۔ سید نذیر نیازی مکتوبات اقبال، اقبال اکادمی، پاکستان لاہور ۷۷/۱۹۵۷ء ۷۔ رفیع الدین ہاشمی (الف) تصانیف اقبال کا تحقیقی و توضیحی مطالعہ، اقبال اکادمی لاہور ۱۹۸۲ء (ب) خطوط اقبال، دہلی ۱۹۷۷ء

۸۔ سید مظفر حسین برنی (مرتبہ) کلیات مکاتیب اقبال، اردو اکادمی دہلی، چار جلدیں ۹۰-۱۹۸۹ء ۹۔ رضی الدین صدیقی، ڈاکٹر اقبال کا تصور زمان و مکان، مجلس ترقی ادب لاہور ۱۹۷۳ء ۱۰۔ نقوش لاہور اقبال نمبر اول دوم ۱۹۶۲ء ۱۱۔ محمود نظامی (مرتب) ملفوظات اقبال (پندرہ مضامین کا مجموعہ) لاہور ۱۹۴۹ء ۱۲۔ وقار عظیم، اقبال معاصرین کی نظر میں، مجلس ترقی ادب لاہور ۱۹۷۳ء ۱۳۔ خواجہ عبدالحمید اقبال کے چند جواہر ریزے، لاہور ۱۹۶۱ء۔

شیخ عبد النبی شامی مدح

از جناب شیخ نذیر حسین صاحب

حضرت شیخ عبد النبی شامی گیارہویں صدی ہجری و بارہویں صدی ہجری / سترہویں صدی عیسوی کے ممتاز عابد و زاہد اور قوی النسبت بزرگ تھے۔ حضرت موصوف کا وطنی تعلق قصبہ شام چوراسی (ضلع ہوشیار پور، مشرقی پنجاب) سے تھا۔ شام کے ساتھ چوراسی (۸۴) کی نسبت کی بڑی وجہ یہ ہے کہ مغلوں کے زمانے میں شام کے اردگرد کے چوراسی گاؤں کا مالیہ شام میں جمع ہوتا تھا اور یہ مالیہ سرہند بھجوا دیا جاتا تھا۔ کیونکہ اس وقت شام سرہند شریف کی سرکار میں شامل تھا، انھوں نے وہاں ایک ہندو گھرانے میں جنم لیا تھا جس کے افراد مالیہ جمع کرانے پر مامور تھے، لیکن آپ نے اپنے مسلمان استاد کے فیض صحبت اور اپنے فطری ذوق اور اندرونی کشش سے اسلام قبول کرلیا اور آپ کا اسلامی نام عبد النبی رکھا گیا۔ آپ کے گھر والوں نے انہیں اسلام سے برگشتہ کرنا چاہا، لیکن آپ نے شدت سے انکار کر دیا، جس پر آپکو بہت سی تکلیفیں دی گئیں، آخر کار آپ کو گھر سے باہر نکال دیا گیا۔ آپ کی اہلیہ محترمہ بھی آپ کے ساتھ دائرۂ اسلام میں داخل ہوگئیں۔

دینی علوم کی تکمیل کے بعد جناب شامی صاحب پھرتے پھراتے سلطانپور لودھی (ضلع کپورتھلہ، مشرقی پنجاب) میں وارد ہوئے اور وہاں کے پیر طریقت حضرت حاجی

عبداللہ کے دامنِ عقیدت سے وابستہ ہوگئے اور سلسلۂ عالیہ نقشبندیہ سے منسلک ہوگئے، لیکن خرقۂ خلافت اپنے پیر بھائی حضرت حاجی سید محمد طاہر عالم پوری سے حاصل کیا اور ان سے فیض پایا۔ اس اثنا میں جناب شامی صاحب نے بڑی ریاضتیں اور مجاہدے کیے اور ولایت و طریقت کے اعلیٰ مدارج پر پہونچے۔ ان کی ولایت و جلالتِ شان پر اس زمانے کے لوگوں کا اتفاق ہے۔

شامی صاحب نے اپنی عمر کے آخری چالیس سال شام چوراسی میں بسر کیے اور اسلام کی تبلیغ و اشاعت اور لوگوں کی رشد و ہدایت میں مصروف رہے۔ ان کی تبلیغی مساعی سے سینکڑوں ہندو حلقۂ بگوشِ اسلام ہوئے۔ انھوں نے ایک درسگاہ اور لنگر خانہ بھی جاری کیا تھا جہاں سے عوام و خواص کھانا کھایا کرتے تھے۔ مولانا عبدالحئی رائے بریلوی نے نزھۃ الخواطر میں لکھا ہے" شامی صاحب جلیل القدر رہنمائے طریقت تھے، انھیں سالکانِ طریقت کی تعلیم و تربیت میں کمال حاصل تھا، اپنے مریدوں کو راہِ سلوک کی منزلیں طے کرا کے اعلیٰ مدارج پر پہونچا دیتے تھے۔ ذ طریقۂ احسنیہ نقشبندیہ کے متقصد تھے۔ کتابوں میں ان کی بہت سی کرامتیں اور کشوفات مذکور ہیں (نزہۃ الخواطر، ج ۶، ششم، ص ۱۷۰ - ۱۷۱، مطبوعہ حیدر آباد دکن)۔ ان دینی مشاغل کے علاوہ وہ خدمتِ خلق میں بھی مصروف رہا کرتے تھے۔ اور مزدوروں کے کام میں مدد دیا کرتے تھے، انھوں نے ۱۱۴۶ھ/ ۱۷۳۳ء میں انتقال کیا۔ ان کے مریدوں و مداحوں نے عربی و فارسی میں ان کے مراثی لکھے ہیں۔

شیخ عبدالنبی شامی شدید دینی مصروفیات کے باوجود تصنیف و تالیف ے

لچسپی رکھتے تھے۔ شاہ ولی اللہ محدث دہلوی نے انتباہ فی سلاسل اولیاء
ں شامی صاحب کے ایک مکتوب لطیف کا ذکر کیا ہے۔ انہوں نے فصوص الحکم
ایک شرح لکھی ہے جو آج کل شاید ناپید ہے۔ آپ کے مکتوبات مجموعۃ الاسرار
نام سے مشہور ہیں (ان کا اردو میں ترجمہ ہوچکا ہے اور عرفان و تصوف اور
لہیات کے مختلف مسائل سے بحث کرتے ہیں رحمۃ اللہ علیہ۔ جناب
امی صاحب کا مزار مبارک آج بھی شام چوراسی میں موجود ہے اور مرجع خلائق ہے
یک ہندو بزرگ مزار کی نگرانی کرتے ہیں۔

اخذ: (۱) شاہ ولی اللہ: الانتباہ فی سلاسل الاولیاء (۲) عبدالحئی
ائے بریلوی: نزھۃ الخواطر، جلد ششم، ص ۱۷۰-۱۷۱) (۳) وجیہ الدین
شرف لکھنوی، بحر ذخار (۴) محمد فاضل الدین شاہ قادری بٹالوی، شرائف غوثیہ
۵) شاہ محمد غوث لاہوری، اسرار طریقت (۶) محمد سلیم شامی، تذکرہ تاج العارفین
قطب الاقطاب حضرت شیخ عبدالنبی شامی نقشبندی۔

بزم صوفیہ

از جناب سید صباح الدین عبدالرحمن صاحب

اس میں تیموری عہد سے پہلے کے ہندوستان کے مشہور صوفیائے کرام کا تذکرہ ہے جنہوں نے
اپنے عہد کے مسلمانوں کے مذہب، اخلاق، معاشرت اور سیاست کو سنوارا اور اسلام کی معنوی
شوکت وعظمت قائم کی۔ عام طور سے یہ غلط فہمی ہے کہ خواجگان چشت کی تعلیمات میں رنگینی
و سرمستی اور نغمہ و سرور کی آواز سنائی دیتی ہے لیکن اس کتاب کے مطالعہ سے یہ خیال
زائل ہوجائے گا۔

قیمت ۱۱۵ روپے۔ ص ۲۴۶

آنند نرائن ملا کی مجاہدانہ اردو خدمات

از

ڈاکٹر عبدالرشید ظہیری۔

اردو کے ممتاز شاعر اور نثر نگار آنند نرائن ملا مظلوم اردو زبان کی حمایت میں برابر سرگرم رہے اور اس حیثیت سے انہوں نے جو کارنامے انجام دیے وہ ناقابلِ فراموش ہیں۔ ۱۹۶۴ء میں جے پور کی آل انڈیا اردو کانفرنس میں خطبۂ صدارت دیتے ہوئے فرمایا:

"میں مذہب چھوڑ سکتا ہوں لیکن زبان نہیں چھوڑ سکتا ہوں کیونکہ زبان میری ذات کا آئینہ ہے، میری میراث ہے، میری تاریخ ہے اور میری زندگی ہے۔"

ملا کی مادری زبان اردو تھی اور وہ ہندی نہیں جانتے تھے، اپنی اس مادری زبان کو ایک قیمتی متاع سمجھکر ہمیشہ سینے سے لگائے رہے اور اس کو اس کا جائز حق اور قانونی درجہ دینے کے لیے وہ ہمیشہ سعی بلیغ سے کام لیتے رہے۔ اپنی نثری کتاب "کچھ نثر میں بھی" کی رسم اجرا کے موقع پر انہوں نے کہا تھا کہ:

"میں نے ہزاروں مقدمات کی پیروی کی ہے اور بعض بہت ہی کمزور مقدموں میں بھی مجھے فتح حاصل ہوئی ہے لیکن اردو کا مقدمہ ایسا ہے جو میری زندگی کے تمام مقدمات میں سب سے زیادہ جاندار ہے لیکن اس میں ابھی تک مجھے ناکامی ہی کا منہ دیکھنا پڑا ہے اور تاریخوں پہ تاریخیں لگتی چلی جارہی ہیں۔" (ہماری زبان: یکم فروری ۱۹۶۶ء)

ہندوستان کی مختلف ریاستوں میں قائم شدہ اردو اکیڈمیاں ترقی اردو بیورو، اردو گھر اردو یونیورسٹی کے علاوہ اترپردیش بالخصوص بہار میں اردو کو جو سرکاری درجہ اور مراعات ملے وہ ملا کے خواب کی تعبیر ہی نہیں بلکہ مختلف محاذوں پر اردو کے لیے ان کی ستر سالہ غیر معمولی جدوجہد کا ثمرہ ہے۔ ۴۸ سال پہلے انہوں نے اردو سے متعلق حسب ذیل اشعار کہے تھے ؎

قطعہ ؎ یہ سانحہ چہل و نو میں جو ہوا　　ہندی کی چھری تھی اور اردو کا گلا
اردو کے رفیقوں میں جو مقتول ہوئے　　ملا نامی سنا ہے شاعر بھی تھا

رباعی ؎ اک موت کا جشن منالیں تو چلیں　　پھر پونچھ کے اشک مسکرالیں تو چلیں
آ تجھکو گلے لگا کرائے مٹتی ہوئی اردو　　اک آخری گیت اور گالیں تو چلیں

ملا کے قلم سے نکلا ہوا ایک ایک لفظ درد، تڑپ اور کرب میں ڈوبا ہوا ہے۔ ان اشعار میں اردو کے عروج و زوال کی مکمل داستان بیان کی گئی ہے مگر ملا یہ مرثیہ کہہ کر خاموش نہیں ہوگئے تھے بلکہ اردو کو اس کا صحیح مقام دلانے کے لیے حتی الامکان جدوجہد کرتے رہے۔ ملا کی اردو کی مجاہدانہ خدمات کی کہانی شروع سے آخر تک بے لوث اور مخلصانہ رہی۔

دراصل اردو زبان کو فروغ دینے میں دو طرح کے لوگوں کے نام ہیں۔ پہلی قسم ان لوگوں کی ہے جو اپنی شہرت و ناموری اور بعض ذاتی فائدوں کے لیے اردو تحریک سے وابستہ ہوگئے ہیں، ایسے لوگوں کی فہرست طویل ہے۔ دوسری قسم ان لوگوں پر مشتمل ہے جو ذاتی غرض و شہرت سے بے نیاز اردو زبان کو اپنا دین و ایمان بنائے ہوئے ہیں، مخلصین کے اس گروہ میں چند ہی افراد نظر آئیں گے۔ جن میں ملا کا نام سرفہرست ہے۔

ناساعد حالات کے باوجود اردو کے لیے ان کی سرفروشانہ جدوجہد کی عکاسی ان کی مشہور نظم "مجاہد" سے ہوتی ہے جو ان کے مجموعہ "سیاہی کی ایک بوند" میں شامل ہے اور جب یہی موضوع ان کی غزل کا جز بنتا ہے تو اس میں ایک عجیب لطافت اور دلآویزی پیدا ہو جاتی ہے ؎

اردو زبان غیر ہے شوق سے کہیے — ملاؔ سے آکے لیکن نگاہیں ملائے تو

بزمِ ادبِ ہند کی ہر گل میں ہے خوشبو — ملاؔ گلِ اردو کی مہک اور ہی کچھ ہے

ملا بنا دیا ہے اسے بھی محاذِ جنگ — اک صلح کا پیام تھی اردو زباں کبھی

ملا اردو کو مقدس ماں کی طرح سمجھتے تھے۔ کوئی سپوت اس بات کو برداشت نہیں کر سکتا کہ کوئی اس کی ماں کو اس سے چھین لے یا اس کا چہرہ (رسم خط) مسخ کرنے کی کوشش کرے ؎

لب مادر نے ملاؔ لوریاں جس میں سنائی تھیں :: وہ دن آیا ہے اب اسکو بھی غیروں کی زباں سمجھو

اردو رسم خط سے متعلق جامعہ اردو کے خطبۂ صدارت کے یہ الفاظ سننے کے قابل ہیں:

"آج کچھ حلقوں میں سنجیدگی سے یہ سوال اٹھایا جا رہا ہے کہ قومی یک جہتی حاصل کرنے کے لیے یہ بہتر ہوگا کہ اردو ہندی رسم الخط اختیار کرے۔ جو لوگ نیک نیتی سے یہ رائے دیتے ہیں وہ یہ بھول جاتے ہیں کہ زبان اور رسم الخط کا تعلق جسم اور پوشاک کا نہیں بلکہ جسم اور کھال کا ہے جو جسم کا رنگ بھی متعین کرتی ہے اور اس کی ساخت پر بھی اثرانداز ہوتی ہے۔ اردو رسم الخط نے اردو زبان کا اس کی تمام ارتقائی منازل میں ساتھ دیا ہے اور اب یہ دونوں اس طرح ہو چکے ہیں کہ ایک دوسرے سے جدا نہیں کیے جا سکتے۔"

ملا صاحب ہمیشہ حکومت کے ارباب حل و عقد کو متنبہ کرتے رہے کہ وہ ہندی میں اردو کے

جبر اجذب و انضمام کی کوشش سے باز آجائیں۔ زبان دفتروں اور اسکولوں میں نہیں بنتی یہ بازاروں اور چوراہوں پر بنتی ہے۔

سہ لسانی فارمولوں کے تحت جب حکومت نے ثانوی اسکولوں میں جنوبی ہند کی زبان کے ساتھ سنسکرت کو بھی شامل کر دیا تو اس موقع پر بھی وہ خاموش نہیں رہ سکے۔ رقمطراز ہیں:

"مجھے سنسکرت سے کوئی پرخاش نہیں لیکن وہ زبان جس میں پچھلے ہزار سال سے کوئی قابل قدر کتاب نہ لکھی گئی ہو اسے زندہ زبانوں میں شمار کرنا سیاسی معجزہ تو ہو سکتا ہے لیکن لسانی حقیقت کبھی نہیں ہو سکتی۔ زندہ زبان وہ ہوتی ہے جو ہمارے ساتھ سوتی ہے، ہمارے ساتھ جاگتی ہے اور ہمارے ساتھ چلتی پھرتی ہے۔" (خطبۂ صدارت ریاستی سہ لسانی کنونشن، یوپی)

آنند نرائن ملاّ اردو کی لڑائی ہمیشہ تین محاذوں (۱) عوامی محاذ (۲) تنظیمی محاذ (۳) آئینی محاذ پر لڑتے رہے اور اسی پر سب کو عمل کرنے کی دعوت دیتے رہے۔ ملاّ صاحب نے ان مسلمانوں کو بھی متنبہ کیا ہے جو اردو کو صرف اپنی زبان سمجھتے تھے۔ دراصل زبانیں کسی کی میراث اور جاگیر نہیں ہوتیں، یہانتک کہ عربی جو مسلمانوں کی مذہبی زبان ہے یا سنسکرت جو ہندوؤں کی زبان سمجھی جاتی ہے ان دونوں پر بھی ان دونوں قوموں کا کوئی اجارہ نہیں ہے۔ پس جس طرح ہندی صرف ہندوؤں کی زبان نہیں اسی طرح اردو بھی صرف مسلمانوں کی زبان نہیں ہے، ملا صاحب فرماتے ہیں کہ:

"اردو کو اس کا صحیح اور جائز مقام کیوں نہیں مل رہا ہے۔ اسلیے کہ حکومت کے فیصلے اس بات پر نہیں ہوئے کہ کیا حق ہے اور کیا ناحق، کیا جھوٹ ہے کیا سچ، کیا جائز ہے

اور کیا ناجائز؟ حکومت کا کوئی اصول نہیں ہوتا۔ وہ تو صرف یہ دیکھتی ہے کہ دباؤ کس طرف سے زیادہ پڑ رہا ہے اس کے فیصلے مصلحتوں پر مبنی ہوتے ہیں، ہندی کا دباؤ بڑھتا جا رہا ہے اس لیے حکومت اردو کے حق کو نظر انداز کرتی ہے"۔

انجمن ترقی اردو ہند دہلی، اتر پردیش اردو اکادمی لکھنؤ اور پارلیمانی اردو کمیٹی کے صدر، فخر الدین علی احمد میموریل کمیٹی لکھنؤ کے چیرمین اور ترقی اردو بورڈ بھارت سرکار کے نائب صدر، ساہتیہ اکادمی دلی کی مجلس عاملہ کے ممبر کی حیثیت سے بھی انہوں نے اردو کی مخلصانہ خدمت انجام دی ہے، وہ اپنی گوناگوں مصروفیتوں کے باوجود مرتے دم تک اردو کے کاز کو آگے بڑھاتے رہے، مرکزی اور ریاستی حکومتوں کے اعلیٰ افسروں اور سربراہوں سے مل کر وہ اردو کے مسائل حل کرنے کی فکر کرتے اور اسے دوسری سرکاری زبان بنانے کے سلسلے میں کچھ یہ سے منر نامے پیش کیے اور اسے عملی جامہ پہنانے کی بھی کوشش کی۔ اردو کے جن اداروں اور انجمنوں سے وہ وابستہ رہے ان کے جلسوں میں اردو کی ترویج و اشاعت کے سلسلے میں بنیادی مسائل کی جانب توجہ مبذول کرنے پر زیادہ زور دیتے اور اگر وہ ان اداروں اور اکادمیوں کی کوتاہیاں دیکھتے تو رضاکارانہ طور پر ان سے مستعفی ہو جاتے۔

آنند نرائن ملا آزادی کے بعد ہندوستان میں اردو تحریک کے ان قافلہ سالاروں میں تھے جنھوں نے بڑے پرآشوب اور نازک حالات میں اسے پورے جوش و خروش کے ساتھ اپنے حقوق کی بازیابی کی منزل کی طرف گامزن رکھا۔ تشدد اور خوف کی فضاؤں میں بھی اردو کے پرچم کو سرنگوں نہ ہونے دیا۔ انہوں نے ہر وہ طریقہ اختیار کیا جس میں تشدد کو ذرا بھی دخل نہ تھا۔ ملا کی پوری زندگی شعر و ادب اور اردو کی خدمت میں گزری، وہ ایک شاعر کے ساتھ اردو کے ایک عظیم مجاہد بھی تھے۔

کی مصلحت وقت سے اس نے نہ کبھی صلح ملا کے سے دو چار ہی دیوانے ملیں گے

اخبار علمیہ

ملکہ سبا کا عہد حکمرانی قریباً تین ہزار سال قدیم ہے، تورات، انجیل اور قرآن مجید میں ان کے ذکر کی وجہ سے ان کی شخصیت میں مورخوں اور ماہرین آثار و حفریات کیلئے خاص کشش ہے، لیکن اب جنوب عرب کے دو ملکوں یعنی یمن اور حبشہ کے درمیان یہ پُرانا تنازعہ پھر شروع ہوا ہے کہ ملکہ سبا کا تعلق کس کی سرزمین سے ہے؟ گذشتہ دنوں کلکتہ کے اخبار اسٹیٹسمین میں میکائیل بنیان اور فلپ ہوورڈ کی تحریروں سے معلوم ہوا کہ اب اس تنازعہ میں شدت آرہی ہے، حبشہ کے سابق بادشاہ ہیل سلاسی کا اصرار تھا کہ ملکہ سبا ان کے خاندان کی مورث اعلیٰ ہیں، ان کا وطن حبشہ کا ایک شہر اکسوم ہے اور وہ اس ملک میں ماکیدہ کے نام سے معروف ہیں، اب یہ بھی کہا جارہا ہے کہ یہ روایت یوسیفوس کے زمانہ سے قرون وسطیٰ تک یورپ میں مسلم رہی ہے کہ ملکہ افریقی نژاد تھی، تائید میں بعض ان قدیم تصاویر کو بھی پیش کیا جاتا ہے جن میں ملکہ ایک افریقی غلام کے ہمراہ نظر آتی ہے، یہ روایت بھی دلیل میں پیش کی جاتی ہے کہ ملکہ کا پیر ناقص اور عیب دار تھا جس کو وہ ہمیشہ اپنے لمبے گاؤن میں چھپائے رکھتی تھی، حضرت سلیمانؑ بھی اس کے بارے میں اس قدر متجسس تھے کہ ملکہ کی آمد پر انہوں نے خاص طور پر ایسا بلورین فرش بنوایا کہ ملکہ نے اسے آب جو سمجھ کر پائینچے اٹھاکر اس پر قدم رکھا اور تب یہ راز کھلا کہ اس کے پاؤں پر بال تھے۔ لیکن یمن والوں کا

دعویٰ ہے کہ ملکہ جب حضرت سلیمانؑ سے ملنے یروشلم گئی تو اس نے سونے اور جواہرات کے ایسے خزانے پیش کیے جن کے لیے یمن اپنے تجارتی مرکز ہونے کی وجہ سے مشہور تھا، لندن میں یمن کے سفیر ڈاکٹر حسین العامری نے کہا ملکہ بالیقین یمنی ہے گو اساطیر سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ یروشلم سے یمن واپس ہوتے ہوئے سرزمین حبشہ سے گزری تھی، انھوں نے آکسفورڈ اور کیمبرج کے شعبۂ تاریخ عرب کے اساتذہ سے اس موضوع پر مزید تحقیق کی فرمائش کی، ماضی میں پروفیسر فیڈی بیسٹن اور پروفیسر باب سرجنٹ نے یمنی کتبات کی تحقیق میں عمریں کھپا دی تھیں ۱۹۵۲ء میں امریکہ کے ایک ماہر حفریات وینڈل فلپس نے مارب میں سبا کے معبد قمر کی تلاش بھی شروع کی تھی، لیکن بعد میں یمن جب کمیونسٹ حکمرانوں کے عہد میں بدامنی اور خانہ جنگی میں مبتلا ہوا تو ان تحقیقات پر بھی پابندی عائد کر دی گئی، اب موجودہ حکومت نے پھر محققین کو دعوت دی ہے اسلیے ماہرین اب جوق درجوق وہاں پہونچ رہے ہیں، حبشہ میں اکسوم میں بھی ماہرین کو بیے آثار اور ہڈیاں ملی ہیں جن کو ملکہ سبا کے باقیات کا نام دیا جارہا ہے، ادھر یمن تمام قابل سیاحت مقامات اور وہاں کے دارالحکومت کے سب سے بڑے ہوٹل ام ملکہ سبا سے موسوم کیے گئے ہیں، یمنی محققین کے دعوے اور تحقیقات کی بنیاد ن مجید کے بیانات ہیں، البتہ اسٹیٹسمین کی تحریروں میں قرآن مجید کے حوالہ سے یہ سبا کا نام بلقیس بتایا گیا ہے جو صحیح نہیں، قرآن مجید میں نام کی وضاحت نہیں ہے نس مولانا سید سلیمان ندویؒ کی کتاب ارض القرآن کی تحقیقات ان جدید محققوں ثیں نظر رہتیں جنھوں نے اس صدی کے اوائل میں ثابت کیا تھا کہ ملکہ کا افریقی نژاد نطعی غلط ہے اور مشرقی جنوب یا حبشہ کے دعویٰ سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ یہ

سبا کے مقامات تھے تاہم اصل مرکز کے لحاظ سے وہ یمن ہی کی کہی جائے گی۔

قرآن مجید کی صداقت اور اس کے تاریخی بیانات کی روشنی ہر دور کے صاحب فکر وتدبر اور اولی الالباب کے لیے منارۂ نور ہے، شکر ہے کہ اس کتاب مبین سے مسلمانوں کے خاص تعلق اور شغف کی خبریں مسلسل آتی رہتی ہیں، لندن کے معاصر رسالہ امپیکٹ سے معلوم ہوا کہ گذشتہ دنوں ملیشیا کے کارگذار وزیر اعظم انور ابراہیم نے مالے رسم الخط اور نقش و نگار سے مزین قرآن مجید کی کتابت و طباعت کا افتتاح خود بسم اللہ لکھ کر کیا، امید ہے تین سال میں یہ شاندار مصحف مطبوع ہوگا، اس سے پہلے انڈونیشیا کے پچاس سالہ جشن آزادی کے موقع پر وہاں کے صدر سوہارتو نے ۱۹۹۱ء میں قرآن مجید کے ایک خاص نسخہ مصحف استقلال کی کتابت و طباعت کا افتتاح کیا تھا جو ۱۹۹۵ء میں اس شان سے مکمل ہوا کہ اب اسے دنیا کے سب سے بڑے مصحف ہونے کا اعزاز حاصل ہے، اس کی کتابت کی سعادت انڈونیشیا کے ایک عالم خطاط کیائی حاجی ... کے حصہ میں آئی، یہ مصحف استقلال کی برکت تھی کہ اس کی تکمیل کے دو سال بعد اب وہاں بیت القرآن اور میوزیم استقلال کی تشکیل میں دو نہایت عظیم الشان قرآنی ادارے بھی وجود میں آگئے اور درست کہا گیا کہ میوزیم استقلال اگر ماضی کی عظمتوں کا امین ہے تو بیت القرآن مستقبل کی شوکت و سطوت کا حامل ہے، امپیکٹ لندن نے ان دونوں کے متعلق ایک مفصل روداد شایع کی ہے، آیندہ اس کا ذکر کیا جائے گا، ہم ان دونوں حکومتوں کو مبارکباد پیش کرتے ہوئے اسی توقع پر آمین کہتے ہیں جس کا اظہار رسالہ مذکور نے کیا ہے کہ قرآن مجید کی یہ فنی خدمات قابل قدر اور ہر مسلمان کے لیے باعث افتخار ہیں لیکن حکومت و سلطنت کے امور میں بھی ہمارے حکمرانوں کے لیے یہی مصحف کامل

ان کا سرمایہ ہدایت ہونا چاہیے۔

استقلال اور آزادی کا پچاس سالہ جشن ہندوستان میں بھی بپا ہے، نصف صدی کے ہندوستان کی تصویر میں بدعنوانی، غیر ذمہ داری، حق تلفی اور ہوس مال وزر کے داغ اس کثرت سے ہیں کہ یہی اصل خدوخال بن کے نمایاں ہیں، حکومت اور انتظامیہ کی ہر سطح عیب دار نظر آتی ہے، گذشتہ دنوں اس میں ایک اور اضافہ کا علم ہوا جس کو عہد رواں کے بدترین علمی فضیحتے سے تعبیر کیا گیا، انڈین کونسل آف ہسٹاریکل ریسرچ (ICHR) مرکزی حکومت کا اہم ادارہ ہے جیسا کہ نام سے ظاہر ہے یہ خاص تاریخی تحقیق کی غرض سے قائم کیا گیا ہے، اگست ۱۹۷۳ء میں اس نے 'آزادی کی جانب' نامی ایک منصوبہ تیار کیا، مقصد یہ تھا کہ تحریک آزادی کے آخری دہے کی مکمل تاریخ دس جلدوں میں مرتب کی جائے، برطانوی حکومت نے بھی یہی کام کیا تھا اور ۱۹۴۳ء سے ۱۹۴۷ء تک کے واقعات کو مرتب کرکے ان کو تبدیل اقتدار کے طور پر پیش کیا تھا یعنی بجائے جدوجہد آزادی کے یہ محض انتظامیہ اور اقتدار کی ہموار اور سہل منتقلی تھی، اس کے جواب میں حکومت ہند کی خواہش تھی کہ ان واقعات کو تحریک آزادی کے پس منظر میں پیش کیا جائے، یہ منصوبہ پانچ سال کی مدت کا تھا اور اس میں ایس گوپال، مشیرالحسن بپن چندر، روند کمار، سمیت سارکر، پارتھا سارتھی گپتا اور کے، این پانیکر جیسے مشہور مورخوں کے نام شامل تھے، لیکن پانچ سال گذر جانے کے بعد جب نتیجہ صفر رہا تو متعدد توسیعات کی گئیں، بالآخر مارچ ۱۹۹۲ء میں اس منصوبہ کی مالی امداد روک دی گئی لیکن اس وقت تک دو کروڑ روپے خرچ کیے جاچکے تھے اور عوض میں صرف ایک جلد شایع ہوسکی تھی وہ بھی اس درجہ ناقص، ژولیدہ اور کج مج تھی کہ اس کو بیکار قرار دینا

پڑا، اب الزامات اور ان کی صفائی کا سلسلہ قائم ہے، ادارہ نے شکوہ کیا کہ اس منصوبہ کو ذاتی علمی مشاغل کے لیے استعمال کیا گیا، مواد کی فراہمی کے لیے برطانیہ کے دورے کیے گیے، حالانکہ منصوبہ کے مطابق صرف ہندوستانی مآخذ کی ضرورت تھی اور یہ ہندوستان میں دستیاب تھے، ایک الزام یہ بھی ہے کہ بعض لوگوں نے جس مواد کو پیش کیا ہے ان کا زیادہ حصہ خود ان کی دوسری کتابوں سے ماخوذ ہے، بعض محققین جو عارضی طور پر تھے اور جن کی کارکردگی نہایت ناقص تھی ان کو مستقل اسٹاف کی حیثیت دی گئی اور ستم یہ کہ ان کو پے دانۂ ترقی بھی عطا کر دیا گیا۔ اب یہ ادارہ اپنی آبرو بچانے کے لیے کوشاں ہے اور چاہتا ہے کہ کم از کم چند علامتی قسم کی جلدیں ہی اسی سال شایع ہو جائیں لیکن ٹائمز آف انڈیا کے مطابق اس قسم کا ایک وعدہ ۹۳ء میں اس وقت کے صدر نشین پروفیسر عرفان حبیب نے بھی کیا تھا جو شرمندۂ تکمیل ہی رہا اور اب موجودہ صدر نشین S. SETTAR نے بھی وعدہ کیا ہے کہ سال کے آخر تک کم از کم پانچ جلدوں کے چھپنے کی توقع ہے، لیکن خود ادارہ کے بعض ذمہ دار اس خوش فہمی سے متفق نہیں، ایک نے کہا کہ اس سے بحث نہیں کہ کیا پک رہا ہے، سوال یہ ہے کہ دسترخوان پر کیا پیش کیا جاتا ہے؟

گذشتہ جولائی میں ایک امریکی خلائی گاڑی جمعہ کے روز مریخ کی سطح پر جا اتری اور تین سو دس ملین میل کا یہ ناقابل تصور سفر کامیابی سے ہمکنار ہوا تو سائنسدانوں کی خوشی بھی ہمدوش ثریا بن گئی کسی نے کہا افسانہ آج حقیقت بن گیا کسی نے اپنی خوشی اور جشن کو پہلا بین السیاراتی جشن قرار دیا، گذشتہ ربع صدی سے مریخ پر کمندیں ڈالنے کا سلسلہ جاری تھا اور غیظ و غضب کی خصوصیات اور سرخ سیارہ سے معروف یہ ستارہ

کسی ارضی پیام کو قبول کرنے سے انکار کرتا رہا، تقریباً بیس مشن روانہ کیے گئے، بعض جیسے مارس آبزرور بالکل ناکام رہے، بعضوں نے کچھ اشارے تو کیے لیکن مبہم سے، گذشتہ دسمبر سے پاتھ فائنڈر نامی خلائی گاڑی کی تیاری زور و شور سے جاری تھی، یہ گاڑی دراصل ان دس خلائی جہازوں کا پہلا حصہ ہے جو آیندہ دس برسوں میں مریخ کے لیے تیار کیے جارہے ہیں، پاتھ فائنڈر راہ پا ہوا اور اس کے روبوٹ نے جس کا نام جہانیاں جہاں گشت رکھا گیا تھا، اپنے متحرک کیمرہ کی مدد سے تصویریں بھیجنا شروع کیں، پاتھ فائنڈر اس مقصد سے بھیجا گیا تھا کہ سطح مریخ کی ارضیاتی ساخت کا تجزیہ کیا جائے، لیکن حسن اتفاق سے اس کے روبوٹ نے جو واضح اور صاف تصویریں بھیجیں ان سے معلوم ہوا کہ گاڑی کے آس پاس چٹانیں بکھری ہوئی ہیں، یہ گاڑی ایک محدود دائرہ میں ان چٹانوں کے درمیان چلتی پھرتی رہتی ہے، اس کی بیٹری شمسی توانائی سے چلتی ہے، چنانچہ دن میں یہ متحرک رہتی ہے لیکن رات میں کمپیوٹر چلانے، موسم کی تفصیلات اور تصویریں حاصل کرنے میں بھی یہ بیٹری خاصی خرچ ہوجاتی ہے، اب سائنسداں اس بیٹری کو زیادہ دیر تک قابل استعمال بنانے میں مصروف ہیں، بہر حال اب تک جو تصویریں آئی ہیں ان میں فضا کے گرد و غبار، مریخ سے نظر آنے والے ستاروں، مریخ کے چاند فوبوس اور طلوع و غروب آفتاب کے منظر بھی شامل ہیں، مریخی چٹانوں کا رنگ سرخ، سفید اور نیلا ہے، سفید رنگ عموماً چٹانوں کے بالائی حصہ میں ہے، قیاس ہے کہ یہ ایک ٹھوس معدنی شئے CALICH ہے کیلشیم اور کاربونیٹ کا یہ حجری معدن ایریزونا کے علاقہ میں عام ہے، لیکن اصل توجہ سرخ اور نیلے رنگوں پر مبذول ہے، ان دونوں میں واضح فرق ہے، پروفیسر اسمتھ کا کہنا ہے کہ نیلا رنگ ان چٹانوں کے مشرقی سمت ہے، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ انتہائی تیز و تند طوفانوں سے چھل کر صاف ہوا لیکن جس حصہ کو

طوفانی ہواؤں نے براہ راست متاثر نہیں کیا وہ سرخ ہی ہے اور یہی مریخ کا اصل رنگ ہے، ان طوفانوں کے متعلق گمان ہے کہ یہ کیسی عظیم ترین شکل میں تھا یا پھر یہ بتدریج لاکھوں کروروں سال مسلسل چلتی رہنے والی ہوا بھی ہوسکتی ہے، مریخ کی زمین سے متعلق اب تصاویر کی مدد سے بتایا گیا کہ یہ تین طرح کی ہے، ایک تو پسی ہوئی ساحلی ریت کی طرح ہے دوسری کچی اینٹ کے مانند ٹھوس اور تہہ در تہہ ہے اور تیسری سفوف اور گرد جیسی ہے، سطح پر جا بجا جوہڑ کے باقیات نظر آتے ہیں، جہاں شاید اربوں سال پہلے پانی بخارات میں تحلیل ہو کر غائب ہوگیا، یہ استخوان خشک کی طرح ہے، ایسی خشکی کرۂ ارض پر کہیں نہیں۔ تصویروں میں مریخ کے آسمان پر بھی بادل ہیں، ممکن ہے یہ پانی سے پُر ہوں، مریخ کی صبح کی تصویروں میں آسمان پر ہلکے نحاسی رنگ بھی ظاہر ہیں، اسمتھ کے خیال میں یہ پانی کے ابخرے ہیں لیکن جوں جوں دن چڑھتا ہے یہ بادل جل کر غائب ہو جاتے ہیں، یہ بھی معلوم ہوا کہ مریخ میں طلوع و غروب آفتاب کا عمل زمین کے مقابلہ میں دیر تک اور زیادہ روشن رہتا ہے اور یہ فضا میں غبار کی نسبت سے ہے۔

مریخ پر پاتھ فائنڈر کے کامیاب نزول سے مریخ کے متعلق افسانوی ادب کے مشہور عالم اہل قلم آرتھر سی کلارک کو خوشی ہے کہ انہوں نے بہت پہلے مریخ کو اہل دنیا کی نوآبادی بنانے کا خیال پیش کیا تھا اور اب مریخ پر تلاش حیات کی سمت میں یہ بڑی پیش قدمی ہے لیکن اخبار پانیر کے ایک مراسلہ نگار کو ان جدید معلومات سے زیادہ حیرت نہیں ہوئی، انہوں نے لکھا کہ قدیم ہندوستان ان معلومات سے باخبر تھا، انہوں نے ہندوؤں کی روزانہ پوجا میں شامل مندرجہ ذیل اشلوک کا ذکر کیا۔

اوم برہما مراری استری پرنکاری / بھانو ششی بھومی سوتو بدھا سچا / گرو سچا شکر شنی راہو کیتو / کرونت سروے ماما سپر بھاتم اس اشلوک میں صرف منگل یعنی مریخ کو بھومی سوتو یعنی فرزند زمین سے تعبیر کیا گیا ہے جو اس بات کی علامت ہے کہ مریخ کو زمین سے خاص تعلق اور مناسبت ہے۔

ع۔ص۔

معارف کی ڈاک

مکتوب علی گڑھ

ناظم منزل، ۴/۲۸۶ امیر نشان روڈ

علی گڑھ

۴ راگست ۱۹۹۷ء

مکرمی و محترمی! السلام علیکم

میں المجمع الملکی لبحوث الحضارۃ الاسلامیہ کے موتمر یازدہم میں شرکت کیلئے عمان / اردن گیا ہوا تھا۔ واپسی میں ڈاک میں معارف (جولائی) رکھا ہوا ملا۔ اس طرف چھ مہینوں سے ڈاک گھر والے مہربان رہے اور معارف برابر ملتا رہا۔ خدا کرے یہ حسن انتظام قائم رہے اور مجھے آپ کو خط لکھ کر رسالہ دوبارہ بھیجنے کی درخواست نہ کرنی پڑے۔

شذرات اس ماہ کا بھی بہت متوازن ہے اور آپ نے ایک ضروری اور اہم مسئلے پر قلم اٹھایا ہے۔ شاید آپ کی بات لکھنؤ کے مشاہیر کے دل میں اتر جائے۔ پروفیسر ریاض الرحمن شروانی کا علامہ شبلی نعمانی پر مقالہ بہت جامع و مانع ہے اور علامہ کی شخصیت پر انہوں نے بہت اچھی روشنی ڈالی ہے۔ ڈاکٹر سید رضوان علی ندوی صاحب کی اسلامیات پر بہت گہری نظر ہے۔ ایک مشہور پاکستانی عالم کے رد میں جو مضامین انہوں نے سپرد قلم کیے تھے وہ میری نظر سے گزرے ہیں اور انہیں پڑھ کر میں بہت متاثر ہوا تھا۔ پھر جولائی ۱۹۹۱ء میں اردن میں ان سے ملاقات ہوئی جہاں المجمع الملکی لبحوث الحضارۃ الاسلامیہ کے موتمر

ہشتم میں جس کا موضوع تھا " مشارکۃ الشعور الاسلامیۃ فی بناء الحضارۃ الاسلامیۃ" شرکت کے لیے ہندوستان سے میں اور پاکستان سے جسٹس جاوید اقبال اور سید رضوان علی صاحب گئے ہوئے تھے۔ رضوان صاحب نے پہلے دن پہلی نشست میں " التراث الحضاری الاسلامی فی اللغۃ الاردیۃ" کے عنوان سے ایک بسیط مقالہ پڑھا تھا، میں اسے سُن نہیں سکا اس لیے کہ میرا جہاز کچھ تاخیر سے عمان پہنچا تھا لیکن بعد کو مضامین کے ضخیم مجموعے "کتاب المؤتمر العالم الثامن" (عمان ۱۹۹۲ء) میں ڈاکٹر جاوید اقبال کے تعلیقات کے ساتھ چھپا۔ اسی مجموعے میں میری تحریر " مشارکۃ اللغۃ الاردیۃ فی الحضارۃ الاسلامیۃ" بھی شایع ہوئی ہے۔

اس موتمر میں مشارکۃ اللغۃ العربیۃ فی الحضارۃ الاسلامیۃ پر پروفیسر احسان عباس (عمان) فارسی زبان کی خدمات پر میر مہدی محقق (تہران) ترکی زبان پر پروفیسر اکمل الدین احسان اوغلو (استنبول) ملائی زبان پر پروفیسر عبدالرؤف (ملیشیا) پروفیسر عبدالحمید عثمان (کوالالمپور) لطفی زہدی (عمان) اور عبدالعزیز بن جنیدی (برونائی) اور بنگالی زبان پر پروفیسر ابوالحسن صادق (ملیشیا) اور استاذ شاہجہاں محمد عبدالقیوم (بنگلہ دیش) نے مقالات پڑھے تھے۔

اس موتمر کی ایک دلچسپ بات میں آپ کو بھی شریک کرنا چاہتا ہوں۔ نام " مختار" بہت عام نہیں ہے۔ ہندوستان پاکستان میں اس نام کے دو ایک صاحبوں ہی سے واقف ہوں، اس کانفرنس میں مختار نام کے چار چار اصحاب موجود تھے۔ السید احمد مختار اُمبو رباط (المملکۃ المغربیۃ) سے تشریف لائے تھے۔ پروفیسر محمد المختار ولد اُباہ جامعۂ اسلامیہ نیامی کے وائس چانسلر موریتانیہ سے آئے تھے اور میں مختار الدین احمد ہندوستان سے۔

ایک اور صاحب مغرب کے تھے ان کا نام یاد نہیں آتا۔

ڈاکٹر سید رضوان علی صاحب کچھ دنوں کے بعد ہندوستان آئے تو علی گڑھ بھی آئے جہاں ان کے کچھ اعزہ اور ندوہ کے ہم سبق اور رفقاء موجود تھے۔ کئی دن ان سے ملاقات رہی۔ وہ کراچی سے ایک علمی و دینی رسالہ بھی شایع کرتے تھے معلوم نہیں اب بھی شایع ہوتا ہے یا نہیں۔ کراچی میں ان کا کتب خانہ قابل دید ہے جس میں اسلامی تاریخ پر بہت قابل قدر ذخیرہ موجود ہے۔

معارف کے تازہ شمارے میں عزیزی سید محمد فاروق بخاری کی رحلت کی خبر دیکھ کر بہت افسوس ہوا۔ آپ نے بہت اچھا کیا کہ وفیات میں ان پر ایک شذرہ لکھ دیا۔ یہ کشمیر کے ایک دینی و علمی خانوادے سے تعلق رکھتے تھے۔ صالح نوجوان تھے اور علم و ادب کا بہت ستھرا ذوق رکھتے تھے۔ ام اے (عربی) میں وہ میرے شاگرد ہوئے، پھر میری نگرانی میں تین سال تک وہ ریسرچ کرتے رہے۔ کشمیر کی مناسبت سے میں نے انہیں علامہ انور شاہ کشمیری موضوع دیا تھا انہوں نے محنت سے کام کیا اور اس مواد کو بھی استعمال کیا جو کشمیر کے کتب خانوں اور ذاتی ذخیروں میں محفوظ تھے۔ پروفیسر سید رفیع الدین صاحب ناگپور یونیورسٹی اور مولانا سعید احمد اکبر آبادی مرحوم و مغفور ان کے ممتحنین میں تھے۔ مولانائے اکبر آبادی شاہ صاحب کے خاص تلامذہ میں تھے، انہوں نے بھی مقالے کی بہت تعریف کی۔ یہ کتابی شکل میں شایع ہوگیا ہے۔

سید محمد فاروق بخاری دیندار و نیک نفس تھے اور شگفتہ طبیعت کے مالک تھے۔ اپنے اساتذہ کا احترام ہی نہیں ان سے محبت بھی کرتے تھے۔ پروفیسر رئیس احمد کی کشمیر میں وائس چانسلر شپ کے زمانے میں میں وہاں کی اکیڈمیک کونسل کا م

تھا۔ پھر ریاض الرحمن شروانی صاحب جب کشمیر کے شعبۂ عربی و اسلامیات کے صدر تھے تو ڈاکٹر مشیر الحق مرحوم اور میں اس شعبے کے بورڈ آف اسٹڈیز کے جلسوں میں شرکت کے لیے جایا کرتا تھا اور کبھی کبھی کئی کئی دن یونیورسٹی میں قیام کرتا تھا۔ فاروق بخاری کو جب بھی اطلاع ملتی تو شہر سے ملنے آتے اور دیر تک بیٹھتے۔ ان صفات کے ساتھ ان میں استغنا کا بھی وصف موجود تھا۔ ایک بار انھوں نے امر سنگھ کالج سرینگر سے کشمیر یونیورسٹی کے شعبۂ عربی میں آنے کا ارادہ کیا لیکن جب دیکھا کہ وہاں کچھ امیدوار پہلے سے موجود ہیں تو پھر انھوں نے اس طرف توجہ نہیں کی اور آخر حیات تک وہ امر سنگھ کالج ہی میں رہے اور عربی کو فروغ دیتے رہے، خدا ان کی مغفرت فرمائے اور ان پر رحمت کے پھول برسائے۔

والسلام : مختار الدین احمد

مکتوب دہلی

محترمی اصلاحی صاحب! تسلیم

جون ۹۷ء کے معارف میں "کھف" سے متعلق راقم کی جو تحریر شایع ہوئی تھی اس کے سلسلے میں ڈاکٹر ظفر الاسلام خاں کا یہ فرمانا بجا ہے کہ "کلاسیکل عربی زبان میں حرف واؤ کو ف میں بدلنے کی کوئی مثال نہیں ملتی بلکہ یہ یورپی اثر کا نتیجہ ہے"۔

تاہم مجھے یہ عرض کرنا ہے کہ قرآن مجید میں الفاظ تھوم کی ثوم[ؒ] اور وصل کی بصل کی صورت اختیار کرنے کی مثالیں ضرور موجود ہیں۔ واضح رہے کہ ہندوستان میں ضلع ملتان جو آج کل پاکستان میں ہے۔ وہاں پیاز کو ملتانی لوگ اب بھی "وصل" کہتے ہیں، غالباً یہ دونوں چیزیں صرف ہندوستان میں ہوتی ہیں اور عرب میں نہیں پیدا ہوتیں۔ "ثھ" کو "ث" اور واؤ کے "با" میں بدل جانے کی مثال تو صحیفۂ پاک[ؒ] میں موجود ہے۔

گوردیال سنگھ مجذوب

[ؒ] معارف : قرآن مجید میں ثوم کا لفظ ہی نہیں آیا ہے۔ احادیث میں ملتا ہے۔

ادبیات

شب چراغ

از

جناب عرفی آفاقی۔ لکھنؤ

طلوعِ صبحِ[1] محشر خاوراں کو شام تھی یعنی[2]
دمک خورشید قشقے سے اٹھی مغرب[3] کی پیشانی

افق ایسا، شفق ایسی، فلک ایسا، دھنک ایسی
یہ دشت و در، یہ طشتِ زر، یہ یخ منظر درخشانی

اس اوج و موج رنگ و نور میں انوار پیشیں کیا
غبار کاروانِ رفتہ کی کم کم ضوافشانی

علوم تجربی کا شوق دل میں کس[4] نے اکسایا
کیا کس نے تعقل[5] کا رواں ٹھہرا ہوا پانی

وہ کیا موجِ نظر تھی جس سے ہے زیر و زبر دریا
سفینہ کس ہوائے ناز سے ہے ایسا طوفانی

---

[1] قیامت کے روز آفتاب مشرق کی بجائے مغرب سے طلوع ہوگا (حدیث) [2] صوتی قافیہ [3] اسلامی مشرق میں زوالِ علم کی انتہا مغرب میں نئے نئے علمی اکتشافات وانکشافات کا نقطۂ آغاز تھا [4] اشارہ ہے پیغمبرِ اسلام صلعم کی ذاتِ گرامی کی طرف [5] عقل استقرائی مراد ہے۔

ملے موقع تو پڑھ قرآں بصیرت کی نگاہوں سے
جو فرصت ہو تو کر تاریخ کی اوراق گردانی
ظن وتخمیں سراسر دانشِ چیں، بینش ایراں
گمان ووہم یکسر حکمتِ ہندی و یونانی
کہاں علم الحقائق[1] اور کہاں افسانہ وافسوں
کہاں موجیں سرابوں کی، کہاں دریا کی طغیانی
نثار اس علمِ محکم کے، فدا اس اسمِ اعظم کے
کہ جس کے زور سے ٹوٹا طلسم جہل ونادانی
رخِ فطرت سے پردہ لحظہ لحظہ اٹھتا جاتا ہے
کہ رفتہ رفتہ کھلتے جاتے ہیں اسرارِ پنہانی
سمجھ میں آتے جاتے ہیں رموزِ عَلَّمَ الْاَسْمَاء[2]
ہوئے جاتے ہیں روشن آیہ تسخیر کے معنی[3]
بھرم ٹوٹا خداوندانِ باطل کی خدائی کا
کہ عظمت آپ اپنی حضرتِ انساں نے پہچانی
مگر یہ علم، یہ حکمت، مگر یہ دانش وبینش
یہی، جی ہاں یہی قندیلِ محرابِ خوش امکانی
چراغِ راہ اگر ایماں نہ ہو اس دشتِ ظلمت میں
کرے چشمک بہ رنگِ دیدۂ غولِ بیابانی

---

[1] علومِ طبیعی مراد ہیں [2] وَعَلَّمَ آدَمَ الْاَسْمَاءَ كُلَّهَا (آیۂ شریفہ) [3] صوتی قافیہ۔

حقیقت ایک آتی ہے نظر دو جیسے احول کو
دوتا کرتی ہے یکتا کو خرد کی نامسلمانی
دوئی کیا؟ جسم کی اور جان کی آپس میں ٹھن جانا
دوئی کیا؟ دیدہ و دل کی بہم دست و گریبانی
دوئی کیا؟ دین کا دنیا کے ہنگاموں سے کٹ جانا
دوئی کیا؟ معبد و بیزداں، دوئی کیا؟ ملک و شیطانی
کسی کو کسب کا ہوکا، کسی کو ترک کا سودا
ہوا کا کوئی زنجیری، خلا کا کوئی زندانی
کوئی لہلوٹ صورت پر، کوئی معنی کا دلدادہ
بفیضِ جہل ہر ناداں کو دعوائے ہمہ دانی
کوئی کہتا ہے یہ باطل، کوئی کہتا ہے وہ باطل
غرض اس کشمکش میں نظمِ ہستی کی پریشانی
بہت بھٹکے اندھیروں میں یہ نکتہ تب ہوا روشن
یہ موتی ہاتھ تب آیا بہت سی خاک جب چھانی
جہانِ رنگ و بو صد برگ نیرنگِ شگفتن ہا
نشاطِ ذوقِ پیدائی چمن ایجاد حیرانی
سکون سرمدی ہے تہ میں جو دریائے بے حد کی
وہی موجوں کی صورت سطح پر ہے گرم جولانی
تفکر نفس و آفاق میں عنوانِ عرفاں ہے
کہ یہ آیاتِ ربانی کہ وہ آیاتِ ربانی

مطبوعات جدیدہ

سیرت سلطان ٹیپو شہید از جناب مولانا محمد الیاس ندوی متوسط تقطیع، بہترین کاغذ اور طباعت، مجلد مع خوبصورت گرد پوش، صفحات ۶۰۰، قیمت ۱۰۰ روپے، پتہ: مجلس تحقیقات و نشریات اسلام، ندوۃ العلماء، پوسٹ بکس ۱۱۹، لکھنؤ، یوپی۔

ہند بلکہ عالم اسلام کے دور زوال میں جن اولوالعزم حکمرانوں نے شجاعت و غیرت وحمیت اور عدل و انصاف کی داستانوں کو اپنے پاکیزہ لہو سے تابناک اور سرخرو کیا، ان میں ابوالفتح ٹیپو سلطان کا نام سر فہرست ہے، ان کی شکل میں سرنگا پٹن کی سرزمین نے تاریخ کے دامن کو بیش قیمت ہیرے سے مالا مال کیا، حلقہ یاراں میں بریشم کی طرح نرم اور رزم حق و باطل میں فولاد صفت ٹیپو شہید اپنی زندگی ہی میں اساطیری کردار کے حامل ہوگئے، انگریزوں کے ڈیڑھ سو سالہ دور اقتدار میں گو سلطان شہید کے سوانح بالکل پردۂ خفا میں نہیں رہے، انگریزی اور اردو میں چند عمدہ کتابیں شایع بھی ہوئیں لیکن ان کی مفصل تاریخ اور ایک ایسے تذکرہ کی کمی رہی جس میں اللہ کے اس شیر کی تصویر بے کم و کاست نظر آتی، زیر نظر کتاب اسی ضرورت کے پیش نظر لکھی گئی اور بے شبہہ یہ اپنے مقصد میں کامیاب ہے، لایق اور نوجوان مصنف کو سلطان شہید سے نسبت ہم وطنی کا شرف بھی حاصل ہے وہ اشراف عرب کی قدیم ہندوستانی ساحلی بستی بھٹکل کے خاندان نوائط کے فرزند ہیں، اردو ان کی مادری زبان نہیں لیکن دارالعلوم ندوۃ العلما لکھنؤ میں حصول تعلیم

کے بعد انہوں نے شستہ اور رواں اردو میں تحریر کا ملکہ بھی پیدا کیا اور یہ کتاب اس کا نمونہ ہے، پچیس ابواب کی اس کتاب میں ٹیپو سلطان، ان کے والد حیدر علی اور میسور سرزمین کی تاریخی حیثیت سلطنت خداداد اور اس زمانہ کے سیاسی، فوجی اور تمدنی ماحول کو بڑی محنت سے بیان کیا گیا ہے، اس کے علاوہ تین سو سال پہلے کے ہندوستان اور عالم اسلام کی سیاسی و اخلاقی صورت کو بھی جامعیت سے پیش کیا گیا ہے، ٹیپو سلطان کی سیرت میں خاص طور پر ان کی رواداری اور اسلام سے ان کے عشق کا بیان بڑا دلکش اور موثر ہے، مراجع اور مآخذ سے اندازہ ہوتا ہے کہ موضوع پر حتی الامکان وسیع مطالعہ کیا گیا ہے تاہم چند ایسی کتابوں کا بھی ذکر ہے جو تاریخی و تحقیقی استناد کے معیار سے فروتر ہیں، مباحث میں طرز معروف کے مطابق حوالوں کی عدم موجودگی کا بھی احساس ہوتا ہے، حیدر علی کے برسر اقتدار آنے کے محرکات میں دو ابتدائی اسباب محل غور ہیں، اس شکل میں تو سر استعماری کوشش کے لیے وجہ جواز فراہم ہوسکتی ہے، سلطان شہید کے حادثہ شہادت میں واقعہ نگاری سے زیادہ قصہ گوئی کا رنگ نمایاں ہے، کتاب حسن طباعت کا نمونہ اور جاذب نظر اور بامعنی سرورق سے آراستہ ہے، لیکن کمپیوٹر کی کتابت خاصی ناقص ہے جس سے املا کی صحت پر اثر پڑتا ہے، مثلاً ڈہرا کو دھرا، گھر کو گھر، پوراکو پورہ اور ابرو کو آبرو لکھ دیا گیا ہے، ص ۲۰۷ پر انگلستان کے وزیر اعظم اور ہندوستانی گورنر جنرل کے نام بھی غلط لکھے گئے ہیں، لیکن ان فروگذاشتوں سے قطع نظر یہ سلطان شہید کی بہترین سوانح ہے جس میں واقعہ نگاری، مورخانہ غیر جانب داری کے علاوہ جذبہ و احساس کی پاکیزگی اور غیرت و حمیت کی تپش بھی شامل ہے، مولانا سید ابوالحسن علی ندوی، پروفیسر خلیق احمد نظامی اور سلطان شہید کے معتبر سوانح نگار پروفیسر بی۔ شیخ علی کی مفید تحریروں سے کتاب کے وزن و وقار میں اور اضافہ ہوا ہے۔

ع۔ ص۔

جلد ۱۶۰ ماہ جمادی الآخرہ ۱۴۱۷ھ مطابق ماہ اکتوبر ۱۹۹۶ء عدد ۴

فہرست مضامین

شذرات

دنیا کی کسی قوم و جماعت میں خواہ کیسا ہی شدید اختلاف کیوں نہ ہو لیکن جب اس پر سخت اور نازک وقت آتا ہے تو وہ اپنے باہمی اختلافات کو بھول جاتی ہے، اس کے تمام افراد مل جل کر دوسری قوموں اور جماعتوں کی طرف سے ہونے والے حملوں اور خطروں کا سدباب کرنے میں لگ جاتے ہیں اور دوسروں کے ظلم و تعدی کو روکنے کے لیے سینہ سپر ہو جاتے ہیں، اغیار کی سازشوں اور ریشہ دوانیوں کو ناکام بنانے کے لیے برابر فکرمند رہتے ہیں لیکن جس قوم کا زوال و ادبار حد انتہا کو پہنچ جاتا ہے وہ نازک موقع پر بھی ہوشمندی اور تدبر سے کام نہیں لیتی اور سخت وقتوں میں بھی اپنے ہی جھگڑوں اور بکھیڑوں میں الجھی رہتی ہے، مسلمان بھی اسی صف میں شامل ہیں، وہ مسلسل مصیبتوں اور خطروں میں گھرے ہوئے ہیں اور ہر طرف سے ان پر یلغار ہو رہی ہے مگر اس کے باوجود وہ متحد و متفق ہونا جانتے ہی نہیں، نہ باہمی اختلافات کو بھول رہے ہیں نہ اپنے دشمنوں اور مخالفوں کی سازشوں کو ناکام بنانے کی تگ و دو کر رہے ہیں ع نہ جانے کس ادا میں ہے دل دیوانہ برسوں سے

اس سے کون انکار کر سکتا ہے کہ مسلمانوں پر عجب وقت آپڑا ہے، اقوام عالم انہیں بیخ و بن سے نیست و نابود کر دینا چاہتی ہیں، لیکن وہ اپنے کانوں میں تیل ڈال کے بیٹھے ہوئے ہیں، ان کے مخالفین انکے خلاف ریشہ دوانیاں کر رہے ہیں مگر انکو اس کی کوئی فکر نہیں، بیرونی حملوں اور خطروں سے وہ بالکل بے پروا ہیں، کہیں سے انکے مقابلے کے لیے کوئی حرکت اور بیداری نہیں ہو رہی ہے، اس بے نمکی کے ساتھ یہ نمکینی بھی دیکھئے کہ وہ اپنے ہی بھائیوں کے خون کے پیاسے ہیں، جو اختلافات فرسودہ ہو چکے ہیں یا مدت سے دبے ہوئے تھے انکو ازسرنو زندہ کر رہے ہیں، نمائشی جنگی معرکہ آرائی، باہمی عداوت و مخاصمت انکا وتیرہ بن گئی ہے، ایک دوسرے کی تحقیر و رسوائی کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیتے، نفرت، کدورت اور بغض و حسد کی آگ ہر دل میں بھڑک رہی ہے، غرض ساری صلاحیت، قوت اور دولت ایک دوسرے کو نیچا دکھانے میں صرف ہو رہی ہے، آخر اس کا انجام کیا ہوگا؟ دشمن سے غفلت و بے پروائی اور

باہم ایسی سخت آویزش و کشمکش کا نتیجہ کیا نکلے گا؟

اس سے اتفاق ہے کہ احقاقِ حق اور ابطالِ باطل ضروری ہے لیکن کیا اس کے لیے قتال و خوں ریزی اور شر انگیزی بھی ضروری ہے؟ ہم یہ تسلیم کرتے ہیں کہ مسلمانوں کے بعض فرقوں کے عقائد و اعمال بہت بگڑ چکے ہیں بلکہ انکے حدود کفر و شرک سے جاملے اور توحید خالص سے بالکل مختلف سمت میں ہو گئے ہیں انکی اصلاح و ہدایت کے لیے وعظ و تذکیر لابد ہے وَذَكِّرْ فَإِنَّ الذِّكْرَىٰ تَنفَعُ الْمُؤْمِنِينَ لیکن دعاۃ و مبلغین کا بڑا طبقہ خود ہی ناپختہ اور محتاجِ اصلاح ہے، وہ اسلام کے اصولِ دعوت حکمت، موعظت، بطریقِ احسن جدال اور بشروا ولا تنفروا کی روح سے ناآشنا ہے اسی لیے اسکی دعوت و تبلیغ حق و صداقت سے برگشتہ کر دیتی ہے غلط موقف پر لوگوں کے اصرار میں مزید شدت پیدا کر دیتی ہے، مدعو میں ایسی نفرت اور عصبیت پیدا ہو جاتی ہے کہ وہ باطل عقیدہ و خیال سے دست بردار ہونے کے بجائے حق سے اور زیادہ منحرف اور بعید تر ہو جاتا ہے تبلیغی جماعت کے طریقۂ اصلاح و دعوت سے توڑنے کے بجائے جوڑنے اور فصل کے بجائے وصل کے امکانات پیدا ہو سکتے ہیں۔ دعوت و تبلیغ کا ایک میدان غیر مسلم بھی ہیں مگر پتہ نہیں اس کی جانب توجہ کیوں نہیں ہے؟ اسلام اور مسلمانوں سے غیر مسلموں کی نفرت و بدگمانی دور کرنے کے لیے یہ ایک ضروری کام ہے ورنہ غیر مسلم خود مسلمانوں کو اپنے اندر جذب کر لیں گے۔ جماعت اسلامی نے اس میدان کا رُخ کیا تھا، ضرورت ہے کہ سیاست کی خارزار سے دامن بچایا جائے اور یہ ارشاد ربانی پیش نظر رکھا جائے اِنْ اَجْرِیَ اِلَّا عَلَی اللّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ۔

مسلمانوں میں ذات برادری کے اختلافات بھی شباب پر ہیں، مذہباً ایک ہوتے ہوئے بھی ذات برادری کا اختلاف انہیں ایک دوسرے کے قریب نہیں ہونے دیتا، وہ غیر مسلموں سے مل جل کر رہ سکتے ہیں، لیکن غیر برادری کے مسلمانوں سے میل جول رکھنا گوارا نہیں کرتے، گاؤں کی پنچایت سے لے کر پارلیمنٹ کے الکشن کے وقت یہ اختلافات بہت کھل کر اور بڑی بھونڈی اور مضحکہ خیز صورت میں سامنے آتے ہیں، اتفاق سے اگر کوئی مسلمان کسی پارٹی کے ٹکٹ پر امیدوار ہوتا ہے تو محض برادری کے اختلاف

کی وجہ سے وہ اپنے ہم مذہبوں کے ووٹ سے محروم رہتا ہے دوسری طرف جس برادری سے امیدوار کا تعلق ہوتا ہے اس برادری کے لوگ آنکھ بند کرکے اسے ووٹ دیتے ہیں اور یہ بھی نہیں دیکھتے کہ وہ کتنی بے اصول، موقع پرست، فرقہ پسند اور مسلمانوں کے معاملات و مسائل سے کوئی دلچسپی نہ لینے والی جماعت کا امیدوار ہے، اس وقت بڑا اہم اور ضروری مسئلہ یہ ہے کہ فرقہ پرست جماعتوں کو روکنے کے لیے مسلمانوں کے ووٹ منقسم نہ ہوں، اگر قوم و برادری کے نام پر ووٹ دیے گئے تو تقسیم ہوکر غیر موثر اور بے نتیجہ ہوجائیں گے، اس سے بچنے کی صورت صرف یہی ہے کہ ان سیکولر پارٹیوں کی حمایت کی جائے جن کا رویہ مسلمانوں کے ساتھ ہمدردانہ ہے اور جو فرقہ پرستوں سے ٹکر لے رہی ہیں خواہ انکا امیدوار کسی فرقہ و مذہب کا کیوں نہ ہو۔ انتخابات کی بات آگئی ہے تو ووٹر لسٹ کے معاملے میں بھی ہوشیار رہنے کی ضرورت ہے تاکہ کوئی نام اس میں درج ہونے سے رہ نہ جائے اور غلط ناموں کی تصحیح بھی ہوجائے، عام لوگوں کے لیے یہ کام انجام دینا مشکل ہو تو ہر آبادی اور ہر محلہ کے سمجھ دار اور ذمہ دار لوگوں کو اسے اپنے ہاتھ میں لے لینا چاہیے۔

اردو ہندوستان کے ہر فرقہ و مذہب کے لوگوں کی زبان ہے مگر متعصب اور تنگ نظر لوگوں نے اسے صرف مسلمانوں کی زبان بنا دیا ہے اور جس طرح مسلمانوں کے ساتھ ظلم و ناانصافی عام ہے اسی طرح کا معاملہ اس زبان کے ساتھ بھی ہو رہا ہے، اس کے ساتھ سب سے زیادہ معاندانہ رویہ اتر پردیش کی حکومت کا رہا ہے۔ ہیم وتی نندن بہوگنا اور ملائم سنگھ یادو کو چھوڑ کر سب ہی وزرائے اعلیٰ یو۔ پی میں اردو کو مٹانے کے لیے اسے پڑھنے پڑھانے کے مواقع مسدود کرتے رہے ہیں لیکن اس صورت حال کی ذمہ داری صرف حکومت پر ڈال کر خود کو بری الذمہ نہیں قرار دیا جاسکتا، ان صفحات میں اردو والوں کی کوتاہیوں پر بار بار اظہار خیال کیا گیا اور بعض معاصر رسالوں میں بھی اس پر بہت کچھ لکھا جاتا رہا ہے مگر افسوس ہے کہ ان دردمندانہ معروضات کو اردو والوں کی توہین پر محمول کرکے ان کا مذاق اڑایا جاتا ہے اور اپنے غلط رویے میں اصلاح و تبدیلی کی ضرورت محسوس نہیں کی جارہی ہے ؎

رعنائی خیال کو ٹھہرا دیا گناہ ناصح بھی کس قدر ہے مذاق سخن سے دور

مقالات

محمد صلی اللہ علیہ وسلم انسانیت کے معالج

بائبل کی دو بشارتوں کی روشنی میں

از

مولانا حبیب ریحان خاں ندوی بھوپال

اسلام نسخۂ شفاء کمیونزم، سرمایہ داری، موجودہ مسیحیت اور مغرب کا فلسفہ جب تہذیب حاضر کی پیدا کردہ بیماریوں کے علاج میں ناکام ہیں تو ہماری رائے میں اس جانکاہ مرض کا علاج صرف یہ ہے کہ ہم فطرت بشری کے سب سے بڑے نبض شناس جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا دامن تھام لیں اور ان کے نسخۂ شفاء (قرآن وسنت کا قانون اسلامی) کو اپنا لیں کیونکہ تاریخ انسانیت شاہد ہے کہ جب جب اس نے اس دوا کو استعمال کیا بیماریوں سے اسے کامل و مکمل شفا حاصل ہو گئی ہے!

اسلام انسان کو تمدن، تہذیب، ترقی، شہریت سب کی دعوت دیتا ہے لیکن اسلامی تہذیب و تمدن کی اصل اولین یہ ہے کہ خدا کا دین اور اس کی شریعت دنیا میں نافذ ہو گی اور اس کے زیر سایہ ایسی ترقی ہو گی کہ چشم فلک حیران ہو جائے گی اور جاننے والے اس بات کو اچھی طرح جانتے ہیں کہ یورپ کی جدید صنعتی ترقی میں کہاں تک اسلامی علوم اور تہذیب اور ترجموں کا ہاتھ ہے لیکن اسلامی تہذیب امن و سلامتی کا پرچم اور تمدن و ثقافت کا مرکز بنی ہوئی تھی کیونکہ اس کا رشتہ اللہ سے جڑا ہوا تھا اور روحانیت کے شعلے اس میں موجود

تھے، اکبر کی زبان میں ؎

تعلیم مذہبی کا خلاصہ یہی تو ہے — سب مل گیا اسے جسے اللہ مل گیا

حضرت موسیٰؑ کی پیشین گوئی لیکن جدید مغربی ترقی جنگ اور ظلم کی دعویدار بنی ہوئی ہے، اخلاقی طور پر دیوالیہ ہو چکی ہے کیونکہ اس کا رشتہ خالقِ کائنات سے ٹوٹ چکا ہے اسلیے اس زہر کا علاج لبنان کے صحرا میں نہیں مکہ کے صحرا میں ہے، وادی سینا اور شعیر کی چٹانوں میں نہیں بلکہ کوہِ فاران کے پاس ہے کیونکہ بائبل کی زبان میں حضرت موسیٰؑ کی توراۃ کے آخری باب میں اپنی وفات سے قبل بنی اسرائیل کو جو برکت دی اس میں اس طرح کہا:

"خداوند سینا سے آیا اور شعیر سے ان پر آشکارا ہوا اور کوہِ فاران سے جلوہ گر ہوا اور لاکھوں قدسیوں میں سے آیا۔ اس کے داہنے ہاتھ پر ان کے لیے ایک آتشی شریعت تھی۔" (استثنا ۳۳: ۲)

حضرت موسیٰ علیہ السلام کی یہ پیشین گوئی بالکل واضح ہے اس لاکھوں کے لفظ پر بحث کی ضرورت بھی نہیں تاہم علمی امانت کے طور پر اتنا بتا دینا ضروری ہے کہ اس لفظ کی اصل کے بارے میں اختلاف ہے کہ یہ اصل میں کیا تھے، کوثر نیازی صاحب لکھتے ہیں کہ:

"کتاب مقدس میں پہلے دس ہزار کے الفاظ تھے مگر جب اہل اسلام نے اس تعداد کو حضورؐ کے صحابہؓ پر منطبق کر کے آپ کی صداقت کا ثبوت بہم پہنچانا شروع کیا تو اس کتاب مقدس میں یہ الفاظ بدل دیے گئے، اب دس ہزار کی جگہ لاکھوں کے الفاظ ہیں۔"[1]

مولانا کوثر صاحب کی یہ بات بالکل صحیح اور مدلل ہے اور اس دعوے کی دلیل انہوں نے آگے چل کر اس طرح دی ہے کہ:

"سکوفیلڈ ریفرنس بائبل ۱۹۱۷ء کے انگریزی ترجمہ میں دس ہزار قدسیوں کے الفاظ

---

[1] آئینہ تثلیث: مولفہ مولانا کوثر نیازی، صفحہ ۱۲۲۔

موجود ہیں۔[1]

ی تحقیق | اردو کے حالیہ ترجموں میں لاکھوں کا لفظ ہے، عربی ترجمہ میں ربوات کا لفظ
ں پر زیر و زبر نہیں ہے اس لفظ کی تحلیل کے لیے لغت کی مدد ضروری ہے، عربی لغت
ربوہ دس لاکھ کو کہتے ہیں اور ربوہ بڑی جماعت مانند دس ہزار کو۔[2]
اس لیے اس جگہ دونوں کا احتمال ہو سکتا ہے، حضرت سلیمان کے نشید الانشاد میں
ا کا لفظ موجود ہے جس سے مراد دس ہزار ہیں جو اردو ترجمہ میں بھی موجود ہیں۔

"میرا محبوب سرخ و سفید ہے وہ دس ہزار میں ممتاز ہے۔" (غزل الغزلات ۵: ۱)

اس تفصیل سے نفس پیشین گوئی پر مطلق کوئی اثر نہیں پڑتا۔ نہ تحریف کتاب پر کوئی
ت ہوتی۔ لیکن ہاں:

يُحَرِّفُونَ الْكَلِمَ عَنْ مَّوَاضِعِهٖ — الفاظ کو اس کے محل سے پھیر دیتے ہیں

(النساء: ۴۶) — یعنی بدل دیتے ہیں۔

ر مل جاتا ہے۔ کیونکہ ہزار یا لاکھ کا لفظ محض کثرت تعداد کے اظہار کے لیے بولا جا سکتا ہے۔
یہ کہ فتح مکہ کے دن اگر دس ہزار اسلام کے سپاہی موجود تھے تو جس دن شریعت الہیہ
ل ہوئی یعنی حجۃ الوداع اس دن اس سے بہت زیادہ مسلمان وہاں پر موجود تھے۔
الغرض حضرت موسیٰؑ کی موت سے قبل دی گئی پیشین گوئی حرف بحرف ثابت ہوئی حضرت
ؑ کے بعد جناب رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم فاران سے آئے اور جہاد ساتھ لائے نیز
ا کامل و مکمل شریعت بھی لائے جو قیامت تک انسانوں کو راہ راست دکھائے گی۔
ین گوئی میں ایک خاص بات یہ ہے کہ حضرت موسیٰؑ نے حضور کے بعد کسی آنے والے کی

ئینہ تثلیث: مولفہ مولانا کوثر نیازی، ص ۱۴۱ [2] مصباح اللغات: مولانا عبدالحفیظ بلیاویؒ مادہ ربا۔

بشارت نہ دی جس کا واضح مطلب یہ ہے کہ آپ کی شریعت تا قیامت چلتی رہے گی۔

ایلیا یا مسیح مراد نہیں ہوسکتے | پیشین گوئی سے حضرت ایلیا (الیاس علیہ السلام) بزعم یہود اس لیے مراد نہیں ہوسکتے کہ وہ یہودی عقیدہ کے مطابق قیامت سے قبل آئیں گے، فاران کا پہاڑ مکہ میں ہے گو کتاب مقدس کے شارح فاران سے شام کا علاقہ مراد لیتے ہیں، اس کی تفصیل انشاء اللہ کسی دوسرے موقع پر کی جائے گی، نیز حضرت موسیٰ نے اس آخری پیشین گوئی سے پہلے بھی جس آنے والے کی بشارت دی ہے وہ ہم یہاں برسبیل تذکرہ نقل کرتے ہیں تفصیلی بحث "بشارات محمد کتب مقدسہ میں" جیسی کتاب میں کی جائے گی۔

"خداوند تیرا خدا تیرے لیے تیرے ہی درمیان سے یعنی تیرے ہی بھائیوں میں سے میری مانند ایک نبی برپا کرے گا تم اس کی سننا، یہ تیری اس درخواست کے مطابق ہوگا جو تونے خداوند اپنے خدا سے مجمع کے دن حورب میں کی تھی ... میں ان کے لیے ان ہی کے بھائیوں میں سے تیری مانند ایک نبی برپا کروں گا اور اپنا کلام اس کے منھ میں ڈالونگا اور جو کچھ میں اسے حکم دوں گا وہی وہ ان سے کہے گا" (استثناء ۱۸: ۱۵-۱۹)

حضرت الیاس موسیٰ کی نسل سے نہیں ہیں بلکہ ان سے بہت پہلے پیدا ہوئے تھے، موسیٰ کی مانند صاحب کتاب و شریعت نبی بھی وہ نہیں ہیں۔

حضرت عیسیٰ بن باپ پیدا ہوئے، بلکہ مسیحی تو ان کو ابن اللہ مانتے ہیں وہ موسیٰ کے بھائیوں میں کیسے ہوسکتے ہیں، نیز حضرت عیسیٰ صاحب شریعت نہیں تھے صاحب بشارات تھے اور خود حضرت موسیٰ کی شریعت کے متبع تھے، جہاد کا حکم بھی نہیں دیا تھا۔

صرف محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہی بشارت کا مصداق ہیں کہ آپ اسحاق کے بھائی اسمٰعیل کی اولاد میں سے ہیں، حضرت موسیٰ ہی کی طرح صاحب شریعت وجہاد ہیں، تاریخ بنی اسرائیل

ہ ہے کہ موسیٰؑ کی مانند کوئی نبی نہیں آیا تو پھر قیامت سے پہلے جب نزول مسیحؑ ہوگا تو اب وہ
بت محمدیہؐ کے تابع ہونگے، مستقل بالذات نہیں ہونگے۔

مسیحؑ کی بشارت | کامل حق لے کر جلوہ گر ہونے کی بشارت حضرت مسیحؑ نے بھی دی ہے
حضرت موسیٰؑ کی طرح آخری زمانہ میں دی ہے۔

"اس کے بعد میں تم سے زیادہ باتیں نہ کرونگا۔ کیونکہ دنیا کا سردار آتا ہے" (یوحنا ۱۴:۳۰)

آگے چل کر یوحنا ہی کی انجیل میں اس طرح تفصیل ہے:

"انہوں نے مجھ سے مفت عداوت رکھی۔ لیکن جب وہ مددگار آئے گا جس کو میں تمہارے پاس باپ کی طرف سے بھیجوں گا یعنی روح جو باپ سے صادر ہوتا ہے تو وہ میری گواہی دے گا (یوحنا ۲۶:۲۷)

یوحنا ہی کے مزید جملے ملاحظہ ہوں:

"لیکن میں تم سے سچ کہتا ہوں کہ میرا جانا تمہارے لیے فائدہ مند ہے کیونکہ اگر میں نہ جاؤں تو وہ مددگار تمہارے پاس نہ آئے گا لیکن اگر جاؤں گا تو اسے تمہارے پاس بھیج دونگا اور وہ آکر دنیا کو گناہ اور راست بازی اور عدالت کے بارے میں قصوروار ٹھہرائے گا۔ گناہ کے بارے میں اس لیے کہ وہ مجھ پر ایمان نہیں لاتے، راست بازی کے بارے میں اس لیے کہ میں باپ کے پاس جاتا ہوں اور تم مجھے پھر نہ دیکھوگے۔ عدالت کے بارے میں اس لیے کہ دنیا کا سردار مجرم ٹھہرایا گیا ہے، مجھے تم سے اور بھی بہت سی باتیں کہنی ہیں مگر اب تم ان کی برداشت نہیں کر سکتے"

"لیکن جب وہ روح حق آئے گا تو تم کو تمام سچائی کی راہ دکھائے گا۔ اس لیے کہ وہ اپنی طرف سے کچھ نہ کہے گا، لیکن جو سُنے گا وہ کہے گا اور تمہیں آیندہ کی خبریں دے گا اور میرا

جلال ظاہر کرے گا۔" (یوحنا ۱۶: ۷-۱۵)

ہمارا مقصد اس مضمون میں بشارتیں جمع کرنا نہیں ورنہ بائبل کے عہدِ عتیق و عہدِ جدید سے بے شمار ایسی بشارتیں جمع کی جا سکتی ہیں جن میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو سرور دوسرا بنا کر ارسال کیے جانے کی وضاحتیں موجود ہیں لیکن سیاق کلام میں صرف انجیل یوحنا کی یہ بشارت آگئی جس کی قدرے تفصیل ضروری ہے۔

انبیاء پر گواہ دنیا و آخرت میں | دوسری بات یہ کہ یہود نے جو تہمت آپ پر لگائی تھی اس سے آپ کو بری کرنا نیز مسیحیوں نے جو افسانے گڑھ رکھے تھے ان کا پردہ کون چاک کرے گا؟ یہ وہی روحِ حق جب آئے گا تو کرے گا اور میرے خلاف کہی گئی باتوں کو رد کرے گا اور میرے حق میں گواہی دے گا۔ یہ صحیح ہے ور اس سے مراد بھی رسولؐ انور ہی ہیں، واضح آیت ملاحظہ ہو:

فَكَيْفَ إِذَا جِئْنَا مِنْ كُلِّ أُمَّةٍ	سوچو اس وقت یہ لوگ کیا کریں گے
بِشَهِيدٍ وَجِئْنَا بِكَ عَلَىٰ هَٰؤُلَاءِ	جب ہم ہر امت میں سے ایک گواہ لائیں گے
شَهِيدًا (النساء: ۴۱)	اور ان لوگوں پر تمہیں گواہ کی حیثیت سے کھڑا کریں گے۔

یہ بات معلوم و معروف ہے کہ قیامت سے پہلے اس زمانہ میں بھی جناب رسول انور صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عیسیٰؑ کے پیغمبر ہونے کی گواہی دی!

دنیا کو قصوروار ٹھہرائے گا گناہ کے بارے میں کہ وہ حضرت عیسیٰؑ پر ایمان نہیں لاتے یہود حضرت مریم پر کیسے بہتان باندھتے ہیں (النساء: ۱۵۶)

نعوذ باللہ حضرت مسیحؑ کو نبی ماننا تو الگ رہا ان کے کامل انسان ہونے تک کے

قائل نہیں بلکہ "بدروحوں کا سردار" (متی : ۱۲ : ۲۴) اور "دھوکہ باز" (متی : ۲۷ : ۶۳) اور "کفر بکنے والا" (متی : ۲۶ : ۶۵) وغیرہ جیسی ناشائستہ تہمتیں آپ پر لگاتے تھے اور کفروفسا اور انکار میں اس طرح افراط کرتے تھے لیکن ان کے برخلاف مسیحی تھے جو عظمت وتکریم میں اس طرح افراط کرتے تھے کہ نعوذ باللہ بندہ کو آقا، خادم کو سردار، مخلوق کو خالق اور انسان کو ابن اللہ اور پھر اللہ کی حاکمیت میں شریک اور ملکوتِ الٰہی کا پورا حقدار جس کو کفارہ کی صورت میں خطاؤں کو بخشنے اور ہر اس چیز پر قدرتِ کاملہ ہو جو خدائے وحدہٗ کے تصرف میں ہے۔ یہ عقیدہ صرف عقلی طور پر ہی ہذیان نہیں بلکہ ہر دینی اور فطری تقاضے کے خلاف ہے قرآنِ پاک نے اس سلسلہ میں حضرت مسیح کی پوزیشن صاف کی اور کئی کلی اصول بنائے۔

حاکمیت خدا کی ہے پہلا اصول تو یہ ہے کہ حاکمیت صرف خدا کی ہے :

اَلَا لَہُ الْخَلْقُ وَالْاَمْرُ ط (اعراف : ۵۴)	خبردار ہو جاؤ اسی کی مخلوق ہے یعنی وہی ان کو پیدا کرتا ہے اور (اس لیے) اسی کی حکومت واقتدار ہے۔
قُلْ مَنْ بِیَدِہٖ مَلَکُوْتُ کُلِّ شَیْءٍ وَّھُوَ یُجِیْرُ وَلَا یُجَارُ عَلَیْہِ (المومنون : ۸۸)	کہو بتاؤ اگر تم جانتے ہو کہ ہر چیز پر اقتدار کس کے قبضہ میں ہے اور کون ہے وہ جو پناہ دیتا ہے اور اس کے مقابلہ میں کوئی پناہ نہیں دے سکتا۔

اور ہر مسلمان کے لیے ایک مسلم ومقرر قاعدہ بندگی ہے۔

وَلَہٗ اَسْلَمَ مَنْ فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ کُلٌّ لَّہٗ قَانِتُوْنَ۔ (الروم : ۲۶)	اس کے بندے ہیں سب جو آسمانوں میں ہیں یا زمین میں سب اسکے تابع فرمان ہیں۔

کفارہ نہیں، ہر شخص خود ذمہ دار ۲:۔ دوسرا اصول یہ ہے کہ اپنے اعمال کا ذمہ دار خود انسان ہے اور دوسرا کوئی اس کا کفارہ ادا کر ہی نہیں سکتا۔

اَلَّا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰى ۝ وَاَنْ لَّيْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَا سَعٰى (النجم: ۳۸-۳۹)

کوئی بوجھ اٹھانے والا کسی دوسرے کا بوجھ نہیں اٹھائے گا اور انسان کو اسکی سعی یعنی کوشش و عمل ہی کا بدلہ ملے گا۔

مقرب بندے ۳:۔ تیسرا اصول یہ کہ خدا یکتا ہے کوئی اس کی آل اولاد نہیں، کوئی شریک و ہمسر نہیں، سب اس کے تابع فرمان بندے ہیں، فرشتے مقرب و مکرم بندے ہیں اسی طرح انبیاء و صالحین بھی لیکن ان میں سے کوئی بھی خدائی کی صفات و اختیار کا حامل نہیں، سب خوفِ خدا سے لرزاں و ترساں رہتے ہیں۔

وَقَالُوا اتَّخَذَ الرَّحْمٰنُ وَلَدًا سُبْحٰنَهٗ ۭ بَلْ عِبَادٌ مُّكْرَمُوْنَ ۝ لَا يَسْبِقُوْنَهٗ بِالْقَوْلِ وَهُمْ بِاَمْرِهٖ يَعْمَلُوْنَ ۝ يَعْلَمُ مَا بَيْنَ اَيْدِيْهِمْ وَمَا خَلْفَهُمْ وَلَا يَشْفَعُوْنَ ۙ اِلَّا لِمَنِ ارْتَضٰى وَهُمْ مِّنْ خَشْيَتِهٖ مُشْفِقُوْنَ ۝ وَمَنْ يَّقُلْ مِنْهُمْ اِنِّىْٓ اِلٰهٌ مِّنْ دُوْنِهٖ فَذٰلِكَ نَجْزِيْهِ جَهَنَّمَ ۭ كَذٰلِكَ نَجْزِي الظّٰلِمِيْنَ (الانبیاء: ۲۶-۲۸)

اور کہتے ہیں رحمان اولاد رکھتا ہے، سبحان اللہ بلکہ (فرشتے تو) بندے ہیں مکرم و معزز، اس کے حضور بڑھ کر نہیں بولتے اور اس کے حکم پر عمل پیرا رہتے ہیں جو کچھ ان کے سامنے ہے یا ان سے اوجھل ہے وہ سب جانتا ہے، وہ کسی کی سفارش نہیں کرتے بجز اس کے جس کی سفارش پر وہ راضی ہو یعنی اجازت دے اور وہ اس کے خوف سے ڈرتے رہتے ہیں اور جو کوئی بھی ان میں سے کہہ دے کہ اللہ کے

سوا میں بھی ایک خدا ہوں تو اسے ہم
جہنم کی سزا دیں، ہم ظالموں کو یہی بدلہ
دیتے ہیں۔

قرآن پاک کے ذریعہ جناب رسول انور صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ تین اہم اصول بیان کرکے حضرت مسیحؑ کی پوزیشن بالکل صاف کر دی۔ نہ ان کی الوہیت باقی رہی نہ خداکاری کی ضرورت ورنہ نبوت وا قانیم ثلاثہ کا چکر۔ ان تینوں متفرق اصولوں کو حضرت مسیحؑ کے سلسلہ میں اس طرح یک آیت میں یکجا کیا گیا ہے جو بڑی جامع ہے۔

يَا أَهْلَ الْكِتَابِ لَا تَغْلُوا فِي	اے اہل کتاب (مراد مسیحی ہیں) اپنے دین
دِينِكُمْ وَلَا تَقُولُوا عَلَى اللَّهِ	میں غلو نہ کرو یعنی حد سے تجاوز نہ کرو اور
إِلَّا الْحَقَّ ۚ إِنَّمَا الْمَسِيحُ عِيسَى ابْنُ	اللہ کی طرف حق کے سوا کوئی بات منسوب
مَرْيَمَ رَسُولُ اللَّهِ وَكَلِمَتُهُ	نہ کرو، بیشک مسیح ابن مریم اس کے سوا
أَلْقَاهَا إِلَىٰ مَرْيَمَ وَرُوحٌ مِّنْهُ	کچھ نہ تھا کہ اللہ کا ایک رسول تھا اور
فَآمِنُوا بِاللَّهِ وَرُسُلِهِ ۖ وَلَا	ایک کلمہ یعنی حکم و فرمان تھا جو اللہ نے
تَقُولُوا ثَلَاثَةٌ ۚ انتَهُوا	مریم کی طرف بھیجا اور ایک روح تھی اللہ
خَيْرًا لَّكُمْ ۚ إِنَّمَا اللَّهُ إِلَٰهٌ	کی طرف سے، پس تم اللہ اور اس کے
وَاحِدٌ ۖ سُبْحَانَهُ أَن يَكُونَ	رسولوں پر ایمان لاؤ اور نہ کہو کہ تین ہیں
لَهُ وَلَدٌ ۘ لَّهُ مَا فِي السَّمَاوَاتِ	باز آجاؤ یہی تمہارے لیے بہتر ہے اللہ تو
وَمَا فِي الْأَرْضِ ۗ وَكَفَىٰ بِاللَّهِ	بس ایک ہی ہے وہ پاک ہے اس سے
وَكِيلًا ۞ لَّن يَسْتَنكِفَ الْمَسِيحُ	کہ کوئی اس کا بیٹا ہو، آسمانوں اور زمین

اَنْ یَّکُوْنَ عَبْدًا لِّلّٰہِ وَلَا الْمَلٰٓئِکَۃُ الْمُقَرَّبُوْنَ وَمَنْ یَّسْتَنْکِفْ عَنْ عِبَادَتِہٖ وَیَسْتَکْبِرْ فَسَیَحْشُرُھُمْ اِلَیْہِ جَمِیْعًا۔ (النساء: ۱۷۱-۱۷۲)

کی ساری چیزیں اس کی ملک ہیں اور ان کی کفالت وخبر گیری کے لیے بس وہی کافی ہے، مسیحؑ نے کبھی اس بات کو عار نہ سمجھا کہ وہ اللہ کا بندہ ہے اور نہ مقرب ترین فرشتے (بندگی کو) اپنے لیے عار سمجھتے، اگر کوئی اللہ کی بندگی کو اپنے لیے عار سمجھتا ہے اور تکبر کرتا ہے تو ایک وقت آئے گا جب وہ سب کو گھیر کر اپنے سامنے حاضر کریگا۔

قرآن نے اس طرح مسیحؑ کے لاہوتی وناسوتی حالات پہ جو جھگڑے تھے ان کا دروازہ بند کیا اور رسول اور کامل بندہ ثابت کیا، دوسری طرف آپ پہ سے اس غبار کو دور کیا کہ آپ ذلت ومسکنت کے ساتھ سولی پر چڑھے بلکہ یہ بتایا کہ آپ زندہ آسمان پہ اٹھالیے گئے۔

وَقَوْلِھِمْ اِنَّا قَتَلْنَا الْمَسِیْحَ عِیْسَی ابْنَ مَرْیَمَ رَسُوْلَ اللّٰہِ وَمَا قَتَلُوْہُ وَمَا صَلَبُوْہُ وَلٰکِنْ شُبِّہَ لَھُمْ وَاِنَّ الَّذِیْنَ اخْتَلَفُوْا فِیْہِ لَفِیْ شَکٍّ مِّنْہُ مَا لَھُمْ بِہٖ مِنْ عِلْمٍ اِلَّا اتِّبَاعَ الظَّنِّ وَمَا قَتَلُوْہُ یَقِیْنًا بَلْ رَّفَعَہُ اللّٰہُ اِلَیْہِ وَکَانَ اللّٰہُ عَزِیْزًا حَکِیْمًا۔ (النساء: ۱۵۷-۱۵۸)

اور ان کے اس قول کی وجہ سے بھی ان پر لعنت وملامت ہے کہ ہم نے مسیح عیسیٰ ابن مریم کو قتل کر دیا ہے، حالانکہ فی الواقع انہوں نے نہ اس کو قتل کیا نہ صلیب پر چڑھایا بلکہ معاملہ ان پر مشتبہ کر دیا گیا اور جن لوگوں نے ان کے بارے میں اختلاف کیا ہے وہ بھی دراصل شک میں مبتلا ہیں، انہیں اس معاملہ کا کوئی علم نہیں محض گمان کی

پیروی ہے، انہوں نے اس کو یقیناً
قتل نہیں کیا بلکہ اللہ نے اسے اپنی طرف
اٹھالیا، اللہ زبردست طاقت رکھنے
والا اور حکیم ہے۔

مسیح کی الوہیت کا دعویٰ یہود و نصاریٰ کا افتراء | اور عیسیٰ پر یہود نے جو ظلم کیا اور آپ کو مجرم ٹھہرایا کہ آپ نے الوہیت کا دعویٰ کیا یہ سراسر بے بنیاد اور غلط ہے، قرآن پاک نے صاف صاف موقف اختیار کیا اور دعویٰ کیا کہ دعوائے الوہیت کا یہ جرم جو یہود نے نفرت میں اور نصاریٰ نے محبت میں حضرت عیسیٰ پر لگایا ہے آپ اس سے بالکل بری ہیں۔ قرآن مجید نے کس طرح دلکش اور ادیبانہ تصویر کھینچی ہے ملاحظہ ہو :

وَاِذْ قَالَ اللّٰهُ يٰعِيْسَى ابْنَ	جب اللہ فرمائے گا کہ اے عیسیٰ بن مریم
مَرْيَمَ ءَاَنْتَ قُلْتَ لِلنَّاسِ	کیا تو نے لوگوں سے کہا تھا کہ خدا کے سوا
اتَّخِذُوْنِيْ وَاُمِّيَ اِلٰهَيْنِ مِنْ	مجھے اور میری ماں کو خدا بنالو ــــــ
دُوْنِ اللّٰهِ قَالَ سُبْحٰنَكَ مَا	تو وہ خود جواب میں عرض کرے گا
يَكُوْنُ لِيْٓ اَنْ اَقُوْلَ مَا لَيْسَ	سبحان اللہ میرا یہ کام نہ تھا کہ وہ بات
لِيْ بِحَقٍّ اِنْ كُنْتُ قُلْتُهٗ فَقَدْ	کہتا جس کے کہنے کا مجھے حق نہ تھا، اگر
عَلِمْتَهٗ تَعْلَمُ مَا فِيْ نَفْسِيْ	میں نے ایسی بات کہی ہوتی تو آپ کو
وَلَآ اَعْلَمُ مَا فِيْ نَفْسِكَ اِنَّكَ	ضرور علم ہوگا، آپ جانتے ہیں جو کچھ میرے
اَنْتَ عَلَّامُ الْغُيُوْبِ مَا قُلْتُ	دل میں ہے اور میں نہیں جانتا جو کچھ
لَهُمْ اِلَّا مَآ اَمَرْتَنِيْ بِهٖٓ اَنِ اعْبُدُوا	آپ کے دل میں ہے آپ تو ساری پوشیدہ

اللّٰہَ رَبِّیْ وَرَبَّکُمْ۔ (المائدہ: ۱۱۶-۱۱۷)

حقیقتوں کے عالم ہیں۔ میں نے ان سے اس کے سوا کچھ نہیں کہا جس کا آپ نے مجھے حکم دیا تھا، یہ کہ اللہ کی بندگی کرو جو میرا بھی رب ہے اور تمہارا بھی رب۔

نیز رسول انور صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ خدا نے حضرت عیسیٰؑ کا حال اس طرح ظاہر کیا، ان کو برگزیدہ انبیاء کی صف میں کھڑا کیا۔ خدا کی قربت اور دنیا و آخرت کی وجاہت کا اعلان اس طرح کیا:

اِسْمُہُ الْمَسِیْحُ عِیْسَی ابْنُ مَرْیَمَ وَجِیْہًا فِی الدُّنْیَا وَالْآخِرَۃِ وَمِنَ الْمُقَرَّبِیْنَ وَیُکَلِّمُ النَّاسَ فِی الْمَھْدِ وَکَھْلًا وَّمِنَ الصّٰلِحِیْنَ

(آل عمران: ۴۵-۴۶)

اس کا نام مسیح عیسیٰ ابن مریم ہوگا دنیا اور آخرت میں معزز ہوگا، مقرب بندوں میں شمار کیا جائے گا اور وہ صالح بندوں میں سے ہوگا۔

اور ان وضاحتوں کے بعد سرور کائنات ؐ نے حضرت عیسیٰؑ پر سے الزامات دور کیے اور دنیا کو قصوروار ٹھہرایا۔

۴: "روح حق" کے آنے سے مراد حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات گرامی صفات ہے، قرآن پاک میں اس کی بے شمار تصریحات موجود ہیں جنکا تفصیلی ذکر یہاں فائدہ سے خالی نہ ہوگا۔

حق کی تفصیل قرآن کی روشنی میں

اِنَّآ اَرْسَلْنٰکَ بِالْحَقِّ بَشِیْرًا وَّنَذِیْرًا وَّلَا تُسْئَلُ عَنْ اَصْحٰبِ

ہم نے تم کو حق (بات) کے ساتھ خوشخبری دینے والا اور ڈرانے والا بنا کر بھیجا اور

الْجَحِيمِ (بقرہ: ۱۱۹) اہلِ دوزخ کے تم جواب دہ اور ذمہ دار نہیں ہو۔

تِلْكَ آيٰتُ اللّٰهِ نَتْلُوهَا عَلَيْكَ بِالْحَقِّ وَاِنَّكَ لَمِنَ الْمُرْسَلِينَ (بقرہ: ۲۵۲) یہ اللہ کی آیات ہیں جنھیں ہم تمھیں حق کے ساتھ یعنی سچ اور ٹھیک سنا رہے ہیں اور تم یقیناً رسولوں میں سے ہو۔

تم پر نازل کردہ کتاب کتبِ سابقہ کی تصدیق کرتی ہے۔

نَزَّلَ عَلَيْكَ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ۔ (آل عمران: ۳) اس نے تم پر یہ کتاب نازل کی جو حق لیکر آئی ہے اور ان کتابوں کی تصدیق کرتی ہے جو پہلے سے آئی ہوئی تھیں۔

اس کتابِ حق کی غایت یہ ہے کہ اس کے قانون پر حکومت کی جائے اور اسی کی روشنی میں عدالت کے فیصلے کیے جائیں:

اِنَّآ اَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ لِتَحْكُمَ بَيْنَ النَّاسِ بِمَآ اَرٰىكَ اللّٰهُ (نساء: ۱۰۵) ہم نے یہ کتاب حق کے ساتھ تمہاری طرف نازل کی ہے تاکہ جو راہ راست اللہ نے تمہیں دکھائی ہے اس کے مطابق لوگوں کے درمیان فیصلہ کرو۔

نبی برحق پر روح القدس کے ذریعہ قرآن ہدایت و بشارت و شجاعت پیدا کرنے کے لیے ارسال کیا گیا ہے:

قُلْ نَزَّلَهُ رُوحُ الْقُدُسِ مِنْ رَّبِّكَ بِالْحَقِّ لِيُثَبِّتَ ان سے کہو! (قرآن کو) تو روح القدس نے تمہارے رب کی طرف سے حق کے ساتھ

الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَهُدًى وَّبُشْرٰى لِلْمُسْلِمِیْنَ ۔
(نحل: ۱۰۲)

بتدریج نازل کیا، تاکہ ایمان والوں کے ایمان کو پختہ کرے اور ہدایت وبشارت ہے فرمانبرداروں کے لیے۔

وَبِالْحَقِّ اَنْزَلْنٰهُ وَبِالْحَقِّ نَزَلَ وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا مُبَشِّرًا وَّنَذِیْرًا ۔ (الاسراء: ۱۰۵)

حق کے ساتھ ہم نے (قرآن کو) نازل کیا اور حق ہی کے ساتھ یہ نازل ہوا ہے اور تمہیں ہم نے بشارت دینے والا اور ڈرانے والا بنا کر بھیجا ہے۔

آپ کی آمد کو حقانیت وصداقت کی اور حق کی دلیل بتایا گیا ہے:

وَقُلْ جَآءَ الْحَقُّ وَزَهَقَ الْبَاطِلُ اِنَّ الْبَاطِلَ كَانَ زَهُوْقًا ۔
(اسراء: ۸۱)

اور اعلان کردو کہ حق آگیا اور باطل کی روح نکل گئی یعنی مٹ گیا، باطل ٹوٹنے ہی والا ہے۔

حق کے آنے اور اس میں کسی قسم کا شک نہ کرنے اور مومن اہلِ کتاب سے اس کے بارے میں پوچھنے کا تذکرہ اس طرح ہے:

فَاِنْ كُنْتَ فِیْ شَكٍّ مِّمَّآ اَنْزَلْنَآ اِلَیْكَ فَسْئَلِ الَّذِیْنَ یَقْرَءُوْنَ الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلِكَ لَقَدْ جَآءَكَ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّكَ فَلَا تَكُوْنَنَّ مِنَ الْمُمْتَرِیْنَ ۔
(یونس: ۹۴)

اگر تجھے اس (ہدایت) کی طرف سے کچھ بھی شک ہو جو ہم نے تجھ پر نازل کی ہے تو ان لوگوں سے پوچھ لے جو پہلے سے کتاب پڑھ رہے ہیں فی الواقع تیرے پاس حق ہی آیا ہے لہذا تو شک کرنے والوں میں سے نہ ہو۔

ساری انسانیت کے لیے رسول برحق پر آئینۂ حق نازل ہونے اور ہدایت کی دعوت اس طرح دی گئی ہے۔ یہاں حق سے مراد رسول برحق اور کتاب برحق دونوں ہی ہو سکتے ہیں۔

قُلْ يَا أَيُّهَا النَّاسُ قَدْ جَاءَكُمُ	کہدو کہ لوگو تمہارے پاس تمہارے رب
الْحَقُّ مِنْ رَبِّكُمْ فَمَنِ اهْتَدَىٰ	کی طرف سے حق آچکا ہے اب جو سیدھی
فَإِنَّمَا يَهْتَدِي لِنَفْسِهِ وَمَنْ	راہ اختیار کرے اس کی راست روی
ضَلَّ فَإِنَّمَا يَضِلُّ عَلَيْهَا وَمَا	اس کے لیے مفید ہے اور جو گمراہ رہے
أَنَا عَلَيْكُمْ بِوَكِيلٍ (یونس: ۱۰۸)	اس کی گمراہی اسی کے لیے تباہ کن ہے
	اور میں تمہارے اوپر کوئی حوالدار نہیں ہوں۔

سورۂ زمر (۴۱) میں بھی یہ بات کہی گئی ہے أَنَا عَلَيْكُمْ کی جگہ أَنْتَ عَلَيْهِمْ ہے آیات الٰہی کو عین حق اس طرح کہا گیا ہے:

الْمَرٰ تِلْكَ آيَاتُ الْكِتَابِ وَالَّذِي	المرٰ۔ یہ کتاب الٰہی کی آیات ہیں اور جو
أُنْزِلَ إِلَيْكَ مِنْ رَبِّكَ الْحَقُّ	تمہارے رب کی طرف سے تم پر نازل
وَلَٰكِنَّ أَكْثَرَ النَّاسِ لَا يُؤْمِنُونَ	کیا گیا وہ عین حق ہے مگر اکثر لوگ مان
(الرعد: ۱)	نہیں رہے ہیں۔

رسولؐ کو خاکم بدہن گستاخ مجنون کہنے والوں کا جواب اس طرح دیا گیا ہے۔

أَمْ يَقُولُونَ بِهِ جِنَّةٌ بَلْ جَاءَهُمْ	کیا کہتے ہیں کہ وہ مجنون ہے؟ نہیں،
بِالْحَقِّ وَأَكْثَرُهُمْ لِلْحَقِّ كَارِهُونَ	بلکہ وہ حق لایا ہے اور حق ہی ان کی
(المومنون: ۷۰)	اکثریت کو ناگوار ہے۔

نبیؐ حق کو صریح حق پر ہونے، خدا پر بھروسہ کرنے اور کتاب رحمت و ہدایت کی خبر

اس طرح دی گئی۔

وَاِنَّهٗ لَهُدًى وَّرَحْمَةٌ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ	اور یہ (قرآن) ہدایت و رحمت ہے
اِنَّ رَبَّكَ يَقْضِيْ بَيْنَهُمْ بِحُكْمِهٖ	مومنوں کے لیے یقیناً تیرا رب ان لوگوں
وَهُوَ الْعَزِيْزُ الْعَلِيْمُ فَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ	کے درمیان اپنے حکم سے فیصلہ کردیگا
اِنَّكَ عَلَى الْحَقِّ الْمُبِيْنِ	وہ غالب اور سب جاننے والا ہے
(النمل : ۷۷-۷۹)	پس اللہ پر بھروسہ رکھو یقیناً تم صریح
	حق پر ہو۔

محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر کتاب گھڑنے کا الزام لگانے والوں کا پردہ اس طرح فاش کیا گیا

الٓمّٓ تَنْزِيْلُ الْكِتٰبِ لَا رَيْبَ فِيْهِ	الم یہ کتاب بلاشبہ رب العالمین کی طرف
مِنْ رَّبِّ الْعٰلَمِيْنَ اَمْ يَقُوْلُوْنَ	سے نازل کی گئی ہے کیا یہ لوگ کہتے ہیں کہ
افْتَرٰىهُ بَلْ هُوَ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّكَ	اس شخص نے اسے خود گھڑ لیا ہے؟ نہیں
لِتُنْذِرَ قَوْمًا مَّآ اَتٰىهُمْ مِّنْ نَّذِيْرٍ	بلکہ یہ حق ہے تیرے رب کی طرف سے
مِّنْ قَبْلِكَ لَعَلَّهُمْ يَهْتَدُوْنَ	تاکہ تو متنبہ کرے ایک ایسی قوم کو جس کے
(السجدۃ : ۱-۳)	پاس تجھ سے پہلے کوئی ڈرانے والا نہیں
	آیا شاید کہ وہ ہدایت پاجائیں۔

رسول برحق ارسال کرنے کا تذکرہ سورۂ فاطر میں اس طرح ہے:

اِنَّآ اَرْسَلْنٰكَ بِالْحَقِّ بَشِيْرًا وَّ	ہم نے تم کو حق کے ساتھ بھیجا ہے،
نَذِيْرًا وَاِنْ مِّنْ اُمَّةٍ اِلَّا	بشارت دینے والا اور ڈرانے والا
خَلَا فِيْهَا نَذِيْرٌ (فاطر: ۲۴)	اور کوئی امت ایسی نہیں گزری جس میں

ڈرانے والا نہ آیا ہو۔

وَالَّذِیْٓ اَوْحَیْنَآ اِلَیْکَ مِنَ الْکِتٰبِ	جو کتاب ہم نے تمہاری طرف وحی کی ہے۔
ھُوَ الْحَقُّ مُصَدِّقًا لِّمَا بَیْنَ یَدَیْہِ	وہی حق ہے تصدیق کرتی ہے ان کتابوں
اِنَّ اللّٰہَ بِعِبَادِہٖ لَخَبِیْرٌۢ بَصِیْرٌ	کی جو اس سے پہلے آئی تھیں بیشک اللہ
(فاطر : ۳۱)	اپنے بندوں کے حال سے باخبر اور ہر چیز پر
	نگاہ رکھنے والا ہے۔

حق پر آنے اور رسولوں کی تصدیق کرنے کا تذکرہ یوں ہے :

وَیَقُوْلُوْنَ اَئِنَّا لَتَارِکُوْٓا اٰلِھَتِنَا	وہ کہتے ہیں، کیا ایک شاعر مجنون کی خاطر
لِشَاعِرٍ مَّجْنُوْنٍ بَلْ جَآءَ بِالْحَقِّ	ہم اپنے معبودوں کو چھوڑ دیں، حالانکہ
وَصَدَّقَ الْمُرْسَلِیْنَ۔	وہ حق لے کر آیا اور رسولوں کی تصدیق کی۔

(الصافات : ۳۶)

خدا کی طرف سے کتابِ حق کے نزول کے بعد مخلصانہ بندگی کیے جانے کا حکم دیا گیا ہے۔

تَنْزِیْلُ الْکِتٰبِ مِنَ اللّٰہِ الْعَزِیْزِ	اس کتاب کا نزول زبردست اور دانا
الْحَکِیْمِ اِنَّآ اَنْزَلْنَآ اِلَیْکَ الْکِتٰبَ	کی طرف سے ہے، یہ کتاب ہم نے تمہاری طرف
بِالْحَقِّ فَاعْبُدِ اللّٰہَ مُخْلِصًا لَّہُ	برحق نازل کی ہے، لہٰذا تم اللہ ہی کی بندگی
الدِّیْنَ اَلَا لِلّٰہِ الدِّیْنُ الْخَالِصُ	کرو اسی کے لیے خالص کرتے ہوئے خبردار!
(زمر : ۱ : ۳)	دین خالص اللہ کا حق ہے۔

سورۂ شوریٰ (۱۷) میں بتایا گیا ہے کہ اللہ ہی نے کتاب حق کے ساتھ نازل کی اور میزان ترازو بھی نازل کیا جس سے مراد اللہ کی شریعت ہے جو ترازو کی طرح تول کر صحیح اور غلط

حق اور باطل، ظلم اور عدل، راستی اور ناراستی اور ایمان و کفر کا فرق واضح کر دیتی ہے۔

سورۂ جاثیہ (۶) میں بھی آیاتِ الٰہی کو حق بتایا گیا ہے اور کفار کے موقف پر تعجب کا اظہار کیا گیا ہے کہ آخر یہ اللہ اور اس کی آیات کے بعد اور کون سی بات ہے جس پر ایمان لا سکتے ہیں۔

اس کتابِ حق ترجمان کو سُن کر جنوں نے اپنی قوم سے کہا تھا۔

اِنَّا سَمِعْنَا كِتٰبًا اُنْزِلَ مِنْۢ بَعْدِ	ہم نے ایک کتاب سُنی ہے جو موسیٰ کے بعد
مُوْسٰى مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ	نازل کی گئی ہے تصدیق کرتی ہے اپنے سے
يَهْدِيْٓ اِلَى الْحَقِّ وَاِلٰى طَرِيْقٍ	پہلے آئی ہوئی کتابوں کی، رہنمائی کرتی ہے
مُّسْتَقِيْمٍ (الاحقاف: ۳۰)	حق اور راہِ راست کی طرف۔

حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی کتاب حق پر ایمان و عمل کی دعوت یوں دی گئی ہے۔

وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ	اور جو لوگ ایمان لائے، نیک عمل کیے
وَاٰمَنُوْا بِمَا نُزِّلَ عَلٰى مُحَمَّدٍ وَّهُوَ	اور اس چیز کو مان لیا جو محمدؐ پر نازل
الْحَقُّ مِنْ رَّبِّهِمْ كَفَّرَ عَنْهُمْ سَيِّاٰتِهِمْ	ہوئی ہے جو ان کے رب کی طرف سے سراسر
وَاَصْلَحَ بَالَهُمْ (محمد: ۲)	حق ہے اللہ نے ان کی برائیاں دور کر دیں
	اور ان کا حال درست کر دیا۔

رسولِ پاکؐ کو دینِ حق و ہدایت اس لیے دیا گیا ہے کہ دنیا میں اسے پھیلا دیں۔

هُوَ الَّذِيْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ	وہ اللہ ہی ہے جس نے اپنے رسول کو
بِالْهُدٰى وَدِيْنِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهٗ	ہدایت اور دینِ حق کے ساتھ بھیجا ہے
عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ ۭ وَكَفٰى بِاللّٰهِ	تاکہ اس کو تمام ادیان پر غالب کرے
شَهِيْدًا۔ (الفتح: ۲۸)	اور حقیقت پر اللہ کی گواہی کافی ہے۔

یہی آیت سورۂ الصف (۹) میں بیان کی گئی ہے اور کفی باللّٰہ شہیدا کی جگہ فرمایا گیا ہے۔ ولوکرہ المشرکون" یعنی دین کو غالب کرنا ہی فرض ہے۔ خواہ مشرکین کو یہ کتنا ہی ناگوار
ذرے سورۂ توبہ (۳۳) میں بھی یہ آیت سورۂ صف ہی کے الفاظ میں وارد ہوئی۔

جو حق کا علم اور حق کا عَلَم (پرچم) ہو، قدیم کتب حق کی تصدیق کرنے والا ہو جس کی کتاب ق، حق وصداقت کے لیے فرقان ہو، جس کی نبوت حقانیت کی دعویدار ہو، جس کا لایا ہوا دین حق کا ترجمان ہو، جو اہل کتاب سے یہ کہتا ہو کہ دین میں غلو نہ کرو اور خدا کی طرف حق کے سوا کچھ منسوب نہ کرو، جسے حق تمام انسانوں تک پہنچانے کی دعوت کا ذمہ دار بنایا گیا ہو، جس حق کے آجانے سے باطل کی حجت بے دلیل ہو جائے۔ اگر وہ روح حق نہیں ہے تو پھر کون حضرت عیسیٰؑ کی پیشینگوئی کا روحِ حق ہوگا، اس سب کی روشنی میں ایک بار پھر بشارت عیسوی کا یہ حصہ پڑھ لیں۔

"مجھے تم سے اور بہت سی باتیں کہنی ہیں مگر اب تم ان کو برداشت نہیں کر سکتے لیکن جب وہ روحِ حق آئے گا تو تم کو تمام سچائی کی راہ دکھائے گا"

سچائی اور ہدایت کی راہ | تم کو تمام سچائی کی راہ دکھائے گا، قرآن پاک کا ارشاد ہے:

وَالَّذِیْ جَآءَ بِالصِّدْقِ وَ	اور وہ شخص جو سچائی لے کر آیا اور
صَدَّقَ بِہٖۤ اُولٰٓئِکَ ھُمُ	جنھوں نے اس کو سچ مانا وہی عذاب
الْمُتَّقُوْنَ (الزمر: ۳۳)	سے بچنے والے ہیں

دوسری جگہ اہل کتاب سے مخاطب ہو کر کہا:

وَیَکْفُرُوْنَ بِمَا وَرَآءَہٗ وَھُوَ الْحَقُّ	اس دائرہ سے باہر (یعنی انبیاء بنی اسرائیل
مُصَدِّقًا لِّمَا مَعَھُمْ (بقرہ: ۹۱)	کے سوا) جو کچھ آیا اسے ماننے سے وہ انکا

کرتے ہیں حالانکہ وہ حق ہے اور اس کی
تصدیق و تائید کررہا ہے جو ان کے پاس
پہلے سے موجود تھا۔

بائبل کے عربی ترجمہ میں سچائی کی راہ کے بدلے "جمیع الحق" کا لفظ ہے جس کا ترجمہ پورے حق سے آگاہ کرے گا، حق اور سچائی ہم معنی لفظ ہیں، حق کے سلسلہ کی آیتیں اوپر گزر چکی ہیں پورے حق یا سچائی سے مراد کامل و مکمل لائحہ عمل اور قانون ہے جس کے متعلق قرآن کا ارشاد ہے:

وَنَزَّلْنَا عَلَيْكَ الْكِتَابَ تِبْيَانًا لِّكُلِّ شَيْءٍ وَهُدًى وَرَحْمَةً وَبُشْرَىٰ لِلْمُسْلِمِينَ۔ (نحل : ۸۹)	ہم نے یہ کتاب تم پر نازل کردی ہے جو ہر چیز کی صاف صاف وضاحت کرنے والی ہے اور ہدایت و رحمت و بشارت ہے ان لوگوں کے لیے جنھوں نے تابعداری قبول کرلی ہے۔

ہر بیماری کا علاج، ہر مشکل کا حل | ہر چیز کی وضاحت، ہر متن کی تشریح، ہر مشکل کا حل، ہر اعتراض کا جواب، ہر تاریکی کے لیے روشنی، ہر زخم کے لیے مرہم، ہر بیماری کے لیے دوا، ہر ناسور کے لیے علاج، ہر بھٹکے ہوئے کے لیے نشان منزل اور ہر انسان کا آخری مطمح نظر، آخری تمنا اور آخری سہارا یہی دین ہے جس میں جامعیت و کاملیت و ابدیت کی شان جلوہ گر ہے اور جس کو قیامت تک انسانیت کا دین اس طرح بنا دیا گیا ہے۔

اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ وَرَضِيْتُ لَكُمُ الْاِسْلَامَ	آج میں نے تمہارے دین کو تمہارے لیے مکمل کردیا ہے اور اپنی نعمت تم پر

دِیْنًا۔ (المائدہ : ۳) تمام کر دی ہے اور تمہارے لیے اسلام کو تمہارے دین کی حیثیت سے قبول کر لیا ہے۔

اور جس کے متعلق حضرت مسیحؑ کا ارشاد ہے۔

"میں باپ سے درخواست کروں گا تو وہ تمہیں دوسرا مددگار بخشے گا کہ ابد تک وہ تمہارے ساتھ رہے۔" (یوحنا : ۱۴ : ۱۶)

اور یہی کمالِ دین کی پہچان اور ختمِ نبوت کی دلیل ہے کہ ابد تک اس کی شریعت باقی اور نافذ رہے گی، ارشاد الٰہی ہے :

مَا كَانَ مُحَمَّدٌ اَبَآ اَحَدٍ مِّنْ رِّجَالِكُمْ وَلٰكِنْ رَّسُوْلَ اللّٰهِ وَخَاتَمَ النَّبِيّٖنَ (الاحزاب : ۴۰)

محمدؐ تمہارے مردوں میں سے کسی کے باپ نہیں ہیں مگر وہ اللہ کے رسول اور خاتم النبیین ہیں۔

اس لیے ابد تک اسی سردار (سرور کائناتؐ) کی پیروی میں انسانیت کی فلاح ہے اور اس کے لائے ہوئے مکمل شدہ دین اسلام ہی میں انسانیت کے لیے دنیا و آخرت کی کامرانی و سعادت ہے اور اب قیامت تک جو دین یا ازم یا فلسفہ اس آخری دین کی ہدایت کو قبول نہ کرے گا دو جہان میں نقصان اٹھائے گا۔

وَمَنْ يَّبْتَغِ غَيْرَ الْاِسْلَامِ دِيْنًا فَلَنْ يُّقْبَلَ مِنْهُ وَهُوَ فِي الْاٰخِرَةِ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ۔ (آل عمران : ۸۵)

اس اسلام (فرمانبرداری کی راہ) کے سوا جو شخص کوئی اور طریقہ اختیار کرنا چاہے اس کا وہ طریقہ ہرگز مقبول نہ ہوگا اور آخرت میں وہ ناکام و نامراد رہے گا۔

روح القدس مراد نہیں ہو سکتے | یہودی تو حضرت مسیحؑ کو نبی ہی نہیں مانتے اس لیے اس پیشین گوئی

گویا حضرت عیسیٰؑ کی کسی بھی پیشین گوئی کو وہ کذب و افترا، بدروحوں کی جعل سازی وغیرہ سے تعبیر کرتے ہیں۔

مسیحی حضرات اس قسم کی تمام پیشین گوئی کا مطلب یہ بتاتے ہیں کہ ان سے مراد روح القدس یعنی فرشتۂ الٰہی جبرئیل ہیں لیکن یہ تاویل اس لیے درست نہیں کہ روح القدس تو حضرت مسیحؑ کے آنے سے بھی پہلے سے موجود تھا بلکہ حضرت مریم کے پاس اللہ کے حکم سے حضرت عیسیٰؑ کی روح کو لے کر آیا تھا اور بائبل کے تمام حوالوں سے اور ادیانِ عالم کی تاریخ سے یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچ چکی ہے کہ روح القدس انسانوں کے وجود سے پہلے سے فرشتگانِ الٰہی کے ساتھ تھا، پیشین گوئی میں وضاحت ہے کہ اگر میں نہ جاؤں گا تو وہ مددگار تمہارے پاس نہیں آئے گا حالانکہ روح القدس ہر ہر موقع پر مسیح کے ساتھ تھا، دوم یہ کہ روح القدس نے دنیا میں آکر انسانوں سے مل کر نہ کو نہ سچائی کی راہ دکھائی اور نہ مسیح علیہ السلام پر تہمتوں کی صفائی پیش کی، یہ ضرور ہے کہ جو کتاب حق خدا نے نبی برحق پر اتاری وہ روح القدس کے ذریعے اتاری لیکن اس حق کی تعلیم، تبلیغ نبیؐ ہی نے دی، توحید کے ذریعے خدا کا جلال ظاہر کیا وغیرہ۔

حضرت عیسیٰ بھی مراد نہیں ہو سکتے یہ بات بالکل واضح ہے، زندگی میں وہ حضرت موسیٰ کی شریعت کے ماتحت تھے اور دوبارہ جب آئیں گے تو شریعت محمدیؐ کے تابع ہوں گے نیز حضرت عیسیٰؑ کے بعد اب تک کوئی ان صفات کا نبی بھی نہیں آیا جو بشاراتِ موسیٰؑ و عیسیٰؑ کا مصداق کہلائے۔

اس لیے عقل و بصیرت، تاریخِ ادیان اور سلامت روی کا تقاضا یہی ہے کہ اس سورج سے زیادہ روشن حقیقت کو انسانیت مان لے کہ وہ آنے والا نبیوں کا سردار

خاتم النبیین خدا کا برگزیدہ بندہ، گواہ، مبشر، نذیر، داعی الی اللہ، خیر اور نیکی کی تمام قدروں کو نشر کرنے والا، سراج منیر محمدؐ امی فداہ ابی وامی ہی ہے جس کے ذریعہ دین مکمل ہوا، نعمت تمام ہوئی اور قیامت تک خدا کی رضامندی کا ضامن اسلام بن گیا۔

زبان حق کا ترجمان | وہ اپنی طرف سے کچھ نہ کہے گا بلکہ وہ جو کچھ سنے گا وہی کہے گا، اس نبی آخر الزماں کی پہچان حضرت موسیٰ علیہ السلام نے توراۃ میں بھی اسی وصف کے ساتھ بتائی ہے اور قرآن نے بھی حضورؐ کا یہی وصف بتایا ہے:

مَا ضَلَّ صَاحِبُكُمْ وَمَا غَوٰى — تمہارا رفیق نہ بھٹکا ہے نہ بہکا ہے
وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى إِنْ هُوَ — وہ اپنی خواہش نفس سے نہیں بولتا
إِلَّا وَحْيٌ يُّوحٰى (النجم: ۳-۴) — یہ تو ایک وحی ہے جو اس پر نازل کی جاتی ہے۔

قرآن پاک کی بے شمار آیتیں واضح طور پر یہ بتاتی ہیں کہ وہ احکام الٰہی و مواعظ جو حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم کے نطق مبارک سے ساری عمر جاری رہے وہ یا تو قرآن پاک کے کلمات حق تھے جو وحی متلو کی شکل میں نازل ہوئے یا وہ وحی غیر متلو تھی جو حکمت و بصیرت کی حامل تھی اور سنت پاک کے ذریعہ ظاہر ہوئی اور اس طرح آپ کی زبان مبارک لسان حق کی ترجمان تھی اور آپ کی تعلیمات سب کی سب حق تعالیٰ شانہٗ کی بیان کی ہوئی تعلیمات ہیں۔ چند آیتیں نمونہ کے طور پر ملاحظہ ہوں:

وَاتْلُ مَا أُوحِيَ إِلَيْكَ مِنْ — تمہارے رب کی طرف سے جو وحی آئی ہے
كِتَابِ رَبِّكَ لَا مُبَدِّلَ لِكَلِمَاتِهٖ — اسے جوں کا توں سنا دو کوئی اس کے
(الکہف: ۲۷) — فرمودات کو بدل دینے کا مجاز نہیں۔

وَكَذٰلِكَ أَوْحَيْنَآ إِلَيْكَ قُرْاٰنًا عَرَبِيًّا لِّتُنْذِرَ أُمَّ الْقُرٰى وَمَنْ حَوْلَهَا (شوریٰ: ۷)	اس طرح ہم نے تم پر یہ قرآن عربی وحی کیا ہے تاکہ تم تمام بستیوں کے مرکز (شہر مکہ) اور اس کے گردوپیش رہنے والوں کو خبردار کردو۔
وَكَذٰلِكَ أَوْحَيْنَآ إِلَيْكَ رُوْحًا مِّنْ أَمْرِنَا (شوریٰ: ۵۲)	اور اسی طرح اے نبی اپنے حکم سے ایک روح تمہاری طرف وحی کی ہے (یعنی وحی کے طریقوں سے تم کو سرفراز کیا ہے)
ذٰلِكَ مِنْ أَنْبَآءِ الْغَيْبِ نُوْحِيْهِ إِلَيْكَ (آل عمران: ۴۴)	یہ غیب کی باتیں ہیں جو ہم تم کو وحی کے ذریعہ بتارہے ہیں۔

ان جیسی بے شمار آیتوں کی روشنی میں یہ بات واضح ہوتی ہے کہ وہ مبشر اعظم جو حضرت عیسیٰؑ کے بعد آئے گا اور جو کچھ خدا کے حکم سے سنے گا وہی بیان کرے گا اور اپنی خواہش نفس سے کچھ نہ کہے گا وہ رسول برحق محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے سوا کوئی اور نہیں۔ آپ کو خدا کی شریعت اور حکم کا ایک لفظ اور نقطہ بدلنے کا نہ اختیار ہے اور نہ آپ نے ایسا کیا، کفار قریش نے جب یہ کہا کہ کوئی مصالحت ہو جائے، تمہاری بعض باتیں ہم مان لیں اور بعض باتیں ہماری تم مان لو، قرآن میں معمولی سی تبدیلی گوارا کرلو اور قرآن کی ان واضح تعلیمات توحید میں کچھ تبدیلی کردو تو اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول کی طرف سے جو تفصیلی جواب عنایت فرمایا اس حقیقت کو پوری طرح آشکارا کرتا ہے کہ نبی برحق کا منصب صرف یہ ہے کہ وہ کلام وحی کا سچا پیرو کار اور حقیقی متبع ہو اپنی طرف سے وہ کچھ کہنے، بڑھانے گھٹانے، چھپانے یا بدل دینے کا اختیار نہیں رکھتا۔

وَاِذَا تُتْلٰى عَلَيْهِمْ اٰيَاتُنَا بَيِّنَاتٍ
قَالَ الَّذِيْنَ لَا يَرْجُوْنَ لِقَآءَنَا
ائْتِ بِقُرْاٰنٍ غَيْرِ هٰذَآ اَوْ بَدِّلْهُ
قُلْ مَا يَكُوْنُ لِيْٓ اَنْ اُبَدِّلَهٗ مِنْ
تِلْقَآئِ نَفْسِيْ اِنْ اَتَّبِعُ اِلَّا مَا
يُوْحٰٓى اِلَيَّ اِنِّيْٓ اَخَافُ اِنْ عَصَيْتُ
رَبِّيْ عَذَابَ يَوْمٍ عَظِيْمٍ قُلْ لَّوْ
شَآءَ اللّٰهُ مَا تَلَوْتُهٗ عَلَيْكُمْ
وَلَآ اَدْرٰىكُمْ بِهٖ فَقَدْ لَبِثْتُ
فِيْكُمْ عُمُرًا مِّنْ قَبْلِهٖ اَفَلَا
تَعْقِلُوْنَ فَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنِ
افْتَرٰى عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا اَوْ
كَذَّبَ بِاٰيٰتِهٖ اِنَّهٗ لَا يُفْلِحُ
الْمُجْرِمُوْنَ ۝

(یونس: ۱۵-۱۷)

جب انہیں ہماری صاف صاف باتیں
سنائی جاتی ہیں تو وہ لوگ جو ہم سے ملنے
کی توقع نہیں رکھتے، کہتے ہیں کہ اس کے
بجائے کوئی اور قرآن لاؤ یا اس میں سے
کچھ ترمیم و تبدیلی کر دو، ان سے کہو میرا
یہ کام نہیں ہے کہ اپنی طرف سے اس میں
کوئی تغیر و تبدل کر لوں، میں تو بس اس
وحی کا پیرو ہوں جو میرے پاس بھیجی جاتی
ہے اگر میں اپنے رب کی نافرمانی کروں تو
مجھے ایک بڑے ہولناک دن کے عذاب کا
ڈر ہے، کہو اگر اللہ کی مشیت یہ ہوتی تو
میں یہ قرآن کبھی نہیں سناتا اور تمہیں اس کی
خبر تک نہ دیتا، آخر اس سے پہلے میں ایک
عمر تمہارے درمیان گزار چکا ہوں کیا تم
عقل سے کام نہیں لیتے، پھر اس سے بڑھ کر
ظالم کون ہوگا جو ایک جھوٹی بات گھڑ کر
اللہ کی طرف منسوب کرے یا اللہ کی واقعی
آیات کو جھوٹا قرار دے، یقیناً مجرم کبھی
فلاح نہیں پاتے۔

واضح ہوگیا کہ بشارتِ موسوی اور بشارتِ انجیلی کا حقیقی مصداق خاتم النبیین والمرسلین ہی ہیں۔
(باقی)

علمائے اصول کے نزدیک صحابہ اور انکی روایات کا مقام

از ڈاکٹر محمد باقر خاں خاکوانی۔ ملتان

لفظ صحابہ کا مادہ صَحِبَ ہے' اس سے اسم فاعل صاحب بنتا ہے جس سے مراد ساتھی، ہم نشیں، دوست وغیرہ ہیں[1] لفظ صحابہ کی اسی مادہ سے دو حیثیتیں ہیں۔ یہ صاد کی زبر کے ساتھ مصدر بھی بنتا ہے اور یہ فعالہ کے وزن پر صاحب کی جمع بھی ہے اور یہ صرف لفظ صاحب کی امتیازی خصوصیت ہے کہ اس سے اس وزن پر جمع کا صیغہ آتا ہے جب کہ اس وزن سے کسی اور لفظ کی جمع نہیں بنتی۔ صاحب کی جمع صحب جیسے راکب کی جمع رکب بھی متداول ہے اور اس کی جمع اصحاب بھی ہے لیکن اس کی جو جمع اکثر مستعمل ہے وہ صحابہ ہے[2]

صاحب اس کو کہتے ہیں جو کسی کے ساتھ وابستہ رہے چاہے وہ انسان ہو' حیوان ہو' مکان ہو یا زمانہ ہو اور عرف عام میں صاحب اس کے لیے استعمال ہوتا ہے جو کسی کے ساتھ زیادہ رہے[3]

صحابی کی اصطلاحی تعریف | علم اصول کی اصطلاح میں صحابی کی تعریف کے بارے میں دو آرار متداول ہیں۔

۱۔ پہلی رائے جمہور کی ہے جنھوں نے صحابی کی وہی تعریف قبول کی ہے جو محدثین کے ہاں مروّج ہے۔

۲۔ دوسری رائے احناف کی اور چند دیگر علمائے کرام کی ہے۔

۱۔ جمہور کی تعریف کو مشہور اصولی ابن حاجب نے اس طرح بیان کیا ہے:

الصحابی من رای الرسول علیہ الصلاۃ والسلام وان لم یرو ولم تطل ؎	صحابی وہ ہے جس نے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا ہو چاہے ان سے کوئی حدیث روایت نہ کی ہو اور نہ ہی ایک طویل مدت تک ان کے ساتھ رہا ہو۔

اس تعریف کو اگر قبول کر لیا جائے تو اس صورت میں صحابیت کی بنیاد رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھنا قرار پائے گی اور اس طرح سے وہ صحابہ جو نابینا تھے، مثلاً ابن ام مکتوم وغیرہ صحابی شمار نہیں ہوں گے۔ مزید یہ کہ اس تعریف میں اس امر کو بھی مخصوص نہیں کیا گیا کہ دیکھنے والا مسلمان ہو یا غیر مسلم۔ اس لحاظ سے یہ تعریف جامع قرار دی جا سکتی ہے اور نہ ہی مانع۔ لیکن جمہور کے اسی نقطۂ نظر کو مشہور حنبلی اصولی ابن نجار فتوحی نے اس انداز میں پیش کیا ہے:

الصحابی من لقی النبی صلی اللہ علیہ وسلم من صغیر او کبیر ذکراً وانثی او خنثی او راٰہ یقظۃ فی حال کونہ صلی اللہ علیہ وسلم حیاً وفی حال کون الرای مسلماً ولو ارتد بعد ذلک ولم یرہ بعد اسلامہ ومات مسلماً ؎	صحابی ہر وہ شخص ہے جس نے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے صغر سنی میں یا بڑی عمر میں ملاقات کا شرف حاصل کیا ہو چاہے وہ مرد ہو، عورت ہو یا مخنث ہو یا اس نے بیداری کی حالت میں (خواب میں نہیں) رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو ان کی حیات مبارکہ میں دیکھا ہو، مزید یہ کہ دیکھنے والا یا ملاقات کرنے والا اس وقت مسلمان

ہو اور اس کی موت بھی حالتِ اسلام
میں آئی ہو چاہے وہ درمیانی مدت میں
مرتد ہی کیوں نہ ہو گیا ہو اور اس نے
دوبارہ اسلام لانے کے بعد آپ کو
نہ دیکھا ہو۔

ابن نجار کی اس تعریف کو جمہور علمائے اصول نے قبول کیا ہے۔ جمہور کی رائے میں شرف صحابیت کے لیے کسی شخص میں اگر ان دو شرائط، ۱۔ ملاقات، ۲۔ دیکھنا، میں سے کوئی ایک موجود ہے تو وہ صحابی کہلانے کا مستحق ہے اور اس امر کے لیے آپ کے ساتھ کچھ مدت رہنا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے کچھ علم کا حصول، یا آپ کے ساتھ کسی مہم میں شرکت یا آپ سے چند احادیث کی روایت کرنا یا ان سے ملتی جلتی اور شرائط عائد نہیں کی جاسکتیں۔ ان کے نزدیک ایک بہت بڑے مجمع میں اگر کوئی شخص آپ کو ایک نظر دیکھ لے تو وہ صحابی ہے۔ جیسے ۹ ہجری میں جسے عام الوفود بھی کہتے ہیں، لاتعداد وفود نے آپ سے ملاقات کی اور کبھی ایک وفد کے بے شمار لوگ یا کئی وفود کے لوگ بیک وقت آپ سے ملاقات کرتے، اسلام قبول کرتے اور اپنی وفاداری کا یقین دلاکے واپس چلے جاتے، یہ تمام لوگ صحابی شمار ہوں گے۔ اسی طرح ۱۰ ہجری میں جب آپ نے فریضۂ حج ادا کیا اور اس موقع پر جن مسلمانوں نے آپ کو دور سے بھی ایک نظر دیکھ لیا تو وہ تمام لوگ صحابی شمار ہوں گے اور شرف صحابیت سے بھی بہرہ ور ہوں گے[1]

جمہور علمائے اصول کے نزدیک ان دو شرائط کے علاوہ کسی اور شرط کا اضافہ اس لیے مناسب نہیں کہ اگر رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ طویل مدت رہنے کی شرط لگا دی جائے تو حضرت جریر بن عبداللہ البجلی صحابی شمار نہیں ہوں گے کیونکہ وہ آپؐ کے وصال سے چالیس

دن قبل اسلام لائے تھے اور ان کے صحابی ہونے پر اجماع ہے اور اگر آپ کے ساتھ غزوات میں شرکت کی شرط عائد کی جائے تو حضرت حسان بن ثابت کا صحابیِ رسول ہونا ثابت نہیں ہوتا جو السابقون الاولون میں سے ہیں اور اگر آپ سے روایتِ احادیث کی شرط قبول کی جائے تو آپ کے وفات کے وقت جو ایک لاکھ چودہ ہزار صحابی موجود تھے ان میں چند ہزار کو چھوڑ کر باقی تمام کی صحابیت سے انکار لازم آتا ہے جن میں بڑے جلیل القدر اصحاب مثلاً حمزہ بن عبدالمالکؓ معصب بن عمیرؓ خبیب اور عاصم بن الافاح وغیرہ بھی شامل ہیں۔ اسلیے انکی رائے میں اس قسم کی تمام شرائط شرف صحابیت کے لیے مناسب نہیں۔[۸]

جمہور کے نزدیک شرف صحابیت کے لیے بعض علمار کی طرف سے بلوغت کی شرط بھی قرین قیاس نہیں۔ ان کی رائے میں وہ بچے بھی صحابی شمار نہیں ہوں گے جن کے سر پر رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے عہد طفولیت میں ہاتھ پھیرا، ان کا بوسہ لیا یا انہیں پیار کیا لیکن انہیں سنِ شعور میں پہنچنے کے بعد آپؐ کی شبیہہ مبارک یاد نہ رہی۔ اس لیے اس میں کم از کم عمر کی حد یہ ہے کہ جس بچے کو آپؐ کی شکل اور آپ کا وہ عمل یاد رہے تو وہ صحابی شمار ہوگا، جیسے محمود بن ربیع جن کے گھر ایک مرتبہ آپؐ تشریف لے گئے اور ان کو پیار بھی کیا اور اپنے منہ کا پانی تبرکاً ان کے منہ میں بھی ڈالا، اس وقت ان کی عمر چار سال تھی اور انہیں آپؐ کی صورت اور یہ عمل یاد رہا، اس لیے انہیں صحابی شمار کیا جائے گا[۸] اور اگر شرفِ صحابیت کے لیے بلوغ کی شرط عائد کی جائے تو جمہور کی رائے میں حضرت حسن، حسین، عبداللہ بن زبیر نعمان بن بشیر اور اس طرح کے دوسرے لوگ زمرۂ صحابہ میں شمار نہیں ہوتے۔[۹]

۲۔ علمائے اصول میں سے دوسری رائے احناف، معتزلہ اور چند دیگر علمار کی ہے ان کے نزدیک صحابی کے لیے جمہور کی عائد کردہ شرائط کے علاوہ چند اور شرائط بھی ضروری

ہیں، ان کی رائے میں صحابی کی تعریف ہے۔

الصحابي عند جمهور الاصوليين	صحابی وہ مسلمان ہے جس نے ایک مدت
مسلم طالت صحبته مع النبي	رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی معیت
صلى الله عليه وسلم[1]	میں گزاری ہو۔

ان علمائے اصول نے مدت کا تعین نہیں کیا لیکن ان کی رائے میں اس کا تعین عرف عام کے ذریعے کیا جائے گا یعنی جتنی مدت میں ایک شخص کسی اور کے ساتھ رہنے سے اس کے اخلاق عادات، تعلیمات وغیرہ سے آگاہ ہو جائے وہ مدت شرف صحابیت کے لیے کافی ہے اور معتزلہ کے نزدیک یہ شرط بھی ہے کہ آپ کے ساتھ رہنے والا آپ سے کچھ علم سیکھنے کی غرض سے رہا ہو کیونکہ حصول علم کی غرض کے بغیر رہنے سے انسان کچھ سیکھتا نہیں لہذا اسے صحابی نہیں کہا جا سکتا۔[11]

یہاں یہ امر قابل ذکر ہے کہ احناف جمہور کے نزدیک بیان کردہ صحابی کی تعریف قبول کرتے ہوئے ایک شرط کا اضافہ کرتے ہیں کہ شرعی امور میں ان صحابہ کی روایت قبول کی جائے گی جو ایک مدت تک رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت میں رہے ہوں، اس لیے وہ راوی کی دو قسمیں معروف اور مجہول بیان کرتے ہیں۔[12]

احناف کی رائے میں دینی امور کی بڑی اہمیت ہے۔ اس لیے اس کی بنیاد ان صحابۂ کرام کی روایتوں پر رکھی جائے جنھوں نے کچھ مدت تک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت میں رہکر دین کا علم اور فہم حاصل کیا ہو، نیز آپ نے ان کو مختلف ذمہ داریاں سونپی ہوں اور انھوں نے ان کو نبھایا۔ وہ حضرت علیؓ کے اس قول سے استدلال کرتے ہیں جس میں انھوں نے صحابہ کی تین قسمیں بیان کی ہیں۔

۱۔ مخلص مومن جو آپ کی صحبت میں رہا ہو، آپ کے کلام کو سمجھا ہو اور جو کچھ آپ نے اس کے سامنے بیان کیا اس کلام کے معنی سے آگاہ ہوا اور آپ کی مراد سے واقف ہو۔

۲۔ اعرابی (بدو) جو اپنے قبیلہ سے آیا ہو اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے کلام کا کچھ حصہ سنا مگر اس کی حقیقت کو نہ سمجھا پھر اپنے قبیلہ میں لوٹ گیا اور ان الفاظ میں حدیث روایت کی جو آپ کی زبان مبارک سے نہیں نکلے تھے۔ اس سے حدیث کے معنی بدل گئے۔ حالانکہ وہ یہ سمجھتا رہا کہ وہ آپ کے قول کو من وعن ادا کر رہا ہے۔

۳۔ وہ منافق جس کا نفاق ظاہر نہ ہو، وہ بغیر سنے حدیث روایت کرے اور آپ پر بہتان باندھے، اس سے لوگ وہ حدیث سنیں اور اس کو مومن مخلص سمجھیں اور وہ حدیث روایت در روایت لوگوں میں مشہور ہو جائے[۱۳]

احناف کی دوسری دلیل وہ ہے جس میں آئمہ صحابہ نے بھی بعض صحابہ کی روایات انکے صحبت نبی سے فیضیاب نہ ہونے کی وجہ سے رد کر دی تھیں، مثلاً حضرت عمرؓ سے فاطمہ بنت قیس کی حدیث[۱۴] اور حضرت علیؓ نے معقول بن سنان اعرابی کی حدیث کو رد کیا تھا[۱۵]

ان وجوہ کے سبب احناف صحابی کی تعریف میں مذکورہ بالا شرائط کا اضافہ کرتے ہیں تاکہ دین کے معاملہ میں احتیاط کا دامن ہاتھ سے نہ چھوٹے[۱۶]

صحابی کی اصطلاحی تعریف پر بحث کے بعد علمائے اصول نے ان امور کی بھی صراحت کی ہے، جن کے باعث کسی شخص کو صحابی کہا جا سکتا ہے۔ ان میں اہم درج ذیل ہیں:

۱۔ جس شخص کے بارے میں تواتر سے معلوم ہو کہ وہ صحابی ہے مثلاً عشرۂ مبشرہ اور اس طرح کے دوسرے معروف صحابۂ کرام۔

۲۔ کسی شخص کا صحابی ہونا مشہور ہو اگرچہ تواتر کے درجہ تک نہ پہنچتا ہو مثلاً ضمام

بن ثعلبہ اور عکاشہ بن محصن وغیرہ۔

۳۔ کوئی مشہور صحابی کسی شخص کے صحابی ہونے کی شہادت دے جیسے حممہ بن ابی حممہ کے صحابی ہونے کی شہادت ابوموسیٰ اشعریؓ نے دی تھی۔

۴۔ کوئی عادل شخص ایسے زمانہ تک صحابی ہونے کا دعویٰ کرے جس میں صحابی ہونے کا امکان بھی ہو، علمار نے یہ زمانہ ۱۰۰ھ یا ۱۱۰ھ تک مقرر کیا ہے۔ اس لیے جعفر بن نسطور رومی متوفی ۲۲۰ھ اور رتن ہندی متوفی ۶۳۲ھ یا چھٹی صدی ہجری کے دعویٰ صحابیت کو علمار نے باتفاق رد کیا ہے[۱۷]

پھر ان علمار کی رائے میں تمام صحابۂ کرام میں سے خلفائے راشدین بحسب ترتیب زمانی افضل ہیں، پھر باقی عشرۂ مبشرہ ان کے بعد اصحاب بدر کا مقام ہے پھر اصحاب احد کی فضیلت ثابت ہے اور ان کے بعد اہلِ بیعتِ رضوان کا درجہ ہے اور جمہور کے نزدیک السابقون الاولون سے مراد وہ اصحاب ہیں جنھوں نے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی اقتدار میں دونوں قبلوں کی طرف منھ کرکے نماز ادا کی تھی[۱۸]

سنت کی تعریف | علمائے اصول نے اسلامی قانون کا دوسرا ماخذ سنت کو قرار دیا اور صحابہ کے اس شرف اور عظمت اور دین میں ان کی سبقت کو مدنظر رکھتے ہوئے سنت کی تعریف میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اقوال، افعال اور تقاریر کے علاوہ صحابۂ کرام کے اقوال و افعال کو بھی شامل کیا ہے، جیسے ملاجیون رقمطراز ہیں:

السنۃ تطلق علی قول رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وفعلہ و سکوتہ وعلی اقوال الصحابۃ	سنت کا اطلاق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے قول، فعل تقریر اور صحابہ کے اقوال و افعال پر ہوتا ہے، لیکن

وافعالہم والحدیث یطلق علی قول الرسول خاصۃ [19] لفظ حدیث کا اطلاق خاص رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے قول پر ہوتا ہے۔

علمائے اصول کے مابین صحابہ کے قول، فعل اور تقریر کے سنت شمار ہونے کے بارے میں تین آراء پائی جاتی ہیں۔

۱۔ شافعیہ کے نزدیک صحابہ کا قول سنت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم میں داخل ہے حالانکہ وہ اس کو سنت کی تعریف میں بیان نہیں کرتے لیکن وہ صحابی کے فعل اور تقریر کو نہیں بلکہ صرف قول کو سنت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کا جز سمجھتے ہیں [20]۔

۲۔ اور احناف علمائے اصول رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے قول، فعل و تقریر کے علاوہ صحابہ کے اقوال و افعال کو بھی سنت قرار دیتے ہیں کیونکہ یہ اسلاف کا طریقہ تھا کہ وہ لفظ سنت کا اطلاق طریق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے علاوہ حضرت ابوبکرؓ و عمرؓ کے طریقوں پر بھی کرتے تھے اور وہ بیعت ان شیخین کے طریقہ پر لیتے تھے [21]۔

۳۔ مالکیہ میں سے ابو اسحٰق شاطبی اور بعض دیگر علمائے اصول کی رائے میں صحابہ کا قول، فعل اور تقریر سنت میں شامل ہے اور صحابہ کے عمل سے مراد ان کے وہ اعمال ہیں جن کی موافقت یا مخالفت کے بارے میں قرآن یا حدیث میں کوئی دلیل نہیں ملتی، اس پر بھی عمل کیا جائے گا اور مختلف فیہ معاملات میں ان کی طرف رجوع کیا جائے گا، کیونکہ صحابہ کرام ہر معاملہ میں سنت کی پیروی کرنے والے تھے۔ جیسے حد شرب کے معاملہ میں، مصحف قرآنی کے جمع کرنے کے معاملے میں اور تمام مسلمانوں کو قریش کی قرأت پر جمع کرنے پر اور اس طرح کے کئی اور امور میں ان کی پیروی ہمارے لیے لازم ہے۔ کیونکہ اس کے دلائل ہمیں قرآن اور حدیث دونوں سے ملتے ہیں [22] جیسے صحابہ کرام کی عدالت کے

بارے میں قرآن مجید کی یہ آیات شہادت دے رہی ہیں۔

كُنتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ [۲۳]	بہترین گروہ تم ہو جسے انسانوں کی ہدایت و اصلاح کے لیے نکالا گیا ہے تم نیکی کا حکم دیتے ہو۔
وَكَذَٰلِكَ جَعَلْنَاكُمْ أُمَّةً وَسَطًا لِّتَكُونُوا شُهَدَاءَ عَلَى النَّاسِ [۲۴]	اور ہم نے تم مسلمانوں کو ایک "امت وسط" بنایا ہے تاکہ تم دنیا کے لوگوں پر گواہ ہو۔

اور یہی صحابہ کرام تھے جنھوں نے سب سے پہلے آپ سے علم دین حاصل کیا، وہ اسلام میں سب سے پہلے داخل ہوئے اس لیے اہل سنت نے اتفاق رائے سے صحابہ کو عادل ٹھہرایا اور ان سے روایت اور درایت دونوں قبول کیں۔ مزید یہ کہ حدیث میں ان کی اتباع کا حکم آیا ہے اور صحابہ کی سنت پر عمل کرنے کو سنت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم پر عمل کرنے کے مترادف قرار دیا ہے، جیسا آپ نے فرمایا۔

علیکم بسنتی وسنۃ الخلفاء الراشدین المہدیین [۲۵]	تم پر لازم ہے کہ میری سنت کو اختیار کرو اور خلفائے راشدین جو ہدایت یافتہ ہیں، ان کی سنت کو اختیار کرو۔
اصحابی مثل الملح لا یصلح الطعام الا بہ [۲۶]	میرے صحابہ کی مثال نمک کی سی ہے جس کے بغیر کھانا ٹھیک نہیں ہوتا۔
ان اللہ اختار اصحابا فجعل لی منھم وزرا و انصارا و اصھارا [۲۷]	اللہ تعالیٰ نے میرے اصحاب کو چن لیا ہے اور ان میں سے میرے لیے وزراء

مددگار اور سسرال بنائے ہیں۔

اس لیے ابواسحاق شاطبی کے نزدیک لفظ سنت کا اطلاق درج ذیل چار مقامات پر ہوتا ہے۔

۱۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اقوال پر ۲۔ آپ کے افعال پر ۳۔ آپ کی تقاریر پر ۴۔ خلفائے راشدین اور صحابہ کے قول، فعل اور تقریر پر۔[۲۸]

اس ساری بحث سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ سنت کے معنی میں وسعت ہے اور اسلامی شریعت دورِ صحابہ کے اجتہاد، اجماع، قیاس، فیصلہ جات اور احکام کے بغیر مکمل نہیں ہوتی۔ اس لیے علمائے اصول کے نزدیک سنت میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور انکے اصحاب کے افعال، اقوال اور تقاریر شامل ہوں گے۔

عدالتِ صحابہ | علمائے اصول نے روایت حدیث میں صحابہ کا مقام مزید واضح کرنے کے لیے حدیث کے راویوں کو دو اقسام صحابی راوی اور غیر صحابی راوی میں تقسیم کیا ہے۔[۲۹]

علماء کا اس امر پر اتفاق ہے کہ جرح و تعدیل کے تمام اصول غیر صحابی راوی کے لیے ہیں۔ جہانتک صحابۂ کرامؓ کا تعلق ہے تو ان کی عدالت کے بارے میں چار آرا پائی جاتی ہیں۔

۱۔ ابن حزم ظاہری کی رائے میں صحابۂ کرام عام انسانوں کی مانند ہیں۔ ان میں عادل بھی ہیں اور غیر عادل بھی ہیں۔ اس لیے انکا تزکیہ ضروری ہے اور جو صحابی تزکیہ کے بعد عادل ثابت ہوں ان کی روایت قبول کی جائے گی اور باقی تمام کی رد کر دی جائیں گی۔ ان کی رائے میں دورِ نبویؐ میں بھی لوگ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف جھوٹ منسوب کرتے تھے۔ اس لیے ان کا تزکیہ ضروری ہے، مثلاً ایک آدمی مدینہ کے قریب ایک بستی میں گیا اور بستی والوں سے کہا کہ مجھے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس لیے بھیجا ہے

کہ بستی والے میرا نکاح فلاں عورت سے کر دیں۔ اس پر بستی والوں نے اپنا نمائندہ آپ سے استفسار کے لیے بھیجا تو آپ نے اس امر سے انکار کیا اور ایک آدمی کو اس کے قتل کے لیے روانہ کیا لیکن وہ شخص پہلے ہی مر چکا تھا۔[29]

اسی طرح دور نبویؐ میں بے شمار لوگ منافق تھے اور ان میں سے اکثر کا نفاق ان کی موت تک چھپا رہا۔ مزید آپ کے دور میں بھی کچھ صحابہ مرتد ہوئے مثلاً عیینہ بن حصینؓ اشعث بن قیس، عبداللہ بن ابی سرح وغیرہ اور انہیں کے بارے میں قرآن میں بھی وارد ہے۔

ومن حولکم من الاعراب	اور تمہارے اردگرد جو اعراب ہیں ان میں
منافقون ومن اھل المدینۃ	سے بعض منافق ہیں اور مدینہ والوں میں
مردوا علی النفاق۔	سے بھی نفاق پر اڑے بیٹھے ہیں۔

ان دلائل کی بنیاد پر ان کے نزدیک صحابہ کا تزکیہ ضروری ہے اور وہ مطلقاً عدالت صحابہ کے قائل نہیں۔[30]

۲- دوسری رائے خوارج اور انہیں کے ہم خیال چند دیگر فرقوں کی ہے کہ صحابۂ کرام اس وقت عادل تھے جب تک فتنوں میں داخل نہیں ہوئے اور جب فتنوں کے دور کا آغاز ہوا تو اس وقت جو صحابہ زندہ تھے ان کی عدالت جاتی رہی لہذا ان کا تزکیہ از حد ضروری ہے بلکہ بعض کی روایات معتبر ہی نہیں۔

ان میں سے بعض کی رائے میں فتنے کا آغاز حضرت عثمانؓ کی شہادت سے ہوا اور اس فتنہ میں جو صحابہ شریک تھے یا جنھوں نے خاموشی اختیار کی تمام کی عدالت ختم ہوگئی کیونکہ حضرت عثمانؓ امام برحق تھے اور ان کے خلاف بغاوت کرنا یا بغاوت کو فرو نہ کرنا ایک فاسقانہ عمل ہے اور فسق منافی عدالت ہے۔[31]

معتزلہ کی رائے میں جن لوگوں نے حضرت علیؓ کے خلاف قتال میں حصہ لیا اور پھر توبہ نہ کی ان کی عدالت جاتی رہی کیونکہ وہ امام برحق تھے اور امام کے خلاف بغاوت حرام ہے اس لیے ان کی رائے میں جنگ جمل میں شریک اصحاب جن میں معروف حضرت عائشہؓ، طلحہؓ اور زبیرؓ ہیں اور جنگ صفین میں شریک صحابہ جن میں معروف حضرت معاویہؓ، مغیرہؓ بن شعبہ، عمروؓ بن العاص ہیں اور ان کے علاوہ دوسرے صحابی عادل نہیں رہے [۲۲]

۳۔ جمہور کی رائے میں جہالت عدالت کا اطلاق صحابہ پر نہیں ہوتا۔ ان کے نزدیک تمام صحابہ باجماع امت عدول ہیں اور تمام کی روایات مقبول اور قابل حجت ہیں کیونکہ ان کی تعدیل اللہ تعالیٰ نے ان قرآنی آیات کے ذریعے کی ہے۔

وَالسَّابِقُوْنَ الْأَوَّلُوْنَ مِنَ الْمُهَاجِرِيْنَ وَالْأَنْصَارِ وَالَّذِيْنَ اتَّبَعُوْهُمْ بِإِحْسَانٍ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَرَضُوْا عَنْهُ [۲۳]	اور وہ مہاجر و انصار جنھوں نے سب سے پہلے دعوت ایمان پر لبیک کہنے میں سبقت کی، نیز جو بعد میں راست بازی کے ساتھ پیچھے آئے اللہ ان سے راضی ہوا اور وہ اللہ سے راضی ہوئے۔
لَقَدْ رَضِيَ اللّٰهُ عَنِ الْمُؤْمِنِيْنَ إِذْ يُبَايِعُوْنَكَ تَحْتَ الشَّجَرَةِ [۲۴]	اللہ مومنوں سے خوش ہوگیا جب وہ درخت کے نیچے تم سے بیعت کر رہے تھے
مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ وَالَّذِيْنَ مَعَهٗ أَشِدَّاءُ عَلَى الْكُفَّارِ رُحَمَاءُ بَيْنَهُمْ [۲۵]	محمد اللہ کے رسول ہیں، جو لوگ ان کے ساتھ ہیں کفار پر سخت اور آپس میں رحیم ہیں۔

ان جیسی بے شمار قرآنی آیات کے علاوہ متعدد احادیث نبویؐ سے بھی عدالت صحابہ کا

واضح ثبوت ملتاہے مثلاً آپؐ نے فرمایا :

اصحابی کالنجوم بایہم	میرے صحابی نجوم کی مانند ہیں تم جسکی
اقتدیتم اھتدیتم۔	بھی اقتدا کروگے ہدایت پاؤگے۔

اور اگر ایک شخص عادل ہی نہیں تو اس سے ہدایت حاصل کرنا ناممکنات میں سے ہے۔ اسی طرح آپ کا یہ قول کہ :

خیر القرون قرنی ثم الذین	بہترین لوگ میرے زمانہ والے ہیں
یلونھم ثم الذین یلونھم	پھر جو اس کے بعد آئے۔ ان تین زمانوں
ثم یفشوا الکذب [۳۶]	کے بعد جھوٹ پھیل جائے گا۔

قرآن و سنت کے ان دلائل کے علاوہ یہ امر بھی حد تواتر تک ثابت ہے کہ صحابۂ کرام نے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ہر معاملہ میں مدد کی، ان کے ساتھ ہجرت کی، ان کے کہنے پر جہاد کیا اور اپنی اور اپنے آل و اولاد کی جانیں قربان کیں اور ان کے کہنے پر دینی امور کی حفاظت کی۔ قوانین اسلام کا اجرا کیا اور اللہ کی حدود کو قایم کیا، اس لیے آپ نے ان قربانیوں کو مدنظر رکھتے ہوئے صحابہ سے اپنی محبت کا اظہار کرتے ہوئے فرمایا :

لاتسبوا اصحابی فوالذی نفسی	میرے صحابیوں کو گالیاں مت دو اسکی
بیدہ لو انفق احدکم مثل	قسم جس کے قبضہ میں میری جان ہے تم
احد ذھباً ما بلغ مدّ احدھم	میں سے اگر کوئی احد پہاڑ کے برابر سونا
ولا نصیفہ [۳۷]	بھی خرچ کرے تو وہ صحابی کے ایک مد
	یا اس سے نصف مقدار سونا خرچ کرنے
	کے برابر بھی نہیں پہنچ سکتا۔

علمائے اصول کے نقطۂ نظر کے مطابق صحابہ کی عدالت کی شہادت اللہ تعالیٰ نے بغیر کسی امتیاز کے ان قرآنی آیات میں اور رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان احادیث میں دی ہے۔ ان شواہد کے بعد کسی اور شہادت کی ضرورت نہیں رہتی۔[۴۸]

البتہ جمہور میں سے بعض کی رائے میں فتح مکہ سے قبل تک کے تمام صحابہ مقطوع العدالہ ہیں، ان کے بارے میں کسی قسم کا شک قطعاً مناسب نہیں، البتہ فتح مکہ کے بعد جو لوگ مسلمان ہوئے ان میں کچھ مولفۃ القلوب بھی تھے ان کے بارے میں اختلاف کی گنجائش ہے لیکن ہمارے لیے لازم ہے کہ ہم تمام کے بارے میں کلمہ خیر کہیں۔[۴۹]

جمہور علمائے اصول نے معتزلہ، خوارج وغیرہ کا یہ اعتراض قبول نہیں کیا کہ صحابہ فتنوں میں داخل ہونے سے قبل عادل تھے اور بعد میں عادل نہ رہے۔ ان کی رائے میں حضرت عثمانؓ کی شہادت میں کوئی صحابی شریک نہیں تھے اور نہ ہی ان کے قتل پر کوئی راضی تھا بلکہ باہر سے فاسقوں کا ایک ٹولہ چوروں کی مانند مدینہ میں داخل ہوا اور اس نے یہ فعل قبیح سرانجام دیا، حالانکہ صحابہ نے امیرالمومنین کی حفاظت کی کوشش بھی کی تھی۔ اور حضرت علیؓ سے لڑائیوں میں جمہور علماء کا یہ موقف ہے کہ حضرت علیؓ خلیفہ برحق تھے لیکن جنگ جمل یا جنگ صفین میں مدمقابل فریق سے اجتہادی غلطی سرزد ہوئی تھی اور مجتہد اگر اجتہاد میں غلطی کرے تو اس سے اس کی عدالت کا بطلان ثابت نہیں ہوتا، مزید یہ کہ جنگ جمل کے بعد حضرت عائشہؓ ساری عمر استغفار کرتی رہیں۔ حضرت علیؓ نے دونوں جنگوں کے بعد ان صحابہ کی گواہی قبول کی اور ان کے ساتھ نماز بھی پڑھی جو ان کی مخالفت میں لڑے تھے یا خاموش رہے تھے، مثلاً حضرت سعد بن ابی وقاص، عبداللہ بن مسعود وغیرہ۔ اس لیے جمہور کی رائے میں عدالت صحابہ پر معتزلہ کا یہ اعتراض فاسد ہے۔[۵۰]

۴- چوتھی رائے جمہور احناف کی ہے۔ان کے نزدیک بھی جہالت عدالت کا اطلاق صحابۂ کرام پر نہیں ہوتا کیونکہ ان کی تعدیل قرآن اور حدیث کے نصوص سے ثابت ہے اور اسی طرح صحابہ کی عدالت پر اعتراض کرنا، قرآن وحدیث کی مخالفت کرنا ہے لیکن انسان ہونے کی حیثیت سے بعض کو بعض روایات میں توہم پیدا ہوا، جس کا اظہار ان کے ہم عصر صحابہ نے کیا اور بعض صحابہ کی احادیث کو کچھ صحابہ نے قرآن، سنت متواترہ یا عقلی دلائل سے رد بھی کیا۔اس لیے اگر بعض صحابہ کی روایات کو قرآن، سنت متواترہ یا عقلی دلائل کی روشنی میں رد کیا جائے تو اس صورت میں ان کی عدالت میں فرق نہیں آئے گا۔ذیل میں بعض جلیل القدر صحابہ کے حدیث پر اعتراض کی چند مثالیں دی جارہی ہیں تاکہ احناف کا موقف واضح ہوجائے۔

صحابۂ کرام کے حدیث پر اعتراض کرنے یا اس پر عمل نہ کرنے کے دو اسباب ممکن ہیں۔

۱- ان کو حدیث کا علم تھا، ۲- حدیث کا علم نہیں تھا۔ان ہر دو ممکنہ صورتوں میں راوی کی عدالت میں کوئی فرق نہیں آئے گا۔

حدیث پر صحابۂ کرام کے اعتراضات (الف) حدیث کے مخفی رہنے کا احتمال نہ ہونے کے باوجود اس کی مخالفت؛ اگر صحابۂ کرام ایسی حدیث کی مخالفت کرتے ہیں جس کے مخفی رہنے کا احتمال نہیں ہوسکتا تو یہ احناف کے نزدیک ان کی طرف سے حدیث پر اعتراض ہے لیکن اس سے اس کے راوی کی عدالت مجروح نہیں ہوگی، مثلاً حضرت عبادہ بن صامت سے مروی ہے:

البکر بالبکر جلد مائۃ وتغریب عام۔[۴۳]	اگر کنوارا کنواری سے زنا کرے تو اسے سو کوڑے اور جلاوطنی کی سزا دو۔

جلاوطنی سے مراد شہر بدر کرنا ہے یعنی اسے اس کے مسکن سے اتنی دور بھیج دیا جائے جہاں کے سفر سے نماز قصر ہو جاتی ہے[۴۳] لیکن حضرت عمرؓ نے جب ربیعہ بن خلف کو خیبر کی طرف جلاوطن کیا تو وہ ہرقل روم سے مل گیا اور عیسائی ہوگیا۔ اس پر انہوں نے فرمایا" میں اب کسی کو جلاوطن نہیں کرونگا" ایسے ہی حضرت علیؓ نے بھی فرمایا کہ" جلاوطنی ایک فتنہ ہے"[۴۴] یہ بات واضح ہے کہ یہ حدیث ان بزرگوں سے مخفی نہیں رہ سکتی تھی کیونکہ امام کے فرائض میں سے ایک فریضہ حد کا قائم کرنا بھی ہے اور حضرت عمرؓ اور حضرت علیؓ تو ان شخصیات میں سے ہیں جن سے ہم دین سیکھتے ہیں اگر یہ ائمہ صحابہ کسی حدیث کو جانتے ہوئے اس پر عمل ترک کریں اور اسے فتنہ قرار دیں تو یہ بات ان کی طرف سے اس حدیث کے منسوخ ہونے کی دلیل ہے[۴۵] لیکن اس سے راوی صحابی کی عدالت مجروح نہیں ہوگی۔

اسی طرح رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم جب کسی شہر کو فتح کرتے تو غیر مسلموں پر جزیہ لگاتے اور وہ زمین اور مال غنیمت مجاہدین میں تقسیم فرما دیتے مثلاً بنو نضیر، بنو قریظہ اور خیبر کی فتح کے موقع پر آپ نے ایسا ہی کیا لیکن حضرت عمرؓ نے جب عراق کو فتح کیا تو بقیہ مالِ غنیمت مجاہدین میں تقسیم کرکے زمین اہلِ عراق کے پاس رہنے دی اور ان سے اسکا خراج وصول کیا۔ ظاہر ہے کہ حضرت عمرؓ کو سنتِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کا علم نہ رہا ہو یہ ممکن نہیں مگر وہ جانتے تھے کہ آپ کا یہ فرمان حتمی نہیں تھا، چنانچہ سواد عراق کے مسئلہ پر شوریٰ کے اندر کئی دن تک بحث ہوتی رہی اور حضرت بلالؓ ان کی اس رائے کی شدید مخالفت کرتے رہے مگر حضرت عمرؓ نے اس کی پروا نہیں کی دوسرے تمام صحابہ نے ان کے اس موقف کی حمایت کی۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ یہ حدیث رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے کوئی حتمی حکم نہ تھا جس کو حضرت عمرؓ نے بدل دیا ہو[۴۶]

ایسے ہی حضرت عمرؓ نے متعۃ النساء اور متعۃ الحج سے یہ کہہ کر روک دیا کہ یہ عہد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم میں تھا مگر میں ان سے روک رہا ہوں۔ چنانچہ ابن سیرین نے کہا کہ ایک طرف تو حضرت عمرؓ عہد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم میں عورتوں سے متعۃ کرنے کے حکم کے مروج ہونے کی شہادت بھی دیتے تھے اور دوسری طرف خود ہی اس سے روکتے بھی تھے۔[۷۲]

(ب) حدیث کے مخفی رہنے کے احتمال کے ساتھ اس سے صحابہ کی مخالفت: اگر حدیث کے مخفی رہنے کا احتمال ہو تو ائمہ صحابہ کا اس کے خلاف عمل راوی کی صحت پر اثر انداز نہیں ہوگا کیونکہ امکان ہے کہ وہ حدیث صحابی تک نہ پہنچی ہو اور وہ کسی اور حدیث یا اپنے اجتہاد پر عمل کرتے رہے ہوں مثلاً رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حائضہ کو طواف الصدر کی رخصت عطا فرمائی تھی[۷۳] یعنی اگر حج کے ارکان ادا کرنے کے بعد صرف طواف الصدر باقی رہ جائے اور عورت کو حیض شروع ہو جائے تو وہ یہ طواف چھوڑ کر گھر آسکتی ہے مگر حضرت عبداللہ بن عمرؓ کے بارے میں مشہور ہے کہ وہ اس پر عمل نہیں کرتے تھے اور اگر اپنی خواتین کے ساتھ حج کو جاتے اور یہ صورت حال رونما ہوتی تو پاک ہونے کے بعد خواتین کو طواف صدر کرواکے واپس لاتے۔ چونکہ اس طرح کے واقعات نادر الوقوع ہوتے ہیں لہذا یہ ممکن ہے کہ ان تک رخصت والی حدیث نہ پہونچی ہو اس لیے وہ اس حدیث پر عمل نہ کرتے ہوں[۷۴]

ایسے ہی حضرت ابو موسیٰ اشعری کے بارے میں مشہور ہے کہ وہ اس حدیث پر عمل نہیں کرتے تھے جس میں حکم ہے کہ نماز میں قہقہہ لگانے سے وضو اور نماز دونوں فاسد ہو جاتے ہیں[۷۵] ممکن ہے کہ ان کا اس حدیث کے خلاف عمل عدم واقفیت کی وجہ سے ہو کیونکہ یہ حدیث نادر واقعات سے متعلق ہے اور یہ بھی ممکن ہے کہ یہ حدیث ان تک

نہ پہونچی ہو۔[۵۱]

حوالہ جات

[۱] رازی، محمد بن ابی بکر، مختار الصحاح، لبنان، دار الفکر، تاریخ ندارد، مادہ "صحب" [۲] حوالۂ سابقہ [۳] راغب اصفہانی امام۔ المفردات فی غریب القرآن تحقیق محمد سعید گیلانی کراچی، نور محمد کارخانہ کتب، مادہ "صحب" [۴] عضد الدین ایجی۔ شرح مختصر ابن الحاجب، مصر، المطبعۃ الکبریٰ الامیریہ، ۱۳۱۸ھ، ج ۲ ص ۶۷ [۵] ابن نجار الفتوحی۔ شرح الکواکب المنیر مکہ مکرمہ کلیۃ الشرعیہ، الکتاب الخامس، ج ۲، ص ۴۶۵ [۶] آمدی۔ الاحکام، ج ۲، خلاصہ ص ۱۳۱، ۱۳۲۔ نیز ملاحظہ فرمائیں ایجی۔ شرح مختصر ابن الحاجب ج ۲، ص ۶۷ [۷] عبد العلی بحر العلوم فواتح الرحموت، ج ۲، ص ۱۵۸، نیز ملاحظہ فرمائیں ابن کثیر الباعث الحثیث۔ قاہرہ، مکتبہ دار التراث ۱۹۸۹ء، ص ۱۵۸۔ الباجی ابو الولید۔ احکام الفصول فی احکام الاصول، بیروت، الموسستہ الرسالۃ، ۱۹۸۸ء، ص ۲۹۵ [۸] صحیح بخاری، کتاب العلم، باب نمبر ۱۱، (متی یصح سماع الصغیر) [۹] الفتوحی۔ شرح الکوکب المنیر، ج ۲، ص ۴۷۶، نیز ملاحظہ فرمائیں ابن لحام۔ المختصر فی اصول الفقہ، تحقیق ڈاکٹر محمد مظہر بقا، مکہ مکرمہ، جامعہ ملک عبد العزیز، الکتاب التاسع، ص ۸۹، سیوطی جلال الدین۔ تدریب الراوی، لاہور، دار نشر الکتب الاسلامیہ، تاریخ ندارد، ج ۲ ص ۲۱۰ [۱۰] عبد العلی بحر العلوم، فواتح الرحموت شرح مسلم الثبوت، قم، منشورات الرضی، تاریخ ندارد، ج ۲، ص ۱۵۸ [۱۱] امیر بادشاہ، تیسیر التحریر شرح کتاب التحریر، مصر، مصطفیٰ البابی الحلبی، ۱۳۵۱ھ، ج ۳، ص ۶۷، نیز ملاحظہ فرمائیں بصری ابی الحسین۔ المعتمد فی اصول الفقہ۔ لبنان، دار الکتب العلمیہ، ۱۹۸۳ء، ج ۲، ص ۱۷۲ [۱۲] فخر الاسلام بزدوی۔ اصول البزدوی، کراچی، نور محمد کتب خانہ، تاریخ ندارد، ص ۱۵۸ [۱۳] شاشی نظام الدین۔ اصول الشاشی، دیوبند، مکتبہ رحیمیہ، تاریخ ندارد، ص ۶۷

۱۴؎ صحیح بخاری ۔ کتاب الطلاق ، باب قصہ فاطمہ بنت قیس ۱۵؎ تفصیل کے لیے ملاحظہ فرمائیں، آمدہ صفحات عنوان "مجہول راوی" ۱۶؎ صدر الشریعہ ۔ التوضیح مع التلویح ، کراچی ، نور محمد تجارت کتب، ۱۴۰۰ھ ، ج ۲ ، ص ۴۴۲ ۱۷؎ امیر بادشاہ ، تیسیر التحریر، ج ۲ ، ص ۶۷ ۱۸؎ عبد العلی بحر العلوم، فواتح الرحموت، ج ۲ ، ص ۱۵۹ ۱۹؎ ملاجیون ، نور الانوار شرح المنار ، لبنان ، دار الکتب العلمیہ ۱۴۰۶ھ ، ج ۲ ، ص ۳ ۲۰؎ آمدی ۔ الاحکام فی اصول الاحکام ، ج ۲ ص ۱۳۹ ۲۱؎ سرخسی، شمس الائمہ اصول السرخسی ، قاہرہ ، مطبع دار الکتاب العربی ۱۳۷۲ء ، تحقیق ابو الوفاء دا ہانی ، ج ۱ ، ص ۳۴۱ ۲۲؎ شاطبی ابی اسحاق ۔ الموافقات فی اصول الشریعۃ، مصر ، مکتبہ التجاریہ الکبری ، تاریخ ندارد ، ج ۴ ، ص ۳-۷ ۲۳؎ آل عمران، ۱۱۰ ۲۴؎ البقرہ ۱۴۳ ۲۵؎ مسند احمد بن حنبل ، ج ۴ ، ص ۱۲۶ (حدیث عرباض بن ساریہ) ۲۶؎ ابن قیم جوزیہ، اعلام الموقعین ، بیروت ، دار الجلیل ، ۱۹۷۳ء، ج ۴ ص ۱۳۷ ۲۷؎ حوالہ سابقہ، ج ۴ ، ص ۱۳۸ ۲۸؎ شاطبی ، الموافقات، ج ۴ ، ص ۳-۴ ، ۷۵-۷۷ ۲۹؎ ابن حزم ظاہری ، الاحکام فی اصول الاحکام ، مصر ، مکتبہ الخانجی ، ۱۳۴۵ھ، ج ۲ ص ۲ ۳۰؎ حوالہ سابقہ، ج ۲ ، ص ۳ ۳۱؎ عبد العلی بحر العلوم ، فواتح الرحموت، ج ۲ ، ص ۱۵۵ ۳۲؎ شیرازی ابی اسحق ۔ اللمع فی اصول الفقہ ، مکہ مکرمہ ، محمد صالح منصور الباز ، ۱۳۲۵ھ ، ص ۱۷۸ ، نیز ملاحظہ فرمائیں آمدی ، الاحکام فی اصول الاحکام ، ج ۲ ، ص ۱۲۸ ، ایجی ۔ شرح مختصر ابن حاجب، ج ۲ ، ص ۱۲۸ ۳۳؎ التوبہ ، ۱۰۰ ۳۴؎ الفتح ، ۱۸ ۳۵؎ الفتح ۲۹ ۳۶؎ صحیح بخاری ۔ کتاب فضائل الصحابہ ، باب فضائل الصحابہ باب فضائل اصحاب النبی صلی اللہ علیہ وسلم ۳۷؎ حوالہ سابقہ ۳۸؎ آمدی ۔ الاحکام فی اصول الاحکام ج ۲ ، ص ۱۲۹ ، نیز ملاحظہ فرمائیں ایجی ۔ شرح مختصر ابن الحاجب، ج ۲ ، ص ۶۷ ۳۹؎ عبد العلی بحر العلوم ، فواتح الرحموت ، ج ۲ ، ص ۱۵۶ ۴۰؎ حوالہ سابقہ ، ج ۲ ص ۱۵۵ ۴۱؎ شیرازی ، کتاب اللمع ، ص ۱۸۰ ، آمدی ۔ الاحکام فی اصول الاحکام ، ج ۲ ، ص ۱۳۰ ۴۲؎ سنن ابی داؤد ۔

کتاب ابواب الحدود، باب حد الزنا ۳۳ھ عبد العزیز بخاری۔ کشف الاسرار شرح اصول البزدوی، قسطنطنیہ۔ مکتبہ الصنائع، ۱۳۰۷ھ ج ۳، ص ۸۶، ۳۴ھ بزدوی۔ اصول البزدوی ص ۱۹۶ ۳۵ھ حقانی عبد الحق، النامی شرح الحسامی، دیوبند، کتب خانہ رحیمیہ، تاریخ ندارد ج ۱، ص ۱۵۲ ۳۶ھ نسفی، کشف الاسرار شرح المنار، ج ۲، ص ۸۲ ۴۷ھ بزدوی، اصول البزدوی، ص ۹۶ ۴۸ھ صحیح بخاری، کتاب الحیض، باب المرأۃ تحیض بعد الافاضہ ۴۹ھ سرخسی، اصول السرخسی، ج ۲، ص ۸ ۵۰ھ تفصیل ملاحظہ فرمائیں، آمدہ صفحات عنوان "معروف راوی" ۵۱ھ عبد العزیز بخاری، کشف الاسرار، ج ۳، ص ۸۸۔

اسوۂ صحابہؓ حصہ اول ودوم

از مولانا عبد السلام ندوی

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد مسلمانوں کے لیے صحابۂ کرام کی زندگی اسوہ اور نمونہ ہے، اس لیے دارالمصنفین نے سلسلۂ سیرت کی طرح سلسلۂ سیر الصحابہ کی تالیف کو ضروری اور مقدم سمجھا، اس سلسلہ کو بھی اللہ تعالیٰ نے بڑی قبولیت بخشی، اس سلسلہ میں تقریباً ۱۵ تصنیفات شائع ہو چکی ہیں، مذکورہ بالا کتاب بھی اسی سلسلہ کی کڑی ہے، جس میں صحابۂ کرام کی سیرت، زندگی، اخلاق اور تعلیمات کا عطر کشید کیا گیا ہے، اسکے دو حصے ہیں، پہلے حصہ میں صحابہ اور صحابیات رضی اللہ عنہم کے عقائد، عبادات، اخلاق، حسن معاشرت اور طرز معاشرت وغیرہ کی تفصیل پیش کرکے یہ دکھایا گیا ہے کہ انکی زندگی عمل بالکتاب والسنہ کا کامل نمونہ تھی، دوسرے حصہ میں ان حضرات کی سیاسی، مذہبی اور علمی خدمات کی تفصیل کرکے یہ دکھایا گیا ہے کہ انھوں نے کیونکر اسلام کے عادلانہ نظام کو قائم رکھا اور کیونکر مذہب، اخلاق اور علوم اسلامیہ کی حفاظت واشاعت کی۔ اس کا مطالعہ ہر مسلمان بلکہ غیر مسلموں کے لیے بھی ضروری ہے۔ اس سے اسلام اور مسلمانوں کی اصل خصوصیات پوری طرح سامنے آجاتی ہیں۔

قیمت حصہ اول ۵۰ روپے۔ قیمت حصہ دوم ۵۶ روپے۔

آزاد بلگرامی کے معروف تذکرۂ "ید بیضا" کی چوری کے بارے میں آزاد کا ایک بیان

از ڈاکٹر سید حسن عباس

تذکرہ ید بیضا[1]، قدیم وجدید فارسی گو شعرا کا فارسی میں لکھا گیا ایک عام تذکرہ ہے اس کے مولف معروف تذکرہ نویس اور شاعر و ادیب میر غلام علی آزاد بلگرامی (۱۱۱۶ - ۱۲۰۰ھ) ہیں۔ مولانا آزاد بلگرامی برصغیر کے ان علما میں شمار کیے جاتے ہیں جن پر بجا طور پر مسلمان فخر کر سکتے ہیں۔ آپ کئی اہم کتابوں کے مصنف اور عربی و فارسی کے صاحب دیوان شاعر تھے۔ عربی میں آپ کی مشہور زمانہ کتاب "سبحۃ المرجان فی آثار هندوستان" اور فارسی میں آپ کے مشہور تذکرے — ید بیضا، سرو آزاد اور خزانۂ عامرہ کے علاوہ "مآثر الکرام تاریخ بلگرام" کی افادیت کا ایک زمانہ قائل ہے اور ان کتابوں کے حوالے کثرت سے دیے جاتے ہیں۔

آزاد بلگرامی کو تذکرہ ید بیضا کی تالیف کا خیال اس وقت آیا جب وہ ۱۱۴۳ھ میں سیوستان (سندھ) جا رہے تھے اور ۱۱۴۵ھ کے وسط میں وہیں پر اسے تحریر کیا۔ اس وقت

---

[1] تفصیل کے لیے رجوع کریں:۔ تذکرہ نویسی فارسی در ہند و پاکستان، تالیف ڈاکٹر علی رضا نقوی ص ۲۷۱ و تاریخ تذکرہ ہای فارسی، تالیف گلچین معانی، جلد دوم ص ۴۱۹۔

منابع و مصادر کی کمی اور مسافرت و غربت میں آزاد سے جو کچھ ہو سکتا تھا اس کے مطابق اس تذکرے میں ۵۳۲ شاعروں کا احوال مع انتخاب کلام داخل کیا۔ تحریر اول کا آغاز افضل الدین محمد کاشانی سے اور اختتام میر محمد یوسف بن میر محمد اشرف بلگرامی پر ہوا۔ ۱۱۴۷ھ میں وہ بلگرام واپس آگئے۔ وطن آنے کے بعد اس تذکرے پر نظر ثانی کرکے ۱۱۴۸ھ میں ایک دوسرا نسخہ تیار کیا جس میں شعراء کی تعداد ۱۳۵۹ ہو گئی۔ تحریر دوم کا آغاز ابو الحسن شہید بلخی سے کیا اور خاتمہ میر محمد یوسف بلگرامی پر۔

یہ تذکرہ ابھی تک شایع نہیں ہوا ہے اور اس کے متعدد قلمی[1] نسخے ہندو پاکستان کے کتب خانوں میں موجود ہیں۔ خود مولف کا خود نوشت نسخہ خدا بخش لائبریری میں موجود ہے، البتہ پورا نسخہ مولف کے قلم سے نہیں ہے بلکہ ایک حصہ آزاد کے قلم سے ہے[2] جس دوسرے نسخے پر مولف کے نسخے کا گمان ہے وہ کتابخانۂ شاہان اودھ میں تھا[3] مصنف کا خود نوشت ایک اور نسخہ تھا جسے "نسخۂ صمدن" کا نام دیا گیا تھا۔ اس نسخہ کی خصوصیت یہ تھی کہ یہ مصنف کے والد سید نوح کی فرمایش پر تیار ہوا تھا جس کو آزاد بلگرامی اور ان کے دو بھائیوں غلام حسن اور غلام امام صادق نے لکھا تھا اور حجت الملت والامت سید برہان الدین کی خدمت میں پیش کیا تھا[4]

---

[1] اس کے قلمی نسخوں کے لیے ملاحظہ کریں۔ فہرست مشترک نسخہ ہائے خطی فارسی پاکستان، تالیف احمد منزوی، جلد ۱۱ ص ۵۹، [2] فہرست بانکی پور، جلد ۸ ص ۱۱۶ [3] فہرست اسپرنگر —— CATALOGUE OF THE ARABIC, PERSIAN AND HINDUSTANI MSS. IN THE LIBRARIES OF THE KING OF OUDH BY A.- SPRENGER. M.D. VOL. I P142 - [4] معارف اعظم گڈھ دسمبر ۱۹۲۳ء، مقالۂ مقبول احمد صمدانی۔

مئی ۱۹۹۶ء میں حیدرآباد میں منعقدہ ایک بین الاقوامی سمینار میں شرکت کا موقع ملا۔ سمینار کے بعد ایک دن سالار جنگ میوزیم گیا۔ وہاں دن بھر مخطوطات دیکھتا رہا اور یادداشتیں تیار کرتا رہا۔ سب سے پہلے میں نے آزاد بلگرامی کی تالیفات وتصنیفات[1] کے وہاں موجود قلمی نسخے دیکھے ان ہی نسخوں میں ید بیضا کا وہ مخطوطہ بھی مطالعے میں آیا جس کا نمبر ۱۵ ہے۔ اس مخطوطے کے آخر میں صفحات ۲۵۰-۲۵۲ پر آزاد بلگرامی کی جانب سے ید بیضا کے سرقے سے متعلق یادداشت درج ہے۔ اس نسخے کی کتابت کی تاریخ ۵ جمادی الاولی ۱۲۲۳ھ ہے۔ مخطوطہ متاخر ہے اور غلط کتابت کا نمونہ۔ اس یادداشت کا خلاصہ یہ ہے۔ آزاد کہتے ہیں:

"حرمین شریفین کی زیارت کے بعد اورنگ آباد میں سکونت کے دوران ۱۴ رمضان ۱۱۵۶ھ کو بلگرام سے میر محمد یوسف بلگرامی کا خط آیا کہ آپ کے حرمین شریفین کی زیارت پر جانے کی بعد میدان کو خالی پاکر بنارس کے ایک شخص نے ید بیضا میں جہاں جہاں میرا (آزاد) نام تھا، مٹاکر اس تذکرے کی نقلیں تیار کرواکر اپنے نام سے جاری کیں۔" آزاد کہتے ہیں:

سبحان اللہ! بے حیائی کی کیا نقاب پہنی ہے، ایمان بیچ ڈالا اور دیانت وامانت کو پس پشت ڈال دیا۔" اس کے بعد انہوں نے آیات قرآنی اور احادیث پیش کرکے

---

[1] آزاد بلگرامی اور ان کی فارسی تالیفات وتصنیفات۔ دانشگاہ تہران میں ڈاکٹریٹ کے لیے میرا موضوع تھا اور میں نے اپنا تحقیقی مقالہ اسی موضوع پر داخل کرکے ڈی۔ لٹ کی ڈگری حاصل کی ہے۔ اب یہ تحقیقی مقالہ وہیں سے شایع ہونے والا ہے۔ اس لیے مجھے خصوصی طور پر ان سے اور انکی کتابوں سے دلچسپی ہے اور میں جہاں جاتا ہوں سب سے پہلے آزاد کی کتابیں تلاش کرتا ہوں۔

سرقے کی مذمت کی ہے۔ آزاد کہتے ہیں :

" میں نے اتنی محنتیں اور مشقتیں اٹھائی ہیں گویا سارق نے خود یہ زحمات برداشت کی ہیں اور تمام واقعات جو تذکرے میں درج ہیں، گویا اس نے مطالعہ کرکے درج کیے ہیں حالانکہ اس کی بے نور آنکھوں نے ان کتابوں کو کبھی دیکھا بھی نہ ہوگا اور اگر بعض کتابیں دیکھی بھی ہوں گی تو کچھ ایسے نوادر بھی ہیں جنھیں پوری زندگی میں دیکھا نہ ہوگا۔"

اس کے بعد آزاد کہتے ہیں :

" حرمین شریفین کی زیارت کے بعد کچھ نئے مواد ہاتھ آئے جن کے مفید ہونے کے پیش نظر وطن (بلگرام) بھیج دیے تاکہ وہ نسخے (ید بیضا) میں اضافہ کر دیے جائیں۔"

پھر سارق کے بارے میں کہتے ہیں :

" اگر بنارس کے سارق سے الحاقات اور تذکرہ نویسی کے اصول دریافت کیے جائیں تو اس کا جواب یہی ہوگا لا علم لنا علی ما علمتنا۔ اس عزیز نے تو عجب جسارت سے کام لیا ہے کہ خود مصنف تذکرہ کی زندگی میں کتاب پر قبضہ کر لیا اور مصنف کے مشہور ہونے کے باوجود اس نے یہ نہیں سوچا کہ اطراف و اکناف میں اس کتاب کے پہونچنے کے بعد اسے کتنی رسوائی کا سامنا کرنا پڑے گا ع

چہ دلاور است دزدی کہ بکف چراغ دارد "

آزاد آگے کہتے ہیں :

" یہ عزیز ہماری طرز و روش اور استعداد سے معرا ہے ورنہ " متاع دزدی" کو " سرمایۂ خود فروشی" نہ بناتا اور اس نے تذکرے میں جو دخل و تصرف کیا ہے "

اس کی بے استعدادی کی وجہ سے ظاہر ہو جائے گا۔ جب دونوں نسخوں کا مقابلہ کیا جائیگا تو بنارس کا سارق خود بخود ناظرین پر روشن ہو جائے گا۔"

پھر آزاد نے ناصر علی کے چند اشعار اپنی بات کی وضاحت کے لیے پیش کیے ہیں۔ اس کے بعد یہ کہا ہے کہ ایسے واقعات بہت ہوئے ہیں جب کسی نے کسی کی کتاب اپنے نام سے مشہور کر دی۔ مثال کے طور پر انھوں نے علامہ شیخ جلال الدین سیوطی کی کتاب "خصائص نبوی" کا ذکر کیا ہے جس کی جمع آوری میں شیخ نے سالہا صرف کیے تھے۔ ایک شخص نے جو شیخ کا معاصر تھا ان کی کتاب کے بعض حصے اپنا لیے جب یہ خبر علامہ سیوطی کو ملی تو ہنگامۂ عظیم برپا ہوا اور سب کے سامنے سارق کو رسوائی کا منھ دیکھنا پڑا۔ سیوطی نے اس واقعے کا ذکر بھی کیا ہے اور اس حصے کا جہاں یہ واقعہ ذکر ہوا ہے "الفارق بین المصنف والسارق" نام رکھا ہے۔

شیخ سعدی نے بھی گلستان میں ایک ایسی ہی حکایت بیان کی ہے۔ پھر آزاد "بنارسی سارق" کو گلستان کے اسی "ضیاد" کا "برادر معنوی" بتلاتے ہیں جس نے انوری کا قصیدہ اپنا لیا تھا۔ آزاد کہتے ہیں:

"اس بنارسی چور نے ہماری کتاب چرالی ہے تعجب نہیں کہ ہمارے حج اور ہماری سیادت کو بھی خود سے منسوب کر دے۔ لیکن وہ رسوائے عالم ہوگا۔"

پھر آزاد نے ایک قطعہ کہا جو اس تذکرے میں موجود ہے۔

بی شعوری از بنارس کرد فکر نارسی | خواست تا در دست گیرد شعلۂ جوالہ ای
برد تصنیف من و شہرت بنام خویش داد | از بہارم کرد غارت این ستمگر لالہ ای
خواند از بر کرد توریت و کلیم اللہ را | گفت من صاحب کتابم طوطی بنگالہ ای
سامری باشی و دعوای ید بیضا کنی | نہ کہ در دستِ تو می زیبد دُم گوسالہ ای

گرچہ خود را گوہر اصلی نماید در نظر آب گرد دعافیت از آفتاب تر الہای

آزاد مذکورہ قطعۂ مذمت لکھنے کے بعد افسوس کرتے ہیں کہ میں نے ہمیشہ ایسی باتوں سے پرہیز کیا لیکن کیا کروں کہ اس شخص نے میری عمر بھر کی محنت و مشقت پر پل بھر میں پانی پھیر دیا۔ یہ چند باتیں زبان قلم سے بے ساختہ نکل آئیں۔ ہاں! ناظرین سے میری درخواست ہے وہ بنارسی چور کو اگر پائیں تو اس سے ضرور پوچھیں۔

جہاں تک تحقیق کی بات ہے تو مذکورہ نسخۂ ید بیضا کے علاوہ یہ کہانی اس تذکرے کے کسی اور نسخے میں نہیں ملتی اور مجھے یقین ہے کہ چونکہ یہ واقعہ ید بیضا کی تالیف (۱۱۴۸ھ) اور مصنف کے سفر حج (۱۱۵۲ھ) کے بعد کی بات ہے اس لیے آزاد نے اسے اپنی بیاض میں لکھا ہوگا اور کسی نے اس کہانی کو مذکورہ نسخہ موجود در سالار جنگ میں نقل کر دیا۔

یہ بات آج تک معلوم نہ ہو سکی وہ 'بنارسی چور' کون تھا؟ اور نہ ہی ید بیضا کے کسی نسخے پر آزاد بلگرامی کے علاوہ کسی اور کا نام ملتا ہے۔ ممکن ہے آزاد کے احتجاج کے بعد وہ نسخے جن پر سے آزاد کا نام صاف کر کے کسی اور کا نام لکھا گیا ہو، ضایع کر دیے گئے ہوں۔ بہرحال یہ ایک احتمال ہی ہے تا وقتیکہ ید بیضا کا کوئی ایسا نسخہ سامنے نہ آجائے جس پر آزاد کے بجائے کسی اور کا نام بحیثیت مصنف درج ہو اور محتویات و مطالب' آزاد کے تالیف کردہ ید بیضا کے ہوں۔ اس وقت وہ 'سارق' جو بنارس کا رہنے والا تھا، بے نقاب ہو جائیگا۔

مولانا عبدالسلام ندوی کی تاریخ الحرمین الشریفین

از مولوی کلیم صفات اصلاحی

مولانا عبدالسلام ندوی دارالمصنفین کے اساطین ثلاثہ میں تھے، علامہ شبلیؒ کے جن تلامذۂ خاص نے ان کے ناتمام کاموں کی تکمیل کا بیڑا اٹھایا اور ان کی یادگار دارالمصنفین کو پروان چڑھایا ان میں یہ بھی تھے جن کے علمی اشتراک اور مولانا مسعود علی ندوی کے انتظامی تعاون سے مولانا سید سلیمان ندوی نے دارالمصنفین کو عالمگیر اور بین الاقوامی شہرت کا حامل ادارہ بنادیا۔

مولانا عبدالسلام ندوی میں تصنیف و تالیف کی فطری صلاحیت تھی اور علامہ شبلی نے خاص طور پر انہیں اس کی تربیت بھی دی تھی۔ ان کو ترجمہ نگاری کا خاص ملکہ حاصل تھا، انکے ترجمے پر اصل کا دھوکا ہوتا تھا۔ انہوں نے مستقل تصنیفات کے علاوہ کئی کتابوں کا بہت سلیس اور شگفتہ اردو ترجمہ کیا ہے، جن میں تاریخ فقہ اسلامی، ابن خلدون، انقلاب الامم اور تاریخ الحرمین الشریفین قابل ذکر ہیں۔ اس مضمون میں اسی موخر الذکر کتاب کا تعارف کرانا مقصود ہے جس کا ترجمہ مولانا نے اپنی تصنیفی زندگی کے اوائل میں کیا تھا اور اب اکثر لوگوں کو اس کے نام سے بھی واقفیت نہیں رہ گئی ہے۔

۴ اکتوبر ۱۹۵۶ء کو مولانا کا انتقال ہوا تھا، اس مناسبت سے ان کی اس کتاب پر یہ مضمون پیش کیا جارہا ہے۔

"تاریخ الحرمین الشریفین" "الرحلۃ الحجازیہ" کا اردو ترجمہ ہے ۱۳۲۶ھ میں عباس حلمی[1]

---

[1] یہ ۱۴ جولائی ۱۸۷۴ء میں پیدا ہوئے اور اٹھارہ سال کی عمر میں ۸ جنوری ۱۸۹۲ء کو تخت نشین ہوئے۔

ثانی خدیو مصر نے حج کا سفر کیا۔ اس کے مشاہدات وتاثراتِ سفر کو اس کے دوست لبیب البتنونی نے اس خوبی سے مرتب کیا کہ وہ محض سفر کے مشاہدات ہی نہیں بلکہ مکہ معظمہ مدینہ منورہ کی جامع اور دلچسپ تاریخ بھی بن گیا۔ مولانا نے اس مفید سفر نامہ کو دو میں منتقل کرنے کے علاوہ اس میں بعض ضروری اور مفید مضامین وحواشی کا اضافہ کیا۔ جس سے اس کی قدر وقیمت بہت بڑھ گئی وہ مقدمہ میں لکھتے ہیں کہ :

"۱۳۲۷ھ میں جب عباس حلمی پاشا ثانی خدیو مصر نے بہ تقریب حج ان مقامات مقدسہ کی زیارت کا شرف حاصل کیا تو ان کے رفقاء میں محمد لبیب البتنونی نے اس کمی (یعنی حرمین شریفین کی تاریخ پر کوئی مستند وجامع کتاب نہیں ہے) کو محسوس کیا اور خدیو کا ایک نہایت مفصل سفرنامہ "الرحلۃ الحجازیہ" کے نام سے لکھا جس میں اس مقدس سرزمین کے ذرے ذرے پر مذہبی، علمی اور تاریخی حیثیت سے نگاہ ڈالی ہے۔"[1]

ایک اور خوبی انھوں نے یہ بیان کی کہ بہت سے زائرین حج نے اپنے سفرناموں میں سکِ حج وغیرہ پر جو کچھ لکھا ہے اس سے مخالفین اسلام کے اعتراضات کو تقویت ملتی ہے ان سے اس مقدس سرزمین کی علمی، تاریخی، سیاسی وتمدنی تصویر بہت دھندلی نظر آتی ہے کے برخلاف الرحلۃ الحجازیہ کے مصنف نے خانۂ کعبہ، طواف، آبِ زمزم، حجراسود، قربانی رمی جمار وغیرہ مناسکِ حج پر تاریخی، مذہبی حیثیت سے اس طرح فلسفیانہ بحث کی ہے س سے معترضین اسلام کے سارے اعتراضات وشبہات رفع اور مسلمانوں کے دلوں میں چیزوں سے اور بھی حسن عقیدت پیدا ہوگئی ہے۔

ب کا مقدمہ | کتاب کا آغاز مولانا سید سلیمان ندوی کے مقدمہ سے ہوا ہے جس میں زیر نظر

---

[1] دیباچہ تاریخ الحرمین الشریفین، ص ۴-۵۔

کتاب کو ارض حرم کی ایک مختصر لیکن جامع تاریخ بتانے کے بعد خود حضرت سید صاحب نے ارض حرم کی مذہبی و تاریخی اہمیت قرآن مجید اور احادیث نبویہ کی روشنی میں بیان کی ہے۔ یہ مقدمہ ۲۶ صفحات پر مشتمل ہے۔

کتاب کا اصل موضوع کتاب کا موضوع اس کے نام ہی سے ظاہر ہے۔ مولانا عبدالسلام ندوی نے اپنے دیباچہ میں وضاحت کے ساتھ لکھا ہے کہ:

"اس سفرنامہ میں مکہ معظمہ اور مدینہ منورہ کے علاوہ اور بھی بہت سے تاریخی واقعات وحالات مذکور ہیں لیکن عام مسلمانوں کی دلچسپی زیادہ تر ان واقعات وحالات سے ہوسکتی ہے جو مکہ معظمہ اور مدینہ منورہ کے ساتھ خاص تعلق رکھتے ہیں"[1]

فاضل مترجم کی نظر میں یہ کتاب مذہبی، سیاسی، تمدنی اور علمی حیثیت سے حرمین شریفین کی مفصل تاریخ ہوگئی ہے اور خاص طور سے اس پُر از معلومات سفرنامہ میں مکہ معظمہ کی تاریخ بڑے دلچسپ انداز میں بیان کی گئی ہے۔

مباحث "مکہ معظمہ کے عام حالات" کے عنوان سے ارض حرم کی حکومت، مکانات، راستے لوگوں کے اخلاق وعادات، زبان، رسم ورواج، لباس، زیارت گاہوں، ڈاک خانوں، قہوہ خانوں، قلعوں، کتب خانوں، تجارت، سکوں، بازاروں اور شفاخانوں کے بارے میں معلومات قلم بند کیے گئے ہیں۔ اس کے علاوہ مکہ کی تاریخ، حکومت اشراف کا قیام، نجد میں آل سعود کی حکومت کا آغاز، غلاف کعبہ، محمل، حج، طواف، سنگ اسود، جامۂ احرام، منیٰ میں رجم، قربانی اور آثار منیٰ کا بھی تفصیلی تذکرہ کیا گیا ہے۔

ام القریٰ مکہ کے اولین آثار اور اس کے اطراف ونواح میں انسانی بستی کے قدیم ترین

---

[1] دیباچہ تاریخ الحرمین الشریفین، ص ۵۔

وجود پر بحث کرتے ہوئے لکھا گیا ہے کہ :

" مکہ کی تاریخ حضرت ابراہیم خلیل اللہؑ سے شروع ہوتی ہے۔ ۱۸۹۲ء قبل مسیح میں خدا نے انہیں اپنے فرزند حضرت اسماعیلؑ اور بیوی حضرت ہاجرہؑ کے ساتھ ایسی جگہ ہجرت کا حکم دیا جہاں پانی کی کمی کی وجہ سے کوئی آبادی نہیں تھی، صرف شمالی وادی میں عمالیق آباد تھے، اس وادی کو " جحون بھی کہتے تھے جو بحرین کی طرف سے نکل کر آئے تھے۔ ان کی حکومت کا دائرہ شبہ جزیرہ سینا تک پھیلا ہوا تھا "[۱]

پھر مولانا نے عمالیق کی لفظی تحقیق اور مختلف زبانوں میں اس کے اصلی تلفظ کی تحقیق کرتے ہوئے لکھا ہے کہ بابلی انہیں مالیق کہتے تھے۔ عبرانیوں نے اس میں لفظ "عم" یعنی "امۃ" کا اضافہ کرکے " عم مالیق" بنالیا اور عربوں نے تحریف کرکے اسی کو عمالیق یا عمالقہ بنالیا۔ مصری ان کو ہکسوس یعنی چرواہا کہتے تھے "[۲]

چاہ زمزم اور حجر اسود کی تاریخی حیثیت پر بحث کے دوران حضرت ہاجرہؑ کی اس شرط کا بھی ذکر کیا گیا ہے کہ انہوں نے عمالقہ کو اس شرط پر مکہ میں آباد ہونے کی اجازت دی تھی کہ اس خطہ کی سربراہی ان کے اور ان کے فرزند کے ہاتھ میں ہوگی۔ بنائے کعبہ اور اعلان حج کا تذکرہ بھی ہے۔ مولانا نے لفظ مکہ کے اشتقاق پر روشنی ڈالتے ہوئے تحریر کیا ہے کہ لفظ مکہ یا مکا ایک بابلی لفظ ہے جس کے معنی گھر کے ہیں اور یہ نام عمالیق کا دیا ہوا ہے۔

اہل مکہ کے عادات و اطوار، وضع قطع، زبان، آبادی وغیرہ کا ذکر کرتے ہوئے لکھا گیا ہے کہ مکہ کی آبادی تقریباً ڈیڑھ لاکھ ہے[۳] جن میں پچاس ہزار شہری ہیں اور بقیہ

---

[۳] الرحلۃ الحجازیہ ص ۷۹ ۔ اب وہاں کی آبادی میں مزید اضافہ ہوا ہوگا۔

نو وارد۔ اس کے بعد وہاں کے باشندوں کی ایک طویل فہرست نقل کی ہے جس میں دکھایا ہے کہ شامی، جاوی، مغربی، ہندوستانی، افغانی اور بخاری نسل کے لوگ یہاں بڑی تعداد میں آباد ہیں اور یہ لوگ تجارت پیشہ ہیں۔ ان کی حالت بہتر ہے، اسی لیے ملک کی اقتصادیات پر انکا قبضہ ہے[1]

وضع قطع اور اخلاق و عادات کے ذکر میں لکھا گیا ہے کہ مختلف قوموں کے میل جول اور باہمی رشتہ داری نے اہل مکہ کو اخلاقی، جسمانی اور لسانی وضع قطع کے اعتبار سے ایک مخلوط النسل قوم بنا دیا ہے اور مکہ میں شامی، ہندوستانی، افغانی، جاوی وغیرہ متنوع تہذیبوں کا ایک سنگم اور امتزاج نظر آتا ہے۔

مدینہ منورہ میں خدیو مصر کی حاضری کے احوال کے ساتھ مدینہ کے مختلف ناموں قدیم باشندوں اور یہود و انصار کا مفصل ذکر ہے، ہجرت نبوی کے پس منظر کے ساتھ مسجد قبا، مسجد نبوی، بیوت النبی، بیوت الصحابہ، مدینہ کی تعمیر نو، مکانات، سڑکیں، بازار، تجارت، حمام، خانقاہیں، کنوئیں مثلاً بئر اریس، بئر انا، بئر ایوب وغیرہ، نہر، باغ، وادیاں زیارت گاہیں اور کتب خانے وغیرہ بھی حیطۂ تحریر میں آگئے ہیں، مدینہ کی سیاسی حیثیت وہاں کی آب و ہوا اور وہاں کے باشندوں کے اخلاق و عادات، فضائل و خصائص اور قرآن مجید اور مدینہ کے عنوان پر سیر حاصل بحث کی گئی ہے۔

مدینہ منورہ کے مختلف اسماء اور ان کی وجہ تسمیہ اس کی آبادی کی تاریخ پر اصل کتاب میں جو لکھا گیا ہے فاضل مترجم نے وفاء الوفاء اور معجم البلدان وغیرہ کی مدد سے مزید معلومات اس طرح فراہم کی ہیں کہ اس کی پوری علمی و تمدنی تاریخ سامنے آجاتی ہے۔ مولانا

---

[1] الرحلۃ الحجازیہ، ص ۴۰۔

لکھتے ہیں :

" یاقوت حموی نے معجم البلدان میں صرف انیس [19] نام مدینہ، طیبہ، طابہ، مسکینہ، الکالتہ البلدان الخ گنائے ہیں [1] "

صاحب وفاء الوفا نے نوے [90] نام گنائے ہیں اور لکھا ہے کہ :

ان کثرة الاسماء تدل علی شرف المسمیٰ ولم اجد اکثر من اسماء ھذہ البلدة الشریفة۔	ناموں کی کثرت مسمیٰ کے شرف پر دلالت کرتی ہے اور میں نے اس مقدس شہر سے زیادہ کسی اور شہر کے نام نہیں پائے [2]

آگے صاحب وفاء الوفاء کے حوالے سے مدینہ کے قدیم مشہور نام یثرب کی وجہ تسمیہ کے متعلق متعدد اقوال نقل کرتے ہوئے لکھتے ہیں :

" کہ وہ تثریب سے مشتق ہے جس کے معنی ملامت کرنے کے ہیں۔ ایک خیال یہ بھی ہے کہ یہ ایک کافر کا نام تھا اور اسی کے نام سے یہ شہر مشہور ہوگیا۔ یہی وجہ ہے کہ بعض علماء نے مدینہ کے اس نام کو مکروہ خیال کیا ہے۔ ایک قول یہ بھی ہے کہ وہ ثرب سے ماخوذ ہے جس کے معنی فساد کے ہیں۔ بعض لوگوں کا خیال ہے لفظ یثرب ایک مصری لفظ تربیس کی تحریف ہے " [3]

مولانا نے اہل مدینہ کے اخلاق و عادات، آبادی اور وہاں کے راستوں وغیرہ کے ذکر کے بعد شہر مدینہ منورہ کے ۲۸ خصائص بیان کیے ہیں، طوالت کے خوف سے یہاں چند ہی خصائص پیش کرنے پر اکتفا کیا جاتا ہے۔

---

[1] معجم البلدان، جلد ۷، لفظ مدینہ یثرب، ص ۳۴۴ [2] وفاء الوفاء ج ۱، باب ۱، ص ۷ [3] تاریخ الحرمین الشریفین، ص ۱۷۲۔

(۱) اس میں ایک ایسی جگہ ہے جو دنیا کی تمام جگہوں پر اجماعاً فضیلت رکھتی ہے (حجرۂ شریف)

(۲) اکثر صحابہ وہاں مدفون ہیں۔

(۳) جن شہداء نے خدا کی راہ میں اپنی جانیں دیں وہ خزانے کی طرح مدینہ کی سرزمین میں گڑے ہوئے ہیں۔

(۴) خدا نے رسول اللہؐ کی اعانت وامداد کے لیے اہل مدینہ ہی کا انتخاب کیا۔

(۵) تمام اسلامی ممالک بزور شمشیر مفتوح ہوئے اور مدینہ صرف قرآن کے ذریعہ فتح ہوا۔

(۶) خدا نے اس شہر کی قسم کھائی ہے "لا اقسم بھذ البلد"۔

(۷) آپ نے اس کو حرم بنایا۔

(۸) خود آپ نے اپنے ہاتھ سے اس میں مسجد تعمیر فرمائی۔

(۹) یہاں آپ کے حجرے اور منبر کے درمیان جنت کا ایک باغ ہے۔

(۱۰) مسجد نبوی میں تعلیم وتعلم کی تاکید آئی ہے[1]

اس کتاب کی ایک معرکۃ الآراء بحث حکومت اشراف آل سعود، نجدیوں کی تاریخ اور محمد بن عبدالوہاب کی تحریک ہے جو نہایت پُر از معلومات ہے

اشراف اور آل سعود کی حکومت | اس باب میں لکھا گیا ہے کہ ۳۵۸ھ میں فاطمیین کی حکومت کے قیام کے بعد اشراف کے اقتدار کا آغاز ہوا اور اشراف میں مکہ کا سب سے پہلا والی جعفر بن محمد مقرر ہوا، جس کی اولاد میں یہ سلسلۂ امارت ۴۵۵ھ تک قائم رہا[2]

۱۲۰۲ھ میں محمد بن عبدالوہاب کی تحریک کا آغاز ہوا۔ اس تحریک نے مکہ سے بدعات وخرافات کے استیصال میں بڑی سرگرمی دکھائی۔ آل سعود کو اس تحریک کی تائید حاصل ہوئی

---

[1] تاریخ الحرمین الشریفین، ص ۲۵ - ۲۲۳ [2] الرحلۃ الحجازیۃ، ص ۴۷۔

۱۲۵۸ھ میں نجد پر امیر فیصل (جس کو ۱۲۵۴ھ میں خورشید پاشا نے گرفتار کر کے مصر روانہ کر دیا تھا) کا قبضہ ہو گیا۔

اس بحث میں نجد میں آل سعود اور مکہ کے شریف خاندان کی باہم آویزش کے متعلق معلومات گو مختصر ہیں مگر جس جامعیت سے ان کو پیش کیا گیا ہے اس سے اس کی افادیت واضح ہے۔ اردو خواں حضرات کو ان واقعات سے بہت کم واقفیت ہوتی ہے اس لیے یہ معلومات ان کے لیے نعمت غیر مترقبہ سے کم نہیں۔

کتاب کا سلیس، شگفتہ اور رواں ترجمہ بھی اپنے اندر اہل نظر اصحاب ذوق کی کشش اور دلچسپی کا سامان رکھتا ہے، مولانا ایک بڑے کامیاب مترجم تھے، یہ کتاب اس کا بہترین ثبوت ہے جو دراصل سرے سے ترجمہ معلوم نہیں ہوتی اور جیسا کہ پہلے عرض کیا جا چکا ہے کہ اس میں جا بجا مولانا کے حواشی و اضافات نے چار چاند لگا دیے ہیں۔ مولانا کے ترجمہ کی خوبی و روانی کا اندازہ اس اقتباس سے ہوگا:۔

"مختلف قوموں کے میل جول اور باہمی رشتہ داری نے اہل مکہ کو اخلاقی اور جسمانی دونوں حیثیتوں سے ایک مخلوط النسل قوم بنا دیا ہے۔ مثلاً ان میں ایک ہی ساتھ باشندگان اناطولیہ کی امن پسندی، ترکوں کی عظمت، اہل جاوہ کی ذلت، ایرانیوں کا غرور، مصریوں کی نرمی، ترکوں کی سختی، چینیوں کا سکون، مغربیوں کی تیز مزاجی، ہندوستان کی سادگی، یمنیوں کا فریب، شامیوں کی مستعدی اور زنگیوں کی کاہلی جمع ہو گئی ہے۔"[1]

افادیت: اس کی افادیت کے متعلق خود مولانا عبدالسلام ندوی لکھتے ہیں:

"بالخصوص مدینہ کے حالات میں بطور خود بہت سی معلومات کا اضافہ کر دیا ہے اور اس طرح مذہبی، سیاسی، تمدنی اور علمی حیثیت سے حرمین کی ایک نہایت مستند تاریخ مرتب ہو گئی ہے جو ایک طرف تو مسلمانوں کے دلوں میں حج اور مناسک حج کے فوائد، اسرار اور مصالح و حکم کا ایک غیر فانی یقین پیدا کر دیگی دوسری طرف ایام حج میں مسلمانوں کی رہنمائی کا کام بھی دیگی اور اسکے ذریعہ سے وہ لوگ بہت سے امراض اور بہت سے خطرات و توہمات سے محفوظ رہیں گے۔"[2]

[illegible]

مولانا اکبر شاہ خان نجیب آبادی

از جناب سید مصطفےٰ علی بریلوی، اڈیٹر سہ ماہی العلم کراچی۔

حقیقی شہرت و عزت کا تاج اکثر ان اہل قلم کو حاصل ہوتا ہے جو غربت، افلاس اور تنگ دستی کے عالم میں بھی کتاب و قلم کا رشتہ قائم رکھتے ہیں۔ حصولِ مقصد کی خاطر تن، من، دھن قربان کر دیتے ہیں۔ مولانا اکبر شاہ خان نجیب آبادی ہمارے سلف صالحین کا اعلیٰ نمونہ، بہترین انشا پرداز اور صاحب نظر بزرگ تھے۔ آئینۂ حقیقت نما اور تین جلدوں میں تاریخ اسلام لکھ کر انھوں نے شہرت دوام حاصل کی۔ مورخ اسلام ان کے نام کا جزر لاینفک ان کی زندگی میں ہی بن گیا۔ ان کے ہندوستان کے چوٹی کے اکابر سے مساویانہ تعلقات تھے۔ علامہ اقبال، مولانا محمد علی جوہر، صاحبزادہ آفتاب احمد خان جیسی بزرگ ہستیاں ان کی قدر کرتی تھیں۔

عاشق حسین بٹالوی مرحوم راوی ہیں کہ مولانا مرحوم کی کتاب "آئینۂ حقیقت نما" اس قدر مقبول ہوئی کہ مولانا محمد علی جوہر نے یہ کتاب مہاتما گاندھی کو تحفتاً پیش کی۔ (جزوی ترجمہ انگریزی میں ڈاکٹر سید محمود سابق وزیر بھارت نے کیا تھا) خواجہ حسن نظامی نے فرمایا:

"اگر میں صاحب استطاعت ہوتا تو مولانا اکبر شاہ خان نجیب آبادی کو موتیوں میں تول دیتا"

مولانا کی کتاب تاریخ اسلام سے تو برصغیر پاک و ہند کی کوئی لائبریری آج بھی خالی نہیں ہے۔

علامہ سر محمد اقبال مولانا کے ہم عصر تھے۔ مولانا نے ایک مختصر رسالہ "حجت الاسلام" لکھا۔

اسے پڑھ کر علامہ اس قدر متاثر ہوئے کہ سو روپیہ اس کتابچہ کی تقسیم کے واسطے اپنی جیبِ خاص سے عنایت فرمائے۔

شدھی سنگٹھن کی تحریک کے زمانے میں مولانا نے مسلمانوں کی حمایت میں بڑی جرأت، لیاقت اور جوانمردی کے کام کیے۔ اس زمانے میں ان کو عام مسلمانوں، مولویوں کی آپس کی رقابت، علمی میدان میں ان کی کم مائیگی کا تلخ تجربہ ہوا۔ لہذا انھوں نے ایک معرکۃ الآراء کتاب اپنی زندگی کے آخری دور میں لکھی جس کا نام "معیار العلماء" تھا۔

مولانا بڑے کھرے مزاج کے بزرگ تھے۔ صاف بات، بلا مصلحت زبان وقلم پر آجاتی تھی۔ جس کا نقصان بھی ان کو اٹھانا پڑتا تھا۔ اس امر کا اظہار مولانا نے خود کیا ہے:

"مجھ کو امراء کی ملاقات سے ہمیشہ نفرت رہی ہے اور صاف بات کہنے میں تامل نہیں کرتا لہذا اکثر دوستوں کو شکایت پیدا ہو جاتی ہے، حسد میرے دل میں کبھی پیدا نہیں ہوا بلکہ حسد کے صحیح مفہوم کو میں سمجھ نہیں سکا۔ میری سب سے بڑی آرزو یہ ہے کہ میں خدائے تعالیٰ کی راہ میں کام آؤں"

یہ سطور ہم نے مولانا کے ایک تفصیلی خط سے نقل کی ہیں جو انھوں نے پروفیسر محمود بریلوی مرحوم کے نام لکھا تھا۔ جس میں اپنے حالات زندگی تحریر کیے تھے۔ اس تاریخی اہمیت رکھنے والے خط سے معلوم ہوا کہ ایک زمانہ میں ان پر قادیانیت کے پروپیگنڈہ کا خفیف سا اثر ہوا۔ یہ وہ وقت تھا جب وہ لاہور میں مقیم تھے۔ قادیانیت کی کہانی بیان کرنے سے قبل مولانا کے لاہور کے شب و روز کی کیفیت کے شاہد عاشق حسین بٹالوی کی زبانی سنیے!

"میں نے مولانا مرحوم کو پہلی مرتبہ لاہور میں دیکھا۔ میں مسلم اسکول کا طالب علم تھا اور وہ وہاں مدرس تھے۔ درس وتدریس کے علاوہ ہوسٹل میں رہنے والے طلبہ کی نگہداشت کا

فرض بھی انہیں کے ذمہ تھا۔ میں بھی چونکہ ہوسٹل میں رہتا تھا اس لیے صبح سے شام تک تقریباً سارا دن ان کے ساتھ گزرتا تھا۔ یہ صحبت کم و بیش دو سال قائم رہی اس کے بعد مولانا نجیب آباد تشریف لے گئے اور پھر آخر دم تک انہوں نے نجیب آباد چھوڑنا گوارا نہیں کیا۔ اسکول میں مولانا کی سخت تاکید تھی کہ تمام طلبہ صوم و صلوٰۃ کی پابندی کریں، ہوسٹل میں وہ پانچوں وقت نہایت باقاعدگی سے باجماعت نماز پڑھتے اور امامت کرتے۔ نماز فجر کے بعد نصف گھنٹہ قرآن مجید کا اور نماز عشا کے بعد امام غزالی کی احیاء العلوم کا درس دیا کرتے تھے .... ورزش کا شوق تھا، طلبہ کو ہمیشہ ورزش کی تلقین کرتے۔ لاہور سے جہانگیر کے مقبرے تک پا پیادہ جانا اور آنا ان کا معمول تھا"

مولانا علامہ اقبال کی ز[illegible] ہفتہ میں ایک بار ضرور جاتے تھے۔ لاہور میں مولانا کے دوستوں میں بڑی بڑی ہستیاں مثل چوہدری عبدالحمید خاں (گورنمنٹ کالج) پروفیسر عبدالقادر، مولانا انشاء اللہ خاں، ڈاکٹر مرزا یعقوب بیگ (اسلامیہ کالج) سر فضل حسین جیسی شخصیت بھی جب وہ قانونی پریکٹس کرتے تھے۔ مولانا سے ملنے آتے تھے۔ مولانا ظفر علی خاں مولانا محمد دین فوق، راجہ نریندر ناتھ سے بھی ان کے قریبی مراسم تھے۔ مولانا ظفر علی خاں کی قید فرہنگ کے زمانہ میں انہوں نے زمیندار کی ادارت بھی کی۔ لاہور ہی میں حکیم نورالدین قادیانی کی شخصیت سے مولانا متاثر ہو گئے۔ ان حکیم صاحب نے کچھ ایسا جادو کیا کہ مولانا قادیان پہنچ گئے۔ اب آپ مولانا کا احوال خود ان کی زبانی سنیے :

"میں نے ایک سفر پنجاب کا اختیار کیا اور سیاحانہ قادیان بھی پہنچا وہاں جلسہ منعقد ہو رہا تھا اور غالباً یہ ۱۹۰۶ء کا واقعہ ہے۔ میں کئی روز وہاں رہا مجھ کو وہاں کوئی چیز پسند نہ آئی لیکن مولانا نورالدین کا درس قرآن میرے لیے قیمتی چیز تھی"

اگلے سال قادیان پہنچ کر وہاں قیام اختیار کیا مولانا ممدوح (نورالدین) نے مجھ کو جاتے ہی دبوچ لیا اور میرے ساتھ ان کا برتاؤ ایسی محبت و شفقت کا تھا جس کی کوئی نظیر پیش نہیں کی جاسکتی۔

سارے ملک میں خبر پھیل گئی کہ اکبر شاہ نجیب آبادی قادیانی ہوگئے۔ قدرتاً دوستوں، عزیزوں کی طرف سے شدید ردعمل ہوا۔ دوسری طرف حکیم نورالدین کے انتقال کے بعد مولانا کی آزاد اسلام پسندی کی وجہ سے بقول خود "میرے لیے قادیان کی زمین تنگ ہوچکی تھی"۔ ایک طرف قادیانیوں کی جانب سے مولانا کو قتل کی دھمکیاں مل رہی تھیں، دوسری طرف مسلمانوں کی جانب سے کفر یہ فتوے دیے جارہے تھے۔ مولانا فطرتاً بے حد راست گو اور خوب پڑھے لکھے آدمی تھے۔ انہوں نے قادیان سے فوراً واپسی کو شانِ مردانگی کے خلاف سمجھا اور جم کر بیٹھ گئے۔ مولانا لکھتے ہیں:

"میں نے کئی مہینے کفر یہ فتووں اور قتل کی دھمکیوں کو لغو ثابت کرنے کے لیے قادیان میں بسر کیے اور پھر وہاں سے چلا آیا"۔

مولانا قادیانی ہوئے تھے یا نہیں یہ کوئی راز کی بات نہیں ہے ان پر اس ناقص فلسفہ کا اثر ضرور ہوا تھا۔ مولانا کے حقیقی بھتیجا اکاؤنٹنٹ جنرل سندھ کے دفتر میں افسر تھے انکا لیاقت آباد میں قیام تھا، اس وقت نام یاد نہیں آرہا ہے۔ انہوں نے بھی اس امر کی تصدیق کی اور مولانا کی کتابوں کا ایک بکس دکھایا جو قادیانی لٹریچر سے بھرا ہوا تھا۔ یہ بوسیدگی کے سبب تقریباً گل چکا تھا۔ تاہم یہ بات واضح ہے کہ مولانا بہت جلد اس دورِ ابتلاء سے نکل گئے۔ انہوں نے اپنے خط بنام محمود بریلوی میں لکھا کہ:

"میرے اندر جو ایمان اور میری روح میں جو سوز و گداز اپنے گھر کی چار دیواری کے اندر بچپن میں پیدا ہوچکا تھا وہی آج تک موجود ہے۔ الحمد للہ رب العلمین میں نے

نہ ایک منٹ کے لیے قادیان میں کتاب و سنت کے خلاف کوئی چیز کسی سے مرعوب ہو کر تسلیم وقبول کی اور نہ کسی دوسری جگہ، ہاں یہ ضرور ہوا کہ بعض مسائل میں تحقیق و تفتیش کی کمی اور بے علمی و ناواقفیت کے سبب میں نے کچھ کا کچھ سمجھ لیا لیکن صحیح بات معلوم ہونے پر اس کو فوراً تسلیم کر لینے میں مجھے کبھی تامل نہیں تھا اور دل کی حالت الحمدللہ کبھی نہیں بگڑی"۔

اپنی غلطی کو تسلیم کرنا بہت بڑی بات ہے۔ مولانا اس میدان کے مرد نکلے۔

انھوں نے نجیب آباد سے رسالہ "عبرت" جاری کیا، اس کے مضامین و مقالات اکثر مولانا کے قلم سے تحریر کردہ ہوتے تھے۔ ملک بھر کے اہل علم کو اس کا انتظار رہتا تھا۔

نواب امیر خان والی ٹونک ایک مجاہد شخصیت تھی۔ سید احمد شہیدؒ کے لشکر میں سات سال تک رہ چکے تھے۔ نواب امیر خان پر مولانا نے ایک کتاب لکھی جو آج بھی حرف آخر کا درجہ رکھتی ہے۔ علامہ اقبال نے ۲۲ ستمبر ۱۹۲۲ء کے اپنے خط میں لکھا:

"امیر خان پر آپ نے خوب مضمون لکھا تھا، خدا تعالیٰ اس کے جانشینوں کو بھی ہدایت دے"۔

(مقالہ عاشق حسین بٹالوی "العلم" سہ ماہی اکتوبر ۱۹۵۸ء)

مولانا کے خود اپنے بیان کے مطابق "میری پیدائش غالباً ۱۸۷۶ء میں ہوئی اور اس حساب سے ۱۹۳۶ء میں میری عمر ساٹھ سال کی ہے"۔

مولانا کو ضعف معدہ کی شکایت ہوئی اور اس مرض میں ۱۹۳۸ء میں انتقال ہوا۔ جوالا پور نزد ہردوار روہیلہ افغانوں کی ایک چھوٹی سی خوبصورت بستی دریائے گنگا کے کنارے آباد تھی۔ مولانا وہیں مدفون ہیں۔ جوالا پور کے مسلمان ۱۹۴۷ء میں فسادات میں تباہ و برباد ہو گئے۔ راقم مدیر بھی ۱۹۴۶ء میں فسادی ماحول میں ایک رات غیور و بہادر افغانان جوالا پور کا مہمان رہا تھا۔ مشہور ممتاز شاعر روش صدیقی مرحوم اسی بستی کے رہنے والے تھے۔

آثار علمیہ وادبیہ

مکتوب ڈاکٹر خلیل الرحمن اعظمی
بنام
شاہ اقبال احمد ردولوی

۶ مارچ ۱۹۶۲ء

برادرم، تسلیمات:

آپ کے کئی خطوط ملے۔ میں چند در چند مصروفیات کے باوجود جواب نہ دے سکا۔ "مقدمہ کلام آتش" کی آپ نے فرمائش کی تھی اس کی بھی تعمیل نہ ہو سکی۔ دراصل اسکی صرف دس کاپیاں مجھے ملی تھیں جو شروع ہی میں احباب کی نذر ہو گئیں۔ امید ہے معذرت قبول فرمائیں گے۔

آپ نے نظم کے سلسلے میں جن خیالات کا اظہار کیا ان سے مسرت ہوئی اور اس بات سے اور بھی کہ آپ نے خود ایک نظم میرے پاس بھیجی۔ میرا اپنا خیال ہے کہ نظم اور غزل ایک دوسرے کی حریف نہیں ہیں اور نہ ہی یہ بات ہے کہ جو شاعر اچھا غزل گو ہو وہ اچھا نظم گو نہیں ہو سکتا یا جو اچھا نظم گو ہو وہ اچھا غزل گو نہیں ہو سکتا۔ غزل کی اپنی خوبیاں ہیں اور اس کا اپنا لطف ہے لیکن یہ کلاسیکی صنف اپنے پورے امکانات کے ساتھ سامنے آچکی ہے اس لیے اس پر اضافے کی گنجائش کم ہے۔ ویسے بحیثیت ایک صنفِ سخن کے یہ ہمیشہ باقی رہے گی۔ نظم ایک جدید صنف ہے اس لیے اس کے امکانات بے حد وسیع ہیں۔ پھر نظم کی یہ بھی

خصوصیت ہے کہ اس میں بے حد لچک اور جامعیت ہے اور اس میں پچھلے زمانے کی تمام اصناف مع اپنی خوبیوں کے جذب ہوسکتی ہیں۔ وہ بعض نئے عناصر سے آمیز ہوکر اور عمدہ شکل اختیار کرسکتی ہیں یعنی کوئی نظم گو اپنی نظم میں غزل، قصیدہ، مثنوی، مرثیہ، شہر آشوب، اسی طرح مخمس، مسدس، ترجیع بند، ترکیب بند، قطعہ تمام ہیئتوں سے فائدہ اٹھاتے ہوئے جدید مسائل اور موضوعات سے عہدہ برآ ہوسکتا ہے۔ غزل اس لحاظ سے بہت کمتر ہے اور اس کا دائرہ اور اس کی کیفیات محدود ہیں، اس دائرہ کو توڑکر غزل غزل نہیں رہتی کچھ اور ہوجاتی ہے۔ غزل میں اسلوب کے تجربے تو کیے جاسکتے ہیں لیکن اس کی ہیئت (FORM) میں کسی تبدیلی یا تجربے کی گنجائش نہیں اور جن لوگوں نے اس کی کوشش کی ہے انہیں زیادہ کامیابی نہ ہوسکی۔ مرحوم آرزو لکھنوی کا آپ نے ذکر کیا ہے۔ بیشک وہ ایک عمدہ شاعر تھے اور غزل کے اسلوب میں انہوں نے جو تازگی اور ندرت پیدا کی وہ ان کا ایسا کارنامہ ہے جسے کبھی بھلایا نہیں جاسکتا۔ انہوں نے اپنی غزل میں ایک نئی فضا پیدا کی اور غزل کے مزاج کو بہت کچھ بدلنے کی کوشش کی لیکن ان کا کام تجرباتی نوعیت کا ہے اور ان کی توجہ زیادہ تر اسلوب پر رہی اس لیے انسانی تجربات کی پیچیدگیاں اور مسائلِ حیات انکی گرفت میں بہت کم آسکے اور ان کی غیر مقبولیت کا ایک سبب یہ بھی ہے یعنی ایک سبب تو روشِ عام سے انحراف ہے اور یہ ان کی خوبی ہے اور ایسی خوبیوں کا اعتراف بعد میں کیا جاتا ہے جس طرح غالب کے اختراعات کی قدر بعد میں ہوئی لیکن دوسرا سبب ان کی غزل کا محدود دائرہ بھی ہے جس میں کسی خاص تصورِ حیات کا پتہ نہیں چلتا نہ عشق کے بارے میں، نہ جمالیات کے بارے میں، نہ سیاست اور نہ روحانی کیفیات کے بارے میں، ان کی ساری کوشش اندازِ بیان کی ندرت پر رہتی ہے اور "خالص اردو" بعض اوقات

بھلی لگتی ہے لیکن جہاں شعر میں سپاٹ پن آتا ہے تو یہ کوشش پُرتصنع معلوم ہونے لگتی ہے اور آورد کا گمان گزرتا ہے۔ ویسے ان کے یہاں اچھے اشعار کی کمی نہیں لیکن حسرت، فانی، اصغر اور جگر یا فراق اور یگانہ کے مقابل بعض اعتبار سے ان کا قد کچھ دبتا ہوا ہے۔

جہاں تک اصغر کا تعلق ہے، اصغر احساسات کے شاعر نہیں ہیں یعنی مادی احساسات کے، بلکہ ان کے یہاں ایک ذہنی فضا ملتی ہے جو تصوف کے اثر سے آتی ہے۔ تصوف سے انھوں نے گداز کے بجائے نشاط کا عنصر قبول کیا ہے اس لیے ان کے یہاں ایک رقص اور وجد کی کیفیت ملتی ہے۔ اس کیفیت میں ایک ماورائی دھندلکا ہے اس لیے وہ لطیف معلوم ہوتا ہے اور اس معاملے میں وہ ایک منفرد شاعر ہیں۔

ویسے ان کی شاعری کا دائرۂ اثر نسبتاً محدود ہے اور ان کے یہاں زیادہ گہرائی بھی نہیں۔

امید ہے آپ کا مزاج بخیر ہوگا۔

نیازمند

خلیل الرحمن اعظمی

اردو غزل

از جناب ڈاکٹر یوسف حسین خاں مرحوم

یہ اردو شاعری کی مقبول ترین صنف غزل کا مفصل و مبسوط تاریخی و تنقیدی جائزہ ہے، جس میں غزل کے لامحدود امکانات، اس کے جمالیاتی محرکات، موضوع اور ہیئت اور اس کے حسن مطالب پر نہایت بلند پایہ بحث کی گئی ہے، نیز ولی اورنگ آبادی سے جدید غزل گو شعرا تک کے کلام کا عمدہ انتخاب بھی ہے، اس کتاب کے متعلق اعتراف کیا گیا کہ صنف غزل کو گذشتہ دنوں جو احیاء نصیب ہوا، یہ کتاب اس کا خاص سبب ہے

قیمت ۱۲۰ روپے

وفیات

قاری سید صدیق احمد صاحب باندوی

۲۸ اگست ۱۹۹۷ء کو مشہور عالم ربانی اور مرجع خلائق بزرگ قاری سید صدیق احمد صاحب باندوی نے رحلت فرمائی۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

وہ ضلع باندہ کے ایک گاؤں ہتھورا کے رہنے والے تھے جو علمی و تمدنی حیثیت سے بہت پس ماندہ تھا، انہوں نے مظاہر العلوم سہارنپور میں تعلیم حاصل کی اور مولانا اسعد اللہ صاحب خلیفہ حضرت تھانویؒ سے بیعت ہوئے اور اجازت و خلافت حاصل کی، تعلیم سے فراغت کے بعد اپنے وطن سے قریب فتح پور میں مفتی ظہور الاسلام صاحب کے مدرسہ میں مدرس مقرر ہوئے مگر کچھ ہی دنوں بعد ان کے گاؤں ہتھورا اور اس کے گرد و نواح میں ارتداد کی لہر پھیل گئی۔ چنانچہ قاری صاحب نے اپنے گاؤں میں بڑی بے سرو سامانی کے عالم میں ایک مدرسہ کی بنیاد ڈالی اور اس فتنہ کی سرکوبی کے لیے سرگرم عمل ہوگئے، ان کی یہ اصلاحی کوشش بارآور ہوئی اور جو خطہ ارتداد کی لپیٹ میں آچکا تھا اب وہ مرکز علم و رشد بنا ہوا ہے، جہاں دور دراز سے طلبہ اور علوم نبوت کے شائقین رخت سفر باندھ کر آتے ہیں۔

قاری صاحب اچھے معلم و مدرس ہی نہ تھے بلکہ ایک داعی و مصلح بھی تھے، اس کی وجہ سے علوم دینیہ کی تحصیل کے لیے آنے والوں کے علاوہ ہر وقت طالبین و سالکین کا جمگھٹ ان کے یہاں لگا رہتا تھا اور ہر ایک بقدر استعداد ان سے فیضیاب ہوتا تھا۔ مشرقی اضلاع کے لوگوں کو ان کی تذکیر و ہدایت سے خاص طور پر بڑا فائدہ ہوا۔

راقم الحروف جامعہ عربیہ ہتھورا میں حاضری کے موقع پر ان کی مشغول زندگی کا خود اہدہ کر چکا ہے، نماز فجر کے بعد سے ظہر تک طلبہ کی ایک جماعت ان سے سبق پڑھ کر جاتی الی گھنٹے میں پچاسوں کی تعداد میں لوگ ان کی خدمت میں حاضر ہو جاتے اور یہ سلسلہ دوسرے لبہ کی آمد تک مسلسل قائم رہتا، اسی کے ساتھ وہ ملک کے مختلف مقامات کا سفر بھی تے رہتے تھے، مگر اس میں بھی اس بات کا خیال رکھتے تھے کہ طلبہ کا تعلیمی نقصان نہ ہونے پائے۔

حیرت ہوتی ہے کہ ان متنوع مشاغل کے باوجود وہ لکھنے پڑھنے کے لیے کس طرح وقت نکال لیتے تھے، فن تجوید و قرأت اور علم منطق سے ان کو خاص دلچسپی تھی۔ چنانچہ طلبہ کی سہولت کے لیے انھوں نے ان فنون پر چند مختصر رسالے لکھے جو بعض مدارس کے نصاب میں داخل ہیں۔

قاری صاحب ہر طبقہ و جماعت میں یکساں محبوب اور ہر دلعزیز تھے، اکثر دینی درسگاہوں سے ان کو تعلق رہا اور ہر طبقہ کے علماء و مشائخ سے بھی ان کے روابط تھے۔ ان کی ذات مسلمانوں کی طرح غیر مسلموں کے لیے بھی نفع بخش تھی، وہ بلا تفریق مذہب و ملت ہر ضرورت مند اور پریشاں حال کی مدد کرتے، ان کے یہاں مسلم و غیر مسلم کی کوئی تمیز نہ تھی۔

طبعاً حلیم، نرم خو، منکسر المزاج اور سادگی پسند اور بڑے مہمان نواز تھے، خوردوں کے ساتھ شفقت و محبت اور بزرگوں کا احترام ان کی طبیعت ثانیہ تھی، شرافت، مروت اور اخلاق حسنہ کے مثالی پیکر تھے اور انھی خوبیوں کی بنا پر وہ مرجع خلائق بن گئے تھے۔ اور مسلمانوں کے علاوہ غیر مسلم بھی ان کے حد درجہ گرویدہ تھے۔

مسلسل محنت و ریاضت نے قاری صاحب کو قبل از وقت بہت کمزور اور ناتواں کر دیا تھا، بلڈ پریشر کی شکایت اور دل کا عارضہ لاحق ہوگیا تھا، ڈاکٹروں کی سخت تاکید اور ہدایت تھی کہ محنت کم کر دیں، مگر ان کی روح مضطرب اور بے چین دل کو سکون کہاں مل سکتا تھا، بالآخر ۲۸ اگست ۹۷ء کو عمر بھر کی بیقراری کو قرار آگیا اور اپنی خدمات کا صلہ لینے کے لیے رب العالمین کے حضور میں جا پہونچے۔ اللہ تعالیٰ مرحوم کے درجات بلند فرمائے اور ان کے اعزہ و متوسلین کو صبر کی توفیق بخشے اور ان کی قائم کردہ یادگار جامعہ عربیہ ہتھورا کو قائم و دائم رکھے۔ آمین۔

ع۔ ع۔

یاأسفیٰ علی یوسف

افسوس ہے کہ جناب سید یوسف صاحب سکریٹری جماعت اسلامی ہند کا مختصر علالت کے بعد انتقال ہوگیا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

وہ جماعت اسلامی ہند کے پُرجوش اور فعال رکن تھے، جماعت کے سکریٹری ہونے کے ساتھ انگریزی ہفتہ وار اخبار "ریڈینس" بھی انکی ادارت میں نکلتا تھا۔ جماعت اسلامی نے جب "فورم برائے جمہوریت و فرقہ وارانہ ہم آہنگی" کے نام سے ایک مشترکہ سیکولر پلیٹ فارم قائم کیا تو اسکی کامیابی کے لیے انھوں نے بڑی سرگرمی دکھائی اور مسلسل سفر بھی کیے۔

نہایت سادہ، متواضع اور خلیق آدمی تھے، ہر طبقہ و مسلک کے لوگوں سے خندہ پیشانی کے ساتھ ملتے جلتے تھے، ابھی صرف اسٹھ برس کی عمر ہوئی تھی اور جماعت اسلامی ہند کو بجا طور پر ان سے بڑی توقعات وابستہ تھیں مگر ۳۰ ستمبر کو رب حقیقی سے جاملے۔ اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت فرمائے اور تمام متعلقین کو صبر جمیل عطا کرے۔ آمین

ع۔ ع۔

ادبیات

حمد باری تعالیٰ

از جناب مقصود احمد مقصود۔ بڑودہ یونیورسٹی

تری حمد مجھ سے ہو کیا بیاں، تری شان جل جلالہ — میں ترے حضور ہوں بے زباں، تری شان جل جلالہ
تری ذاتِ پاک ہے بے کنہ، ہے محال درکِ صفات بھی — تو ورائے فہم ہے بے گماں، تری شان جل جلالہ
تو ہر ابتدا کی ہے ابتدا، نہیں تیری کوئی بھی انتہا — بہ لحاظِ ذات ہے تو نہاں، تری شان جل جلالہ
ہیں یہ کائنات کی رونقیں ترے ہی وجود کے نور سے — تو صفت سے اپنی ہے خود عیاں، تری شان جل جلالہ
تو ہے زندہ اپنی حیات سے، تو ہے قائم اپنی ہی ذات سے — تو ہے منبعِ دمِ انس و جاں، تری شان جل جلالہ
نہ تو ہے کسی کا بھی تو پسر، نہ ترا ہی کوئی بھی ہے پسر — تو ہے بے نیازِ ہر این و آں، تری شان جل جلالہ
تو علیم ہے تو بصیر ہے، تو سمیع ہے تو خبیر ہے — تو مرید، تو ہی ہمہ تواں، تری شان جل جلالہ
ترے فعل تیرے ارادے میں، تری شانِ منع و عطا میں بھی — ہے کسے مجالِ چنیں چناں، تری شان جل جلالہ
تجھے نیند سے نہیں واسطہ کہ تکان تجھ کو نہیں روا — تو ہے تازہ دم تو رواں دواں، تری شان جل جلالہ
تو ہر ایک عیب سے پاک ہے، تو ہی خوبیوں سے ہے متصف — تری ذات میں نہیں خامیاں، تری شان جل جلالہ
تو جلیل بھی تو جمیل بھی، تو غنی بھی ہے تو حمید بھی — نہ تو ناقص و نہ تو ناتواں، تری شان جل جلالہ
تو محیط بھی تو رقیب بھی تو رگِ گلو سے قریب بھی — ہے وجودِ خلق میں تو نہاں، تری شان جل جلالہ
ہیں نظر میں تیری ہی شوخیاں، ہیں تری ہی دل میں تجلیاں — تو ہی جسم و روح کے درمیاں، تری شان جل جلالہ
یہ جو حکم قبلہ رخی کا ہے تو یہ اتحاد کی رو سے ہے — تو ہے بے جہت تو ہے لامکاں، تری شان جل جلالہ
تو کفیل ہے تو وکیل ہے، تو حفیظ ہے تو نصیر ہے — ترا آستاں ہی درِ اماں، تری شان جل جلالہ
ہیں وجودِ خیر سے راحتیں، ہیں وجودِ شر میں بھی حکمتیں — یہ سبھی ہیں یاں پئے امتحاں، تری شان جل جلالہ
ہے مرا وجود اٹا ہوا گنہ و خطا کے غبار میں — ہو نزولِ رحمتِ بے کراں، تری شان جل جلالہ

حضور ہو کہ شہود ہو کہ ہو صحو و محو کی کیفیت ہیں یہ اجتبا کی نشانیاں، تری شان جل جلالہ
میں ہوں ناخلف یہ ہے سچ مگر مجھے لے چلا ہے تری طرف ترا فضلِ خاص کشاں کشاں، تری شان جل جلالہ
میں ہوں غرق قلزمِ یاد میں گہرِ وصول کی چاہ میں ہے قرار مجھ کو یہاں کہاں، تری شان جل جلالہ

نعت

از پروفیسر محمد ولی الحق انصاری۔ لکھنؤ

ہمائے اوج سعادت بدام کرتے ہیں
نبی کی نعت کا ہم اہتمام کرتے ہیں
دیارِ عشق سے لانے کو نعت کے موتی
سمندِ فکر کو ہم تیز گام کرتے ہیں

انہیں کو عرش کے بانی سلام کرتے ہیں وہی جو مدحتِ خیر الانام کرتے ہیں
نبی کی آتی ہے خوشبو قرآں کے لفظوں سے سنو! کہ اب بھی وہ ہم سے کلام کرتے ہیں
خیالِ پاک، زبانِ پاک، طرزِ مدحت پاک ہم اس کی نعت میں یہ التزام کرتے ہیں
سکونِ قلب دیا نعتِ مصطفیٰ تو نے تیرے طفیل ہم عیشِ دوام کرتے ہیں
گدائے در ترے ہیں بے نیازِ باغِ بہشت یہ لوگ دور سے اس کو سلام کرتے ہیں
یہی وسیلۂ بخشش ہمارا ہو شاید نبیؐ کے خُلق کو دنیا میں عام کرتے ہیں
ہے رہبریِ جہان سے بلند اس کا مقام یہ کام وہ ہے جو اس کے غلام کرتے ہیں
جنھیں ستاتا ہے آسیبِ شک و گمراہی وہ لوگ وردِ زباں تیرا نام کرتے ہیں
انہیں کو ملتی ہے خوشنودیِ خدا و رسول نبیؐ کے پیاروں کا جو احترام کرتے ہیں
وہ سر فروش فدائی تھے جو محمدؐ کے کنارِ چشمۂ کوثر خرام کرتے ہیں
یہ فیضِ صحبتِ ذاتِ نبیؐ ہے جو اصحاب بزیرِ سدرہ و طوبیٰ قیام کرتے ہیں
ولی کی بادہ کشی کا نرالا ہے انداز نبیؐ کی مدح سے کوثر بجام کرتے ہیں

مطبوعات جدیدہ

ملی امراض اور ان کا علاج، شاہراہ اعتدال از علامہ محمد غزالی،

مترجم جناب ابو مسعود اظہر ندوی، متوسط تقطیع، عمدہ کاغذ و طباعت، صفحات ۲۸۰ قیمت ۹۰ روپے، پتہ: اسامہ پبلی کیشنز، فائن کمپوزنگ سنٹر، A-50-B، غفار منزل، جامعہ نگر، نئی دہلی۔

عہد حاضر میں عالم عرب بلکہ عالم اسلام کے صاحب فکر و نظر علامہ محمد غزالی اسلام کی اشاعت و ترجمانی اور مخالفین اسلام کے اعتراضات و شبہات کے ازالہ کے لیے مشہور ہیں، ان کا اسلوب بڑا موثر، منطقی اور معتدل ہے، اپنی ایک کتاب "دستور الوحدۃ الثقافیہ بین المسلمین" میں انھوں نے امت کے موجودہ اختلاف و انتشار کی جڑوں کی نشاندہی کر کے اس کے اتحاد و یکجہتی کے موانع کا جائزہ تفصیل اور دقت نظر سے لیا ہے، زیر نظر کتاب اسی مفید کتاب کا اردو ترجمہ ہے۔ اس میں قرآن و سنت، نص شرعی، اخبار احاد اور اجتہاد کے علاوہ فقہی اختلاف رائے، مسلکی تعصب، تقلید، سلفیت، بدعت، توسل اور تکفیر وغیرہ پر تفصیل سے اظہار خیال کیا گیا ہے، مکاتب فقہ، اہل حدیث اور سلفیت و بدعت کے مباحث ہندوستان کی موجودہ دینی و مذہبی فضا میں خاص طور پر مطالعہ کے لائق ہیں، مرکزی نقطہ یہی ہے کہ تمام اختلافات و تنازعات کا اصل سبب وہ پوشیدہ نفسیاتی امراض ہیں، جن میں ذہنی خواہشیں مادی خواہشوں سے زیادہ سنگین بن جاتی ہیں، فقہی تعصب کی ایک عبرت ناک مثال بھی پیش کی گئی ہے کہ شام کے صدر حافظ الاسد نصیری اور اخوان المسلمین کے

درمیان آویزش کے متعلق بعض لوگوں نے کہا کہ اگر اخوانی کامیاب ہوئے تو حنفی فقہ کی حکمرانی ہوگی اور ابوحنیفہ، حافظ الاسد سے بہتر نہیں، فاضل مصنف شیخ حسن البنا سے بہت متاثر ہیں، ان کے منتخب اقوال جابجا نقل کیے ہیں، عالم عرب کی طرح برصغیر کے مسلمانوں کے ملی امراض کی تشخیص و علاج کے لیے یہ کتاب ایک مفید اور عمدہ نسخہ ہے، ترجمہ سلیس اور رواں ہے لائق مترجم کا مقدمہ بھی قابل مطالعہ ہے۔

مولانا مودودیؒ کے انٹرویو مرتبہ جناب ابو طارق ایم اے، متوسط تقطیع عمدہ کاغذ، کتابت و طباعت، مجلد، صفحات ۳۳۵، قیمت ۵۲ روپے، پتہ: مرکزی مکتبہ اسلامی ۱۳۵۳، چتلی قبر، دہلی ۶۔

مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی کی تحریر و تقریر کے وسیع اور متنوع ذخیرے میں یہ کتاب ایک اور عمدہ اضافہ ہے، ملاقاتیوں سے مولانا کی گفتگو اور ان کے سوالوں کے جواب وقتاً فوقتاً بعض رسائل و جرائد میں شایع ہوتے رہے ہیں، اس کتاب میں ان کے چالیس انٹرویو شامل ہیں جو ۴۸ء سے ۷۲ء تک کے عرصہ میں لیے گئے تھے، ان سے مولانا مرحوم کے ذہنی سفر کی استقامت اور عزم و ہمت کا بھی اندازہ ہوتا ہے عموماً ہر گفتگو کا خاص موضوع اسلام کی سربلندی اور اس کے لیے فکر و عمل کا طریقہ کار ہے اس کے علاوہ تعلیم، تہذیب، اخلاق و کردار سرمایہ داری اور اشتراکیت و اشتمالیت پر بھی اظہار خیال کیا ہے ان کے یہ انٹرویو دراصل ان کی کتابوں اور بے شمار مضامین کا عطر ہیں، قرآن مجید کے ترجمہ و تفسیر کے متعلق انہوں نے کہا کہ "۔۔۔ آیا ہم قرآن سے اس کا منشا معلوم کرتے ہیں یا قرآن کو اپنے منشا کے مطابق ڈھالتے ہیں، پہلی صورت میں ہم اس سے رہنمائی لیتے ہیں، دوسری صورت میں ہم اس کی رہنمائی کا منصب سنبھالنے لگتے ہیں"۔ اجتہاد کے متعلق ایک گفتگو میں کہا کہ مغربی تہذیب سے مغلوب لوگ

جب قدیم فقہاء کے اختلافات اور پھر اجتہاد کی باتیں کرتے ہیں تو ان کا اصل مدعا اسلامی قانون سے فرار ہوتا ہے، کتاب کی پہلی تحریر مولانا محمد عمران خاں ندوی مرحوم کی مرتب کردہ "مشاہیر اہلِ علم کی محسن کتابیں" سے ماخوذ ہے۔ مولانا مرحوم اور جماعت اسلامی کے فکر و مزاج کو سمجھنے میں اس کتاب سے بڑی مدد ملتی ہے۔ (ع ـ ص)

یادگار مجلہ حیات و خدمات عبید الرحمٰن خاں شروانی متوسط تقطیع، کاغذ، کتابت و طباعت اچھی، صفحات اردو ۲۱۲، صفحات انگریزی ۵۶، مجلد مصور، شایع کردہ انجمن الغرض، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ۔

الحاج نواب عبید الرحمٰن خاں شروانی ایک عالی خاندان کے چشم و چراغ اور بڑے باپ کے بیٹے ہی نہیں تھے بلکہ خود بھی نہایت ممتاز اوصاف و کمالات اور بڑی پاکیزہ اور دلکش شخصیت کے حامل اور بہت عملی آدمی تھے، اعتدال، متانت، سلامت روی، علم دوستی، حلم، شرافت، وضعداری، انکسار، خلوص، دردمندی، جذبۂ خدمت و ایثار، تدبر، معاملہ فہمی اور خوش انتظامی میں وہ اپنی مثال آپ تھے، علی گڑھ تحریک کے عاشق و شیدائی تھے، اس کے اور اس کے ذیلی اداروں کے بڑے بڑے عہدوں پر فائز رہے اور ان کی بے مزد نمایاں خدمت انجام دی، گرد و نواح کے اسکولوں کالجوں اور تعلیمی اداروں کو بھی ان کی ذات سے بڑا فیض پہنچا، دارالمصنفین، ندوۃ العلماء اور دارالعلوم دیوبند کو بھی ان کے مشوروں اور تجربوں سے بڑی مدد اور رہنمائی ملی۔ ڈیوٹی سوسائٹی علی گڑھ نے جس کو ان کی مساعی جمیلہ سے نئی زندگی ملی، نومبر ۱۹۹۵ء میں اپنے اس محسن کی یاد میں ایک سمینار کرایا اور اب یہ یادگاری مجلہ شایع کیا ہے جس کے ایک حصہ میں اردو اور دوسرے میں انگریزی مضامین اور بعض پیغامات درج ہیں، اکثر مضامین علی گڑھ تحریک اور یونیورسٹی سے وابستہ لوگوں کے ہیں جن کو برسوں نواب صاحب کے ساتھ کام کرنے اور قریب رہنے کا

اتفاق ہوا تھا، ایک مضمون خود ان کے فرزند والاتبار پروفیسر ریاض الرحمن خاں شروانی کا ہے، اس میں آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس سے ان کے تعلق اور خدمات کا تذکرہ ہے، اسی طرح دوسرے مضامین سے بھی ان کی زندگی، علمی، تعلیمی، قومی اور ملی خدمات کے مختلف پہلو سامنے آتے ہیں جن سے تعلیمی اور قومی کام کرنے والوں کو بڑی رہنمائی مل سکتی ہے، جابجا مختلف موقعوں کی تصویریں بھی دی گئی ہیں، اس یادگار مجلہ کی اشاعت پر سوسائٹی کے کیپر پروفیسر ابوالحسن صدیقی تبریک کے مستحق ہیں۔

وہ بھی کیا دن تھے مرتبہ جناب مسعود احمد برکاتی، چھوٹی تقطیع، کاغذ، کتابت و طباعت اچھی، صفحات ۶۴، قیمت ۲۵ روپے، پتہ: نونہال ادب ہمدرد فاؤنڈیشن پاکستان کراچی۔

حکیم محمد سعید صاحب ایسے متحرک، چاق چوبند اور سراپا عمل انسان ہیں جن کی پیری میں بھی ہے مانند سحر رنگ شباب ان کے کمالات و خدمات اور سرگرمیوں کا دائرہ بہت وسیع ہے اور وہ بڑے حیرت انگیز اور متضاد اوصاف و کمالات کے حامل ہیں، تحریر و تصنیف کا ملکہ خداداد ہے، تعجب اس پر ہے کہ گوناگوں اشغال اور آئے دن کے اسفار کے باوجود وہ اسکا موقع کس طرح نکال لیتے ہیں اور اس سے عجیب تر یہ ہے کہ اب انھوں نے بچپن کی یادوں اور شرارتوں کو قلم بند کرنے کا موقع نکالا ہے اور جب محسوس کیا کہ کہیں ان کے نونہال بھی شرارت پر آمادہ نہ ہوجائیں تو اس کی تلافی کے لیے کتاب کے آخر میں سعید پارے بھی شامل کردیے جو گنجینۂ حکمت ہیں، یوں بھی حکیم صاحب کی شرارتیں بچوں کی دلچسپی اور سبق آموزی کا سامان ہیں۔ حکیم صاحب نے شرارتوں کے ذکر کے لیے جناب مسعود احمد برکاتی کو ذمہ دار ٹھہرایا ہے، مگر ان کے نونہال برکاتی صاحب کے ممنون ہیں کہ انھوں نے یہ اچھی اور دلچسپ کتاب تیار کرادی۔

"ض"

جلد ۱۶۰ ماہ رجب المرجب ۱۴۱۷ھ مطابق ماہ نومبر ۱۹۹۷ء عدد ۵

فہرست مضامین

مقالات

معارف کی ڈاک

ادبیات

شذرات

اب سے پچاس برس پہلے ملک کو آزادی ملی تھی۔ اس سال اس کی گولڈن جبلی منائی جارہی ہے، اس پر اور ملک کی گزشتہ نصف صدی کی تعمیر و ترقی پر فخر و مسرت کا اظہار کیا جارہا ہے۔ ہر طرف سڑکیں بن گئی ہیں، دریاؤں پر پل تعمیر ہوگئے ہیں، آنے جانے کے لیے سواریاں مہیا رہتی ہیں، آمد و رفت کی سہولت سے مہینوں کی مسافت دنوں میں اور دنوں کی گھنٹوں میں طے ہورہی ہے، بجلی کے بلب اور قمقموں سے چھوٹی بستیاں اور جھونپڑے جگمگا رہے ہیں۔ آب پاشی کے لیے نہریں اور ٹیوب ویل ہوگئے ہیں، ڈاک خانے، بینک، اسپتال اور تھانے جگہ جگہ بنتے جارہے ہیں، ٹیلیفون بھی لگتے جارہے ہیں، روزی روزگار کی آسانیوں کی وجہ سے پیشہ ور طبقوں اور محنت و مزدوری کرنے والوں میں خوش حالی آگئی ہے، گاؤں گاؤں میں اسکول قائم ہوگئے ہیں، سکنڈری اور ہائر ایجوکیشن کے ادارے اب بڑے شہروں تک ہی محدود نہیں رہ گئے ہیں، ریاستی حکومتیں اعلان کررہی ہیں کہ وہ کسی بچے کو ناخواندہ نہیں رہنے دیں گی اب تعلیم پر کسی خاص طبقہ، گروہ، جماعت اور قوم کی اجارہ داری نہیں رہ گئی ہے، یہ ہر شخص کا بنیادی حق سمجھا جاتا ہے۔

دیکھنا یہ ہے کہ کیا ان ترقیوں سے لوگوں کو واقعی پوری طرح فائدہ پہنچ رہا ہے؟ وقت سے ٹیوب ویل کے لیے بجلی مہیا رہتی ہے؟ آپریٹر موجود رہتا ہے؟ ٹیکنیکل خرابی کو ٹھیک کرانے میں پاپڑ تو نہیں بیلنے پڑتے ہیں؟ سڑکیں کاغذ پر بنادی جاتی ہیں لیکن عملاً ان کا کوئی وجود نہیں ہوتا، ان کی مرمت کے لیے کروڑوں روپے کے بجٹ بنتے ہیں لیکن پھر بھی وہ ٹوٹی پھوٹی رہتی ہیں، آئے دن حادثے ہوتے ہیں، ریلوے کے حادثات تو معمول بن گئے ہیں۔ تھانے زیادہ ہوئے مگر جرائم اور بڑھ گئے، پولیس اصل مجرموں سے تعرض کرنے کے بجائے بے گناہوں کو تنگ کرتی اور جھوٹے مقدموں میں پھنساتی ہے۔ ڈاک خانے کی کثرت ہورہی ہے لیکن خطوط دس پندرہ روز سے پہلے

نہیں ملتے اور کتنے تو سرے سے ملتے ہی نہیں، ٹیلیفون آئے دن خراب رہتے ہیں، بڑی دوڑ دھوپ کے بعد اگر ٹھیک بھی ہوئے تو پھر خراب ہونے میں دیر نہیں لگتی۔ ریل کا کرایہ بڑھتا جارہا ہے لیکن ڈبوں میں روشنی اور پانی اکثر غائب اور زر روپیشن کے باوجود کبھی کبھی بیٹھنے کی جگہ نہیں ملتی۔

تعلیم کی وسعت اور پھیلاؤ کے باوجود اس کا مقصد اس کے سوا اور کوئی نہیں رہ گیا ہے کہ کسی طرح کوئی ملازمت مل جائے تاکہ زندگی اچھے حال میں بسر ہو۔ اساتذہ کو تنخواہ سے غرض، طلبہ کو جیسے تیسے امتحان پاس کر لینے سے مطلب، نہ وہ اپنے منصب کے لائق، نہ ان میں کسی طرح کی استعداد ولیاقت، علم کی روشنی پھیلنے کے بجائے جہالت برگ و بار لارہی ہے۔ فکر و خیال میں بلندی، ذہن و دماغ میں تبدیلی اور سیرت و کردار میں پختگی و پاکیزگی نہیں پیدا ہوتی اور نہ اعمال و اخلاق کی اصلاح ہورہی ہے۔ معاشرہ، ملک اور قوم بھی تعلیم کے فائدے سے محروم ہیں، تعلیم گاہیں بے راہ روی شورش، ہنگامہ، انتشار اور خلفشار کا اڈا ہوگئی ہیں۔ طلبہ سماج کی ناہمواری اور ملک کے اخلاقی بحران کا باعث بنے ہوئے ہیں، ہر جگہ ان کی غلط روش اور شورش پسندی نے لوگوں کی ناک میں دم کر دیا ہے، قتل، غارت گری اور لوٹ کھسوٹ کے بازار کی گرمی انہی کی وجہ سے ہے۔

یہ گفتگو نامکمل رہے گی اگر اس موقع پر ملک میں بڑھتے ہوئے فرقہ وارانہ جنون اور ذات پات کی لعنت کا ذکر نہ کیا جائے، زمانۂ قدیم سے اہنسا اور عدم تشدد اس ملک کے لوگوں کا دین اور دھرم رہا ہے، یہاں جیو ہتھیا کو سب سے بڑا پاپ خیال کیا جاتا تھا، رواداری اور مفاہمت صلح و امن پسندی اس کی خصوصیت تھی لیکن اب ظلم و تشدد اس کی سرشت میں داخل ہوگیا ہے، رواداری اور مفاہمت، جارحیت اور تنگ دلی میں تبدیل ہوگئی ہے، ملک میں امن و امان اور صلح و آشتی مفقود ہوگئی ہے، اخوت اور بھائی چارگی، یکجہتی اور اتحاد کا ماحول ختم ہوگیا ہے، ہر وقت زبان، مذہب، نسل، رنگ اور علاقائیت کے جھگڑے کھڑے رہتے ہیں۔ ایک فرقہ و ذات کے لوگ دوسرے فرقہ

و ذات کے لوگوں کے خون کے پیاسے ہیں، اس کے مذہب، اس کی زبان، اس کی نسل، اس کی تہذیب، اس کا کلچر اور اس کا تشخص ختم کر دینے پر تلے ہوئے ہیں، دوسرے کی عبادت گاہیں ڈھا کر بے شرمی سے اس پر فخر کیا جا رہا ہے اور کہیں سے اس کے خلاف کوئی موثر آواز نہیں اٹھتی، تفصیل کی ضرورت نہیں، ہر شخص جانتا ہے کہ پچھلے پچاس برسوں میں کتنی جانیں فرقہ واریت اور ذات پات کی دیوی کو بھینٹ چڑھائی جا چکی ہیں۔

یہ علتیں اور بیماریاں صرف عام لوگوں میں نہیں ہیں بلکہ حکمراں اور سیاست داں بھی حمام میں ننگے ہو گئے ہیں۔ یہ پتہ لگانا مشکل نہیں ہے کہ ملک کی موجودہ خرابیوں اور ہر طرح کی بدعنوانیوں کا اصل سرا کہاں ہے، پچھلے دنوں حوالوں اور گھٹالوں میں کیسے کیسے ذمہ داروں کے نام آئے تھے وہ خواہ بری ثابت ہو جائیں لیکن ع تا نہ باشد چیزکے مردم نہ گویند چیزہا۔ ان کو لوٹ کھسوٹ کا چسکا لگ گیا ہے، اقتدار اور عہدے کے لالچ میں یہ ہر طرح کی بے اصولی اور بدعنوانی کرنے پر آمادہ ہو جاتے ہیں، اب ان کی کج روی اس قدر بڑھ گئی ہے کہ وہ جس پارٹی کے ٹکٹ پر منتخب ہوتے ہیں، چھن بھر میں نہایت بے شرمی اور بے حیائی سے اسے چھوڑ کر دوسروں کے ساتھ ہو جاتے ہیں، ایسے بے ضمیر اور بے کردار لوگوں کو منھ مانگی قیمت دینے کے لیے بے اصول اور بے ضمیر افراد اور پارٹیوں کے خزانے کھلے ہوتے ہیں۔

اس تحریر کا یہ مقصد نہیں کہ گولڈن جبلی نہ منائی جائے یا ہم کو ملک میں ہونے والی ترقی سے بھی انکار ہے، مقصد یہ ہے کہ شر و فساد کا انسداد کیا جائے، ذات پات اور فرقہ وارانہ جنون کے سیلاب پر بند لگایا جائے اور ملک کو اس اخلاقی و روحانی بحران سے نکالا جائے ورنہ ظاہری ترقیوں کے باوجود ملک تباہ ہو جائے گا۔ ہمارے ہم وطن اپنی ذہنیتوں میں، دل و دماغ میں، خیالات و نظریات میں، اعمال و اخلاق میں تبدیلی لائیں، ان کی اصلی ترقی برق و تجارات میں نہیں ہے بلکہ مولانا آزاد کے لفظوں میں "اس معنوی طاقت میں ہے جو قوم کے اخلاق، اس کے کیرکٹر، اس کے اتحاد اور ہماری اصطلاح میں خشیت الٰہی اور اعمال حسنہ سے پیدا ہوتی ہے"۔

مقالات

سیرۃ النبیؐ جلد پنجم کے بعض قرآنی مباحث

از ضیاء الدین اصلاحی

مولانا سید سلیمان ندوی کا علمی ذوق بڑا متنوع اور مطالعہ نہایت وسیع تھا، اسلامی علوم میں انہیں خاص دستگاہ تھی، لیکن ان کو سب سے زیادہ شغف وانہماک قرآن مجید سے تھا۔ وہ اس کے بڑے عارف وشیدائی اور متبحر عالم تھے۔ اس کی شہادت بین الاقوامی شہرت کے حامل اور سید صاحب کے عزیز ترین شاگرد مولانا سید ابوالحسن علی ندوی نے جو خود بھی تفسیر وقرآنیات سے والہانہ شغف رکھتے ہیں، ان لفظوں میں دی ہے:

" عام طور پر لوگ سید صاحب کو مورخ یا ادیب کی حیثیت سے جانتے ہیں، خصوصاً علماء کے قدیم حلقہ میں ان کا تعارف اسی سلسلہ سے ہے، لیکن مجھے سید صاحب کی علمی صحبتوں اور ذاتی استفادہ سے معلوم ہوا کہ ان کا امتیازی مضمون قرآن مجید اور علم کلام ہے، میں نے معاصر علماء میں کسی شخص کا مطالعہ قرآن مجید اور علوم قرآن کا اتنا وسیع اور گہرا نہیں پایا، علم کلام اور عقائد پر سید صاحب کی نظر بہت عمیق و وسیع تھی، ان کو علم کلام کو سلف کے اصول اور کتاب و سنت کی روشنی میں عصر حاضر کے ذہن اور روح کے مطابق پیش کرنے کا خاص ملکہ حاصل تھا اور یہ غالباً مولانا حمید الدین فراہیؒ کی طویل صحبت، شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ کی کتابوں کے مطالعہ اور سیرۃ النبیؐ کی تالیف

کے سلسلے میں طویل غور و فکر کا نتیجہ تھا" (پرانے چراغ حصہ اول ص ۵۸)

گو سید صاحب نے عام مفسرینؒ کی طرح قرآن مجید کی کوئی تفسیر نہیں لکھی لیکن انکی اکثر تصنیفات سے قرآنیات سے ان کی خاص مناسبت اور عمیق مطالعہ کا کافی اندازہ ہوتا ہے، خصوصاً سیرۃ النبی جو شبلی و سلیمان کا سب سے مہتم بالشان کارنامہ اور در اصل اسلامی انسائیکلوپیڈیا اور تعلیماتِ محمدیؐ کا لُب لباب ہے۔ اس کے اکثر مسائل و مباحث قرآن مجید ہی سے ماخوذ و مستنبط اور مستفاد ہیں۔

اہلِ نظر جانتے ہیں کہ سیرۃ النبی کی تمام جلدوں کی تالیف میں اصل ماخذ و مرجع قرآن مجید ہی کو بنایا گیا ہے، رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی قرآن پاک کی عملی تفسیر اور آپؐ کا وجودِ مبارک اسی کا پرتو اور عملی نمونہ تھا، اس لیے مصنفینِ سیرت نے بحدِ امکان اسی کو آپؐ کی سیرتِ مبارکہ کی تالیف و تدوین کا اصلی و بنیادی ماخذ بنایا ہے، اس میں جس کثرت سے قرآنی آیات سے استشہاد کیا گیا ہے سیرت کی دوسری کتابوں میں اس کی مثال ملنا مشکل ہے، ہر مبحث میں اس سے متعلق قرآنی آیات کا پورا استقصا کیا گیا ہے، جس سے سیرۃ النبی کے مصنفین کے تدبر فی القرآن اور قرآنی علوم میں ژرف نگاہی کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے۔

اس طرح سیرۃ النبی تفسیر کی کتاب نہ ہوتے ہوئے بھی اس میں قرآن مجید کی آیتوں کی تفسیر و تاویل، اس کے معارف و حقایق کی تلاش و جستجو، اس کے مطالب و مضامین کی توضیح و تلخیص، اس کے اسرار و حکم کی تعلیل و توجیہہ، اس کے مشکلات و غوامض کی عقدہ کشائی اس کی مراد و منشا کی تعیین، اس کے مہمات اور اصول و حقایق کی نشاندہی، اس کے لطائف و نکات کی شرح، اس کے اشارات و ابہامات کی تفصیل و تبیین، اس کی تعبیروں اور اصطلاحات

کے مفہوم، اس کے متعلق شکوک و شبہات کا ازالہ، اس کی ادبی لطافتیں، اس کی بلاغت کی خوبیاں، نحو و صرف کے مسائل اور اس کے الفاظ و لغات کی بحث و تحقیق وغیرہ سب کچھ موجود ہے۔

اس جلد کا موضوع اسلامی عبادات ہے، جن کی سید صاحب نے دو قسمیں بتائی ہیں ایک جسمانی و مالی عبادات یعنی نماز۔ زکوٰۃ۔ روزہ۔ حج اور جہاد۔ دوسری وہ جن کا تمام تر تعلق قلبی احوال اور نفس کی اندرونی کیفیتوں سے ہے جیسے تقویٰ۔ اخلاص۔ توکل۔ صبر اور شکر۔ سیرت کی جلد پنجم انہی عبادات کی تشریح و توضیح پر مشتمل ہے، یہ سب خالص قرآنی موضوعات ہیں جن کی وضاحت تمام تر قرآن مجید کی روشنی میں کی گئی ہے اور اس کی تائید و استشہاد میں روایاتِ صحیحہ اور آثارِ صحابہ نقل کیے گئے ہیں۔ فاضل مصنف نے دیباچہ میں خود تحریر فرمایا ہے:

"ہر موضوع کی تفصیل و تشریح میں مصنفِ اول کے ایما کے مطابق قرآن مجید پر پوری نظر رکھی جاتی ہے، ان کی تدریجی تاریخ پیش نظر رہتی ہے، ان کی مصلحتوں اور حکمتوں سے پردہ اٹھایا جاتا ہے، دوسرے مذہبوں سے مناظرانہ پہلو کو بچا بچا کر مقابلہ و موازنہ کیا جاتا ہے اور ہر ایک بحث کے متعلق بتایا جاتا ہے کہ اسلام نے اس باب میں کیا تعلیم پیش کی ہے اور وہ کیونکر تمام عالم کی اصلاح کے لیے کافی ہے۔" (جلد پنجم دیباچہ ص ۳)

اب آئیے اس جلد پر ایک طائرانہ نظر ڈالیں کہ قرآن مجید کے بحرِ بیکراں میں سید صاحب کی غواصی و غوطہ زنی کے کچھ نمونے دیکھے جائیں!

سب سے پیشتر یہ بات مد نظر رکھنی چاہیے کہ اس جلد کے ہر باب یا مبحث کے تحت اصل مضمون شروع کرنے سے پہلے اس کے مناسب کسی آیت کا مختصر مگر جامع اور موضوع کا

احاطہ کرنے والا کوئی ٹکڑا نقل کرنے کا التزام کیا گیا ہے، مثلاً سب سے پہلا باب "عمل صالح" کے جلی عنوان سے شروع ہوا ہے، اس کے تحت یہ قرآنی الفاظ درج ہیں : اَلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ (ص) ۔ عبادات کے جلی عنوان کے تحت یٰاَیُّهَا النَّاسُ اعْبُدُوْا رَبَّکُمْ تحریر ہے ۔ اسی طرح آگے نماز اور دوسری عبادات کے جلی عنوان کے تحت اس سے متعلق قرآنی فقرے درج کیے گئے ہیں ۔

اوپر بتایا جا چکا ہے کہ اس جلد کے اکثر بلکہ تمام مباحث قرآن مجید سے ماخوذ و مستنبط ہیں، اس طرح ہر بحث سے متعلق اکثر آیات کا اس میں استقصا کیا گیا ہے، سید صاحب نے ان آیتوں کی توضیح و تشریح اور ان کا مدعا اور لب لباب بیان کر کے ایک طرح سے انکی سادہ اور دلنشین تفسیر کر دی ہے، اس سے جہاں قرآن مجید میں ان کے امعان نظر کا پتہ چلتا ہے وہاں اس کا بھی اندازہ ہوتا ہے کہ سیرۃ میں کس طرح قرآن مجید ہی کو اصل ماخذ و مرجع بنایا گیا ہے، اس کی مثالیں اس جلد میں بے شمار ہیں، لیکن ہم اپنے نقطۂ نظر کو واضح کرنے کے لیے صرف ایک مثال پر اکتفا کرتے ہیں ۔

اس کتاب میں صبر کا باب سورۂ احقاف کی اس آیت سے شروع ہوا ہے فَاصْبِرْ كَمَا صَبَرَ اُولُوا الْعَزْمِ مِنَ الرُّسُلِ ۔ پھر صبر کی حقیقت، اس کا مفہوم اور اس کے مختلف اطراف و جوانب اور متعدد گوناگوں پہلوؤں کی وضاحت کی گئی ہے ۔ پہلے یہ بتایا ہے کہ صبر کے بارے میں عموماً یہ غلط فہمی پائی جاتی ہے کہ وہ بے بسی و بے کسی کی تصویر ہے، جس کے معنی اپنے دشمن سے کسی مجبوری کے سبب سے انتقام نہ لے سکنا ہیں، سید صاحب نے صبر کے لغوی معنی اور قرآن مجید میں اس کے مواقع استعمال بیان کر کے اس کی اس طرح تردید کی ہے کہ صبر کا قرآنی مفہوم پوری طرح واضح ہو جاتا ہے ۔

سید صاحب کے نزدیک لغت میں اس کے معنی روکنے اور سہارنے کے ہیں اور یہی صبر کی معنوی حقیقت ہے کہ اپنے نفس کو اضطراب اور گھبراہٹ سے روکنا اور اس کو اپنی جگہ پر ثابت قدم رکھنا، اس سے اس غلط مفہوم کی تردید کے علاوہ یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ " صبر کے معنی پامردی، دل کی مضبوطی، اخلاقی جرأت اور ثباتِ قدم کے ہیں، اس کے ثبوت میں حضرت موسیٰ و خضر کے واقعہ سے یہ تین آیتیں نقل کرتے ہیں:۔

خضر حضرت موسیٰ سے کہتے ہیں

۱۔ اِنَّكَ لَنْ تَسْتَطِيْعَ مَعِیَ صَبْرًا (کہف ۔ ۱۸ : ۶۷)	تم میرے ساتھ صبر نہ کرسکوگے۔
۲۔ وَكَيْفَ تَصْبِرُ عَلٰى مَا لَمْ تُحِطْ بِهٖ خُبْرًا (کہف ۔ ۱۸ : ۶۸)	اور کیسے اس بات پر صبر کرسکتے ہو جس کا علم تمہیں نہیں۔
۳۔ حضرت موسیٰؑ جواب دیتے ہیں:۔ سَتَجِدُنِیْ اِنْ شَآءَ اللّٰهُ صَابِرًا۔ (کہف ۱۸ : ۶۹)	اگر خدا نے چاہا تو آپ مجھے صابر پائیں گے۔

سید صاحب کے نزدیک ان آیتوں میں صبر سے مقصود لاعلمی کی حالت میں غیر معمولی واقعات کے پیش آنے سے دل میں اضطراب اور بے چینی کا پیدا نہ ہونا ہے، اس معنی پر دلالت کرنے والی مزید آیتیں نقل کرکے بتاتے ہیں کہ قرآن پاک میں صبر اسی ایک معنی میں مستعمل ہے، گو حالات کے تغیر سے کہیں کہیں اس مفہوم میں ذرا ذرا فرق اور مزید وسعت پیدا ہوگئی ہے تاہم سب کا مرجع ثابت قدمی اور استقامت ہی ہے۔

سید صاحب نے قرآن مجید میں صبر کے مواقعِ استعمال کا ذکر کرکے اس کے مختلف مفہوم اور صبر کے حسب ذیل اقسام بتائے ہیں:۔

۱۔ ہر قسم کی تکلیف اٹھا کر اور اپنے مقصد پر جمے رہ کر کامیابی کے وقت کا انتظار کرنا۔ فرماتے ہیں کہ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے توحید کی دعوت اور اسلام کی تبلیغ کا آغاز کیا تو عرب کا ذرہ ذرہ آپؐ کی مخالفت میں سرگرم ہوگیا، اس وقت تسلی کا یہ پیام آیا کہ اضطراب اور گھبراہٹ کی ضرورت نہیں، آپؐ مستعدی سے اپنے کام میں لگے رہیں، خدا آپؐ کا نگہبان ہے، اس کا فیصلہ اپنے وقت پر آئے گا۔

وَاصْبِرْ لِحُكْمِ رَبِّكَ فَإِنَّكَ بِأَعْيُنِنَا۔ (طور ۵۲ : ۴۸)	(اے رسول!) تو اپنے پروردگار کے فیصلے کا ثابت قدم رہ کر منتظر رہ! کیونکہ تو ہماری آنکھوں کے سامنے ہے۔

اس مفہوم کی متعدد آیتیں نقل کر کے رقم طراز ہیں:

"انتظار کی کشمکش کی حالت میں جب ایک طرف حق کی بے کسی، بے چارگی اور بے بسی پاؤں کو ڈگمگا رہی ہو اور دوسری طرف باطل کی عارضی شورش اور ہنگامی غلبہ دلوں کو کمزور کر رہا ہو، حق پر قائم رہ کر اس کی کامیابی کی پوری امید رکھنی چاہیے، یہ نہ ہو کہ وعدۂ الٰہی کے ظہور میں اگر ذرا دیر ہو تو مشکلات سے گھبرا کر حق کا ساتھ چھوڑ دو اور باطل کے گروہ میں مل جاؤ، حضرت یونسؑ کی طرح اے پیغمبر! جو نافرمان قوم پر عذاب آنے میں تاخیر کی وجہ سے بھاگ کھڑے ہوئے، تمہارے ہاتھ سے صبر کا سررشتہ چھوٹنے نہ پائے۔"

ان سب امور کے ثبوت میں انہوں نے ان قرآنی آیات کو نقل کیا ہے جن میں صبر کا ذکر ہے۔

۲۔ صبر کا دوسرا مفہوم یہ بتایا ہے کہ مصیبتوں اور مشکلوں میں اضطراب اور بے قراری

نہ ہو بلکہ ان کو خدا کا حکم اور مصلحت سمجھ کر خوشی خوشی جھیلا جائے اور یہ یقین رکھا جائے کہ جب وقت آئے گا تو اللہ تعالیٰ اپنی رحمت سے خود ان کو دور فرما دے گا۔ چنانچہ ایسے ہی صابروں کی مدح میں کہا گیا ہے:

وَالصَّابِرِيْنَ عَلٰى مَا اَصَابَهُمْ — اور جو مصیبت میں صبر کریں۔

(حج ۔ ۲۲ : ۳۵)

حضرت یعقوبؑ نے حضرت یوسفؑ کے بارے میں جھوٹی خبر سُن کر فرمایا:

بَلْ سَوَّلَتْ لَكُمْ اَنْفُسُكُمْ اَمْرًا فَصَبْرٌ جَمِيْلٌ وَاللّٰهُ الْمُسْتَعَانُ عَلٰى مَا تَصِفُوْنَ۔ (یوسف ۔ ۱۲ : ۱۸)

بلکہ تمہارے دلوں نے ایک بات گھڑ لی ہے تو بہتر صبر ہے اور خدا سے اس کی مدد چاہی جاتی ہے جو تم بیان کرتے ہو۔

پھر اپنے دوسرے بیٹےؑ کے مصر میں روک لیے جانے کا حال سُن کر فرماتے ہیں:

بَلْ سَوَّلَتْ لَكُمْ اَنْفُسُكُمْ اَمْرًا فَصَبْرٌ جَمِيْلٌ عَسَى اللّٰهُ اَنْ يَّاْتِيَنِيْ بِهِمْ جَمِيْعًا (یوسف ۔ ۱۲ : ۸۳)

بلکہ تمہارے دلوں نے ایک بات گھڑ لیا ہے تو بہتر صبر ہے، عنقریب خدا ان سب کو ساتھ لائے گا۔

حضرت اسماعیلؑ و حضرت ایوبؑ کے غیر معمولی صبر سے متعلق آیتیں نقل کرکے بھی اپنا مدعا ثابت کیا ہے۔

۳۔ تیسرا مفہوم یہ ہے کہ منزلِ مقصود کی راہ میں جو مشکلیں اور خطرے پیش آئیں دشمن جو تکلیفیں پہنچائیں اور مخالفین جو طعن و طنز کریں ان میں سے کسی چیز کو خاطر میں نہ لایا جائے اور ان سے بددل اور پست ہمت ہونے کے بجائے اور زیادہ استقلال

اور استواری پیدا ہو۔ اسی لیے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو دوسری وحی میں تبلیغ و دعوت کے حکم کے ساتھ اس حقیقت سے بھی باخبر کر دیا گیا:۔

یٰاَیُّھَا الْمُدَّثِّرُ قُمْ فَاَنْذِرْ	اے چادر پوش اٹھ اور لوگوں کو
... وَلِرَبِّکَ فَاصْبِرْ۔	ہشیار کر... اور اپنے پروردگار کے
(مدثر - ۷۴ : ۱-۲ و ۷)	لیے پامردی (صبر) کر!

اس قسم کے مواقع اکثر انبیاء کو پیش آئے، آپ کو نبوت کی اس اعلا مثال کی پیروی کا حکم ہوا۔

فَاصْبِرْ کَمَا صَبَرَ اُوْلُوا الْعَزْمِ	(اے محمد!) تو بھی اسی طرح پامردی کر
مِنَ الرُّسُلِ وَلَا تَسْتَعْجِلْ لَّھُمْ	جس طرح پختہ ارادہ والے پیغمبروں
(احقاف - ۴۶ : ۳۵)	نے کی اور ان (مخالفوں) کے لیے جلدی نہ کر۔

اس مفہوم کی توضیح کے لیے مزید آیتیں بھی پیش کی گئی ہیں۔

۴- چوتھا مفہوم یہ بتایا گیا ہے کہ برائی کرنے والوں کی برائی کو نظر انداز، بدخواہوں اور تکلیفیں دینے والوں کے قصور کو معاف کیا جائے یعنی تحمل اور برداشت میں اخلاقی پامردی دکھائی جائے، اس مفہوم کی آیتیں متعدد ہیں، ایک ملاحظہ ہو:۔

وَاِنْ عَاقَبْتُمْ فَعَاقِبُوْا بِمِثْلِ	اور اگر تم سزا دو تو اسی قدر جس قدر
مَا عُوْقِبْتُمْ بِہٖ وَلَئِنْ صَبَرْتُمْ	تم کو تکلیف دی گئی اور البتہ اگر صبر
لَھُوَ خَیْرٌ لِّلصّٰبِرِیْنَ وَاصْبِرْ	(برداشت) کرو تو صبر کرنے والوں
وَمَا صَبْرُکَ اِلَّا بِاللّٰہِ وَلَا تَحْزَنْ	کے لیے یہ بہتر ہے اور تو صبر کر اور
عَلَیْھِمْ وَلَا تَکُ فِیْ ضَیْقٍ مِّمَّا	تیرا صبر کرنا نہیں لیکن خدا کی مدد سے

يَمْكُرُوْنَ (نحل۔ ۱۶: ۱۲۶ و ۱۲۷) اور ان کا غم نہ کر اور نہ ان کی سازشوں سے دل تنگ ہو۔

سید صاحب نے صبر کی اس قسم کو اخلاقی حیثیت سے بہت بڑی بہادری بتایا ہے، جس کی مسلمانوں کو بار بار تعلیم دی گئی ہے اور بتایا گیا ہے کہ یہ صبر و برداشت کمزوری یا دشمن کے خوف یا کسی اور سبب سے نہ ہو بلکہ صرف خدا کے لیے ہو، اس کی تائید میں صبر کے مفہوم پر مشتمل مزید آیتیں تحریر فرمائی ہیں۔

۵۔ صبر کا پانچواں مفہوم لڑائی کی صورت میں میدانِ جنگ میں بہادرانہ استقامت اور ثابت قدمی ہے اور اس وصف سے متصف لوگوں کو صادق القول، راست باز اور خدا سے کیے وعدہ کو پورا کرنے والا بتایا ہے، فرمایا:

وَالصّٰبِرِيْنَ فِي الْبَاْسَآءِ وَالضَّرَّآءِ	اور صبر کرنے والے (ثابت قدمی دکھانے
وَحِيْنَ الْبَاْسِ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ صَدَقُوْا	والے) مصیبت میں اور نقصان میں
وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُتَّقُوْنَ۔	اور لڑائی کے وقت۔ وہی ہیں جو
(بقرہ۔ ۲: ۱۷۷)	سچ بولے اور وہی پرہیزگار ہیں۔

اس مفہوم کی اور بھی آیتیں نقل کر کے ان کی مناسب، موثر اور دل نشیں وضاحت فرمائی ہے۔

۶۔ چھٹا مفہوم ضبطِ نفس ہے یعنی بڑی کامیابی و ناکامی کے وقت نفس پر قابو رکھنا اور ضبط سے کام لینا مشکل ہوتا ہے مگر اسی سے سنجیدگی، متانت و وقار اور کیرکٹر کی مضبوطی پیدا ہوتی ہے، دنیا میں غم و مسرت اور رنج و راحت توأم ہیں، ان دونوں موقعوں پر انسان کو ضبطِ نفس اور اپنے آپ پر قابو کی ضرورت ہے، تاکہ مسرت اور

خوشی کے نشہ میں فخر و غرور پیدا نہ ہو اور غم و تکلیف میں وہ اداس اور بددل نہ ہو ان دونوں عیوب کا علاج صبر و ثبات اور ضبط نفس ہے، فرمایا :-

وَلَئِنْ اَذَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنَّا رَحْمَةً	اور اگر ہم انسان کو اپنے پاس سے
ثُمَّ نَزَعْنٰهَا مِنْهُ اِنَّهٗ لَيَئُوْسٌ	کسی مہربانی کا مزہ چکھائیں پھر اس سے
كَفُوْرٌ وَلَئِنْ اَذَقْنٰهُ نَعْمَآءَ بَعْدَ	اس کو اتار لیں تو وہ ناامید اور ناشکرا
ضَرَّآءَ مَسَّتْهُ لَيَقُوْلَنَّ ذَهَبَ السَّيِّاٰتُ	ہو جاتا ہے اور اگر کوئی مصیبت کے
عَنِّيْ اِنَّهٗ لَفَرِحٌ فَخُوْرٌ اِلَّا الَّذِيْنَ	بعد اس کو نعمت کا مزہ چکھائیں تو
صَبَرُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ اُولٰٓئِكَ	کہتا ہے کہ برائیاں مجھ سے دور ہو گئیں
لَهُمْ مَّغْفِرَةٌ وَّاَجْرٌ كَبِيْرٌ۔	بے شک وہ شاداں اور نازاں ہے
(ہود - ۱۱ : ۹ - ۱۱)	لیکن وہ جنھوں نے صبر (یعنی نفس پر
	قابو) رکھا اور اچھے کام کیے، یہ لوگ
	ہیں جن کے لیے معافی اور بڑا انعام ہے۔

۷ - صبر کا ایک مفہوم یہ ہے کہ کسی فرض کو عمر بھر پورے استقلال اور مضبوطی سے ادا کرنا - جو ہنگامی واقعات اور وقتی مشکلات پر صبر و پامردی سے بڑھ کر ہے، مثلاً مذہبی فرائض و احکام کو جو بہر حال نفس پر سخت گزرتے ہیں، عمر بھر پوری مضبوطی سے ادا کرتے رہنا بھی صبر ہے، بہر حال اور ہر کام میں خدا کے حکم کی فرماں برداری اور عبودیت پر ثباتِ نفس انسانی کا سب سے بڑا امتحان ہے، اسی لیے حکم ہوا :

رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا	آسمانوں کا پروردگار اور زمین کا،
بَيْنَهُمَا فَاعْبُدْهُ وَاصْطَبِرْ	اور جو ان دونوں کے بیچ میں ہے،

لِعِبَادَتِہٖ - (مریم ۱۹ : ۶۵) سب کا، تو اسی کی بندگی پر ٹھہرا رہ (صبر کر)

ایک اور آیت میں تمام عمر نماز کا فریضہ ادا کرنے اور اپنے اہل و عیال کو بھی اسکی تاکید رکھنے کے سلسلے میں ہے :

وَأْمُرْ أَهْلَكَ بِالصَّلٰوةِ وَاصْطَبِرْ عَلَيْهَا (طٰہٰ ۲۰ : ۱۳۲) اور اپنے گھر والوں کو نماز کا حکم کر اور آپ اس پر قائم رہ !

اختصار کے خیال سے صبر اور اس کے مختلف مفاہیم کی توضیح کے لیے جو متعدد آیتیں نقل کی گئی ہیں انہیں یہاں پیش نہیں کیا جا سکا، اس کے بعد اسی سلسلۂ بیان میں مصنف نے یہ دو عنوان قائم کیے ہیں :

(۱) صبر کے فضائل اور انعامات (۲) فتحِ مشکلات کی کنجی صبر اور دعا۔

اور ان دونوں کی وضاحت تمامتر قرآنی آیات سے کی ہے۔

قرآن مجید سے اوقاتِ نماز کی تعیین

سید صاحب نے اوقات نماز پر اس لیے نہایت طویل اور مبسوط بحث کی ہے کہ بعض مستشرقین نے دانستہ یا نادانستہ طور پر اوقاتِ نماز میں غلط فہمی پھیلانی چاہی ہے، سید صاحب اوقاتِ نماز کی تعیین کو اسلام کا تکمیلی کارنامہ قرار دیتے ہیں، انہوں نے اس کی ضرورت و حکمت بھی بیان کی ہے اور یہ بھی واضح کیا ہے کہ عبادت اور نماز کے اوقات دوسرے مذہبوں میں بھی ان کے اصولوں اور نظریوں کے مطابق مقرر ہیں۔ اسلام نے نماز کے لیے مناسب نظری اوقات کا تعین کیا ہے اور انسان کی فطری و نوعی ضرورتوں کے لحاظ سے روزانہ کے مختلف انسانی مشاغل کے سرآغاز پر ایک وقت کی نماز رکھی ہے تاکہ یہ لمحے اوقات خدا کی یاد ہی میں محسوب ہوں (سیرۃ النبی جلد پنجم ص۱۱۳)

یہ نکتہ بھی بیان کیا گیا ہے کہ آفتاب پرست قومیں آفتاب کے نمودار اور غروب ہونے کے وقت سجدہ کرتی ہیں، اس کے برعکس ملتِ ابراہیمی میں آفتاب کے زوال و غروب کے بعد نماز پڑھی جاتی ہے، یہ ساری بحثیں پڑھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ شریعت کے اسرار و حکم پر ان کی کیسی گہری نظر تھی، لیکن ہم ان کو قلم انداز کر کے یہ دکھانا چاہتے ہیں کہ حضرت سید صاحب نے قرآن مجید سے نماز کے اوقات کس طرح متعین اور ثابت کیے ہیں۔

نماز کے اوقات کے مخصوص و متعین ہونے کا پتہ اس آیت سے چلتا ہے:

اِنَّ الصَّلٰوۃَ کَانَتْ عَلَی الْمُؤْمِنِیْنَ کِتَابًا مَّوْقُوْتًا (نساء - ۴ : ۱۰۳)	بے شبہ نماز مسلمانوں پر مقررہ اوقات میں فرض ہے۔

سب سے پہلے وہ یہ اصولی اور تمہیدی بات ذہن نشین کراتے ہیں کہ ادائے نماز کے لیے قرآن مجید میں زیادہ تر تین لفظ استعمال ہوئے ہیں، صلوٰۃ یا اقامتِ صلوٰۃ، تسبیح اور ذکر اللہ، اقامتِ صلوٰۃ کے لفظ کو وہ نماز ہی کے لیے مخصوص بتاتے ہیں، لیکن دوسرے اور تیسرے لفظ کو عام مانتے ہیں کیونکہ وہ نماز کے علاوہ تسبیح و تحمید اور یادِ الٰہی کے لیے بھی استعمال ہوتے ہیں، ان کا اطلاق نماز پر اس لیے ہوتا ہے کہ نماز کا جزو اعظم تسبیح و تحمید ہے۔ احادیث میں بھی تسبیح نماز پڑھنے کے معنی میں آیا ہے، اشعارِ عرب اور لغتِ عرب سے بھی اس کا ثبوت ملتا ہے۔ فرماتے ہیں کہ قرآن مجید میں جب تسبیح کے ساتھ وقت کی تخصیص ہوگی تو اس سے نماز کے علاوہ اور کوئی چیز مراد نہیں ہوسکتی کیونکہ وقتِ مخصوص کے ساتھ اسلام میں نماز کے علاوہ کوئی عام تسبیح فرض نہیں ہے۔ اوقات کی تخصیص کے بغیر قرآن مجید نے جہاں تسبیح کا حکم دیا ہے، اس سے خدا کی عام یاد تو صرف مراد ہوسکتی ہے۔

اس اصولی حقیقت کو ذہن نشین کرانے کے بعد انہوں نے قرآن مجید کے متعلقہ مقامات

کی آیتیں نقل کی ہیں، جن میں نماز یا ذکر تسبیح اور قیام کے الفاظ آئے ہیں، طوالت کے خوف سے ہم اصل آیتیں نقل کرنے کے بجائے صرف سورتوں کے نام ان کے اور آیات کے نمبر پر لکھنے پر اکتفا کرتے ہیں :۔

مزمل (۷۳ : ۲ و ۳) مومن (۴۰ : ۵۵) احزاب (۳۳ : ۴۲) فتح (۴۸ : ۹) اعراف (۷ : ۲۰۵) انعام (۶ : ۵۲) (نور ۲۴ : ۳۶ و ۵۸)، کہف (۱۸ : ۲۸) طور (۵۲ : ۴۸ و ۴۹) ہود (۱۱ : ۱۱۴) بنی اسرائیل (۱۷ : ۸۰ و ۷۹) دہر (۷۶ : ۲۵ و ۲۶) طٰہٰ (۲۰ : ۱۳۰) روم (۳۰ : ۱۷ و ۱۸) ق (۵۰ : ۳۹-۴۱) (سیرۃ النبی جلد پنجم ص ۱۲۲)

سید صاحب فرماتے ہیں کہ ان آیتوں میں نماز کے مختلف اوقات کا ذکر مکرر ہے، سب کو ملانے سے پانچ وقتوں فجر، ظہر، عصر، مغرب اور عشا ہو جاتے ہیں، جن میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تمام عمر نماز ادا فرماتے رہے اور یہ مسلسل تواتر سے بھی ثابت ہے۔

غدو۔ غداۃ۔ بکرہ۔ فجر قبل طلوع الشمس اور حِیْنَ تُصْبِحُوْنَ کے معنی صبح کی نماز۔

اصیل۔ عشی اور قبل غروب الشمس سے مراد عصر۔

دلوک الشمس (زوال) اور حِیْنَ تُظْهِرُوْنَ (جب دوپہر کرو) سے مقصد ظہر۔

طرف النہار (دن کا کنارہ) اور تُمْسُوْنَ (جب شام کرو) سے مراد مغرب۔

مِنْ آنَاءِ اللَّيْلِ (کچھ رات گزرے) غَسَقِ اللَّيْلِ (رات کی ابتدائی تاریکی) اور صلوٰۃ العشاء سے عشاء کی نماز ہے۔

یہی نماز کے پانچ اوقات ہیں جن میں خدا کی یاد اور تسبیح و تحمید کا حکم ہم کو دیا گیا ہے۔

(سیرۃ النبی جلد ۵ ص ۲۳۳)

یہ حقیقت بھی ملحوظ رہے کہ اوقاتِ نماز کی تکمیل تدریجاً ہوئی ہے، اسلام کا آغاز غربت، مظلومی اور بے سروسامانی کے ساتھ ہوا، اس لیے شروع میں دن کے وقت کوئی نماز نہ تھی، لوگ صرف رات کو چھپ چھپا کر دیر تک نماز پڑھا کرتے تھے، اس کا ثبوت یہ آیتیں ہیں:۔

یٰاَیُّهَا الْمُزَّمِّلُ قُمِ الَّیْلَ اِلَّا قَلِیْلًا نِّصْفَهٗۤ اَوِ انْقُصْ مِنْهُ قَلِیْلًا اَوْ زِدْ عَلَیْهِ وَرَتِّلِ الْقُرْاٰنَ تَرْتِیْلًا اِنَّا سَنُلْقِیْ عَلَیْكَ قَوْلًا ثَقِیْلًا اِنَّ نَاشِئَةَ الَّیْلِ هِیَ اَشَدُّ وَطْاً وَّ اَقْوَمُ قِیْلًا اِنَّ لَكَ فِی النَّهَارِ سَبْحًا طَوِیْلًا

(مزمل-۷۳: ۱-۷)

اے کملی اوڑھ کر سونے والے! تھوڑی دیر کے علاوہ ساری رات اٹھ کر نماز پڑھا کر! آدھی رات تک یا اس سے کچھ کم یا اس سے (کچھ) زیادہ اور اس میں قرآن ٹھہر ٹھہر کر پڑھ! ہم تجھ پر عنقریب ایک بھاری بات ڈالنے والے ہیں یعنی (شریعت کے مفصل احکام اتارنے والے ہیں) بے شک رات کو اٹھ کر نماز پڑھنے میں طمانیتِ قلب کا زیادہ موقع ہے اور قرآن سمجھ کر پڑھنے کے لیے زیادہ مناسب ہے، بے شک تجھ کو دن کے وقت آرام کی فرصت حاصل ہے۔

شروع کے تین برسوں میں جب تک اسلام کی دعوت برملا نہیں دی جا سکتی تھی یہی حکم رہا، جب نسبتاً اطمینان حاصل ہوا اور دعوت کے اظہار کا وقت آیا تو رفتہ رفتہ اسلام کا قدم تکمیل کی طرف بڑھا اور رات کی طویل نماز تہجد کے علاوہ عشا اور فجر کی نمازوں کا اضافہ ہوا۔

وَاصْبِرْ لِحُكْمِ رَبِّكَ فَإِنَّكَ بِأَعْيُنِنَا وَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ حِينَ تَقُومُ وَمِنَ اللَّيْلِ فَسَبِّحْهُ وَإِدْبَارَ النُّجُومِ

(طور - ۵۲ : ۴۸ و ۴۹)

اور اپنے رب کے فیصلہ کا انتظار کھینچ، بے شک تو ہماری آنکھوں کے سامنے ہے اور اپنے رب کی تسبیح کر جب تو نماز کو کھڑا ہو اور کچھ رات کے حصہ میں اس کی تسبیح کر اور ستاروں کے پیٹھ پھیرتے وقت۔

سورۂ طور مکہ میں نازل ہوئی، اس وقت قریش نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو ایذا دینا شروع کر دیا تھا، کیونکہ اس سورہ میں اسی آیت سے پہلے آپؐ کے مصائب اور ان پر صبر کرنے اور فیصلۂ الٰہی کا حکم اور آپؐ کی ہر قسم کی حفاظت کی خوش خبری ہے، سورۂ دہر بھی جمہور کے نزدیک مکی ہے اور غالباً سورۂ طور کے بعد اتری جس میں ان اوقات کے علاوہ دن کے خاتمہ کے قریب کی ایک نماز جس کو عصر کہئے بڑھتی ہے۔

فَاصْبِرْ لِحُكْمِ رَبِّكَ وَلَا تُطِعْ مِنْهُمْ آثِمًا أَوْ كَفُورًا وَاذْكُرِ اسْمَ رَبِّكَ بُكْرَةً وَأَصِيلًا وَمِنَ اللَّيْلِ فَاسْجُدْ لَهُ وَسَبِّحْهُ لَيْلًا طَوِيلًا۔

(دہر - ۷۶ : ۲۴ - ۲۶)

تو اپنے پروردگار کے فیصلے کا انتظار کر، اور ان مخالفوں میں سے کسی گنہگار یا اللہ کے ناشکر گزار کا کہنا نہ مان، اور صبح کو اور تیسرے پہر کو اپنے پروردگار کا نام لیا کر اور کچھ رات گئے اس کو سجدہ کر، اور رات کو دیر تک اس کی تسبیح کیا کر!

سید صاحب کے نزدیک اس میں رات کی دیر تک کی نماز تہجد کے علاوہ تین وقتوں

کی تصریح ہے یعنی صبح، اخیر دن اور ابتدائی شب، مگر ابھی اصیل میں ظہر و عصر اور من الیل (رات) میں مغرب اور عشا کی تفریق نہیں ہوئی تھی، کیونکہ کل تین نمازیں تھیں، ایک فجر کے وقت، ایک سہ پہر کو اور ایک رات کو۔ اسی لیے باقی دو نمازوں کی جگہ رات کو دیر تک نماز پڑھنے کا حکم تھا، سید صاحب کے نزدیک ان تین وقتوں کی تسبیح و تحمید کے باقاعدہ نماز کا قالب اختیار کرنے کا حکم اس آیت سے ہوتا ہے:۔

وَاَقِمِ الصَّلٰوۃَ طَرَفَیِ النَّھَارِ وَزُلَفًا مِّنَ الَّیْلِ۔	اور دن کے دونوں کناروں میں (یعنی فجر اور عصر) اور رات کے ایک ٹکڑے میں نماز پڑھا کر!
(ہود۔ ۱۱: ۱۱۴)	

سورۂ ہود بھی مکی ہے اور سید صاحب کے خیال میں غالباً اوقاتِ نماز کے سلسلے میں یہ پہلی آیت ہے جس میں تسبیح کے بجائے باقاعدہ "صلوٰۃ" کی اقامت کا حکم آیا ہے۔ اس کے بعد وہ سورۂ ق کی یہ آیت پیش کرتے ہیں:

فَاصْبِرْ عَلٰی مَا یَقُوْلُوْنَ وَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّکَ قَبْلَ طُلُوْعِ الشَّمْسِ وَقَبْلَ الْغُرُوْبِ وَمِنَ الَّیْلِ فَسَبِّحْہُ وَاَدْبَارَ السُّجُوْدِ۔	پس ان (مخالفوں) کے کہنے پر (اے رسول) صبر کر اور آفتاب[۱] کے نکلنے سے پہلے (صبح) اور اس[۲] کے ڈوبنے سے پہلے (عصر) اپنے پروردگار کی حمد و تسبیح کر اور کچھ[۳] رات گئے (عشا) پر اس کی تسبیح کر اور (آفتاب کے) سجدہ کرنے کے بعد (غروب کے بعد یعنی مغرب کے وقت اس کی تسبیح کر)
(ق۔ ۵۰: ۳۹ و ۴۰)	

اس آیت کے ضمن میں تحریر کرتے ہیں کہ رات کی نماز کا ابہام دور کر کے مغرب اور عشا کی تعیین کردی گئی، ایک کی نسبت وَمِنَ الَّیْلِ (کچھ رات گئے) اور دوسری کی نسبت وَاَدْبَارَ السُّجُوْدِ (آفتاب ڈوبنے پر) کہا گیا۔ زوال کے بعد سے غروب تک کی نماز (جس کو پہلے اَصِیْل اور پھر طَرَفِی النَّهَارِ (دن کے دونوں کناروں میں) اور یہاں قبل غروب کی نماز کہا گیا ہے۔ اب بھی تفصیل طلب ہے، جس کے اندر ظہر و عصر دونوں نمازیں داخل ہیں۔ چنانچہ سورۂ روم میں جو مکہ میں نازل ہوئی ہے، اس کی تفصیل کی گئی ہے :۔

فَسُبْحَانَ اللّٰهِ حِيْنَ تُمْسُوْنَ وَحِيْنَ	اللہ کی تسبیح کرو جب شام (یا رات)
تُصْبِحُوْنَ وَلَهُ الْحَمْدُ فِي السَّمٰوٰتِ	کرو اور جب صبح کرو اور اس کی حمد
وَالْاَرْضِ وَعَشِيًّا وَّحِيْنَ تُظْهِرُوْنَ	آسمانوں اور زمین میں ہے اور اخیر
(روم - ۳۰ : ۱۷ و ۱۸)	دن کو اس کی تسبیح کرو اور جب ظہر کرو!

اس آیت کے متعلق بتاتے ہیں کہ اس میں زوال کے بعد (ظہر) اور غروب سے قبل (عصر) کی مبہم نمازوں کی توضیح کی گئی ہے، ایک کو عشی (عصر) اور دوسری کو ظہر کہا گیا ہے۔

ان تمام آیتوں پر مفصل بحث کرنے کے بعد ان کا ماحصل یہ بتایا گیا ہے کہ نماز فجر کا ذکر بالتصریح طٰہٰ، طور، دھر، ھود، ق، روم، اور نور میں۔ ظہر کا بالاجمال تذکرہ دھر، ق، طٰہٰ، اور اسرا میں اور بالتصریح اسرا و روم میں، عصر کا بقرہ، دھر، ھود، طٰہٰ، ق اور روم میں، مغرب کا بالاجمال ھود، طٰہٰ اور روم میں اور بالتصریح ق میں ہے، عشا کا بصورت صلوٰۃ الیل مزمل، طور اور دھر میں اور بصورتِ عشا بالاجمال طٰہٰ، ھود، اور روم میں اور بالتصریح ق اور ھود میں ہے۔

تمام نمازوں کا بالاجمال تذکرہ بقرہ، اسراء اور طٰہٰ میں ہے، طور سے فجر اور

عشا دو وقتوں کی نماز۔ اسراء، ھود اور طٰہٰ سے کم از کم بظاہر تین وقتوں کی۔ روم سے چار وقتوں کی (اگر مسلسل سے صرف مغرب مراد لیں) اور طٰہٰ و روم سے پانچ وقتوں کی نماز ثابت ہے۔

وہ محدثین و مورخین کے اس اتفاق عام کا ذکر کرتے ہیں کہ نماز کے اوقات پنج گانہ کی تعیین معراج میں ہوئی اور معراج سید صاحب کی تحقیق میں بعثت کے بارہویں سال اور ہجرت سے ایک سال پہلے واقع ہوئی تھی۔ ان کے نزدیک اوقات پنج گانہ کا ذکر سورۂ ق و روم میں بھی موجود ہے جو اس سے پہلے نازل ہو چکی تھی لیکن اقامت صلوٰۃ کے امر کے ساتھ سب سے پہلے سورۂ اسرا (معراج) کی اس آیت میں ہوا ہے:۔

اَقِمِ الصَّلٰوۃَ لِدُلُوْکِ الشَّمْسِ	آفتاب کے جھکاؤ کے وقت رات کی
اِلٰی غَسَقِ الَّیْلِ وَقُرْاٰنَ الْفَجْرِ اِنَّ	تاریکی تک نماز کھڑی کر اور فجر کی
قُرْاٰنَ الْفَجْرِ کَانَ مَشْهُوْدًا	قرأت قائم کر۔ بے شک فجر کی قرأت
(اسراء۔ ۱۷ : ۷۸)	میں حضور ہوتا ہے۔

لغت اور کلام عرب کے استعمال سے یہ ثابت کرتے ہیں کہ دلوک کا اطلاق تین اوقات یا آفتاب کی تین حالتوں پر ہوتا ہے۔ زوال پر، مقابل نقطۂ نگاہ سے آفتاب کے ہٹ جانے پر اور غروب پر۔ آفتاب کے دلوک (جھکاؤ) پر نماز پڑھو کا مطلب یہ ہوا کہ ان تینوں دلوکات یعنی آفتاب کے تینوں جھکاؤ پر ایک ایک نماز لازم آئی، مقصد یہ ہے کہ آفتاب ڈھلنا شروع ہوتا ہے تو اس کے تین دلوک یا جھکاؤ ہوتے ہیں، ایک نقطۂ سمت الراس سے دوسرا نقطۂ تقابل سے اور تیسرا دائرۂ افق سے۔ پہلا ظہر کا وقت ہے دوسرا عصر کا اور تیسرا مغرب کا، چوتھی نماز کا وقت غسق اللیل (رات کی تاریکی) ہے۔ جو عشا کی نماز ہے اور

پانچویں وقت کا "قرآن الفجر" (صبح کا پڑھنا) بتایا گیا ہے یعنی فجر کا۔

غرض اس آیت میں اقامتِ صلوٰۃ سے سید صاحب کے نزدیک اوقاتِ پنجگانہ مراد ہیں، ان میں نماز پڑھنے کی جو حکمت و مصلحت بھی بیان کی گئی ہے، اس کا لب لباب باطل پرستی اور آفتاب پرستی سے تبری ہے۔

سورۂ اسرا کی طرح انہوں نے سورۂ طٰہٰ کی مندرجۂ ذیل آیت سے بھی اوقاتِ پنجگانہ کو ثابت کیا ہے :۔

وَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ قَبْلَ طُلُوْعِ الشَّمْسِ وَقَبْلَ غُرُوْبِهَا وَمِنْ اٰنَآئِ الَّيْلِ فَسَبِّحْ وَاَطْرَافَ النَّهَارِ (طٰہٰ - ۲۰ : ۱۳۰)	اور اپنے پروردگار کی حمد کی تسبیح پڑھ آفتاب نکلنے سے پہلے اور اس (آفتاب) کے ڈوبنے سے پہلے اور رات کے کچھ وقت میں اور تسبیح پڑھ اور دن کے کناروں میں۔

آفتاب نکلنے سے پہلے فجر، ڈوبنے سے پہلے عصر، رات کے کچھ وقت سے عشا اور دن کے کناروں میں ظہر اور مغرب ہے، انہوں نے اطراف النہار سے ظہر و مغرب مراد لیے جانے کو بہ تحقیق ثابت کیا ہے،

سید صاحب نے اوقاتِ پنجگانہ پر اس طرح بھی استدلال کیا ہے۔

۱۔ اَقِمِ الصَّلٰوۃَ لِدُلُوْكِ الشَّمْسِ (اسرا - ۱۷ : ۷۸) — زوالِ آفتاب کے وقت نماز کھڑی کر!

یہ ظہر کی نماز ہوئی۔

۲۔ وَقَبْلَ الْغُرُوْبِ (ق - ۵۰ : ۳۹) — اور غروبِ آفتاب سے پہلے خدا کی تسبیح کر!

وَاذْكُرِ اسْمَ رَبِّكَ بُكْرَةً وَّاَصِيْلًا　　اور اپنے پروردگار کا نام یاد کر صبح کو اور عصر کو۔

(دہر ۷۶ : ۲۵)

یہ عصر کی نماز ہوئی جس کو سورۂ بقرہ میں وَالصَّلٰوةِ الْوُسْطٰى (۲ : ۲۳۸) بیچ کی نماز اس لیے کہا گیا ہے کہ یہ دن کی نمازوں میں ظہر اور مغرب کے بیچ میں واقع ہے۔

۳۔ وَاَقِمِ الصَّلٰوةَ طَرَفَيِ النَّهَارِ　　اور دن کے دونوں (ابتدائی اور انتہائی) کناروں میں نماز کھڑی کر!

(ہود۔ ۱۱-۱۱۴)

دن کا ابتدائی کنارہ صبح اور انتہائی کنارہ مغرب ہے۔

۴۔ سورۂ نور میں ہے کہ صبح کی نماز سے پہلے بے پکارے زنانہ کمرہ یا مکان میں نہ جایا کرو۔

مِنْ قَبْلِ صَلٰوةِ الْفَجْرِ (نور۔۲۴: ۵۸)　　صبح کی نماز سے پہلے۔

۵۔ پھر اسی سورہ میں اسی موقع پر ہے۔

وَمِنْ بَعْدِ صَلٰوةِ الْعِشَاءِ (نور۔۲۴-۵۸)　　اور عشا کی نماز کے بعد۔

یہ نماز عشا کا عملی ثبوت ہے۔

احادیث و سنن نبوی سے بھی اوقات نماز کو ثابت کرنے کے بعد آخر میں یہ بتایا ہے کہ نماز پنجگانہ کی تکمیل کے بعد صلوٰۃ اللیل (تہجد کی نماز) جو پہلے فرض تھی، عام امت کے لیے نفل ہوگئی، ارشاد ربانی ہے:

اَقِمِ الصَّلٰوةَ لِدُلُوْكِ الشَّمْسِ　　نماز کو آفتاب کے جھکاؤ کے بعد کھڑی
اِلٰى غَسَقِ الَّيْلِ وَقُرْاٰنَ الْفَجْرِ　　کر (ظہر، عصر، مغرب) رات کی تاریکی
اِنَّ قُرْاٰنَ الْفَجْرِ كَانَ مَشْهُوْدًا　　تک اور صبح کی قرأت قائم کر، بے شک

وَمِنَ الَّيْلِ فَتَهَجَّدْ بِهٖ نَافِلَةً لَّكَ عَسٰٓى اَنْ يَّبْعَثَكَ رَبُّكَ مَقَامًا مَّحْمُوْدًا (اسراء-۱۷، ۸، ۷۹)

صبح کی قرأت میں حضور ہوتا ہے اور رات کے حصہ میں تو اٹھ کر (اوقات مقررہ سے) زیادہ نماز پڑھ، شاید کہ تجھ کو تیرا رب قابل تعریف مقام میں اٹھائے۔

اوپر اس کا ذکر آیا تھا کہ پانچ نمازوں کے اوقات کی تعیین اسرا (معراج) میں ہوئی، اسرا کا ذکر سیرت کے تیسرے حصہ میں ہے وہاں بھی سید صاحب نے اوقات کی تعیین پر لطیف و عمدہ بحث کی ہے اور حاشیہ میں تحریر فرمایا ہے کہ "یہ نکتہ مخدومی مولانا حمید الدین صاحب مصنف تفسیر نظام القرآن کا افادہ ہے" اس موقع پر اس کو بھی تتمہ بحث کے طور پر نقل کر دینا مناسب معلوم ہوتا ہے۔

زیر بحث وہی سورۂ بنی اسرائیل کی آیات ۷۸، ۷۹، اَقِمِ الصَّلٰوةَ لِدُلُوْكِ الشَّمْسِ الخ ہیں، فرماتے ہیں لفظ لِدُلُوْكِ الشَّمْسِ (آفتاب کے ڈھلنے کے وقت) میں نماز ظہر، عصر اور مغرب کے تین اوقات کی تعیین کی طرف لطیف اشارہ ہے، وہ دین محمدی کو ملت ابراہیمی کا نقش ثانی بتاتے ہیں اور کہتے ہیں کہ حضرت ابراہیمؑ کے زمانے میں آفتاب پرستی اور ستارہ پرستی عام تھی جس کی رسم کہن دنیا میں آج بھی قائم ہے، اس مذہب میں آفتاب کی پرستش کے وہ اوقات تھے جن میں اسکی روشنی کا ظہور یا کمال ہوتا ہے، اسی لیے طلوع سے لیکر نصف النہار تک اسکی پرستش کی جاتی ہے، ملت ابراہیمی نے اسکے برخلاف اپنے لیے وہ اوقات متعین کیے جو آفتاب کے زوال کے ہیں یعنی سورج ڈھلنے سے لیکر آفتاب کے غروب تک کہ یہ تمام اوقات اسکے انحطاط نور اور زوال کے ہیں، آفتاب کے انحطاط اور زوال کی تین منزلیں ہیں، ایک وہ جب سمت راس (سر) سے وہ ڈھلتا ہے، یہ ظہر کا وقت ہے اور دوسری منزل وہ ہے جب وہ برابر کی نگاہ سے نیچے اترتا ہے، یہ عصر کا وقت ہے اور تیسری منزل وہ ہے جب وہ سمت افق سے نیچے گر جاتا ہے اور یہ مغرب کا وقت ہے، چوتھی نماز کا وقت رات کی تاریکی کا مقرر کیا ہے، جب آفتاب کے بقیہ وجود کی سرخ نشانی جس کو عرف عام میں شفق کہتے ہیں وہ بھی مٹ جاتی ہے اور صبح کی نماز وَاِدْبَارَ النُّجُوْمِ یعنی ستاروں کی روشنی کے ماند ہونے کے بعد ہے۔

(باقی)

محمد صلی اللہ علیہ وسلم انسانیت کے مُعَالج
بائبل کی دو بشارتوں کی روشنی میں

از مولانا حبیب ریحان خان ندوی، بھوپال

(۲)

حضور پاکؐ کی پیشینگوئیاں حضرت مسیح علیہ السلام کی پشینگوئی کا یہ جملہ "وہ آئندہ کے متعلق خبر دے گا" مبنی بر حقیقت جملہ ہے، حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم بے شمار آنے والے واقعات کی اطلاع قرآن پاک کے ذریعہ دی اور بہت سی باتیں اس حکمت و وحی کے ذریعے بتائیں جو اللہ تعالیٰ نے آپؐ کو "وحی غیر متلو" کی شکل میں دی تھی اور جسے سنت یا حدیث کے لفظ سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

یہ پیشینگوئیاں قرآن کے علاوہ حدیث پاک کی کتابوں، سیر و سیرت کے دفتروں اور اعلام نبوت یا دلائلِ نبوت جیسی تصنیفات میں تفصیل کے ساتھ بیان کی گئی ہیں، اس میں شبہ نہیں کہ بعض موضوع اور ضعیف و بے اصل باتیں بھی اس میں موجود ہیں، لیکن ان میں صحیح چیزوں کو تلاش کرنے کا کام محدثین اور علمائے امت نے کیا ہے اور اس رو سے صحیح و مستند پیشینگوئیاں بھی اتنی زیادہ ہیں اور ان کی تشریح و توضیح اتنی طویل ہے کہ پوری ایک ضخیم کتاب بھی ان کے لیے ناکافی ہے، راقم یہاں صرف پانچ پیشینگوئیوں کی کچھ تفصیل بیان کرے گا اور دوسری متعدد پیشینگوئیوں کی طرف صرف اشارہ کرے گا۔

جلدی نہ کرو نشانیاں آنے والی ہیں

وَإِذَا رَاٰكَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اِنْ يَّتَّخِذُوْنَكَ اِلَّا هُزُوًا ۭ اَھٰذَا الَّذِيْ يَذْكُرُ اٰلِهَتَكُمْ ۚ وَهُمْ بِذِكْرِ الرَّحْمٰنِ هُمْ كٰفِرُوْنَ ۔ خُلِقَ الْاِنْسَانُ مِنْ عَجَلٍ ۭ سَاُورِيْكُمْ اٰيٰتِيْ فَلَا تَسْتَعْجِلُوْنِ ۔ (الانبیاء - ۳۶ و ۳۷)

یہ منکرین حق جب تمہیں دیکھتے ہیں تو تمہارا مذاق بنالیتے ہیں، کہتے ہیں کیا یہی وہ شخص ہے جو تمہارے خداؤں کا ذکر کیا کرتا ہے، اور ان انسانوں کا حال یہ ہے کہ رحمٰن کے ذکر سے منکر ہیں، انسان جلد باز مخلوق ہے، ابھی میں تم کو اپنی نشانیاں دکھائے دیتا ہوں، جلدی نہ مچاؤ۔

اس کے بعد والی آیتوں سے پتہ چلتا ہے کہ یہ نشانیاں قیامت کے دن ظاہر ہوں گی اور جہنم کی آگ سے وہ بچ نہ سکیں گے اور حق یہ ہے کہ یہ وعدۂ حق اور پیشینگوئی پوری ہو کر رہے گی۔ یا دوسری تفسیر یہ بھی ہے کہ جب رسول پاکؐ دین کے نشر ہونے اور اپنے اصحاب کے غالب ہونے کا ذکر کرتے تھے تو مشرکین و مخالفین اسے جھٹلاتے تھے اور یہ کہتے تھے یہ ہرگز نہیں ہوسکتا تو خدا نے اس کے جواب میں فرمایا کہ غلبۂ دینی اور نصرت رسولؐ کی نشانی تم عنقریب اس دنیا میں دیکھ لوگے، سورۂ انبیاء ہی کی آیت نمبر ۴۱ اس کی طرف اشارہ کرتی ہے کہ انبیاء و رسل کے ساتھ استہزاء کرنے والوں پر مصیبت آجاتی ہے، یہ ذہن میں رہے کہ یہ آیات مکیہ ہیں۔

وَلَقَدِ اسْتُهْزِئَ بِرُسُلٍ مِّنْ قَبْلِكَ فَحَاقَ بِالَّذِيْنَ سَخِرُوْا مِنْهُمْ مَّا كَانُوْا بِهٖ يَسْتَهْزِءُوْنَ (انبیاء: ۴۱)

تم سے پہلے بھی رسولوں کا مذاق اڑانے والے اسی چیز کے پھیرے میں آگئے جس کا وہ مذاق اڑاتے تھے۔

اور اس طرح ان استہزا کرنے والوں کو دنیا میں بھی دردناک انجام سے دوچار ہونا پڑا۔

اپنی نشانیاں آفاق وانفس میں دکھادیں گے | سورۂ حم السجدہ میں جو مکی سورت ہے اس میں خدا نے اپنے نبیؐ کو حکم دیا کہ ان مشرکین سے کہہ دو:

قُلْ اَرَءَيْتُمْ اِنْ كَانَ مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ	کہو ان سے کیا تم نے کبھی غور کیا کہ اگر یہ
ثُمَّ كَفَرْتُمْ بِهٖ مَنْ اَضَلُّ مِمَّنْ هُوَ	(قرآن) خدا ہی کی طرف سے ہے اور تم
فِيْ شِقَاقٍۢ بَعِيْدٍ سَنُرِيْهِمْ اٰيٰتِنَا	اس کا انکار کرتے رہے تو اس شخص سے
فِي الْاٰفَاقِ وَفِيْٓ اَنْفُسِهِمْ حَتّٰى يَتَبَيَّنَ	بڑھ کر بھٹکا ہوا انسان اور کون ہوگا
لَهُمْ اَنَّهُ الْحَقُّ ۝	جو اس کی مخالفت میں دور تک نکل گیا ہو
(حٰمٓ سجدہ: ۵۲-۵۳)	عنقریب ان کو ہم اپنی نشانیاں دنیا میں
	دکھائیں گے اور ان کے اپنے نفس میں
	بھی یہاں تک کہ ان پر یہ بات کھل جائے گی
	کہ واقعی یہ حق ہے۔

ایک واضح معنی تو یہ ہیں کہ قرآن پاک اللہ کی طرف سے نازل ہوا ہے اور ہم تم کو آفاق وکائنات اور تمہارے نفوس میں ایسی نشانیاں دکھادیں گے کہ تم کو اس کی حقانیت کا یقین ہو جائے گا اور اس طرح ہر علمی، سائنسی اور طبی حقیقت ایک نشانی بن کر سامنے آتی رہتی ہے لیکن غور کرنے سے یہ پتہ چلتا ہے اور تفسیروں میں اس کو واضح بھی کیا گیا ہے کہ جب حقانیتِ قرآن اور اسلام کی دعوت آپؐ نے مکہ میں دی اور آپؐ شدت اور تنگی کے عالم میں تھے، دشمنوں کے نرغے میں تھے اس وقت غیب کی یہ بات انھیں بتائی کہ اسلام آفاق پر چھا جائے گا اور تمہارے دل بھی اس کے قائل ہو جائیں گے اور تم ایمان لے آؤ گے

اس سے بڑھ کر نصرتِ الٰہی پر یقین اور وعدۂ خداوندی پر اعتماد کیا ہو سکتا ہے اور چند گنے چنے کفار کو چھوڑ کر تمام اہل مکہ و اہل جزیرۂ عرب آپؐ کی حیاتِ مبارکہ ہی میں اسلام کے حلقۂ بگوش ہو گئے اور خلفائے اسلام کے زمانہ میں اسلام روئے زمین پر پھیل گیا اور قیامت تک آنے والی نسلیں آیاتِ قرآنی و آیات انفس و آفاق سے برابر اسلام میں داخل ہوتی چلی جائیں گی۔

استہزاء کرنے والوں کا انجام ارشاد خداوندی ہے:

فَاصْدَعْ بِمَا تُؤْمَرُ وَاَعْرِضْ عَنِ الْمُشْرِكِيْنَ ٥ اِنَّا كَفَيْنٰكَ الْمُسْتَهْزِءِيْنَ الَّذِيْنَ يَجْعَلُوْنَ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ فَسَوْفَ يَعْلَمُوْنَ

(الحجر: ۹۴-۹۵)

اے نبی جس بات کا تمہیں حکم دیا جا رہا ہے اسے کھل کر کہہ دو اور مشرکین سے بے پروا ہو جاؤ، تمہاری طرف سے مذاق اڑانے والوں کی خبر لینے کو ہم کافی ہیں جو اللہ کے سوا کسی اور کو بھی خدا بناتے ہیں عنقریب انہیں معلوم ہو جائے گا۔

جہری دعوت کی ابتدا کے ایام میں اہلِ مکہ کی طرف سے خاص طور پر ولید بن المغیرہ المخزومی، عاص بن وائل السہمی، الاسود بن عبد المطلب الاسدی، اسود بن عبد یغوث الزہری حارث بن طلیطلہ وغیرہ نے محفلوں، بازاروں اور ہر ہر جگہ آپؐ کا مذاق اڑایا، لوگوں کو آپؐ کی باتیں سننے سے منع کیا، اہل مکہ کا وہاں اقتدار تھا، ان کی حکومت تھی وہ طاقتور تھے اور حضور پاکؐ کی حالت نازک تھی، دشمنوں کے نرغے میں آپ گھرے ہوئے تھے کوئی یار و مددگار نہیں تھا، اس نازک وقت میں حکم ہوتا ہے کہ جس وحی اور اسلامی تعلیم اور توحید کا حکم دیا گیا ہے اسے واضح طور پر بلا جھجک ہانک پکار کر پہنچا دو اور مشرکوں کے اعراض و استہزاء

کی مطلق پرواہ نہ کرو، ہم تمہاری طرف سے استہزاء اور ٹھٹھا کرنے والوں کو ہلاک کرنے کے لیے کافی ہیں۔ تاریخ جانتی ہے کہ ولید پیر میں زخم لگنے سے ہلاک ہوا، اسود بن عبد المطلب اس بددعا کا شکار ہوا "اے اللہ اس کو اندھا کر دے اور اولاد کی موت کا غم دکھا"۔ وہ اندھا ہو گیا اس کے لڑکے زمعہ، عقیل اور حرث اس کے سامنے فوت ہوئے، عاص بن وائل کے پیر کی طرف آپؐ نے اشارہ فرمایا وہ گدھے پر بیٹھ کر طائف جا رہا تھا، گدھے پر سے گرا، پیر میں ایک کانٹا چبھا اور اس طرح مرا، حارث بن طلیطلہ کے پیٹ کی طرف آپؐ نے اشارہ فرمایا وہ نمکین مچھلی کھا کر سویا رات میں پیاس لگی پانی پیا اور اس کا پیٹ پھٹ گیا اور مر گیا۔ ثابت ہوا کہ آپؐ کے ساتھ استہزاء کرنے والے موجود تھے اور اللہ تعالیٰ نے ان کو ہلاک کیا، اس سے بڑھ کر پیشنگوئی اور کیا ہو سکتی ہے۔

ابو جہل قریش کا سردار تھا اور استہزاء و جہالت میں اپنا جواب نہیں رکھتا تھا اس کو دوسرے اور کفار کے ساتھ عذاب جہنم کی بشارت اس طرح دی گئی:

خُذُوْهُ فَاعْتِلُوْهُ اِلٰى سَوَآءِ الْجَحِيْمِ	پکڑو اسے اور لے جاؤ رگیدتے ہوئے
ثُمَّ صُبُّوْا فَوْقَ رَاْسِهٖ مِنْ عَذَابِ	جہنم کے بیچوں بیچ اور انڈیل دو اس کے
الْحَمِيْمِ۔ ذُقْ اِنَّكَ اَنْتَ الْعَزِيْزُ	سر پر کھولتے ہوئے پانی کا عذاب، چکھ
الْكَرِيْمُ۔	اس کا مزا، تو بزعم خود بڑا زبردست اور عزت والا آدمی تھا۔

اخنس بن شریق الثقفی اور بعض نے کہا کہ جمیل بن عامر الجمحی کے متعلق یہ کہا گیا کہ:

وَيْلٌ لِّكُلِّ هُمَزَةٍ لُّمَزَةِ ۙ الَّذِىْ	تباہی ہے ہر اس شخص کے لیے جو منھ
جَمَعَ مَالًا وَّعَدَّدَهٗ	در منھ لوگوں پر طعن اور پیٹھ پیچھے

يَحْسَبُ اَنَّ مَالَهٗۤ اَخْلَدَهٗ ۚ كَلَّا لَيُنْۢبَذَنَّ فِي الْحُطَمَةِ ۖ وَمَاۤ اَدْرٰىكَ مَا الْحُطَمَةُ ؕ (الھمزہ: ۱تا۵)

برائیاں کرنے کا خوگر ہے، جس نے مال جمع کیا اور اسے گن گن کر رکھا وہ سمجھتا ہے کہ اس کا مال ہمیشہ رہے گا ہرگز نہیں اسے چکنا چور کر دینے والی آگ میں پھینک دیا جائے گا۔"

گو یہ وعید ہر کافر کے لیے ہے لیکن مخصوص امراء پر اس کا انطباق ہوا مکہ میں یہ پیشینگوئیاں کی گئیں اور ان کا انجام یہ ہوا کہ بہت دن بعد کفر پر موت ہوئی۔

نضر بن الحارث رستم و اسفندیار کے قصے سُنا کر لوگوں کو قرآن اور حضور پاکؐ کی مجلس سے دور کرتا تھا، حضور پاکؐ نے قرآنی زبان میں اسے عذاب مہین کی بشارت دی:

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّشْتَرِيْ لَهْوَ الْحَدِيْثِ لِيُضِلَّ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ بِغَيْرِ عِلْمٍ ۖ وَّيَتَّخِذَهَا هُزُوًا ۚ اُولٰٓئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ مُّهِيْنٌ (لقمان: ۶)

اور انسانوں میں سے کوئی ایسا بھی ہے جو کلام دلفریب خرید کر لاتا ہے تاکہ لوگوں کو اللہ کے راستے سے علم کے بغیر بھٹکا دے اور اسے مذاق میں اڑا دے ان کے لیے سخت ذلیل کرنے والا عذاب ہے۔

غزوۂ بدر میں وہ زخمی ہوا، اسیر ہو کر آیا، کفر پر مرا اور ہزیمت و شکست اور جراحت کے عذاب سے دوچار ہونے کے بعد دردناک عذاب کا حقدار بنا۔

ولید بن المغیرہ اسلام کا دشمن تھا قرآن کی حقانیت اس پر آشکارا ہو چکی تھی، لیکن اپنی سرداری قائم رکھنے کی غرض سے اس نے قریش کو یہ مشورہ دیا کہ جزیرۂ عرب سے

آنے والے لوگ موسم حج میں جب آئیں گے تو دعوت اسلام سے متاثر ہوں گے اس لیے کسی ایسی بات پر اتفاق کر لیا جائے جو صاحب رسالت کے متعلق ان سے کہی جائے، لوگوں نے کہا ہم کہیں گے محمدؐ (خاکم بدہن گستاخ) پاگل ہیں، شاعر ہیں، کاہن ہیں وغیرہ ولید نے کہا یہ غلط ہے اور لوگ یہ بات نہیں مانیں گے، پھر سوچ سمجھ کر اور غور وفکر کرکے کہا کہ یہ جادو ہے، سورۂ مدثر میں اللہ تعالیٰ نے اس کے متعلق فرمایا:

"چھوڑ دے مجھ کو اور اس کو جس کو میں نے اکیلا پیدا کیا، بہت سا مال اس کو دیا، حاضر رہنے والے بیٹے دیے، اس کے لیے ریاست کی راہ ہموار کی۔" (۱۱ تا ۱۴)

پھر آگے چل کر فرمایا، پھر سوچ سمجھ کر آخر کار بولا کہ:

"کچھ نہیں ہے مگر ایک جادو پہلے سے چلا آرہا ہے، یہ تو ایک انسانی کلام ہے میں اسے عنقریب دوزخ میں پھینک دوں گا۔" (مدثر: ۲۴ - ۲۷)

آخر کار وہ کفر کی حالت میں مرا۔

غلبۂ روم کی پیشین گوئی عربوں کی حدود پر فارس اور رومی حکومتیں تھیں جو اس وقت دنیا کی دو بڑی طاقتیں تھیں اور اقتدار وتسلط کے لیے آپس میں نبرد آزما رہتی تھیں، فارسی قوم آتش پرست مجوسی تھی، بت پرستی بھی عام تھی اور روم والے مسیحی تھے گو انہوں نے بھی دین میں تحریفات روا رکھی تھیں، ایک جنگ میں فارس کو روم پر جزیرہ میں فتح حاصل ہوئی، مشرکین قریش اس پر بہت مسرور ہوئے، کیونکہ فارس اسلام کے سخت دشمن تھے اور مشرک بھی تھے، مسلمانوں کو فارس کی یہ کامیابی اچھی نہیں لگی، اللہ تعالیٰ نے قرآن میں یہ پیشین گوئی کی۔

الٓمّٓ، غُلِبَتِ الرُّوْمُ فِیْٓ اَدْنَی الْاَرْضِ وَھُمْ مِّنْ بَعْدِ غَلَبِھِمْ	الٓمّٓ، رومی قریب کی سرزمین میں مغلوب ہو گئے ہیں اور اپنی اس مغلوبیت کے

سَيَغْلِبُوْنَ فِيْ بِضْعِ سِنِيْنَ ٥	بعد چند سال کے اندر وہ غالب ہوجائیں گے
لِلّٰهِ الْاَمْرُ مِنْ قَبْلُ وَمِنْ بَعْدُ	اللہ ہی کا اختیار پہلے بھی تھا اور بعد کو بھی
وَيَوْمَئِذٍ يَّفْرَحُ الْمُؤْمِنُوْنَ	ہے اور وہ دن وہ ہوگا کہ اللہ کی بخشی
بِنَصْرِ اللّٰهِ يَنْصُرُ مَنْ يَّشَاۤءُ	ہوئی فتح پر مسلمان خوشیاں منائیں گے
وَهُوَ الْعَزِيْزُ الرَّحِيْمُ وَعْدَ اللّٰهِ	اللہ نصرت عطا کرتا ہے جسے چاہتا ہے
لَا يُخْلِفُ اللّٰهُ وَعْدَهٗ وَلٰكِنَّ	اور وہ زبردست اور رحیم ہے یہ اللہ
اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ يَعْلَمُوْنَ	کا وعدہ ہے، اللہ کبھی وعدہ کی خلاف
ظَاهِرًا مِّنَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَهُمْ	ورزی نہیں کرتا مگر اکثر لوگ جانتے
عَنِ الْاٰخِرَةِ هُمْ غٰفِلُوْنَ ٥	نہیں ہیں، لوگ دنیاوی زندگی کا بس
(روم : ۱-۷)	ظاہری پہلو جانتے ہیں اور آخرت سے
	غافل ہیں۔

یہ پیشین گوئی حرف بہ حرف ثابت ہوئی، سب کو یہ قصہ معلوم ہے کہ صدیقوں کے سردار ابوبکر الصدیقؓ نے قولِ الٰہی و رسول پاکؐ کی تصدیق کے لیے ابی بن خلف سے اس بات پر شرط باندھی کیونکہ ابی بن خلف نے خدا کی قسم کھا کر کہا تھا کبھی یہ نہیں ہوسکتا کہ روم فارس پر غالب آجائیں، یہ شرط نو اونٹوں کی تھی اور تین سال کی تھی، جب حضور رسالتمآبؐ کو اطلاع ہوئی تو آپؐ نے فرمایا بضع کے معنی تین سال سے زیادہ کے ہیں، الغرض حضرت ابوبکرؓ نے مدت بڑھوائی اور شرط میں مزید اونٹ بھی بڑھوائے، ایک روایت میں ہے کہ حضور پاکؐ نے حضرت ابوبکرؓ سے سات سال کی مدت بتائی اور یہ پیشینگوئی پوری ہوئی، تاریخ اس پر دلالت کرتی ہے۔

غزوۂ بدر میں فتح | مسلمانوں کو رومیوں کی فتح سے خوشی کا ہونا کوئی اہم بات نہیں تھی اس لے ان آیات میں جو دوسری پیشنگوئی تھی جب وہ پوری ہوئی تو مسلمان فرحاں و شاداں تھے، جس دن غلبۂ روم ہوا اسی دن مسلمانوں کو غزوۂ بدر میں مشرکین پر فتح حاصل ہوئی، غزوۂ بدر تمام آئندہ فتوحات کا پیش خیمہ اور دعوت اسلام کے ظاہر و غالب ہونے کا عظیم وسیلہ بنا، اس لیے خوشی و مسرت کا جشن اس دن کیسے نہ ہوتا؟

سورۂ روم مکی ہے اس میں کیے ہوئے وعدہ ہائے نصرت و فتح تمام اور سورتوں میں کیے ہوئے وعدوں کی طرح پورے ہوکر رہیں گے، سورہ کے آخر میں حضور پاکؐ سے خطاب ہے کہ کفار کی ایذا رسانیوں اور استہزار پر صبر کرو۔

فَاصْبِرْ اِنَّ وَعْدَ اللّٰهِ حَقٌّ وَّلَا	صبر کرو، اللہ کا وعدہ یقیناً سچ ہے اور
يَسْتَخِفَّنَّكَ الَّذِيْنَ لَا يُوْقِنُوْنَ	ہرگز ہلکا نہ پاویں، تم کو وہ لوگ جو
(روم: ۶۰)	یقین نہیں کرتے۔

مرتدین کے خاتمہ کے لیے محبوب خدا گروہ کی آمد | فتح مکہ اور فتح طائف کے بعد اسلام جزیرۂ عرب میں سیل رواں کی طرح پھیل گیا، قبائل کے وفود آرہے تھے اور کوئی اسلام اور رسول اسلامؐ سے مخالفت کی ہمت نہیں کر سکتا تھا، اس وقت خدا نے اپنے رسول کے ذریعہ اطلاع دی کہ مرتدین کا ظہور ہوگا اور اس کی ابتدا حضورؐ کے زمانے ہی میں ہوئی اور مسیلمہ نے آپؐ کو اپنی نبوت کا خط لکھا جس میں آپؐ کے نبی ہونے کا اقرار بھی کیا، خط کے جواب میں آپؐ نے اس کو "کذاب" لکھا کیونکہ حضورؐ کے بعد کسی نبوت کے آنے کا امکان بھی کذب و افترا ہوا اور تدا د کا موجب ہے، ارتداد کی شدت اس وقت ہوئی، جب حضرت ابوبکرؓ کی خلافت کے بعد مسیلمہ کذاب، سجاح، الاسود العنسی، نیز معطلین شریعت کے

گروہوں نے علم بغاوت بلند کیا اور اسلام کی تعلیمات سے روگردانی کا برملا اظہار ہوا، حضرت ابوبکرؓ جیسے بظاہر نرم مزاج اور صلح جو انسان نے اس موقع پر بلاجھجک ان سب سے جہاد کیا اور فتنۂ ارتداد کا قلع قمع کیا، اس تمہید کے بعد قرآنی بشارت ملاحظہ ہو:

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَنْ يَّرْتَدَّ	اے ایمان والو! جو کوئی تم میں سے
مِنْكُمْ عَنْ دِيْنِهٖ فَسَوْفَ يَاْتِى	مرتد ہوگیا (اپنے دین سے پھر گیا) تو
اللّٰهُ بِقَوْمٍ يُّحِبُّهُمْ وَيُحِبُّوْنَهٗۤ	اللہ تعالیٰ ایسی قوم کو لائے گا جو اس کے
اَذِلَّةٍ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ اَعِزَّةٍ	محبوب ہوں گے اور وہ نہیں اللہ محبوب
عَلَى الْكٰفِرِيْنَ يُجَاهِدُوْنَ فِىْ	ہوگا، مومنوں پر نرم اور کفار پر سخت
سَبِيْلِ اللّٰهِ وَلَا يَخَافُوْنَ لَوْمَةَ	ہوں گے (یعنی دین کے معاملہ میں کوئی
لَاۤئِمٍ ذٰلِكَ فَضْلُ اللّٰهِ يُؤْتِيْهِ	سودا نہ کریں گے نہ خوف کھائیں گے)
مَنْ يَّشَآءُ وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ	راہ خدا میں جہاد کریں گے، ملامت
اِنَّمَا وَلِيُّكُمُ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ	کرنے والوں کی ملامت سے نہ ڈریں گے
وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوا الَّذِيْنَ يُقِيْمُوْنَ	یہ اللہ کا فضل ہے جسے چاہتا ہے دیتا
الصَّلٰوةَ وَيُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ وَهُمْ	ہے اور اللہ وسیع (ذرائع) کا مالک اور
رٰكِعُوْنَ وَمَنْ يَّتَوَلَّ اللّٰهَ وَ	(محیط) علم والا ہے تمہارا رفیق و ولی تو
رَسُوْلَهٗ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا فَاِنَّ	صرف اللہ اور اس کا رسول اور وہ
حِزْبَ اللّٰهِ هُمُ الْغٰلِبُوْنَ ٥	اہل ایمان ہیں جو نماز قائم کرتے ہیں
(المائدہ: ۵۴ - ۵۶)	زکوٰۃ ادا کرتے ہیں اور اللہ کے روبرو
	جھکنے والے ہیں اور جو اللہ اور اس کے

رسول اور اہل ایمان کو اپنا رفیق بنالے

اسے معلوم ہو کہ اللہ کی جماعت ہی غالب

ہونے والی ہے۔

ان آیتوں میں مسلمانوں کے لیے متعدد امور پر غور کرنے کا موقع ہے، خاص طور پر ان آیتوں میں حضرت ابوبکرؓ اور اسلامی امت کی مدح و توقیر ہے جنھوں نے حضرت ابوبکرؓ کا ساتھ دیا اور مرتدین پر غلبہ حاصل کیا اور اس کے مقابل جو گروہ حضرت ابوبکرؓ کو اپنی ملامت اور دیرینہ بغض کا ہدف بناتا ہے اس کو اگر رجوع الی الحق کی طلب ہو تو اس کے لیے بھی یہ آیات واضح اور روشن دلائل و حجت فراہم کرتی ہیں لیکن اس موضوع کی تفصیل سے ہم یہاں گریز کرتے ہوئے چند نکات کی طرف صرف اشارہ کرتے ہیں۔ آیات میں ،

۱۔ دین سے مرتد ہونے والوں کی اطلاع ہے اور یہ واقعہ ظاہر ہوا۔

۲۔ اس مرتد گروہ کو مغلوب کرنے اور کیفر کردار تک پہنچانے کے لیے ایک قوم اور گروہ اٹھایا جائے گا، اس کی صفات یہ ہوں گی، سب سے اہم صفت یہ ہے کہ:

"اللہ ان سے محبت کرتا ہوگا وہ اللہ سے محبت کرتے ہوں گے"

۳۔ مومنوں کے لیے نرم ہوں گے، کفار کے لیے سخت ہوں گے۔

۴۔ اللہ کی راہ میں جہاد کریں گے۔

۵۔ کسی ملامت کرنے والے کی ملامت سے نہ ڈریں گے اور نہ اسکی پرواہ کریں گے

۶۔ یہ محض اللہ کے فضل سے ہوگا۔

۷۔ ان کی ولایت اللہ، اس کے رسول اور مومنین سے ہوگی یعنی کفار و منافقین و مرتدین سے نہ ہوگی۔

۸۔ وہ نماز کو قائم کریں گے، زکوٰۃ کو ادا کریں گے۔

۹۔ اور وہی گروہ غالب و فتح مند ہوگا۔

حضور پاکؐ کے وصال کے بعد مومن گروہ حضرت ابوبکر صدیقؓ کی پیروی میں ابھرا اور مرتد گروہ سے اس نے جہاد و قتال کیا، نص قرآنی کی رو سے یہ جہاد فی سبیل اللہ تھا ملک گیری کی لڑائی نہیں تھی، خاص طور سے حضرت ابوبکرؓ کی نرمی مومنین پر ایک مسلم الثبوت بات تھی لیکن مرتدین سے جہاد کے سلسلے میں آپ سخت تھے اور کسی ایسے مشورہ کو آپ نے قبول نہیں کیا جس سے ان کے خلاف جہاد نہ کرنے کا جواز ملتا ہو، اس طرح آپ نے کسی ملامت کرنے والے کی ملامت کو قبول نہیں کیا، نماز قائم کی اور مانعین زکوٰۃ کو زکوٰۃ ادا کرنے پر مجبور کیا اور حقیقت حال و تاریخ کی شہادت سے یہی گروہ غالب اور فتح مند ہوا، مرتدین کی سرکوبی ہوئی، عام لوگوں نے توبہ کی اور مکمل اسلام میں داخل ہوئے، ان کوششوں کے ذریعے انہوں نے اللہ سے محبت کے وعدہ کو پورا کر دکھایا اور سب سے بڑی سرفرازی اور کامیابی تو یہ کہ وہ اللہ کی محبت و رضا کے مستحق ٹھہرے۔

خدانخواستہ حضرت ابوبکرؓ اور آپ کے معاون خلفائے ثلاثہ و مہاجرین و انصار اگر آیت کا مصداق نہیں ہیں تو پھر آخر اس کا مصداق کون ہے؟ نص قرآنی کی رو سے ایسے گروہ کا ظاہر ہونا ضروری تھا جو مرتدین کے خلاف جنگ کرتا۔

اور اگر خدانخواستہ حضرت ابوبکرؓ و عمرؓ اور مہاجرین و انصار ہی مرتد ہو گئے تھے تو نص قرآنی کی رو سے کونسا وہ گروہ پردۂ ہستی پر نمودار ہوا جس نے ان کے خلاف جہاد کیا، ان کو شکست دی اور خود غالب و فتح مند ہوا؟

بس جب ایسا کوئی گروہ نہ دنیا کے پردے پر اور نہ تاریخ میں نمودار ہوا تو

اب اس کے سوا عقلی و علمی و شرعی و تاریخی طور سے کوئی چارہ نہیں رہ جاتا کہ اس عظیم پیشینگوئی کا مصداق صدیقوں کے سردار اور صدیقوں کا وہ پاک باطن گروہ ہی تھا وہ صدیق اکبرؓ کے ساتھ تھا۔

یہ آیت حقانیتِ قرآن و رسالت کی بہت بڑی دلیل اور صدیقیتِ صدیقؓ کی واضح حجت ہے اور ان کی اللہ سے محبت اور اللہ کی ان سے محبت و رضا کی واضح نشانی ہے۔

پیشینگوئیوں کے مختصر اشارے | اب ہم بعض ان واقعات کی طرف صرف اشارہ کرتے ہیں جو آپ نے آئندہ کے متعلق فرمائے اور وہ واقع ہوئے۔

آپ نے تمام لوگوں کو خدا کی طرف سے یہ چیلنج دیا کہ "تمہارا جو جی چاہے کرو تم میرا کچھ نہیں بگاڑ سکتے"۔ (ہود: ۵۵)

آپ نے فرمایا کہ یہ دین چار دانگ عالم میں غالب ہوکر رہے گا" وہ اللہ ہی ہے جس نے اپنے رسول کو ہدایت اور دین حق لے کر ارسال فرمایا تاکہ اس دین کو پوری جنس دین پر غالب کر دے"۔ (فتح: ۲۸)

ڈنکے کی چوٹ پہ آپ نے تمام باطل ادیان و نظریات اور قریش کے من گھڑت معتقدات کو باطل اور فریب سے تعبیر کیا اور اسلام کے متعلق فرمایا "حق آگیا اور باطل کی روح نکل گئی، باطل کی روح نکلنی ہی چاہیے"۔ (الاسراء: ۸۱)

اور ایسا ہی ہوا، اسلام غلبہ اور حجت و دلیل سے آپ کی زندگی میں جزیرۂ عرب میں اور خلفائے راشدین و خلفائے اسلام کے عہد میں اس وقت کی تمام دنیا پہ غالب ہوا۔

واضح اعلان کیا گیا کہ "دشمنوں کے دلوں میں رعب اور خوف ڈال دیا جائے گا"۔ (انفال: ۱۲) اور بار بار اس کا ظہور ہوا "کفر و شرک کے لشکر شکست کھائیں گے اور پیٹھ

پھیر کر بھاگ جائیں گے"۔ (القمر: ۴۵)

اور کفار کی مرضی کے خلاف" اللہ تعالیٰ اپنا نور (اسلام کی روشنی) پوری طرح ظاہر کردے گا۔ (توبہ: ۳۲)

زبور داؤد کی پیشینگوئی پوری ہوگی" میرے صالح بندے زمین کے وارث ہوں گے" (الانبیاء: ۱۰۵) اور جب تک مسلمان زمین کے لیے، انسانیت کے لیے اور خدا کے احکامات پر کامل زندگی گذارنے اور بندگی کی شرطوں کو پورا کرنے کے لائق رہے اور صلاح وخیر کے وارث رہے زمین ان کے ورثہ میں رہی۔

کفار ومشرکین کے مکر وفریب سے گھبرانے کی ضرورت نہیں" تمہارا نگہبان اللہ ہے، اس نے تمہاری حقیقی تائید اپنی مدد سے کی ہے اور مومنوں کو تمہارا مددگار بنایا گیا ہے۔

(الانفال: ۶۲)

اور یہ حقیقت واقع ہو کر رہی سخت جاں دشمنوں کے نرغے میں آپ رہے اور ان کی کوئی سازش اور مکر وفریب آپ کو نقصان نہ پہنچا سکا اور خدا نے آپ کی مکمل نگرانی اور مدد کی اور سبب کے طور پر بعض اوقات فرشتوں کو ارسال کیا، کبھی ہوا اور قدرتی وسائل سے مدد کی اور عام طور پر مہاجرین وانصار کے برگزیدہ گروہ کو آپ کی معاونت کے لیے مقرر کیا، جنھوں نے اپنی جان اور اپنی دولت دینِ الٰہی کی نصرت واشاعت اور رسولِ اسلامؐ کی مدافعت میں خرچ کی۔

آپ نے قبیلہ مضر پر قحط نازل ہونے کی بددعا کی اور انہیں اس کی خبر دی، اس کا اثر یہ ہوا کہ لوگ بھوک سے نڈھال ہوگئے، آنکھوں میں اندھیرا چھا گیا، مفسرین نے صحیح قول یہی لکھا ہے کہ آیت قرآنی میں وارد دخان یعنی دھوئیں سے مراد یہی ہے۔ مشرکوں کی

دعا اور فرمان الٰہی "کہتے ہیں پروردگار ہم پر سے یہ عذاب ٹال دے ہم ایمان لے
ہیں، ان کی غفلت کہاں دور ہوتی ہے ان کا حال تو یہ ہے کہ ان کے پاس رسول
آگیا، پھر بھی اسکی طرف ملتفت نہیں ہوئے اور کہا کہ یہ سکھایا پڑھایا باولا ہے"۔ (دخ
۱۲-۱۳) سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ واقعہ ہوچکا ہے، بعض مفسرین کہتے ہیں کہ قیام
کے قریب یہ ہوگا، بہر دو صورت یہ ہوچکا ہے یا ہوگا، یا یہ بھی ممکن ہے کہ ہوچکا ہوا
دوبارہ بھی ہو۔

"یَوْمَ نَبْطِشُ الْبَطْشَةَ الْکُبْرٰی" (دخان ۱۶) جس دن ہم بڑی ضر
لگائیں گے (پکڑ کریں گے) وہ دن ہوگا جب ہم تم سے انتقام لیں گے، اس سے قیام
کا دن بھی مراد ہے اور مفسرین کے خیال میں یہ بدر کے دن کے عذاب کی پیشینگوئی
جس دن قریش کے ستر اکابر قتل ہوئے، کفر کا چراغ مدہم ہوا اور اسلام کے نش
اشاعت اور اظہار دین کا دروازہ کھلا۔

آیتِ قرآنی "اِنَّ الَّذِیْ فَرَضَ عَلَیْکَ الْقُرْاٰنَ لَرَآدُّکَ اِلٰی مَعَادٍ" (ا
۸۵) کی تفسیر یہ ہے کہ وہ خدا جس نے تم پر قرآن نازل کیا ہے تمہیں معاد یعنی بہتر
انجام تک پہنچائے گا، یعنی تم پر اس قرآن کو پھیلانے کی ذمہ داری ہے، ایک تفسیر
بھی ہے کہ تمہیں دوبارہ اپنے معاد یعنی جس جگہ سے آئے ہو یعنی مکہ واپس لے جائے"
فتح مکہ اس بشارت کی تعبیر ہے۔

عثمان بن ابی طلحہ سے آپؐ نے مکہ میں کہا تھا "وہ دن یاد کرو جب کعبہ کی کنج
میرے ہاتھ میں ہوگی" اور ایسا ہی ہوا۔ آپؐ نے کمال شفقت و رحمت و عدل کے پیش
پھر مفتاح کعبہ عثمان ابن ابی طلحہ ہی کو واپس کردی۔ مظلوموں کو جب قتال کی اجازت

دی گئی تو فتح و ظفر کی بشارت بھی ساتھ دی گئی (حج: ۳۹-۴۰) اور یہ فتح نصیب ہوئی۔

غزوۂ احزاب کی پریشانیاں ایسی تھیں کہ قرآن نے اس کی بلیغانہ تصویر کشی کی ہے دل حلق تک آگئے تھے، خوف و ہراس کا عجیب عالم تھا، دشمنوں نے ہر طرف سے گھیر رکھا تھا، مدینہ شریف میں رہنا دوبھر ہو رہا تھا، اس یاس آمیز ماحول میں آپؐ نے دنیا کے بہت سے علاقوں کے فتح ہونے کی بشارت دی جو پوری ہوئی۔

اس کے علاوہ متعدد مواقع پر آپؐ نے فارس و شام، مصر و ہندوستان اور قسطنطنیہ کے فتح ہونے کی پیشین گوئیاں فرمائیں جو حرف بہ حرف پوری ہوئیں۔

اس تمام تفصیل کے بعد کوئی منصف کیا اس بات میں ادنیٰ شک کر سکتا ہے کہ بشارت انجیل میں جس نبی برحق کا یہ تذکرہ کیا گیا ہے کہ "وہ تم کو آئندہ کے متعلق خبریں دے گا" وہ حضور پر نور، رحمۃ للعالمین، خاتم النبیین والمرسلین محمد مصطفٰے، احمد مجتبیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے سوا کوئی دوسرا ہو سکتا ہے۔

سلسلۂ سیرۃ النبیؐ

۱۔ سیرۃ النبی	اول	علامہ شبلی	(مجلد اضافہ شدہ کمپیوٹر کتابت)	~~۱۳۵~~ ۱۹۰
۲۔ "	دوم	"	"	۱۹۰
۳۔	سوم	سید سلیمان ندوی	(اس جلد میں معجزات اور پیشینگوئیوں پر مفصل بحث ہے)	۱۲۵
۴۔	چہارم	"		۱۲۵
۵۔	پنجم	"		۶۰
۶۔	ششم	"		۱۲۵
۷۔	ہفتم	"		۴۵

علمائے اصول کے نزدیک صحابہ اور انکی روایات کا مقام

از ڈاکٹر محمد باقر۔ ملتان

(۲)

احناف کے نزدیک رواۃ صحابہ کے اقسام | احناف عدالت صحابہ کے قائل ہونے کے باوجود دینی امور کی اہمیت اور صحابۂ کرام کے طرز عمل کو مدنظر رکھتے ہوئے صحابی راویوں کے ان اقسام کے قائل تھے۔

۱۔ معروف راوی ۲۔ مجہول راوی۔

معروف راوی کی مندرجۂ ذیل قسمیں ہیں :۔

(الف) صحابۂ کرام میں معروف راوی وہ ہیں جن کی شہرت ہر طرف پھیلی اور مدت دراز تک وہ آپؐ کے ساتھ رہے اور ان سے بے شمار احادیث مروی ہیں اور اگر احادیث مروی نہیں تو کتب حدیث ومغازی اور فتاویٰ میں ان کا کثیر ذکر ہے، ایسے صحابہ کی پھر دو قسمیں ہیں :۔

۱۔ جو فقہ واجتہاد میں معروف تھے ۲۔ جو فقہ اور اجتہاد میں معروف نہ تھے۔

۱۔ ایسے راوی جو عدالت، حسن ضبط وقوت ضبط کے ساتھ فقہ واجتہاد میں بھی مشہور تھے، اگر ان کی روایت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تک صحیح اسناد سے ثابت ہو تو ان کی روایت پر عمل کرنا مقدم ہے اور اگر وہ حدیث مخالف قیاس ہو تو

اس روایت کے مقابلے میں قیاس کو ترک کر دیا جائے گا اور اگر حدیث قیاس کے مطابق ہے تو حدیث پر عمل ہوگا اور قیاس کو اس کا موید سمجھا جائے گا[۱]

یہ معروف راوی خلفائے اربعہ عبداللہؓ بن زبیر، عبداللہؓ بن مسعود، عبداللہؓ بن عمر، عبداللہؓ بن عمرو بن العاص، عبداللہؓ بن عباس، زیدؓ بن ثابت، معاذؓ بن جبل، ابو موسیٰ اشعریؓ، ابو درداء، ابیؓ بن کعب، ام المومنین حضرت عائشہؓ صدیقہ اور اسی طرح اور کئی اصحاب کرام ہیں۔ صحابہ میں فقیہ اور مجتہد لوگوں کی تعداد بیس سے متجاوز تھی۔

احناف ان حضرات کی احادیث کو خواہ مخالف قیاس ہی کیوں نہ ہوں قبول کرتے ہیں اور ان پر عمل کرتے ہیں[۲]۔ اس لیے محمد بن الحسن شیبانی نے مندرجۂ ذیل حدیث کو قبول کیا ہے جس میں یہ حکم ہے کہ دورانِ نماز قہقہہ لگانے سے وضو اور نماز دونوں فاسد ہو جاتے ہیں۔ اس حدیث کا پس منظر یہ ہے کہ ایک مرتبہ رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نماز پڑھا رہے تھے کہ ایک نابینا صحابی آئے اور کنوئیں میں گر گئے اس کو دیکھکر بعض صحابی نماز میں اس طرح ہنسے کہ آواز دوسروں نے سُنی، آپؐ نے نماز سے فارغ ہوکر فرمایا:

• تم میں سے جو نماز میں قہقہہ لگا کر ہنسے وہ وضو اور نماز دونوں لوٹائے[۳]

یہ حدیث اس لحاظ سے قیاس کے مخالف ہے کہ بدن میں کسی نجاست کے نکلنے سے وضو ٹوٹتا ہے اور قہقہہ کسی نجاست کے نکلنے کا باعث نہیں، اس لیے یہ نواقض وضو میں سے نہیں ہو سکتا لیکن چونکہ یہ حدیث متعدد فقیہ صحابہ سے مروی ہے اس لیے احناف نے قیاس کو ترک کر کے اس حدیث کے حکم کو قبول کیا ہے[۴]

اسی طرح محاذات کے مسئلہ میں بھی احناف نے قیاس کو ترک کر کے اس حدیث پر

عمل کیا ہے۔

اخروهن من حيث اخرهن الله تعالىٰ [۵]	انہیں (عورتوں کو) اس طرح پیچھے رکھو جس طرح اللہ تعالیٰ نے انہیں پیچھے رکھا ہے۔

مسئلہ محاذات یہ ہے کہ نماز باجماعت کے دوران عورتوں کی صف مردوں کی صف کے پیچھے ہونی چاہیے، لیکن اگر کوئی بالغ مرد نماز کی نیت سے کسی بالغہ عورت کے ساتھ ایک ہی صف میں کھڑا ہو جائے تو مرد کی نماز فاسد ہو جائے گی۔

یہ حدیث اس لحاظ سے مخالف قیاس ہے کہ اگر مرد کے عورت کے ساتھ کھڑے ہونے سے اس کی نماز فاسد ہو جاتی ہے تو عورت کی بھی فاسد ہو جانی چاہیے یا دونوں کی فاسد نہ ہو۔ لیکن احناف نے اس مسئلے میں قیاس کو چھوڑ کر حدیث پر عمل کیا ہے جو عبداللہ بن مسعودؓ سے مروی ہے اور ان کی رائے میں اس صورت حال میں صرف مرد کی نماز فاسد ہوگی۔ عورت کی نہیں ہوگی [۶]

اسی طرح یہ حدیث جس میں کہا گیا ہے کہ قے کرنے سے وضو ٹوٹ جاتا ہے۔ احناف کے نزدیک قیاس کے مخالف ہے؛

من قاء او رعف فى صلاة فلينصرف و يتوضا وليبن على صلاته مالم يتكلم۔ [۷]	جس نے نماز کے دوران قے کی ہو یا اس کی نکسیر پھوٹی ہو تو اس کو چاہیے کہ وضو کر کے بقیہ نماز پوری کرے اگر اس نے اس دوران بات نہ کی ہو۔

احناف کے نزدیک قے سے وضو ٹوٹنا خلاف قیاس ہے، کیونکہ قے معدہ کے

اوپر والے حصہ سے نکلتی ہے اور بدن میں وہ جگہ نجاست کا مقام نہیں، بلکہ نجاست کے مقامات کچھ اور ہیں۔ اس لیے جب بدن سے نجاست ہی نہیں نکلی تو وضو بھی نہیں ٹوٹے گا لیکن چونکہ حدیث حضرت عائشہؓ صدیقہ سے مروی ہے جو فقیہہ صحابیہ تھیں، اس لیے اس حدیث پر عمل ہوگا اور قیاس کو ترک کر دیا جائے گا۔[۹]

۲۔ دوسری معروف قسم میں وہ صحابی راوی ہیں جو حافظہ اور عدالت میں معروف ہوں مگر اجتہاد و فتویٰ دینے کے اہل نہ ہوں، ایسے راویوں میں حضرت ابوہریرہؓ، انس بنؓ مالک، سلمان فارسیؓ، بلال حبشیؓ وغیرہم ہیں۔

ان کی روایات کو دیکھا جائے گا اگر وہ قیاس کے موافق ہوئیں تو قبول کی جائیں گی اور اگر مخالف قیاس ہوئیں تو ترک کر کے قیاس کو ترجیح دی جائے گی۔ یہ رائے جمہور احناف اور امام مالک کی ہے۔ ان کے نزدیک اگر اس قسم کے راوی کی حدیث پر عمل کو مقدم رکھا جائے اور قیاس کو بغیر ضرورت کے ترک کر دیا جائے تو اس کے نتیجہ میں رائے کا دروازہ ہر طرح سے بند ہو جائے گا اور اس طرح اللہ تعالیٰ کے اس قول کی مخالفت ہوگی۔

فَاعْتَبِرُوْا یَا اُوْلِی الْاَبْصَارِ　　عبرت حاصل کرو اے دیدۂ بینا رکھنے والو!

اس کے علاوہ جب کوئی غیر فقیہہ راوی رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے کوئی حدیث سن کر اس کو اپنے الفاظ اور اپنی سمجھ کے مطابق ادا کرے گا تو اس بات کا غالب امکان ہے کہ اس نے آپؐ کے بیان کردہ مطلب سے ہٹ کر کوئی اور مطلب سمجھا ہو یا آپؐ کی مراد ہی نہ سمجھا ہو۔[۱۰] اس لیے اس قسم کے راویوں کی احادیث کو اگر قیاس کے موافق ہوں تو قبول کیا جائے گا ورنہ رد کر کے قیاس کو ان پر ترجیح دی جائے گی۔[۱۱]

جمہور احناف یہ بھی واضح کرتے ہیں کہ صحابہ کو دو اقسام فقیہ و غیر فقیہ میں تقسیم کرنے سے ان کی مراد کسی صحابی کی توہین نہیں مثلاً ابی ہریرہؓ کی عدالت اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ طویل صحبت پر کون شک کر سکتا ہے حتیٰ کہ آپؐ نے ان سے کہا:

زر غباً تزدد حباً [۲۱] ابوہریرہ کچھ مدت کے بعد ملو تاکہ محبت زیادہ ہو۔

ان کے حافظہ کے لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خود دعا فرمائی تھی اور حضرت انس بنؓ مالک کی روایتوں سے امام ابو حنیفہؒ نے کئی مرتبہ استنباط کیا ہے لیکن یہ دین کا معاملہ ہے اس لیے اگر ہم ان کی خلاف قیاس حدیثوں کو مان لیں تو اس سے رائے اور قیاس کا دروازہ بند ہو جائے گا اور ان صحابہ کی روایات قرآن و سنت اور اجماع کی ناسخ ہو جائیں گی [۲۳]

احناف نے اس کی مثال میں حضرت ابوہریرہؓ کی یہ حدیثیں پیش کی ہیں:

توضئو مسھا مستہ النار [۲۴] آگ پر پکی ہوئی چیز کے کھانے سے وضو کرو۔

اس سے مراد یہ ہے کہ آگ سے پکی ہوئی اشیا اگر منھ کو لگیں تو وضو دوبارہ کرو۔ جب یہ حدیث حضرت عبد اللہ بنؓ عباس نے سنی تو انھوں نے یہ دلائل دیتے ہوئے کہ اگر آگ سے پانی گرم کرکے اس سے وضو کیا جائے یا تیل نیم گرم کرکے ہونٹوں پر لگایا جائے تو کیا اس سے وضو ٹوٹ جائے گا۔ یہ حدیث رد کر دی [۲۵] اسی طرح حضرت ابوہریرہؓ سے یہ حدیث مروی ہے:

من حمل جنازۃ فلیتوضاء [۲۶] جو جنازہ کو کندھا دے اسے چاہیے کہ

دوبارہ وضو کرے۔

اس کو حضرت عبداللہ بن عباس نے یہ کہہ کر کہ کیا خشک لکڑیاں اٹھانے کی وجہ سے ہم وضو کو لازم قرار دیں؟ رد کر دیا۔ حضرت ابوہریرہؓ نے جب یہ حدیث بیان کی کہ:

ولد الزنا شر الثلاث۔[۱۷] حرامی بچہ تیسرا برا ہے۔

اس کو حضرت عائشہؓ نے قرآن کی یہ آیت پڑھ کر رد کر دیا:

وَلَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰی[۱۸] کوئی بوجھ اٹھانے والا دوسرے کا بوجھ نہ اٹھائے گا۔

صحابۂ کرام کے اس عمل اور عقلی دلائل کی وجہ سے جمہور احناف غیر فقیہ صحابی کی حدیث کو اگر وہ مخالف قیاس ہو ترک کر کے قیاس کو اس پر ترجیح دیتے ہیں[۱۹]۔

۲۔ غیر فقیہ راوی کے بارے میں دوسری رائے احناف میں سے کرخی، ان کے پیرکار اور جمہور علمائے اصول (مالکیہ، شافعیہ، حنبلیہ) کی ہے۔ ان کے نزدیک راوی کا فقیہ ہونا شرائط راوی میں سے کوئی شرط ہی نہیں۔ اس لیے ہر وہ راوی جو متفقہ شروط روایت پوری کرتا ہو، اس کی حدیث خواہ موافق قیاس ہو یا مخالف ہو قبول کی جائے گی اور اس کے مقابلے میں قیاس کو رد کر دیا جائے گا۔ ہاں اگر خبر قرآن، سنت اور اجماع کے مخالف ہے تو قابل رد ہے۔[۲۰]

احناف میں سے بعض کے نزدیک حضرت ابوہریرہؓ کا شمار بھی صحابہ مجتہدین میں سے ہوتا ہے کیونکہ وہ خود بھی فتویٰ دیتے اور کسی دوسرے صحابی کے فتویٰ پر عمل نہیں کرتے تھے اور وہ بڑے بڑے صحابہ کا معارضہ بھی کرنے لگے تھے، مگر یہ رائے مرجوح ہے۔[۲۱]

۳۔ غیر فقیہ صحابی کے بارے میں تیسری رائے یہ ہے کہ اگر اس کی روایت

خلاف قیاس ہو مگر امت اسے قبول کرلے تو اس خبر پر عمل ہوگا اور قیاس کو ترک کر دیا جائے گا۔[۲۲]

(ب) راوی کی دوسری قسم مجہول سے مراد مجہول عین ہے نہ کہ مجہول عدالت، کیونکہ احناف مجموعی طور پر صحابہ کی عدالت کے قائل ہیں، لیکن اس اصطلاح سے ان کی مراد وہ صحابی ہیں جو مدت دراز سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت میں رہنے اور آپؐ سے مستفیض ہونے میں مشہور نہیں ہوئے، بلکہ کبھی کبھار اپنے قبیلے سے آئے اور آپؐ کے کلام کو سنا اور لوٹ گئے اور ان سے ایک یا دو حدیثیں مروی ہیں ۔ انکی پانچ اقسام ہیں:

۱۔ ایسے صحابی جو کثرت سے روایات بیان کرنے میں مشہور نہ ہوں اور ان سے صرف ایک یا دو حدیثیں مروی ہوں، اگر ان کی روایت کردہ حدیثوں کو ثقہ اصحاب قبول کرلیں اور اس کے صحت کی شہادت دیدیں تو ان کی احادیث معروف صحابی کی مانند ہی تصور ہوں گی۔ کیونکہ ثقہ صحابیوں کا ان احادیث پر اعتراض نہ کرنا اس بات کی دلیل ہے کہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہیں۔ اس کی مثال وابصہ بن معبد، سلمہ بن محبق اور معقل بن سنان الاشجعی ہیں۔[۲۴]

۲۔ ایسے صحابی جن کی روایتیں دور صحابہ میں شہرت حاصل کر گئی ہوں لیکن ثقہ صحابہ نے ان پر کوئی طعن نہ کیا ہو تو وہ روایتیں بھی قبول کی جائیں گی، کیونکہ بولنے کی جگہ پر نہ بولنا بھی رضامندی کی ایک علامت ہوتی ہے جب ثقہ صحابہ نے ان کو سنا اور خاموش رہے تو یہ تقدیراً ان کی رضامندی ہوگئی، اس قسم کے راوی کا مقام بھی سابقہ قسم کی طرح ہے۔[۲۵]

۳۔ ایسے صحابی جن کی روایتیں جب ثقہ صحابیوں کے سامنے پیش کی گئیں تو کچھ نے

ان کو قبول کیا اور بعض نے رد کر دیا۔ ایسے راوی کے بارے میں اختلاف ہے مثلاً معقل بن سنان الاشجعی نے ایسی منکوحہ عورت کے بارے میں جس کا حق المہر مقدر نہ کیا گیا ہو اور اس کا خاوند خلوت صحیحہ سے پہلے فوت ہو جائے، یہ حدیث بیان کی ہے کہ :

عن معقل بن سنان الاشجعی
کان ذکر بروع بنت واشق
انہ مات عنھا ھلال بن ابی مرۃ
ولم یکن فرض لھا ودخل بھا
فقضی لھا رسول اللہ صلی اللہ
علیہ وسلم بمھر مثل نساءھا[۲۶]

معقل بن سنان الاشجعی سے روایت ہے کہ بروع بنت واشق کا خاوند ہلال بن ابی مرہ نکاح کے بعد خلوت صحیحہ سے پہلے فوت ہو گیا اور اس نے حق المہر کا تعین بھی نہیں کیا تھا تو رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے لیے مہر مثل کا فیصلہ فرمایا۔

اس حدیث کو حضرت علیؓ نے یہ کہہ کر رد کر دیا کہ :

ما نصنع بقول اعرابی بوال علی عقبیہ۔

ہم ایسے اعرابی کے قول کو کیسے قبول کریں جو کھڑے ہو کر پیشاب کرتا ہے۔

لیکن حضرت عبد اللہ بن مسعود نے اس کو قبول کیا اور اس کے مطابق فتویٰ دیا[۲۷] ایسے راوی کے بارے میں احناف کی رائے ہے کہ اس کی روایت قبول کی جائے گی۔

لیکن امام شافعیؒ اس حدیث کو رد کر دیتے ہیں کیونکہ وہ مخالف قیاس ہے لیکن احناف کے نزدیک اول یہ کہ معقل سے ابن مسعود، علقمہ، مسروق، نافع بن جبیر اور حسن نے روایت کی ہے۔ مزید یہ کہ ان کا تعلق خیر القرون سے ہے جس کے عدالت کی شہادت خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دی ہے۔ اس لیے اس حدیث کو قبول کیا جائے گا۔[۲۸]

۴۔ جس صحابی کی حدیث سلف میں ظاہر ہوئی ہو اور انہوں نے اسے رد کر دیا ہو تو یہ ان کی طرف سے اس صحابی کی مرویات کا رد شمار ہوگا اور اس کی حدیثوں کو اگر خلاف قیاس ہوں تو رد کر دیا جائے گا[۲۹]

۵۔ جس صحابی کی احادیث سلف میں نہ ظاہر ہوئی ہوں اور نہ ہی سلف نے اس کی مخالفت کی ہو تو وہ رد و قبول کے مابین ہے اس کی وجہ سے قیاس کو ترک نہیں کیا جائے گا لیکن اس پر عمل جائز ہے کیونکہ تمام صحابہ کرام معلوم العدالت ہیں اور اس زمانہ کے لوگوں کی عدالت پر شک نہیں کیا جا سکتا ہے[۳۰]

راویوں کی اقسام کے بارے میں جمہور کی رائے | جمہور علمائے اسلام کے ہاں راوی کے یہ دو اقسام معروف و مجہول موجود ہیں اور نہ وہ صحابہ کو چاہے ان سے ایک حدیث ہی کیوں نہ مروی ہو مجہول تصور کرتے ہیں۔ کیونکہ اگر اس شرط کو برقرار رکھا جائے تو حمزہ بنؓ عبدالمطلب، مصعب بنؓ عمیر، خبیبؓ عاصم بنؓ الافلح اور اس طرح کے کئی اور جلیل القدر صحابہ مجہولین میں شمار ہوں گے۔ اس لیے جمہور کے نزدیک یہ تقسیم صحیح نہیں اور ان کی رائے میں تمام صحابہ معلوم العین، معلوم العدالت اور معلوم الحال ہیں[۳۱]

عدالت صحابہ پر سیر حاصل بحث کرنے کے بعد علمائے اصول نے صحابہ کے حدیث نقل کرنے کے طریقوں کی بھی وضاحت کی ہے، جو اس طرح ہے۔

صحابہ کے حدیث نقل کرنے کے طریقے | حدیث کے نقل کرنے کے طریقہ میں علمائے اصول نے صحابی اور غیر صحابی میں فرق کیا ہے، اصحاب کرام کے نقل کرنے کے مراتب درج ذیل ہیں۔

۱۔ کوئی صحابی یہ کہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھ سے یہ فرمایا تھا میں نے سُنا یا پھر "اخبرنی" و شافہنی کے الفاظ استعمال کرے تو اس حدیث کا درجہ بہت بلند

ہوگا اور یہ متفقہ طور پر حجت ہے۔ لیکن اس احتمال کی وجہ سے کہ شاید یہ خبر اس صحابی نے کسی اور صحابی سے سُنی ہو وہ حدیث نص صریح نہیں ہوگی۔

۲۔ کسی صحابی کا یہ کہنا کہ ہمیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس بات کا حکم دیا ہے یا اس سے روکا ہے تو جمہور کے نزدیک یہ حجت ہے لیکن داؤد ظاہری اور بعض متکلمین اسکے مخالف ہیں اور ان کے نزدیک یہ حجت نہیں۔

۳۔ کوئی صحابی مفعول کا صیغہ استعمال کرتے ہوئے کہیں کہ "امرنا بکذا، یا "نھینا عن کذا" یعنی اس بات کا حکم دیا گیا یا یہ اشیاء ہمارے لیے مباح رکھی گئیں تو امام شافعی اور آمدی کے نزدیک وہ حجت ہیں لیکن کرخی اور صیرفی متردد ہیں کہ آیا وہ اللہ کا حکم تھا جسے آپؐ نے صادر فرمایا یا صرف آپؐ کا اپنا حکم تھا۔

۴۔ کسی صحابی کا یہ کہنا کہ سنت سے یہ ثابت ہے تو یہ امام شافعی کے ایک قول کے مطابق اور آمدی کے نزدیک حجت ہے جب کہ کرخی اور امام شافعی کے دوسرے قول کے مطابق حجت نہیں ہے۔

۵۔ کسی صحابی کا یہ کہنا "عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم" تو اس میں یہ احتمال ہے کہ انہوں نے کسی اور سے سُنا ہو لیکن ظاہراً یہ ثابت ہوتا ہے کہ انہوں نے آپؐ سے سُنا ہوگا، اس لیے جمہور کے نزدیک یہ بھی حجت ہے۔

۶۔ کوئی صحابی یہ کہیں کہ ہم عہد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم میں اس طرح کرتے تھے یا فلاں لوگ آپؐ کے دور میں ایسے کرتے تھے تو یہ بھی حجت ہے کیونکہ صحابہ آپؐ کے سامنے کچھ کریں اور آپ ان کو نہ روکیں تو وہ بھی سنت ہے اور حجت ہے[۳۲]

رہے صحابہ کرام کے مراسیل تو اس پر ہمارا مفصل مقالہ برہان دہلی (جنوری ۱۹۹۵ء)

میں شایع ہو چکا ہے، قارئین اسے ملاحظہ کر سکتے ہیں۔

حواشی

[1] بزدوی، اصول البزدوی، ص ۱۵۹ [2] نسفی، کشف الاسرار شرح المنار، ج ۲، ص ۲ [3] سنن دار قطنی، کتاب الطہارۃ، باب احادیث القہقہہ فی الصلاۃ وعللہا [4] شاشی، اصول الشاشی، ص ۵، [5] زیلعی جمال الدین، مطبوعات مجلس علمی سورت، ج ۲، ص ۳۶ [6] شاشی، اصول الشاشی، ص ۵، [7] زیلعی نصب الرایۃ ج ۲، ص ۶۱ [8] شاشی، اصول الشاشی، ص ۵، [9] الحشر، ۲ [10] شاشی اصول الشاشی، ص ۶، [11] حقانی، حسامی مع النامی، ج ۱، ص ۴۰ [12] کنز العمال، بیروت، ۱۴۰۵ھ ج ۹، ص ۱۳۰، حدیث نمبر ۲۷۰۴۸ [13] بزدوی، اصول البزدوی، ص ۱۵۹ [14] سنن ابی داؤد، ابواب الطہارۃ، باب الوضو مما غیرت النار [15] سرخسی۔ اصول السرخسی، ج ۱، ص ۳۴۰ [16] مسند احمد بن حنبل ج ۲، ص ۵۵۴ [17] المستدرک علی الصحیحین، ریاض، مکتبہ، کتاب الاحکام ج ۴، ص ۱۰۰ [18] بنی اسرائیل ۱۵ [19] نسفی۔ کشف الاسرار شرح المنار ج ۲، ص ۷۲ [20] باجی۔ احکام الفصول، ص ۲۹۲ [21] نجم الغنی حکیم، مذیل الحواشی شرح اصول الشاشی، ملتان، ۱۹۸۶ء، ص ۲۱۳ [22] نسفی۔ کشف الاسرار شرح المنار، ج ۲، ص ۲ [23] امیر بادشاہ۔ تیسیر التحریر، ج ۳، ص ۵۳ [24] نسفی کشف الاسرار شرح المنار، ج ۲، ص ۲۸ [25] سرخسی۔ اصول السرخسی۔ ج ۱، ص ۳۴۳ [26] مسند احمد بن حنبل ج ۳، ص ۴۰۸ [27] بزدوی۔ اصول البزدوی، ص ۱۲۰ [28] حقانی، حسامی شرح النامی، ص ۱۵۰ [29] امیر بادشاہ، تیسیر التحریر، ج ۳، ص ۵۳ [30] عبد العزیز بخاری۔ کشف الاسرار، ج ۲، ص ۷۰۹ [31] باجی۔ احکام الفصول، ص ۵۰۹ [32] ارموی، سراج الدین۔ التحصیل من المحصول، تحقیق عبد المجید علی ابو زید۔ بیروت، ۱۹۸۸ء، ج ۲، ص ۱۴۴۔

عین الملک ماہرو اور اس کے منشآت

از جناب سید محمد اسد علی خورشید صاحب، علی گڑھ

ہندوستان کے عہد وسطیٰ کی علمی و ادبی تاریخ میں عین الملک عبداللہ ابن ماہرو کا نام بڑی خصوصیت کا حامل ہے۔ وہ علم و ادب ہی میں بھی یگانہ نہ تھا بلکہ حکومت و سیاست میں بھی ماہر اور تجربہ کار سمجھا جاتا تھا لیکن افسوس ہے کہ ہم عصر منابع و مآخذ اس کے حالات کے ذکر سے خالی ہیں۔ البتہ سیاست و حکومت میں عمل و دخل کی بنا پر ابن بطوطہ، سراج عفیف اور ضیاء برنی نے جا بجا اس کا ذکر کیا ہے، جس سے اس کی شخصیت کا ایک دھندلا خاکہ سامنے آتا ہے۔

عین ماہرو کا نام عین ماہرو کے نام کے سلسلے میں بھی محققین تذبذب کا شکار ہیں کہیں اسے عین الدین کہا گیا ہے تو کہیں عبداللہ۔ بعض مورخین نے عین الملک ملتانی اور بعض نے عین الملک ماہرو سے مخاطب کیا ہے، جب کہ عین ماہرو نے خود کو محض ماہرو کہا ہے۔ اغلب یہ ہے کہ عین الدین عین الملک اس کا لقب اور عبداللہ نام تھا۔ اس طرح صحیح "انشاء ماہرو" کے مطابق اسکا مکمل نام عین الدین عین الملک عبداللہ ابن ماہرو قرار پاتا ہے۔

پیدائش و وطن ابن ماہرو کی تاریخ پیدائش اور وطن کے متعلق بھی بے خبری ہے، اس کے نام کے ساتھ منسلک نسبت ملتانی کی وجہ سے قیاساً یہ گمان کیا جا سکتا ہے کہ غالباً اسکی پیدائش ملتان میں ہوئی ہوگی اور وہیں اس نے پرورش بھی پائی ہوگی، یا پھر مدت دراز

تک ملتان سے وابستہ رہنے کی بنا پر ملتانی نسبت سے شہرت پائی ہو۔ بعض اصحاب قلم نے ابن ماہرو کو ایرانی النسل شمار کیا ہے، جب کہ عین ماہرو نے خود کو اپنے ایک مکتوب میں تاجیک بیان کیا ہے۔ چنانچہ مسطور ہے کہ:

" درین دیار نعیم ہمان وجہ مواجب ۔ ۔ ۔ ۔ می ستانم۔ پانصد تنکہ از ملتان مرا ذخیرہ نماندہ و با آن کہ مرتبہ وجاہ برابر ہم موفورۂ پادشاہ جہاں پناہ بدان مشابہ است کہ ہیچ تاجیکی رانہ ۔ ۔ ۔ ۔" (انشای ماہرو ص۸)

ڈاکٹر ذبیح اللہ صفا نے ابن ماہرو کے خود کو تاجیک بیان کرنے کی تاویل کے ضمن میں یوں رقم کیا ہے کہ:

" ۔ ۔ ۔ ۔ زیرا خود او در ضمن منشآت خویش بہ "تاجیک" بودن خود اشارہ دارد و چنانکہ می دانیم درین مورد مقصود را "تاجیک" ایرانیانیست کہ در برابر ترکان مہاجر بہ ہند قرار داشتہ و جمعاً تشکیل دہندگان حکومتہای مسلمانانِ ہند بودہ اند" (تاریخ ادبیات در ایران ص۱۳۰۸)

عہدے ومناصب عین الملک امیر ماہرو کا بیٹا تھا۔ سیاسی اعتبار سے اس کی شخصیت بڑی اہم تھی۔ سلطان فیروز شاہ تغلق کے اعلیٰ افسران کی فہرست میں اس کا نام سرفہرست نظر آتا ہے۔ عین الملک ماہرو نے سلطان محمد بن تغلق کے عہد میں ناظم و منصرم کی حیثیت سے اعلیٰ مقام حاصل کر لیا تھا۔ جب فیروز شاہ سریر آرائے سلطنت ہوا تو اس نے پہلے عین ماہرو کو مشرف ممالک کے عہدۂ جلیلہ پر فائز کیا پھر ملتان کی امارت تفویض کی

بنارسی پرشاد سکسینہ کے بیان کی تردید ضیاء الدین برنی سب سے پہلے عین الملک کا ذکر اس وقت کرتا ہے۔ جب سلطان علاء الدین خلجی نے محاصرۂ قلعۂ رنتھمبور کے

دوران ایک مجلس خاص طلب کی تھی۔ یہاں جس عین الملک کا ذکر ہوا ہے اسے شیخ عبدالرشید مصحح و مدون انشائے ماہرو نے عین ماہرو یعنی صاحب "انشائے ماہرو" ہی تصور کیا ہے لیکن پروفیسر بنارسی پرشاد سکسینہ نے دونوں کو دو مختلف شخصیتیں قرار دیا ہے کیونکہ اولاً تو ایک ہی شخص ہونے کی بنا پر ایک کی مدت کا ۷۵ برس ماننا پڑے گا، ثانیاً یہ کہ عین الملک ملتانی ایک مشہور سپہ سالار تھا جبکہ عین ماہرو بقول برنی جنگی تدابیر اور عسکری تجربوں سے نابلد تھا۔

پروفیسر سکسینہ کا خیال ہمارے نزدیک محل نظر ہے جہاں تک پچہتر سالہ مدت کار کا سوال ہے تو یہ بعید از قیاس نہیں۔ ممکن ہے ۱۳۰۱ء میں قلعۂ رنتھمبور کے محاصرے کے دوران طلب کی گئی علائی مجلس خاص میں شرکت کے وقت عین ماہرو کا عنفوان شباب رہا ہو اور اس وقت بھی اپنی زیرکی، دانشمندی اور بالغ النظری کی بنا پر اپنے معاصر سن رسیدہ اہل الرائے اور اصحاب حل و عقد میں ممتاز ہو۔ ان کی دوسری توجیہ کے سلسلے میں برنی کا یہ قول کہ عین الملک اور اس کے بھائیوں کو عسکری تجربات اور جنگی تدابیر سے ناواقفیت تھی مبنی بر حقیقت نہیں معلوم ہوتا ہے، کیونکہ یہی عین الملک فیروز شاہ تغلق کے عہد میں ہمیں ملتان، بھکر اور سیوستان کا گورنر نظر آتا ہے۔ ظاہر ہے کہ عسکری تدابیر اور جنگی امور سے نابلد شخص کو اتنے اہم منصب پر فائز کرنا غیر دانشمندانہ فعل ہوگا اور قیاس یہ تسلیم کرنے کو تیار نہیں کہ فیروز شاہ تغلق جیسا کامیاب حکمراں جس نے ہندوستان اور اس کی رعایا کو امن و آشتی کے اڑتیس سال دیئے، ایسے غیر دانشمندانہ فعل کا مرتکب بھی ہو سکتا ہے۔ اس کے علاوہ ملک الشرق شمس الدولہ والدین محمود بک کو لکھے گئے اپنے ایک مکتوب میں خود عین الملک ماہرو نے بیان کیا ہے کہ وہ سلطان کے بموجب حکم لشکر کی ترتیب میں مشغول ہے۔ چنانچہ

رقمطراز ہے کہ:

"بعد ازاں تشریفات فاخرہ و نوازش وافرہ بندہ را بتاریخ نہم ماہ شوال بر صوب ملتان روانہ کردن فرمان داد و بتاکید فرمان شدہ تا بندۂ کمینہ دو ہزار و پانصد سوار بدو دفعت بمصاحبت مذکورین بدین اسامی ملک ہلال و قاضی برہان و ملک امیر کوہ نائب ملتان با بحر و اسباب دیگر روانہ کند۔ این کہتر بخشش و کوشش بست و نہم ماہ مذکور در ملتان رسید و بقدر قدرت و توانائی خود بہ ترتیب لشکر و بحر مشغول شدہ است"۔

(انشائے ماہرو، ص ۱۰۶)

ان اسباب و علل کی روشنی میں محض برنی کے بیان پر عین الملک ماہرو کو عسکری تجربوں سے نابلد شخصیت گمان کر لینا مناسب نہیں ہے، کیونکہ عسکری رموز سے ناآشنا شخص سے عساکر کی ترتیب کا کام لینا دانش و بینش کے خلاف ہے جس کی توقع سلطان فیروز شاہ تغلق سے بعید ہے۔ اس بنا پر ہمیں یہ قبول کر لینے میں کوئی تذبذب و تامل نہیں کہ عین الملک ملتانی اور عین ماہرو دونوں ایک ہی شخصیتیں تھیں۔

عین الملک ماہرو نے سلطان محمد بن تغلق کے خلاف علم بغاوت بلند کیا اور سلطان کی افواج کے ہاتھوں شکست اٹھائی اور گرفتار ہو کر سلطان کے سامنے پیش ہوا۔ سلطان نے اسے معاف کر دیا اور شاہی باغ کا نگراں مقرر کیا، بغاوت، معافی اور پھر شاہی باغ کے نگراں کی حیثیت سے تقرری کے اس ذکر کے بعد محمد بن تغلق کے عہد میں اس کا ذکر ہمیں کہیں نظر نہیں آتا۔ لیکن جب فیروز شاہ تغلق سریر آرا ہوا تو اولاً اس نے عین الملک ماہرو کو مشرف ممالک مقرر کیا پھر خانجہاں مقبول سے اس کی نزاعی صورت حال کے تدارک کیلئے اسے ملتان، بھکر اور سیوستان کی گورنری تفویض کی۔

نہ تو عین الملک ماہرو کی ملتان کی گورنری سے سرفرازی کی تاریخ کا کہیں ذکر ملتا ہے اور نہ ہی کہیں یہ مذکور ہے کہ کتنی مدت تک اس نے اس منصب پر فائز رہ کر اپنی خدمات انجام دیں۔ غالباً ملتان کی گورنری ہی اس کی حیات کا آخری منصب تھا جس پر بحال رہ کر اس نے سلطنت کی خدمات انجام دیں کیونکہ معاصر مآخذ میں اقطاعات ملتان، بھکر اور سیوستان کی تفویض کے بعد عین الملک ماہرو کا کوئی ذکر نظر نہیں آتا۔ موجود اطلاعات کے مطابق سنہ ۷۵۳ھ مطابق سنہ ۱۳۵۲ء میں عین ماہرو کو مشرف ممالک کا عہدہ تفویض ہوا اور سنہ ۷۶۰ھ مطابق سنہ ۱۳۵۹ء میں دوسری مہم بنگال پیش آئی۔ سنہ ۱۳۵۲ء میں مشرف ممالک مقرر ہونے کے کچھ دن بعد اسے ملتان کی گورنری عطا ہوئی۔ گویا سنہ ۱۳۵۲ء میں بہ حیثیت گورنر مقرر ہونا اگر فرض کر لیا جائے تو اپنے ایک مکتوب کے مطابق سنہ ۱۳۵۶ء تک تو ضرور عین ماہرو ملتان میں بحیثیت گورنر رہا۔ گمان اغلب ہے کہ دوسری مہم بنگال سے قبل اس کا انتقال ہو گیا اس طرح سنہ ۱۳۵۶ء اور سنہ ۱۳۶۰ء کے درمیان کسی سن میں ابن ماہرو کا انتقال ہوا۔

عین الملک کی علمی و ادبی بلند پائیگی | جس طرح حکومت اور سیاست کے کاموں میں عین ماہرو مشہور، ممتاز اور ماہر تھا اسی طرح علمی اور ادبی حلقوں میں بھی بڑی قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا۔ دراصل وہ نہایت عمدہ ادبی مذاق رکھتا تھا اور متداول علوم میں منفرد تھا۔ تاریخ، فقہ، تفسیر، سیر اور احادیث غرض تمام علوم متداولہ میں دسترس تھی اور سراج عفیف کی اطلاع کے مطابق محمد بن تغلق اور فیروز شاہ تغلق کے عہد فرمانروائی میں متعدد علمی و ادبی کتابیں تصنیف کیں جن میں سے ایک "ترسیل عین الملک" ہے اور امتداد زمانہ سے بہ استثناء اس مجموعہ ترسلات کے سبھی ناپید ہو گئیں۔ عین ماہرو کے علم کی گہرائی و گیرائی کا اندازہ اس کے منشآت سے بخوبی لگایا جا سکتا ہے۔ رائج الوقت انشاء نگاری کی نرگس شہلا

میں اس نے دل کش طرز تحریر اور انوکھی ادا کے کمل جواہر سے جاذب النظر صناعی کا جو دلکش و دلربا حسن جگایا ہے اس کی مثال ما بعد کے منشیان زود آور کے یہاں کم یاب ہے

منشآت کی اہمیت | عین الملک نے اپنے منشآت کے شیوۂ تحریر میں عمومی طور پر فارسی زبان کے مترسلان کی طرز و روش اختیار کی ہے۔ مصنوع و مقرون کلام کی جلوہ آرائیاں ہیں اور عربی و فارسی اشعار و امثال بہ کثرت موجود ہیں۔ مکاتیب و مراسلات میں بہ استثنار دو کے کسی میں کوئی تاریخ مرقوم نہیں ہے جس سے مکاتیب کی ترقیم کی تاریخ کی تعیین کی جاسکے۔ ساتھ ہی بعض مکتوب الیہم نیز مذکور بعض اشخاص کی شناخت بھی امر لاینحل ہے۔ ان تمام مجموعی خامیوں کے باوجود بھی ماہرو کے یہ منشآت اس اعتبار سے ذی قیمت اور بیش بہا ہیں کہ ان میں اہم شہزادوں، سرکاری حکام و عمال، طائفۂ صوفیہ، خود عین ماہرو کے خانوادے کے بعض افراد عوام کے مختلف طبقات کے ساتھ حکومت کے طریق کار، زمانہ متعلقہ کی تہذیب و تمدن کا عکس، سرکاری محاصل اور ان کی شرح اور ایسی ہی دیگر معلومات سے متعلق اجمالی تفاصیل موجود ہیں۔

منشآت کی تعداد و اقسام | عین الملک ماہرو کے منشآت کی تعداد ایک سو چونتیس ہے جس میں مکاتیب، مناشیر، امثال اور عرضداشت وغیرہ شامل ہیں۔ ادبی لحاظ سے یہ منشآت خاص اہمیت کے حامل ہیں اور اس سے خلجی و تغلق عہد کی طرز تحریر و نگارش کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے۔ اس دور کے ہندوستان اور ایران میں فارسی نثر اگر ایک طرف سادگی و روانی سے مزین ہو رہی تھی تو دوسری طرف پر تکلف و تصنع اور مغلق تحریریں بھی لکھی جارہی تھیں۔ عین الملک ماہرو نے اسی مصنوع اور مشکل پسند طرز کو اختیار کیا اور اسی میدان میں جولانی طبع دکھائی۔ منشآت ماہرو سے عین الملک ماہرو کے علم و فضل کا اندازہ

ہوتا ہے جس میں دقیق الفاظ، رقیق معانی، عمیق افکار، مناسب ترکیبوں اور فقروں کی بندش و چستی کا قابل دید منظر نظر آتا ہے۔

عین الملک کے مکاتیب کا انداز | عین الملک کے مکاتیب کا آغاز عموماً استعارہ و تشبیہ لیے ہوتا ہے، وہ اس امر کی کامیاب سعی کرتا نظر آتا ہے کہ جو استعارات و تشبیہات بھی استعمال کی جائیں وہ کسی نہ کسی زاویے سے مکتوب الیہ کے نام یا اس کے عہدے وغیرہ سے مماثلت رکھتی ہوں، لیکن جب وہ سلطان یا کسی اعلیٰ عہدیدار کو مکتوب لکھتا ہے تو اس کا انداز یکسر بدل جاتا ہے اور سنجیدگی و متانت اس کے دامنِ قلم کو تھام لیتی ہے۔ عین الملک نے اپنے مکاتیب و مراسلات میں مکتوب الیہ کے شایانِ شان القاب استعمال کیے ہیں جو اپنے انتخاب، وزن اور معنویت کے اعتبار سے بڑے جاذب نظر ہیں۔ لیکن کہیں کہیں ثقالت نے ان القاب کے حسن کو دوبالا کرنے کے بجائے ان میں بھدا پن پیدا کر دیا ہے۔

القاب اور کلماتِ دعاء و سلام کے بعد اکثر و بیشتر مکاتیب میں اس نے مکتوب الیہم سے فرقت و جدائی اور ہجر و دوری کا بیان بڑے شاعرانہ انداز میں کیا ہے۔ اظہار مدعا کے لیے موزوں الفاظ کا انتخاب اور مناسب طرزِ ادا و اندازِ تخاطب اختیار کرتا ہے اور اظہار کیفیت و حال کے لیے استعاراتی اور تشبیہاتی پیرایہ اور موزوں و مناسب چیزوں سے تمثیل دے کر واقعی جاذبیت و اثر پیدا کر دیتا ہے۔ لیکن کبھی کبھی اظہار اشتیاق اور وفور شوق میں عین الملک کا قلم اتنا ازخود رفتہ ہو جاتا ہے کہ تصنع اور مبالغے کا شائبہ نظر آنے لگتا ہے۔

اشتیاق ملاقات کے اظہار کے بعد مکتوب کا اصل موضوع شروع ہوتا ہے اور پھر مکتوب الیہ سے عموماً سلسلۂ مراسلت و مکاتبت برقرار رکھنے اور تلطف و عنایات کا سلسلہ

قائم رکھنے کی گزارش کے بعد مکتوب الیہم کے لیے دعائیہ کلمات اور فقروں پر مکاتیب منتہی ہوتے ہیں۔ ---

منشآت عین الملک بلاغت کا بہترین نمونہ ہیں اور ان میں مختلف ادبی صنعتیں مثلاً سجع، تشبیہ و استعارہ، اشتقاق، مراعات النظیر، تنسیق الصفات اور ایہام وغیرہ کا استعمال فنی انداز میں کیا گیا ہے۔ اس کے مکاتیب میں مطائبات کی جھلک بھی نظر آتی ہے چنانچہ سید شمس الدین جیجو کو لکھے گئے مکتوب میں مطائبہ بدرجۂ اتم موجود ہے اور مکتوب الیہ کے افکار کو کنواری لڑکیوں اور اس کے منشآت کو لڑکیوں اور دلہنوں سے تشبیہ دیتے ہوئے خود کو ملاقات کی دلہن کا شوہر قرار دیا ہے۔ چنانچہ رقمطراز ہے کہ:

"تا چہرۂ خاتون فیروزہ بہ طرۂ رواج دعیرۂ صباح آراستہ خواہد بود عروس مشتاقان از تتق خاوری روی عالم افروز خواہد نمود، ذات آں شہسوار مضمار بلاغت اعنی سید شمس الدین جیجو کہ ابکار افکار و بنات منشآت قلم گوہر نثار او بہ درر معانی دقیق و غرر الفاظ رقیق آراستہ است بہ عروس مراد فیروز باد بحق من قال "وخلق منہا زوجہا" خاطب عروس ملاقات اخوی عین ماہرو۔۔۔" (انشائے ماہرو، ص۳۵)

عین الملک ماہرو کے مکاتبات و منشآت میں بعض جگہ لا طائل تطویل بھی نظر آتی ہے محض تحسین و تزئین کے لیے طولانی جملوں کا استعمال کبھی کبھی عبارت کو بوجھل کر دیتا ہے اور مفاہیم و مطالب کے ادراک میں قاری کو بے وجہ زحمتیں برداشت کرنی پڑتی ہیں۔

آیات، احادیث، اشعار اور امثال و حکم | عین ماہرو کے یہاں اشعار و امثال و حکم کا استعمال بھی لائق اعتناء ہے۔ کلام میں زور و تاثیر پیدا کرنے کی غرض سے اس نے بکثرت عربی و فارسی اشعار و امثال و حکم کا استعمال بھی عربی ضرب الامثال و اقوال وغیرہ کا امتزاج اس خوبی سے

کیا گیا ہے کہ کہیں کہیں قاری کو اس کا احساس بھی نہیں ہوتا کہ وہ کب فارسی متن سے عربی کلمات وفقروں کی طرف منتقل ہو جاتا ہے۔

آیات قرآنی اور احادیث نبوی کے استشہاد سے عین الملک کے منشآت بھرے پڑے ہیں اور اتنا نپا تلا اور چست و درست استشہاد کیا گیا ہے کہ خوانندہ انگشت بدنداں رہ جاتا ہے۔ یہ استشہاد عین الملک کی عربی دانی بلکہ عربی زبان پر اس کی کامل دسترس کی دلیل ہیں اور عمق نظر، گہرائی افکار، دوراندیشی اور برمحل و مناسب فطانت کی آئینہ دار بھی ہیں۔ عین الملک کو نثر کی نظم میں تلفیق کا بھی ملکہ حاصل تھا۔ اپنے مدعا کو نثر میں بیان کرنے کے بعد عموماً وہ برمحل اشعار کے ذریعہ ان مقاصد و مدعا کے بیان میں زور پیدا کرتا ہے۔

مختصر یہ کہ عین ماہرو کے مراسلات و منشآت مرصع، مسجع، مزین، مقرون باطناب وایراد اور صناعات ادبی کا مظاہرہ ادبیت میں بڑا نمایاں اور ممتاز مقام رکھتے ہیں۔ الفاظ کے نادر انتخاب اور برجستہ استعمال، بندشوں کی چستی، ترکیبوں کی جزالت، مرادفات کی سلاست، تضادات کی روانی، استعارات و اشتقاق کی سحر کاری، مراعاۃ النظیر، تنسیق الصفات اور سیاقۃ الاعداد کی افسوں نگاری، ایہام و مبالغہ اور براعت الاستہلال کی دلکشی، ذو رعایت و مطائبہ کی لذت و چاشنی، تلفیق نثر بنظم کی جولانی، تمثل و استشہاد کی فراوانی اور القاب و عناوین کے نفیس انتخاب۔ غرض عین الملک ماہرو کے منشآت تمام ادبی خصوصیات اور خوبیوں کا مجموعہ ہیں۔

منشآت میں تاریخی، سیاسی، تہذیبی اور معاشی تعلیمات | تاریخی، سیاسی، تہذیبی و ثقافتی، معاشرتی نیز معاشی اعتبار سے بھی منشآت عین الملک لائق اعتنا ہیں۔ سیاسی و تاریخی نقطہ نگاہ سے

عین ماہرو کی منشآت کا مطالعہ عہد علائی سے لے کر عہد فیروزی تک کی ایک اجمالی تاریخ کا خاکہ سامنے لاتا ہے۔ تاریخی حیثیت سے بعض مہمات وقائع کا ذکر بھی ملتا ہے اور ارباب حل وعقد کے مناصب اعلیٰ پر سرفرازی کا علم بھی ہوتا ہے۔ منشآت ماہرو میں مذکور بعض شخصیات تاریخی حیثیت سے اتنی مبہم اور غیرواضح ہیں کہ مزید تفصیل کے بغیر ان کی شناخت ممکن نہیں ہے۔ تاریخی اعتبار سے منشآت عین الملک میں ایک سقم یہ ہے کہ اس میں دو کے علاوہ کسی مکتوب کی تاریخ ترقیم کا اندراج نہیں ہے۔ اول فیروز شاہ تغلق کے حضور لکھی گئی ایک عرضداشت جو اوقاف ملتان سے متعلق موضوع پر ہے اور جس کی تاریخ ترقیم ۱۰ صفر ۷۶۳ھ درج ہے۔ دوسرا مکتوب جو اپنے بیٹے کریم الدین کو لکھا ہے، اس میں مکتوب الیہ کے بیٹے یعنی اپنے پوتے کے تولد کی تاریخ ۷ ذیقعدہ ۷۵۵ھ درج کی ہے۔ ان کے علاوہ ایک اور مکتوب میں صرف تاریخ کا ذکر نظر آتا ہے جو محمود بک کو لکھا گیا ہے اور جس میں یہ مذکور ہے کہ ۹ شوال کو ملتان کی ذمہ داری سنبھالنے کے لیے سلطان کے بموجب حکم روانہ ہوا اور ۲۹ شوال کو ملتان پہنچا۔ اس مکتوب میں اگر سن کا ذکر بھی موجود ہوتا تو محققین کے لیے بہت سے ابہام بآسانی دور ہوجاتے۔ منشآت عین الملک میں مختلف سلاطین دہلی کے دور کی بغاوتوں کا بھی ذکر ملتا ہے اور خود سلاطین کی بعض مہمات نیز افغان پور میں عمارت کے انہدام کے سبب غیاث الدین تغلق کی موت واقع ہوجانے کا ذکر بھی دستیاب ہے۔ یہ اطلاعات تاریخی اور سیاسی اعتبار سے خاصی اہم ہیں اور براہ راست اطلاع کی بنیاد پر لائق اعتبار و استناد ہیں۔

منشآت عین الملک سے بہت سے معاشی پہلوؤں پر بھی روشنی پڑتی ہے اور

اس دور کی تہذیب و ثقافت و معاشرت اور رسوم و رواج کا بھی ذکر ملتا ہے۔ متعدد خطوط میں عین الملک نے ملتان کی معاشی صورت حال، غلوں کے نرخ، اپنے پیشرو حکام و عمال کی بدعنوانیوں کے نتیجے میں رعایا اور مخلوق کی بدحالی اور خزانۂ ملتان کے خالی ہوجانے کا ذکر ہے، خراج و محاصل کی شرحیں، خیاطوں کی اجرت اور اس قبیل کی بہت سی اطلاعات پیش کی گئی ہیں۔

مختصر یہ کہ عین الملک کے منشآت کا یہ مجموعہ اواخر ہفتم اور اوائل ہشتم صدی ہجری کی فارسی انشار کا اچھا اور بہترین نمونہ ہے جو ادبی حیثیت سے بلند پایہ اور عظیم کارنامہ ہے، اس کے علاوہ وہ تاریخی نقطۂ نگاہ سے بھی خاصی اہمیت کا حامل ہے کیونکہ اس کے توسط سے ہمیں امرار، ملوک، خواتین، ولاۃ و رجالِ دولت، علمار، فقہار، صوفیۂ اولیار اور سلطنت دہلی کے دیگر مشاہیر کے سلسلے میں بیش قیمت اور گرانقدر اطلاعات دستیاب ہوتی ہیں۔

مقدمہ رقعات عالمگیر

از سید نجیب اشرف ندوی

اورنگزیب عالمگیرؒ کے مجموعۂ رقعات و خطوط و مراسلات پر مقدمہ اور تفصیلی تبصرہ، جس میں اسلام میں فن انشار اور شاہانہ مراسلات کی تاریخ، ہندوستان کے صیغۂ انشار کا حال، بالخصوص عالمگیرؒ کی انشار پر بحث، اس کی تاریخ کے مآخذ اور عالمگیرؒ کی پیدائش سے برادرانہ جنگ تک کے تمام واقعات و سوانح پر خود ان کے خطوط و واقعات کی روشنی میں تنقیدی نگاہ ڈالی گئی ہے۔

قیمت ۸۰ روپے

لفظ نسناس کی تحقیق

از عمیر الصدیق دریابادی ندوی

گذشتہ دنوں کلکتہ کے ایک سفر میں وہاں کے مشہور صاحب علم اور حاذق طبیب جناب مولانا حکیم محمد زماں حسینی صاحب کی خدمت میں حاضری کی سعادت میسر آئی، وہ پیرانہ سالی کے علاوہ دوسرے گوناگوں عوارض اور فالج میں مبتلا ہیں، جس سے ان کے روزمرہ کے معمول پر اثر پڑا ہے لیکن مطالعہ و تحقیق اور علمی مشاغل اس حالت میں بھی جاری ہیں، قاسمی دواخانہ میں ان کی نشست کے اردگرد تفسیر و حدیث اور فقہ و تاریخ کی امہات کتب اور مولانا کی عالمانہ گفتگو، اکابر سلف کی مجلسوں کی یاد تازہ کردیتی ہے۔

ایسی ہی ایک نشست میں انہوں نے فرمایا کہ مولانا اشرف علی تھانوی کی مناجات مقبول میں عربی کا ایک منظوم درود ہے، مولانا تھانوی نے اس کا اردو ترجمہ بھی کیا ہے اس میں ایک شعر یہ ہے:

صل یارب علی صاحب شرع حسن		فرق الناس متی جاء من النسناس

ترجمہ یہ ہے: رحمت بھیج اے پروردگار اچھی شریعت والے پر جنھوں نے بھلے آدمیوں کو برے آدمیوں سے متمیز کیا۔

قریب چالیس سال سے یہ نعتیہ درود ورد زبان ہے لیکن لفظ نسناس کے متعلق جستجو اب ہوئی، چند دستیاب کتابوں مثلاً دمیری کی حیات الحیوان سے مراجعت کی تو

معلوم ہوا کہ یہ لفظ کسی مجموعہ احادیث میں بھی وارد ہوا ہے، از راہ شفقت انہوں نے مزید تحقیق کا حکم دیا، چنانچہ اور کتابوں اور لغات کے حوالہ سے جو کچھ معلوم ہوا اس کو دلچسپی کے خیال سے یہاں پیش کیا جاتا ہے۔

نسناس کے متعلق زیادہ تفصیل شیخ کمال الدین دمیری متوفی ۸۰۸ھ کی کتاب حیاۃ الحیوان الکبری ہی میں ملتی ہے، اس میں گویا پیش رو علما، و محققین کی آراء و تحقیقات کی تلخیص کر دی گئی ہے، مثلاً المحکم ابن سیدہ کے حوالہ سے بتایا گیا ہے کہ نسناس انسانی شکل کی مانند ایک مخلوق ہے اور ضعف خلقت کی وجہ سے یہ لفظ ناس سے مشتق ہے جوہری کی صحاح کے حوالہ سے یہ بھی بتایا گیا ہے کہ یہ ایسی مخلوق ہے جو ایک پیر والی ہے اور پھدک پھدک کر چلتی ہے، مشہور مورخ مسعودی کا یہ بیان بھی نقل کیا گیا ہے کہ یہ انسان کے مانند ایک جانور ہے جس کی صرف ایک آنکھ ہوتی ہے اور یہ پانی سے نکلتا ہے، باتیں بھی کرتا ہے اور آدم خور ہے۔ زکریا قزوینی کی یہ عبارت بھی دی گئی ہے کہ یہ ایک خاص قوم ہے جس کا بدن، سر اور ہاتھ پیر یعنی انسان کے اعضاء کا نصف ہوتا ہے گویا یہ نصف انسان ہے، یہ عربی زبان بولتا ہے اور اس کا شکار بھی کیا جاتا ہے، دمیری کی یہی تفصیلات ان کے ہم عصر علامہ مجد الدین فیروز آبادی متوفی ۸۱۷ھ نے اپنی القاموس المحیط میں نقل کی ہیں اور انہوں نے یہ بھی لکھا ہے کہ نسناس کے ہاتھ پیر بندروں کی ایک قسم سے مشابہ ہیں اور یہ پرندوں کی طرح اچھلتا ہے، لمبی چھلانگ بھی لگاتا ہے اور مویشیوں کی طرح گھاس بھی چرتا ہے، انھوں نے یہ بھی لکھا کہ اب یہ نسل ختم ہو چکی ہے، لیکن قریب قریب اس کے مشابہ ایک اور مخلوق موجود ہے، اس کی تین قسمیں ہیں، ناس، نسناس اور نسانس، موخر الذکر دراصل نسناس کے مادہ جانوروں کو کہا جاتا ہے اور ان کو نر سے زیادہ قیمتی کہا جاتا ہے،

ایک قول یہ بھی ہے کہ یہ یاجوج ماجوج ہیں، اس تفصیل کے ساتھ قاموس کے حاشیہ میں چند اور وضاحتیں بھی ہیں مثلاً نسناس کا شکار کیا جاتا ہے اور اس کا گوشت کھایا جاتا ہے ابن الرقیش کا یہ قول بھی ہے کہ یہ سام بن سام کی اولاد سے ہیں جو عاد و ثمود کے بھائی تھے ان کے عقل نہیں ہوتی اور یہ جھاڑیوں میں رہتے ہیں، بحر ہند کے ساحلی علاقے ان کا مسکن ہیں عرب ان کا شکار کرتے ہیں، ان سے باتیں بھی کرتے ہیں، ان مختلف اور متضاد اقوال میں سب سے زیادہ دلچسپ یہ قول ہے کہ نسناس عربی زبان بولتے ہیں اور اس میں شاعری بھی کرتے ہیں، وہ اپنے نام بھی عربوں کے سے رکھتے ہیں، چنانچہ ابو حامد غرناطی نے تاریخ صنعاء کے ایک تاجر کا ذکر کیا ہے، جس نے ایک نسناس کو یہ اشعار پڑھتے ہوئے سُنا تھا:

مررت من خوف السراة شدا ... اذلم اجد من الفرار بدا

قد کنت قدما فی زمانی جلدا ... منها انا الیوم ضعیف جدا

(تحفۃ الالباب ص ۴۶-۴۴)

قریب چار سو سال کے بعد القاموس المحیط کے شارح علامہ زبیدی (ت ۱۲۰۵ھ) نے تاج العروس میں ان معلومات کو نقل کرتے ہوئے یہ بھی لکھا ہے کہ نسناس جزائر چین میں پائے جاتے ہیں، یہ بھی لکھا کہ یہ یمن کی ایک مخلوق ہے۔

ان عجیب وغریب، ناقابلِ یقین اور متضاد و مخالف رایوں اور اندازوں نے واقعتاً نسناس کو پُر اسرار بنا دیا، لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ عرب، زمانۂ قدیم سے اس لفظ سے واقف اور مانوس تھے، ان کی شاعری میں نسناس کا ذکر عام ہے چنانچہ ایک شاعر حافظ نے کمیت گھوڑے کے متعلق ایک شعر کہا کہ:

فما الناس الا تحت خب نعالهم ولو جمعوا نسناسهم والنسانسا

ابو حامد غرناطی اندلسی کی کتاب تحفۃ الالباب عجائب و غرائب عالم کے بیان میں بڑی دلچسپ ہے، اس نادر کتاب کو پیرس سے فرانسیسی زبان کے حواشی و تعلیقات کے ساتھ شایع کیا گیا ہے، اس میں نسناس کے متعلق مشہور شاعر الاعشی کے یہ اشعار نقل کیے ہیں:

الم تروا ارما و عادا افناهم الليل والنهار
واهلكت من بعدهم ثمود بما جنى فيهم قدار
وحل بالحي من جيء يوم من الشر مستطار
وجاسم بعدها وطيس قد اوحشت منهم الوبار
ومسخت بعدهم وبار فلا صحار ولا وبار

(تحفۃ الالباب، مطبوعہ پیرس، ص ۴۳-۴۴)

ان اشعار میں وبار کے لفظ کے متعلق صاحب تحفۃ الالباب لکھتے ہیں کہ یہ صنعار کے قریب کی ایک مسخ شدہ عرب قوم ہے، یہ ارم بن سام برادر عاد و ثمود کی اولاد سے ہیں، اور بحر ہند کے کنارے بلاد شجر یا سحر میں بھی رہتے ہیں۔

شعراء کے علاوہ ادیبوں کے ہاں بھی لفظ نسناس نامانوس نہیں، ابو عثمان عمرو بن الجاحظ متوفی ۲۵۵ھ نے اپنی کتاب الحیوان میں انسان ملائکہ اور جن کی مخلوط اولاد کا دلچسپ اور افسانوی ذکر کیا ہے اور لکھا ہے کہ ملکہ سبا بلقیس اور ذوالقرنین اس کی مثالیں ہیں، یہ بھی لکھا ہے کہ جن و انس کے درمیان کبھی کبھی مناکحت واقع ہوتی ہے، اسی بحث میں نسناس کا بھی ذکر ہے کہ یہ مخلوق بھی انسان اور دوسری مخلوقات سے

مرکب ہے چنانچہ جاحظ نے بندروں کی ایک قسم شق کا ذکر کرتے ہوئے لکھا کہ زعموان

[illegible]

مخلوق ہے جو نسناس اور ناس اور شق اور یاجوج و ماجوج سے مرکب ہے (کتاب الحیوان،

جاحظ، مطبوعہ مصر، ص ۸۷)

امام زکریا قزوینی کی کتاب عجائب المخلوقات و غرائب الموجودات مطبوعہ مصر اپنے موضوع پر نہایت دلچسپ کتاب ہے' انہوں نے بھی عربوں میں اسی قسم کے افسانوی مخلوقات کا تفصیل ذکر کیا ہے مثلاً بحری انسان جو بجز اپنی دم کے مکمل انسانی شکل و ساخت رکھتا ہے' انہوں نے ایک روایت نقل کی ہے کہ بحر شام میں سمندر سے اس قسم کا انسان اکثر ظاہر ہوتا تھا، لوگوں نے اس کو شیخ البحر کا نام دیا تھا، اسی طرح ایک اور بحری انسان ایک بادشاہ کے پاس لایا گیا جس نے اس کی شادی ایک عورت سے کر دی، جو بچہ پیدا ہوا وہ ان دونوں کی زبان سمجھتا تھا، ایک بار اس لڑکے نے اپنے سمندری باپ کی یہ بات نقل کی کہ تمام حیوانات کی دم ان کے حصہ زیریں میں ہوتی ہے لیکن ان انسانوں کی دمیں ان کے چہرے پر ہوتی ہیں' ما بال هولاء اذنانهم على وجوههم' علامہ قزوینی نے ان مخلوقات میں نسناس کا بھی شمار کیا ہے۔

(عجائب المخلوقات' ص ۴۰۳)

نسناس کے متعلق کہا گیا کہ حدیث شریف میں بھی ان کا ذکر آیا ہے کہ یہ عاد کا ایک قبیلہ تھا جس نے اپنے رسول کی نافرمانی کی تو اللہ تعالیٰ نے ان کو مسخ کر کے نسناس بنا دیا، لیکن تلاش بسیار کے بعد بھی صحاح ستہ، مسند احمد بن حنبل' موطا امام مالک اور مسند دارمی میں یہ حدیث نہیں ملی' النہایہ فی غریب الحدیث والاثر میں اس کا ذکر ہے لیکن بغیر کسی سند کے۔ البتہ اسی النہایہ میں حضرت ابوہریرہؓ کا یہ قول موجود ہے کہ ذهب الناس وبقي النسناس لیکن یہی قول ابونعیم اصبہانی کی حلیۃ الاولیاء میں حضرت عبداللہ ابن عباسؓ سے منسوب ہے کہ ذهب الناس

[illegible]

بنا انسان نہیں رہے نسناس رہ گئے، پوچھا گیا کہ نسناس کون؟ فرمایا وہ جو انسانوں سے مشابہت رکھتے ہیں لیکن انسان نہیں ہوتے۔

فقہاء نے اسی بنیاد پر فیصلہ کیا ہے کہ یہ قوم اب معدوم ہے، کیونکہ مسخ شدہ قوم تین دنوں سے زیادہ زندہ نہیں رہ سکتی، لیکن اگر یہ سمندری مخلوق ہے تو رویانی وغیرہ نے اس کے گوشت کی حلت کا حکم دیا لیکن ابو حامد اسفرائنی کا قول ہے کہ اس کا گوشت انسان کے لیے جائز نہیں کیونکہ بہر حال وہ بنی آدم کی خلقت کے مشابہ ہے۔ یہی قول مشہور شافعی فقیہ قاضی ابو الطیب طبری کا ہے۔ (حیاۃ الحیوان' دمیری' ص، ۹۴)

لیکن اس دلچسپ بحث میں قول فیصل یہی معلوم ہوتا ہے کہ نسناس کے اصل معنی وہی مراد لیے جائیں جن کا ذکر صاحب تاج العروس نے کیا ہے کہ وقیل النسناس السفلۃ والاراذل یعنی نسناس کمینہ فطرت اور رذیل کے معنی میں ہے اور عربوں میں اس کا ذکر اگر شایع وذایع رہا تو اسی معنی میں' ذھب الناس وبقی النسناس بھی اس معنی میں ایک مثل کی حیثیت رکھتی ہے، چنانچہ اس کی تائید ہم کو مجمع الامثال سے ملی، جس میں علامہ میدانی متوفی ۵۱۸ھ نے امثال عرب میں اس ضرب المثل کو نقل کیا (ج ۱ ص ۱۹۳)

باقی عاد وثمود سے اس کے تعلق کی روایات کے متعلق یہی کہا جا سکتا ہے کہ یہ حقیقت ہے کہ عرب جس طرح ہر نادر تعمیر کی نسبت حضرت سلیمانؑ سے کرتے تھے اسی طرح ہر قدیم کو عاد سے منسوب کیے جانے کی بھی ان کی عادت تھی، جیسا کہ ابو محمد بن داؤد ہمدانی متوفی [illegible]ھ نے اکلیل میں لکھا ہے کہ العرب ینسبون کل مستطرف من البناء الی سلیمان بن داؤد علیہ السلام کما ینسبون کل قدیم الیٰ عاد (ج ۸، ص ۱۳۵)

معارف کی ڈاک

مکتوب لاہور

۱۱ر اکتوبر ۱۹۹۶ء

مکرمی و محترمی جناب اصلاحی صاحب !

السلام علیکم و رحمۃ اللہ مزاج شریف

گرامی نامہ نے سرفراز کیا، اسی کے ساتھ ستمبر کا شمارہ ملا۔ معارف ہر ماہ باقاعدگی سے ملتا رہتا ہے، اس کے لیے شکریہ قبول فرمائیں۔

شاہی صاحب کے مضمون میں ایک سطر لکھنی بھول گیا تھا وہ یہ ہے کہ "آپ کی نسل کے افراد شیخ قانون گو کہلاتے ہیں اور تقریباً سب ملازمت پیشہ ہیں اور آج کل بھی معزز مناصب پر فائز رہیں"

ترکوں سے متعلق یہ خبر بھی ہمارے لیے ایک المیہ سے کم نہیں کہ اب ترک اسلامیت سے برگشتہ ہو کر سیکولرازم (لادینیت) کے راستے پر گامزن ہیں۔ اس کے برعکس مسلمانان پاکستان و بھارت اسلام سے رشتے کی بنا پر ترکوں کی محبت و ہمدردی سے سرشار رہے ہیں۔ گذشتہ صدی میں جنگ ہائے روس و شام، یونان و روم کے مواقع پر ہماری تمام تر ہمدردیاں ترکوں سے رہی ہیں۔ ہماری مسجدوں میں نمازوں کے بعد ترک افواج کی فتح مندی کے لیے دعائیں مانگی جاتی ہیں۔

تحریک خلافت، خلافت عثمانیہ کی بحالی اور ترکوں کی آزادی کے لیے تھی۔ اس کے لیے

ہمارے علماء و صلحاء و سیاسی زعماء و قومی کارکنوں نے مال و جان کی قربانیاں دیں، قید و بند کی مصیبتیں اٹھائیں، جائیدادیں ضبط کرائیں اور ملازمتوں سے محروم ہوئے، پھر بھی وہ ترکوں سے محبت اور ہمدردی سے دستکش نہ ہوئے۔ اب ہمارے لیے یہ خبریں اندوہناک اور افسوسناک ہیں کہ ترکوں نے عالم اسلام کو نظر انداز کر دیا ہے یورپ کی طرف منھ کر لیا ہے اور سیکولرازم (لادینیت) کو اپنا لیا ہے۔

اب تازہ خبر یہ ہے کہ موجودہ ترک حکومت دینی مدارس کو بند کر رہی ہے۔ اِنا لِلّٰہِ الخ .... دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ترکوں کو صراط مستقیم پر چلنے کی ہدایت دے اور انہیں اسلام اور عالم اسلام کے ساتھ دوبارہ رشتہ جوڑنے کی توفیق عطا فرمائے۔

تاریخ التراث العربی (تاریخ و ثقافت) کا ترجمہ چھپ رہا ہے اس کی ایک جلد جلد ہی آپ کے ملاحظہ کے لیے بھیجوں گا۔ نیاز مند : شیخ نذیر حسین

مکتوب لکھنؤ

۶/ اکتوبر ۹۷ء

مکرمی و محترمی! سلام مسنون

ستمبر کے معارف میں کتابوں کی ناجائز طباعت پر جس انداز سے تشویش کا اظہار کیا اس سے اندازہ ہوا کہ آگے کی سطروں میں کوئی تحریک یا مسئلہ کا حل تجویز فرمائیں گے اس لیے کہ یہ مستقل کاروبار ہے جس نے مصنفین اور بعض ناشروں کو سخت اذیت اور مالی نقصان سے دوچار کر رکھا ہے یہ صرف اردو مصنفین کے ساتھ نہیں دوسری زبانوں کے ساتھ بھی ہو رہا ہے مسئلہ یہ ہے کہ قانونی مشکلات اس راہ میں حائل ہیں جس نے لوگوں کو جری کر دیا ہے، ڈیڑھ دو سو روپے کی کتاب ۵۰ میں بکنے لگے۔ ۵۰ کی کتاب ۲۰ میں بکنے لگے اس میں دیندار کتب فروش سب سے زیادہ جری ہیں ایسے لوگ دہلی۔ دیوبند اور لکھنؤ میں زیادہ جری ہیں تحقیق کرکے انکی فہرست شایع کرنا چاہیے اور مستقل مہم چلانی ہے ورنہ یہ کینسر یونہی پھیلا رہے گا۔ والسلام : احقر اشتیاق

ادبیات

غزل

از ڈاکٹر ابرار اعظمی

مری متاعِ نظر، میری منتہائے نظر
ترا تصور عالی، تری علائے ن

مرا فریب نظر تھا کہ نقطہائے نظر
قدم قدم پہ ملے مجھ کو نقشِ پائے ن

نظر جھکی تو تری دید کا نظارہ تھا
نظر اٹھی تو ہر اک سمت آشنائے ن

نظر بس ایک ہی کافی ہے گر ہو اہلِ نظر
نظر، نظر نہیں گر ہو اعادہ ہائے ن

یہ تیری تشنہ لبی ہے مآلِ کم نظری
بھرے ہیں ساغر و مینا، ہمارو ائے ن

یہ بزم کون و مکاں اور تیری جلوہ گری
سلیقہ شرط، یہی کچھ ہے مدعائے ن

یہ میرا حسن نظر ہے کہ تو ہے جلوہ فگن
کہ صرف پر تو نیکوں ہے یا صدائے ن

میں نہیں مرادیں ہے تری نظر کا اسیر
تو ہی بتا یہ سزا ہے کہ جزائے نظ

غزل

از جناب وارث ریاضی صاحب، چمپارن

جگن ناتھ آزاد کی ایک غزل سے متاثر ہو کر جو اسی زمین ہے۔

مری آنکھوں سے اشکِ غم کی طغیانی نہیں جاتی
کسی صورت جنوں کی حشر سامانی نہیں جا

خدا جانے یہ بزمِ غم ہے یا گہوارۂ جنت ؟
حقیقت گلشنِ ہستی کی پہچانی نہیں جاتی

خوشی کے دن بہ آسانی گزر جاتے ہیں دنیا میں
مگر کوئی مصیبت بھی بہ آسانی نہیں جا

دہاں سے بڑھ کے کوئی ایک ہی پل میں چلا آیا
جہاں پروازِ فکرِ نوعِ انسانی نہیں جاتی

زمیں بدلی فلک بدلا، ہزاروں انقلاب آئے
نہ جانے کیوں تری خوئے ستم رانی نہیں جاتی

الٰہی! گلشنِ کون و مکاں کو جاوداں کر دے — "دلوں سے آرزوئے عالمِ فانی نہیں جاتی"[1]

تری چشمِ کرم کی آس ہے کچھ اس طرح یارب! — مرے دل سے متاعِ ذوقِ عصیانی نہیں جاتی

ہے مغرب سے تو نے جامۂ احرام کو بیچا — مگر اے شیخ! تیری پاک دامانی نہیں جاتی

مری جاں! داستانِ دردِ دل کہنے سے کیا حاصل — کہ دل کی بات محفل میں تری مانی نہیں جاتی

رہے جو مدتوں ہمراہ ممنونِ کرم بن کر!! — انہیں سے اب مری آواز پہچانی نہیں جاتی

وہی امراض ہو جاتے ہیں یکسر لا دوا اکثر — طبیبوں سے علامت جن کی پہچانی نہیں جاتی

خرد کی حکمرانی ہر طرف دنیا میں ہے وارثؔ
مگر مجھ سے مری طفلی کی نادانی نہیں جاتی

بہ یاد صباح الدین عبدالرحمٰن مرحوم

از ڈاکٹر محمد حسین فطرت بھٹکلی۔

وہ شہسوارِ قلم وہ مورخ اعظم — گہر فروش وچمن در بغل تھا جس کا قلم

قلم نے جس کے "معارف" کو لالہ زار کیا — ہر ایک صفحۂ زریں کو مشک بار کیا

عجب تھی ندرتِ تحریر کی فسوں کاری — ہے یاد خامۂ معجز نما کی گل باری

وہ تیری جدتِ تحریر یاد آتی ہے — تری وہ شوخیٔ تحریر یاد آتی ہے

ترے بیان میں اخلاص کی حرارت تھی — گداز و سوز کا معدن تری طبیعت تھی

مری زبان پہ رہتی ہے مغفرت کی دعا — عطا کرے تجھے جنت خدائے ارض و سما

ترا تصورِ رنگیں متاعِ فطرتؔ ہے — عجیب چیز گداز و خلش کی نعمت ہے

---

[1] پروفیسر جگن ناتھ آزاد کی غزل کا مصرع۔

مطبوعات جدیدہ

ہجرہ ان اسلام

(HIJRAH IN ISLAM) از ڈاکٹر ظفر الاسلام خاں، متوسط تقطیع، بہترین کاغذ و طباعت، صفحات ۲۰۰، قیمت درج نہیں، پتہ: PHAROS MEDIA AND PUBLISHING (P) LTD، ڈی۔۸۴، ابوالفضل انکلیو۔۱، جامعہ نگر، نئی دہلی ۱۱۰۰۲۵۔

گو ترک وطن اور مہاجرت کے نقوش انسانی تاریخ میں زمانہ قدیم سے ملتے ہیں، لیکن تاریخ اسلام میں ہجرت ایک مہتم بالشان واقعہ ہے، جس کے مذہبی اور سماجی دونوں لحاظ سے دوررس اثرات مرتب ہوئے، یہ شریعت میں ہجرت اوصاف اور ہجرت اوطان سے عبارت ہے، ان میں اول الذکر ہی اصل ہجرت ہے یعنی ممنوعات و منہیات کا ترک اور اوامر کی بجا آوری۔ رہی ہجرت اوطان یعنی اپنے ملک و وطن کو خیرباد کہہ کر کسی اور علاقے میں توطن اور بود و باش تو اس کی کئی قسمیں ہیں جن کی تفصیل قرآن و حدیث اور فقہ و تاریخ میں جابجا موجود ہے، لائق مصنف نے ان کو مدنظر رکھ کر یہ کتاب بڑی محنت اور سلیقے سے مرتب کی ہے، یہ دراصل فاضل مولف کا وہ تحقیقی مقالہ ہے جس پر مانچسٹر یونیورسٹی نے ان کو ڈاکٹریٹ کی سند تفویض کی ہے، وہ اردو عربی اور انگریزی کے معروف اہل قلم ہیں، جن کا مطالعہ وسیع اور نظر عمیق ہے، کتاب پانچ ابواب پر مشتمل ہے، اس کے لغوی و اصطلاحی مفہوم اور قرآن و حدیث و فقہ میں اس کے ذکر و حکم کو اس طرح بیان کیا گیا ہے کہ متقدمین و متوسطین اور عہد آخر کے مفسرین و فقہاء و علماء کے آراء

وافکار کا عطر و خلاصہ آگیا ہے اور ہر باب کے آخر میں اس کا نچوڑ پیش کیا گیا ہے، ہجرت کے وجوب و استحباب اور منسوخ ہونے کے متعلق جمہور اہل سنت کی ترجمانی میں مسالک و ممالک کے اختلاف فکر و نظر کے باوجود ان کا قلم جادۂ اعتدال سے نہیں ہٹا، مثلاً پہلے باب میں قریباً ۶۶ مفسرین کی تشریحات کو بیان کرنے کے بعد انھوں نے صرف یہ کہا کہ اکثر مفسرین کے تصور ہجرت میں یہ پہلو ہی مشترک ہے کہ ایک مسلمان کو ایسی جگہ نہیں رہنا چاہیے جو موجب ابتلاء و فتنہ ہے جہاں جسمانی ضرر کا یقین ہو، فقہاء کے باب میں نسبتاً زیادہ بسیط بحث کا بھی یہی خلاصہ انھوں نے بے کم و کاست بیان کر دیا، پانچواں باب خاص طور پر قابل ذکر ہے، جس میں ہجرت کے انقلابی تصور کا جائزہ لیا گیا ہے اور عہد جدید کے بعض اہم علماء و مصلحین جیسے عبدالقادر جزائری، سید احمد شہید، مہدی سوڈانی اور محمد السنوسی وغیرہ کے تصور ہجرت کو موضوع بنایا گیا ہے، لغات و کتابیات کے ضمیموں کے علاوہ دارالحرب، دارالامن، دارالکفر اور دارالاسلام کے متعلق بھی ایک بڑا مفید حصہ بطور ضمیمہ شامل کیا گیا ہے، چند ایسے چارٹ بھی ہیں جن پر ایک نظر ڈالتے ہی علماء و فقہاء کے خیالات کا اندازہ ہو جاتا ہے، بعض مقامات پر فاضل مصنف نے اپنے خیالات کا اظہار جسارت سے کیا ہے، مثلاً سنہ ۱۹۲۰ء میں ہندوستان کی تحریک ہجرت کے متعلق انھوں نے لکھا کہ یہ ہجرت کے استعمال کی غلط مثال تھی، جہاں قیادت نے عملاً اس سے گریز کیا لیکن عام مسلمانوں کو اس سے ایذا میں مبتلا کر دیا گیا، اور نتیجہ میں قیادت کا اعتبار جاتا رہا، البتہ اس کے لیے مولانا ابوالکلام آزاد کو مطلق ذمہ دار قرار دینا درست نہیں، وہ یقیناً تصور ہجرت کے موید تھے لیکن بعض شروط و قیود کے ساتھ، جن کے متعلق اب واضح ہو چکا ہے کہ ان کا خیال نہیں رکھا گیا، تبلیغی جماعت

کے نظریہ ہجرت کے متعلق انہوں نے لکھا کہ اصل اور اولین مآخذ میں اس کی بنیاد نہیں ملتی ہے،

مولانا امین احسن اصلاحی کو پاکستان کا غیر مقبول عالم، لکھنا بے جا اور غیر ضروری ہے۔

مولانا غلام رسول مہر اور پاکستان اسکیم

از جناب پیر علی محمد شاہ راشدی مرحوم، مرتبہ جناب ڈاکٹر ابو سلمان شاہجہانپوری، متوسط تقطیع

کاغذ اور کتابت و طباعت بہتر، صفحات ۱۰۸، مجلد مع گرد پوش، قیمت درج نہیں، پتہ:

مکتبہ رشیدیہ، قاری منزل، پاکستان چوک، کراچی پاکستان۔

مولانا غلام رسول مہر بلند پایہ صحافی اور کثیر التصانیف تھے، ان کی تصنیفات کی تعداد ستر کے قریب بتائی جاتی ہے، تحقیق و تنقید اور ادب و تاریخ میں دسترس کے علاوہ وہ کامیاب مترجم و شارح بھی تھے، سیرت سید احمد شہید اور غالب و اقبال پر ان کی کتابیں وقیع قرار پائیں، روزنامہ زمیندار اور پھر انقلاب کے ذریعہ انہوں نے برصغیر کے مسلمانوں کے سیاسی شعور کی بیداری اور قیام پاکستان کی سیاست میں سرگرم حصہ لیا، زیر نظر کتاب کے لائق مصنف کے خیال میں پاکستان کے خواب کو شرمندۂ تعبیر کرنے میں مولانا مہر کا ہی دماغ کارفرما تھا، جنھوں نے ایک سیاسی فارمولے کے ذریعہ خیال کو عمل میں منتقل کیا، یہ کتاب دراصل اسی ۱۹۴۰ء کے فارمولے معروف بہ پاکستان اسکیم کی ایک چشم دید تاریخ ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس اسکیم کی تسوید و تبییض میں مولانا مہر اور پیر راشدی دونوں کی مساعی شامل تھیں، بعد میں قرارداد لاہور کے ذریعہ جس پاکستان کا تصور پیش کیا گیا اس کا المیہ یہ ہے کہ اس میں اس پاکستان اسکیم کی اصل روح سے انحراف کیا گیا، پاکستان کی تاریخ کے اس اہم باب کے متعلق یہ کتاب ایک دستاویزی حیثیت رکھتی ہے جس سے بعض مخفی گوشے سامنے آجاتے ہیں، مصنف راشدی مرحوم نے

اپنے ممدوح مولانا مہر سے تعلق کی روداد چند مضامین میں بیان کی تھی، ان تمام تحریروں کو جمع کر کے اور مولانا مہر اور پیر راشدی کے سوانح اور چند ضمیموں اور اضافوں کے ساتھ شایع کر کے فاضل مولف نے تاریخ پاکستان سے دلچسپی رکھنے والوں کے لیے ایک مفید اور کار آمد تحفہ مہیا کر دیا ہے۔

مجھے یاد آنے والے از جناب مولانا محمد ثناء اللہ عمری، متوسط تقطیع، عمدہ کاغذ و کتابت و طباعت، صفحات ۲۲۹، قیمت ۱۰۰ روپے، پتہ: محمد ثناء اللہ عمری، ۲۴/۵۵۳-۲۱، فرنچ پیٹ، مچھلی پٹنم اے۔ پی ۵۲۱۰۰۲۔

مصنف ایک اچھے اہل قلم ہیں، جنوبی ہند کے باشندے ہونے کے باوجود لکھنؤ کی زبان و اسلوب پر انکا ملکہ حیرت انگیز ہے، مولانا دریا بادی کے طرز نگارش کے وہ شیدائی ہیں جس کا اثر ان کی تحریروں میں بڑا خوشگوار ہوتا ہے، شخصیت کا صحیح تجزیہ، اوصاف و محاسن کا بے کم و کاست بیان اور اس پر مستزاد ادبی چاشنی جس میں رعایت لفظی کو خاص دخل ہے، فاضل مولف علمی و مذہبی موضوعات پر داد تحقیق دیتے رہے ہیں، چند ماہ پہلے امثال القرآن پر ان کی ایک مفید علمی کتاب پر ان صفحات میں تبصرہ بھی آچکا ہے اب زیر نظر مجموعۂ مضامین میں انہوں نے علماء و مصلحین، رہنمایان قوم اور اساتذہ و احباب کا خاکہ پیش کیا ہے اور ان پر ماتم کیا ہے۔ ان میں مولانا قاری محمد طیب، مولانا ابو اللیث اصلاحی، مولانا ابو الجلال ندوی، مولانا محمد عمران خاں بھوپالی ندوی، سید صباح الدین عبد الرحمن اور ماہر القادری جیسے مشاہیر کے علاوہ نسبتاً غیر معروف اور بعض گمنام شخصیتیں بھی ہیں جن کے متعلق لکھا گیا ہے کہ عام طور پر ملک کے جن گوشوں کی بابت پڑھے لکھے لوگوں کو بھی سان گمان نہیں وہاں بھی دین حق کے کیسے کیسے خادم ہوئے ہیں، ان کی شخصیت کے خط و خال

میں عظمت بھی ہے اور سامان بصیرت بھی۔ مولانا سید عبدالحئی بخاری کے خاندان کے متعلق لکھا کہ "... اس خاندان کی ایک شاخ مدراس پہنچ گئی یہ خاندان سادات کا تو تھا ہی، بخارا کی نسبت بھی رکھتا تھا، سونے پر سہاگہ سے یار ما ایں دارد و آں نیز ہم"۔ مولانا ابو اللیث اصلاحی کے ذکر میں لکھا کہ" مولانا جماعت کے سب سے کمسن امیر تھے، ۱۹۴۸ء میں امیر بنے تو ان کی عمر ۳۶ برس تھی ... آزاد ہندوستان کے بدلتے اور بگڑتے ہوئے حالات میں انہوں نے اپنی جماعت کا شیرازہ متحد رکھا یہ کام بھی بجائے خود ایک کارنامے سے کم نہیں"۔ مولانا ابو الجلال ندوی کا سراپا بیان کرنے کے بعد یہ جملہ بھی ملاحظہ ہو"۔۔ جلال صرف جزو نام سراپا تمام تر جمال ہی جمال"۔ سید صباح الدین عبدالرحمٰن کے متعلق لکھا کہ "۔۔۔ انہوں نے تاریخ جیسے خشک موضوع کو ادبیت سے ہم آہنگ کیا بالفاظ دیگر تاریخ کو ادبی تعبیر عطا کی"۔ اس سے اور دیگر اور مضامین سے فاضل مولف کی دارالمصنفین سے محبت و تعلق کا بھی اندازہ ہوتا ہے۔

لمیات نظیرک فی نظر

از جناب عنبر بہرائچی، متوسط تقطیع، بہترین کاغذ اور کتابت و طباعت، دیدہ زیب و معنی خیز گرد پوش، مجلد، صفحات ۲۱۲، قیمت ۱۰۰ روپے، پتہ: ایجوکیشنل بک ہاؤس، مسلم یونیورسٹی مارکیٹ، علی گڑھ ۲۰۲۰۰۲ اور ملک کے دوسرے مشہور مکتبے۔

اردو ادب کا ایک بڑا سرمایہ نعتیہ شاعری بھی ہے، ذات نبوی سے عقیدت اور اسوۂ نبوی کی کشش و جاذبیت نے اردو شعراء کو سو سو طرح کے مضمون باندھنے کی سعادت بخشی، زیر نظر مجموعہ بھی اس مبارک سلسلہ کی دلکش کڑی ہے، حفیظ جالندھری کے مشہور شاہنامۂ اسلام کے طرز پر اسے ایک کامیاب نعتیہ رزمیہ سے تعبیر کیا جا سکتا ہے، خود شاعر خوش نوا نے اپنے دیباچہ میں واضح کیا ہے کہ اس طویل نظم کی ظاہری ہیئت میں

گو قصیدہ اور غزل کے عناصر کی آمیزش ہے لیکن اس کے اجزائے ترکیبی کے لیے سنسکرت کے رزمیہ سے مدد لی گئی ہے، انہوں نے رزمیہ کے موضوع پر سیر حاصل بحث کے بعد لکھا کہ ان کے شعری رجحانات و منتخبات میں رزمیہ کو خاص ترجیح حاصل ہے کیونکہ رزمیہ میں مختلف اشیا، واقعات، جذبات و محسوسات کے وسیع اظہار کے مواقع رہتے ہیں، اس سے پہلے ان کا ایک رزمیہ مہابھنشکرمن بھی شایع ہوکر داد و تحسین حاصل کر چکا ہے، اب زیر نظر مجموعہ میں انہوں نے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اعلان نبوت سے فتح مکہ تک کے واقعات کو شعری پیکر میں اتارا ہے، اس مجموعہ کو محض مذہبی کتاب کی حیثیت سے دیکھے جانے کی صفائی پیش کرتے ہوئے انہوں نے لکھا کہ ذات اقدسؐ نے صرف مذہبی اصول ہی عطا نہیں کیے بلکہ حیات انسانی کے لیے ایک مکمل اور ہمہ جہت منشور بھی عطا کیا جس کی اہمیت تاابد برقرار رہے گی، اس پاکیزہ جذبہ نے جو توانائی، سرور اور کیف و وجدان بخشا وہ ہر شعر سے ظاہر ہے، عربی فارسی اور ہندی کے خوبصورت الفاظ کو جس مہارت سے انہوں نے اشعار کی لڑیوں میں پرو دیا ہے اس سے پورے رزمیہ میں نغمگی اور فرحت بخش موسیقی کی فضا چھا گئی ہے، پہلے شعر سے ہی یہ ماحول بنتا نظر آتا ہے :

شام جاں میں بس گئی ہیں موگرے کی ڈالیاں — حد نگاہ تک شمیم بیز سبز وادیاں

آنحضورؐ کی مدینہ تشریف آوری کا ایک منظر ملاحظہ ہو :

نفس نفس عقیدتیں، قدم قدم محبتیں — بہار پوش، جاذب نظر سبھی سجے دھجے
خرام میں خروش ہے ہر ایک دل میں جوش ہے — امڈ پڑے حبیبؐ کل کی سمت جھومتے ہوئے
ہجوم در ہجوم طفل و زن ضعیف و نوجواں — ہیں بے قرار حسن مصطفیٰ کی دید کے لیے
یہی تو ہیں وہ محسن عظیم جن کی چھاؤں میں — تمام اختلاف باہمی دھواں دھواں ہوئے

یہ شعری سوغات شایان شان پذیرائی کے لایق ہے، ظاہری اعتبار سے بھی کتاب حسین و دیدہ زیب ہے، ایسی خوبصورت کتابیں شاذ ہی شایع ہوتی ہیں۔

حدیث دل از جناب سید نورالدین انور بھوپالی، متوسط تقطیع، کاغذ اور کتابت و طباعت مناسب، مجلد مع گرد پوش، صفحات ۲۰۰، قیمت پچاس روپے، پتہ: بھوپال بک ہاؤس، بدھوارہ، بھوپال ایم۔ پی ۴۶۲۰۰۱۔

جناب انور بھوپالی علامہ سیماب اکبرآبادی کے شاگرد ہیں اور دارالاقبال بھوپال کے بزرگ ترین شاعر ان کے کلام میں خیالات کی پختگی، فن پر قدرت اور طرز قدیم کا تتبع صاف نظر آتا ہے، زیر نظر مجموعہ میں نعت و منقبت اور نظمیں بھی ہیں لیکن غالب حصہ غزلوں کا ہے اس کی وجہ خود شاعر کے الفاظ میں شہر غزل بھوپال کی فضا اور پھر شاعر کی افتاد طبع ہے، نعت و غزل کے صرف دو شعر ملاحظہ ہوں ان سے پورے مجموعہ کے رنگ و آہنگ کا قیاس کیا جا سکتا ہے۔

اللہ بچائے نظر کفر سے دل کو ‏ ‏ ‏ پھر جوش میں ہے جذبہ ایمان محمدؐ
تو اپنے منصب عالی سے بھی اے کاش واقف ہو ‏ ‏ ‏ بحسرت جانب اوج ثریا دیکھنے والے

باذوق قارئین کے لیے یہ مجموعہ باعث لطف و مسرت ہے۔

ارمغان حرم، جمال حرم، سوغات رخصتی از جناب مولانا عبدالمعبود نادان بستوی، عمدہ کاغذ و طباعت، قیمت بالترتیب ۵، ۵ اور ۷ روپے، پتہ: سہیل بک ڈپو، سمریاواں بازار، بستی، یوپی۔

نادان بستوی صاحب کی شاعری لطافت و رعنائی اور حرارت ایمانی سے معمور ہے، تینوں مختصر شعری مجموعے دل پر اثر کرتے ہیں، سوغات رخصتی میں دلہنوں کے لیے مفید اور دلنشیں نصیحتیں ہیں۔

ع۔ص۔

جلد ۱۶۰ ماہ شعبان المعظم ۱۴۱۸ھ مطابق ماہ دسمبر ۱۹۹۷ء عدد ۶

فہرست مضامین

شذرات

مسلمانوں کو بابری مسجد کے لیے تڑپتے، بلکتے اور روتے ہوئے ۵ برس گزر گئے لیکن کوئی مقصد بر آری نہیں ہوسکی اسکی بازیابی کے لیے جو تدبیر کی جاتی ہے وہ الٹی ہو جاتی ہے، دوسری جانب بڑا دم خم ہے، تباہ شدہ مسجد کی جگہ پر مندر تعمیر کرنے کی تحریک میں بڑی قوت اور زور پیدا ہوتا جارہا ہے کارسیوکوں کو اعزاز وانعام دینے کے لیے جمع کیا جارہا ہے برابر نئی باتیں اور نئے چرچے سنائی دیتے ہیں اور ہر روز نئے نئے منصوبے بنائے جاتے ہیں، صاف دکھائی دیتا ہے کہ مسجد کی بازیابی کی راہ تو دشوار اور بعید تر ہوتی جارہی ہے مگر مندر کی تعمیر کا راستہ سبک اور ہموار ہوتا جارہا ہے۔ بابری مسجد ڈھانے والے تو روز اول سے علی الاعلان یہ کہہ رہے ہیں کہ مسلمان اب بابری مسجد کا خیال اپنے ذہن و دماغ سے نکال دیں لیکن اب یہی بات ناسازگار حالات دیکھ کر خود بعض سنجیدہ، ذی شعور اور سوجھ بوجھ رکھنے والے مسلمان بھی کہہ رہے ہیں کہ ایک بابری مسجد کے لیے آخر مسلمان کیوں اپنے کو ہلاک و برباد کر رہے ہیں، اسے بھول جائیں اور اس پر صبر کرلیں تاکہ مزید خون خرابہ نہ ہو، جو چیز نہ ملنے والی ہو اس کے پیچھے پڑ کر ملنے والی چیزوں کو بھی گنوا دینا دانائی نہیں ہے، اس لیے مسجد کا خیال چھوڑ دیں، اپنی تعمیر وترقی کے سامان کریں اور اقتصادی و تعلیمی پس ماندگی دور کرنے میں لگ جائیں!

موجودہ حالات میں مجبور و بیکس مسلمانوں کے لیے ظلم و تشدد سے ڈھائی جانے والی مسجد کی تعمیر واقعی ناممکن ہوگئی ہے، اگر یہ مسئلہ اتنا ہی آسان ہوتا اور مسلمانوں کے دست و بازو میں قوت ہوتی تو مسجد مسمار ہی کیوں کی جاتی لیکن ان کی تھوڑی بہت امیدیں ملک کے عدل و انصاف پسند اشخاص، جمہوریت اور سکولر نواز جماعتوں اور ملک کی عدالتوں سے وابستہ تھیں، انہیں خیال تھا کہ فرقہ وارانہ جنون کی لہریں، شرپسندی اور غنڈہ گردی کی یلغاریں گو بہت تیز و تند ہوگئی ہیں لیکن جمہوریت کے شیدائی اور انصاف پسند انکے مقابلے میں سینہ سپر ہوکر حق و صداقت کا بول بالا کریں گے اور عدل و انصاف کا خون نہ ہونے دیں گے، خاص طور سے متحدہ محاذ کی حکومت سے انہیں بڑی توقعات وابستہ تھیں، مگر کچھ تو اس کی واقعی مجبوریوں اور کچھ مصلحت پسندی اور باہمی کشمکش کی وجہ سے بابری مسجد کا معاملہ جوں کا توں ہی رہا اور اس کے چل چلاؤ کا وقت آگیا عدالتوں کی سست رفتاری بھی

نہیں بہت سی گفتنی و ناگفتنی باتیں بھی ہیں جنھوں نے اس کے بارے میں خوش فہمی ختم کردی ہے، مسجد مسمار ہونے کے بعد ہی اس کا معاملہ لبرہن تحقیقاتی کمیشن کو سپرد کیا گیا، مگر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ابھی اس نے اپنے کام کا آغاز ہی نہیں کیا، دوسری طرف مسجد ڈھا دینے والے اپنے "کارنامے" پر فخر کر رہے ہیں، ایسے مایوس کن حالات میں کس کو خیال ہو سکتا ہے کہ وہ دوبارہ بن جائے گی۔

دراصل یہ دو باتیں الگ الگ ہیں اور دونوں کی نوعیتیں بھی جدا جدا ہیں، ایک تو یہ کہ بابری مسجد کی تعمیر نو موجودہ حالات میں مشکل اور دشوار ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ مسلمان اس کا خیال ہی دل میں نہ لائیں اور اسے بالکل بھول جائیں، پہلی بات کے سلسلے میں ان کو اپنی مجبوری اور بے چارگی کا پورا اندازہ ہے، اسی لیے اس کے بارے میں وہ آسمان و زمین سر پر نہیں اٹھائے ہوئے ہیں، وہ صرف یہ کہہ رہے ہیں کہ ہر حال میں اس کے متعلق عدالت کا فیصلہ مانیں گے، رہی دوسری بات تو وہ ان کی حلق کے نیچے نہیں اتر رہی ہے، سنگھ پریوار کی نظریں تو کاشی اور متھرا اور نہ جانے کس کس پر گڑی ہوئی ہیں، جیسا کہ آر۔ ایس۔ ایس کے سربراہ نے حال ہی میں اس کا اعلان بھی کیا ہے، اس لیے ان سے بابری مسجد کو بھلا دینے کا مطالبہ سخت ناروا، نہایت بیجا اور بڑا دل شکن ہے اور یہ حقیقت تو روز روشن سے بھی زیادہ عیاں ہے کہ مساجد کا تحفظ اور شعائر اللہ کا احترام فرض عین ہے، اس میں کوتاہی پر مسلمانوں سے مواخذہ ہوگا، اگر ان کی ذات سے متعلق کوئی مسئلہ ہو تو وہ اسے سو بار معاف کر سکتے اور ہزار بار بھول سکتے ہیں لیکن معابد کی تخریب اور شعائر الٰہی کی توہین کو بھلانا ان کے بس میں نہیں ہے، یہی اسوۂ نبوی بھی ہے، آپؐ نے اپنے ذاتی مخالفوں اور جان کے دشمنوں کو برابر معاف کیا ہے اور قدرت کے باوجود ان سے کوئی انتقام نہیں لیا ہے، لیکن اللہ کے حدود اور شعائر و محارم کے معاملہ میں نہ کوئی رو رعایت کی ہے اور نہ کسی کی سفارش پر کان دھرا ہے۔

یہ صحیح ہے کہ مسلمان بہت سی ضروری اور اہم باتوں سے واقعی غافل اور بے پروا ہو گئے ہیں، ان میں صحیح دینی شعور نہیں رہ گیا ہے، ایمان و عقیدہ میں پختگی اور درستگی ختم ہو گئی ہے، اعمال و اخلاق میں بڑی کجی اور بے راہ روی آگئی ہے، ان کا اتحاد پارہ پارہ اور اختلاف و انتشار بڑھ گیا ہے، نہ اپنی تعلیمی و اقتصادی پس ماندگی

دور کرنے کی فکر ہے اور نہ تعمیر و ترقی کا کوئی لائحہ عمل سامنے ہے لیکن ان سب کی وجہ یہ ہرگز نہیں ہے کہ وہ بابری مسجد کے لیے دیوانے ہوگئے ہیں، بلکہ اس کے سلسلے میں انہوں نے جس صبر و ضبط، ہوش و تمکین اور اعتدال و توازن سے کام لیا ہے اگر وہ بے حسی نہیں ہے تو اس کی ان کو داد ملنی چاہیے جس طرح مسلمانوں کے لیے بابری کو نسیاً منسیاً نہ کرنا ضروری ہے اسی طرح اپنے حالات و معاملات کی اصلاح اور اعتقاد و عمل کی درستگی کرنا بھی ضروری ہے اسی سے وہ نصرت الٰہی کے مستحق ہو سکتے ہیں اور بابری مسجد کی بازیابی کا اصل ہتھیار بھی یہی ہے، وہ ضرور مجبور اور بے بس ہیں لیکن ان کا خداوند مجبور اور بے بس نہیں ہے، اسے حالات کو موافق اور سازگار بنا دینے میں کوئی مانع نہیں ہے۔

اتر پردیش میں اردو کشی کی جو مہم پنڈت گووند ولبھ پنتھ جی اور ان کے جانشین ڈاکٹر سمپورنانند جی نے شروع کی تھی، اس کا اختتام اب بھارتیہ جنتا پارٹی کی حکومت کے دور میں ہوا ہے، جس نے تمام اسکولوں میں درجہ سوم کے سنسکرت کا کورس درجہ چہارم اور پنجم میں پڑھانے اور سب کے لیے لازماً وندے ماترم پڑھنے کا اعلان کیا ہے، تاکہ بزعم خویش وہ اردو کا قصہ ہی ختم کر دے اور مزید ستم یہ کہ وندے ماترم جیسا مشرکانہ گانا پڑھ کر مسلمان اسلام پر قائم نہ رہیں، ایک طرف تو بی۔ جے۔ پی مرکز اور صوبوں میں برسر اقتدار آنے کے لیے اپنی پاکی داماں کی حکایت بیان کر کے مسلمانوں کو بہلانے پھسلانے میں لگی رہتی ہے، دوسری طرف وہ ان کا وجود ہی ختم کرنے کے لیے انکا عقیدہ، مذہب، تہذیب و تمدن اور زبان ہر ہر چیز کو مٹا دینے کے بھی درپے ہے اتر پردیش کی سرکاروں کے اسی مسلم کش اور اردو دشمن رویے کی وجہ سے مسلمانوں کو اپنے نجی اور علحدہ تعلیمی ادارے قائم کرنے کے لیے مجبور ہونا پڑتا ہے لیکن بی۔ جے۔ پی کی حکومت اس میں بھی رخنہ اندازی کر رہی ہے اور ان اداروں کے پانچویں درجہ پاس طلبہ کو چھٹے درجہ میں داخلہ کی سہولت نہیں دے رہی ہے، نجی اسکول قائم کرنے پر مسلمانوں پر علحدگی پسندی کا الزام بھی عائد کیا جاتا ہے لیکن اگر وہ یہ ادارے نہ قائم کریں تو کیا مشرک و مرتد ہو جائیں۔

مقالات

سیرۃ النبیؐ جلد پنجم کے بعض قرآنی مباحث

از ضیاء الدین اصلاحی

(۲)

تفسیر آیات دوسری جلدوں کی طرح اس جلد میں بھی بعض قرآنی آیتوں اور فقروں کی تفسیر و تشریح کی گئی ہے، ایک جگہ سورۂ فاتحہ کی بڑی دل نشین تفسیر کی ہے، پہلے اس سورہ کی اہمیت اس طرح واضح کی ہے کہ نماز کی مختلف حالتوں میں ان کے مطابق جو مختلف دعائیں پڑھی جاتی ہیں ان میں نماز کی اصل دعا وہ ہے جس سے قرآن مجید کا آغاز ہوتا ہے اور جس کو آپؐ نے تمام عمر نماز کی ہر رکعت میں پڑھا ہے اور اس وقت سے آج تک تمام مسلمان پڑھتے آئے ہیں وہ سورۂ فاتحہ ہے جو مقاصد نماز کے ہر پہلو پر حاوی اور محیط ہے، یہ وہ دعا ہے جو خدا نے بندوں کی بولی میں اپنے منھ سے ادا کی ہے، جس کے بغیر ہر نماز ناتمام اور ادھوری رہتی ہے، یہ دعا اسلام کی تعلیمات کا عطر اور خلاصہ ہے، سید صاحب نے پہلے اس کی یہ اجمالی تفسیر کی ہے:

"خدا کی حمد و ستایش ہے، توحید ہے، اعمال کی جزا و سزا کا یقین ہے، عبادت کے مخلصانہ ادا کا اقرار ہے، توفیق و ہدایت کی طلب ہے، اچھوں کی تقلید کی آرزو اور بروں کی پیروی سے بچنے کی تمنا ہے۔" (ص ۹۵)

اس کے بعد مفصل تفسیر اس طرح کی ہے:

"جس وقت اس حمد میں خدا کی پہلی صفت "کل جہانوں کا پروردگار" زبان پر آتی ہے

تو اس کی تمام قدرتیں اور بخششیں جو زمین سے آسمان تک پھیلی ہیں، سب سامنے آجاتی ہیں، جہانوں کی وسعت کے تخیل سے اس کی عظمت اور کبریائی کی وسعت کا تخیل پیدا ہوتا ہے، سارے جہانوں کے ایک ہی پروردگار کے تصور سے کل کائنات ہستی کی برادری کا مفہوم ذہن میں آتا ہے، انسان ہوں کہ حیوان، چرند ہوں کہ پرند، پھر انسانوں میں امیر ہوں یا غریب، مخدوم ہوں یا خادم، بادشاہ ہوں یا گدا، کالے ہوں یا گورے، عرب ہوں یا عجم، کل مخلوقات خلقت کی برادری کی حیثیت سے یکساں معلوم ہوتی ہے، خدا کو "رحمان ورحیم" کہہ کر پکارنے سے اس کی بے انتہا رحمت، بے پایاں شفقت، بے حد و بخشش اور ناقابلِ بیان کیفِ محبت کا سمندر، دل کے کوزے میں موجیں مارنے لگتا ہے "روزِ جزا کے مالک" کا خیال ہم کو اپنے اعمال کی ذمہ داری اور مواخذہ سے باخبر اور خدا کے جلال و جبروت سے مرعوب کر دیتا ہے" ہم تجھ ہی کو پوجتے ہیں" کہہ کر ہم اپنے دل کی زمین سے ہر قسم کے شرک کو بیخ و بن سے اکھاڑ دیتے ہیں۔ "ہم تجھی سے مدد مانگتے ہیں" بول کر ہم تمام دنیاوی سہاروں اور بھروسوں کو ناچیز سمجھتے اور صرف خدا کا سہارا ڈھونڈھتے اور سب سے بے نیاز ہو کر اسی ایک کے نیاز مند بن جاتے ہیں، سب سے آخر ہم اس سیدھی راہ پر چلنے کی توفیق چاہتے ہیں، یہ سیدھی راہ (صراطِ مستقیم) کیا ہے؟ اس کی شریعت کے احکام ہیں۔"

تفسیرِ قرآن کا ایک اصول یہ ہے کہ خود نظائرِ قرآن سے اس کی تفسیر کی جائے کیونکہ جو بات ایک جگہ مجمل و مبہم ہوتی ہے وہ دوسری جگہ مفصل اور واضح ہوتی ہے، تفسیر القرآن بالقرآن کے اسی اصول کے مطابق سید صاحب نے صراطِ مستقیم (احکامِ شریعت) کی وضاحت کے لیے سورۂ انعام کی آیات [۱۵۲-۱۵۴] سے مدد لی ہے جن کے آخر میں یہ کہا گیا ہے کہ:

وَاَنَّ هٰذَا صِرَاطِیْ مُسْتَقِیْمًا فَاتَّبِعُوْهُ (انعام-۶:۱۵۴)	اور بے شبہ یہی ہے میرا سیدھا راستہ (صراط مستقیم) تو تم اسی کی پیروی کرو!

ان آیتوں کی روشنی میں واضح کیا ہے کہ وحی محمدی کی اصطلاح میں صراط مستقیم یہ ہے: شرک نہ کرنا، ماں باپ کے ساتھ نیک سلوک، اولاد کے ساتھ اچھا برتاؤ، ظاہری و باطنی ہر قسم کی برائیوں سے بچنا، معصوم اور بے گناہ جانوں کی عزت کرنا (ناحق قتل نہ کرنا) یتیم کے ساتھ احسان، ناپ تول میں ایمان داری، بلا رو رعایت سچ بولنا اور عہد کا پورا کرنا۔

یہ سب دراصل توراۃ کے احکام عشرہ جن کا ذکر سورۂ بنی اسرائیل میں ہے، شب اسرا میں آپ کو من جانب اللہ مرحمت ہوئے اور جن کا ذکر سید صاحبؒ نے سیرۃ النبی جلد سوم میں معراج کے انعامات و اعلانات کے عنوان سے کیا ہے۔

سید صاحب کے نزدیک یہ وہ صفات عالیہ ہیں جو صراط مستقیم کی مختصر سی ترکیب توصیفی میں پنہاں ہیں اور جو اخلاق کا جوہر اور نیکی کی روح ہیں، جن سے خدا کے وہ خاص بندے متصف تھے جن پر اس کا فضل و انعام ہوا، ان بندگان خاص کی تشریح سورۂ نساء میں خدا نے خود کردی ہے:

وَمَنْ یُّطِعِ اللّٰهَ وَالرَّسُوْلَ	اور جو خدا اور رسول کے حکم پر چلتے ہیں
فَاُولٰٓئِكَ مَعَ الَّذِیْنَ اَنْعَمَ اللّٰهُ	تو وہ ان لوگوں کے ساتھ ہیں، جن پر
عَلَیْهِمْ مِّنَ النَّبِیّٖنَ وَالصِّدِّیْقِیْنَ	خدا کا فضل اور انعام ہوا، یعنی نبی،
وَالشُّهَدَآءِ وَالصّٰلِحِیْنَ وَحَسُنَ اُولٰٓئِكَ رَفِیْقًا۔	صدیق، شہید اور صالح لوگ، ان کی
(نساء-۴:۶۹)	رفاقت کیسی اچھی ہے۔

"سیدھی راہ سے ہٹنا" کے متعلق بتاتے ہیں کہ یہ دو طرح سے ہوتا ہے (۱) افراط (زیادتی)

(۲) تفریط (کمی) کے سبب سے۔ افراط یہ ہے کہ خدا کی شریعت میں ہم اپنی طرف سے بدعتوں کا اضافہ کریں، یہ گمراہی ہے اور تفریط یہ ہے کہ خدا کے احکام پر عمل چھوڑ دیں۔ اس سے خدا کا غضب قوم پر نازل ہوتا ہے اور ہر قسم کا انعام واکرام چھین لیا جاتا ہے، پہلی صورت کی مثال نصاریٰ ہیں جنھوں نے دین میں اپنی طرف سے ہزاروں باتیں اضافہ کردیں، دوسری کا نمونہ یہود ہیں جنھوں نے احکامِ الٰہی کو پسِ پشت ڈال دیا اور ہر قسم کے انعام واکرام سے محروم ہوگئے، مسلمانوں کی دعا یہ ہے کہ ہم کو ان دونوں غلط راستوں سے بچانا اور اعتدال کی شاہراہ پر قائم رکھنا۔" (سیرۃ النبی جلد ۵، ص ۱۰۲)

مصارف زکوٰۃ سورۂ توبہ میں زکوٰۃ کے مصارف کی تعیین وتحدید کی گئی ہے، اس کی حکمت اور بعض دوسرے پہلوؤں کی وضاحت کرنے کے بعد سید صاحب نے ان ہشت گانہ مصارف کی تفسیر وتشریح کی ہے جو سیرت کی اس جلد میں ملاحظہ کی جاسکتی ہے، ہم چند مصارف کی تشریح پیش کرتے ہیں جس کا تعلق تفسیر قرآن سے ہے۔

فقراء ومساکین: میں وہ تمام اہلِ حاجت داخل ہیں جو اپنی محنت وکوشش سے اپنی روزی کمانے کی فرصت نہیں پاتے، جیسے مبلغین، مذہبی معلمین، بالغ طالب العلم جو

لِلْفُقَرَاءِ الَّذِينَ أُحْصِرُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ لَا يَسْتَطِيعُونَ ضَرْبًا فِي الْأَرْضِ (بقرہ ۲ : ۲۷۳)	صدقہ ان فقراء کے لیے ہے جو خدا کی راہ میں گھرے ہوئے ہیں (بغرض معاش وتجارت) سفر کی قدرت نہیں رکھتے۔

میں اسی طرح داخل ہیں جس طرح آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانۂ مبارک میں اصحابِ صفہ داخل تھے اور وہ کم نصیب بھی داخل ہیں جو اپنی پوری محنت اور کوشش کے باوجود اپنی

روزی کا سامان پیدا کرنے سے اب تک قاصر رہے ہیں اور فاقہ کرتے ہیں۔

فی سبیل اللہ: (خدا کی راہ میں) ایک وسیع مفہوم ہے جو ہر قسم کے نیک کاموں کو شامل ہے اور حسب ضرورت کبھی اس سے مذہبی لڑائی یا سفرِ حج یا اور دوسرے نیک کام مراد لیے جا سکتے ہیں، اکثر فقہا نے فِي سَبِيْلِ اللّٰهِ سے مراد صرف جہاد لیا ہے مگر سید صاحب کے نزدیک یہ تحدید صحیح نہیں معلوم ہوتی کیونکہ ابھی آیت گزر چکی ہے:

لِلْفُقَرَاءِ الَّذِيْنَ اُحْصِرُوْا فِي سَبِيْلِ اللّٰهِ (بقرہ ۲۔ ۲۷۳) — صدقہ ان فقرا کے لیے ہے جو خدا کی راہ میں گھرے ہوئے ہیں۔

یہاں فی سبیل اللہ سے بالاتفاق صرف جہاد نہیں بلکہ ہر نیکی اور دینی کام مراد ہے، اکثر فقہا نے یہ بھی کہا ہے کہ زکوٰۃ میں تملیک یعنی کسی شخص کی ذاتی ملکیت بنانا ضروری ہے مگر ان کا استدلال جو لِلْفُقَرَاءِ کے لام تملیک پر مبنی ہے بہت کچھ مشتبہ ہے، ہو سکتا ہے کہ لام انتفاع ہو جیسے:

خَلَقَ لَكُمْ مَا فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا۔ (بقرہ۔ ۲: ۲۹) — اللہ نے تمہارے (فائدے کے) لیے جو کچھ زمین میں ہے سب پیدا کیا۔ (ص ۲۳۶ و ۲۳۷)

آیتوں کا مستفاد و ماحصل | سید صاحب جو آیتیں نقل کرتے ہیں عموماً ان کا مستفاد اور لب لباب اس طرح بیان کرتے ہیں کہ آیات کا مفہوم و منشا اور مدعا پوری طرح واضح ہو جاتا ہے مثلاً روزہ سے متعلق آیتوں کا ماحصل یہ بیان کرتے ہیں:

"ان آیات پاک میں نہ صرف روزہ کے چند احکام بلکہ روزہ کی تاریخ، روزہ کی حقیقت، رمضان کی ماہیت اور روزہ پر اعتراض کا جواب یہ تمام امور مفصل بیان ہوئے ہیں۔" (ص ۲۹۳)

آگے چل کر آیات:

شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِي أُنْزِلَ فِيهِ الْقُرْآنُ (بقرہ-۲:۱۸۵) | وہ رمضان کا مہینہ جس میں قرآن اتارا گیا۔

إِنَّا أَنْزَلْنَاهُ فِي لَيْلَةٍ مُبَارَكَةٍ۔ (دخان-۴۴:۳) | ہم نے قرآن کو ایک برکت والی رات میں اتارا۔

إِنَّا أَنْزَلْنَاهُ فِي لَيْلَةِ الْقَدْرِ (قدر-۹۷:۱) ہم نے قرآن کو شب قدر میں اتارا۔

کو نقل کرکے ان کا استفادہ یہ بتایا ہے کہ رمضان وہ مقدس مہینہ ہے جس میں قرآن سب سے پہلی بار دنیا میں نازل ہوا۔ (ص ۲۹۱)

روزہ ہی سے متعلق یہ آیت بھی نقل کی ہے:

يُرِيدُ اللَّهُ بِكُمُ الْيُسْرَ وَلَا يُرِيدُ بِكُمُ الْعُسْرَ (بقرہ-۲:۱۸۵) | خدا تمہارے ساتھ نرمی چاہتا ہے سختی نہیں چاہتا۔

اس کے ضمن میں اسلام کے اس عام قانون:

لَا يُكَلِّفُ اللَّهُ نَفْسًا إِلَّا وُسْعَهَا۔ (بقرہ-۲:۲۸۶) | خدا کسی جان کو اس کی طاقت سے زیادہ تکلیف نہیں دیتا۔

اور قرآن کے مبلغؐ کی یہ توصیف:

يَأْمُرُهُمْ بِالْمَعْرُوفِ وَيَنْهَاهُمْ عَنِ الْمُنْكَرِ وَيُحِلُّ لَهُمُ الطَّيِّبَاتِ وَيُحَرِّمُ عَلَيْهِمُ الْخَبَائِثَ وَيَضَعُ عَنْهُمْ إِصْرَهُمْ وَالْأَغْلَالَ الَّتِي | وہ ان کو نیکیوں کا حکم دیتا ہے برائیوں سے روکتا ہے اور گندہ چیزوں کو حرام کرتا ہے اور اس طوق اور زنجیروں کو جو ان کے اوپر پڑی ہیں، ان سے اتارتا ہے

كَانَتْ عَلَيْهِمْ (اعراف ۷: ۱۵۷)

نقل کرکے ارشاد فرماتے ہیں :

"ان امور کا منشا یہ ہے کہ اسلامی عبادات و احکام میں کوئی چیز بھی اس غرض سے نہیں رکھی گئی کہ اس سے انسان کی جان کو دکھ پہنچایا جائے، روزہ بھی اسی سلسلہ میں داخل ہے اور اسی لیے اسلام نے روزہ کی ان سختیوں کو جو لوگوں نے بڑھا رکھی تھیں بتدریج کم کر دیا"

(ج ۵ ص ۲۱۳)

حج و شعائر حج سے متعلق یہ آیتیں تحریر کی گئی ہیں :

وَمَنْ يُعَظِّمْ حُرُمٰتِ اللّٰهِ فَهُوَ خَيْرٌ لَّهٗ عِنْدَ رَبِّهٖ ۔ (حج ۲۲ - ۳۰)	اور جو اللہ کی محترم چیزوں کا ادب کرے تو وہ اس کے پروردگار کے نزدیک بہتر ہے ۔
إِنَّ الصَّفَا وَالْمَرْوَةَ مِنْ شَعَائِرِ اللّٰهِ (بقرہ ۲ : ۱۵۸)	بے شک صفا اور مروہ خدا کا شعار ہے
ذٰلِكَ وَمَنْ يُعَظِّمْ شَعَائِرَ اللّٰهِ فَإِنَّهَا مِنْ تَقْوَى الْقُلُوْبِ (حج ۲۲ : ۳۲)	یہ ہے اور جو اللہ کے شعائر کا ادب کرے تو یہ دلوں کی پرہیزگاری ہے ۔

ان آیتوں سے اس کے نزدیک یہ ظاہر ہوا کہ حج کا ایک بڑا مقصد ان محترم مقامات کا ادب و احترام ہے تاکہ ان مقامات سے جو مقدس روایتیں وابستہ ہیں ان کی یاد قائم رہے اور دلوں میں تاثیر کی کیفیت پیدا کرتا رہے۔ (ج ۵ ص ۲۶۷)

توکل | سید صاحب نے توکل کو ایک قرآنی اصطلاح بتایا ہے، عام لوگ اس کے معنی یہ سمجھتے ہیں کہ کسی کام کے لیے جد و جہد اور کوشش نہ کی جائے بلکہ چپ چاپ ہاتھ پاؤں توڑ کے کسی حجرہ یا

خانقاہ میں بیٹھ رہا جائے اور یہ سمجھا جائے کہ خدا کو جو کچھ کرنا ہے وہ خود کر دیگا یعنی تقدیر میں جو کچھ ہے وہ ہو رہے گا، اسباب اور تدبیر کی ضرورت نہیں لیکن یہ سراسر وہم ہے اور مذہبی اپاہجوں کا دل خوش کن فلسفہ ہے، جس کو اسلام سے ذرہ بھر بھی تعلق نہیں، وہ توکل کے متعلق تمام آیات نقل کر کے ان کا مدعا اس طرح بیان کرتے ہیں :

"توکل کے متعلق قرآن پاک کی جس قدر آیتیں ہیں وہ ایک ایک کر کے آپ کے سامنے ہیں، ہر ایک پر غور کی نظر ڈالیے کہ ان میں سے کوئی بھی ان معنوں میں ہے جن میں ہم اپنی جہالت سے اس کو سمجھتے ہیں، ان میں سے ہر ایک کا مفہوم یہ ہے کہ ہم مشکلات کے ہجوم، موانع کی کثرت اور پرزور مخالفوں کی تدبیروں سے نڈر ہو کر استحکام عزم اور استقلال کے ساتھ اپنے کام میں لگے رہ کر خدا کی مدد سے کام کے حسب خواہ نتیجہ پیدا ہونے کا دل میں یقین رکھیں" (ص ۴۴۶)

استدلال واخذ نتائج | سید صاحب کے یہاں قرآن مجید سے استدلال کے بہت سے دلچسپ اور حقیقت پر مبنی نمونے ملتے ہیں مثلاً وہ فہم و تدبر کی حقیقت یہ بتاتے ہیں کہ جو کچھ پڑھا جائے اس کے سمجھنے کی کوشش کرنی چاہیے، اگر بے پروائی کی وجہ سے معنوں کی طرف دل متوجہ نہ ہوا تو اس سے دل پر کچھ اثر نہ ہوگا، وہ فرماتے ہیں کہ اسی بنا پر نشہ کی حالت میں نماز پڑھنے کی ممانعت کی گئی ہے کیونکہ اس حالت میں سمجھنے والا دل شرابی کے پہلو میں نہیں، چنانچہ فرمایا :

لَا تَقْرَبُوا الصَّلٰوۃَ وَاَنْتُمْ سُکَارٰی	نماز کے قریب نہ جاؤ جب تم نشہ میں ہو۔
حَتّٰی تَعْلَمُوْا مَا تَقُوْلُوْنَ۔	یہاں تک کہ (اتنا ہوش آجائے کہ) جو
(نساء-۴-۴۳)	تم کہو اس کو سمجھو۔

اس آیت پاک سے ثابت کیا ہے کہ نماز میں جو کچھ پڑھا جائے اس کے سمجھنے کی بھی ضرورت ہے۔

اسی بنا پر آپؐ نے نیند کے غلبہ کی حالت میں نماز پڑھنے کی ممانعت فرمائی کہ اس میں بھی انسان فہم وتدبر سے عاری ہو جاتا ہے۔ (ص۱۶۶)

چند اور آیات ملاحظہ ہوں:

اَلَّذِیْنَ هُمْ عَلٰی صَلَاتِهِمْ دَائِمُوْنَ	جو اپنی نماز ہمیشہ ادا کرتے ہیں اور جن کے
وَالَّذِیْنَ فِیْ اَمْوَالِهِمْ حَقٌّ مَّعْلُوْمٌ	مالوں میں مانگنے اور محروم کا معلوم حصہ
لِلسَّائِلِ وَالْمَحْرُوْمِ (معارج ۷۰: ۲۳-۲۵)	ہے۔

اس آیت سے ثابت کرتے ہیں کہ مسلمانوں کی دولت میں غریبوں کا جو حصہ ہے وہ متعین، مقرر، معلوم اور عملاً رائج ہے (ص ۲۱۷ و ۲۱۸)

یَا اَیُّهَا النَّاسُ اعْبُدُوْا رَبَّكُمُ	اے لوگو! اپنے اس پروردگار کی عبادت
الَّذِیْ خَلَقَكُمْ وَالَّذِیْنَ مِنْ	کرو جس نے تم کو اور تم سے پہلوں کو
قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ (بقرہ ۲: ۲۱)	پیدا کیا، تاکہ تم کو تقویٰ حاصل ہو۔

اس آیت سے یہ استنباط کیا ہے کہ عبادت کی غرض وغایت محض حصول تقویٰ ہے (ص۴۸ و ۴۹)

حَافِظُوْا عَلَی الصَّلَوٰتِ (بقرہ ۲: ۲۳۸)	نمازوں کی نگہداشت کرو!

اس سے نتیجہ نکالا ہے کہ "یہ نماز کی ظاہری اور معنوی دونوں حیثیتوں سے نگہداشت کا حکم ہے (ص۶۹)

وَاَقِیْمُوا الصَّلٰوةَ وَلَا تَكُوْنُوْا	اور نماز کو کھڑا رکھو اور مشرکوں میں سے
مِنَ الْمُشْرِكِیْنَ (روم ۳۰: ۳۱)	نہ ہو جاؤ!

اس سے پہلا استدلال یہ کیا ہے کہ توحید وایمان کے بعد سب سے اہم چیز نماز ہے، دوسرا یہ کہ ترک نماز سے کفر وشرک میں گرفتار ہو جانے کا اندیشہ ہے۔ (ص۲۰)

وَأَقِمِ الصَّلٰوةَ إِنَّ الصَّلٰوةَ تَنْهٰى عَنِ الْفَحْشَاءِ وَالْمُنْكَرِ وَلَذِكْرُ اللّٰهِ أَكْبَرُ (عنکبوت۔ ۲۹: ۴۵)

اور نماز کھڑی کیا کر، کہ نماز بے حیائی اور برائی کی باتوں سے روکتی ہے اور البتہ خدا کی یاد سب سے بڑی چیز ہے۔

اس آیت سے نماز کی یہ دو حکمتیں مستنبط کی ہیں ایک تو یہ کہ نماز برائیوں اور بے حیائیوں سے روکتی ہے اور دوسری اس سے بڑھ کر یہ کہ نماز خدا کی یاد ہے۔ (ص۲)

قَدْ أَفْلَحَ مَنْ تَزَكّٰى وَذَكَرَ اسْمَ رَبِّهٖ فَصَلّٰى۔ (اعلیٰ۔ ۸۷: ۱۴ و ۱۵)

کامیاب ہوا وہ جس نے صفائی حاصل کی اور اپنے پروردگار کا نام لیا پس نماز پڑھی۔

سے معلوم ہوا کہ انسان کی فلاح اور پاکیزگی کے حصول کی تدبیر یہ ہے کہ وہ اپنے پروردگار کا نام لے یعنی نماز پڑھے (ص۹)

إِنَّمَا تُنْذِرُ الَّذِينَ يَخْشَوْنَ رَبَّهُمْ بِالْغَيْبِ وَأَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَمَنْ تَزَكّٰى فَإِنَّمَا يَتَزَكّٰى لِنَفْسِهٖ وَإِلَى اللّٰهِ الْمَصِيرُ (فاطر۔ ۳۵: ۱۸)

تو ان ہی کو تو ہوشیار کر سکتا ہے جو بن دیکھے اپنے پروردگار سے ڈرتے ہیں اور نماز کھڑی کیا کرتے ہیں اور جو تزکیہ اور دل کی صفائی حاصل کرتا ہے، وہ اپنے ہی لیے حاصل کرتا ہے اور (آخر) خدا ہی کے پاس لوٹ کر جانا ہے،

سے ظاہر ہوا کہ نماز انسان کو اس کی اخلاقی کمزوریوں سے بچاتی، نفسانی برائیوں سے ہٹاتی اور اس کی روحانی ترقیوں کے درجہ کو بلند کرتی ہے۔ (ص۹)

فَإِذَا قَضَيْتُمُ الصَّلٰوةَ فَاذْكُرُوا اللّٰهَ

پس جب نماز (ایک رکعت) ادا

قِيَامًا وَّقُعُوْدًا وَّعَلٰى جُنُوْبِكُمْ | کر چکو تو اللہ کو اٹھتے، بیٹھتے اور پہلوؤں
فَاِذَا اطْمَاْنَنْتُمْ فَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ | پر یاد کرو، پھر جب اطمینان ہو جائے تو
(نساء ۴: ۱۰۳) | نماز کھڑی کرو!

اس سے سید صاحب یہ استنباط فرماتے ہیں:

"غور کرنے کی دو باتیں ہیں اول یہ کہ ایک رکعت جو باقاعدہ ادا ہوئی اس کو الصلوٰۃ کہا گیا اور دوسری رکعت جو خدا کا نام اٹھ کر، بیٹھ کر، جھک کر، لیٹے اور لڑائی، حملہ اور مدافعت کی حالت میں پوری ہوئی، اس کو صرف ذکر اللہ کہا گیا، دوسری بات یہ ہے کہ جنگ کی اس عارضی مختصر نماز کو اقامت صلوٰۃ کے لفظ سے ادا نہیں کیا گیا، حالانکہ ذکر الٰہی تسبیح و تہلیل اور بعض ارکان بھی اس میں موجود تھے بلکہ یہ فرمایا گیا کہ (پھر جب اطمینان ہو جائے تو نماز کھڑی کرو) اس سے معلوم ہوا کہ اقامت صلوٰۃ کے معنی مطلق ذکر و فکر، تسبیح و تہلیل، حمد و ثنا اور تلاوت قرآن سے جداگانہ ہیں یعنی اقامت صلوٰۃ کے ضمن میں ذکر و فکر، تسبیح و تہلیل، حمد و ثنا اور قرأت کے علاوہ کچھ اور ارکان بھی داخل ہیں جو جنگ کی حالت میں کم یا موقوف ہو گئے تھے اور اب اس عارضی مانع کے دور ہو جانے کے بعد پھر بدستور نماز میں ان کی بجا آوری کا مطالبہ کیا جا رہا ہے" (ص ۹۲)

آگے وہ جملہ ارکان نماز کا ثبوت بھی مختلف آیتوں سے بہم پہنچاتے ہیں۔

وَاتَّقُوْهُ وَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَلَا | اور خدا سے ڈرتے رہو اور نماز کھڑی
تَكُوْنُوْا مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ مِنَ الَّذِيْنَ | رکھو اور مشرکوں میں سے نہ ہو، ان میں
فَرَّقُوْا دِيْنَهُمْ وَكَانُوْا شِيَعًا۔ | سے جنھوں نے اپنے دین میں پھوٹ ڈالی
(روم۔ ۳۰: ۳۱ و ۳۲) | اور بہت سے جتھے ہو گئے۔

اس سے یہ استدلال ہے کہ نماز مسلمانوں میں باہمی الفت و محبت پیدا کرنے کا ذریعہ ہے محلہ کے تمام مسلمانوں کے ایک جگہ دن میں پانچ دفعہ جمع ہونے اور ایک دوسرے سے باہم ملنے سے ان کی بے گانگی دور ہوگی اور ایک دوسرے کی امداد کے لیے ہر وقت تیار رہیں گے، نماز کا اجتماع ان کو جتھابندی اور فرقہ آرائی سے بھی روک سکتا ہے ایک دوسرے سے ملاقات سے غلط فہمیوں کا موقع کم ملے گا۔ (ص۱۸۱)

وَلَآ آٰمِّيْنَ الْبَيْتَ الْحَرَامَ يَبْتَغُوْنَ فَضْلًا مِّنْ رَّبِّهِمْ وَرِضْوَانًا۔ (مائدہ ۵ : ۲)	اور نہ ان کو (ستاؤ) جو اس ادب والے گھر کے قصد سے جا رہے ہوں، اپنے پروردگار کا فضل اور خوشنودی تلاش کرتے ہوئے۔

سے یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ لوگوں کے مال و اسباب کو لوٹنا جائز نہیں (ص۲۸۲)

حج میں تجارت کرنے کو بہتر اور طلب رزق کا جائز ہونا حسب ذیل آیت سے ثابت کیا ہے :-

وَتَزَوَّدُوْا فَاِنَّ خَيْرَ الزَّادِ التَّقْوٰى وَاتَّقُوْنِ يٰٓاُولِي الْاَلْبَابِ لَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ اَنْ تَبْتَغُوْا فَضْلًا مِّنْ رَّبِّكُمْ (بقرہ ۲ : ۱۹۷ و ۱۹۸)	اور راہ کا توشہ (خرچ) لے کر چلو، کہ راستہ کا سب سے اچھا توشہ تقویٰ (بھیک نہ مانگنا) ہے، اور مجھ سے ڈرو اے عقل والو! تم پر گناہ نہیں ہے کہ تم اپنے پروردگار کا فضل تلاش کرتے ہوئے چلو (یعنی بیوپار کرتے ہوئے)

اسی طرح وَاِذْ جَعَلْنَا الْبَيْتَ مَثَابَةً لِّلنَّاسِ الخ (بقرہ ۲ : ۱۲۵) رَبَّنَا وَاجْعَلْنَا

مُسْلِمَيْنِ لَكَ الخ (بقرہ ۲: ۱۲۸) وَاِذْ بَوَّأْنَا لِاِبْرَاهِيمَ الخ (حج ۲۲: ۲۶) وَاِذْ قَالَ اِبْرَاهِيمُ رَبِّ اجْعَلْ هٰذَا الْبَلَدَ اٰمِنًا الخ (ابراہیم ۱۴: ۳۵) کو نقل کرکے چند نتائج اخذ کیے ہیں۔ (ص۱۳)

بعض قرآنی نکات | اوقات صلوٰۃ پر مفصل بحث ہو چکی ہے، اس سلسلہ کی بعض آیتوں میں ظہر اور عصر کی نمازیں مجملاً مذکور ہیں یعنی دونوں کو ایک لفظ قبل الغروب یا اصیل یا طرف النہار لاکر بیان کیا گیا ہے، سورۂ روم کی آیت میں ظہر و عصر کی نمازوں کا نام تصریح کے ساتھ آیا ہے مگر شام کی نمازیں میں اجمال ہے یعنی مغرب و عشا دونوں کو حِيْنَ تُمْسُوْنَ کے ذریعہ سے ادا کر دیا گیا ہے، اس سے سید صاحب یہ نکتہ آرائی فرماتے ہیں:

"یہ دونوں مل کر ایک بھی ہیں اور علیحدہ بھی ہیں، اسی بنا پر کسی اشد ضرورت اور سفر کی بے اطمینانی کے وقت ظہر و عصر کو ایک ساتھ اور مغرب و عشا کو ایک ساتھ ملا کر بھی ادا کر سکتے ہیں اور صبح کی نماز چونکہ ہر آیت میں ہمیشہ علیحدہ ذکر کی گئی ہے اس لیے اس کا کسی دوسری نماز سے ملانا جائز نہیں ہے۔" (ص۱۳۱)

غنیمت کے مال پر جو زکوٰۃ عائد ہوتی ہے وہ خمس ہے جس کا ذکر اس آیت میں ہے:

وَاعْلَمُوْا اَنَّمَا غَنِمْتُمْ مِنْ شَيْءٍ فَاَنَّ	اور جان لو کہ جو کچھ تم کو غنیمت ملے
لِلّٰهِ خُمُسَهٗ وَلِلرَّسُوْلِ وَلِذِي	اس کا پانچواں حصہ خدا کے لیے اور
الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنِ وَ	رسول کے لیے اور قرابت مند کے لیے
ابْنِ السَّبِيْلِ۔	اور یتیموں اور مسکینوں اور مسافر
(انفال ۸: ۴۱)	کے لیے ہے۔

سید صاحب نے اس سے یہ نکتہ سمجھایا ہے:

"جہاد یا دشمنوں سے لڑائی کا اصل مقصد دین کی حمایت اور اعلائے کلمۃ اللہ ہے،

غنیمت کا مال حاصل کرنا نہیں اور اگر کوئی اس نیت سے دشمن سے لڑے تو اس کی یہ لڑائی اس کی نگاہ میں جہاد نہ ہوگی اور نہ اس کا ثواب ملے گا، اس کی طرف خود قرآن مجید میں اشارہ موجود ہے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی متعدد حدیثوں میں اس کی تشریح فرمادی ہے، اس بنا پر درحقیقت وہ مالِ غنیمت جو لڑائی میں دشمنوں سے ہاتھ آتا ہے ایک ایسا سرمایہ ہے جو بلا قصد اور بلا محنت اتفاقاً مسلمانوں کو مل جاتا ہے، اس سے یہ نکتہ حل ہوتا ہے کہ جو سرمایا کسی محنت کے بغیر اتفاقاً ہاتھ آئے، اس میں پانچواں حصہ نظامِ جماعت کا حق ہے یا حکومت کے مقررہ بالا مصارف کے لیے ہے" (ج ۵ ص ۲۱۹)

آگے بتایا ہے کہ رکاز (دفینہ) میں بھی خمس جماعت کے بیت المال کا حق تسلیم کیا گیا ہے۔

سورۂ رعد میں صابرین کو فرشتوں کی اس مبارک باد کا ذکر ہے:

سَلٰمٌ عَلَیۡکُمۡ بِمَا صَبَرۡتُمۡ — تم پر سلامتی ہو کیونکہ تم نے صبر کیا تھا،
فَنِعۡمَ عُقۡبَی الدَّارِ (رعد-۱۳: ۲۴) — تو آخرت کا انجام کیا اچھا ہوا۔

اس میں اس بات کو خیال کرنے کے لائق بتایا ہے:

"اس کے شروع میں چند نیکیوں کا ذکر ہے، صبر، نماز، خیرات، برائی کی جگہ بھلائی مگر فرشتوں نے اس میں مومن کے جس خاص وصف پر اس کو سلامتی کی دعا دی، وہ صرف صبر یعنی برداشت کی صفت ہے، کیونکہ یہی اصل ہے، جس میں یہ جوہر ہوگا وہ عبادات کی تکلیف بھی اٹھائے گا، مصیبتوں کو بھی جھیلے گا اور دشمنوں کی بدی کا جواب نیکی سے بھی دے گا، ایک اور روایت میں ہے کہ درگزر اور بدی کے بدلہ نیکی کی صفت اس میں ہوگی جس میں صبر ہوگا"

وَلَا تَسۡتَوِی الۡحَسَنَۃُ وَلَا السَّیِّئَۃُ — بھلائی اور برائی برابر نہیں، برائی کا

اِدْفَعْ بِالَّتِیْ هِیَ اَحْسَنُ فَاِذَا الَّذِیْ	جواب اچھائی سے دو، تو یک بارگی جس کے
بَیْنَكَ وَبَیْنَهٗ عَدَاوَةٌ كَاَنَّهٗ	اور تمہارے درمیان دشمنی ہے، وہ قریبی
وَلِیٌّ حَمِیْمٌ وَمَا یُلَقّٰهَاۤ اِلَّا الَّذِیْنَ	دوست سا ہو جائے گا اور یہ بات اسی کو
صَبَرُوْا وَمَا یُلَقّٰهَاۤ اِلَّا ذُوْ حَظٍّ	ملتی ہے جو بڑی قسمت والا ہے۔
عَظِیْمٍ۔	

(فصلت۔۴۱: ۳۴و۳۵)

حمد کی حقیقت ومفہوم بیان کرکے اس نکتہ کی نشاندہی کی ہے "جس طرح سارے قرآن کا نچوڑ سورۂ فاتحہ ہے، سورۂ فاتحہ کا نچوڑ خدا کی حمد ہے، اسی بنا پر قرآن کا آغاز سورۂ فاتحہ سے اور سورۂ فاتحہ کا آغاز الحمد سے ہے"۔ (صفحہ ۳۸)

قرآن پاک کی مختلف آیتوں میں مختلف نعمتوں کے ذکر کے بعد شکر الٰہی کا مطالبہ کیا گیا ہے، اس لیے سید صاحب فرماتے ہیں کہ ہر آیت میں شکر کے ادا کرنے کی نوعیت اسی نعمت کے مناسب ہوگی۔ مثلاً:

تَبٰرَكَ الَّذِیْ جَعَلَ فِی السَّمَآءِ	بڑی برکت اس کی ہے جس نے آسمان
بُرُوْجًا وَّجَعَلَ فِیْهَا سِرٰجًا وَّ	میں برج بنائے اور اس میں ایک چراغ
قَمَرًا مُّنِیْرًا وَهُوَ الَّذِیْ جَعَلَ	اور اجالا کرنے والا چاند رکھا اور اسی نے
الَّیْلَ وَالنَّهَارَ خِلْفَةً لِّمَنْ اَرَادَ	رات اور دن بنایا کہ ایک کے بعد ایک
اَنْ یَّذَّكَّرَ اَوْ اَرَادَ شُكُوْرًا۔	آتا ہے، اس کے واسطے جو دھیان رکھنا
(فرقان۔۲۵: ۶۱و۶۲)	یا شکر کرنا چاہے۔

میں اپنی نعمتوں کا ذکر کرکے شکر کی ہدایت کی ہے، یہ شکر اسی طرح ادا ہو سکتا ہے کہ

اس قدرت والے کی قدرت تسلیم کریں اور دن کی روشنی اور چاند کے اجالے اور رات کے سکون میں ہم وہ فرض ادا کریں جس کے لیے یہ چیزیں ہم کو بنا کر دی گئی ہیں۔ اسی طرح بعض اور آیتیں نقل کرکے ان نکات کو واضح کیا ہے (ص ۳۹۲ و مابعد)

قرآن پاک میں مالی جہاد کی تنبیہ و تاکید بکثرت ہے، اس سلسلہ میں سید صاحب نے مثالوں سے یہ نکتہ بیان کیا ہے کہ ہر ایک موقع پر جان کے جہاد پر مال کے جہاد کو تقدم بخشا گیا ہے۔ (ص ۴۰۵)

سیرۃ کی اس جلد میں تفسیر الآیات بالآیات اور نظائر قرآن سے آیات کی وضاحت کی مثالیں اوپر کی بحثوں میں گزر چکی ہیں، کہیں کہیں احادیث و روایات سے بھی آیات کی تفسیر کی گئی ہے، قرآن مجید کے بیان کی تصدیق و تائید کتب مقدسہ سے بھی کرتے ہیں، آیتوں کا شان نزول، ان کے اور سورتوں کے مکی و مدنی ہونے کی تصریح کرتے ہیں، فقہی احکام و مسائل پر بحث و گفتگو بھی کی گئی ہے۔ قرآنی الفاظ و لغات کی تحقیق، نحوی بحثیں، کلام کی لطافت و بلاغت اور طرز ادا کی خوبیاں بھی جا بجا بیان کی گئی ہیں اور مفسرین کے بعض تفسیری اقوال و اختلافات کی حکایت بھی کی گئی ہے۔

مکی مواخات ــ اسلامی معاشرہ کی اولین تنظیم

از ڈاکٹر محمد یٰسین مظہر صدیقی ندوی

مدنی مواخات کو اسلام میں معاشرتی تنظیم کا آغاز خیال کیا جاتا ہے جو رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ہجرت مدینہ کے بعد ۱ھ/۶۲۳ء کے آغاز میں مہاجرین و انصار کے درمیان استوار فرمائی تھی۔ یہ خیال اتنا پختہ اور دل نشیں ہوگیا ہے کہ مکہ مکرمہ میں اس کی تنظیم و تشکیل کا کوئی تصور کرنا بھی مشکل ہوگیا ہے، عوام تو درکنار علما و محققین بھی اس کے صحیح ادراک سے قاصر ہیں۔ اسی بنا پر مکی اسلام و مدنی اسلام کی تفریق بھی کی جاتی ہے[1]

حقیقت یہ ہے کہ مکہ مکرمہ کے تیرہ سالہ دور (۶۱۰-۶۲۲ء) میں اسلامی تہذیب و تمدن کا صحیح تو درکنار عمومی تجزیہ بھی نہیں کیا گیا۔ اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ لوگ روایتی طرز نگارش کے اسیر ہیں بلکہ یہ کہنا بھی نامناسب نہ ہوگا کہ مکھی پر مکھی مارنے کے عادی ہیں۔ مصادر و مآخذ میں جو مواد جس انداز میں ملتا ہے اس کو اسی انداز میں پیش کر دیتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ تمام کتب سیرت و تاریخ تقریباً ایک جیسی ہوتی ہیں[2] مواد کی کمی نہیں، صرف ان کے تحلیل و تجزیہ کی ضرورت ہے اور ان کو نئے اور حقیقی انداز میں پیش کرنے کی حاجت ہے۔

یہ بڑا اہم مسئلہ ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے مکی دور میں مسلمانوں کو منظم و مرتب کیا یا ان کی تنظیم کے معاملہ کو تیرہ سال تک کے لیے موخر رکھا؟ عام تصور کے برخلاف تاریخی شواہد اور کتب سیرت میں درج حقائق یہ ثابت کرتے ہیں کہ تنظیم و تشکیل کے

علاوہ سماجی، معاشی اور تہذیبی ارتقاء کا سلسلہ بھی مکہ مکرمہ کے اولین زمانے ہی سے شروع ہوگیا تھا جن میں معاشرتی تنظیم سرفہرست تھی۔ جیسا کہ ہم آگے بیان کریں گے بعض متقدمین و متوسطین اصحاب سیر نے بھی مدنی مواخاۃ کی طرح مکی مواخات کا تذکرہ کیا ہے لیکن اکثر اصحاب سیر نے صرف مدنی ہی مواخات کا ذکر کیا ہے اور انہوں نے مکی مواخات کو اس سے خلط ملط کر دیا ہے، ان کے بیان کے مطابق مدینہ منورہ تشریف لے جانے کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مہاجرین و انصار کے درمیان بھائی چارہ (مواخات) کرایا تھا اس کے نتیجے میں ایک مہاجر دوسرے انصاری کا بھائی بنا دیا گیا تھا اور وہ دونوں ہر شیئے میں مشارکت و موافقت اور تعاون و تفاعل کے پابند تھے حتی کہ ایک بھائی کے مرنے پر اس کا دینی بھائی اس کی جائداد و مال کا وارث ہوتا تھا اور مرحوم کے خون کے رشتے دار محروم ہوجاتے تھے۔ اس کا ذکر سیرت کے تمام قدیم مصادر اور تاریخی مآخذ میں ملتا ہے اور انہیں پر ہماری تمام ثانوی کتب سیرت و تاریخ مبنی ہیں۔

سیرت کے بعض مصادر میں ایک اور مواخات اسلامی کا بھی ذکر ہے جو رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے مکی مسلمانوں کے درمیان استوار فرمائی تھی۔ مگر اس کا ذکر کوئی نہیں کرتا اور چند ایک جو اس کا ذکر کرتے بھی ہیں تو مدنی مواخات کے ضمن میں یا اس کے پس منظر میں مدنی دور ہی میں کرتے ہیں۔ اس کی اصل جگہ اور زمانے کو وہ نظر انداز کر گئے ہیں اسکا سبب وہی روایت پرستی اور روش عام کی پیروی ہے، ہمارے اکثر سیرت نگار ابن ہشام پر کلی انحصار کرتے ہیں، خال خال ہی دوسرے مصادر کی جانب اعتنا کرتے ہیں اور چونکہ ابن ہشام کی موجودہ کتاب سیرت میں مکی مواخات کا ذکر نہیں پایا جاتا اس لیے اس سے انکے تعرض کرنے کا بھی سوال نہیں پیدا ہوتا، بعض سیرت نگاروں نے ابن سعد پہ اعتماد کرکے

یہ لکھا ہے کہ گو مواخات اصلاً مہاجرین و انصار کے درمیان ہوئی تھی لیکن بعض مہاجرین کے بعض مہاجرین سے اور بعض انصاریوں کا انصار سے بھی بھائی چارہ ہوا تھا لیکن یہ آخری شق تحقیق طلب ہے، یہاں اس کو نظر انداز کرکے ہم اصل مسئلہ پر گفتگو کرتے ہیں۔

سیرتِ نبوی کے بہت سے مصادر ہماری دسترس میں نہیں ہیں تاہم جو بھی دستیاب ہیں ان میں سے متعدد میں مکی مواخات کا ذکر موجود ہے۔ ابھی تک کی معلومات کے مطابق محمد بن حبیب بغدادی (م ۲۴۵ھ / ۸۶۰ء) پہلے شخص ہیں جنھوں نے مکی مواخات کا ذکر صراحتاً اور مدنی مواخات سے علیحدہ کیا ہے، وہ فرماتے ہیں کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ہجرت سے قبل مواخات کی اور ان (مسلمانوں) کے درمیان "حق و مواسات" (سچائی اور ہمدردی) پر بھائی چارہ قائم کیا اور ایسا مکہ میں کیا۔ چنانچہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے خود اپنی ذاتِ والا صفات اور حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ کے بیچ مواخات قائم کی، اسی طرح حضرت ابوبکرؓ و حضرت عمرؓ، حضرت حمزہؓ ہاشمی اور حضرت زید بنؓ حارثہ کلبی، حضرت عثمان بنؓ عفان اموی و حضرت عبد الرحمن بنؓ عوف زہری، حضرت زبیر بنؓ عوام اسدی و حضرت عبد اللہ بنؓ مسعود ہذلی، حضرت عبیدہ بنؓ حارث ہاشمی و حضرت بلال بنؓ رباح حبشی، حضرت مصعب بنؓ عمیر عبدری و حضرت سعد بنؓ ابی وقاص زہری، حضرت ابو عبیدہ بنؓ جراح فہری و حضرت سالم مولیٰؓ ابی حذیفہ اموی، حضرت سعید بنؓ زید عدوی و حضرت طلحہ بنؓ عبید اللہ تیمی کے درمیان مواخات قائم کی۔ بغدادی نے اسی کے ساتھ ہی یہ صراحت بھی کی ہے کہ یہ مکہ کی مواخات تھی۔ پھر جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ منورہ تشریف لائے تو مہاجرین و انصار کے درمیان مواخات قائم فرمائی... اور اس بار حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ اور حضرت سہیل بن حنیف انصاری اوسی (م ۳۸ھ / ۶۵۸ء) کے درمیان بھائی چارہ استوار کیا

اور اس کے بعد دوسرے تمام مدنی دینی بھائیوں کا ذکر کیا ہے[۳]

دوسرے اہم مورخ اور زمانی ترتیب میں مقدم حافظ ابن عبد البر (یوسف بن عمر بن عبد البر النمری ۳۶۸-۴۶۳ھ) ہیں جنھوں نے مکی مواخات کا ذکر کیا ہے مگر انھوں نے دونوں واقعاتِ تنظیمی کی ترتیب الٹ دی ہے۔ وہ پہلے مدنی مواخات کا ذکر کرتے ہیں جس کا عنوان ہے: "مواخات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بین المہاجرین والانصار رضی اللہ عنہم اجمعین"۔ اس کی تفصیل بیان کرنے کے بعد وہ آخر میں یہ واضح بیان دیتے ہیں کہ رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ہجرت سے قبل حق و مواسات کی بنیاد پر ہی مہاجرین میں سے بعض کی بعض سے مواخات استوار کی تھی۔ ان کی بیان کردہ فہرست بغدادی کے مطابق ہے مگر انھوں نے حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ سے نبوی ذات گرامی کی مواخات کا ذکر نہیں کیا ہے، اگرچہ مدنی مواخات کے حوالہ سے اس کا نہ صرف ذکر کیا ہے بلکہ کئی روایات بھی اس معنی و مطلب کی نقل کی ہیں[۴]

عظیم اندلسی سیرت نگار امام ابنِ سید الناس (محمد بن عبد اللہ بن یحییٰ ۶۷۱-۷۳۴ھ) نے دونوں مواخات مکی و مدنی کا واضح ذکر کیا ہے۔ "ذکر المواخات" کے عنوان سے وہ اپنا بیان اس طرح شروع کرتے ہیں کہ مواخات دو بار ہوئی۔ پہلی بار مکہ مکرمہ میں ہجرت سے پہلے مہاجرین کے درمیان "حق و مواسات" پر رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے استوار کی علامہ موصوف اور بغدادی کی فہرستیں یکساں ہیں۔ البتہ ان کے یہاں رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت علیؓ بن ابی طالب کے درمیان مواخات کا ذکر سب سے آخر میں ہے، جبکہ بغدادی کی فہرست کا آغاز ہی اس سے ہوا ہے[۵]

محدث جلیل اور شارح بخاری حافظ ابن حجر عسقلانی (ابو الفضل شہاب الدین احمد بن

لی مصری شافعی (۸۵۲-۷۷۳ھ / ۱۴۴۹-۱۳۷۲ء) نے مکی مواخات کے بارے میں مزید روایات نقل کی ہیں۔ وہ حافظ ابن عبدالبر کے اس بیان کو کہ مواخات دوبارہ ہوئی پہلی مرتبہ مکہ میں اور دوسری مرتبہ مدینہ میں دہرانے کے بعد حضرت ابن عباسؓ کی ایک روایت نقل کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرات زبیر اور عبداللہ بن مسعودؓ کے درمیان مواخات قائم کی، حالانکہ وہ دونوں مہاجرین میں سے ہیں۔ اس حدیث کو امام حاکم کے علاوہ حافظ ابن عبدالبر نے بھی نقل کیا ہے۔ اس کی اسناد حسن ہے۔ حافظ ضیاء الدین مقدسی نے اس روایت کو اپنی تالیف لطیف مختارہ میں امام طبرانی کی معجم کبیر کے حوالے سے بھی بیان کیا ہے۔ حافظ عسقلانی نے اس سند کی مزید توثیق کرکے مکی مواخات کے بارے میں امام حاکم کی ایک روایت نقل کی ہے اور لکھا ہے کہ حافظ ابن تیمیہ کے خیال میں مستدرک حاکم کی روایات کے مقابلہ میں مقدسی کی مختارہ کی روایات و احادیث زیادہ صحیح اور قوی ہیں۔ اسی مستدرک حاکم میں حضرت عبداللہ بن عمرؓ کی ایک روایت یہ بھی ملتی ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابوبکرؓ و عمرؓ اور فلاں فلاں میں مواخات استوار کی اور حضرت علیؓ کے استفسار پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو اپنا بھائی قرار دیا۔

گو حافظ ابن حجر عسقلانی نے امام بخاری کی حدیث مواخات کی تشریح میں یہ تفصیل فراہم کی ہے، لیکن خود امام بخاریؒ نے اگرچہ مکی و مدنی زمانوں کا ذکر نہیں کیا ہے تاہم انکے ترجمۂ باب، حدیث اور ابواب صحیح میں "حدیث مواخات" کی ترتیب وغیرہ سے واضح ہوتا ہے کہ ان کی تمام روایات بلکہ ان کا زور مدنی مواخات پر ہے۔ امام بخاری نے عنوان باب قائم کیا ہے: "باب کیف آخی النبی صلی اللہ علیہ وسلم بین اصحابہ" اور اس میں حضرت سلمان الفارسی اور ابوالدرداءؓ کے مابین مواخات کا حوالہ ہے اور جو حدیث نقل کی ہے

وہ حضرت سعد بن ربیع انصاری اور عبدالرحمن بن عوف زہری کی مواخات کا ذکر کرتی ہے اور یہ دونوں مواخات مدنی دور کی ہے جو انصار و مہاجرین کے درمیان ہوئی تھی۔ امام بخاری نے بعض اور مقامات پر بھی "حدیث مواخات" کا ذکر کیا ہے اور وہاں بھی زمانہ مدنی ہی ہے، مکی نہیں، اگرچہ ترجمۂ باب میں زمانہ کی قید نہیں ہے۔ پھر امام موصوف نے مواخات کا باب "باب هجرة النبی صلی اللہ علیہ وسلم واصحابہ الی المدینۃ" کے بعد باندھا ہے جو اس بات کا اشارہ ہے کہ ان کی حدیث مواخات اور ترجمۂ باب کا تعلق مدنی دور سے ہے[۶]۔ امام بخاری کے ایک دوسرے شارح امام قسطلانی (احمد بن محمد المصری ۸۵۱-۹۲۳ھ / ۱۴۴۸-۱۵۱۷ء) نے بھی مکی اور مدنی دو بار کی مواخات کا ذکر کر کے وہی نام گنائے ہیں جو حافظ ابن سید الناس کی روایت کے مطابق روایت مواخات میں موجود ہیں۔ آخر میں "مشروعیۃ التواخی" کے فوائد اور مصالح . . . بیان کیے ہیں[۸]۔

حسین بن محمد بن حسن دیار بکری م حدود ۹۶۶ھ / ۱۵۵۹ء نے مکی مواخات کے بارے میں حافظ ابن حجر، حاکم اور ابن عبدالبر کے حوالے سے کسی قدر تفصیل قلم بند کی ہے[۹]، مگر زیادہ تفصیل (علی بن برہان الدین حلبی ۹۷۵-۱۰۴۴ھ / ۱۵۶۷-۱۶۳۴ء) نے فراہم کی ہے۔ انہوں نے حضرت زید بن ابی اوفی کی سند سے حافظ ابن الجوزی (ابو الفرج عبدالرحمن بن علی بن محمد قرشی بکری حنبلی ۵۱۰-۵۹۷ھ / ۱۱۱۶-۱۲۰۰ء) کی روایت نقل کی ہے کہ میں مدینہ میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی مسجد میں آیا تو آپ نام لے لے کر لوگوں کو تلاش کر رہے تھے۔ جب لوگ جمع ہو گئے تو آپ نے ارشاد فرمانے کے بعد حضرت ابوبکر و عمر کے درمیان مواخات استوار کی۔ اس پر امام حلبی نے یہ تبصرہ کیا ہے کہ ہجرت کے بعد رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے مہاجرین و انصار کے مابین مواخات استوار کی تھی جبکہ یہ دونوں حضرات مہاجرین میں سے تھے، اس کا مطلب یہ ہوا کہ

یہ مواخات ہجرت سے قبل مہاجرین کے درمیان کرائی گئی تھی اور راوی ابن ابی اوفی سے کچھ سہو ہو گیا کہ انہوں نے مہاجروں کے درمیان مواخات کی بات کہی ہے؛ معروف و مشہور یہی ہے کہ مواخات دو بار واقع ہوئی۔ ایک بار مہاجرین کے درمیان ہجرت سے قبل اور ایک بار ہجرت کے بعد مہاجرین و انصار کے درمیان ...؛ اس کے بعد امام طبی نے مدینہ میں جن مہاجرین و انصار کے درمیان مواخات ہوئی تھی، ان کی تعداد بیان کر کے اس پر دلیل قائم کی ہے اور مدنی مواخات کے بارے میں دوسری تفصیلات دی ہیں[۱]

علامہ زرقانی (عبد الباقی بن یوسف مصری ۱۰۲۰-۱۰۹۹ھ/ ۱۶۱۱-۱۶۸۸ء) نے "ذکر المواخات بین الصحابة رضوان اللہ علیہم اجمعین" عنوان کے تحت پہلے حافظ ابن البر کا قول نقل کیا ہے کہ مواخات دو بار ہوئی تھی اول بار مکہ میں مہاجرین کے درمیان اور امام حاکم کی روایت پر اس پہلی مواخات کے مذکورہ بالا دینی بھائیوں کے اسمائے گرامی نقل کیے ہیں۔ مواخات رضی اللہ عنہ سے متعلق مختلف روایات و تفصیلات کے علاوہ زرقانی نے مواخات مکی کے بارے میں جو تفصیلات یا نکات دیے ہیں وہ بالترتیب یہ ہیں: امام حاکم کے مطابق حضرت طلحہؓ و زبیرؓ کے درمیان مواخات ہوئی تھی مگر ایک روایت میں ہے کہ حضرت زبیرؓ و ابن مسعودؓ میں استوار ہوئی تھی۔ دوسرا اہم نکتہ یہ ہے کہ جب ہر دو کے درمیان مواخات قایم ہو گئی تو صرف حضرت علیؓ باقی بچ گئے، ان کے عرض و معروض پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے ان کی مواخات ہوئی جس کے متعلق احادیث کثیرہ منقول ہیں، آگے چل کر زرقانی نے مزید صراحت کی ہے کہ حاکم و ابن عبد البر نے سند حسن کے ساتھ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت نقل کی ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے زبیرؓ اور ابن مسعودؓ کے درمیان مواخات استوار کی تھی حالانکہ وہ دونوں مہاجرین میں سے تھے۔ ان کا باقی

حافظ ابن حجر کے مطابق ہے اور پھر مدنی مواخات کی تفصیل دی ہے۔ جس کی اہم بات مواخات کی ضرورت وحکمت اور مقصد کی وضاحت ہے۔[۱۱]

مکی مواخات سے بے خبری کے اسباب مندرجہ بالا حقایق و شواہد سے یہ ثابت ہوجاتا ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے مکہ مکرمہ میں نئے مسلمانوں کے درمیان بھائی چارہ کرایا تھا لیکن اس کے ذکر سے سیرت کے مشہور مصادر و مآخذ خالی ہیں۔ اس کے اسباب و وجوہ کا پتہ لگانا کچھ زیادہ مشکل نہیں۔

یہ بات تو تسلیم شدہ ہے کہ حیات نبوی اور سیرت محمدی کی تمام جزئیات جمع نہیں کی جاسکی ہیں، خصوصاً مکی دور اور ابتدائی عہد کے تنظیمی واقعات وحالات۔ کیونکہ زیادہ تر سیرت نگاروں کی توجہ دوسرے حالات و معاملات پر مرکوز رہی، ابتدائی مؤلفین سیرت امام عروہ بن زبیر (۲۲-۹۴ھ / ۶۴۳-۷۱۳ء)، امام زہری (محمد بن مسلم ۵۸-۱۲۴ھ / ۶۷۸-۷۴۲ء) اور ان کے تلامذہ کرام امام ابن اسحاق (محمد بن اسحاق بن یسار ۸۵-۱۵۱ھ / ۶۹۵-۷۶۸ء) اور امام موسیٰ بن عقبہ (۵۵-۱۴۱ھ / ۶۷۵-۷۵۸ء) وغیرہ نے بہت سا مواد جمع نہیں کیا۔ ان میں بعض حضرات کی کتابیں اب دستیاب نہیں ہیں مگر ان کی مرویات دوسری کتابوں میں درج ہیں، عروہ بن زبیر کی مغازی اور ابن اسحاق کی سیرت چھپ گئی ہیں اور ان کے اردو ترجمے بھی ہوچکے ہیں۔[۱۲]

دوسری وجہ یہ ہے سیرت کا بہت سا مواد تنقیح و تہذیب کے عمل میں صفحات تاریخ سے محو ہوگیا جیسا کہ ابن ہشام (عبدالملک بن ہشام م ۲۱۳ھ / ۸۲۸ء) نے سیرت ابن اسحاق کی تہذیب و ترتیب میں کیا۔ یا امتداد زمانہ اور عام بے اعتنائی سے ضایع ہوگیا، جیسے واقدی (محمد بن عمر ۱۳۰-۲۰۷ھ / ۷۴۷-۸۲۳ء) کی اصل کتاب سیرت کے دو تہائی گم شدگی یا امام اموی یحییٰ بن سعید بن ابان م ۱۹۴ھ / ۸۱۹ء کی سیرت نبوی وغیرہ کی بربادی۔

غرض تیسری/ نویں صدی سے آج تک متعدد معتمد و مستند مصادر سیرت میں مکی مواخات کا ذکر ملتا ہے جس سے سیرت کا یہ مہتم بالشان واقعہ پوری طرح ثابت ہو جاتا ہے۔ کیونکہ بغدادی ابن عبد البر، ابن سید الناس، ابن حجر عسقلانی اور ان کے حوالے سے حاکم و مقدسی نے اور قسطلانی، دیار بکری، حلبی اور زرقانی وغیرہ نے نہ صرف اس کی روایت کی ہے بلکہ اس کو مستند و معتبر بھی قرار دیا ہے۔ استناد و شہادت کے باب میں امام ابن تیمیہؒ کی رائے بھی موجود ہے جو اسے اور بھی معتبر و معتمد علیہ بناتی ہے۔ گویا مکی مواخات کی روایات ایک دو نہیں متعدد کتب سیر و تاریخ میں موجود ہیں۔ غالباً اس سے بے خبری کا سب سے بڑا اور خاص سبب مکی و مدنی مواخات کے بارے میں روایات کا اختلاط ہے۔

مکی و مدنی مواخات میں اشتباہ کے اسباب رواۃ نے اپنی بعض روایات میں ان دونوں واقعاتِ مواخات میں خلط ملط کر کے خلط مبحث ہی نہیں کیا بلکہ متعدد اہل حدیث، اصحابِ اخبار اور مورخین کو پراگندہ بیانی کا شکار بھی بنایا ہے۔ یہ حضرات بالعموم بحث کا آغاز اس عنوان سے کرتے ہیں کہ رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ہجرتِ مدینہ کے بعد مسجدِ نبوی میں ایک روز نام بنام اپنے صحابۂ کرام کو بلایا اور انصار و مہاجرین کے درمیان بھائی چارہ کرایا مگر جب وہ صحابۂ کرام کے ان دینی بھائیوں کا ذکر کرتے ہیں تو طرفین میں مہاجرین ہی کا نام لیتے ہیں۔ یہ الجھاؤ اور تضاد متعدد حضرات کے ہاں پایا جاتا ہے، مثلاً امام ابن حبان بستی (محمد بن حبان بن احمد ابو حاتم التمیمی البستی م ۳۵۴ھ/۹۶۵ء)۔ مدنی مواخات کا جو پس منظر بیان کرتے ہیں وہ بہت دلچسپ اور معلومات افزا ہے۔ رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم مسجد میں داخل ہوئے تو لوگوں کو دیکھا کہ وہ بخار کی نقاہت کے سبب بیٹھ کر نماز ادا کر رہے ہیں۔ فرمایا: بیٹھ کر پڑھنے والے کی نماز قائم کی نماز سے آدھی ہوتی ہے لہذا لوگوں نے اپنی اپنی نماز کھڑے ہو کر پوری کی۔ آپؐ نے

دعا فرمائی: اے میرے اللہ! مدینہ میں مجھے مکہ سے دوگنی برکت عطا فرما۔ پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارادہ فرمایا کہ مہاجرین و انصار کے درمیان مواخات قائم فرمادیں۔ یہ ماہ رمضان تھا۔ آپ مسجد میں داخل ہوتے اور فرمانے لگے فلاں فلاں کہاں ہے؟ آپ برابر ان کو گناتے اور بلاتے رہے تا آنکہ وہ آپ کی خدمت میں اکٹھا ہوگئے۔ پھر فرمایا: میں تم سے ایک بات (حدیث) بیان کرتا ہوں اس کو یاد کرلو اور اسے اپنے بعد والوں سے بھی نقل کرو: "اللہ تعالیٰ نے اپنی مخلوق میں سے ایک مخلوق کا انتخاب فرمایا" اور یہ آیت پڑھی: اَللّٰهُ يَصْطَفِي مِنَ الْمَلٰٓئِكَةِ رُسُلًا وَّمِنَ النَّاسِ (سورہ ۲۲ ۷۵)۔ یہ مخلوق ایسی ہوگی جن کو اللہ تعالیٰ جنت میں داخل فرمائے گا۔ میں بھی تم میں سے کچھ کو جن کو چاہوں منتخب کرنے والا ہوں اور تمہارے درمیان اسی طرح مواخات قائم کرنے والا ہوں جس طرح اللہ تعالیٰ نے ملائکہ کے درمیان مواخات استوار کی ہے۔ پھر آپ نے حضرت ابو بکرؓ کو بلایا اور ان سے کچھ فرمایا اور پھر حضرت عمرؓ کو بلا کر کچھ فرمایا اور ان کے درمیان مواخات قائم کی۔ اسی طرح آپ نے حضرت عثمان بن عفان اور عبد الرحمن بن عوف کو باری باری بلا کر فرمایا اور مواخات ان دونوں میں استوار کی۔ یہی طرز عمل حضرت طلحہؓ و زبیرؓ، سعد بن ابی وقاص اور عمار بن یاسر اور عمیر ابو الدرداءؓ اور سلمان فارسی کے بارے میں اختیار فرمایا۔ امام سبتی نے ان کلمات عالیات کا بھی ذکر کیا ہے اور خاتمہ میں یہ لکھا ہے کہ آپ نے صحابہ کرام پر نظر ڈالی اور فرمایا: "بشارت ہو اور آنکھ ٹھنڈی ہو۔ تم پہلے ہوگے جو حوض پر پہونچو گے۔ تم بلند ترین غرفات میں ہوگے اور آپ نے حضرت عبد اللہ بن عمر کی جانب نظر رحمت کی اور فرمایا: اللہ کی حمد ہو جو گمراہی سے جسے چاہتا ہے بچالیتا ہے اور ہدایت عطا فرماتا ہے۔" اس کے بعد کا حصہ روایت حضرت علیؓ سے آپ کی مواخات سے متعلق ہے۔ جو بعد میں زیر بحث آئے گا۔

غور فرمایئے کہ امام موصوف مہاجرین و انصار کے درمیان مواخات کا تذکرہ اور مسجد نبوی میں اس کے انعقاد کی تفصیل بیان کر رہے ہیں لیکن جن چھ چھ اشخاص کا ذکر خیر فرمایا ہے اور ان میں پانچ پانچ بشمول حضرت محمد بن عبد اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہاشمی اور علی بن ابی طالب ہاشمی مہاجرین کے طبقہ سے تعلق رکھتے ہیں اور صرف ایک ایک یعنی ابو الدرداؓ عویمرؓ اور سلمانؓ فارسی مدنی و انصاری ہیں۔ بلکہ اصلاً انصاری تو صرف حضرت ابو الدرداؓ ہیں۔ رہے حضرت سلمانؓ تو ان کا تعلق فارس سے تھا جن کو زیادہ سے زیادہ مدنی کہا جا سکتا ہے۔ جو ہجرت سے پہلے ہی مدینہ میں آبسے تھے لیکن ان کو انصاری نہیں قرار دیا جا سکتا[۱۴]

روایات مواخات کے مزید تجزیہ و تنقیح سے معلوم ہوتا ہے کہ امام ابن حبان کی طرح امام حاکم، امام ابن عبد البر، حافظ مقدسی، امام طبرانی، علامہ دیار بکری، علامہ حلبی اور علامہ زرقانی کی نقل کردہ بعض روایات و احادیث میں بھی اختلاط کا عنصر پایا جاتا ہے اور اس کا اصل سرا دراصل امام سیرت ابن اسحاق (محمد بن اسحاق بن یسار، ۸۵-۱۵۱ھ / ۷۰۴-۷۶۸ء) کے یہاں ہے جو مدنی دور کے ضمن میں "المواخات بین المہاجرین والانصار" کا عنوان قائم کرتے ہیں مگر اس میں پہلے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت علیؓ کی مواخات کا ذکر کرتے ہیں۔ پھر بالترتیب حضرت حمزہؓ و زید بن حارثہ اور جعفر بن ابی طالب اور معاذ بن جبل کا ذکر کرتے ہیں۔ جس پر ابن ہشام کا یہ تبصرہ بھی ہے کہ حضرت جعفرؓ اس وقت ارض حبشہ میں تھے۔

ابن اسحاق کی باقی روایت مواخات میں واقعتاً مہاجرین و انصار کے نام آئے ہیں[۱۵]

ایک دوسرے امام سیرت و طبقات ابن سعد (محمد بن سعد بصری م ۱۶۸-۲۳۰ھ / ۷۸۴-۸۴۵ء) نے یہ کہہ کر ایک مزید الجھن پیدا کر دی ہے کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ تشریف لائے تو

آپ نے بعض مہاجرین بعض مہاجرین سے مواخات کی اور پھر مہاجرین و انصار میں مواخات کی اگرچہ انھوں نے صحابۂ کرام میں سے کسی کا نام نہیں لیا ہے[۱۶]۔ یہ پراگندہ بیانی بلاذری (احمد بن یحییٰ بن جابر م ۲۷۹ھ/۸۹۲ء) کے ہاں ملتی ہے۔ انھوں نے "قالوا" کہہ کر راویوں کی روایت یوں نقل کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حق و مواسات کی بنیاد پر مواخات استوار کی، حمزہؓ و زید بن حارثہؓ میں، ابوبکرؓ و عمرؓ میں۔ دوسرے پیراگراف میں ان کا ایک نیا بیان ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مہاجرین کے درمیان اس شرط پر مواخات قائم کی کہ وہ ذوی الارحام کے بجائے آپس میں وارث ہوں گے۔ بعد ہ یہ توارث ختم ہوا۔ بلاذری نے مکی مواخات کا حوالہ نہیں دیا ہے پھر بعد میں مدنی مواخات کا اسی تسلسل کے ساتھ ذکر کیا ہے۔ مگر ان کی مواخات کی روایات مدنی دور ہی سے متعلق ہے گو انصار و مہاجرین کا عنوان اور ہجرت مدینہ کا کوئی تذکرہ نہیں ہے تاہم آخری پیرے میں مہاجرین و انصار کا حوالہ موجود ہے کہ ان میں سے کوئی ایسا نہیں رہا تھا جس کی مواخات استوار نہ کی گئی ہو[۱۷]۔

ابن سعد نے طبقات صحابۂ کرام میں متعدد مہاجرین کی باہمی مواخات کا ذکر جلد سوم وغیرہ میں کیا ہے۔ حضرت حمزہ بن عبدالمطلبؓ و زید بن حارثہ کلبیؓ کی مواخات کا ذکر کیا ہے مگر اس میں مکان کا حوالہ نہیں ہے۔ البتہ حضرت علیؓ کے ذکر خیر میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے ان کی مواخات کا ذکر بھی ہے اور جلد اول کے بیان کی تکرار بھی کہ مہاجرین کے درمیان مواخات قائم کی اور انصار و مہاجرین کے درمیان بھی مواخات استوار کی۔ حضرت زید بن حارثہؓ کی مہاجری مواخات کا ذکر ہے پھر مدنی مواخات کا جو حضرت اسید بن حضیرؓ سے کی گئی تھی یہ دہری مواخات کا بیان ہے جو بعض دوسرے صحابۂ کرام کے تذکروں میں بھی ہے[۱۸]۔

لیکن متعدد صحابۂ کرام کے ضمن میں صرف مدنی مواخات یا انصار و مہاجرین کی مواخات

کا واضح بیان ہے جیسے حضرات ابو مرثدؓ غنوی و عبادہ بنؓ صامت، مرثد بنؓ ابی مرثدؓ غنوی و اوس بنؓ صامت، حضرت طفیل بنؓ حارث و حصین بنؓ الحارث کی دو انصاریوں سے مواخات، حضرت ابو حذیفہؓ اموی و عباد بنؓ بشر انصاری کی صرف مدنی مواخات کا ذکر ہے جبکہ ان کے مولیٰ حضرت سالم کی مکی اور مدنی مواخات دونوں کا ذکر ملتا ہے جو بہت عجیب باب ہے۔ مہاجرین و انصار کے درمیان مواخات کا تذکرہ ابن سعد کی سوانحی تفصیلات کا ایک لازمی جزئیہ ہے جو آخر تک تقریباً تمام صحابۂ کرام کے ضمن میں ملتا ہے لیکن اس سے ہم کو سردست بحث نہیں ہے۔ مگر یہ بہت نادر و دلچسپ بات ہے کہ ایک مولیٰ کی مواخات مکی کا ذکر بھی ہو اور مدنی مواخات کا بھی، مگر ان کے سرپرست و آقا کی مکی مواخات کا حوالہ تک نہ آئے۔ یہاں یہ محسوس ہوتا ہے کہ روایات میں کہیں خلا رہ گیا ہے۔ ابھی تک ہم نے جن کتب سیرت و تذکرہ کا مطالعہ کیا ہے اور جو اہلِ علم کو دستیاب ہیں ان میں سے کسی میں حضرت ابو حذیفہؓ کی مواخات کا ذکر نہیں مل سکا، نہ مکی اور نہ مدنی، مگر ان کے مولیٰ حضرت سالمؓ کی دونوں مواخات کا ذکر ملتا ہے یعنی ایک مہاجر سے بھی مواخات کا اور ایک انصاری صحابی سے بھی۔ یہ مسئلہ تحقیق طلب ہے۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ عہد جدید کے بیشتر اور بعض کبار سیرت نگاروں نے مکی مواخات کا اپنی اپنی تالیفات میں ذکر کیوں نہیں کیا؟ اس کا جواب یہ ہے کہ بعض کو سرے سے اس کا علم ہی نہیں ہو سکا اور جن کو علم ہوا وہ روایت پرستی کے سبب اس کو کی دور میں اس کے صحیح موقع و محل میں پیش کرنے سے قاصر رہے[عہ]

عہ معارف: مقالہ نگار نے اس مسئلہ کو جس قدر اہمیت دی ہے ممکن ہے اور لوگوں کے نزدیک یہ مسئلہ اتنا اہم نہ ہو اس لیے انہوں نے مکی مواخات کا ذکر نہ کیا ہو اور ظاہر ہے کہ مدنی (بقیہ صفحۂ آئندہ پر)

مؤاخات کا مقصود و عامل | مکی مواخات کے مطالعہ میں اہم مسئلہ اس کے سبب و عامل کا ہے کہ مکی مواخات کیوں کی گئی؟ اس کا ایک مختصر اور تاریخی حوالے سے جواب تو یہ دیا جا سکتا ہے کہ جو وجہ مدنی مواخات کا باعث بنی تھی وہی مکی مواخات کے لیے بھی تھی۔ مکی مسلمانوں کے لیے روایت کے لیے بالعموم مہاجرین کی اصطلاح استعمال کی گئی ہے جو غلط فہمی پیدا کرتی ہے کہ راویوں کے سامنے چونکہ مدنی مواخات کا پیش منظر تھا کہ وہ مہاجرین و انصار کے دو عرب طبقات کے درمیان استوار کی گئی تھی لہذا غیر شعوری طور پر انہوں نے "مہاجرین" کی اصطلاح استعمال کر لی کہ وہ ہجرت سے قبل صرف انہیں کے درمیان قائم کی گئی تھی۔ حالانکہ اس کے لیے صحیح لفظ اہل مکہ یا مکی مسلمانوں کا تھا۔

یہ حقیقت سب کو معلوم ہے کہ مکی مسلمانوں کا تعلق مختلف قبیلوں اور خاندانوں سے تھا۔ ان میں قریشی اور غیر قریشی دونوں شامل تھے۔ خاص مکہ مکرمہ کے باشندے بھی تھے اور بعض دوسرے علاقوں کے باشندے بھی۔ پھر ان کے خاندانی تعلقات بھی غیر مستحکم بن گئے تھے کہ کسی کا بھائی مسلمان تھا تو بہن غیر مسلم، بیوی مسلم تھی تو شوہر غیر مسلم، باپ صاحب ایمان تھا تو ماں کافر، یا اس کے برعکس۔ مسلمانوں کے بعض پورے پورے خاندان بھی مسلم ہوگئے تھے لیکن ان کی تعداد بہت کم تھی زیادہ تر منقسم خاندانوں کے افراد تھے یا اپنے خاندانوں سے اسلام کی وجہ سے منقطع و اجنبی بن گئے تھے۔ مسلمانوں کا مسئلہ یہ تھا کہ وہ اپنے خاندانوں سے کٹ گئے تھے اور اگرچہ ان کو ان کے خاندانوں نے بالکل تج نہیں دیا تھا مگر ان کو اب

(بقیہ ص۴۳۳) مواخات جیسی اہمیت کی مواخات کی ہے بھی نہیں، مکی و مدنی اسلام کی تفریق یقیناً غلط ہے لیکن مکی اور مدنی دور میں فرق اور دونوں کے حالات و احکام میں اختلاف تو ہے ہی جس کو مقالہ نگار اہمیت نہیں دے رہے ہیں اور دوسروں پر خواہ مخواہ طنز و تعریض کر رہے ہیں۔

اپنا رکن بھی نہیں سمجھتے تھے۔ دوسری طرف ان کے خاندان کو اسلام اور پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم سے شکوہ تھا کہ ان کے افراد و اشخاص کو مسلم بنا کر ان کے خاندانی نظام کو درہم برہم کر دیا تھا اور یہ ان کا سب سے بڑا شکوہ تھا۔[عہ]

جب ان مکی مسلمانوں کی تعداد معتد بہ ہو گئی تو رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان میں مکی مواخات یا اسلامی بھائی چارہ قائم کرایا۔ اس کی وجہیں تو بہت ہیں لیکن مندرجۂ ذیل تین بنیادی اور اہم ہیں: اول خاندانی روابط سے محروم اور اعزہ و اقارب کی محبت و شفقت اور تعلق سے منقطع مسلمانوں کو ایک ایسا سماجی اور معاشرتی ماحول فراہم کیا جائے جو ان کو یگانگت و ہم آہنگی فراہم کرے اور خاندان سے تعلق ٹوٹنے کے سبب جو معاشرتی خلا پیدا ہو گیا ہے اسکو پُر کرے۔ دوم متعدد مکی آیات میں امت اسلامی کو دوسری امتوں اور دوسرے لوگوں سے الگ اور ممتاز معاشرتی جماعت قرار دیا گیا ہے۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے از اول روز یہ حقیقت واضح تھی کہ مسلمانوں کی معاشرتی تنظیم اور مذہبی تہذیب اور سیاسی تشکیل کرنی ہے مگر اس کے لیے وہ اذن الٰہی کے ساتھ ساتھ موزوں وقت کے بھی منتظر تھے۔ جونہی یہ دونوں شرطیں پوری ہوئیں اور مکی مسلمانوں کی ایک معتد بہ تعداد وجود میں آگئی اور حالات کے دباؤ نے ان کو مکی اور قریشی سماجی نظام میں اچھوت بنا دیا۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان میں مواخات کے ذریعہ معاشرتی ہم آہنگی پیدا کر دی۔ سوم اسلام صرف ایک مذہب کی حیثیت سے وجود میں نہیں آیا تھا۔ وہ ایک دین ہے جو زندگی کے تمام پہلوؤں پر حاوی ہے لہذا معاشرتی و سماجی سطح پر بھی وہ اپنی انفرادیت، اپنا تشخص اور اپنا ملی وجود قائم و مستحکم کرنا چاہتا تھا۔ اسلامی دینی تعلیمات میں معاشرتی، قانونی، سیاسی، اقتصادی اور

عہ معارف: اسی بنا پر مکی و مدنی عہد میں بھی فرق کیا جاتا ہے۔

تہذیبی سب ہی قسم کے احکام شامل تھے۔ قریشی اکابر کو بھی اس کا ادراک جلد ہو گیا تھا کہ اسلام ان کے جاہلی نظام کے بالمقابل ایک متوازی نظام استوار کرنا چاہتا ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اپنے آغازِ اسلام میں جب یہ کہا تھا کہ "ہم جس دن تین سو ہو گئے تو یا تو تم اسے ہمارے لیے یا ہم تمہارے لیے خالی کر دیں گے"[۱۴] تو وہ محض ایک تعلی آمیز دھمکی یا تفاخر نہ تھا بلکہ اپنی تنظیمی قوت کی پیش گوئی تھی۔ مسلم آبادی میں اضافہ کے ساتھ ساتھ دوسرے تمام سماجی، سیاسی، اقتصادی اور تہذیبی اداروں کا وجود میں آنا ناگزیر واقعات کا سلسلہ تھا جس کو کسی طرح سے روکا نہیں جا سکتا تھا اور بالآخر مدینہ میں ایسا بطورِ احسن وجود پذیر ہوا اس کی اولین وجہ یہ تھی کہ ہجرتِ نبوی سے معاً قبل شہر نبی میں مسلم اکثریت وجود میں آگئی تھی۔ مسلم طبقات میں اوس و خزرج اور مہاجرین وغیرہ کے متعدد سماجی تقسیمات تھیں جو اپنے اپنے قبائلی اور سماجی روایات و ترجیحات کی پابند تھیں۔ ان کو جب اسلامی سماجی تنظیم میں پرو دیا گیا تو اسلامی بھائی چارہ اور دینی مواخات کا وہی طریقہ اپنایا گیا جو مکہ میں آزمایا جا چکا تھا۔ ظاہر ہے کہ اسلامی معاشرہ کی تنظیم و تشکیل اور اس کے وجود کا صرف اور صرف ایک ہی محور ہو سکتا ہے اور وہ اسلام کا تعلق تھا۔

حواشی

[۱] مکی اسلام اور مدنی اسلام کی تفریق مستشرقین کی تحریروں میں عام ہے جس کا اثر مسلمانوں اور بالعموم ان کے جدید تعلیم یافتہ طبقے پر بھی پڑا ہے، ملاحظہ ہو: جی ای وی گرونی بام (G.E.V. GRUNE BO-UM) کلاسیکل اسلام (QLASSICAL ISLAM) انگریزی ترجمہ لندن ۱۹۷۰ء ص ۲۸-۲۷ وغیرہ۔ اسی بنا پر خیال کیا گیا ہے کہ مکی دور میں احکام نہیں دیے گئے تھے، جس کو قرآن کریم کی مکی سورتوں کے حوالے سے زیادہ پیش کیا جاتا ہے۔ [۲] عربی، اردو اور بیشتر انگریزی کتب سیرت کا موازنہ اس

روایت پرستی اور ایک دو مصادر پر کلی انحصار کو اچھی طرح واضح کر دیتا ہے، ان کے موضوعات و عناوین اور مباحث وغیرہ یکساں ہوتے ہیں صرف زبان و اسلوب کا فرق ہوتا ہے۔[۳] کتاب المحبر ۷۱ کی تالیفی خصوصیت یا ترتیبی تنظیم یہ ہے کہ وہ مختلف عناوین کے تحت غیر مربوط مباحث پیش کرتی ہے۔ لہذا وہ ذکر المواخات کے تحت پہلے مکی مواخات کو پھر مدنی مواخات کو بیان کرتی ہے جو ان کے انداز تالیف کے مطابق بالکل منطقی ہے۔ اصلاً وہ کتاب سیرت و تاریخ و تہذیب ہے۔

حضرت سہیلؓ بن حنیف اوسی انصاری رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے تمام غزوات میں شریک رہے، مدینہ میں ان کی مواخات حضرت علیؓ سے ہوئی، یہی وجہ ہے کہ وہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ہمیشہ حامی و ناصر رہے اور جنگ صفین میں انہیں کے پرچم تلے شریک ہوئے۔ حضرت علیؓ کی زندگی میں وفات پائی تو حضرت موصوف نے ہی ان کی نماز جنازہ پڑھائی۔ کوفہ میں مدفون ہوئے، نیز ابن اثیر، اسد الغابہ دوم ص ۳۶۴-۳۶۵ [۴] الدرر فی اختصار المغازی والسیر، ص ۹۲-۹۵، [۵] عیون الاثر فی فنون المغازی والشمائل والسیر، اول، ص ۲۶۴-۲۶۸ [۶] فتح الباری مطبعہ دار المعرفۃ بیروت (غیر مورخہ) ہفتم ص ۲۷۰-۲۷۱ [۷] الجامع الصحیح، باب کیف آخی النبی صلی اللہ علیہ وسلم بین اصحابہ۔ وراثت کے حق برادری کا ذکر امام بخاری نے کتاب التفسیر، سورۃ النساء میں بھی کیا ہے۔ (مصطفی البابی الحلبی مصر ۱۳۴۵ھ کی طباعت ۵/۸۸) نیز ملاحظہ ہو: مسلم، الجامع الصحیح، کتاب الفضائل، باب مواخات النبی صلی اللہ علیہ وسلم۔

[۸] ارشاد الساری، مطبعہ امیریہ بولاق مصر ۱۳۲۶ھ ششم ص ۲۳۶ [۹] تاریخ الخمیس المطبعۃ العامرۃ العثمانیہ ۱۳۰۲ھ، اول ص ۳۵۰-۳۵۸ [۱۰] السیرۃ الحلبیہ، قاہرہ ۱۲۹۲ھ دوم ص ۱۱۹-۱۲۰

[۱۱] شرح المواہب اللدنیہ، بولاق ۱۲۹۱ھ / ۱۸۷۴ء اول ص ۵۲-۳۴۹ (دار الطباعۃ المیریۃ المصریۃ)

[۱۲] مزید بحث کے لیے ملاحظہ ہو: جوزف ہورووتس، اولین کتب سیرت اور ان کے مولفین، اردو ترجمہ

از نثار احمد فاروقی، نیز خاکسار کا مضمون مقدمہ بر کتب سیرت ۳؎ کتاب الثقات، دار المعارف العثمانیہ حیدر آباد دکن ۱۹۷۵ء اول ص ۴۲-۱۳۹ ۴؎ دونوں کے لیے ملاحظہ ہو: ابن اثیر اسد الغابہ دوم، چہارم، پنجم اور ابن سعد کی طبقات ۵-۹۳ ۔ حضرت سلمانؓ فارسی ہجرت نبوی سے قبل تلاش حق میں بہت ملکوں کی خاک چھاننے کے بعد مدینہ منورہ آ بسے تھے اور مدنی بن چکے تھے، وہ ہجرت کے بعد اسلام لائے اور ابو الدرداء کے بارے میں ابن اثیر کا دلچسپ تبصرہ ہے کہ وہ اپنے خاندان (دار) والوں میں سب سے آخر میں اسلام لائے۔ ۵؎ ابن ہشام، السیرۃ النبویہ، قسم اول، ۵۰۴ ۶؎ ابن سعد، الطبقات الکبریٰ، اول ص ۳۸-۲۳۸، میں مواخات کے ذریعہ استوار ہونے والے رشتہ کے بھائیوں کا ذکر نہیں ہے، لیکن دوسری جلدوں جلد سوم میں جو پوری صحابۂ کرام کے مہاجرہ وانصار طبقات پر مبنی ہے، ان حضرات کے تذکروں میں ان کی مواخات کا ذکر ضرور کرتے ہیں اور دینی بھائیوں کا ذکر نہیں کرتے بلکہ بعض دوسری اختلافی روایات بھی نقل کرتے ہیں جن میں ایک مہاجر صحابی کی مواخات دو دو یا تین تین انصاری صحابہ سے معلوم ہوتی ہے۔ ان اختلافی روایات کا تجزیہ آگے آئے گا۔ ۷؎ بلاذری، انساب الاشراف، مرتبہ محمد حمید اللہ، قاہرہ ۱۹۵۹ء، اول، ص ۷۱-۲۷۰ ۸؎ ابن سعد، الطبقات الکبریٰ، جلد سوم ۹، ۲۲، ۴۲، ۵۱، ۵۶، ۸۸، ۱۰۲، ۱۲۶ وغیرہ ۹؎ ابن سعد نے مکی اور مدنی مواخات کی تفریق نہیں کی ہے بلکہ ہم نے کی ہے کیونکہ وہ ایک مہاجر کی دوسرے مہاجر سے مواخات کا ذکر کرتے ہیں جو حقیقت میں مکی عہد کی ہے۔ مگر ابن سعد کے مطابق وہ مدنی ہے کیونکہ وہ مہاجرین کے باہمی بھائی چارے کے بھی اسی طرح قائل ہیں جس طرح مہاجرین وانصار کے درمیان مواخات کے۔ ۱۰؎ ابن اسحاق/ابن ہشام، اول ۲۶۷ ابوطالب سے قریشی اکابر نے جو شکایت کی تھی کہ انہوں نے تمہارے اور تمہارے آباء واجداد کے دین کی مخالفت کی اور تمہاری قوم کے

اتحاد کو پارہ پارہ کردیا (و فرق جماعۃ قومک) اور ان کی عقلوں یا عقلمندوں کو حماقت آمیز ٹھہرایا۔ ص ۲۷۰ پر ان کا ایک اور شکوہ نقل کیا ہے: "... وہ ایسا کلام لے کر آئے ہیں جو جادو ہے جس کے ذریعہ وہ آدمی اور اس کے باپ میں، انسان اور اس کے بھائی میں اختلاف پیدا کردیتا ہے، شوہر کو بیوی سے اور انسان کو اس کے خاندان (عشیرہ) سے جدا کردیتا ہے"۔ ایسی مثالیں اور شکوے بہت ہیں، اسلام لانے سے قبل حضرت عمرؓ کو بھی اس کی شکایت تھی ۱۲۰ء ابن ہشام، اول ص ۳۷۳: حضرت عمرؓ نے جب مجلس قریش میں اپنے قبول اسلام کا اعلان و اظہار کیا تو ان کو خوب زدوکوب کیا گیا، اسی دوران انکی زبان مبارک سے یہ جملہ نکلا" افعلوا مابدا لکم فاحلف باللہ ان لو قد کنا ثلاث مئۃ رجل (لقد) ترکنا ھا لکم او ترکتموھا لنا ..." جو تمہارا جی چاہے کرو۔ اللہ کی قسم کھاتا ہوں کہ اگر ہم تین سو مردان کار ہوگئے تو یا ہم اسکو (مکہ کو) تمہارے لیے چھوڑیں گے یا تم اس کو ہمارے لیے خالی کردوگے۔ ..."

عرب ضرب الامثال کے آئینہ میں

از ڈاکٹر منظور احمد خان، کشمیر

عربی زبان و ادب کی تاریخ سولہ صدیوں سے زائد کی مدت پر محیط ہے۔ شروع شروع میں عربی زبان صرف جزیرہ نمائے عرب میں ہی بولی جاتی تھی، لیکن ظہور اسلام کے بعد یہ اسی برق رفتاری سے جزیرہ کے قرب و جوار اور پورے شمالی افریقہ میں پھیل گئی جس برق رفتاری سے خود اسلام ان ممالک میں پھیل گیا۔ عربوں کو ابتدا ہی سے دوسری قوموں کے مقابلہ میں اپنے قادر الکلام ہونے پر فخر حاصل رہا ہے اور یہی وجہ ہے کہ وہ بقیہ دنیا کو "عجم" یا گونگا کہا کرتے ہیں۔ گو عربوں کا یہ خیال تعصب پر مبنی ہے، تاہم عربی زبان کی فصاحت و بلاغت، اس کا انوکھا پیرایۂ بیان، اس کے افعال کی ندرت اوزان، اس کے مشتقات کی خوبصورتی اور اس کا غیر عربی الفاظ کو بڑی مہارت سے عربی قالب میں ڈھالنا اس کے کچھ ایسے مابہ الامتیازات ہیں کہ شاید اللہ تعالیٰ نے کئی دوسرے وجوہ کے ساتھ ساتھ اس سبب کی وجہ سے بھی اپنے پیغام کو اسی زبان میں بھیجا۔

عربی ضرب الامثال اور محاورے عربوں کے صدیوں کے تجربات اور مشاہدات کا ثمرہ ہیں۔ یہ تجربات انہیں جزیرے کے تپتے صحراؤں سے لے کر شام و لبنان کی حسین و جمیل وادیوں اور یمن و امارات کے اتھاہ گہرے سمندروں سے لے کر مصر و عراق کے مشہور و معروف دریاؤں میں عمر فانی کے شب و روز گزار کر خود اپنے ہم قوم لوگوں اور غیر قومی

لوگوں سے ساتھ رہ کر حاصل ہوئے۔ ان امثال و محاوروں کو اگر تاریخی پس منظر میں دیکھا جائے تو عربوں کا تمدن وثقافت، ان کی نفسیات اور ماحول کو سمجھنے میں آسانی ہوگی۔ اسی بات کے پیش نظر زیر بحث مقالہ کو مندرجہ ذیل عنوانات کے تحت تقسیم کیا گیا ہے۔

(۱) صحرائی زندگی اور دور جاہلیت (۲) عربوں کے ماحولیاتی مشاہدات (۳) عرب اور اسلام (۴) تاریخی حوالے (۵) فصاحت و بلاغت (۶) دانائی و حکمت (۷) بذلہ سنجی (۸) امثال و محاوروں کا آفاقی پہلو۔

۱۔ صحرائی زندگی اور دور جاہلیت | یہ بات تاریخی اعتبار سے بالکل واضح اور بین ہے کہ عرب اسلام سے قبل قتل و غارت گری کے نہایت خوگر تھے۔ ان کے یہاں سے امن و امان مفقود ہوگیا تھا۔ وہ نہایت معمولی باتوں پر سالہا سال تک ایک دوسرے کے خون کے پیاسے رہتے اور جنگ وجدال کو معیوب سمجھنے کے بجائے اس پر فخر محسوس کرتے تھے۔ درج ذیل امثال اوپر بیان کردہ حقائق کی آئینہ دار ہیں۔

۱۔ الروم اذا لم تغز غزت (اگر رومیوں پر کوئی حملہ نہیں کرتا تو وہ خود کسی پر حملہ آور ہوتے ہیں) ۲۔ أشأم من البسوس (بسوس سے زیادہ بدشگون)۔ بسوس ایک خاتون کا نام ہے جس کی سراب نامی اونٹنی ایک دن اس کے حریف کی چراگاہ میں چل دی، اس قبیلہ کے کلیب نامی سردار نے جب اسے دیکھا تو اس کے تھن پر تیر برسائے اونٹنی فوراً اپنے مالکن کے دیار کی طرف بھاگ گئی اور صحن میں انتہائی دردوالم میں تھن سے خون اور دودھ ایک ساتھ بہاتے ہوئے بیٹھ گئی۔ اس بات پر دونوں قبیلوں کے درمیان جنگ چھڑ گئی جو چالیس سال تک چلتی رہی اور جس میں دونوں فریقین کی کثیر تعداد لقمۂ اجل بن گئی۔ ۳۔ بینهم عطر منشم[۱] (ان کے درمیان منشم کی عطر ہے) یہ منشم ایک

[۱] المیدانی (ابوالفضل احمد بن محمد النیسابوری)، مجمع الامثال، ج ۱/ ۱۲۰، ۳۲۴، ۵۲۱۔

خاتون عطارہ تھی جس کا عطر خزاعہ اور جرہم نامی دو قبائل جنگ سے پہلے یہ مان کر لگاتے کہ اس کے لگانے سے دشمن کے مقتولین کے ڈھیر لگتے ہیں۔

جنگ و جدال کے اس ماحول میں صرف بہادر، نڈر اور بے خوف نفوس ہی سر اٹھا کر زندہ رہ سکتے تھے، بزدلوں اور نکموں کی نہ صرف کوئی وقعت نہیں تھی بلکہ انہیں انتہائی حقارت و ذلت کی نظر سے دیکھا جاتا تھا۔ مثلاً بزدل کے بارے میں کہا گیا ہے: ان الجبان حتفہ من فوقہ، اس کا ترجمہ علامہ اقبالؒ کے اس مصرعے سے کیا جا سکتا ہے:

ہے جرم ضعیفی کی سزا مرگ مفاجات۔

بزدل کی نفسیات پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا گیا ہے کہ "عصا الجبان أطول" اور "جبان ما یلوی علی الصفیر" [1] یعنی بزدل کی لاٹھی لمبی ہوتی ہے اور بزدل کبھی سیٹی کی طرف متوجہ نہیں ہوتا۔ ظاہر ہے کہ لمبی لاٹھی کا سہارا تو وہی لے گا جسے اپنے بازوؤں پر بھروسہ نہ ہو اور بھلا بزدل اور للکار کا آپس میں کیا تعلق؟

کوئی انسان یا انسانی گروہ چاہے کتنا ہی نڈر اور بہادر کیوں نہ ہو، وہ دوسروں سے بے نیاز نہیں ہو سکتا۔ اس نفسیاتی و عملی حالت کو شدید دوستی کا نام دیا گیا ہے۔ تاہم عرب اکثر و بیشتر اس رشتے کو بھائی چارے سے موسوم کرتے ہیں جس سے انکے ہاں اس کی قدر و قیمت کا اندازہ ہوتا ہے۔ اسی بات کے پیش نظر وہ کہتے ہیں: "رب أخ لم تلدہ أمک" [2] (تمہارے کتنے ہی ایسے بھائی ہیں جنھیں تمہاری ماں نے نہیں جنا ہے) عرب چونکہ بدوی یا خالص دیہی ماحول سے تعلق رکھتے ہیں اس لیے ان کی طبیعت اور تکلف میں مشرق و مغرب کا بعد ہے اور اگر یہ بے تکلفی عام لوگوں سے برتی جا رہی

---

[1] المیدانی (ابوالفضل احمد بن محمد النیسابوری) مجمع الامثال، ج ۱/ ۱۸، ۲۴۱، ۲۴۲، ۴۴۲ [2] ایضاً: ص ۱۹۹ مطبع خیریہ ۱۳۱۰ھ۔

ہو تو بھلا ایک دوست کے ساتھ کیوں نہیں؟ یہی وجہ ہے کہ ان کے ہاں مشہور ہے: "اذا ترضیت أخاك فلا أخاً لك" (اگر تو اپنے بھائی کو خوش کرنے میں لگا ہے تب وہ تمہارا بھائی ہی نہیں ہے) اس بے تکلفی کو کھونا تو در کنار، بلکہ اسے کھونے کا خیال تک انکے ہاں محال ہے۔ ان کا کہنا ہے: "حافظ علی الصدیق ولو فی الحریق"[1] (دوست کی حفاظت کر، گرچہ وہ آگ میں گھرا ہو)۔

جاہلی عربوں کا مسکن بنیادی طور پر جزیرہ عربیہ کے بیکراں صحرا ہیں، جہاں بود و باش انتہائی مشکل اور سفر بسا اوقات جان لیوا ثابت ہوتا تھا۔ ایسے ماحول میں اگر وہاں کے باشندے باہم جود و سخا کا مظاہرہ نہیں کرتے تو ان کی مجموعی بقا متزلزل ہوتی، بالخصوص جب وہ قبیلوں کی صورت میں ایک جگہ سے دوسری جگہ اجتماعی ہجرت کے خوگر تھے۔ نتیجتاً تمام عرب سخاوت اور فیاضی برتنے پر فخر محسوس کرتے اور بخیل کو گری ہوئی نظر سے دیکھتے تھے۔ چونکہ جود و سخا ان کی حسن معاشرت کا جزو لاینفک اور ان کے اخلاق کی کسوٹی تھی، اسی لیے شاید انھوں نے اس کی ترغیب کی کوئی ضرورت محسوس نہیں کی جبکہ بخیل کو طرح طرح کے طعنوں اور تشنوں کا نشانہ بنایا گیا۔ پس اگر کوئی کسی کی ضیافت کرنے سے قاصر ہوتا تو وہ کہتا: "بیتی یبخل لا أنا" (میرا گھر بخل برت رہا ہے، میں نہیں)۔ بخیل کے بارے میں کہا جاتا: "سواء ھو والعدم" (اس کا ہونا نہ ہونا دونوں برابر) اور "دمعة من عوراء غنیمة باردة" (کانی عورت کا آنسو ٹھنڈا مال غنیمت کے مترادف ہے)۔ بخیل کی نفسیات کا پتہ مندرجۂ ذیل امثال سے چلتا ہے: "اذا قلت له زن، طأطأ راسه وحزن" (جب تو اس سے کچھ مانگتا ہے تو وہ

---

[1] المیدانی، ج ۱، ص ۲۰۷۔

غم کے مارے اپنا سر جھکاتا ہے) اور "تشتمی و تشتکی"[۱] (چت بھی میرا اور پٹ بھی میرا)

۲۔ عربوں کے ماحولیاتی مشاہدات | صحرا میں عربوں کو جہاں اونٹ اور کتے کی رفاقت میسر آکر ان کی بود و باش قدرے آسان ہوئی، وہیں انہیں بھیڑیے جیسے انتہائی مضرت رساں جانوروں سے بھی واسطہ پڑا۔ نیز ان کے مشاہدہ میں بلی جیسا چھوٹا گوہ نامی صحرائی جانور آیا، جسے انہوں نے کبھی غائب دماغی پر محمول کیا، کبھی طویل العمری میں بطور مثال پیش کیا، تو کبھی حد درجہ کی قوت سماعت میں[۲]

قرون اولیٰ کے مخدوش سیاسی اور سماجی حالات نے عرب و عجم میں انسانوں کی خرید و فروخت کی بدعت کو جنم دیا اور عرب صحرا نورد اس ظلم و بربریت میں پیش پیش تھے۔ نتیجتاً ہر قبیلہ کے پاس کئی کئی غلام و لونڈیاں ہوا کرتی تھیں۔ یہ غلام چونکہ کسی بھی طرح اپنی مرضی کے مالک نہیں ہوا کرتے تھے، اس لیے ان کے آقا ان سے جو کام چاہتے لیتے تھے۔ تاہم غلاموں کی جنسی شرارت سے بچنے کے لیے عرب انہیں آختہ کیا کرتے تھے جن کی نفسیات عورتوں کی نفسیات جیسی ہوتی تھی۔ ان کی زنانہ نفسیات کی عکاسی یہ محاورہ کرتا ہے: "اسرع من دمعۃ الخصی"[۳] (خصی کے آنسوں سے تیز تر) بایں ہمہ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ انسانی نفس دبانے سے نہیں دبتا بلکہ اس میں انتقامی جذبہ پیدا ہوتا ہے۔ ایسا ہی کچھ ان غلاموں کے ساتھ بھی ہوا جو ان کے تعلق سے مشہور ہوا کہ "کل عبد ان جاع سرق، و ان شبع فسق"[۴] (ہر غلام بھوکا ہونے پر چوری کرتا ہے اور بھرا پیٹ ہونے پر برائی)

---

[۱] المیدانی: ۱/ ۸۵، ۱۲۹، ۱۹۶، ۲۷۵، ۲۷۴ [۲] ایضاً: ۳۰۳، ۳۴۹، ۴۸۳ [۳] ایضاً: ۳۹۰ [۴] BURCKHART, ARABIC PROVERBS - P. 203.

اونٹ نہ صرف عربوں کے لیے صحرائی جہاز کا کام دیتا تھا بلکہ وہ ان کی مالی خوشحالی وآسودگی کا بین مظہر بھی تھا۔ لہذا اگر کسی پر برے دن آتے تو وہ اسے یوں تعبیر کرتے تھے: "العنون بعد النوق" (فلاں کے پاس اونٹوں کے بعد بھیڑیں آئی ہیں)۔

اونٹ کی عمر کے مختلف ادوار کو مندرجہ ذیل امثال ومحاوروں میں ثبت کیا گیا ہے:

(۱) أتعب من راكب فصيل (غیر سدھائے ہوئے اونٹ سے زیادہ تھکنے والا)۔

(۲) أحن من شارف (عمر رسیدہ ماں اونٹنی سے زیادہ شفیق) اور (۳) اذا جاء اجل البعير حام حول البئر[۱] (جب اونٹ کی موت آتی ہے تو وہ کوئیں کے ارد گرد چکر لگاتا ہے)۔

کتے کو جہاں فرمانبرداری، شکر گذاری، فرض شناسی اور الفت کی مثال قرار دیا گیا ہے، وہیں اسے حرص وطمع[۲] اور کج طبعی کا نمونہ بھی بنایا گیا ہے[۳] نیز اسے متضاد حرکتوں کے صدور کا قصوروار ٹھہرا کر انعام وتعذیب کا مستحق گردانا گیا ہے[۴]

بھیڑیا عربوں کے نزدیک نہایت ہی حیلہ گر، غدار، ظالم محتاط، بھوکا اور صحت مند ہے[۵] اس کی کامل صحت مندی کو دیکھتے ہوئے وہ اگر کسی کو ہلاک ہونے کی بددعا دینا چاہیں تو کہتے ہیں: رماه الله بداء الذئب[۶] (اللہ اسے بھیڑیے کی بیماری یعنی موت سے دوچار کرے)۔

۳۔ عرب اور اسلام | اسلام نے جہاں سکرات سے دوچار انسانیت کو نئی زندگی بخشی،

---

[۱] المیدانی: ۱/۱۱۹، ۲۰۶، ۳۱۷، ۶۳۵ [۲] ایضاً: ۱۱۸، ۳۱۷، ۳۱۸، ۵۳۹، ۶۱۰ [۳] BUR-CKHART, P. 91. [۴] ذنب الكلب يكسبه الطعم وفمه يكسبه الضرب، المیدانی: ۱/ ۳۴۸ [۵] ایضاً: ۲۵۸، ۳/۴، ۳۱۷، ۳۵۹ [۶] ایضاً: ۳۰۲۔

دہی ان گمنام عربوں کو وہ شان و شوکت عطا کی جس کا وہ تصور بھی نہیں کر سکتے تھے۔
عرب اس وقت کی دو عالمی طاقتوں فارس اور روم کے درمیان ایک ناقابل عبور خلیج کا کام دیتے تھے۔ تاہم کسی دوسری قوم پر اپنا اثر و نفوذ ڈالنا تو درکنار، قریب تھا کہ لوگ طیش اور جہالت میں آپس ہی میں لڑ کر کٹ مرتے۔ اسلام نے نہ صرف انہیں سیاسی اعتبار سے متحد کیا بلکہ زندگی کے باریک سے باریک تر مسئلے کے سلسلے میں ایک منفرد زاویہ نظر عطا کیا۔ اسلام کے دو ترجمان قرآن و حدیث نے ان کی زندگی پر اتنے گہرے نقوش چھوڑے کہ وہ اٹھتے بیٹھتے، کھاتے پیتے اور سوتے جاگتے، ہر حال میں ان کے فقرے استشہاداً دہرانے لگے۔ قرآن و حدیث کی اس تاثیر کو ہم تین عنوانات کے تحت بیان کریں گے۔ (۱) قرآنی آیات سے استشہاد (۲) احادیث نبویہ سے استشہاد اور (۳) اسلامی تصورات فکر و عمل۔

قرآن پاک کی بے شمار آیات مبارکہ ایسی ہیں جنھیں عرب بطور مثل پیش کرتے ہیں۔ مثال کے طور پر سورۂ یوسف کی ۲۶ ویں آیت کا یہ حصہ نسلی اور گروہی وابستگیوں کے باوجود اعتراف حق کے لیے پیش کیا جاتا ہے: وشھد شاھد من اھلھا (اور خود زلیخا کے افراد خانہ میں سے ایک فرد نے شہادت دی) حیرت اور ششدر رہ جانے کے لیے سورۂ الاعراف کی ۱۴۹ ویں آیت کا یہ حصہ دہرایا جاتا ہے: "سقط فی یدہ"

شاید قرآن پاک کا اسلوب خطابی ہونے اور حدیث نبویؐ کا عام بول چال سے قریب ہونے کی بنا پر احادیث قرآنی آیات کی نسبت امثال و محاوروں میں زیادہ استعمال کی جانے لگیں۔ تاہم یہ بات قابل توجہ ہے کہ احادیث کے متن میں کہیں جزوی تبدیلی کی گئی ہے اور کہیں پورے کے پورے الفاظ بدل دیے گئے ہیں۔ مثال کے طور پر حسن معاشرت

کے سلسلے میں درج ذیل احادیث کو عام رواج ملا: (۱) أخوك من صدقك النصيحة (تمہارا بھائی وہ ہے جو تمہارا خیر خواہ ہو) (۲) لا يشكر الله من لا يشكر الناس (جو لوگوں کا شکر گزار نہیں ہے وہ بھلا اللہ کا شکر گزار کیسے ہو سکتا ہے۔) (۳) خیارکم خیرکم لأهله (تم میں سے بہترین وہ ہے جو اپنے گھر والوں کے ساتھ بھلائی سے پیش آتا ہو) (۴) الدال على الخير كفاعله (نیکی کی ترغیب دینا نیکی کرنے کے برابر ہے) (۵) السر أمانة (راز ایک طرح کی امانت ہے) اور (۶) الجالب مرزوق والمحتكر ملعون[1] (اشیائے مایحتاج کا فراہم کنندہ پسندیدہ ہے، جبکہ ذخیرہ اندوز ملعون ہے)۔

قرآن وحدیث کے علاوہ فکر وعمل کے چند اسلامی تصورات بھی عربی کہاوتوں اور محاوروں کا حصہ بنے جو عربوں کی اسلام سے گہری وابستگی اور اسلامی زندگی کے غماز ہیں مثلاً قرآن کی پہلی سورت جو دوران نماز ہر رکعت کی ابتدا میں پڑھی جاتی ہے، ہر کام کے شروع کے لیے جا فذ بولی جاتی ہے۔ پوری کہاوت یوں ہے: اذا نسيت الحمد تصلى بايش (اگر تو الحمد ہی بھول گیا تو تمہاری نماز کیسے ہوگی؟) اسی طرح اسلام کے تصور حلال وحرام اور زکوٰۃ کو لیجیے۔ حلال ترین شئے کے بارے میں عربوں میں مشہور ہے کہ: "أحل من لبن الأم" (ماں کے دودھ سے بھی زیادہ حلال)۔

زکوٰۃ مال اور دل کی تطہیر کا دوسرا نام ہے اور ہر صاحب نصاب سچا مسلمان اسے باعث شرف وسعادت سمجھتا ہے۔ تاہم سبھی طرح کے اموال پر زکوٰۃ لازم نہیں آتی ہے۔

---

[1] المیدانی: ۱/۲۴، ۲۹۴، ۳۴۹، ۳۶۲، ۱۴۹۹ اور BURCKHART, P. 212۔

[2] BURCKHART, P. 4. [3] المیدانی: ۱/۳۱۸۔

اسی لیے وہ مال جس کی زکوٰۃ نہ نکالی جائے، عربوں کے نزدیک بدترین مال ہے۔ ان کا کہنا ہے: شر المال مالا یزکی ولا یذکی۔[1]

تاریخی حوالے | عربی امثال و محاورے نہ صرف دینی اور معاشرتی تبدیلیوں کے شاہد ہیں بلکہ ان میں مختلف تاریخی واقعات کو بھی نہایت ہی خوش اسلوبی کے ساتھ محفوظ کیا گیا ہے یہ واقعات جاہلی شخصیات، انبیاء علیہم السلام، قرآنی شخصیات، صحابہ وصحابیات اور خلفاء و امراء سے متعلق ہیں۔ جاہلی شخصیات میں حاتم طائی کا نام جود و سخا میں بطور مثال پیش کیا جاتا ہے جبکہ قس بن ساعدۃ فصاحت و بلاغت میں اپنی مثال آپ ہے۔ انبیائے کرام میں حضرت نوحؑ کے کوے کو دیر لگانے میں، قوم ثمود کے گستاخ شخص کو بدشگونی میں، حضرت خضر کو متواتر سفر کرنے میں اور حضرت یوسف کے بھائیوں کو غداری میں مشتبہ بہ قرار دیا گیا ہے۔ قرآنی شخصیات میں جلندی نامی بادشاہ کو جو حضرت موسیٰ کے زمانہ میں کشتی بانوں کو زبردستی بیگار پر لیتا تھا، ظلم کی مثال اور ابولہب کی بیوی ام جمیل کو تباہی و بربادی کا سرچشمہ بتایا گیا ہے۔[2]

حضرت علی کرم اللہ وجہہ پر جب ابن ملجم نے تلوار سے حملہ کیا تو حضرت نے افسردگی میں فرمایا: "أرید حباءہ و یرید قتلی (میں اسے بخشش سے نوازنا چاہتا ہوں اور وہ مجھے قتل کرنے کے درپے ہے) حضرت عبد اللہؓ بن زبیر کو جب حجاج بن یوسف نے حرم کعبہ میں محبوس کرکے جنگ پر مجبور کیا تو آپ نے لڑائی پر چل پڑنے سے پہلے اپنی والدہ سے

---

[1] رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: لیس فی الجبھۃ (الخیل) ولا فی الکمعۃ (الحمیر) ولا فی النخۃ (الرقیق) صدقۃ۔ دیکھو المیدانی: ۱/۵۰۳ [2] المیدانی: ۱/۱۶۲، ۲۵۳، ۲۵۴، ۳۶۲، ۴۹، ۵۲۸، ۶۲۰۔

اجازت لینے کی غرض سے ملاقات کی۔ دوران ملاقات انہوں نے حجاج کے ہاتھوں قتل ہونے کے بعد اپنی لاش کے ساتھ زیادتی کیے جانے کے احتمال کا ذکر کیا، اس پر بہادر والدہ نے اس کا حوصلہ بڑھاتے ہوئے کہا: الشاۃ المذبوحۃ لا تألم السلخ[1] (ذبح شدہ بکری کھال کھینچے جانے کی تکلیف کو محسوس نہیں کرتی ہے) مذکورہ دونوں فقرے بعد میں زبان زد خاص و عام ہوئے۔

اموی خلفاء چونکہ خالص عربی النسل تھے، اس لیے ان کی زبان عباسی خلفاء کے مقابلے میں زیادہ فصیح و بلیغ تھی۔ ان کے کئی فقرے عام کہاوتوں کا درجہ حاصل کر گئے۔ مثلاً حضرت معاویہؓ نے جب یہ سُنا کہ حضرت علیؓ کے مصر کے نامزد گورنر اشتر نخعی زہریلے شہد کے سبب لقمۂ اجل بن گئے تو انہوں نے خوشی کا اظہار کرتے ہوئے کہا: ان للّٰہ جنوداً فیہا العسل (اللہ تعالیٰ کی کئی طرح کی فوج ہے جس میں شہد بھی ہے) ان کا یہ فقرہ بعد میں دشمن کو مبتلائے مصیبت دیکھ کر اظہار خوشی کے لیے ہر خاص و عام میں مقبول ہوا۔ اسی طرح حجاج کے بارے میں مشہور ہے کہ وہ اہل واسط کو تعمیراتی کاموں کیلئے بیگار پر لیا کرتا تھا اور واسطی بیگانہ بن کر مسجد میں اجنبیوں کے درمیان سویا کرتے تھے۔ تاہم سپاہی ان کی تلاش میں نکل کر مسجد میں داخل ہوکر "اے واسطی" پکارا کرتے تھے۔ اور جو شخص بھی سر اٹھاتا اسے وہ پکڑ لے جاتے تھے لہذا ہر واسطی انجان بنتا تھا اور اسی لیے یہ فقرہ مشہور ہوا: تغافل کانک واسطی[2] (ایسا انجان بن گویا تو واسطی ہے)۔

ہر چند کہ یہود کو جزیرہ نمائے عرب سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد مبارک

---

[1] المیدانی: ۲۷، ۴۴۴، ۵۴۴۔

میں بے دخل کیا گیا، پھر بھی وہ شام و فلسطین اور مصر و عراق میں اپنی بود و باش جاری رکھے رہے۔ یہودیوں کے تعلق سے مشہور ہے کہ وہ تاجرانہ ذہنیت کے مالک ہونے کے ساتھ ساتھ انتہائی خودغرض اور لالچی ہوا کرتے ہیں۔ درج ذیل کہاوتوں میں ان کی اسی نفسیات کی عکاسی کی گئی ہے، (۱) اذا افتقر الیھودی نظر فی حسابہ العتیق (جب یہودی پر برے دن آتے ہیں تو وہ پرانے کھاتوں کو ٹٹولتا ہے) اور (۲) اصاب الیھودی لحما رخیصا فقال ھذا منتن[1] جب یہودی کے ہاتھوں سستا گوشت آیا تو اس نے کہا کہ وہ بدبودار ہے)

۵۔ فصاحت و بلاغت | امثال و محاورے بجائے خود ہی اختصار و ایجاز کے اعتبار سے ایک اعلیٰ درجہ رکھتے ہیں، تاہم مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ان کی فصاحت و بلاغت کے چند اور پہلوؤں کی طرف اشارہ کیا جائے۔ ہر زبان کی طرح عربی زبان میں بھی تشبیہات کو ایک خاص مقام حاصل ہے جو نہ صرف عربوں کی زندگی کے غائر فہم و ادراک پر دلالت کرتی ہیں بلکہ ان کے ماحولیاتی شاہدات کی بھی غماز ہیں۔ مثلاً سلامتی میں مکے کا کبوتر بطور مثال پیش کیا جاتا ہے، بینائی میں دوران شب چمگادڑ، پائداری میں پتھر پر ثبت عبارت، جرات میں مکھی، نفع یابی میں بروقت بارش، ہلکے پن میں تتلی، سستے پن میں مٹی، بابصرے کی کھجور، کبر و غرور میں کوا یا مور، ستھرے پن میں شہد، صبر و شکیب میں گدھا بازمین، پیاس میں ریت، عدل و انصاف میں ترازو، گہرائی میں سمندر اور نایابی میں بھی تریاق تو کبھی نامرد کا بیٹا اور کبھی مچھر کا دماغ تو کبھی اڑتا عقاب[2]

---

[1] المیدانی: ۱/۱۹۹، ۸، ۵ [2] ایضاً: ۱/۸، ۵۷، ۱۴۲، ۲۵۱، ۲۶۲، ۳۵۲، ۴۴۳، ۴۵۹، ۵۷، ۵۶۰، ۶۲۱، ۶۸۸، ۶۸۹۔

تشبیہات سے بھی بڑھ کر مجاز کی ایک شکل کنایہ ہے، زبان و بیان کی گہرائی و گیرائی میں اس کا نمایاں حصہ ہے۔ مثلاً بزدلی کو یوں تعبیر کیا جاتا ہے: اشبہ فلان امہ (فلاں نے اپنی ماں کی صفات پائی ہیں) بدنصیبی کے لیے بولا جاتا ہے: لوا تجرت فی الاکفان ما مات احد (اگر میں کفن کی تجارت شروع کر دوں تو لوگ مرنا بند کر یں گے) کسی کے عجز و قصور اور ضعیفی کو نہایت ہی خوبصورت پیرایہ میں بیان کیا گیا ہے: ذھب منہ الاطیبان (وہ لذت طعام اور لذت نکاح سے محروم ہو گیا)۔ درازی عمر کو یوں تعبیر کیا گیا ہے: نشأ مع نوح فی السفینۃ[1] (وہ حضرت نوح کی کشتی میں نشو و نما پایا ہے)

مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کہتے ہیں کہ مجھے عرب میں گدگدی کا لفظ معلوم نہیں تھا، یہاں تک کہ ایک دن میں عربوں کی کسی مجلس میں بیٹھا تھا اور وہاں بے حسی پر بات ہو رہی تھی کہ اتنے میں کسی نے یہ مثال دہرائی: یدغدغ فی الصباح و یضحک فی المساء (کسی کو صبح میں گدگدی کی جائے اور وہ شام کو ہنسے)۔ مجبوری کی اس سے زیادہ اور کیا حسین تعبیر ہو سکتی ہے کہ "ضحک الجوزۃ بین حجرین (دو پتھروں کے درمیان اخروٹ کی ہنسی)۔ کساد بازاری کو اسلامی تصور جنت سے کنایۃً یوں تعبیر کیا گیا ہے: سوقنا سوق الجنۃ (ہمارا بازار تو جنت کا بازار ہے) تجربہ کار شخص ہمیشہ دوسروں کے صلح مشورے سے بے نیاز ہوتا ہے، اس خیال کو یوں بیان کیا گیا ہے ان العوان لا تعلم الخمرۃ (ادھیڑ عمر والی عورت کو دوپٹہ باندھنا نہیں سکھایا جاتا ہے) عورت کو طلاق دیتے وقت نہایت ہی خوبصورت انداز میں یہ کہتے ہوئے رخصت

---

[1] المیدانی ۱۹۱، ۵۱۷ اور BURCKHART, PP. 209, 244.

کیا جاتا ہے۔ حبلك علی غاربك[1] (تمہاری رسی تمہارے کوہان پہ ہے یا تمہاری رسی ڈھیلی ہے)۔

۷۔ دانائی وحکمت | عربوں کو جزیرہ عربیہ میں انتہائی ناموافق و ناسازگار حالات سے دوچار ہونے پر زندگی کی تلخیوں کا راست تجربہ ہوا، آگے چل کر یہی تجربے اور مشاہدے امثال ومحاورہ[1] کی صورت میں ان کی زبان پر رواں ہوئے۔ ان کی اس دنیا بینی اور حکمت سنجی میں اس وقت چار چاند لگ گئے جب مطلق رشد وہدایت کے ابدی سرچشمے نے ان کے دل و دماغ پر قرآن وحدیث کی صورت میں حکومت کرنی شروع کی۔ لہٰذا حکمت و دانائی پر مبنی ان کے اقوال اکثر اوقات انہی دو پہلوؤں پر محیط نظر آتے ہیں۔ دور جاہلیت کے مشاہدات درج ذیل اقوال میں پائے جاتے ہیں: (۱) اول الشجرة النواة (پیڑ کی ابتدا گٹھلی سے ہوتی ہے)، (۲) بعد الدار کبعد النسب (گھر کی دوری حسب ونسب کی دوری کی مانند ہے)۔ (۳) تضرع الی الطبیب قبل ان تمرض (ضرورت سے پہلے ہی دوستوں کا انتخاب کر) (۴) دل علی عاقل اختیارہ (حسن انتخاب عقلمندی کی نشانی ہے) (۵) رضا الناس غایة لا تدرک (لوگوں کی رضامندی کبھی حاصل نہیں ہوتی ہے) (۶) السفر میزان القوم[2] (سفر مسافرین کے اخلاق کی کسوٹی ہے)۔

اسلامی فلسفۂ حیات پر مندرجۂ ذیل اقوال سے روشنی پڑتی ہے (۱) رای الشیخ خیر من مشهد الغلام (بزرگ کی رائے نوجوان کے مشاہدے سے بہتر ہے) (۲) الجهل موت الاحیاء (جہالت زندوں کی موت ہے) (۳) ناصح الاحمق عدوہ (بیوقوف کا

---

1. المیدانی: ۱/۲۸، ۲۷۳، ۳۹۹، ۵۹۲ 2. ایضاً: ۸۱، ۱۳۷، ۱۹۹، ۳۸۱، ۳۲۰، ۳۸۳۔

بھی خواہ اس کا دشمن ہے) (۴) راس الخطایا الحرص والغضب (گناہوں کی انتہا لالچ اور غصہ ہے) (۵) الصبر مفتاح الفرج (صبر مسرت وشادمانی کی کنجی ہے) (۶) التدبیر نصف المعیشۃ (حسن تدبیر آدھی کمائی ہے) (۷) الصناعۃ فی الکف امان من الفقر (ہنر افلاس سے نجات کی ضمانت ہے) (۸) طول اللسان یقصر الاجل (زبان درازی عمر کو تاہ کرتی ہے) (۹) الصمت یکسب اھلہ المحبۃ [۱] (خموشی سے محبت پروان چڑھتی ہے۔)

۷۔ بذلہ سنجی | بذلہ سنجی میں عرب کسی قوم سے پیچھے نہیں ہیں اور ان کے ہاں جُحا نامی ایک مستقل کردار ہے جس سے ہمارے ہاں کے سردار جی کی طرح ہر لطیفہ منسوب کیا جاتا ہے۔ جُحا کا پورا نام مولوی نصر الدین ہے جو نہ صرف عربوں کے ہاں بلکہ پورے وسط ایشیا میں مقبول عام ہے۔ کچھ سال پہلے ٹیلی ویژن سے ملا نصر الدین نامی سیریل ٹیلی کاسٹ ہوا تھا شاید روسی زبان سے ترجمہ کیا گیا تھا۔ عرب اگر کسی کو پرلے درجے کا بیوقوف کہنا چاہیں تو وہ کہتے ہیں: ھو احمق من جحا [۲] (وہ جُحا سے بھی بڑھ کر بیوقوف ہے) جُحا کے چغد ہونے کی بھی دلچسپ کہانی ہے، کہتے ہیں کہ وہ ایک دن کوفہ کے مضافات میں زمین کھود رہا تھا کہ عیسیٰ بن موسیٰ نامی شخص کا وہاں سے گزر ہوا۔ جب اس نے اسے زمین کھودتے ہوئے دیکھا تو اس کی وجہ پوچھی۔ حضرت جُحا کہنے لگے کہ اس نے کچھ عرصہ پہلے وہاں اشرفیاں دفن کی تھیں جو اسے اب نہیں مل رہی ہیں۔ عیسیٰ نے پوچھا کہ آیا اس نے اشرفیوں کی جگہ کوئی نشانی چھوڑی ہے؟ جُحا نے اثبات میں جواب دیا۔ عیسیٰ نے وضاحتاً پوچھا کہ وہ نشانی کیا تھی؟ جُحا نے کہا کہ

[۱] المیدانی: ۲۰۸/۱، ۲۶۵، ۳۰۹، ۵۵۲، ۵۶۹، ۶۱۲ اور BURCKHART, p. 242.
[۲] المیدانی: ۳۱۱/۱۔

آسمان پر ایک بادل تھا جو انہیں سایہ کر رہا تھا لیکن وہ اب نظر نہیں آرہا ہے۔

کہا جاتا ہے کہ حضرت عبد اللہ بن زبیر کا اشعب نامی ایک غلام تھا۔ یہ اشعب حرص وطمع میں شہرت کے تمام ریکارڈ توڑ گیا۔ ایک دن کسی نے اس سے اس کی حرص کی شدت کے بارے میں پوچھا تو کہنے لگا کہ جب کبھی میں جنازے میں شریک لوگوں میں دو افراد کو سرگوشی کرتے دیکھتا ہوں تو مجھے گمان گزرتا ہے کہ شاید میت نے اپنے مال میں سے کچھ حصہ مجھے دیے جانے کی وصیت کی ہے اور جب میں کسی کو جیب میں ہاتھ ڈالتے دیکھتا ہوں تو مجھے لگتا ہے کہ وہ مجھے کچھ دینے والا ہے۔ کسی اور شخص نے جب اس سے یہی سوال کیا تو اس کا جواب تھا کہ مدینے میں جب بھی کسی خاتون کی شادی ہوتی ہے تو میں اپنے گھر کی صفائی اس امید سے کرتا ہوں کہ شاید اسے غلطی سے میرے گھر لایا جائے۔ نتیجتاً "اطمع من اشعب"[1] (اشعب سے زیادہ حریص) محاورہ زبان زد خاص وعام ہوا۔

نیز اگر عرب کسی کا مذاق اڑانا چاہیں تو اسے مونث کے صیغے سے مخاطب کرتے ہیں مثلاً اگر کوئی متکبر شخص کسی مشکل کام کے اپنے بس میں ہونے کا دعویٰ کرے تو اس پر مزاح کا نشانہ بنایا جاتا ہے: "ان کنت حبلی فلدی غلاما" (اگر تو حاملہ ہے تو پھر لڑکا جنو) اگر کوئی معاملات کی مہار اپنے ہاتھ میں ہونے کا دعویٰ کرے تو اس پر مزاح کا یہ تیر برسایا جاتا ہے: "انت الامیر فطلقی او راجعی" (اے خاتون! تو خود حکم ہے، تو چاہے تو طلاق دے اور چاہے تو رجوع کرے) اور اگر کوئی بزرگ طفلانہ حرکتوں کا مرتکب پایا گیا تو اس کے لیے یہ مثل بولا جاتا ہے: جدة تقضی العدة[2] (دادی عدت کے دن گزار رہی ہے)۔

---

[1] المیدانی: ۱/۶۰۸ [2] ایضاً: ۳، ۶۳، ۱۰۵، ۲۶۴۔

۸:۱ امثال ومحاوروں کا آفاقی پہلو | اب تک عربی امثال ومحاوروں کی جو خصوصیات بیان کی گئی ہیں ان میں ایک ایسا آفاقی عنصر جھلکتا ہے کہ ہر قدم پر انسان کی فکری یکجہتی کا تصور مضبوط سے مضبوط تر ہوتا چلا جارہا ہے اور ان کی ایک بڑی تعداد اردو، انگریزی اور کشمیری امثال ومحاوروں کی عکس معلوم ہوتی ہے۔ طوالت سے بچنے کے لیے صرف کشمیری امثال ومحاوروں کا دو عنوانات کے تحت ذکر کیا جاتا ہے: (۱) لفظ ومعنی دونوں میں مطابقت (۲) صرف معنی میں مطابقت۔

(۱) لفظ ومعنی میں مطابقت | ۱۔ أنہ ٹھلہ سیود گژھنہ (ربما اصاب الاعمی رشدہ، م: ۳۲۹)

۲۔ بے ییمانس کیاہ نیہ شیطان (الشیطان لا یخرّب کرمہ، م: ۵۴۴)

۳۔ حرکتھ کر تہ برکتھ کرٗی (الحرکۃ برکۃ، م: ۳۳۱)

۴۔ دو ہنس دُزہ ھا، دو ہنس پھوکھ چھس چونیہ (تطلق النار وتصیح الحریق، ب: ۵۱)

۵۔ گاڈہ چھہ آبہ منزیہ ترلشہ ھوند ارمان (اظمأ من الحوت، م: ۴۲۱)

۶۔ گیہ بو تھہ رامہ ھون (ذئب استنجع، م: ۳۹۸)

۷۔ گوربن لاجیکھ نعل تہ خر آیے پڈر دارتھ (جاؤا لینعلوا خیل الباشا، فمدت الخنفسیۃ رجلھا، ب ۵۸)

۸۔ لوکہ ھند بس ورنس اُڈیہ نبندر (ثوب العاریۃ ما یدفی، ب: ۵۴)

۹۔ نکھہ پیٹھ وک شورہ (ابنہ علی کتفہ وھو یطلبہ، م: ۱۶۵)

۱۰- نیکو نیک کر بد لگہ پانیہ (دار الظالم خراب، ب: ۸۲)

۱۱- ھونہ لوٹہ بریا کہ قندیلس سُہ داریا و تنتہ تہ ھونہ لوٹیہ (ذنب الکلب مرة ما یستقیم، ب: ۹۱)

۱۲- یوتا ۸ وروِن آسہ تیرتیہ گوہر خورو ھراون (مد رجلك علی قدر الکساء، م: ۶۰۲)

۱۳- یہ شریکہ ونہ تہ گرھہ نہ کس ون، یہ سُہ کرہ تی گرھہ کرون (جارك معلمك، ب: ۶۰)

(۲) صرف معنی میں مطابقت: ۱- اپن ھنزہ ماجہ نیہ پرسن، تروکن ھند ۸ گرہ کتہ کمسن (رزق الکلاب علی المجانین، ب: ۹۳)

۲- اکہ وکور بیہ تکور (ظرطت فلطمت عین زوجھا، م: ۵۹۲)

۳- أنس مش ھاوٗنہ نہ گنا ۸ نہ ثواب (تقرأ الزبور علی اھل القبور، ب: ۵۲)

۴- ببہ زُشہ آسنہ (بینھم داء الضرائر، م: ۱۲۰)

۵- بتہ لبجہ چھہ پٹھیہ کنہ وُچھان (خذ الکتاب من عنوانه، ب: ۷۹)

۶- پانہ پتھُرہ ٹینٹھ گورس (بطن جائع ووجه مدھون، م: ۱۶۵)

۷- پلسم نتیہ ژوکی گامہ (اعجز عن الشئ من الثعلب عن العنقود، م: ۶۸۷)

۸- پنے حجہ چھہ بہ ترچہ (الحجامه بالفأس، ولا الحاجة

لناس، ب : ۱۱)

۹- پنہ نسو چھنہ پاغمبر مأنہ مٹہ (أزهد الناس في العالم جيرانه، م : ۳۵۷)

۱۰- پنون عأب گو معشوکھ (الخنفسية في عين أمها مليحة، ب: ۲۰)

۱۱- پوشو کھنے تہٕ ژولو کھ تہ نار (ان لم تغلب فاخلب، م : ۳۸)

۱۲- توت کھنہ سیتہ چھ گیک دزان (الرشف أنقع، م: ۳۲۳)

۱۳- خوجن دو پنم پہٹہ کھیہ (الزبون يفرح بلا شئ، م: ۳۶۰)

۱۴- دمس سیتہ نمسکار (أسجد لقرد السوء في زمانه، ب : ۱۰۶)

۱۵- زیرٕ لدس زیر سیتہ (اذا جاءت السنة معها أعوانها، م: ۹۲)

۱۶- زیادن گگراین نہ رٕود، زیادن کتھن نہ سوٕد (کلب ينبح ما يعفى ب : ۱۹۳/۱ السنور الصياح لا يصطاد شيئا، م : ۵۰۰)

۱۷- کاونہ گا لٹول کاوٕ پوٕتیہ (الحذر قبل ارسال السهم، م: ۲۸۷)

۱۸- کھرے آیہ آسہ ھے ہنیے وڈٕ کاسہ ھے (خصی يفخر من زب مولاه، م: ۳۶۴)

۱۹- کوب کل آسون (أذل من قرملة، م: ۳۹۶)

۲۰- گس سس مأل ژوڈٕ ہیتھ بیتہٕ بیتہٕ (خطبوها تمنعت تركوها تطلعت، ب : ۳۰۷)

۲۱- ملس چھ مو تھیہ مھرازٕ (تحل له الميتة، م : ۲۰۷)

۲۲- ملکھ ژلئن (طارت عصافير رأسه، م : ۵۹۷)

۲۳۔ موسس کپب ونسپ (جاء الخروف یعلم أبوه الرعی، ب: ۱۵۸)

۲۴۔ مِہ تیہ خوجن ناوکرۂ (خاوی البطن و یمضغ لبان، ب: ۷۷)

۲۵۔ میا نیسو زاکھواتھو (علی یدتی دار الحدیث، م: ۶۲۹)

۲۶۔ ناو تھودنستہ گود (اسم بلاجسم، ب: ۳۴)

۲۷۔ وُتیہ بِنیہ بلایہ تُوتیہ (اخذ فی بأطیر غیری، م: ۱۰۸)

۲۸۔ ہاپت یارانہ (ربما أراد الأحمق نفعك فضرك، م: ۳۳۱)

۲۹۔ ھونیہ ووران کارخانا چلان (ایش تبالی السماء بعیاط الکلاب؟ ب: ۲۶)

۳۰۔ یس خذاہ دِیہ تس کُس بِنیہ (حبلة ومرضعة وقدامها أربعة، ب: ۱۷)

۳۱۔ یُسیہ روچھیہ تسس نش رُچھمخدا یو (سمن کلبك یأکلك، م: ۳۶۸/ علمناه الشحاتة سبقنا علی الابواب، ب: ۱۴۵)

۳۲۔ یہ مہ کرون تیہ بہ کرہ، مِہ وُنیہ توبہ کیاہ کرہ (دع امرء وما اختار، م: ۳۷۳)۔

مختصر یہ کہا جاسکتا ہے کہ امثال و محاورے عربوں کی زندگی کا دیوان ہیں۔ یہ نہ صرف ان کی ہزاروں سالہ تاریخ کو اپنے اندر سموئے ہوئے ہیں، بلکہ ان کی سیاسی و سماجی زندگی کے ساتھ ساتھ ان کی نفسیات کی بھی مکمل عکاسی کرتے ہیں۔ نیز ان سے عربی فکر و ادب کی آفاقیت کا ثبوت بھی فراہم ہوتا ہے۔

ریاست ٹونک میں علوم شرقیہ اور اس کے مدارس

از جناب حکیم سید محمد احمد ٹونکی۔

نواب امیر خاں نے راجہ ہلکر سے مل کر راجپوتانہ اور مالوہ کے اکثر علاقوں پر فتح حاصل کی اور باہمی تقسیم اور رضامندی سے ۱۸۰۶ء میں ٹونک ان کے قبضہ میں آیا لیکن ٹونک کے والی اس وقت ہوئے جب ۱۸۱۷ء میں انگریزوں سے باقاعدہ معاہدہ ہوگیا، ٹونک کی ریاست پر مکمل قابض ہوجانے کے بعد انہیں یہ فکر لاحق ہوئی کہ اہل علم وکمال کو ٹونک میں بسایا جائے تاکہ ریاست کی رونق بڑھے اور یہاں علم وادب کا چرچا رہے، قدرت نے بھی ان کی مساعدت کی اور وہ ۱۸۳۴ء تک زندہ رہے یعنی معاہدہ کے بعد سترہ سال تک۔

حضرت سید احمد شہیدؒ ۱۸۱۰ء میں امیر خاں کی فوج میں بطور ایک سپاہی شامل ہوئے، ان کو انگریزوں سے معاہدہ بہت ناگوار گزرا اور وہ ٹونک چھوڑ کر چلے گئے۔ ان کا اصل مدعا ونشانہ انگریزوں سے جنگ کرنا اور انہیں ہندوستان سے باہر نکالنا تھا لیکن ان کا پہلا مقابلہ سکھوں سے ہوگیا اور وہ بالاکوٹ میں ۱۸۳۱ء میں شہید ہوگئے۔

ٹونک سے قریب جے پور کی بڑی ریاست بہت پہلے یعنی ۱۸۰۳ء ہی میں ابتدائی معاہدہ کر چکی تھی۔ امیر خاں نے سب سے آخر میں معاہدہ کیا جس کا فائدہ یہ ہوا کہ انکی ریاست

باج گزاری اور سالانہ ٹیکس سے محفوظ رہی۔

پہلے مجھے بھی خیال تھا کہ امیر خاں نے معاہدہ کرکے کمزوری اور بزدلی دکھائی لیکن جب میں جے پور گیا اور وہاں کے راجہ بھوانی سنگھ نے مجھے اپنا تمام فارسی ریکارڈ ترجمہ کے لیے دیا، اس کی وجہ سے اور مغل بادشاہوں کے فرامین، انگریزوں کے خریطے اور ریاستوں کے معاہدے دیکھنے کا موقع ملا[1] تو میں نے اپنی رائے بدل دی اور مجھے اندازہ ہوگیا کہ انگریز اس وقت بہت طاقتور ہو گئے تھے۔ نوابوں اور راجاؤں کے لیے انکا مقابلہ آسان نہ تھا اور جس نے ان کی مخالفت کی وہ نیست و نابود ہوگیا، خود امیر خاں کو معاہدہ کے بعد ہی چین نصیب ہوا، اس سے پہلے وہ کبھی راجستھان میں کبھی مالوہ میں کبھی ہندوستان کے دوسرے علاقوں میں مار دھاڑ کرتے رہتے تھے، لیکن معاہدہ کے بعد ریاست کو علمی و تعلیمی حیثیت سے ترقی دینے کا موقع میسر آیا، گو وہ خود صاحب علم نہ تھے لیکن اہل علم کی قدر کرتے تھے۔

ان کے زمانہ میں بہت سے اہل علم دہلی، رامپور، مراد آباد، نجیب آباد وغیرہ سے ٹونک آئے اور یہیں آباد ہو گئے، امیر خاں نے ان کی عزت افزائی کی اور طرح طرح سے انہیں نوازا۔ ان خاندانوں میں مشہور عالم ملا عرفان رامپوری کے بیٹے مفتی محمد اور مولانا

---

[1] میرے اسی ترجمے کی بنیاد پر جے پور کے راجہ نے انگریزی زبان میں دو ضخیم کتابیں شایع کی ہیں جن کے نام یہ ہیں (۱) کیٹلاگ آف ڈاکیومینٹس ان کپٹر دوارا جے پور (۲) کیٹلاگ آف میپس جے پور، اس کے علاوہ خود میں نے بھی دو مضمون لکھے جو رسالہ "معارف" اعظم گڈھ میں شایع ہوئے، ایک تاج محل اور شاہ جہاں بادشاہ کا فرمان راجہ جے سنگھ کے نام کے عنوان سے جون ۱۹۹۲ء میں شایع ہوا اور دوسرا "کپٹر دوارا جے پور میں فارسی فرامین" اکتوبر ۱۹۹۲ء میں۔

خلیل الرحمن رامپوری اور ان کے برادران بھی تھے۔

امیر خاں کے بعد ان کے جانشین نواب وزیر الدولہ ہوئے، ان کی علم دوستی امیر خاں سے بھی سوا تھی، وہ سید احمد شہیدؒ کے مرید بھی تھے۔ ان کے زمانہ میں مزید علمی ترقی ہوئی۔

ان کے بعد نواب محمد علی خانصاحب والیٔ ریاست ہوئے، مگر انگریزوں سے رنجش کی بنا پر وہ جلد ہی معزول اور شہر بدر ہو گئے۔ ان کی جگہ ان کے بیٹے ابراہیم علی خاں نواب ہوئے۔ ان کے زمانہ میں سید حکیم دائم علی صاحب والد حکیم سید برکات احمد صاحب مونگیر صوبہ بہار سے ٹونک آئے۔

نواب محمد علی خانصاحب اپنے پیش رووں سے بڑھ کر علم دوست تھے، ان کے یہاں ہر وقت علما و صلحا کا جم غفیر موجود رہتا تھا اور برابر علمی گفتگو ہوتی رہتی تھی، خود بھی عالم تھے اور انھیں نادر و نایاب کتابیں جمع کرنے کا بہت شوق تھا، ان کا عظیم الشان کتب خانہ انمول اور نادر کتابوں پر مشتمل تھا۔ معزول ہونے کے بعد وہ بنارس میں قیام پذیر ہو گئے تھے، جہاں عرصہ دراز کے بعد ان کا انتقال ہوا، اس کے بعد ان کا کتب خانہ بنارس سے ٹونک منتقل ہوا اور ان کے صاحبزادے عبدالرحیم خاں اس کے نگراں رہے یہ کتب خانہ شہر ٹونک میں کئی جگہ منتقل ہونے کے بعد اور چھوٹے بڑے کئی کتب خانوں کی طرح اب "ابوالکلام آزاد عربی فارسی ریسرچ انسٹی ٹیوٹ راجستھان میں ضم ہوگیا ہے۔

مذکورۂ بالا امراء کے زمانہ میں باقاعدہ مدارس کا قیام عمل میں نہیں آیا تھا، بلکہ ارباب فضل و کمال کے گھر ہی درسگاہ کا کام دیتے تھے، چنانچہ مفتی مولوی محمد (خلف ملا عرفان رامپوری) مولانا سید حیدر علی صاحب رامپوری، شمس العلما مولانا امام الدین کشمیری، مولانا محمد حسن خاں (چھاؤنی والے) مولانا محمد حسن خاں برادر کلاں، مولانا حیدر

حسن خاں، مولانا سید حکیم دائم علی صاحب والد حکیم سید برکات احمد صاحب، مولانا سراج الرحمن خاں اور دوسرے علمار اپنی اپنی قیام گاہوں پر درس دیا کرتے تھے اور مقامی و بیرونی طلبہ مختلف علوم حدیث، فقہ، تفسیر، فرائض، منطق، فلسفہ وغیرہ کی تعلیم ان سے حاصل کرتے تھے۔

اس دور کے کسی باقاعدہ مدرسہ[1] کا علم مجھے نہیں ہو سکا البتہ مولانا خلیل الرحمن رامپوری (خلف ملا عرفان رامپوری) کے مدرسہ کا پتہ چلتا ہے۔

یہ مدرسہ اب بھی کھنڈروں کی صورت میں موجود ہے لیکن کسی زمانے میں یہاں سے بہت سے نامی گرامی علمار فارغ التحصیل ہو کر نکلے۔ مدرسہ میں ایک قلندری مسجد اور باہر کنواں بھی تھا۔ اس کی عمارت دو منزلہ تھی اب یہ عمارت اور اس کے آس پاس قبرستان بن گیا ہے جو موتی باغ قبرستان کے نام سے مشہور ہے۔

مولانا محمود حسن خاں مصنف "معجم المصنفین" اور استاد اصغر علی ابرو مصنف "تاریخ ٹونک" صاحبزادہ عبداللہ خاں خلف نواب ابراہیم علی خاں کی قبریں اسی عمارت میں واقع ہیں۔

مولانا خلیل الرحمن رامپوری نواب وزیر الدولہ کے زمانہ میں ناراض ہو کر گلشن آباد جاورہ چلے گئے۔ ان کی اولاد میں کئی عالم اور حکیم و مفتی ہوئے۔ جن میں حکیم عبدالرب، حکیم عبدالعلی، حکیم عبدالعزیز، حکیم عبدالحق مشہور ہیں، یہ لوگ جاورہ ہی میں رہے مگر ٹونک بھی آمدورفت رہتی تھی، ان کے حالات "تذکرہ کاملان رامپور" میں تفصیل سے ملتے ہیں۔

مولانا خلیل الرحمن اور مولوی محمد پسران ملا عرفان رامپوری کی اولاد میں بہت سے عالم اور حکیم ہوئے، لیکن میری معلومات کے مطابق اب مولانا خلیل الرحمن کی اولاد میں

---

[1] اس ضمن میں حکیم مولوی عمران خاں صاحب کا مضمون "ٹونک کے قدیم مدارس" ملاحظہ ہو جو معارف جلد ۸۰ شمارہ ۲ میں چھپا ہے۔

کوئی عالم یا حکیم جاورہ میں موجود نہیں، البتہ مولوی محمد کی اولاد میں ابھی تک علم سے اشتغال باقی ہے۔ اس ناچیز کا تعلق بھی اسی خاندان سے ہے۔

ٹونک میں انیسویں صدی کے اواخر میں مدارس کا قیام عمل میں آیا، ۱۸۹۹ء میں حکیم سید برکات احمد صاحب نے مدرسہ خلیلیہ قائم کیا اور اس کے آس پاس مدرسہ ناصریہ بھی قائم ہوا، پھر بیسوی صدی ۱۹۲۵ء میں مدرسہ فرقانیہ مولانا حیدر حسن خاں نے قائم کیا۔

یوپی سے جو اہل علم خاندان ٹونک آئے انہیں میں مولوی حیدر حسن خاں کے والد احمد حسن خاں ذکاتی بھی ہیں جن کا اصل وطن نجیب آباد تھا۔ وہ اور ان کے باپ اور دادا سب عالم تھے، مولانا احمد حسن خاں میں علمی قابلیت کے علاوہ ملکی اور انتظامی صلاحیت بھی تھی۔ مفتی محمد خاں خلف ملا عرفان رامپوری کا خاندان ابتدائے ریاست اور نواب امیر خاں کے زمانہ میں ٹونک بلا لیا گیا تھا۔ انہوں نے محلہ امیر گنج میں اپنی مسجد اور کنواں بھی بنا لیا تھا۔ مسجد اب مفتی محمد کے بیٹے مولوی عبدالکریم صاحب کے اور کنواں پوتے منا خاں کے نام سے مشہور ہے۔

مولانا حیدر حسن خاں ندوۃ العلماء لکھنؤ میں شیخ الحدیث تھے۔ ان کے بھائی مفتی محمد حسن خاں کی شادی مولانا دوست محمد ناظم شریعت کی دختر سے ہوئی اور دوسری دختر کی شادی مولانا سیف الرحمٰن کابلی سے ہوئی جو مدرسہ ناصریہ ٹونک میں صدر مدرس اور مولانا رشید احمد گنگوہی کے شاگرد تھے، "ریشمی رومال" کی تحریک میں بھی بہت پیش پیش تھے اور اسی لیے ٹونک کو بھی خیرباد کہہ دیا، پہلے دہلی تشریف لے گئے اور مولانا رشید احمد گنگوہیؒ سے صلاح و مشورہ کے بعد مسجد فتح پوری میں مدرس ہوئے اور بعد میں تحریک کے قائد کی حیثیت سے باغستان اور افغانستان چلے گئے۔

مولوی حیدر حسن خاں کے والد مولانا احمد حسن خاں دلیر بخت کا ایک واقعہ بھی بڑا سبق آموز ہے، قاضی محمد عرفان خاں ناظم شریعت ٹونک راوی ہیں کہ ایک بار نواب ٹونک نے ایک بہت بڑی جاگیر کی سند ان کو مرحمت کرنی چاہی جس کو انہوں نے یہ کہہ کر واپس کردیا کہ جن لوگوں کو جاگیر دی جاتی ہے اکثر ان کی اولاد علم سے بے بہرہ ہوتی ہے اور جاگیر پر بھروسہ کرکے علم وکمال حاصل کرنے کی کوشش نہیں کرتی۔

خدا نے اس استغنا اور دنیا سے بے رغبتی کا یہ صلہ دیا کہ ان کی اولاد آسمانِ علم پر آفتاب و ماہتاب بن کر چمکی اور نہ صرف ٹونک اور ہندوستان بلکہ تمام دنیا کو روشن ومنور کرگئی۔

انہی دلیر بخت کے ایک صاحبزادے مولانا حیدر حسن خاں جب ندوہ میں شیخ الحدیث تھے تو ان سے دنیائے اسلام کے مشہور عالم مولانا سید ابوالحسن علی ندوی بھی فیضیاب ہوئے وہ ندوہ چھوڑ کر ٹونک اس لیے واپس آگئے تھے کہ اس زمانے میں مدرسہ امیریہ جو تالاب موتی باغ کے قریب واقع اور بانیِ ریاست نواب امیر خاں کے نام سے منسوب تھا ضعف و انحلال کا شکار ہوگیا تھا، اس لیے ٹونک والوں کو اس کے احیا اور نشاۃ ثانیہ کا خیال ہوا، چنانچہ اس میں نئی روح پھونکنے کے لیے انہوں نے مولانا حیدر حسن خاں کو دعوت دی اور وہ اس کے صدر مدرس مقرر کیے گئے، مولانا نے مدرسہ میں درس دینا شروع کیا تو سب سے پہلے نواب سعادت علی خاں نے بطور تبرک بخاری شریف کی پہلی حدیث کا درس لیا۔

۱۸۹۹ء میں مولانا حکیم سید برکات احمد نے مدرسہ خلیلیہ قائم کیا، وہ اس وقت مولانا عبدالحق خلف مولانا فضل حق خیرآبادی کے درس سے فارغ ہوکر ٹونک تشریف

لائے تھے ان کی بدولت ٹونک کی گلیوں میں ہندی نژاد ہی نہیں بلکہ افغانستان، ہیرات بخارا، تاشقند اور دیگر ملکوں کے طالبانِ علم نظر آنے لگے۔ اسی زمانے میں مولانا حیدر حسن خاں لاہور میں مولانا غلام احمد نعمانی سے اور مولانا سیف الرحمن کابلی۔ مولانا رشید احمد گنگوہی سے سندِ علوم حاصل کر کے مدرسہ ناصریہ میں تعلیم دینے لگے تھے اور سنہ ۱۹۲۵ء میں مدرسہ فرقانیہ کی اساس مولانا حیدر حسن خاں نے ڈالی اور حضرت استاد القرار قاری عبد المالک صاحب ٹونک تشریف لائے۔ ان حضرات کی مساعی جمیلہ، خلوص و للٰہیت کے نتیجے میں بے شمار علمار، فضلار، قرار، مجودین، حکمار، وصلحار وجود میں آئے۔ اس وقت نواب صاحبان مسلمان تھے۔ ان کی وجہ سے مدارس اسلامی کو تقویت تھی۔ جاگیردار صاحبان اور اہلِ ثروت بھی علمار و مدارس کی طرف متوجہ تھے۔ لیکن افسوس اب ہر طرف سناٹا ہے اگر کچھ ہے تو دنیاوی تعلیم کا بول بالا ہے۔

ایک عجیب مگر عبرت آموز یہ بات بھی قابلِ ذکر ہے کہ جب تک مدرسہ خلیلیہ میں حکیم سید برکات احمد صاحب اور مدرسہ ناصریہ میں مولانا سیف الرحمن صاحب کابلی اور مولانا حیدر حسن خاں مدرسہ فرقانیہ میں اعزازی طور سے علم فقہ و حدیث کا درس دیتے رہے اور ان میں تمام علوم عقلی کی تعلیم ہوتی رہی تو یہ مدرسہ خلیلیہ، مدرسہ ناصریہ، مدرسہ فرقانیہ کہلاتے تھے اور اب جب تمام علوم میں کمی آگئی ہے اور مدارس علوم سے خالی ہو کر مکاتب بن گئے ہیں تو یہ مدرسے دار العلوم خلیلیہ، دار العلوم ناصریہ اور دار العلوم فرقانیہ کہے اور لکھے جانے لگے ہیں۔

ان مدارس میں درس نظامیہ رائج تھا، بالخصوص خیر آبادی سلسلے کے مدارس میں معقولات منطق اور فلسفہ کا بہت زور تھا، لیکن پھر ٹونک ہی میں نہیں دیوبند و سہارنپور

میں بھی معقولات اور منطق و فلسفہ کے درس میں کمی آتی گئی اور اس کی جگہ عربی علم و ادب، تاریخ امم، محاورات اور عربی بول چال اور علوم جدیدہ کا اضافہ ہوگیا۔ خاص طور سے ندوہ لکھنؤ میں علوم جدیدہ اور عربی علم و ادب کا اضافہ ہوا اور علوم منطق و فلسفہ کو کم سے کم بلکہ حذف ہی کر دیا گیا۔

بنیادی اور ٹھوس علوم میں کمی ہوئی تو درس نظامیہ کی جگہ امتحانات علوم شرقیہ نے لے لی اور مدرسہ خلیلیہ۔ مدرسہ ناصریہ اور مدرسہ فرقانیہ ان امتحانات کی تیاری کے مراکز بن گئے۔ یہ امتحانات پنجاب یونیورسٹی سے بھی ہوتے تھے اور الٰہ آباد یونیورسٹی بورڈ سے بھی۔ عربی کے امتحانات مولوی، عالم، فاضل اور فارسی کے امتحانات منشی۔ کامل اور فاضل تھے۔ البتہ الٰہ آباد کے نصاب میں جہاں فارسی کتابوں کے انتخابات تھے وہاں تاریخ ہند جغرافیہ، حساب، الجبرا اور اقلیدس (GEOMETRY) بھی شامل نصاب تھے ہماری ریاست بھی ان امتحانات کو منظوری دے کر ان میں پاس ہونے والوں کو سرکاری ملازمت دے دیتی تھی، اس کی وجہ سے بہت سے لوگ انگریزی کے میٹرک ایف۔ اے اور بی۔ اے کے بجائے انھی امتحانات کو دے لینا کافی خیال کرتے تھے، جن کے سینٹر دہلی، آگرہ، میرٹھ اور بریلی میں تھے، بعد میں خود ٹونک بھی سینٹر ہوگیا تھا، تقریباً ۱۹۱۵ء سے ۱۹۵۰ء تک یہی سلسلہ چلا، تقسیم کے بعد اور لوگوں کے پاکستان چلے جانے کی وجہ سے طلبہ کی تعداد اور مدارس کی تعلیم میں نمایاں کمی ہونے لگی پھر ریاست بھی انڈین یونین میں ضم ہوگئی اور جاگیریں باقی نہ رہیں تو مدارس کی آمدنی کم ہونے لگی اور وہ مشکلات سے دوچار ہونے لگے۔

اوپر عربی زبان سے تعلق رکھنے والے مدارس اور علماء کا تذکرہ کیا گیا ہے۔ ذیل میں

فارسی تعلیم اور اساتذہ کا مختصر حال بیان کیا جاتا ہے۔ اردو کے مشہور شاعر اختر شیرانی کے والد حافظ محمود خاں شیرانی ٹونک میں فارسی کے بڑے ماہر اور محقق گزرے ہیں، انھوں نے علامہ شبلی کی شہرۂ آفاق تصنیف شعر العجم پر تنقید لکھی تھی۔ پروفیسر محمد عمر بھی یہیں کے تھے جو لاہور میں مدرس تھے، ان کے بارے میں لوگوں کا خیال ہے کہ وہ علامہ اقبال کے استاد اور ان سے فائق تھے۔ ان دونوں کے علاوہ بھی ٹونک میں متعدد باکمال شعراء و اساتذہ گزرے ہیں جو بڑے ذی استعداد تھے اور بعض بعض یہاں کے مدارس میں درس و تدریس کی خدمت انجام دیتے تھے، اس کی وجہ سے نصف صدی قبل ٹونک میں گھر گھر فارسی داں موجود تھے مگر اب یہ میدان بھی صاف ہوگیا ہے اور ریاست کے زمانے میں عربی و فارسی علوم کا جو رواج تھا وہ ریاست کے خاتمہ کے بعد بالکل ہی ختم ہوگیا ہے تاہم اب حال میں پھر مشرقی علوم سے کسی قدر رغبت اور دلچسپی بڑھی ہے اور عام طور سے پورے ملک میں تعلیمی بیداری پیدا ہورہی ہے۔ لڑکیوں کی تعلیم کی جانب بھی توجہ ہونے لگی ہے اور ان کے لیے مدارس بھی قائم ہورہے ہیں۔ خاص راجستھان میں جے پور، سوائی مادھوپور، کوٹہ، جودھپور، بیکانیر اور باڑھ میر وغیرہ میں عربی اور دینی تعلیم کے مدارس کھل گئے ہیں۔ جے پور میں "جامعہ ہدایت" کا قیام عمل میں آیا ہے، جس میں عربی کی اعلیٰ تعلیم کے ساتھ ٹیکنیکل تعلیم کا بھی نظم ہے تاکہ دینی تعلیم حاصل کرنے والے طلبہ معاش کے معاملہ میں خود کفیل ہوسکیں گو میری ناقص رائے میں اس طرح کے انتظام سے نہ طلبہ مکمل عالم ہی ہوتے ہیں اور نہ ٹیکنیکل میں پوری مہارت حاصل کرپاتے ہیں، جس طرح طب کے ساتھ آیورویدک اور ایلوپیتھک کے جوڑ سے نہ طلبہ اچھے طبیب ہوتے ہیں اور نہ ڈاکٹر۔ گو انھیں سندیں مل جاتی ہیں اور وہ پریکٹس بھی کرنے لگتے ہیں، اس طرح کے لوگ حکیم کے نام ہی سے شرماتے ہیں۔

اخبار علمیہ

اسلام آباد پاکستان کا ادارہ انسٹی ٹیوٹ آف پالیسی اسٹڈیز گو کم عمر ہے لیکن اس کے حسن خدمت اور بہتر کارگزاری کی دھاک بیٹھ چکی ہے، اس کے ایک مختصر الحجم لیکن مفید رسالہ "اسلام اور عیسائیت کا تعارف پہلے کرایا جا چکا ہے، اب اس ادارہ نے پاکستان میں چھپنے والے اسلامی لٹریچر کی اطلاع و تعارف کے لیے ایک ششماہی رسالہ "نقطۂ نظر" جاری کیا ہے" اندازاً وہاں سال میں تقریباً پانچ چھ سو کتابیں اردو میں صرف علوم اسلامیہ کے موضوع پر شایع ہوتی ہیں، اس کے اولین دو شماروں سے ظاہر ہوتا ہے کہ اپنے مقصد میں یہ مجلہ پوری طرح کامیاب ہے، پہلے شمارہ میں دو مضامین تبصرہ نگاری کا فن اور اردو میں تبصرہ نگاری کی روایت بھی شامل ہے، مجلہ کو بڑے سلیقہ سے مرتب کیا گیا ہے اور فکر اسلامی، اصول حدیث، تذکار صحابہ و تابعین، تاریخ اسلام، تصوف، علمائے عالم اسلام، تحریک اسلامی، الملل و النحل تحریک پاکستان، ارض پاکستان، اقبالیات اور کتاب شناسی جیسے عنوانات قائم کیے گیے ہیں، تبصروں میں سنجیدگی، متانت اور وسعت نظر کی خوبیاں نمایاں ہیں اور کوشش کی گئی ہے کہ کتاب کے بنیادی مشمولات و مضامین سے روشناس کرا دیا جائے، یہ رسالہ لائق پذیرائی ہے، توقع ہے کہ اس کے مدیر جناب سفیر اختر کی یہ آرزو بھی جلد پوری ہوگی کہ رسالہ میں اردو کے علاوہ دوسری زبانوں کی کتابیں بھی شامل ہوں، زر سالانہ ۱۰۰ روپے ہے اور پتہ یہ ہے؛ انسٹی ٹیوٹ آف

پالیسی اسٹڈیز، اسلام آباد پاکستان۔

مذکورہ بالا ادارہ کا ایک انگریزی دو ورقی خبرنامہ PS NEWS کے نام سے موصول ہوا، جس سے اس کی کاوشوں کی ایک اور جھلک سامنے آئی، یہ ادارہ ۱۹۷۹ء میں قائم ہوا تھا، اب قریب دو دہائیاں گزرنے کے بعد اس کے مندرجہ ذیل چھ مختلف شعبہ جات قائم ہوگئے ہیں۔ پاکستانی معاشرہ اور سیاست، بین الاقوامی روابط اور عالم اسلام، تعلیم، معاشیات، ذرائع اطلاعات اور ثقافت اور علوم و تحریکات اسلامیہ، جن کے تحت چند اور ذیلی شعبے ہیں جیسے عالم اسلام کے شعبہ میں ایک ذیلی اکائی وسط ایشیا کے متعلق ہے۔ رسالہ وسطی ایشیا کے مسلمان کی اشاعت یہیں سے ہوئی، اس کے علاوہ اس شعبہ نے ترکستان میں مسلم مزاحمت، مسلم امت روس میں، سوویت یونین کا زوال جیسی مفید اردو کتابیں نیز انگریزی زبان میں بھی اہم دستاویزی روداد یں شایع کی ہیں ادارہ کے مخلص اور فعال ارکان علوم اسلامیہ کے شائقین کی تحسین و ستایش کے مستحق ہیں۔

افسوس ہے کہ عالم عرب کی مطبوعات جدیدہ سے ہماری واقفیت کا کوئی ذریعہ نہیں، گو بلاد عربیہ سے متعدد ایسے رسائل و جرائد شایع ہوتے ہیں جن سے علم کی گرم بازاری کا حال معلوم ہوسکتا ہے، البتہ دمشق کی مجمع اللغۃ العربیہ کے قدیم علمی مجلہ سے وہاں کے گلستان علم کے چند خوشگوار جھونکے ہم تک بھی پہنچ جاتے ہیں، اس کے دو تازہ شمارے موصول ہوئے تو گزشتہ چند برسوں میں عربی اداروں کی کی چند اہم مطبوعات کا علم ہوا، ان میں جدید طرز کی تعلیقات و تحشیہ سے مزین بعض اہم قدیم مخطوطات ہیں مثلاً ابن عساکر کی اخبار لحفظ القرآن، البحرانی کی اختیار مصباح السالکین

ابن رجب حنبلی اور دوانی کی ثلاث رسائل، ابوبکر الزبیدی اشبیلی کی الزیادات علی کتاب اصلاح لحن العامہ بالاندلس، مرجی ثقفی کی کتاب الحیطان، عبدالغنی نابلسی کی نہایۃ المراد، ابن القاصح کی قرۃ العین فی الفتح والامالہ بین اللفظین ابوالقاسم الخرقی کی مختصر الخرقی اور الجوالیقی کی مختصر شرح امثلہ سیبویہ وغیرہ۔ تاریخ علوم کے متعلق جمعیۃ السوریہ کی سالانہ علمی مجالس میں پیش کیے گئے مقالات کے مجموعے بھی پرکشش ہیں، تاج العروس کا تکملہ اور لسان العرب الامازیغ دارالفکر دمشق سے ۱۹۹۶ء میں شائع ہونے والی مفتاح المعجم المفہرس لالفاظ الحدیث النبوی بھی جاذب نظر ہیں، ان کے علاوہ مختلف ملکوں میں مخطوطات و مطبوعات عربیہ کی فہارس مثلاً المخطوطات العربیہ فی الغرب الاسلامی، المنتقی من مخطوطات جامعۃ بطرسبرغ، المنتقی من مخطوطات معہد البیرونی للدراسات الشرقیہ بطشقند اور دلیل اوائل المطبوعات العربیہ فی العالم حتی نہایۃ القرن التاسع عشر بھی قابل ذکر ہیں، ۱۹۹۴ء میں دمشق سے شائع ہونے والی مطاع الطرابیشی کی کتاب رواۃ محمد بن اسحٰق فی المغازی والسیر والمرویات بھی بڑی اہم ہے۔

برطانیہ کا مشہور برٹش میوزیم محتاج تعارف نہیں، قریباً ڈیڑھ کروڑ سے زیادہ کتابوں کے اس بے مثل خزانے میں علوم اسلامیہ کی نادر ترین دولت بھی محفوظ ہے جس کو دیکھ کر آج بھی اسکے اصل وارثوں کے دل سیپارہ ہوتے ہیں، ۱۸۵۷ء میں جب ہندوستان میں انگریز قتل وغارت گری اور لوٹ کھسوٹ میں مصروف تھے عین اسی زمانہ میں وہاں اس لائبریری کے در کھلے اور ۱۴۰ سال تک اس کا مشہور زمانہ مطالعہ کا کمرہ جو گول گنبد کے نام سے معروف ہے، علم و دانش کا مرکز فیضان بنا رہا، اب اس لائبریری کی عمارت بھی بدل دی گئی ہے اور مشہور گول گنبد والا کمرہ بھی بند کردیا گیا ہے،

چنانچہ اس سے وابستہ بے شمار یادیں اب صرف ذہنوں میں بند ہو کر رہ گئی ہیں۔ گزشتہ چند ہفتوں سے برطانیہ کے اخبارات اور رسائل اس کمرہ کی افسانوی یادوں کے ذکر سے معمور نظر آتے ہیں اور اسکے جلو میں برطانوی عوام کے شوقِ مطالعہ اور کتب بینی کی عادت کا بھی فخر انداز میں ذکر کیا جا رہا ہے اور بقول ایک مبصر کے یہ حقیقت بھی ہے کہ انگریزوں کے اقسام محبت میں کتابوں کا عشق خاص اہمیت رکھتا ہے یہ کتابیں خریدتے ہیں مستعار لے کر پڑھتے ہیں اور انکی چوری بھی کرتے ہیں بعض ادارے تو پابندی سے مطالعہ کے موضوع پر کامیاب سمینار منعقد کرتے رہتے ہیں چنانچہ جب برٹش میوزیم کی منتقلی کا عمل شروع ہوا تو یہ خاصا زیر بحث رہا اور گو نئی عمارت بعض نکتہ چینوں کی نظر میں سخت ناگوار ہے اور عوامی جذبات بھی مخالفانہ ہی ہیں لیکن یہ وقتی جذبات نہیں بلکہ دوسری جنگ عظیم کے بعد ہی برٹش میوزیم کی نئی عمارت کا خاکہ زیر غور آیا تو قدیم و جدید کے حامیوں کا تنازعہ بھی ساتھ لایا، منصوبے بنتے اور بگڑتے رہے ۱۹۶۲ء میں دو ماہرین تعمیر کا تقرر کیا گیا تعمیر کا میزانیہ قریباً دو ملین پاؤنڈ تھا کمیٹی بھی بنی ۱۹۷۱ء میں حکومت نے اس سلسلہ میں قرطاس ابیض بھی شایع کیا ۱۹۷۸ء میں اسکی جدید عمارت کا ایک نقشہ پھر پیش کیا گیا لیکن عوام گول گنبد کی روایات پر اس قدر فریفتہ تھے کہ اسکی منتقلی کا خیال ہی انکے لیے سوہان روح تھا، ایک طبقہ نے باقاعدہ 'ریگولر ریڈرس گروپ' کے نام سے ایک احتجاجی محاذ ہی قائم کر لیا اس اثنا میں میزانیہ دو چند ہو گیا مخالفوں کی ایک دلیل یہ بھی تھی کہ اس قدر خطیر رقم کے خرچ کا جواز ہی نہیں لیکن اس کی تعمیر جدید ہو کر رہی، گزشتہ سال سے کتابوں کی منتقلی شروع ہوئی اور امید ہے ۱۹۹۹ء میں یہ عمل پایۂ تکمیل کو پہونچے گا۔ نئی عمارت کے متعلق کہا جاتا ہے کہ اس میں موزونیت ہے نہ حسن تناسب، بلند اور پست چھتوں کے درمیان منقسم یہ عمارت ان لوگوں کو تو ذرا متاثر نہیں کرتی جو گول گنبد کے کلاسیکی حسن پر فدا تھے، پرنس آف ویلز جو عمارتوں کے متعلق رائے زنی کے شایق ہیں، انھوں نے کہا کہ "یہ سائبانوں کا ایسا مجموعہ ہے جو علامتی سطوت و شوکت کی تلاش میں ہے۔"

ع۔ ص۔

معارف کی ڈاک

مکتوب لکھنؤ

۲۸؍۱۱؍۹۷ء

مخدوم و محترم جناب مولانا ضیاء الدین اصلاحی صاحب دام مجدکم۔

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

مزاج گرامی! خدا کرے بہمہ وجوہ مع الخیر ہوں! ادھر کافی عرصہ سے شرف ملاقات حاصل نہیں ہوا، حالانکہ کئی موقعے ایسے آئے جن میں ملاقات متوقع تھی۔

"معارف" اپنے انداز میں مل رہا ہے یعنی ناغوں کے ساتھ، میں نے اب نہ ملنے کی شکایت آپ کو لکھنا چھوڑ دی ہے، کیونکہ اندازہ ہو گیا ہے کہ ڈاک کا نظم کسی کے قابو میں نہیں ہے۔

تازہ معارف (شمارہ نومبر ۹۷ء) موصول ہو گیا ہے (گزشتہ مہینہ کا نہیں ملا تھا) اس میں "سیرۃ النبی جلد پنجم کے بعض قرآنی مباحث" کے عنوان سے آپ کے قلم سے سید الطائفہ حضرت مولانا سید سلیمان ندوی کے افادات کی تلخیص بڑی معلومات افزا ہے، جس سے آں ممدوح کے قرآن مجید کے وسیع و عمیق مطالعہ کی جھلک نظر آجاتی ہے لیکن اسی میں (معارف نومبر ۹۷ء میں ص ۳۳۳) پیغمبر حضرت یونس علیہ السلام کے تذکرہ میں یہ جملہ زیر قلم آیا ہے: "جو نافرمان قوم پر عذاب آنے کی تاخیر کی وجہ سے بھاگ کھڑے ہوئے" ظاہر ہے کہ اسے سبقت قلم ہی کا نتیجہ قرار دیا جائے گا جو غالباً بے خیالی میں سرزد ہو گیا، کیونکہ اس تعبیر (بھاگ کھڑے ہوئے) سے ایک نبی محترم کی شان میں سوء ادب کا پہلو نکلتا ہے (بتانے کی ضرورت نہیں کہ بھاگ کھڑا

ہونا" مذموم محل میں استعمال ہوتا ہے) بہرحال جس سے بچنا چاہیے تھا، اب بھی اس کی تلافی ممکن ہو تو کر دیا جانا ہی مناسب ہے [1]

دوسری ایک اور عبارت (اسی شمارہ نومبر ۹۷ء) ص ۳۶۵ کی محل نظر معلوم ہوئی وہ یہ کہ مضمون نگار نے لکھا ہے :-

"..... وہ صحابی راوی جو حافظہ وعدالت میں معروف ہوں مگر اجتہاد و فتوے دینے کے اہل نہ ہوں ...... ان کی روایات کو دیکھا جائے گا .... اگر مخالف قیاس ہوئیں تو ترک کر کے قیاس کو ترجیح دی جائے گی، یہ رائے جمہور احناف کی ہے۔"

اس پر یہ عرض کرنا ہے کہ مضمون نگار کا یہ کہنا محل نظر ہے کہ "یہ رائے جمہور احناف کی ہے" کیونکہ محققین احناف اور اکثریت کی رائے یہ نہیں ہے بلکہ ان کی رائے یہ ہے کہ روایت کو ترجیح حاصل ہوگی قیاس پر۔ البتہ حنفیہ میں عیسیٰ بن ابان کی یہ رائے ہے جسے زیر نظر مضمون میں جمہور احناف کی رائے قرار دیا گیا ہے اور اسے جمہور احناف اور محققین نے قبول نہیں کیا ہے۔ تفصیل کے لیے دیکھئے " حجۃ اللہ" (باب حکایت حال الناس قبل المأتہ الرابعۃ وما بعدھا)

امید ہے کہ میری اس دراز نفسی کو معاف فرمائیں گے، اگر نامناسب نہ سمجھیں تو انہیں "معارف" کے صفحات میں جگہ دے دیں۔ دعائے خیر کی درخواست ہے۔ والسلام

احقر، محمد برہان الدین سنبھلی

دار العلوم ندوۃ العلماء

---

[1] معارف: یہ حضرت سید صاحب کے الفاظ اور دراصل قرآنی آیت "ابق الی الفلک المشحون" کا ترجمہ ہیں، سیرت پنجم کے نئے ایڈیشن میں تلافی ممکن ہو سکے گی۔

مکتوب دہلی

۲۶ نومبر ۱۹۹۰ء

مکرمی و محترمی جناب ضیاء الدین اصلاحی صاحب!

السلام علیکم و رحمۃ اللہ و برکاتہ

نومبر ۱۹۹۰ء کے معارف میں میری کتاب "ہجرہ ان اسلام" پر تبصرہ شایع کرنے کا شکریہ۔ فاضل تبصرہ نگار کی ایک عبارت سے بعض لوگوں کو غلط فہمی یا تکلیف ہو سکتی ہے۔ اسی لیے یہ توضیح بھیج رہا ہوں۔ تبصرہ کے آخر میں کہا گیا ہے کہ کتاب میں مولانا امین احسن اصلاحی صاحب کو "پاکستان کا غیر مقبول عالم" لکھا گیا ہے۔ یہ وصف درست نہیں ہے۔ کتاب کے صفحہ ۴۰ پر مولانا اصلاحی صاحب کی ایک عبارت نقل کرتے ہوئے بسلسلۂ تعارف ان کے بارے میں یہ الفاظ ہیں:- A DISTINGUISH-ED BUT NOT POPULAR PAKISTAN ALIM۔ جس کا صحیح ترجمہ یہ ہے: "پاکستان کا ایک ممتاز عالم جسے قبولِ عام نہیں ملا"۔ مذکورہ عبارت میں 'UNPOPULAR' (غیر مقبول) نہیں بلکہ 'NOT POPULAR' (یعنی جسے قبولِ عام نہیں ملا) کا لفظ استعمال کیا گیا ہے۔ ظاہر ہے کہ دونوں میں بہت فرق ہے۔ پہلا وصف ذم کے دائرہ میں آتا ہے، جبکہ دوسرا وصف اظہارِ واقعہ اور وصفی نوعیت کا ہے۔ میری کوشش ہوتی ہے کہ اپنا مدعا انتہائی واضح اور کم از کم الفاظ استعمال کر کے کروں۔

والسلام

نیازمند

ڈاکٹر ظفر الاسلام خاں

مکتوب علی گڑھ

علی گڑھ ۔ جمعہ ۵ دسمبر ۱۹۹۶ء

محترمی ضیاء الدین اصلاحی صاحب ! السلام علیکم

بہت افسوس کے ساتھ اطلاع دے رہا ہوں کہ آج کوئی چار بجے دن کو پروفیسر خلیق احمد نظامی رحلت کر گئے۔ بالکل بھلے چنگے تھے۔ سر سید نگر کی جامع مسجد سے جمعہ کی نماز پڑھ کر گھر پہونچے، کھانا کھایا، چھوٹے بچوں سے ہنستے بولتے رہے پھر عادت کے مطابق قیلولہ کے لیے بستر پر لیٹ گئے۔ پونے چار بجے کے قریب انکی نیند ٹوٹی۔ چہرے پر سے رضائی ہٹائی، ایک سانس لیا اور انکی روح قفس عنصری سے پرواز کر گئی۔ انا للہ۔

بزرگان دین سے عقیدت اور صوفیائے کرام سے محبت کرتے تھے۔ انہیں جمعہ کا مبارک دن ملا، علالت و پریشانی میں کبھی کبھی نمازیں قضا ہو جاتی ہیں، ان کی کوئی نماز انکے ذمے باقی نہ رہی، جمعہ کی نماز پڑھ لی تھی اور عصر کی ابھی اذان نہیں ہوئی تھی، نہ خود تکلیف اٹھائی نہ اعزہ میں کسی کو تکلیف اور زحمت دی۔ ان کی موت نہایت پرسکون واقع ہوئی۔

مجھے کوئی چھ بجے پروفیسر نذیر احمد صاحب نے فون کیا، نظامی لاج پہنچا تو مرحوم کے دوست احباب اعزہ جمع تھے، احتشام انگلستان گئے ہوئے تھے اور فرحان انگلستان سے کسی جلسے میں شرکت کے لیے جرمنی۔ دونوں کو اطلاع دیدی گئی ہے اور دونوں تجہیز و تکفین میں شرکت کے لیے کل دوپہر تک آجائیں گے۔ ممکن ہے کراچی سے بھی اعزہ آجائیں۔ نماز اور تدفین عصر کے بعد۔

ابھی شب کو وہاں سے واپس آکر آپ کو یہ خط لکھ رہا ہوں کہ صبح کی ڈاک سے نکل جائے۔ دسمبر کے معارف میں وفیات کے تحت آپ کا مضمون چھپنا چاہیے ورنہ شذرات میں تو ذکر ضرور آجانا چاہیے، انکا دارالمصنفین اور معارف سے گہرا تعلق تھا۔ خدا انکی مغفرت فرمائے اور انکے درجات بلند فرمائے۔ یہ ذاتی خط ہے بہت عجلت میں لکھ رہا ہوں۔

والسلام : مختار الدین احمد

ادبیات

قطعہ

(ایک مٹتے ہوئے گورِ غریباں کو دیکھ کر)

از پروفیسر ولی الحق انصاری، لکھنؤ

یہ کفن پہنے ہوئے جو سو رہے ہیں زیرِ خاک
کون جانے بے نوا تھا کون ان میں کون شاہ

کون جانے بندۂ مجبور کہلاتا تھا کون
کون جانے کس کو دنیا کہتی تھی عالم پناہ

کون جانے کون تھے جن کے جھکے رہتے تھے سر
کون جانے کون تھے ان بیکسوں میں کج کلاہ

کیا خبر تھے کون آنکھیں جن کی خوں روتی رہیں
کون جانے شعلے برساتی رہی کس کی نگاہ

کیا خبر تھے کون ان میں زندگی بھر فاقہ مست
کیا خبر تھے کون ان میں صاحبانِ عز و جاہ

کیا خبر تھے کون ان میں جو تھے جانِ میکدہ
کیا خبر تھے کون ان میں جو تھے فخرِ خانقاہ

ہوں گے ان میں کچھ فرشتوں سے بھی بڑھ کر پاکباز
ان میں کچھ ایسے بھی ہوں گے جو رہے غرقِ گناہ

ہوں گے وہ بھی باعثِ تضحیک تھا جن کا کلام
ہوں گے وہ بھی بات پر ہوتی تھی جن کی واہ واہ

ان میں ممکن ہے کہ ہوں کچھ وہ بھی جو جب تک جیے
راستے میں دوسروں کے کھودتے رہتے تھے چاہ

اور اس کا بھی ہے امکان آج جو ہیں زیرِ خاک
ان میں ہوں گے وہ بھی جو انساں کے ہوں خیر خواہ

ہوں گے اپنے عہد میں یہ سب فلاں ابن فلاں
مایۂ عبرت ہیں اب تو بن کے یہ سب خاکِ راہ

ذکر کیا افعال کا ان خفتگانِ خاک کے
نام سے بھی انکے اب واقف نہیں ہے کوئی آہ

نیک تھے یا بد تھے، جو کچھ بھی تھے بندے تھے ترے
بخش دے رحمت سے اپنی ان سبھوں کو یا الٰہ

مطبوعات جدیدہ

رسالوں کے خاص نمبر

الحق (خصوصی شمارہ) مدیر جناب مولانا سمیع الحق، صفحات ۱۶۵، قیمت ۳۵ روپے

سالانہ ۱۵۰ روپے، پتہ: ماہنامہ الحق دارالعلوم حقانیہ اکوڑہ خٹک ضلع نوشہرہ پاکستان

برصغیر کو انگریزوں کے تسلط سے آزاد ہوئے پچاس سال ہو گئے، اس موقع پر ہند و پاک کی حکومتیں مختلف پروگرام منعقد کر کے جشن آزادی منانے میں مصروف ہیں لیکن سنجیدہ، دردمند اور باشعور افراد و ادارے اس موقع کو احتساب و خودنگری کا لمحہ غنیمت تصور کرتے ہیں، زیر نظر شمارہ اسی سلسلہ کی ایک کڑی ہے جو تقریباً بائیس مضامین پر مشتمل ہے، اس میں پاکستان کے معروف اہل قلم نے وہاں کے احوال کا جائزہ لیا ہے جس کا ماحصل یہ ہے کہ آزادی کا یہ سفر کج رفتار و بے سمت گزرا، جناب حکیم محمد سعید نے اس کا اصل سبب واعتصموا بحبل اللہ جمیعا ولا تفرقوا کے نسخہ کیمیا کا فراموش کر دیا جانا بتایا ہے، فاضل مدیر کے قلم سے ایک مضمون میں موجودہ حالات کے پس منظر میں مولانا مدنی اور مولانا ابوالکلام آزاد کے ان اندیشوں کا ذکر ہے جو ان کی نگاہ میں آج حقیقت میں بدل گئے ہیں، ڈاکٹر ابو سلمان شاہجہانپوری کا مقالہ فکر انگیز ہے جس میں نظریۂ پاکستان کی صحت و عدم صحت سے قطع نظر اس اہم نکتہ پر بحث کی گئی ہے کہ "یہ استحقاق کس کو حاصل ہے کہ اس کے افکار کو نظریۂ پاکستان کی بنیاد بنایا جائے"، لیکن ان کے بعض خیالات اہل نظر کی بحث کا موضوع بن سکتے ہیں، چنانچہ الحق کے تازہ شماروں سے معلوم ہوا کہ یہ تحریر

متنازعہ بن گئی ہے، تاہم ان کے خیالات غور و فکر کے لائق ہیں، ایک اور مضمون سید احمد شہیدؒ اور اکوڑہ بھی معلومات افزا ہے، ماضی سے بے اطمینانی کے باوجود عام طور سے روشن مستقبل کی توقعات بھی ہیں، تاریخ پاکستان سے دلچسپی رکھنے والوں کے لیے اس شمارہ میں خاصا مواد موجود ہے۔

مجلہ ترجمان الاسلام (مولانا قاضی اطہر مبارکپوری نمبر) مرتبہ جناب اسیر ادروی، متوسط تقطیع، بہترین کاغذ و کتابت و طباعت، صفحات ۴۴۰، قیمت ۳۰ روپے، پتہ: جامعہ اسلامیہ ریوڑی تالاب بنارس، یوپی ۲۲۱۰۱۰۔

مولانا قاضی اطہر مبارکپوری کے سانحۂ وفات کو اب تقریباً ایک سال ہو رہا ہے لیکن ان کی دلنواز یادوں اور باتوں کی خوشبو ان کے متعلقین کے ذہن و دل میں اب بھی بسی ہے، علمی دنیا میں ان کا خلا شاید مشکل سے پُر ہو سکے، ان کے یاران دیرینہ میں اس خاص نمبر کے فاضل مرتب بھی ہیں جنھوں نے بلند پایہ مقالات و مضامین پر مشتمل یہ خاص نمبر شایع کر کے اپنے رفیق دیرینہ کا حق ہی ادا نہیں کیا بلکہ حدیث یار کے عنوان سے قاضی صاحب مرحوم کی شخصی و علمی زندگی اور خود اپنے مخلصانہ روابط کو تفصیل سے سپرد قلم کیا، بلاشبہ یہ خاص نمبر قاضی صاحب مرحوم کے علمی، تحقیقی اور تاریخی کارہائے نمایاں کا عمدہ مرقع ہے۔

رفیق منزل (مسلم تعلیمی تحریکات و شخصیات نمبر) مدیر جناب اعجاز احمد اصلاحی، صفحات ۴۱۶، قیمت ۲۵ روپے، زر سالانہ ۷۰ روپے، پتہ: ۲۳۰-۲ ابوالفضل انکلیو، اوکھلا، نئی دہلی ۱۱۰۰۲۵۔

یہ رسالہ اپنے اصلاحی مضامین کے لیے خصوصاً مسلمان نوجوانوں کی کردار سازی کے لیے معروف ہے، اس سے پہلے اس نے ہندوستانی مسلمانوں کی تعلیم کے متعلق دو اہم

شمارے تعلیم و وسائل تعلیم اور تعلیمی رہنما کے عنوان سے شائع کیے تھے، زیر نظر شمارہ اسی سلسلہ کی تیسری کڑی ہے، جس میں ہندوستان کے ممتاز تعلیمی اداروں، تحریکوں اور قدیم و جدید مشاہیر اہل تعلیم کا جائزہ و تذکرہ شرح و بسط کے ساتھ پیش کیا گیا ہے، مولانا سید سلیمان ندوی کا مشہور مضمون ہندوؤں کی تعلیمی ترقی میں مسلمانوں کا حصہ بھی شامل کیا گیا ہے۔

افکار ملی (مسلم معاشرہ نمبر) مدیر ڈاکٹر سید قاسم رسول الیاس، صفحات ۲۴۰، زر سالانہ ۱۲۰ روپے، پتہ: ای - ۲۲/۱۵۳ ذاکر نگر، جامعہ نگر، نئی دہلی ۲۵-۱۱۰۰۔

ہندوستانی مسلمانوں کو درپیش مسائل میں خود ان کے معاشرہ کی شکست و ریخت اور اسلامی اقدار کے زوال و انحطاط کا مسئلہ سب سے اہم ہے، تعلیمی پس ماندگی اور اقتصادی بدحالی کی بڑی وجہ یہی معاشرتی فساد اور اس کی اصلاح سے چشم پوشی ہے، اس اہم مسئلہ کا زیر نظر شمارہ میں تفصیل سے جائزہ لیا گیا ہے، مضامین کو اصول مباحث، ماہیت اور مسائل و امکانات کے ابواب میں تقسیم کیا گیا ہے، قیادت، جذباتیت، جہیز، مہر، طلاق، ازدواج بیوگان، ذات پات، رسم رواج، پرسنل لا، دار القضا اور اجتماعی نظم زکوٰۃ پر متعدد عمدہ تحریریں ہیں، ان کے علاوہ نوجوان و کہن سال اشخاص، گداگری اور پاکی و صفائی کے متعلق بھی اچھے مضامین ہیں، ادارہ افکار ملی کا یہ دعویٰ غلط نہیں کہ پہلی بار اس موضوع پر اتنا حقیقت پسندانہ جائزہ پیش کیا گیا ہے۔

ماہنامہ اشرفیہ (صدر الشریعہ نمبر) مرتبہ مولانا مبارک حسین مصباحی بڑی تقطیع، بہترین کاغذ اور کتابت و طباعت، صفحات ۲۸۸، قیمت ۴۰ روپے، پتہ: الجامعۃ الاشرفیہ، مبارکپور، اعظم گڈھ۔ یوپی ۲۷۶۴۰۴

دیار پورب کے علماء و فضلاء میں ایک نمایاں اور اہم نام مولانا امجد علی گھوسوی

صاحبِ بہار شریعت کا ہے، وہ تفسیر و حدیث کے استاد تھے، فقہ میں تبحر حاصل تھا، عالم باعمل اور اہل دل تھے، ان کے بے شمار شاگرد ہوئے لیکن ان کے سوانح اب تک مرتب نہ ہوسکے تھے، خوشی کی بات ہے کہ اس ضرورت کو جامعۃ الاشرفیہ مبارک پور نے محنت و سلیقہ سے پورا کیا اور ان کی شخصیت، افکار و احوال اور تصنیفات و تالیفات کے متعلق مفصل معلومات اس خاص نمبر میں جمع کر دیے۔

اللہ کی پکار مدیر جناب ڈاکٹر خالد حامدی، صفحات ۸۸، قیمت فی شمارہ ۲روپے، زرِ سالانہ ۲۵ روپے، پتہ: پوسٹ بکس نمبر ۹۷۰۲، جامعہ نگر، نئی دہلی ۲۵۰۰۱۱۔

یہ سہ ماہی رسالہ دہلی کی ٹکسالِ صحافت کی تازہ دین ہے، خالص مذہبی اور اسلامی مضامین کی اشاعت اس کا اصل مقصد ہے اور زیر نظر شمارہ کی فہرست مضامین سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ اپنے مقصد میں کامیاب ہے، قرآن و حدیث، سیر و آثارِ صحابہ کرام کے مستقل موضوعات کے علاوہ ائمہ سلف کے اقوال و ملفوظات کو اختصار کے ساتھ بڑے سلیقہ سے پیش کیا گیا ہے طباعت بھی عمدہ ہے۔

پیغام (تعلیمی سیمینار نمبر) مدیر جناب مولوی محمد حسن حبیب فلاحی، صفحات ۱۲۶، زر سالانہ ۵۰ روپے، پتہ: الحرا ایجوکیشنل سوسائٹی، پوسٹ بکس نمبر ۲۸۹۶، کاٹھمنڈو۔ نیپال۔

ریاست نیپال کا شمار پس ماندہ، غیر تعلیم یافتہ اور افلاس زدہ ملکوں میں کیا جاتا ہے، مسلمان وہاں کی آبادی کا ایک حصہ ہیں جن کی تعلیمی ترقی کے لیے الحرا ایجوکیشنل سوسائٹی سرگرم ہے، اس سلسلہ میں اس نے ایک تعلیمی سیمینار منعقد کیا تھا جس میں نیپال کے علاوہ ہندوستان کے متعدد علما شریک ہوئے، زیر نظر شمارہ اس سیمینار میں پڑھے جانے والے مقالات کا مجموعہ ہے۔

ع۔ ص۔

تاریخ ہند پر دارالمصنفین کی اہم کتابیں

عرب و ہند کے تعلقات (مولانا سید سلیمان ندویؒ) ہندوستانی اکیڈمی کے لئے لکھے گئے خطبات کا مجموعہ اور اپنے موضوع کی پہلی اور منفرد کتاب ہے۔ قیمت: ۹۵/روپئے

مقدمہ رقعات عالمگیر (سید نجیب اشرف ندویؒ) اس میں عالمگیر کی برادرانہ جنگ کے واقعات، اسلامی فن انشاء اور ہندوستان میں شاہانہ مراسلات کی تاریخ ہے۔ قیمت: ۸۰/روپئے

تاریخ سندھ (سید ابو ظفر ندویؒ) اس میں سندھ کا جغرافیہ، مسلمانوں کے حملہ سے پیشتر کے مختصر اور اسلامی فتوحات کے مفصل حالات بیان کئے گئے ہیں۔ قیمت: ۵۶/روپئے

بزم تیموریہ (سید صباح الدین عبدالرحمنؒ) مغل حکمرانوں کے علمی و ادبی کارناموں کو تفصیل سے پیش کیا گیا ہے۔ قیمت: جلد اول: ۱۵۰/روپئے۔ دوم ۵۰/روپئے۔ سوم ۵۶/روپئے

ہندوستان کی قدیم اسلامی درسگاہیں (ابوالحسنات ندویؒ) اس میں قدیم ہندوستانی مسلمانوں کے علمی حالات اور ان کے مدارس کا ذکر ہے۔ قیمت ۲۵/روپئے

ہندوستان عربوں کی نظر میں (ضیاء الدین اصلاحی) ہندوستان کے بارہ میں عرب مورخین اور سیاحوں کے بیانات کا مجموعہ ہے۔ قیمت: جلد اول: ۷۵/روپئے۔ دوم: زیر طبع

کشمیر سلاطین کے عہد میں (مترجمہ: علی حماد عباسی) پروفیسر محب الحسن کی کتاب کا انگریزی سے ترجمہ جس میں کشمیر کی مفصل تاریخ بیان کی گئی ہے۔ قیمت: ۵۶/روپئے

ہندوستان کے مسلمان حکمرانوں کی مذہبی رواداری (سید صباح الدین عبدالرحمنؒ) مسلمان حکمرانوں کی رواداری کے دلچسپ اور سبق آموز واقعات کا ذکر ہے۔ قیمت: اول: ۳۰/روپئے
دوم: ۳۸/روپئے سوم: ۵۶/روپئے

بزم مملوکیہ (سید صباح الدین عبدالرحمنؒ) ہندوستان میں غلام سلاطین، امراء اور شہزادوں کی علم دوستی اور ان کے دربار کے علماء و فضلاء، ادباء و شعراء کے حالات کا مجموعہ ہے۔ قیمت: ۵۰/روپئے

بزم صوفیہ (سید صباح الدین عبدالرحمنؒ) تیموری عہد سے پہلے کے صاحب تصنیف اکابر صوفیہ کی زندگی کے حالات و کمالات کا تذکرہ ہے۔ قیمت: ۱۱۵/روپئے

ہندوستان کے مسلمان حکمرانوں کے عہد کے تمدنی کارنامے (ادارہ) مسلمانوں کے تمدنی کارناموں اور متفرق مضامین کا مجموعہ ہے۔ قیمت: ۵۰/روپئے

ہندوستان کے عہد وسطیٰ کی ایک ایک جھلک (سید صباح الدین عبدالرحمنؒ) ہندوستانی مسلم حکمرانوں کے دور کی سیاسی، تمدنی اور معاشرتی کہانی ہندو اور مسلم مورخوں کی زبانی۔ قیمت: ۸۰/روپئے

بابری مسجد (ادارہ) فیض آباد کی عدالت کے اصل کاغذات کی روشنی میں بابری مسجد کی تفصیلات بیان کی گئی ہے۔ قیمت: ۳۰/روپئے

ہندوستان کی کہانی (عبدالسلام قدوائی ندوی) بچوں کے لئے مختصر اور عمدہ کتاب ہے۔ قیمت: ۱۵/روپئے

EC1997 Vol. 160(6) MA'ARIF Regd. No. AZM/NP/43
onthly Journal of DARUL MUSANNEFIN SHIBLI ACADEMY
P.O. BOX. NO: 19, AZAMGARH - 276 001 U. P. (INDIA)
one No : 0546 - 200 206 Per Copy Rs 7.00

دار المصنفین کا سلسلہ سیرۃ النبیؐ

سیرۃ النبیؐ حصہ اول (علامہ شبلی نعمانیؒ) اس میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت سے لے کر فتح مکہ تک کے حالات مبارکہ اور غزوات کا ذکر ہے۔ ابتداء میں فن سیرت پر ایک مبسوط مقدمہ ہے۔

قیمت طبع قدیم: ۶۵ روپے۔ قیمت طبع جدید (اضافہ و کمپیوٹر کتابت شدہ مجلد) ۱۹۰/ روپے۔

سیرۃ النبیؐ حصہ دوم (علامہ شبلی نعمانیؒ) اس میں اقامت امن، تاسیس خلافت، تکمیل شریعت حالات، اخلاق و عادات، ازواج و اولاد کا مفصل بیان ہے۔

قیمت طبع قدیم: ۵۰/ روپے۔ قیمت طبع جدید (اضافہ شدہ مجلد) ۱۹۰/ روپے۔

سیرۃ النبیؐ حصہ سوم (مولانا سید سلیمان ندویؒ) اس میں معجزہ کی حقیقت اور اس کے امکان و وقوع پر فلسفہ قدیمہ و جدیدہ، علم کلام اور قرآن مجید کی روشنی میں بحث کی گئی ہے۔ قیمت: ۱۲۵/ روپے۔

سیرۃ النبیؐ حصہ چہارم (مولانا سید سلیمان ندویؒ) اس میں منصب نبوت کی وضاحت کرکے اسلام اور اس کے عقائد پر مفصل اور حکیمانہ بحث کی گئی ہے۔ قیمت: ۱۲۵/ روپے۔

سیرۃ النبیؐ حصہ پنجم (مولانا سید سلیمان ندویؒ) اس میں عبادات اور اس کے اقسام کا ذکر ہے۔ قیمت ۷۰/ روپے۔

سیرۃ النبیؐ حصہ ششم (مولانا سید سلیمان ندویؒ) یہ اخلاقی تعلیمات پر مشتمل ہے۔ قیمت: ۱۲۵/ روپے

سیرۃ النبیؐ حصہ ہفتم (مولانا سید سلیمان ندویؒ) قانون الٰہی کی ضرورت و حیثیت جیسے مضامین پر مولانا سید سلیمان ندویؒ کے متفرق مضامین و مباحث کا مجموعہ ہے۔ قیمت: ۳۵/ روپے۔

خطبات مدراس (مولانا سید سلیمان ندویؒ) سیرت کے مختلف پہلوؤں پر آٹھ خطبات کا مجموعہ جو مدراس میں دیئے گئے۔ قیمت: ۴۲/ روپے۔

الرسالۃ المحمدیہ (مترجمہ مولانا محمد ناظم ندوی) خطبات مدراس کا عربی ترجمہ ہے۔ قیمت: [illegible]

رحمت عالمؐ (مولانا سید سلیمان ندویؒ) مدارس و مکاتب کے طلبہ کے لئے سیرت پر ایک مختصر کتاب ہے۔ قیمت: ۱۰/ روپے۔